دبستانِ حدیث

برِصغیر پاک و ہند کے علمائے اہلحدیث کی
خدماتِ حدیث کا منفرد تذکرہ

محمد اسحاق بھٹی

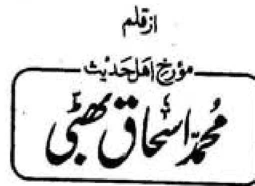


مکتبہ قدوسیہ

دبستانِ حدیث

برِّصغیر پاک و ہند کے علمائے اہلحدیث کی
خدماتِ حدیث کا منفرد تذکرہ

ازقلم



مکتبہ قدوسیہ

22069
2-424

اہتمام طباعت
ابوبکر قدوسی

اشاعت اول ۲۰۰۸ء

مکتبہ قدوسیہ
رحمان مارکیٹ ◉ غزنی سٹریٹ ◉ اردو بازار ◉ لاہور پاکستان
رسول پلازہ ◉ امین پور بازار ◉ فیصل آباد

قدوسیہ اسلامک پریس
Tel: +92-42-7351124,7230585
info@quddusia.com
www.quddusia.com

ترتیب



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف اول

اسلام قرآن کریم اور احادیث نبویہ کے مجموعے کا نام ہے۔ دنیا کے کسی مذہب میں یہ مثال نہیں ملتی کہ اس مذہب کے پیروکاروں نے اپنے مقتدیٰ و پیشوا کے فرامین کو اس انداز سے جمع کیا ہو، جس انداز سے اہل اسلام نے حضرت نبی کریم ﷺ کے فرامین کی جمع وتدوین کی ہے۔ بلاشبہ یہ بھی معجزات نبوی میں سے ہے۔ فرامین نبوی ﷺ کے جمع کرنے سے بھی بڑا کارنامہ ان کی تنقیح ہے۔ اللہ رب العزت علمائے حدیث سے راضی ہو جائے کہ جنھوں نے احادیث کی صحت وضعف کو پرکھنے کا اہتمام کیا۔ ہزاروں لاکھوں راویان حدیث کے حالات کی چھان پھٹک کی اور کھوٹے سے کھرے کو علیحدہ کر دیا۔

اسماء الرجال کا علم علوم عمرانیات میں ایک حیرت انگیز علم ہے۔ علمائے امت نے اپنی زندگیوں کو خدمت حدیث کے لیے وقف کر دیا۔ آج ہمیں بے پناہ سہولیات میسر ہیں لیکن جب سفر کے ذرائع محدود بھی تھے اور مسدود بھی، محدثین عظام نے بسا اوقات ایک حدیث کے حصول کے لیے سیکڑوں میل کا سفر طے کیا۔ اس راہ کی مشکلات کا سامنا کیا، سفر کی صعوبتوں کو برداشت کیا۔ مقصد کیا تھا؟ مالی مفاد یا ناموری؟...... جی نہیں۔ موجودہ ذرائع ابلاغ کی ایجاد سے پہلے ناموری کا یہ تصور کہاں تھا؟ عالم گیر شہرت کے مواقع کس حد تک میسر تھے؟ ویڈیو لیکچرز تو اس دور کی ایجاد ہے۔ آڈیو ریکارڈنگ بھی محض نصف صدی کا قصہ ہے۔ چھاپہ خانہ اگرچہ کسی درجے قدیم ہے لیکن مسلمان تو اس میں بھی بہت پیچھے رہے ہیں اور آج! آج تو صورت حال یہ ہے کہ دین کا معمولی پڑھا لکھا طالب علم بھی کمپیوٹر کی مدد سے تحقیق و تخریج کر رہا ہے، انٹرنیٹ کی سہولت استعمال کر کے علمائے امت کی جدید ترین تحقیقات سے استفادہ کر رہا ہے۔ ماضی میں محدثین عظام کو یہ محیر العقول سہولیات کہاں حاصل تھیں؟ انھیں تو اُس دور کے مطابق سہولیات بھی آسانی سے حاصل نہیں ہو پاتی تھیں۔ اس کے باوجود ان نفوس قدسیہ اور ارواح طیبہ نے نبی کریم ﷺ کی محبت سے سرشار ہو کر حدیث شریف کی خدمت کی۔ کسی نے احادیث کی ترتیب وتدوین کی تو کسی نے ان احادیث کی تشریح کی۔ کسی نے احکام کی احادیث الگ کر دیں تو کسی بزرگ نے فضائل ومناقب کی احادیث کا مجموعہ ترتیب دے دیا۔ کسی امامِ حدیث نے اخلاقیات سے متعلقہ احادیث کو مرتب کیا تو کسی نے آداب زندگی سے تعلق رکھنے والی احادیث پر مشتمل کتاب تالیف کی۔ غرض اللہ رب العزت کی توفیق سے ان عظیم المرتبت ائمۂ حدیث نے اپنے اپنے انداز سے حدیث شریف کی خدمت کی۔ خدمت حدیث کا یہ سلسلہ حضرت نبی کریم ﷺ کی زندگی میں ہی شروع ہو چکا تھا۔ اس مقدس لڑی کے اولین موتی حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین تھے۔ آج بھی یہ سلسلہ پوری آب وتاب سے جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ ماہرین علم حدیث پیدا ہوتے رہیں گے اور خدمت حدیث سرانجام دیتے رہیں گے۔

حدیث شریف کی خدمت میں برصغیر پاک وہند کے علمائے کرام کا کردار نہایت اہم ہے۔ تاریخ کے اوراق میں ان کے کارہائے نمایاں محفوظ ہیں۔ اس خطے میں پیدا ہونے والے علمائے حدیث نے کتب حدیث کی بے مثال شروحات لکھیں۔ انھوں نے اپنے اپنے انداز میں یہ خدمت سرانجام دی۔ ہمارے انتہائی محترم ومکرم جناب مولانا محمد اسحاق بھٹی نے اپنی اس تالیف میں برصغیر پاک وہند کے بہت سے ایسے علمائے اہل حدیث کا ذکر فرمایا ہے جنھوں نے کسی نہ کسی اسلوب میں حدیث شریف کی خدمت کی سعادت حاصل کی ہے۔ جناب بھٹی صاحب کی یہ کتاب اس سلسلے کی تیسری کتاب ہے۔ وہ تاریخ اہل حدیث کے موضوع پر مسلسل لکھ رہے ہیں۔ اس سے قبل ان کی دو کتابیں ''برصغیر میں اہل حدیث کی آمد'' اور ''برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن'' کے عنوان سے شائع ہو چکی ہیں۔ سفر کی صعوبتوں اور پے در پے رکاوٹوں کے باوجود

ان کا اشہب قلم رواں دواں ہے۔اس تحقیقی وتصنیفی زندگی میں انھیں کئی ایک مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔اور پھر وہ عمر کے اس حصے میں ہیں کہ قلم کی توانائی عموماً بہت کم ہو جاتی ہے لیکن ان پر اللہ رب العزت کا خاص کرم ہے کہ چند سالوں میں ان کی درجن بھر کتب شائع ہو چکی ہیں اور ہر کتاب کم از کم پانچ چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔وطن عزیز کے معروضی حالات بھی سب کے سامنے ہیں۔ایسے ابتر حالات میں قلم کو اپنا رفیق زندگی بنائے رکھنا بھی حضرت بھٹی صاحب کی کرامت ہے۔اس سارے تصنیفی وتحقیقی کام میں ان کا کوئی معاون نہیں۔وہ اکیلے یہ کام کرتے ہیں۔کسی کو املا نہیں کراتے،کوئی ان کے لیے حوالے تلاش نہیں کرتا۔کوئی ان کے لیے لائبریریوں کے چکر نہیں کاٹتا کہ جا کر لائبریری سے کتاب لے آئے اور بھٹی صاحب کا قیمتی وقت بچ جائے۔

بھٹی صاحب اس وقت ماشاء اللہ نہایت معروف قلم کار ہیں،اہل حدیث میں بھی اور غیر اہل حدیث حلقوں میں بھی ان کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ان کے چاہنے والے ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ہیں۔پاکستان سے باہر بھی ان کی شہرت جا پہنچی ہے۔ہندوستان میں ان کی تصنیفات طبع ہو رہی ہیں۔بلکہ خود بھٹی صاحب کی حیات وخدمات کے اعتراف میں وہاں کے اہل قلم مسلسل لکھ رہے ہیں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ان پر ایم فل کا مقالہ لکھا گیا اور چھپ بھی گیا۔اب کوئی دن کی بات ہے جب وہ مستقبل کے کسی ''ڈاکٹر'' کی تحقیق کی نذر ہو جائیں گے یعنی ان کی زندگی کے بند اوراق کھولے جائیں گے،ان کی شخصیت کی پرتیں تلاش کی جائیں گی،''افسوس''صرف اس بات کا ہے کہ جناب بھٹی صاحب کو یہ شہرت،یہ محبت،یہ عقیدت ''عالم پیری'' میں حاصل ہوئی۔اس دور میں جب کہ انھوں نے حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کر لی،اپنی مختصر ریش مبارک کو ''مسنون'' طول بھی دے دیا اور اس کی سفیدی جو خضاب کے ''اندھیرے'' میں چھپی ہوئی تھی،اسے اجالے میں لے آئے۔

ہمارے لیے واجب صد احترام جناب مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب کو شہرت بلکہ عالم گیر شہرت ملی ہے۔اب انھیں اس کے تقاضے بھی نباہنے پڑ رہے ہیں۔ان کے چاہنے والے انھیں نہایت محبت سے اپنے ہاں بلاتے ہیں۔سکہ بند واعظ اور پیشہ ور خطیب نہ ہونے کے باوجود انھیں جانا پڑتا ہے۔ان کے پاس اپنی سواری نہیں۔چنانچہ ان کے وقت کا اچھا خاصا حصہ ان تقریبات میں آمد ورفت کی نذر ہو جاتا ہے۔اس کے باوجود بھٹی صاحب مسلسل لکھ رہے ہیں۔مکتبہ قدوسیہ کو ان کی اکثر کتب شائع کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔جناب بھٹی صاحب اخلاق عالیہ کی بلندیوں پر فائز ہیں۔اس لیے آپ ان کی کتاب کے آغاز میں ''حرفے چند'' میں اپنے ناشر کے متعلق ان سے کوئی شکوہ نہیں سنیں گے حالانکہ ہم نے ان کی کتابوں کی اشاعت کی تاخیر میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔وہ ناراض ہوتے ہیں،ہمیں ڈانٹتے ڈپٹتے ہیں۔ان کی ناراضی میں بھی شفقت ومحبت نمایاں ہوتی ہے۔اس لیے کہ ہمارا ان سے پبلشر اور مصنف والا رشتہ کبھی رہا ہی نہیں۔وہ ہمارے لیے اس لیے بھی قابل احترام ہیں کہ والد گرامی قدر مولانا عبدالخالق قدوسی رحمہ اللہ جناب بھٹی صاحب کے دوستوں میں سے تھے۔

اللہ رب العزت محترم جناب بھٹی صاحب کے قلم کو اسی طرح شاداب اور توانا رکھے۔وہ لکھتے رہیں،ہم شائع کرتے رہیں اور آپ پڑھتے رہیں۔امید ہے قارئین کرام نے اس دعا پر ضرور آمین کہی ہوگی۔اہل حدیث نے بالجہر اور احناف نے بالسر کہ بھٹی صاحب کے چاہنے والوں میں احناف کی بھی کمی نہیں۔ان شاء اللہ بہت جلد اس سلسلے کی آئندہ کتاب ''گلستان حدیث'' کے ''حرف اول'' میں آپ سے ملاقات ہوگی۔اس کی کمپوزنگ ہو رہی ہے۔اس کی جلد اشاعت کے لیے دعا کیجیے گا۔مجھے یقین ہے کہ جناب بھٹی صاحب کے حلقہ قارئین میں مستجاب الدعوات بزرگوں کی کمی نہیں۔

عمر فاروق قدوسی

مولانا عبدالخالق محمد صادق (کویت)

حدیث اور اہل حدیث

علم حدیث وہ مبارک ومہتم بالشان اور رفیع القدر علم ہے جو کہ فجر اسلام ہی سے حاملین کتاب وسنت اور ورثائے علوم نبوت کی خصوصی توجہ اور عنایت کا مرکز رہا ہے۔ اس لیے کہ یہ دین اسلام کا بنیادی ماخذ اور سرچشمۂ وحیِ الٰہی ہے اور اس کا اطلاق قرآن اور حدیث دونوں پر ہوتا ہے کیوں کہ دونوں من جانب اللہ اور باہم لازم وملزوم ہیں، اور ان کی حجیت یکساں طور پر مسلّمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل جہان کی رشد وہدایت کے لیے جس طرح ایک جامع، عالم گیر اور کامل واکمل دستورِ حیات (قرآنِ کریم) نازل کیا ہے، اسی طرح اس کی تفسیر وبیان کو بھی "حدیث مصطفیٰ ﷺ" کی صورت میں نازل فرمایا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

﴿ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ٥ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ٥ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ٥ ﴾

[القیامۃ:١٧۔ ١٩]

"ثم ان علینا بیانہ" (پھر اس کا بیان وتفسیر بھی ہمارے ذمے ہے) سے اظہر من الشمس ہے کہ قرآن کا بیان اس کے علاوہ ہے اور دونوں ہی من جانب اللہ ہیں۔ اور سورۂ ہود میں ارشاد ہے:

﴿ الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ﴾ [ھود:١]

(یہ کتاب جس کی آیات محکم بنائی گئی ہیں اور پھر حکیم وخبیر (اللہ تعالیٰ) کی طرف سے ان کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔)

اور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

"الا انی اوتیت الکتاب ومثلہ معہ." [ابوداود حدیث نمبر: ٤٦٠٤]

(خبردار! مجھے قرآنِ کریم کے ساتھ اس کی مثل (حدیث) بھی عطا کی گئی ہے۔)

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاداتِ نبویہ اور احکام واعمال مصطفویہ کو واجب القبول اور واجب الاتباع قرار دیا اور اطاعت رسول ﷺ کو اپنی اطاعت گردانا ہے۔ ارشاد باری ہے:

﴿ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴾ [النساء:٨٠]

(اتباع رسول ﷺ کرنے والا گویا کہ اللہ کا مطیع ہے۔)

چناں چہ علامہ شاطبی فرماتے ہیں:

"فکان السنة بمنزلة التفسير و الشرح لمعانی احکام الکتاب."

[الموافقات: ٦/١٠]

(یعنی حدیث پاک قرآنی احکام کی شرح وتفسیر ہے۔)

علامہ سمعانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اعلم وفقک الله! أن علم الحديث أشرف العلوم بعد العلم بكتاب الله سبحانه وتعالى . اذ الاحكام مبنية عليهما ومستنبطة منهما، والله سبحانه وتعالٰى شرّف نبينا (صلى الله عليه وسلم) حيث قال ﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى. اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴾ " [الانتصار لأهل الحديث، ص:٥٦]

یعنی کتاب اللہ کے بعد اشرف ترین علم اس کی تفسیر و بیان "حدیث" کا علم ہے۔

اصل دین آمد کلام اللہ معظم داشتن
پس حدیث مصطفٰے (ﷺ) برجاں مسلّم داشتن

وحی الٰہی کی بکمالہ حفاظت وصیانت اللہ تعالٰی نے اپنے ذمے لی ہے۔

اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے:

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ [الحجر:٩]

(بلاشبہ، ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔)

آیت کریمہ میں لفظ "الذکر" سے قرآنِ کریم اور حدیث مصطفٰی (ﷺ) دونوں مراد ہیں۔ اور یقیناً اللہ تعالٰی کا وعدہ مبنی برحق ہے۔ لہٰذا وحی الٰہی بکمالہ محفوظ و مامون ہے، جس طرح قرآنِ کریم محفوظ ہے، اسی طرح اس کی تفسیر و بیان (حدیث) بھی محفوظ ہے۔ اور نبی اکرم ﷺ کی نبوت ورسالت چوں کہ قیامت تک آنے والوں کے لیے ہے جس کا لازمی نتیجہ ہے کہ دین اسلام قیامت تک محفوظ ہو۔ لہٰذا یہ ہر دور میں اپنی اصلی وحقیقی شکل میں محفوظ رہا ہے اور محفوظ رہے گا۔ ان شاء اللہ

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہر دور میں بعض نظریات اور مقاصد کی حامل تحریکات کی طرف سے دین اسلام کی اصلی وحقیقی صورت کو مسخ کرنے اور اس کے حسن کو گہنانے اور اسلامی تعلیمات کا حلیہ بگاڑنے اور اپنے مذموم مقاصد اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے تاویلاتِ باطلہ کے ذریعے سے اس کی غلط تشریح کرنے اور من گھڑت اور موضوع روایات کے ذریعے احادیث صحیحہ سے لوگوں کو دور رکھنے کی سازشیں ہوتی رہیں، لیکن یہ تمام تر سازشیں اور کوششیں آفتاب پر تھوکنے کے مترادف ثابت ہوئیں۔

ایسے عناصر ہر دور میں رسوا ہوئے اس لیے کہ۔

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اور چشم کائنات نے دیکھا کہ نور اسلام کو بجھانے اور دین حق کو دبانے کے لیے جس قدر سازشیں ہوئیں یہ اسی قدر نکھرا، چمکا اور ابھرا۔ کیوں کہ اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک رکھی ہے کہ یہ اتنا ہی زیادہ ابھرے گا جتنا کہ اسے دبایا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت اور انبیا کی میراث کے تحفظ کے لیے جن خدام کتاب وسنت کا انتخاب فرمایا انھوں نے اس منصب جلیل کو اپنی سعادت مندی اور بلند اقبالی خیال کرتے ہوئے اس کارِ خیر کے لیے اپنا قیمتی سرمایۂ حیات وفورِ شوق سے لٹایا اور علوم نبوت کی خدمت کو اپنے لیے ایک اعزاز اور قابل صد افتخار اور باعث عزت وشرف گردانا۔ اس طائفہ مبارکہ کو ''اہل حدیث''، ''محدثین'' اور ''طائفہ منصورہ'' جیسے مبارک القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور دربارِ رسالت مآب سے انہی شیدایان قرآن وحدیث کو ''ورثۃ الانبیاء'' کا قابل فخر لقب عطا ہوا ہے، اور یہی وہ قابل رشک لوگ ہیں جنھیں زبان نبوت سے یہ دعا ملی ہے:

"نَضَرَ اللّٰه اِمرَأً سمع مِنّا حديثًا فبلّغه فرُبَّ مُبَلَّغٍ أحفظ من سامِعٍ."

[ابن ماجه: ۱/ ۸۵]

(اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کو پُررونق اور شاداب کرے جو ہماری حدیث کو سن کر اسے آگے پہنچاتا ہے۔ بعض اوقات کسی سے سننے والا سنانے والے سے زیادہ یاد رکھنے والا ہوتا ہے۔)

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

علامہ نسوی رحمہ اللہ نے کیا خوب کہا ہے:

أهل الحديث هم أهل النبي وإن
لم يصحَبُوا نفسه انفاسه صحبوا

(اہل حدیث نبی اکرم ﷺ کے ساتھی ہیں، (ان میں سے) جن کو زندگی میں آپ ﷺ کی صحبت میسر نہ آسکی تو اسے آپ کی مبارک سانسوں (حدیث پاک) سے تو شرف صحبت حاصل ہے۔)

ہمہ وقت قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں بلند کرنا اور ہر حدیث کی روایت اور تعلیم وتدریس کے دوران بکثرت درود شریف پڑھنا انہی کے حصے میں آیا ہے۔ عبدالسلام بن یزید الاشبیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَكُلّ حَدِيْثِي تَأَزَّر بِالتُّقٰى — فَذَاكَ امرؤٌ عِندَ اللّٰه سَعِيْدٌ
وَلَو لَمْ يَقُمْ اَهلُ الحديثِ بِدِيننا — فَمَنْ كَانَ يَروِى عِلْمَه وَيُفِيد؟
هُم وَرِثُوا علمَ النبوةِ واحقوروا — مِن الفَضْلِ مَا عَنه الأنامُ رُقُود
وَهم كَمصابِيح الدُّجٰى يُهتدىٰ بِهِم — وَما لَهم بَعْدَ المَماتِ خُمودٌ

اہل حدیث یا محدثین:

محدثین کرام کے نزدیک حدیث اور سنت دو مترادف اصطلاحات ہیں اور اس سے مراد ہے
"ما اضيف الى النبى ﷺ من قول او فعل او تقرير او وصف خلقى او خلقى"
یعنی "حدیث یا سنت سے مراد وہ قول یا فعل یا تقریر یا جسمانی سراپا یا عادات واخلاق ہیں جن کی نسبت نبی اکرم ﷺ کی طرف ہو۔"
اور اہل حدیث اور محدثین سے مراد وہ سعادت مند گروہ ہے جو عملاً ونقلاً حدیث مصطفیٰ ﷺ کی حفاظت کرتے ہیں۔
چناں چہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
" ونحن لا نعنى بأهل الحديث المقتصرين على سماعه أو كتابته أو روايته، بل نعنى بهم كل من كان احق بحفظه ومعرفته وفهمه ظاهراً وباطناً، واتباعه باطناً وظاهراً." [مجموع فتاوىٰ: ٤/ ٩٥]
(ہم اہل حدیث سے مراد صرف وہ لوگ ہی نہیں لیتے جو احادیث کا سماع کرتے، اسے لکھتے اور روایت کرتے ہیں بلکہ ہمارے نزدیک وہ تمام لوگ اہل حدیث ہیں جو احادیث کو یاد کرتے، ان کے معانی ومطالب سیکھتے اور ان پر عمل کرتے ہیں۔)
علامہ ابن قتیبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
" وأهل الحديث: هم الذين التمسوا الحق من وجهته وتتبّعوه من مظانه، وتقربوا من اللّٰه تعالىٰ باتباعهم سنن رسول الله صلى الله عليه وسلم وطلبهم لآثاره براً وبحراً وشرقاً وغرباً." [تاويل مختلف الحديث، ص: ٨٠]
(اہل حدیث وہ لوگ ہیں جو حق کو اس کے اصل مصدر سے تلاش کرتے اور رسول اکرم ﷺ کی احادیث اور آپ ﷺ کی سنن کو اپنا کر اور بحر وبر اور مشرق ومغرب سے آپ کی سنت اور حدیث کو تلاش کرنے کی جدوجہد کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتے ہیں۔)

عقیدہ اصفہانیہ میں ہے:

"وأهل الحديث هم المتبعون لصحابة رسول الله (ﷺ) فهم أهل الآثار النبوية وهم أهل الحديث والسنة العاملون بطريقهم (الصحابة) وهم اهل العلم بالكتاب والسنة فى كل عصر ومصر وهم افضل الخلق من الأوّلين والآخرين ." [العقيدة الاصفهانيه: ۱/ ۱۵۶]

(اہل حدیث صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر چلنے والے اور نبی اکرم ﷺ کی احادیث مبارکہ کی حفاظت کرنے والے، اور ہر دور میں اور ہر مقام پر کتاب وسنت کا علم رکھنے والے ہیں۔ یہ کائنات کے بہترین لوگ ہیں۔)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

" وأهل الحديث هم الفرقة الناجية فمن لم ينج باتباع الحديث فبما ينجو؟ احق الناس بأن تكون هى الفرقة الناجية اهل الحديث والسنة الذين ليس لهم متبوع يتعصبون له الا رسول الله (ﷺ) " [مجموع الفتاوىٰ: ۳/ ۳۴۷]

(اہل حدیث ہی فرقہ ناجیہ ہیں، کیوں کہ اگر کوئی حدیث رسول مقبول ﷺ پر عمل پیرا ہو کر نجات حاصل نہیں کرسکتا تو پھر کس چیز کے ذریعے سے نجات حاصل کرے گا؟ لہٰذا فرقہ ناجیہ ہونے کے سب سے زیادہ حق دار اہل حدیث ہیں کہ جن کے امام ومطاع، جن کی اتباع پر وہ مر مٹنے کے لیے تیار ہوتے ہیں وہ صرف اور صرف رسول اللہ ﷺ ہیں۔)

مذکورہ اقوال کی روشنی میں بالکل واضح ہے کہ ہر دور میں علمائے امت کے نزدیک "اہل حدیث" یا "محدثین" ان لوگوں کو کہا جاتا رہا ہے جو کہ حدیث مصطفیٰ کو پڑھتے، پڑھاتے، روایت کرتے، ان کی تحقیق کرکے صحیح وضعیف کو الگ الگ کرتے اور احادیث صحیحہ کے مطابق عمل کرتے ہیں، اور ہر دو میں "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول" ان کا شعار اور طرۂ امتیاز رہا ہے۔

کسی کا ہو رہے کوئی نبی ﷺ کے ہو رہیں گے ہم

اہل حدیث کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ حدیث پاک کی ہے۔ مدرسہ نبویہ (اصحاب صفہؓ) سے لے کر ہر دور میں خدام قرآن وحدیث موجود رہے ہیں کیوں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

" يحمل هذا العلم من كل خلفٍ عدوله ." [السلسة الصحيحه: ۱/ ۵۴۵]

(یعنی قابل اعتماد اور ثقہ لوگ اس عمل کو پڑھتے اور پڑھاتے اور آگے پہنچاتے رہیں گے۔)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" لا تزال طائفة من اُمّتي على الحق ظاهرين لا يضرّهم من يخذلهم حتى يأتي

امر اللّٰہ ." [ترمذی حدیث نمبر ۲۱۵۵]
(میری امت میں سے ایک گروہ قیامت تک حق پر قائم رہے گا، ان کو پریشان کرنے والے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔)
امام ترمذی فرماتے ہیں کہ علی ابن مدینی رحمہ اللہ نے فرمایا: "هم أهل الحديث" یہ گروہ (اہل حدیث کا ہے۔)
حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: "اہل حدیث ہی طائفہ منصورہ ہے۔ اگر حدیث پر عمل کرنے والے طائفہ منصورہ نہیں تو اور کون ہوں گے؟ اور پھر امام احمد رحمہ اللہ کا قول نقل فرماتے ہیں کہ انھوں نے طائفہ منصورہ کے بارے میں فرمایا:

" ان لم يكن هم اصحاب الحديث فما أدري من هم؟ "

[فتح الباری: ۱/ ۸۵]

(اگر یہ لوگ اہل حدیث نہیں تو پھر مجھے نہیں معلوم اہل حدیث کون ہیں؟)
علومِ نبوت کے وارث محدثین حضرات نے چمنستانِ حدیث کی رونق بحال رکھنے اور علم حدیث کی شمع کو فروزاں کرنے کے لیے اس دور میں جب وسائل کی کمی تھی اور سہولیات ناپید تھیں علم دین کے حصول کے لیے ہزاروں میل کی مسافتیں طے کیں، انھوں نے لق ودق صحرا، خار دار جنگل اور فلک بوس پہاڑوں کی چوٹیوں کو سر کیا۔ اگر ان کو معلوم ہوا کہ سمندر پار کسی کے پاس رسولِ اکرم ﷺ کا فرمان موجود ہے تو وہ سمندر کا سینہ چیر کر وہاں تک جا پہنچے اور سند عالی کے حصول کے لیے لمبی لمبی مسافتیں طے کیں، کتب سیر ورجال ان قابل رشک لوگوں کے تذکار جمیل اور حسین کارناموں سے بھری ہوئی ہیں۔ ان کا امت مسلمہ پر عظیم احسان ہے کہ انھوں نے صحیح دین امت تک پہنچانے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردیں اور دنیا کے عیش وآرام کو تج کر جہاں ہزاروں لوگوں کے لیے صراطِ مستقیم کو واضح کیا اور دنیا میں نسبت حدیث کے شرف عالی سے متعارف ہوئے وہاں اُخروی سعادتوں سے بھی بہرہ ور ہوئے۔ ہم تحدیث نعمت کے طور پر کہتے ہیں کہ ہمیں ان کی طرف نسبت پر فخر ہے۔

اولئک آبائی فجئنی بمثلهم   اذا جمعتنا یا جریر المجامع

امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والتسلیم پر اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ اس نے اس امت کو "سند" جیسی امتیازی خوبی سے نوازا ہے تاکہ صدق وکذب اور حق وباطل میں تمیز ہو سکے۔ "سند" متن کو بیان کرنے والے سلسلۂ رجال کو کہا جاتا ہے۔ محدثین کرام رحمہم اللہ نے قرآنی اصول کو مدنظر رکھا۔

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا ﴾ [الحجرات:٦]

(اے ایمان والو! اگر تمھارے پاس کوئی مجہول العدالت شخص خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کرلیا کرو۔)

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چوں کہ بالاتفاق عدول وثقات ہیں اور وحی الٰہی کے اوّلین شاہد اور روایت حدیث میں حد درجہ محتاط تھے اس لیے ان سے بلا تردّد روایات لی جاتی تھیں کیوں کہ انھوں نے براہِ راست وہ روایات رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنیں اور باہتمام ان کو حفظ کیا اور کمال احتیاط اور دیانت وامانت سے آگے پہنچایا۔ چناں چہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''ہم تقریباً ساٹھ آدمی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں احادیث سکھاتے، پھر جب آپ تشریف لے جایا کرتے تو ہم آپس میں مذاکرہ کیا کرتے تھے اور جب ہم فارغ ہوتے تو وہ احادیث مبارکہ ہمارے دلوں پر نقش ہوچکی ہوتی تھیں۔'' ((الفقیه والمتفقه))

جب سلسلۂ روایت حدیث صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے آگے بڑھا تو ساتھ ہی روایت حدیث کے بارے میں تحقیق اور چھان بین شروع ہوگئی: چناں چہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

" انا كنا مرة اذا سمعنا رجلا يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم أبتدرته أبصارنا، واصغينا اليه بآذاننا، فلما ركب الناس الصعب والذلول لم ناخذ من الناس الا ما نعرف ." [مقدمه صحيح مسلم]

امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ (م ۱۱۰ھ) فرماتے ہیں:

" الاسناد من الدين ولولا الاسناد لقال من شآء ما شآء ."

(اسناد دین کا حصہ ہے اور اگر سند کا اہتمام نہ ہوتو جس کے جی میں جو آتا کہتا پھرتا۔)

تحقیق سند اور صحت روایت کا اہتمام کرنے کی غرض سے محدثین کرام نے جس قدر محنت اور کاوش کی آج اسماء الرجال اور جرح وتعدیل کی کتابیں اس کی شاہد عدل ہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر اسپرنگر لکھتا ہے:

''صرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات وواقعات جمع اور فراہم کرنے کے لیے مسلمان مصنفین اور محققین نے پانچ لاکھ آدمیوں کے سوانحی حالات وواقعات مرتب اور مدوّن کیے۔''

[اسلامی انسائیکلو پیڈیا، ص:۲۱۱]

اسی لیے جب حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ سے موضوع روایات کے خطرات اور اثراتِ بد کے خدشات کا ذکر کیا گیا تو انھوں نے فرمایا تھا: ''تعيش لها الجهابذة'' کہ ماہرین علوم حدیث اس کا سد باب کرلیں گے۔

یہ خدمت علوم نبوت کے سلسلے میں وہ سعی مشکور اور عظیم کاوش ہے جس کے بارے میں امام حاکم فرماتے ہیں:

" لولا الاسناد وطلب هذه الطائفة (اهل الحديث) له وكثرة مواظبتهم على حفظه لدرس منار الاسلام ." [معرفة علوم الحديث، ص:٦]

(اگر سند نہ ہوتی اور اہل حدیث اس کا خصوصی اور باقاعدہ اہتمام نہ کرتے تو آج دین اسلام کا حلیہ بگڑ چکا ہوتا۔)

اور بقول مولانا الطاف حسین حالی رحمہ اللہ

گروہ ایک جو یا تھا علم نبی کا
لگایا پتا جس نے ہر مفتری کا
نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذب خفی کا
کیا قافیہ تنگ ہر مدعی کا
کیے جرح و تعدیل کے وضع قانون
نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسون

اگر صحیح حدیث کی تعریف پر ہی غور کرلیا جائے تو ان نابغہ روزگار اور عبقری شخصیات کے ذہن رسا اور بالغ نظری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے صدیوں پہلے صحتِ روایات کے لیے جو معیار مقرر کیا تھا آج تک کوئی شخص کسی بات کو پرکھنے کے لیے اس سے بہتر معیار اور پیمانہ پیش نہیں کرسکا۔ انھوں نے صحیح حدیث کے لیے پانچ شرطیں مقرر کیں کہ صحیح حدیث وہ ہے:

" ما اتصل سنده بنقل العدل الضابط عن مثله الى منتهاه غير معلل ولا شاذ."

یعنی" ① اتصال سند ② عدالت ③ ضبط تام ④ عدم علت ⑤ عدم شذوذ۔"

اس سے بڑھ کر سخت اور کڑا معیار کیا ہوسکتا ہے؟ اس لیے جہاں وہ روایت حدیث کی برکات اور اجر وثواب کو جانتے تھے وہاں رسولِ اکرم ﷺ کا فرمان "من كذب على متعمدا فليتبوأ مقعده من النار" بھی ان کے پیش نگاہ تھا۔ اس لیے انھوں نے حدیث پاک کے تحمل واداء میں انتہائی احتیاط سے کام کیا اور اس ذمہ داری کو بڑی جاں فشانی سے نبھایا۔

آج ہمارے پاس تلقی بالقبول کا شرف حاصل کرنے اور علمائے امت سے اُصح الکتب بعد کتاب اللہ کا خطاب پانے والی صحیح بخاری، اور امام مسلم کی صحیح مسلم اور دیگر کتب صحاح موجود ہیں تو یہ انھی نفوسِ قدسیہ کی محنت وکاوش کا ثمرہ اور نتیجہ ہیں۔ جزاهم الله عنا وعن الاسلام خير الجزاء

علماے برصغیر پاک وہند کی خدمات حدیث:

برصغیر پاک وہند کے علماے اہل حدیث نے علومِ نبوت کی ترویج واشاعت اور حفظ وصیانت کے لیے جو خدمات سرانجام دی ہیں وہ تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔ باوجود حجاز مقدس سے علاقائی بعد اور لسانی تفاوت کے اور باوجود نامساعد حالات اور تقلید جامد میں جکڑے ہوئے ماحول کے انھوں نے دیار ہند میں علومِ نبوت کی شمع کو فروزاں کرنے کے لیے تن، من، دھن قربان کردیا اور مسند علم وفضل اور دعوت وعزیمت کے مقام پر آفتاب بن کر چمکے جس کی ضیا باری سے ایک عالم مستفیض ومستفید ہوا۔ اس حقیقت کا اعتراف عرب علما نے بھی کھلے دل سے کیا۔ چناں چہ علامہ رشید رضا مصری لکھتے ہیں:

"ولو لا عناية اخواننا علماء الهند بعلوم الحديث في هذا العصر لقضى عليها بالزوال من امصار الشرق فقد ضعفت في مصر والشام والعراق والحجاز منذ القرن العاشر حتى بلغت منتهى الضعف في آوائل القرن الرابع عشر ."

[مقدمه مفتاح كنوز السنة]

(اگر ہمارے برادران علماے اہل حدیث ہند کی توجہ علومِ حدیث کی جانب نہ ہوتی تو مشرقی ممالک سے علم حدیث اٹھ چکا ہوتا جیسا کہ دسویں صدی ہجری ہی سے ملک مصر، شام، عراق اور حجاز سے علوم حدیث کا سلسلہ کمزور پڑنا شروع ہوا، یہاں تک کہ چودھویں صدی میں اس کی کمزوری انتہا کو پہنچ گئی۔)

علامہ عبدالعزیز خولی فرماتے ہیں: "عصر حاضر میں ہمارے برادر ہندوستانی علماے حدیث نے جس قدر علوم حدیث کا اہتمام کیا ہے باقی اسلامی ممالک میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان میں حفاظ حدیث بھی ہیں اور اس کی تدریس کا وہی طرز موجود ہے جو تیسری صدی میں اسلاف کا طرز تدریس تھا یعنی آزادئ فکر، تحقیق سند کا اہتمام اور اسی طرح عمدہ وقیمتی کتب کی طباعت وغیرہ۔"

[مقدمہ مرعاۃ المفاتیح، ص:۴۰]

آج بھی طرزِ سلف صالحین پر قائم اہل حدیث مدارس اور ان میں محدثانہ طرز پر علوم نبوت کی تعلیم وتدریس اہل حدیث کے اہتمام میں بعلوم الوحی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

برصغیر پاک وہند کے علمائے اہل حدیث کی یہی گراں قدر خدمات جو ابھی تک تشنۂ تصنیف اور قابل اشاعت تھیں انھی کو خادم العلم والعلماء اور مسلک محدثین کے ترجمان معروف صاحب قلم محترم مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب (متعنا اللہ بطول حیاتہ) نے "دبستان حدیث" کے نام سے ایک مبنی

برحقائق علمی معلومات کا خزینہ اور اپنے قابل فخر اکابر کا تعارف انتہائی خوب صورت اور دلآویز اسلوب نگارش میں پیش کر کے اہل حدیث کے ذمے واجب الادا قرض کو چکا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس عظیم خدمت کو شرفِ قبولیت سے نوازے، آمین۔

اس عظیم سعادت کے حصول پر ہم محترم مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب کو دل کی گہرائیوں سے ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔ اور لجنۃ القارۃ الہندیہ کے رئیس ابوخالد فلاح المطیری ﷾ کے بے حد شکر گزار ہیں کہ جن کی سرپرستی اور محترم مولانا عارف جاوید محمدی کی خصوصی دلچسپی سے تاریخ اہل حدیث کا تیسرا مجموعہ ہمارے سامنے ہے۔

بھٹی صاحب نے تاریخ اہل حدیث کے پہلے مجموعے میں برصغیر میں اہل حدیث کی آمد کا تفصیل سے تذکرہ کیا، اہل حدیث کا تعارف کرایا اور اہل حدیث کے نقطۂ نظر کو دلائل کے ساتھ واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔

دوسرے مجموعے (برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن) میں ان اہل حدیث حضرات کے حالات تحریر کیے، جنھوں نے برصغیر میں بولی جانے والی کسی بھی زبان (اردو، انگریزی، فارسی، پنجابی، سرائیکی، پشتو، بنگلہ، سندھی، ہندی اور بلوچی) میں قرآنِ مجید کے ترجمے کیے اور اس کی تفسیریں لکھیں۔ سات سو صفحات کی اس ضخیم کتاب میں اہل حدیث کی تاریخ کے اس بنیادی گوشے کی نہایت خوب صورت اسلوب میں وضاحت کی گئی ہے۔

تیسرا مجموعہ ''دبستانِ حدیث'' کے دل کش نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں اہل حدیث کی ان خدمات کو اجاگر کیا گیا ہے، جو برصغیر کے علمائے اہل حدیث نے حدیث کے سلسلے میں تصنیفی اور تدریسی صورت میں سرانجام دیں۔ یہ بھی ایک ضخیم کتاب ہے۔

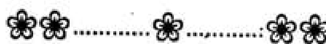
چوتھا مجموعہ ''گلستانِ حدیث'' کے نام سے تکمیل کی منزل طے کر رہا ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ بھٹی صاحب کو اس کے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق مرحمت فرمائے اور اس سلسلے میں ہر نوع کا تعاون کرنے والوں کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

خادم العلم والعلماء

عبدالخالق بن محمد صادق، کویت

۳۔ نومبر ۲۰۰۷ء



حرفے چند

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کتاب ''دبستانِ حدیث'' مکمل ہوئی۔ اس کتاب میں برصغیر کے ان ساٹھ اہل حدیث علمائے کرام کا تذکرہ کیا گیا ہے، جنھوں نے نبی ﷺ کی احادیث مبارکہ کی تدریسی یا تصنیفی صورت میں تبلیغ واشاعت کا اہتمام کیا یا کسی مدرسے میں طلبا کو کتب حدیث پڑھائیں یا حدیث کی کسی کتاب کا ترجمہ کیا یا اس کی شرح لکھی یا فتویٰ نویسی کی۔

ان ساٹھ حضرات میں سب سے پہلے حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کے حالات ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں اور یہی سب سے زیادہ صفحات پر محیط ہیں۔

ان کے بعد اس کتاب میں حضرت میاں صاحب کے بے شمار شاگردوں میں سے گیارہ ذی مرتبت تلامذہ کا تذکرہ کیا گیا ہے، جن میں مولانا شمس الحق عظیم آبادی، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری اور مولانا محمد بشیر سہسوانی شامل ہیں۔

ان حضرات کے علاوہ چوبیس اصحابِ فضیلت اور ہیں جو عمر بھر تدریس یا تصنیف کی صورت میں خدمت حدیث میں مصروف رہے۔ ان میں عالی جناب نواب صدیق حسن خاں، مولانا عبدالقادر لکھوی، مولانا عطاء اللہ لکھوی، مولانا محمد یونس دہلوی، مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی، مولانا عبدالحق ہاشمی، مولانا عبدالغفار ضامرانی، مولانا علی محمد سعیدی، مولانا عبدالغفور جہلمی جیسی شخصیات خاص طور سے لائق تذکرہ ہیں۔

خادمین حدیث کی اس رفیع القدر جماعت میں چوبیس موجودین کے اسمائے گرامی شامل ہیں جن میں سے چند یہ ہیں: مولانا محمد رفیق اثری، مولانا محمد علی جانباز، مفتی عبید اللہ خاں عفیف، مولانا عبدالرشید مجاہد آبادی، حافظ صلاح الدین یوسف، حافظ عبدالستار حماد، مولانا صلاح الدین مقبول احمد، مولانا ابوالاشبال احمد شاغف، مولانا عبدالسلام رحمانی اور مولانا عبداللہ امجد چھتوی ......!

اس سے قبل ''برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن'' کے نام سے اس فقیر کی ایک ضخیم کتاب جو سات سو صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے، خوانندگانِ محترم کے مطالعہ میں آچکی ہے۔ اس میں برصغیر کے ۱۸۵ خادمین قرآن کے حالات بیان کیے گئے ہیں، جنھوں نے اردو، فارسی، عربی، انگریزی، پشتو، ہندی، سندھی، بنگلہ، بلوچی، پنجابی، سرائیکی زبانوں میں بہ صورت نظم یا نثر قرآن کی تفسیر لکھی یا اس کا ترجمہ کیا یا اس پر حواشی تحریر کیے۔ پورے قرآن کے یا اس کے کچھ حصے کے......!

مدت سے یہ تمنا دل میں کروٹ لے رہی تھی کہ برصغیر کے خادمانِ حدیث کا تذکرہ بھی اسی طرح تفصیل سے کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تمنا بھی کسی حد تک پوری فرمادی، **الحمد لله علی ذلک حمداً کثیراً**۔

''کسی حد تک'' کا مطلب یہ ہے کہ ''دبستانِ حدیث'' کے نام سے ایک جلد پایہ تکمیل کو پہنچ گئی ہے جو پونے سات سو صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں ہر خادمِ حدیث کی خدمات کے ساتھ اس کے حالاتِ زندگی بیان کیے گئے ہیں، اس کا خاندانی پس منظر معرضِ تحریر میں لایا گیا ہے، اس کے اساتذہ کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس کی معاشرتی زندگی سے قارئین کو آگاہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کے شاگردوں کے ناموں اور ان کی علمی سرگرمیوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے نیز اس کی اولاد کے بارے میں بھی معلومات بہم پہنچانے کی سعی کی گئی ہے۔ یعنی اس طرح ہر خادم حدیث کے واقعات حیات حوالۂ قرطاس کردیے گئے ہیں، تاکہ آئندہ کوئی شخص اس موضوع پر لکھنا چاہے تو آسانی سے ضروری کوائف اس کے سامنے آجائیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی عرض کردوں کہ یہ کام بہت مشکل ہے اور بہت پھیلا ہوا ہے۔ یہ صرف ایک جلد ہے، دوسری جلد ان شاء اللہ العزیز ''گلستانِ حدیث'' کے نام سے پیش خدمت کی جائے گی۔ اس کا آغاز کردیا گیا ہے۔ لیکن کام پھر بھی ختم نہیں ہوگا۔ خادمانِ حدیث کی تعداد ماشاء اللہ اتنی وسیع ہے کہ کوئی شخص اس کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ **وما یعلم جنود ربک الا هو**

''دبستانِ حدیث'' کی طرح ''گلستانِ حدیث'' میں بھی ان شاء اللہ برصغیر کے مرحومین وموجودین علمائے اہل حدیث کے حالات قلم بند کیے جائیں گے۔ اس میں حضرت میاں صاحب کے بعض مشہور تلامذہ کا تذکرہ بھی آئے گا۔ ہوتا تو وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے، لیکن میرا ارادہ یہ ہے کہ کتاب جلد از جلد مکمل کردی جائے۔

ہر شخص اپنے انداز میں کام کرتا ہے اور ہر لکھنے والے کا اپنا اسلوب تحریر ہے۔ میرا بھی ایک اسلوب ہے، کسی کو اس سے اتفاق ہوگا اور کسی کو اختلاف۔ میں سب کا شکر گزار ہوں۔

یہ فقیر اپنے محدود سے دائرے میں رہتے ہوئے برصغیر کی اسلامی اور علمی تاریخ سے دلچسپی رکھتا ہے، جس میں قدرتی طور پر اہل حدیث کو اوّلیت حاصل ہے۔ چناں چہ اس موضوع پر میری چند کتابیں چھپ چکی ہیں جو قارئین کرام کے مطالعہ میں آئیں۔ وہ کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:

① ......فقہائے ہند: یہ کتاب دس جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی صدی ہجری سے لے کر تیرھویں صدی ہجری تک کے ہزاروں علما وفقہا کی زندگی اور ان کی علمی تگ ودو کا تذکرہ اس کتاب میں آگیا ہے۔ اس میں برصغیر (پاکستان اور ہندوستان) کے تمام فقہی مسالک (اہل حدیث، حنفی، شافعی، مالکی،

حنبلی اور شیعہ) اصحابِ علم کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ سلسلہ فقہائے ہند کی اشاعت ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے ہوئی تھی۔

②...... برصغیر میں اسلام کے اوّلیں نقوش: یہ کتاب ان صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے حالات پر مشتمل ہے جو برصغیر میں تشریف لائے۔ یہ کتاب بھی ادارہ ثقافت اسلامیہ نے شائع کی۔

③...... نقوشِ عظمت رفتہ: اس کتاب میں اکیس جلیل القدر علما مثلاً حضرت حافظ محمد گوندلوی، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اور دیگر متعدد حضرات کے مفصل حالات ضبطِ تحریر میں لائے گئے ہیں۔ یہ کتاب مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور نے شائع کی۔ صفحات ۶۴۰۔

④...... بزمِ ارجمنداں: اس میں حضرت حافظ عبداللہ روپڑی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد علی لکھوی، مولانا عبدالمجید سوہدروی اور بعض دوسرے انیس مرحومین وموجودین کے واقعاتِ حیات خاصی تفصیل سے آگئے ہیں۔ اسے بھی مکتبہ قدوسیہ لاہور نے شائع کیا۔ صفحات ۶۳۰۔

⑤...... کاروانِ سلف: یہ کتاب پہلی مرتبہ ۲۰۰۳ء میں چھپی۔ مولانا عبدالوہاب دہلوی، حافظ عبدالستار دہلوی، مولانا عبداللہ لائل پوری اور حافظ عبداللہ بہاول پوری وغیرہ بائیس اصحابِ علم کے کوائف حیات اور ان کی علمی مساعی کے تذکار اس کتاب میں صراحت سے لکھے گئے ہیں۔ ۵۱۰ صفحات کی یہ کتاب مکتبہ اسلامیہ اردو بازار، لاہور کی طرف سے چھپی۔

⑥...... قافلہ حدیث: یہ چھبیس اہل حدیث علمائے عالی قدر کے حالات کا مجموعہ ہے۔ شائع کردہ مکتبہ قدوسیہ، لاہور۔ صفحات ۶۴۵

⑦...... قصوری خاندان: یہ کتاب برصغیر کے اس مشہور علمی اور سیاسی خاندان کے حالات پر مشتمل ہے، جن سے مولانا ابوالکلام آزاد بے انتہا قلبی تعلق رکھتے تھے۔ اس خاندان کی شرافت ونجابت کی بنا پر مولانا آزاد اسے ''خاندان سعادت قصور'' قرار دیتے ہیں۔ اس کتاب میں مولانا عبدالقادر قصوری اور ان کے فرزندانِ گرامی، مولانا محی الدین احمد قصوری، مولانا محمد علی ایم اے کینٹب قصوری، میاں محمود علی قصوری بار ایٹ لا اور خاندان کے دیگر ارکان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۹۴ء میں میرے مرحوم دوست قاضی محمد اسلم سیف نے مکتبہ تعلیماتِ اسلامی ماموں کانجن (ضلع فیصل آباد) کی طرف سے شائع کی تھی۔ اس کتاب کو برصغیر کے اہل حدیث حضرات کی تاریخ کے ایک اہم باب کی حیثیت حاصل ہے۔

⑧...... ارمغانِ حنیف: یہ کتاب جماعت اہل حدیث کے ممتاز عالم ومصنف مولانا محمد حنیف ندوی کے حالات کا مجموعہ ہے جسے ادارہ ثقافت اسلامیہ نے شائع کیا۔ صفحات ۳۷۱۔

⑨...... برصغیر میں اہل حدیث کی آمد: اپنے موضوع کی یہ ایک منفرد نوعیت کی کتاب ہے، جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ اہل حدیث کوئی فرقہ یا نئی جماعت نہیں بلکہ یہ اصل اسلام ہے۔ برصغیر کے لوگ ابتدائی صدی ہجری ہی میں اس سے آشنا ہوگئے تھے اور ان کا اس خطہ ارض سے تعلق پیدا ہوگیا تھا۔ یہ کتاب مکتبہ قدوسیہ نے شائع کی۔ صفحات ساڑھے تین سو۔

⑩...... برصغیر کے اہل حدیث خدامِ قرآن: یہ ایک بہت بڑی تاریخی دستاویز ہے، جس میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ برصغیر کے کن اہل حدیث حضرات نے کن کن زبانوں میں قرآنِ مجید کا ترجمہ کیا یا اس کی تفسیریں لکھیں۔ یہ کتاب بھی مکتبہ قدوسیہ کی طرف سے چھپی۔ صفحات سات سو۔

⑪...... تذکرہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری: برصغیر کے ممتاز اہل حدیث عالم ومفسر اور سیرت نگار حضرت قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کے حالات میں پانچ سو صفحات پر محتوی یہ کتاب مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور نے ۲۰۰۷ء میں شائع کی ہے۔

⑫......تذکرہ صوفی محمد عبداللہ: ساڑھے چار سو صفحات کی یہ کتاب بھی مکتبہ سلفیہ نے شائع کی ہے۔ اس میں دارالعلوم اوڈاں والا اور جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن کے بانی معروف بزرگ اور مشہور مستجاب الدعوات ولی اللہ صوفی محمد عبداللہ رحمہ اللہ کے حالات وضاحت سے تحریر کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ دارالعلوم سے تعلق رکھنے والے متعدد علمائے کرام کا تذکرہ اس کتاب میں آ گیا ہے۔ مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور سید احمد شہید کی قائم کردہ جماعت مجاہدین کی تاریخ بھی اس میں آ گئی ہے۔ صفحات ساڑھے چار سو۔

⑬...... میاں عبدالعزیز مالواڈہ: لاہور کی ایک نامور شخصیت میاں عبدالعزیز مالواڈہ بار ایٹ لا اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے سیاسی، سماجی اور قانونی کارناموں کی کسی زمانے کے برصغیر میں بڑی دھوم تھی۔ ایک دور تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد لاہور تشریف لاتے تو ان کے مکان پر قیام فرماتے۔ ان کا مکان برصغیر کے بڑے بڑے مسلمان اور ہندو سیاسی رہنماؤں کا مرکز تھا، جن میں گاندھی، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، پٹیل، راجندر پرشاد، مولانا عبدالقادر قصوری، محمد علی جوہر، شوکت علی، حکیم اجمل خاں اور خواجہ حسن نظامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ علامہ اقبال سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ اہل حدیث علما سے میاں عبدالعزیز بے حد تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے دور کی متعدد شخصیتوں کے مقدمات فیس لیے بغیر لڑے، ان میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ظفر علی خاں، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا حافظ محمد گوندلوی کے مقدمات شامل ہیں۔ پھر آزاد ہند فوج کے بعض فوجیوں اور خاکساروں کے مقدمے بھی ان کے سپرد رہے۔ میں نے اس کتاب (تذکرہ میاں عبدالعزیز مالواڈہ) میں ان کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ اس کتاب میں

ان کے سولہ مقدمات درج کیے گئے ہیں۔ وہ پوری ایک صدی کی تاریخ تھے۔ چھ سو صفحات میں پھیلی ہوئی یہ کتاب ''کتاب سرائے اردو بازار لاہور'' نے شائع کی ہے۔ اس کتاب کو برصغیر کے اہل حدیث کی تاریخ کا ایک بڑا جز قرار دینا چاہیے۔

⑭...... میاں فضل حق اور ان کی خدمات: یہ کتاب مرکزی جمعیت اہل حدیث کے سابق ناظم اعلیٰ اور جامعہ سلفیہ کے سابق صدر میاں فضل حق کے حالات میں ہے۔ اس میں برصغیر کی جماعت اہل حدیث کے بہت سے پہلو ضبط تحریر میں آگئے ہیں۔

⑮...... دبستانِ حدیث: یہ کتاب قارئین کے زیر مطالعہ ہے۔ اس میں برصغیر کے ساٹھ علمائے اہل حدیث کی ان سرگرمیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو علومِ حدیث سے تعلق رکھتی ہیں۔

⑯...... ہفت اقلیم: اس میں سات عالی مرتبت شخصیتوں کے سوانح حیات بیان کیے گئے ہیں۔ ناشر مکتبہ قدوسیہ لاہور

تاریخ اہل حدیث کے سلسلے کی ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں کمپوزنگ کے مرحلے سے گزر رہی ہیں۔

①...... آثارِ ماضی: متعدد شخصیات کے حالات زندگی کا مجموعہ۔

②...... محفلِ دانشمنداں: مرحومین کے علاوہ اس میں بعض موجودین بھی شامل ہیں۔ یہ دونوں کتابیں مکتبہ قدوسیہ شائع کر رہا ہے۔

بعض کتابیں زیر تصنیف ہیں، مثلاً:

①...... گلستانِ حدیث، ②...... عربی کے تین ہندوستانی ادیب۔ مولانا عبدالعزیز میمن، مولانا محمد سورتی اور مولانا عبدالمجید حریری۔ اور تیسری کتاب ہے ''تذکرہ مولانا محمد اسماعیل''۔ اس کے علاوہ برصغیر کی جماعت اہل حدیث کے سلسلے کی ایک اور کتاب ہے، جس کی کمپوزنگ ہو چکی ہے۔ صفحات تقریباً تین سو۔

بعض دوستوں کے کہنے سے میں نے گزشتہ دنوں کی ایک چند روزہ فرصت میں خود اپنے واقعاتِ زندگی بھی قلم بند کر لیے ہیں جو غالباً تین سو کے لگ بھگ صفحات پر مشتمل ہوں گے اور کتاب سرائے اردو بازار کی طرف سے شائع کیے جائیں گے۔

الحمدللہ برصغیر میں اہل حدیث کی سیاسی خدمات کا خاکہ بھی ترتیب دے لیا ہے۔

مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ میری اور مطبوعہ کتابیں بھی ہیں، لیکن میں نے صرف ان کتابوں کا ذکر کیا ہے جو برصغیر کی جماعت اہل حدیث کے علما وفضلا کے تذکار اور ان کی تدریسی و تصنیفی تگ وتاز سے تعلق رکھتی ہیں۔

یہ فقیر اہل علم کا خادم اور اصحابِ فضل کا عقیدت مند ہے۔ میرا اصل مشن یہ ہے کہ برصغیر

پاک وہند اور بنگلہ دیش کے علما وفضلا کی علمی سرگرمیوں کو جہاں تک ممکن ہو اجاگر کیا جائے۔ میں کسی عالم شخصیت کا تعارف چند سطروں میں کرانے کا عادی نہیں۔ میری ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ جس صاحب علم کے متعلق لکھا جائے، تفصیل سے لکھا جائے اور اس کی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں کو منقح کرنے کی کوشش کی جائے۔

عمل وحرکت کے مختلف میدانوں میں برصغیر کے اہل حدیث علما نے جو خدمات سرانجام دی ہیں اور دے رہے ہیں، وہ نہایت قابل قدر ہیں۔ اگر اللہ نے توفیق دی اور صحت وعافیت کی نعمت سے نوازے رکھا نیز قلم وقرطاس سے رابطہ رہا تو اپنے اہل علم کی مساعی کو نمایاں کرنے کے لیے ان شاء اللہ ہمیشہ کوشاں رہوں گا اور ان کے زریں کارناموں کو تاریخ کی سلک میں پرونے کی جدوجہد کو اپنا معمول حیات قرار دیے رکھوں گا۔

میں اپنے عزیز دوست مولانا عبدالخالق محمد صادق (کویت) کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ''حدیث اور اہل حدیث'' کے عنوان سے اس کتاب پر مقدمہ لکھا اور قارئین کو مفید معلومات بہم پہنچائیں۔ نیز مولانا عارف جاوید محمدی اور دیگر حضرات کا تہ دل سے ممنون ہوں کہ ان کی کوشش سے کتاب نے اشاعت وطباعت کی مشکل منزلیں طے کیں۔

میری پہلی کتابوں کے سائز کے مطابق یہ کتاب پونے نو سو صفحات پر مشتمل تھی۔ لیکن اس کا سائز کچھ بڑا کردیا گیا ہے، جس کی وجہ سے صفحات گھٹ کر پونے سات سو ہوگئے ہیں۔

آخر میں یہ عرض ہے کہ اپنی کتابوں کی پروف ریڈنگ میں خود ہی کرتا ہوں۔ اس کتاب کی بھی خود ہی کی ہے۔ عین ممکن ہے اتنی ضخیم کتاب میں مجھ سے یا کمپوزر سے کوئی غلطی رہ گئی ہو، اس پر میں قارئین کرام سے معذرت خواہ ہوں۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

بندۂ عاجز
محمد اسحاق بھٹی
اسلامیہ کالونی۔ ساندہ۔ لاہور
فون نمبر: ۷۴۲۳۶۷۷ - ۷۱۴۳۳۶۷۷

۲۰۔ فروری ۲۰۰۸ء
۱۲۔ صفر ۱۴۲۹ھ
بروز بدھ



حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ الکل حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری ان کے ایک لائق شاگرد مولانا فضل حسین بہاری نے لکھی تھی جو ''الحیات بعد الممات'' کے نام سے ۱۹۰۸ء (۱۳۲۶ھ) میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل تھی اور تقسیم ملک کے بعد نایاب تھی۔ ۱۹۵۹ء میں اسے جماعت غرباء اہل حدیث کے مکتبہ شعیب کراچی کی طرف سے شائع کیا گیا جو چھوٹے سائز کے سات سو سے زائد صفحات پر محیط ہے۔ اس مکتبے کے اربابِ اہتمام کو اللہ تعالیٰ جزاء خیر دے کہ جو کتاب کہیں سے میسر نہ تھی، اس کا حصول آسان ہوگیا۔

پھر ۱۹۸۴ء میں مولانا عبدالشکور شاہ اثری نے کوشش کر کے ۱۹۰۸ء (۱۳۲۶ھ) کا اوّلیں مطبوعہ نسخہ کہیں سے حاصل کیا اور اس کا عکس اپنے قائم کردہ اشاعتی ادارے ''المکتبہ الاثریہ'' سانگلہ ہل (ضلع شیخوپورہ) کی طرف سے شائع کردیا جو بہتر کاغذ، عمدہ طباعت اور خوب صورت جلد کے ساتھ خوانندگانِ محترم کے مطالعہ میں آیا۔ حضرت میاں صاحب کے متعلق جن حضرات نے کچھ لکھا، اسی کتاب (الحیات بعد الممات) سے مواد اخذ کر کے لکھا۔ میرے محدود علم کے مطابق ان کے بارے میں یہی اوّلیں ماخذ ہے۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر کوئی قابل ذکر تفصیلی مواد نہیں ہے۔ میرے سامنے اس وقت اس کتاب کے دونوں طبع شدہ ایڈیشن موجود ہیں۔ مکتبہ شعیب (کراچی) والا بھی اور مولانا عبدالشکور شاہ اثری والا بھی۔ اگرچہ اور کتابیں بھی میرے پیش نگاہ ہیں، لیکن حضرت میاں صاحب سے متعلق میں اپنی گزارشات میں زیادہ تر اسی کتاب سے استفادہ کررہا ہوں۔

وطن اور خاندان

آیئے سب سے پہلے حضرت شیخ الکل میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وطن اور خاندان کے بارے میں چند ضروری باتیں ملاحظہ فرمایئے۔

حضرت میاں صاحب کی ولادت ۱۲۲۰ھ (۱۸۰۵ء) میں موضع بلتھوا میں ہوئی جو ہندوستان کے صوبہ بہار کے ضلع مونگیر میں واقع ہے۔ بعد ازاں اس خاندان کے بعض لوگ موضع سورج گڑھ چلے گئے تھے جو بلتھوا سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلۂ نسب چونتیسویں پشت میں بواسطہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور پینتیسویں پشت میں بواسطہ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا ہے۔ حضرت میاں صاحب ننھیال اور دادھیال کی طرف سے نقوی حسینی

سید ہیں۔ آپ کے والد کا اسم گرامی سید جواد علی تھا جو فارسی زبان میں بالخصوص مہارت رکھتے تھے۔

میاں صاحب کا خاندان اس نواح میں علم وفضل میں بھی ممتاز تھا اور دنیوی لحاظ سے بھی اسے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ چھٹے مغل حکمران اورنگ زیب عالم گیر کے عہد سے اس خاندان کے بعض افراد خدمت قضا پر مامور چلے آرہے تھے۔ عہدۂ قضا کی دو سندیں اس خاندان کے بعض افراد کے پاس موجود تھیں۔ ایک بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر کی عطا کردہ سند، جس میں ان کو سورج گڑھ اور بعض دیگر مقامات کے منصب قضا پر فائز کیا گیا تھا اور ایک سند شاہ عالم بادشاہ کی طرف سے جاری کی گئی تھی، اس میں بھی سورج گڑھ اور صوبہ بہار کے بعض دوسرے مقامات کے عہدۂ قضا پر متمکن ہونے کا فرمان مرقوم تھا۔

حصولِ علم کا شوق

ہم میاں صاحب کے عہد طفولیت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اس عہد کا کوئی خاص واقعہ قابل ذکر معلوم نہیں ہوتا۔ اس دور میں ان کا اصل مشغلہ کھیل کود، گھڑ سواری، جمناسٹک اور بھاگ دوڑ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی صحت بہت اچھی تھی، قویٰ مضبوط تھے۔ جفاکشی، محنت، زندہ دلی، دوسروں کی خدمت اور صبر وضبط وغیرہ امور ان کے لوازم حیات قرار پاگئے تھے۔ پڑھنے لکھنے کی طرف کوئی دھیان نہ تھا۔ پندرہ سولہ سال کا ابتدائی زمانہ اسی طرح گزر گیا۔

اب سوال یہ ہے کہ تحصیل علم کی طرف کیوں میلان ہوا اور کب ہوا......؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ میاں صاحب کے والد ماجد کی خدمت میں ایک پڑھا لکھا برہمن آیا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے میاں صاحب سے کہا: ''میاں صاحب زادے؟ تم اتنے بڑے ہوگئے ہو اور پڑھنے لکھنے سے محروم ہو۔ تمھیں پتا نہیں کہ تمھارے خاندان کے تمام لوگ مولوی ہیں اور تم جاہل ہو۔''

برہمن کی اس مختصر اور سیدھی بات نے دل پر اتنا اثر کیا کہ اسی آن دل طلب علم کی طرف مائل ہوگیا اور اس جذبے میں اس قدر تیزی آئی کہ پہلی تمام حرکات سے دست کش ہوگئے اور حصولِ تعلیم کے شوق نے ذہن پر پوری طرح قبضہ کرلیا۔ پہلے والد ماجد سے فارسی پڑھی جنھیں اس علم میں مہارت حاصل تھی۔ تھوڑے عرصے میں یہ مرحلہ طے ہوگیا تو عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھنا شروع کردیں۔

اس وقت وہ عمر عزیز کے سولھویں سال سے نکل کر سترھویں سال میں قدم رکھ رہے تھے اور پڑھنے کے شوق میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہورہا تھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس شوق کی تکمیل کے

لیے کیا صورت اختیار کی جائے۔ کبھی جی چاہتا تھا، یہاں سے بھاگ جائیں اور کسی ماہر علوم استاذ کی خدمت میں حاضر ہوکر یہ شوق پورا کریں، کبھی خیال گزرتا تھا کہ یہیں کہیں یہ مقصد حاصل ہوجائے۔

عظیم آباد کو روانگی

اسی اثنا میں رازداری کے وعدے پر اپنے ایک ہم عمر طالب علم بشیر الدین عرف امداد علی سے مشورہ کیا تو پتا چلا کہ اس کی قلبی کیفیت بھی یہی ہے۔ چند روز کے بعد موقع پاکر رات کے اندھیرے میں دونوں گھر سے نکلے اور کسی طرح عظیم آباد (پٹنہ) جا پہنچے۔ اس شہر کو اس زمانے میں مدینۃ العلم کی حیثیت حاصل تھی۔ وہاں کے محلہ نمو ہیاں میں شاہ محمد حسین کے مکان پر ٹھہرے، جہاں طلبا کی تعلیم اور ان کی ضروریات کی کفالت کا بہت اچھا انتظام تھا۔ طلبا اچھی خاصی تعداد میں ہر وقت وہاں تحصیل علم میں مصروف رہتے تھے۔ میاں صاحب اور ان کے ساتھی بشیر الدین عرف امداد علی ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ء) میں وہاں پہنچے تھے۔ میاں صاحب کم وبیش چھ مہینے وہاں اقامت گزیں رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے وہاں کے اساتذہ سے قرآنِ مجید کا ترجمہ پڑھا اور کتب حدیث میں مشکوۃ شریف پڑھی۔

عظیم آباد سے دہلی کا قصد اور راستے میں قیام

یہاں یہ عرض کردیں کہ حضرت مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور سید احمد شہید تین سو سے کچھ زیادہ آدمیوں کے قافلے کے ساتھ یکم شوال ۱۲۳۶ھ (۲۔ جولائی ۱۸۲۱ء) کو نمازِ عید الفطر پڑھنے کے بعد سفر حج کے ارادے سے رائے بریلی سے روانہ ہوئے تھے۔ وہ ہندوستان کے مختلف شہروں کا چکر لگاتے اور وہاں قیام کرتے ہوئے کئی مہینوں کے بعد پٹنہ (عظیم آباد) پہنچے تھے اور وہاں کے ایک مقام ''گول گھر'' کے سامنے انھوں نے قیام کیا تھا۔ ''لین'' کے میدان میں جمعے کی نماز ہوئی تھی اور مولانا شہید نے وعظ فرمایا تھا۔ میاں صاحب کا ارشاد ہے کہ

> ''ہم اس وعظ اور نماز میں شریک تھے۔ سارا میدان لین کا آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔ پہلی ملاقات سید صاحب اور مولانا شہید سے یہیں پٹنہ میں ہوئی تھی۔'' [1]

معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب اور مولانا شہید کی اس پندرہ روزہ صحبت اور وعظ کی برکت سے میاں صاحب کے دل میں دہلی جانے کا خیال پیدا ہوا۔ کیوں کہ اس وقت حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی زندہ تھے اور دہلی میں تشریف فرما تھے۔ وہ حضرت مولانا شہید کے عظیم القدر خاندان

[1] الحیات بعد الممات، ص:۲۶

کے رکن اعلیٰ اور سید احمد شہید کے مرشد تھے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام اسلامی ممالک میں ان کی فضیلتِ علمی کا شہرہ تھا اور ہر جگہ ان کے فیض یافتگان موجود تھے۔ میاں صاحب کا عازمِ دہلی ہونے کا اصل مقصد حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے حضور زانوے شاگردی تہ کرنا تھا۔

بہر حال ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۲ء) میں میاں صاحب اپنے رفیق سفر امداد علی کی رفاقت میں دہلی کے لیے پٹنہ سے روانہ ہوئے۔ وہاں سے چل کر غازی پور پہنچے تو چند روز وہاں قیام کیا اور مولوی احمد علی چریاکوٹی سے ابتدائی درسی کتابیں پڑھیں۔ مولوی احمد علی کا شمار اس عہد کے مشاہیر علما میں ہوتا تھا۔ غازی پور سے بنارس کا عزم کیا۔ وہاں بھی کچھ مدت قیام رہا۔ بنارس میں نو روپے میں ایک کتاب فروخت کی اور آئندہ سفر کے لیے ایک گھوڑا خریدا۔ بنارس سے الٰہ آباد کو روانہ ہوئے۔ الٰہ آباد میں دریاے جمنا کے کنارے ایک مسجد میں قیام کیا۔ اس مسجد میں چند روزہ قیام کے بعد دائرۂ شاہ محمد اجمل میں فروکش ہوئے۔ وہاں مولوی زین العابدین کا سلسلۂ درس جاری تھا، میاں صاحب نے صرف ونحو کی کتابیں جن میں مراح الارواح، زنجانی، نقود الصرف، شرح مائۃ عامل، مصباح، ضریری اور ہدایۃ النحو وغیرہ شامل ہیں، وہیں الٰہ آباد کے دوران قیام میں پڑھیں۔

پھر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے مستفید ہونے کی نیت سے الٰہ آباد سے دہلی کو روانہ ہوئے۔ وہاں سے چل کر موضع ''کوڑا'' پہنچے جو اعمالِ ضلع فتح پور میں واقع ہے۔ چلتے پھرتے ضلع کان پور میں وارد ہوئے۔ پھر ضلع فرخ آباد کا رخ کرلیا۔ غرض اس طرح اِدھر اُدھر ہوتے ہواتے دوبارہ ضلع کان پور چلے گئے اور موضع خواجہ پھول (تھانہ سکندرہ، تحصیل بھوگنی پور) کے قلعے کے اندر آبادی میں قیام فرمایا۔ وہاں ایک بزرگ خواجہ پھول کا مزار ہے۔ اس کے قریب والی مسجد میں میاں صاحب ٹھہرے اور جانب جنوب کی دیوار کی جھنجریوں پر اپنے دستخط سے یہ الفاظ تحریر فرمائے۔

''بندہ فقیر امروز وارد مسجد ہذا شد۔ عبدہ سید محمد نذیر حسین سورج گڑھی۔ المرقوم فی التاریخ پنجم ماہ رجب المرجب ۱۲۳۸ ہجری۔''

میاں صاحب کے ملنے والے ایک صاحب جناب سید عبدالعزیز (ساکن صمدن ضلع فرخ آباد) تھے۔ کسی زمانے میں وہ تحصیل دار ہوکر بھوگنی پور گئے تو مذکورہ بالا تحریر ان کی نظر سے گزری اور اس کی اطلاع انھوں نے میاں صاحب کو دی۔ میاں صاحب نے ان کو جواب میں لکھا کہ

''میں بھی ایامِ طلب علم میں کوڑا ہوکر تمھارے اسی علاقے سے گزرا تھا۔ تم نے لکھا ہے کہ ''موضع خواجہ پھول کے قلعہ کی مسجد میں کوئی یادداشت ورودِ فقیر کی بقلم فقیر تحریر ہے''، بے شک ہوگی۔ ذرا اس کو کسی وقت پڑھ کر نقل کرلینا جس سے ماہ وسن وغیرہ دریافت کرلینے سے تم کو انتباہ ہوگا۔ میں ایک ٹٹو پر تھا۔ ایک طالب علم بھی میرے ساتھ

تھے۔ ❶ شوقِ کتاب بینی اس وقت زیادہ تھا اور تمھاری طرح غصہ وری اور جلد بازی بھی مجھ میں زیادہ تھی۔ اب کیا ہے۔ فقیر ٹھنڈا ہوگیا۔ تم بھی زیادہ عمر پاؤ گے، عیال کا بوجھ زیادہ ہوگا، سب این وآن طاق پر رکھی جائے گی۔" ❷

دہلی میں آمد اور تحصیل علم میں مشغولیت

غرض اس علاقے سے رخصت ہوکر حضرت میاں صاحب آہستہ آہستہ سفر کرتے اور مختلف مقامات میں قیام کرتے ہوئے ۱۳؍ رجب ۱۲۴۳ھ مطابق ۳۰۔ جنوری ۱۸۲۸ء کو بدھ کے دن دہلی پہنچے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ وطن سے وہ ۱۲۳۷ھ میں روانہ ہوئے تھے اور دہلی ۱۲۴۳ھ میں پہنچے۔ یہ چھ سال کی مدت بنتی ہے اور یہ بہت بڑی مدت ہے۔ اس کا تذکرہ وہ خود ہی کرتے ہیں۔

دہلی میں وہ سب سے پہلے مولوی محمد شجاع الدین مرحوم مفتی اوّل کے مکان پر فروکش ہوئے۔ وہاں ان کے ایک ہم وطن پہلے سے اقامت گزیں تھے، س کا ذکر وہ اپنی ایک تحریر میں فرماتے ہیں۔ ❸

"ہم وطن" سے مراد ظاہر ہے کہ مولوی امداد علی صاحب ہیں۔ پندرہ روز میاں صاحب مولوی محمد شجاع الدین صاحب کے مکان پر رہے، اس کے بعد کٹرہ پنجابیاں مسجد اورنگ آبادی میں مولانا عبدالخالق دہلوی (متوفی ۱۲۶۱ھ) کی خدمت میں حاضر ہوکر تحصیل علومِ درسیہ میں مشغول ہوگئے۔ ❹

چند ضروری باتیں

اب آئندہ سطور میں دہلی میں میاں صاحب کے حصولِ علم سے متعلق چند ضروری باتیں ملاحظہ فرمائیے۔

---

❶ اس سے غالباً وہی ہم سفر بزرگ مولوی امداد علی صاحب سورج گڑھی مراد ہیں۔ یہاں تک ان کا میاں صاحب کے ساتھ رہنا ثابت ہوتا ہے۔

❷ الحیات بعد الممات، ص:۳۰

❸ ملاحظہ ہو الحیات بعد الممات، ص:۳۱، ۳۲۔

❹ سرسید احمد خاں مرحوم مسجد اورنگ آبادی کے متعلق اپنی مشہور کتاب "آثار الصنادید" میں لکھتے ہیں: "پنجابی کٹرہ ایک مکان تھا، مسکن سوداگروں کا اور اس میں اکثر پنجابی سوداگر اترا کرتے تھے، اس نسبت سے پنجابی کٹرہ مشہور ہوگیا ہے۔ اس کٹرہ میں یہ مسجد ہے۔ مصفا اور دل ربا، نری سنگ مرمر سرخ کی کہ اس کی خوبی اور خوش نمائی بیان سے باہر ہے، اور ایسی نیک نیت بیگم نے بنائی ہے کہ اب تک آباد ہے اور مولوی عبد الخالق صاحب اور مولوی محمد نذیر حسین اسی مسجد میں درس وتدریس فرماتے ہیں اور دن رات قال اللہ وقال الرسول کا ذکر رہتا ہے۔"

سرسید کی یہ سطور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل کی رقم کردہ ہیں۔ اس کے بعد تو انگریزوں نے اس خوب صورت مسجد کو مسمار کرکے دہلی کے ریلوے اسٹیشن میں شامل کردیا تھا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے ۷۔شوال ۱۲۳۹ھ (۵۔جنوری ۱۸۲۴ء) کو ہفتے کے روز وفات پائی اور میاں صاحب ان کی وفات سے تین برس نو مہینے پانچ روز بعد دہلی پہنچے یعنی شدید تمنا کے باوجود حضرت شاہ صاحب کے حلقۂ شاگردی میں شریک نہ ہوسکے۔ ان کی دہلی میں تشریف آوری کے وقت شاہ صاحب کے نواسے حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب ان کی مسند درس پر متمکن تھے اور بہت سے حضرات ان سے مستفید ہو رہے تھے۔ دہلی میں اور بھی حلقہ ہائے تدریس قائم تھے، جہاں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگرد یا ان کے شاگردوں کے شاگرد خدمت تدریس انجام دے رہے تھے۔

ورودِ دہلی کے وقت حضرت میاں صاحب کی علمی استعداد بہت کم تھی۔ ہم پہلے پڑھ آئے ہیں کہ انھوں نے قیام پٹنہ کے وقت کتب احادیث میں سے مشکوٰۃ شریف پڑھی تھی اور علم نحو میں ان کی استعداد ہدایۃ النحو تک تھی یا پھر قرآنِ مجید کا ترجمہ پڑھا تھا۔ یہ محدود علمی قابلیت انھیں براہِ راست حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے حلقۂ درس میں شمولیت سے مانع تھی۔ اس لیے انھوں نے پنجابی کٹرہ کی مسجد اورنگ آبادی کو اپنا مسکن قرار دیا۔ اس مسجد کے متولی یا منتظم اس وقت مولانا سید عبدالخالق تھے جو شاہ عبدالقادر صاحب اور شاہ محمد اسحاق صاحب کے شاگرد تھے۔ میاں صاحب نے مولانا عبدالخالق صاحب سے حصول علم کا سلسلہ شروع فرمایا اور کافیہ، قطبی، مختصر معانی، شرح وقایہ، نور الانوار اور حسامی وغیرہ کتابیں مولانا ممدوح سے پڑھیں۔

اساتذہ کرام

مولانا عبدالخالق کے علاوہ میاں صاحب نے مسجد اکبر آبادی میں مندرجہ ذیل اساتذہ کرام سے مندرجہ ذیل کتابوں کی تکمیل فرمائی۔

مولانا اخوند شیر محمد قندھاری سے شافیہ، اصولِ اکبری، شرح کافیہ ملا جامی مع حاشیہ عبدالغفور، زواہد ثلاثہ، صدرا، شمس بازغہ کتابیں پڑھیں۔ مولانا اخوند شیر محمد قندھاری نے ۱۲۵۷ھ میں وفات پائی۔ انھوں نے صحیح بخاری اور تفسیر بیضاوی کا درس مولانا اسماعیل شہید کی رفاقت میں شاہ عبدالقادر صاحب سے لیا تھا۔

اپنے عہدے کے معروف ماہر معقولات جلال الدین ہروی سے میاں صاحب نے شرح سلّم، حمد اللہ، قاضی مبارک اور شرح مطالع پڑھیں جو اپنے موضوع کی نہایت اہم اور مشکل ترین کتابیں ہیں۔

مولوی کرامت علی اسرائیلی سے مطول، توضیح تلویح، مسلم الثبوت، تفسیر بیضاوی اور تفسیر کشاف (تا سورہ نساء) پڑھیں۔

مولوی محمد بخش عرف تربیت خاں اس عہد کے مشہور مہندس تھے۔ حضرت میاں صاحب نے ان کے سامنے کتب ریاضیہ یعنی خلاصۃ الحساب، توشجی، تشریح الافلاک، شرح چغمنی وغیرہ کتابوں کے لیے زانوے ادب تہہ کیے۔

مولانا عبدالقادر رام پوری سے مقاماتِ حریری اور حمیدی پڑھیں اور کچھ حصہ متنبی کا پڑھا۔ احادیث کی مختلف کتابوں کا درس بھی ان سے لیا۔

میاں صاحب کے ایک استاد ملا محمد سعید پشاوری تھے، لیکن یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ ان سے کس موضوع کی کون کون سی کتابیں پڑھیں۔

مولوی حکیم نیاز احمد سہسوانی بہت بڑے عالم، اپنے زمانے کے عامل بالحدیث بزرگ اور ماہرِ طب تھے۔ میاں صاحب کو ان سے علم طب میں نفیسی اور معقولات میں ملا حسن پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

حضرت میاں صاحب ۱۳۔ رجب ۱۲۴۳ھ (۳۰۔ جنوری ۱۸۲۸ء) کو واردِ دہلی ہوئے تھے اور ۱۲۴۶ھ کے آخر (جون ۱۸۳۱ء) میں تقریباً ساڑھے تین برس میں تمام علومِ رسمیہ سے فارغ ہوگئے تھے اور جو علوم وفنون اس وقت مدارس میں پڑھائے جاتے تھے، وہ پڑھ لیے تھے۔ اب انھوں نے پوری توجہ تفسیر وحدیث اور فقہیات کی تحصیل کی طرف مبذول فرمائی تھی۔

حضرت شاہ محمد اسحاق کے حلقہ شاگردی میں

پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ میاں صاحب کا دہلی آمد کا اصل مقصد حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے تحصیل علم کرنا تھا، لیکن حضرت شاہ صاحب ان کے ورودِ دہلی سے قبل سفرآخرت پر روانہ ہوچکے تھے اور ان کی جگہ مسند درس پر ان کے لائق ترین نواسے حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب متمکن تھے، جن کے حلقۂ درسِ حدیث کو تمام ہندوستان کے شائقین حدیث کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ میاں صاحب نے بھی علومِ رسمیہ سے فراغت کے بعد علومِ تفسیر وحدیث اور فقہ کی تحصیل کے لیے حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے مرکز حدیث کا رخ کیا۔ حضرت شاہ صاحب ممدوح سے میاں صاحب نے صحاح ستہ کی تکمیل کی، نیز تفسیر جلالین، تفسیر بیضاوی، کنز العمال اور حافظ سیوطی کی جامع صغیر کا درس لیا۔ علاوہ ازیں تیرہ برس کی مدت مدید تک ان کی صحبت بابرکت سے مستفیض ہوتے رہے۔

صحیح بخاری وصحیح مسلم پڑھنے کا طریقہ یہ تھا کہ ایک دن پہلے شام کو مولوی برکت اللہ بیگ کے ساتھ مولانا عبدالخالق صاحب سے وہی سبق پڑھ لیتے تھے جو کل صبح کو حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے حلقۂ درس میں آنے والا تھا۔ اس طرح وہ صبح کو حضرت شاہ صاحب کے درس میں شریک ہوکر

اس کی سماعت کرتے اور اگر کوئی مسئلہ حل طلب ہوتا تو صبح کے درس میں شاہ صاحب سے سوال کرتے اور مسئلہ حل ہوجاتا یعنی کہیں کوئی شبہ پیدا ہوتا تو رفع ہوجاتا۔ مولانا عبدالخالق کے حضور قرأت کرتے اور حضرت شاہ صاحب کی جناب میں سماعت فرماتے۔ شاہ صاحب کے درس میں ان کو قرأت کا اتفاق کم ہوا اور سماعت کا زیادہ۔ اسی لیے حضرت شاہ صاحب نے ان کی سند میں تحریر فرمایا ہے کہ سَمِعَ مِنِّي الْاَحَادِيْثَ الْكَثِيْرَةَ (یہ پوری سند آگے درج کی جائے گی) بہ الفاظ دیگر حضرت میاں صاحب کو صحیح بخاری اور صحیح مسلم پڑھنے کا شرف مولانا عبدالخالق صاحب سے بھی ہوا اور حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب سے بھی۔ اوّل الذکر سے قرأۃً اور ثانی الذکر سے سماعاً۔

شادی

جس زمانے میں میاں صاحب دہلی میں حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب سے کسب فیض کررہے تھے، اسی زمانے میں ان کی شادی اپنے شفیق استاذ حضرت مولانا سید عبدالخالق صاحب (متولی مسجد اورنگ آبادی) کی صاحب زادی سے ہوئی۔ یہ ان کے دہلی آنے کے چھٹے سال ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) کا واقعہ ہے۔ اس شادی کے کفیل خود حضرت شاہ محمد اسحاق اور ان کے برادر صغیر شاہ محمد یعقوب تھے۔ نکاح مسجد اکبر آبادی میں ہوا تھا، جس میں حضرت شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب سمیت تمام اساتذہ اور طلباے علم شریک تھے۔ دونوں شاہ صاحبان تمام رات قرآنِ مجید اور ابوداؤد شریف کا درس فرماتے رہے۔ صبح کو نکاح ہوا اور بعد فراغ دعوتِ ولیمہ تناول فرما کر اپنے دولت خانہ پر تشریف لے گئے۔

اس شادی کا ذکر مولانا علی احمد صاحب نے بھی اپنے ایک طویل خط میں کیا ہے جو انھوں نے بہ زبانِ فارسی مولانا حفیظ اللہ خاں صاحب دہلوی کو لکھا۔ اس خط کے چند الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔

”آناں کہ در شادی کتخدائ مولوی صاحب ممدوح باصبیہ عفیفہ حضرت مولوی صاحب مخادیمی مولوی عبدالخالق صاحب مرحوم ومغفور شریک بودند، اظہر من الشمس ست کہ حضرت مولانا مبرور (شاہ محمد اسحاق صاحب) از نمازِ عشاء تا نمازِ صبح مع جماعت کثیرہ از علما واہل مدرسہ در مسجد قدیم پنجابی کٹرہ رونق افروز بودند ومجلسے عجیب بابرکت ومیمنت ترتیب یافتہ بود، کاتب حروف نیز دراں مجلس حاضر بود۔“

میاں صاحب کے سوانح نگار مولانا فضل حسین بہاری کے بیان کے مطابق ۱۲۴۸ھ کے آغاز (۱۸۳۳ء) میں میاں صاحب کی شادی ہوئی تھی اور اسی سال کے آخر میں نو دس مہینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بیٹا عطا فرمایا جس کا نام شریف حسین رکھا گیا۔

اب حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کی دہلی سے ہجرت اور حضرت میاں سید نذیر حسین صاحب کی سند کے بارے میں چند سطور کا مطالعہ کیجیے۔

حضرت شاہ محمد اسحاق کی عطا فرمودہ سند

شاہ محمد اسحاق صاحب نے ۱۲۵۸ھ میں ہجرت کی اور اسی سال بہ وقت رخصت شیخ الکل میاں صاحب کو ان سے سند واجازۂ حدیث کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ شاہ صاحب بہ قصد ہجرت دہلی سے رخصت ہوئے تو ان کی پہلی منزل نظام الدین میں تھی۔ تین روز وہاں قیام رہا۔ مشایعت کے لیے سیکڑوں لوگ دہلی سے وہاں تک گئے۔ مفتی صدر الدین خان آزردہ نے حضرات ثلاثہ (حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب، جناب شاہ رفیع الدین صاحب اور جناب شاہ عبدالقادر صاحب) سے تحصیل علم کی تھی۔ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے حلقہ شاگردی میں بھی رہے تھے، لیکن ان میں سے کسی بزرگ سے سند نہیں لے سکے تھے۔

نظام الدین میں مفتی صاحب نے حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب سے سند کے لیے عرض کیا تو انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب مفتی صاحب نے میاں سید نذیر حسین صاحب سے کہا کہ آپ ان سے میرے لیے سند کی درخواست کریں۔ نماز ظہر کے بعد میاں صاحب نے شاہ صاحب سے عرض کیا کہ حضور آپ مفتی صدر الدین کو سند عنایت فرما دیں، لیکن حضرت شاہ صاحب نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسرے روز صبح کے بعد پھر میاں صاحب نے عرض کی کہ مفتی صاحب کی کم نصیبی ہے کہ حضرات ثلاثہ سے سند نہ لی، اب حضور بھی تشریف لے جا رہے ہیں اور انھیں سند نہ ملی۔ اس پر حضرت شاہ صاحب نے مفتی صاحب کی سند لکھ دی اور میاں صاحب سے فرمایا کہ تم نے بھی تو سند نہیں لی ہے، تم بھی لے لو۔ اب حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب نے خود سند تحریر فرما کر میاں صاحب کو عنایت فرمائی۔ پھر وہ تمام امور سے کٹ کر تدریسِ حدیث کی اس خدمت میں مصروف ہوگئے، جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا فرمایا تھا۔

حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب نے میاں صاحب کو جو سند عطا فرمائی، اس کے الفاظ یہ ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علٰی سید المرسلین محمد واٰلہ وصحبہ اجمعین . اما بعد فیقول العبد الضعیف محمد اسحاق ان السیّد النجیب المولوی محمد نذیر حسین قد قرأ علی اطرافاً من الصحاح الستۃ البخاری ومسلم وابی داؤد والجامع الترمذی والنسائی وابن ماجۃ وشیئاً من

كنز العمال والجامع الصغير وغيرها وسمع منى الاحاديث الكثيرة وعليه ان يشتغل بقرأة هذه الكتب ويتدرس بها لانه اهلها بالشروط المعتبرة عند اهل الحديث وانى حصلت القرأة والسماعة والاجازة لهذهِ الكتب من الشيخ الاجل الشيخ عبدالعزيز المحدث الدهلوى وهو حصل القرأة والاجازة عن الشيخ ولى الله المحدث الدهلوى رحمة الله عليهما وباقى سنده مكتوب عنده . حررهٔ فى ثانى عشر شوال ۱۲۵۸ الهجرية . الحمد لله اولاً واخراً .

محمد اسحاق

۱۲۵۸

ہم سبق حضرات

یہاں چلتے چلتے جناب میاں صاحب کے ہم سبق حضرات کے اسمائے گرامی پر بھی نظر ڈال لیجیے! دہلی میں مولانا عبدالخالق صاحب اور حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تحصیل علم کے وقت مولوی رحمت اللہ بیگ، مولوی عبداللہ سندھی، مولوی محمد گل کابلی، مولوی نور علی متوطن سسراون، حافظ محمد فاضل سورتی، حافظ حاجی محمد صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں جناب میاں صاحب کے ہم سبق تھے۔

ہدایہ کے سبق میں نواب قطب الدین خاں مرحوم، مولوی بہاء الدین دکھنی، مولوی صفۃ اللہ پانی پتی، مولوی قاری حافظ کرم اللہ شریک تھے۔ نواب قطب الدین سے جناب میاں صاحب کا سلسلۂ دوستی بہت بڑھ گیا تھا، چناں چہ اپنی یادداشت میں خود تحریر فرماتے ہیں۔

"واز شریک شدن در ہدایہ از جناب مولوی صاحب مرحوم (نواب قطب الدین خاں) سلسلۂ محبت وارتباط وانبساط روز بروز دراز گردید۔"

یعنی ہدایہ کے سبق میں شرکت کی بنا پر مولوی قطب الدین خاں سے محبت وتعلق اور میل جول کا سلسلہ روز بروز بڑھتا چلا گیا۔

مولوی محمد ابراہیم نگرنہسوی عظیم آبادی کے ساتھ بھی میاں صاحب نے حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب سے دوسری دفعہ صحیح بخاری سماعتاً پڑھی اور کسی قدر تفسیر بیضاوی بھی پڑھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت میاں صاحب نے تین مرتبہ صحیح بخاری پڑھی۔ ایک مرتبہ مولانا سید عبدالخالق صاحب سے، دوسری مرتبہ اسی دوران صبح کے وقت حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب سے اور تیسری مرتبہ جناب شاہ صاحب ہی سے مولوی محمد ابراہیم نگرنہسوی کی رفاقت میں! بعض مواقع پر قاری عبدالرحمٰن پانی پتی بھی میاں صاحب کے ساتھ شامل درس ہوتے تھے۔

چند صرفی نحوی اور فقہی نوعیت کے واقعات

اب چند صرف نحوی اور فقہی نوعیت کے واقعات ہلکے پھلکے انداز میں بہ صورت لطائف سنیے۔ اس سے حضرت میاں صاحب کی قوتِ حفظ اور وسعت مطالعہ کا پتا چلے گا۔

ایک مرتبہ اثنائے درس میں حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب نے طلبا سے پوچھا کہ اذامفاجات کے لیے آتا ہے یا نہیں؟

ایک طالب علم نے جواب دیا ''نہیں'' ......!

اسی آن ایک طالب علم قاری عبدالرحمٰن پانی پتی نے کہا: اذ مفاجات کے لیے آتا ہے۔

میاں صاحب نے از راہ مذاق فرمایا: یک نہ شد دو شد۔

قاری عبدالرحمٰن پانی پتی زود رنج تھے، وہ اس مذاق پر میاں صاحب سے خفا ہوگئے اور اس خفگی نے کافی طوالت اختیار کرلی۔

ایک روز حضرت شاہ صاحب کے حلقۂ درس میں ترمذی شریف کا سبق ہورہا تھا۔ اس سبق میں ایک جگہ لفظ کان محذوف تھا۔ شاہ صاحب نے شاگردوں سے پوچھا کہ کان کہاں کہاں محذوف ہوتا ہے؟ ماہرین علم نحو عام طور سے چار مقامات بیان کیا کرتے ہیں، جہاں لفظ کان کو محذوف مانا جاتا ہے۔ میاں صاحب نے ان معروف مواضع اربعہ کے ساتھ دو اور مقامات کا اضافہ کرکے بتا دیا کہ فلاں فلاں محل میں بھی کان محذوف ہوتا ہے۔ اس طرح چھ مقامات میں لفظ کان کا حذف ثابت ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ مفتی شرف الدین جو ریاست رام پور کے منصب افتا پر فائز تھے، دہلی تشریف لائے اور صدر بازار میں پنجابیوں کے مہمان ہوئے۔ ان کی شہرت علمی سن کر میاں صاحب بھی ملاقات کو گئے۔ میاں صاحب کا یہ جوانی کا زمانہ تھا۔ انھوں نے مفتی صاحب سے پوچھا، آج کل آپ کا کیا شغل ہے؟

فرمایا: نواب صاحب نے تفسیر جلالین کے ترجمے کی فرمائش کی ہے، وہی کام کررہا ہوں۔ لیکن بے چارے جلالو تو بالکل بھولے بھالے تھے، انھیں کچھ آتا جاتا نہیں تھا، اس لیے مجھے ہی سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔

ان کی یہ بات سن کر میاں صاحب نے مفتی صاحب سے سوال کیا کہ قرآن کے الفاظ یُوْرِثُ كَلٰلَةً میں یُوْرِثُ، وَرِثَ یَرِثُ سے مشتق ہے یا اَوْرَثَ یُوْرِثُ سے؟

مفتی شرف الدین صاحب اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکے، اور میاں صاحب نے ان

کے علم وفضل کا اندازہ کرلیا۔

اس کے بعد یہی مفتی شرف الدین صاحب دہلی کے معروف عالم مفتی صدر الدین خاں آزردہ کے مہمان ہوئے تو ان کی دعوت پر میاں صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ مفتی صدر الدین خاں اور میاں صاحب کے درمیان دوستانہ مراسم قائم تھے۔ انھوں نے میاں صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مفتی شرف الدین صاحب سے کہا یہ جوان بڑا وہابی ہے۔ اس کے سامنے حضور کوئی مسئلہ بیان نہ فرمائیں۔ کوئی مسئلہ بیان فرمانا ضروری سمجھیں تو جمنا پار جاکر بیان فرمایئے گا۔

اس پر مفتی شرف الدین رام پوری نے میاں صاحب سے مخاطب ہوکر کہا: تم کو فقہ آتی ہے؟

انھوں نے جواب دیا: میں کیا جانوں صاحب۔ آپ پوچھیے۔

مفتی موصوف نے سوال کیا: وضو کے کتنے فرض ہیں؟

میاں صاحب نے کہا: معلوم ہوا آپ وہی اعتراض کریں گے جو پہلے ملا فروخ مکی نے کیا ہے اور اسی کو بحر الرائق میں لکھا ہے۔ اسی کو نہر الفائق میں نقل کیا ہے۔ ایسے اعتراض کے جواب دلّی کے بھٹیاروں کے لونڈے پیڑا بناتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں۔ کوئی بڑی بات پوچھی ہوتی۔

اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے یہ مسئلہ پوچھا کہ پانی پت جانے کے لیے اونٹ گاڑی کرایہ پر لی ہے۔ کرایہ کا فیصلہ تو ہوگیا مگر اونٹ کے دانے چارے کا فیصلہ نہیں ہوا کہ کون دے گا، اجیر یا مستاجر؟

یہ اجارہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟

مفتی شرف الدین صاحب نے جواب دیا: درست ہے۔

میاں صاحب نے پوچھا: کہاں لکھا ہے؟

مفتی صاحب نے کہا: فتاویٰ عالم گیری میں۔

میاں صاحب نے فرمایا: فتاویٰ عالم گیری مطبوعہ کلکتہ اور دہلی میں تو **لا یجوز** لکھا ہے۔ آپ نے شاید کوئی قلمی نسخہ دیکھا ہوگا، جس میں کاتب کی غلطی سے **لا** چھوٹ گیا ہوگا۔ اگر آپ کو یہ خیال ہو کہ فتاویٰ عالم گیری بہت مبسوط کتاب ہے، کون اس کی جزئیات کا احاطہ کرسکتا ہے تو آپ جہاں سے چاہیں سوال کریں صفحۃً صفحۃً ورقۃً ورقۃً عبارت سنا دوں گا۔

واقعہ یہ ہے کہ میاں صاحب نے پورے فتاویٰ عالم گیری کا مطالعہ فرمایا تھا اور کامل غور کے ساتھ اسے بار بار پڑھا تھا۔ وہ انھیں تقریباً از بر ہوگیا تھا۔ اب ہمارے اکثر علمائے کرام اس کا نام تک لینا گوارا نہیں فرماتے اور بعض کو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ کس زبان میں ہے، عربی میں یا فارسی میں۔

پھر میاں صاحب نے مفتی شرف الدین سے پوچھا کہ شوہر بیوی کی میت کو ہاتھ لگا سکتا ہے، غسل دے سکتا ہے اور تجہیز و تکفین کرسکتا ہے کہ نہیں؟

مفتی صاحب نے جواب دیا: نہیں۔

میاں صاحب نے کہا: اس کی کوئی دلیل؟

مفتی صاحب نے جواب دیا: موت کے بعد نکاح فسخ ہوگیا۔ اب وہ اس کی بیوی نہیں رہی، لہٰذا وہ اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔

میاں صاحب نے فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیوں کر جناب سیدہ فاطمۃ الزہرا کو غسل دیا اور ان کی تجہیز و تکفین کی؟

یہ سن کر مفتی صاحب خاموش ہوگئے۔

ایک مرتبہ حضرت حافظ محمد لکھوی نے فقہ حنفیہ کے کسی مسئلے کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے میاں صاحب کی مجلس میں فقہ حنفی کی چودہ کتابوں کا حوالہ دیا۔ میاں صاحب نے چالیس کتابوں کے نام بتائے، جن میں زیرِ بحث مسئلہ مذکور تھا اور وہ سب کتابیں ان کی نظر سے گزر چکی تھیں۔

حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی بیان کرتے ہیں کہ ایک دن صحیح بخاری کے سبق ''کتاب الاکراہ'' میں **قال بعض الناس** آیا۔ (امام بخاری نے التزام کیا ہے کہ وہ ان الفاظ میں امام ابوحنیفہ کے مذہب کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اس کا مقصد ان کے نقطۂ نظر کی تردید ہوتا ہے۔) علامہ عینی حنفی شارح صحیح بخاری نے جو اپنے مذہب کے سرگرم حامی ہیں، صحیح بخاری کے ہر ایسے مقام پر لکھا ہے کہ سرے سے یہ ہمارا مذہب ہی نہیں۔ میاں صاحب نے حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے یہ الفاظ سنے تو اثنائے سبق ہی میں اٹھ کر گھر تشریف لے گئے اور قلمی کتابوں کی نو جلدیں ایک گٹھڑی میں باندھ کر لائے اور معتبر حوالوں سے ثابت کیا کہ حنفی مذہب کا وہی مسئلہ ہے جو امام بخاری نے لکھا ہے اور علامہ عینی کو خود اپنے مذہب کا علم نہیں۔

حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کا معمول تھا کہ جب ان کے پاس کوئی استفتا آتا تو اس کا جواب تحریر فرما کر طلبا کے حوالے کردیتے کہ انھیں پتا چلے کہ استفتا کا جواب کس طرح لکھا جاتا ہے۔

ایک استفتا آیا کہ ایک شخص نے کسی سے چار آنے کے پیسے قرض لیے۔ اس وقت پیسے کا نرخ بیس گنڈہ تھا۔ چار آنے کے بیس پیسے ملے۔ اب قرض ادا کرنے کا وقت آیا تو پیسے کا نرخ پچیس گنڈہ ہے۔ دائن (قرض خواہ) کو بیس پیسے دیے جائیں گے یا پچیس؟

حضرت شاہ صاحب نے جواب تحریر فرمایا کہ جتنے پیسے لیے تھے، اتنے ہی ادا کیے جائیں گے یعنی بیس پیسے۔

جناب میاں صاحب نے یہ جواب پڑھا تو استاذ محترم کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور پچیس پیسے ادا کیے جائیں گے جو نرخ پیسے کا ادائے قرض کے وقت ہے۔

شاہ صاحب نے فرمایا: کیوں؟

عرض کیا: پیسوں کی ثمنیت خلقی نہیں ہے۔ جعلی ہے۔ مگر حضرت شاہ صاحب نے اس پر غور نہیں فرمایا۔

جن لوگوں کو اس کا پتا چلا وہ شاگرد کی طرف سے استاذ کی مخالفت پر متحیر ہوئے اور دہلی کے تدریسی حلقوں میں بات مشہور ہوگئی۔ اس واقعے پر چھ مہینے گزر گئے۔ پھر مکہ معظمہ سے کتاب طوالع الانوار آئی تو میاں صاحب یہ جزئی کتاب سے نکال کر استاذِ محترم کی خدمت میں لے گئے اور عرض کیا کہ حضور یہ فتویٰ منگوا کر قلم زد کریں۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔

خاندان شاہ ولی اللٰہی کے جانشین ...... میاں نذیر حسین

آئندہ سطور میں یہ ثابت کیا جائے گا کہ تدریس علومِ حدیث میں خانوادۂ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے اصل وارث حضرت میاں سید نذیر حسین رحمہ اللہ تھے۔

شوال ۱۲۵۸ھ میں حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب نے ہندوستان سے ہجرت فرمائی۔ اس وقت دہلی میں بے شمار علمائے کرام موجود تھے، جن میں اکثر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ کے تلامذہ اور تربیت یافتہ تھے، ان کے درس وتدریس کے حلقے بھی قائم تھے۔ خود حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدین کے بیٹے شاہ مخصوص اللہ موجود تھے جو پچیس برس تک شاہ عبدالعزیز صاحب کے حلقۂ درس میں شریک رہے تھے اور عرصہ دراز تک خود بھی مشغولِ تدریسِ حدیث رہے تھے۔ شاہ مخصوص اللہ صاحب کے چھوٹے بھائی شاہ محمد موسیٰ صاحب بھی زندہ تھے اور اپنا ایک علمی اور خاندانی مقام رکھتے تھے۔ پھر شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ محمد اسحاق صاحب کے مشاہیر تلامذہ بھی دہلی اور بلادِ ہند کے مختلف اطراف میں پھیلے ہوئے تھے جو وعظ وارشاد اور درس وافتا کی خدمات سرانجام دے رہے تھے، لیکن حضرت شاہ عبدالعزیز اور حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کی مسند درس وافتا پر حضرت میاں سید نذیر حسین ہی متمکن ہوئے۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ ''میاں صاحب'' کا لقب اس زمانے میں حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندان کے لیے مخصوص تھا۔ پہلے شاہ عبدالعزیز صاحب کو میاں صاحب کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں ان کے جانشین، حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کو میاں صاحب کہا جانے لگا۔ پھر یہ سلسلۂ جانشینی ان سے منتقل ہوتا ہوا یہ لقب حضرت سید نذیر حسین صاحب تک پہنچا اور ان کی ذاتِ گرامی پر اس طرح چسپاں ہوا کہ میاں صاحب اور سید نذیر حسین

گویا دو مترادف لفظ قرار پا گئے۔ جوں ہی علمی اور تدریسی حلقے سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کی زبان سے میاں صاحب کا لفظ ادا ہوا فوراً ذہن سید نذیر حسین کی طرف منتقل ہوگیا۔

شوقِ مطالعہ اور وسعت معلومات

شیخ الکل میاں صاحب تمام علوم متداولہ میں عمیق نگاہ رکھتے تھے۔ قرآن وحدیث، فقہ وکلام، صرف ونحو، اصول حدیث اور اصولِ فقہ، ادب وانشا، معانی وبیان، منطق وفلسفہ، حساب وریاضی غرض جو علوم اس زمانے میں مروّج ومتداول تھے، میاں صاحب کو ان سب میں عبور حاصل تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو حفظ واتقان کی بے پناہ دولت سے نوازا تھا۔ فقہ حنفیہ تو یوں سمجھیے کہ انھیں پوری طرح ازبر تھی اور اس کی تمام جزئیات ان کے خزانۂ ذہن میں محفوظ تھیں۔ فتاویٰ عالم گیری کئی ضخیم جلدوں پر محیط ہے اور اسے فقہ حنفیہ کے تمام مسائل کے دائرۃ المعارف کی حیثیت حاصل ہے۔ میاں صاحب اس کے تمام گوشوں سے باخبر تھے اور اس کا انھوں نے شروع سے آخر تک تین مرتبہ نہایت دقتِ نظر سے مطالعہ کیا تھا۔

ان علومِ درسیہ ورسمیہ کے علاوہ انھیں اردو شعرا کے اشعار سے بھی دلچسپی تھی اور انھیں بہت سے شعرا کے بے شمار اشعار زبانی یاد تھے۔ عربی اور فارسی کے بھی بہت سے اشعار ان کے نوکِ زبان تھے۔ وعظ وتبلیغ میں بھی منفرد اسلوب کے مالک تھے۔ فتویٰ نویسی میں نہایت محتاط تھے اور قرآن وحدیث اور ائمہ فقہ کے مستند حوالوں کی روشنی میں فتویٰ تحریر فرماتے تھے۔ طالب علمی کے دور ہی سے طبیعت تحقیق کی طرف مائل تھی اور پھر عمر بھر محققانہ اسلوب ان کے ساتھ رہا۔

میاں صاحب کے وسعت مطالعہ کی متعدد مثالیں گزشتہ سطور میں دی جا چکی ہیں۔ ایک مثال اور ملاحظہ فرمایئے۔ ایک مرتبہ گاڑی میں سوار کہیں جارہے تھے کہ راستے میں مولانا احمد علی سہارن پوری نے ان کو دیکھ لیا۔ مولانا لپک کر ان کی طرف بڑھے اور گاڑی روک کر ایک مسئلہ دریافت کیا اور پوچھا کہ یہ مسئلہ کس کتاب میں ملے گا؟ فرمایا الاشباہ والنظائر میں موجود ہے۔ مولانا احمد علی صاحب اس سے بے حد خوش ہوئے کہ آسانی سے پتا چل گیا اور محنت سے بچ گئے۔

کتب خانوں میں جانے اور مختلف موضوعات کی کتابیں پڑھنے کا میاں صاحب کو بہت شوق تھا۔ دہلی میں ان کے زمانے میں تین بڑے کتب خانے تھے جن سے میاں صاحب مسلسل استفادہ کرتے رہتے تھے۔

ایک کتب خانہ لال قلعے کا تھا، جس میں سیکڑوں برس سے کتابوں کا ذخیرہ جمع ہوتا آرہا تھا اور آخری مغل حکمران بہادر شاہ ظفر (۱۸۵۷ء) تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

دوسرا کتب خانہ دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا تھا، جس میں کتابیں جمع کرنے کی ابتدا حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب سے ہوئی تھی۔ اس میں ان کے فرزند گرامی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی اضافہ کیا اور پھر ان کے لائق تریں صاحب زادے شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس کو مزید منزلِ ارتقا کی طرف بڑھایا۔

تیسرا کتب خانہ خود حضرت میاں صاحب کا تھا جو بے شمار مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں پر مشتمل تھا۔

میاں صاحب ان تینوں کتب خانوں کی کتابوں کا مطالعہ فرماتے تھے۔ افسوس ہے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں یہ کتب خانے ضائع ہوگئے اور جو کتابیں کسی طرح بچ گئیں، وہ لندن کی انڈیا آفس لائبریری میں منتقل ہوگئیں۔

دہلی کے ان کتب خانوں کے علاوہ بعض دیگر مقامات کے کتب خانوں سے بھی میاں صاحب کتابیں عاریۃً منگواتے اور مطالعہ کے بعد واپس فرمادیتے مثلاً کبھی لکھنؤ تشریف لے جاتے تو مولانا عبدالحی فرنگی محل کے کتب خانے کی سیر ضرور کرتے۔ اسی شہر میں شیعہ حضرات کے کتب خانوں میں سے مولانا حامد حسین لکھنوی کے کتب خانے کا چکر لگاتے اور وہ حضرات جناب میاں صاحب کی تشریف آوری پر بے حد مسرت کا اظہار کرتے۔ ان کتب خانوں کی کسی کتاب کی ضرورت ہوتی تو ان کے مہتمم بڑی خوشی سے وہ کتاب میاں صاحب کی خدمت میں پیش کردیتے۔ میاں صاحب اس کا مطالعہ کرتے یا اسے نقل کرکے کتاب واپس بھجوادیتے۔

طریق درس وتدریس اور اندازِ وعظ

الحیات بعد الممات کے مصنف کے بقول میاں صاحب کے درس وتدریس کا بھی عجیب طریقہ تھا۔ اقوالِ صحیحہ وضعیفہ کی جانچ پڑتال، سلجھی ہوئی تقریر، بیان کی صفائی، تفہیم کی قدرت، حافظے کی قوت، اشکال کی تشریح، وسعت نظر، ملکۂ راسخہ، ہر مقام کے مالہ وماعلیہ سے وقوف...... یہ تھیں ان کے درس کی خصوصیات۔

ڈپٹی نذیر احمد نے نہایت مختصر مگر خوب صورت الفاظ میں میاں صاحب کے طریق درس کا تذکرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ”آپ کا درس عام پسند اور حساد کے لیے موجب گزند تھا۔“

مولوی محمد عبداللہ بازید پوری فرماتے ہیں:

> ”میں مفتی صدر الدین خاں صدر الصدور دہلی سے کتب درسیہ پڑھتا تھا اور اکثر میاں صاحب کے درس کے وقت وہاں بھی جا بیٹھتا تھا۔ طلبا کا ہجوم رہتا اور آپ نہایت تحقیق

کے ساتھ درس دیتے اور حق بات یہ ہے کہ فقہ، تفسیر، حدیث اور فلسفہ کے آپ عالم تبحر تھے۔ پڑھانے میں جب تقریر کرتے تو ایک بحرِ مواج معلوم ہوتے تھے۔"

مولانا ابوعبدالرحمٰن محمد عبداللہ ہزاروی جیلانوی لکھتے ہیں:

"میں ۱۲۸۲ھ میں تحصیل علم کے لیے دہلی گیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا احمد علی سہارن پوری، نواب قطب الدین خاں صاحب دہلی، مفتی صدر الدین خاں صدر الصدور دہلی، مولانا سعادت علی سہارن پوری، مولانا عبدالغنی مجددی وغیرہم بڑے بڑے کاملین سے ملا اور بہت دنوں تک ان کے دروس کا مقابلہ اور موازنہ بہ نظر غائر میاں صاحب کے درس سے کرتا رہا۔ آخری فیصلہ میرے دل نے یہی کیا کہ میاں صاحب کے درس میں بالکل ہی نرالا پن ہے۔" ❶

عام لوگوں کے لیے میاں صاحب صبح کے وقت قرآنِ مجید کا درس دیا کرتے تھے۔ درس کا سلسلہ روزانہ چلتا تھا۔ ایک رکوع قرآنِ مجید کا تلاوت فرماتے اور پھر اس کا ترجمہ کرتے۔ اندازِ بیان نہایت سادہ ہوتا۔ میاں صاحب کے سوانح نگار کا بیان ہے کہ اس درس کا لطف وہی لوگ جانتے ہیں جو اس میں شریک رہے ہیں۔ اس طرح ایک قرآن سال میں ختم ہوجاتا۔

قرآن میں جہاں اللہ کی توحید کا مضمون آتا، اسے سلجھا کر فرماتے: "مگر تم دلی والے یا پیر یا پیر ہی کہتے رہے۔ ما قدروا اللہ حق قدرہ۔ چلو، صاحب چلو......" یہ ان کا روزانہ وعظ ہوتا تھا۔

وعظ سے مقصود محض ہدایت انام ہوتا، اس لیے حضرت نے وعظ کا وہ طریقہ اختیار فرمایا جو معنی خیز ہونے کے ساتھ عام فہم بھی تھا۔ ابتدا میں قرآنِ مجید کی کوئی چھوٹی سورہ یا آیت تلاوت فرماتے۔ پھر اس کا ترجمہ کرتے اور جتنے مسائل پر وہ نص صریح مشتمل ہوتی، وہ مسائل اپنے انداز میں بیان کرتے اور حتی الامکان قرآن کی تفسیر یفسر بعضہ بعضاً قرآن ہی سے کرتے اور شواہد میں مسائل مذکورہ سے متعلقہ احادیث سناتے۔ سامعین میں اگر علمائے کرام بھی موجود ہوتے تو ان کے لیے مسائل الٰہیات وفلسفہ کے بعض نکات وغوامض بھی بیان فرمادیتے۔ تقریر میں ایسی صفائی اور سادگی ہوتی کہ آنچہ از دل خیزد بردل ریزد کے محاورے کے مطابق ہر بات لوحِ قلب پر مرتسم ہوتی چلی جاتی۔ ان کے وعظ کی اثر انگیزی کے سلسلے میں الحیات بعد الممات کے فاضل مصنف نے متعدد واقعات بیان کیے ہیں، لیکن یہ ان کی تفصیل میں جانے کا محل نہیں، صرف اشارے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

---

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے: الحیات بعد الممات، ص: ۷۰

چند سیاسی باتیں

اب دو چار سیاسی باتیں ہوجائیں جن کا میاں صاحب کی زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے۔
بہادر شاہ ظفر، مغل شہزادے اور مغلیہ حکومت کے اہل کار حضرت میاں صاحب کا بے حد احترام کرتے تھے اور حضرت کی قلعہ معلیٰ میں آمد و رفت رہتی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ابتدائی ایام کا واقعہ ہے کہ ایک دن میاں صاحب قلعے میں گئے۔ دیکھا کہ مغل شہزادوں کے ہاتھیوں کے نہایت پر تکلف جھول تیار ہورہے ہیں اور بے فکر شہزادے سامنے پیچوان لگائے باہم گپ لڑا رہے ہیں۔ میاں صاحب کو یہ صورتِ حال دیکھ کر نہایت غصہ آیا اور بہادر شاہ سے کہا "کیا آپ ان شہزادوں کو ہاتھیوں پر اپنے ساتھ لے جا کر انگریزوں سے جنگ لڑیں گے"......؟

میاں صاحب کی خفگی اور تلخ کلامی بالکل صحیح تھی۔ مغل شہزادے تعیش کی زندگی بسر کررہے تھے اور وہ جنگ و قتال کی سختیاں برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ پھر اس کا جو نتیجہ نکلا وہ برصغیر کی تاریخ حکمرانی کا نہایت الم ناک حصہ ہے۔ نہ حکومت رہی، نہ حکمران رہے، نہ مغل شہزادوں کا کہیں وجود رہا۔ سب کچھ ختم ہوگیا۔

جنگ آزادی کا آغاز ۱۱۔ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے ہوا تھا۔ ۲۔ جولائی ۱۸۵۷ء کو جنرل بخت خاں دہلی پہنچا تو اس کی تحریک پر ۳۴ علمائے کرام نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا، جس پر (چوتھے نمبر پر) میاں صاحب کے دستخط ہیں۔ یہ فتویٰ اس زمانے کے اخبارات "صادق الاخبار" اور "ظفر الاخبار" میں شائع ہوا۔ اس کی تفصیل ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے اپنی کتاب "۱۸۵۷ء۔ شخصیات" میں بیان کی ہے۔

میاں صاحب انگریزی حکومت کے شدید مخالف ہیں اور اس کی شدت کا اندازہ اس فتوے کے الفاظ سے ہوتا ہے، جس پر انھوں نے دستخط فرمائے۔ لیکن اس کے ساتھ اس کا دوسرا پہلو بھی اپنے زاویۂ فکر میں لائیے۔ اسلام نے دشمن کی عورتوں کو چوں کہ قتل کرنے سے منع فرمایا ہے، اس لیے اس انتہائی تلخ جذبات کے زمانے میں بھی حضرت میاں صاحب اور ان کے تربیت یافتہ لوگ اپنے دشمن اور حریف انگریزوں کی ایک خاتون کو اپنی گرفت میں آنے کے باوجود نہ صرف قتل نہیں کرتے بلکہ اس کی حفاظت کرتے ہیں، اس لیے کہ شریعت اسلامی کا حکم یہی ہے اور اسلام اپنے ماننے والوں کی یہی ذہنی اور عملی تربیت کرتا ہے۔ انگریز عورت کی حفاظت اور اس کے علاج معالجے کا واقعہ خود میاں صاحب کے الفاظ میں سنیے۔

"میں اس زمانے میں ایک دن نماز عصر کے بعد شہر سے باہر چلا گیا، ملا محمد صدیق پشاوری

جو اس وقت مجھ سے اصولِ فقہ پڑھتا تھا، میرے ساتھ تھا۔ مجھ کو کسی آدمی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ میں اس آواز کی جانب بڑھا۔ جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک میم مجروح ہے اور رو رہی ہے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر کہنے لگی کہ خدا کے واسطے میری جان مت مارو۔ میں نے اس کو دلاسا دیا اور کہا کہ ہم مسلمان ہیں، ہمارے مذہب میں لڑائی کے وقت بھی کسی غنیم کی عورت اور بچوں کی جان مارنا یا انھیں تکلیف دینا حرام ہے۔ تم اپنی جان کے متعلق پوری طرح اطمینان رکھو، اور اگر تمھاری مرضی ہو تو ہم تم کو اپنے گھر لے چلیں اور تمھارے زخم کا علاج اور تیمار داری کریں۔ مگر چوں کہ وہ بہت ڈری ہوئی تھی، کہنے لگی کہ اوّل تو ہم اپنے پاؤں سے چل نہیں سکتے اور تم لوگ اگر اٹھا کر لے بھی چلو تو باغیوں کی گولی سے بچ نہیں سکتے۔ میں نے کہا ہم لوگ تم سے کچھ دور ٹھہرتے ہیں۔ رات کو اندھیرے میں تم کو اٹھا کر لے چلیں گے۔ آخر یہی ہوا کہ اندھیرے میں ہم اور ملا صدیق اٹھا کر اس کو ایسے رستے سے لائے کہ کسی فرد بشر کو اس کی خبر بھی نہ ہوئی۔ گھر میں جا کر شریف حسین کی ماں سے کہا کہ یہ نہایت مظلومہ ہے۔ اس کی بہت دل جوئی اور خدمت کرنی چاہیے کہ موجب خوش نودئ خدا اور رسول ہے۔ موسم سخت گرمی کا تھا اور وہ دن رات ایک کوٹھری میں بند رہتی۔ ہر چند میری اہلیہ اس کو کہتیں کہ رات کو انگنائی میں آ کر بیٹھو مگر وہ ڈر سے کوٹھری سے باہر نہ آتی اور اسی گرمی اور مچھروں کی تکلیف میں رات بھر ہاتھ اٹھائے دعا کرتی کہ اے اللہ میرا قصور معاف کر۔[1]

اب حضرت میاں صاحب کی گرفتاری اور راولپنڈی جیل میں ان کی قید کے متعلق چند ضروری باتوں کا مطالعہ فرمایئے۔

۱۸۶۴ء اور اس کے بعد انگریزی حکومت کی بغاوت کے سلسلے میں مولانا احمد اللہ، مولانا یحییٰ علی اور مولانا محمد جعفر تھانیسری وغیرہ حضرات پر انبالہ، پٹنہ اور دیگر شہروں میں حکومت نے جو مقدمے بنائے ان میں انگریزی حکومت نے حضرت میاں صاحب کو بھی گرفتار کر لیا۔ پولیس نے ان کے مکان اور مسجد کی تلاشی لی تو بے شمار خطوط پر نظر پڑی جو ان کی چارپائی اور نشست گاہ پر پڑے تھے۔ تلاشی لینے والوں نے پوچھا: آپ کو اتنی کثرت سے خطوط کیوں آتے ہیں؟

فرمایا: اس کی وجہ تو خطوط بھیجنے والوں سے معلوم کرنی چاہیے یا ان خطوط کے مضامین سے تلاش کرنی چاہیے۔

---

[1] الحیات بعد الممات، ص: ۷۷، ۷۸

خطوط پڑھے گئے تو کسی نے کوئی مسئلہ دریافت کیا تھا، کسی نے کسی سلسلے میں کوئی فتویٰ پوچھا تھا، کسی نے کسی کتاب کی کسی عبارت کا مطلب سمجھانے کی درخواست کی تھی۔ ایک خط میں کسی نے لکھا تھا کہ (کتاب) نخبۃ الفکر بھیج دیجیے۔

تلاشی لینے والے گروہ کے ایک شخص نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ان لوگوں کی اصطلاحیں اسی قسم کے الفاظ سے مرکب ہوتی ہیں۔ ''نخبۃ الفکر'' ان کی کوئی اصطلاح ہے اور یہ کوئی ایسی چیز ہے جو انگریزی حکومت کے خلاف استعمال کے لیے ان سے طلب کی گئی ہے۔

میاں صاحب کو اس پر غصہ آ گیا اور انھوں نے سخت الفاظ میں فرمایا:

نخبۃ الفکر کیا ہے؟ توپ؟

نخبۃ الفکر کیا ہے؟ بندوق؟

نخبۃ الفکر کیا ہے؟ گولا بارود؟

پھر مجسٹریٹ کو مخاطب کر کے فرمایا:

آپ نے میرا مقدمہ کس جاہل کے سامنے پیش کیا ہے؟ آپ کسی پڑھے لکھے شخص سے پوچھیے کہ نخبۃ الفکر کس کتاب کا نام ہے اور اس کا کیا موضوع ہے۔

بہر حال میاں صاحب کو گرفتار کر کے دہلی سے سات آٹھ سو میل دور راولپنڈی جیل میں قید کر دیا گیا۔ ایک تو جیل کی سزا دی گئی اور دوسرے دہلی سے دور دراز مسافت پر بھیج دیا گیا کہ ان کا کوئی رشتے دار یا تعلق دار اتنی دور جا کر ان سے ملاقات بھی نہ کر سکے۔ تقریباً ایک سال وہ راولپنڈی جیل میں قید رہے۔

راولپنڈی سے مزید تحقیق کے لیے انھیں پشاور بھیجا گیا، جہاں ایک انگریز چمبرلین نے تحقیق کرنا تھی۔ اس کے بعد پھر راولپنڈی لائے گئے۔ اس اثنا میں چیمبرلین وفات پا گیا۔

قید کے زمانے میں میاں صاحب کو راولپنڈی کے سرکاری کتب خانے سے کتابیں منگوانے اور ان کا مطالعہ کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔

میاں صاحب کے ساتھ ایک طالب علم بھی بھیجا گیا تھا، جس کا نام عطاء اللہ تھا۔ عطاء اللہ نے حضرت میاں صاحب سے جیل میں صحیح بخاری پڑھی اور قرآنِ مجید حفظ کیا۔

ایک شخص میاں صاحب کے ساتھ اور تھا اس کا نام میر عبدالغنی تھا۔ یہ شخص میاں صاحب کے آبائی وطن سورج گڑھ کا رہنے والا تھا۔ عابد و زاہد اور متقی شخص تھا۔ اس شخص نے جیل ہی میں وفات پائی۔ میاں صاحب نے خود اس کی تجہیز و تکفین کی اور نمازِ جنازہ پڑھائی۔

۱۴۔ رمضان المبارک ۱۲۸۷ھ (۸۔ دسمبر ۱۸۷۰ء) کو جمعرات کے دن میاں صاحب کی اہلیہ

محترمہ کا انتقال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

فریضہ حج کے دوران مخالفین کا اذیت ناک رویہ

اب آتے ہیں حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ کے فریضہ حج کی طرف......! اس پاکیزہ ترین سفر کے دوران میں بھی انھیں کئی قسم کی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس دور کے حجاز کی (شریفی) حکومت سے بعض معاندین نے میاں صاحب کی مذہبی نوعیت کی بہت سی شکایات کیں اور انھیں سخت پریشان کیا گیا۔ لیکن ہم اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے، ہم صرف ان کے وعظ وتذکیر تک اپنی گفتگو کو محدود رکھیں گے۔

۱۳۰۰ھ میں میاں صاحب نے حج کا ارادہ کیا اور اپنے رفقا کے ساتھ دہلی سے بمبئی پہنچے اور وہاں سے جہاز پر سوار ہوئے۔ جدہ میں جہاز سے اترے اور مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ منیٰ کے تین روزہ قیام کے دوران میں ان کے مواعظ کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں لاکھوں آدمیوں کو میاں صاحب نے عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں خطاب کیا۔ وعظ کا لب لباب تھا شرک وبدعت سے اجتناب اور عمل بالحدیث کی تلقین۔ خلاف اسلام رسوم کے ترک اور بدعات سے دامن کشاں رہنے کی تاکید۔ میاں صاحب کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ ان کو ایک حاجی نے خط کے ذریعے اطلاع دی کہ ''میاں صاحب نے تین روز منیٰ میں قیام کیا اور شب وروز وعظ بیان کیا، جس میں بدعات کا ردّ فرماتے رہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی نے بعد تابعین کے ایسا کیا ہو۔'' [1]

سفر حج میں میاں صاحب کے مخالفین ومعاندین نے ان کو جن اذیت ناک مراحل سے دوچار کیا، ان کے سوانح نگار نے اس کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ [2]

حج سے واپسی پر دہلی میں فقید المثال استقبال

اب حج بیت اللہ کے بعد حضرت میاں صاحب کے دہلی پہنچنے کی کیفیت اور ریلوے اسٹیشن پر ان کے فقید المثال استقبال کے بارے میں چند سطور ملاحظہ فرمایئے۔

یکم جنوری ۱۸۸۴ء کو بعد فراغِ حج وزیارت میاں صاحب بمبئی پہنچے اور وہاں سے ان کے رفقائے سفر نے دہلی وغیرہ میں اپنے پہنچنے کی خبر دی اور بمبئی سے روانگی کی تاریخ سے مطلع کیا۔ اکثر اشخاص جو میاں صاحب کے استقبال کے لیے دہلی سے چند اسٹیشن آگے تک گئے تھے، ان کا بیان

---

1. الحیات بعد الممات، ص:۸۵
2. دیکھیے ص:۸۳ تا ۱۰۰

ہے کہ ہر اسٹیشن پر اور ریل کی گاڑیوں میں میاں صاحب کے زائرین اور استقبال کرنے والوں کا ایسا ہجوم تھا، جس طرح لوگ ہلالِ عید کی جستجو میں ۲۹۔ رمضان کو مجتمع ہوتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی فرماتے ہیں:

"جب آپ سفر حجاز سے واپس تشریف لائے تو اسٹیشن دہلی پر استقبال کے لیے اس قدر لوگ حاضر ہوئے کہ پلیٹ فارم کا ٹکٹ ختم ہوگیا۔ کار پردازانِ اسٹیشن حیران تھے کہ یہ کس نامی گرامی شخص کی آمد آمد ہے۔"

> "جب ٹرین دہلی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچی تو آدمیوں کا ایسا ازدحام دیکھا کہ ہم لوگوں نے تمام زندگی کبھی کسی عالم، درویش، ولی، متقی، امیر اور وزیر کے قدوم پر ایسی کثرت نہیں دیکھی تھی۔ پلیٹ فارم اور اسٹیشن پر ہزار ہا مخلوق تھی۔ بہت لوگ ایسے تھے جن کو میاں صاحب کی زیارت بھی اسٹیشن پر نصیب نہ ہوسکی، کجا مصافحہ۔ میاں صاحب کو بھی ایک قدم چلنا دشوار ہوگیا۔ آخر بڑی مشکلوں سے نواب محمد علاء الدین خاں بہادر رئیس لوہارو (جو میاں صاحب کے استقبال کے لیے وہاں موجود تھے) اور چند اور معززین واعیانِ دہلی نے آپ کو حلقہ میں لیا اور بہ مشکل پلیٹ فارم سے فٹن تک پہنچا کر سوار کرایا۔ افسرانِ ریلوے یورپین اور دیسی، ہندو، مسلمان اور عیسائی اس منظر کو دیکھ کر سخت حیرت میں تھے کہ یہ کون سا مقتدر بندہ ہے، جس کے لیے ہزاروں دیدہ ودل فرشِ راہ ہیں۔" [1]

حضرت میاں صاحب کو سفر حجاز کے دوران میں جہاں بعض لوگوں نے مختلف دینی الزامات عائد کرکے ذہنی طور سے اذیت پہنچانے کی کوشش کی، وہاں بے شمار لوگوں نے ان سے بے حد احترام کا برتاؤ بھی کیا اور انھیں بہ درجہ غایت اکرام کے مستحق گردانا۔ چناں چہ حج سے واپس آنے کے بعد حضرت نے مولوی سید عبدالعزیز (ساکن موضع صمدن ضلع فرخ آباد) تحصیل دار متھرا کے خط کے جواب میں جو مکتوبِ گرامی ارسال فرمایا، اس میں لکھتے ہیں:

> "بخدمت عبدالعزیز سلمہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ الحمد للہ کہ میں سفر حجاز سے واپس آیا۔ آپ نے اخبار میں سب حال دیکھے ہوں گے۔ نصرۃ السنۃ نے جو چھاپا ہے، وہ صحیح کیفیت سمجھو۔ برادرانِ ہند کی عنایت تھی، میرا جو اعزاز و تعظیم وتبجیل عرب میں ہوا، اس کا شکر بجناب باری تعالیٰ کرتا ہوں۔ بے شک سعایت معاندین ومنافقین سے مجھے

---

[1] الحیات بعد الممات، ص: ۹۶، ۹۷

ابتداءً بہت دشواریاں پیش آنا محسوس ہوئی تھیں، مگر الحمد للہ کہ وہ بالکل کچھ نہ تھیں ...... میرے ساتھ کوئی خلافِ امر واقعہ پیش نہیں آیا بلکہ میرے مخالفوں کو میری تکریم و تعظیم پر رشک تھا اور ہندوستان میں جو کیفیت سب کی تھی، آپ کو معلوم ہوئی ہوگی۔ جیسا کہ تم چاہتے ہو، میں بھی تم کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ فی الواقع زبانی حالات سن کر آپ کو تسکین ہوگی۔

الراقم العاجز
سید محمد نذیر حسین عفی عنہ
از دہلی

علم حدیث کی شہرتِ تدریس

علم حدیث کی تدریس کے سلسلے میں میاں صاحب کی شہرت مختلف اقطارِ عالم میں پھیلی ہوئی تھی اور دنیا کے بہت سے حصوں میں ان کے تلامذہ موجود تھے۔ ہندوستان کے تقریباً ہر ضلعے، ہر شہر اور ہر قصبے میں ان کے فیض یافتہ حضرات خدمت علم حدیث میں مشغول تھے۔ متعدد دیہات میں بھی ان کے شاگردوں کی مساند تدریس آراستہ تھیں۔ اس کے علاوہ بیرونِ ہند کے بہت سے ممالک میں ان کے مستفیدین اچھی خاصی تعداد میں قال اللہ وقال الرسول کی دل نواز صدائیں بلند کررہے تھے۔ مثلاً حجاز، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، یمن، نجد، شام، حبش، افریقہ، تیونس، الجزائر، کابل، غزنی، قندھار، سمرقند، بلخ، بخارا، داغستان، ایشیائے کوچک، ایران، مشہد، خراسان، ہرات، چین، کوچین، برہما، سری لنکا وغیرہ ملکوں اور علاقوں میں حضرت میاں صاحب کے شاگرد موجود تھے اور ان کے درس وتدریس کے حلقے قائم تھے، جن سے لوگ باقاعدہ استفادہ کررہے تھے۔ ملک حجاز میں بالخصوص حضرت میاں صاحب کی خدمت حدیث کا بہت چرچا تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ میاں صاحب جب حج کے لیے گئے اور ہندوستان کے بعض اہل بدعت نے ان کے خلاف حجاز کی اس وقت کی حکومت کے بعض سرکردہ افراد کو ان کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی تو اس کا پتا وہاں کے شیوخ اور مشاہیر اہل علم کو چلا جس کا ان پر شدید ردّ عمل ہوا اور وہ میاں صاحب کے مخالفین کے خلاف صف آرا ہوگئے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے میاں صاحب کے تلمیذ رشید اور رفیق سفر خادم مولانا تلطف حسین فرماتے ہیں:

”ہم لوگ جب اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو شیوخ اہل مشرق (جن کا قافلہ شہر سے کچھ فاصلے پر تھا اور اس میں چھ سو مسلح سوار تھے) آئے اور میری ان سے راستے میں ملاقات

ہوئی۔ شیوخ نے پوچھا این الشیخ؟ (شیخ کہاں ہیں؟) میں نے کہا مکان میں ہیں۔ ان شیوخ نے برہمی کے لہجے میں کہا کہ ہمیں دکھا دو، وہ کہاں ہیں۔ ہم لوگ ان کے بارے میں کچھ اور ہی باتیں سن کر آئے ہیں۔ میں نے ساتھ لے جا کر ان کی میاں صاحب سے ملاقات کرادی تو ان شیوخ نے کہا کہ ابھی ہم نے ایک موحش خبر سنی ہے اور ہمارا مقصد اس کی تحقیق کرنا تھا۔ الحمد للہ کہ ہم نے شیخ کو زندہ اور صحیح سالم دیکھا، ورنہ آج جو کچھ ہونا تھا، ہو کر رہتا۔"[1]

اللہ تعالیٰ نے میاں صاحب کو بے حد اعزاز سے نوازا تھا۔ ہر جگہ ان کا احترام کیا جاتا تھا اور لوگ ایک دوسرے سے بڑھ کر ان کی تکریم کرتے تھے۔ اس کی وجہ فقط ان کا علم وتقویٰ، رسول اللہ ﷺ کی حدیث پاک کی خالصۃً لوجہ اللہ تعلیم وتدریس اور اللہ کے دین کی اشاعت وتبلیغ تھی۔ اس کی بہت سی مثالوں میں سے یہاں صرف ایک مثال ملاحظہ فرمایئے، جس کا تعلق صوبہ بہار کے شہر آرہ سے ہے اور یہ ان کا آرہ کا آخری سفر ہے۔ آرہ کے علما وروسا کی درخواست پر جب وہ آرہ تشریف لے گئے تو ریلوے اسٹیشن سے ان کی قیام گاہ تک انھیں لے جانے کے لیے پالکی لائی گئی تھی۔ جوں ہی وہ ٹرین سے اترے اور لوگوں کی نظر ان کے چہرۂ مبارک پر پڑی تو استقبال کے لیے آنے والے علما وروسا کے دلوں میں ایسا جذبہ پیدا ہوا کہ انھیں پالکی میں بٹھا کر پالکی کو کندھوں پر اٹھا لیا اور اسی حالت میں قیام گاہ تک لایا گیا۔ ہر شخص آگے بڑھ کر پالکی کو کندھا دینے کا خواہش مند تھا، لیکن بہت سے لوگ اس سے محروم رہے۔ جدھر سے پالکی کو لے جایا جاتا، لوگ کھڑے ہو کر تعجب سے اس منظر کو دیکھتے اور حیران ہوتے تھے کہ یہ کون اتنا بڑا شخص ہے، جس کا اس قدر احترام کیا جارہا ہے۔

جہاں حضرت میاں صاحب کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر احترام کی دولت عطا فرمائی، وہاں انھیں بعض بہت بڑی تکلیفیں بھی پہنچیں۔ حج بیت اللہ سے ساڑھے تین برس بعد ۶۔ جمادی الاخریٰ ۱۳۰۴ھ (۲۔مارچ ۱۸۸۷ء) کو ۵۷ برس کی عمر میں ان کے فرزند گرامی مولانا سید شریف حسین وفات پا گئے۔ یہ چہار شنبہ کا روز تھا۔

شمس العلما کا خطاب

۲۲۔ جون ۱۸۹۷ء (۲۱محرم ۱۳۱۵ھ) کو (بروز سہ شنبہ) حکومت کی طرف سے میاں صاحب کو شمس العلما کا خطاب ملا۔ ہر حکومت مختلف لوگوں کو ان کے مقام ومرتبے کے مطابق کوئی نہ کوئی خطاب دیتی ہے۔ اس میں حکومت کی مخالفت یا موافقت کے مسئلے کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، صرف

[1] الحیات بعد الممات، ص: ۱۰۱

یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ شخص اس خطاب کا مستحق ہے یا نہیں۔ اگر مستحق ہے تو مخالفت وموافقت کی پروا کیے بغیر اسے خطاب دے دیا جاتا ہے۔ اب بھی یہ سلسلہ چلتا ہے۔ نہ ہر خطاب یافتہ حکومت کا مخالف ہوتا ہے، نہ موافق۔ بس اس کا استحقاق ہے جو اسے مل جاتا ہے۔ بسا اوقات خطاب یافتہ اپنی شخصیت اور قابلیت کے اعتبار سے اتنے اونچے مقام پر فائز ہوتا ہے کہ اس کے مقابلے میں خطاب کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، بلکہ خطاب کو اس کی وجہ سے اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ حضرت میاں صاحب کا معاملہ یہی تھا کہ وہ تو اپنی عظیم الشان خدمات کی وجہ سے مرتبۂ عالی پر فائز تھے ہی لیکن خطاب کو ان کی وجہ سے اعزاز کا مقام ملا۔ چناں چہ اسی زمانے میں مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنے ماہنامے ''دلگداز'' میں ''شمس العلما'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، جس کا ماحاصل یہ تھا کہ مولانا سید محمد نذیر حسین صاحب محدث دہلوی مدظلہٗ کی عزت افزائی اس خطاب سے ہو ہی نہیں سکتی۔ البتہ اس خطاب کو عزت اور شرف اُن کے نام کی برکت سے ضرور حاصل ہوا۔

مجددِ وقت

حضرت میاں صاحب سے متعلق گزشتہ صفحات میں بہت سے واقعات بیان کیے جاچکے ہیں اور بے شمار واقعات ابھی باقی ہیں جو ایک مستقل کتاب کے متقاضی ہیں۔ لیکن ہم تفصیل میں جائے بغیر آئندہ سطور میں چند واقعات سے اپنے لائق احترام قارئین کو مطلع کرنا چاہتے ہیں۔

میاں صاحب کی حیاتِ طیبہ کے شب وروز کے حالات اور قرآن وحدیث کے بارے میں ان کی خدمات کی تفصیلات پڑھ کر ذہن یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ بے شک وہ اپنے دور کے مجدد تھے اور اس دور میں منصبِ تجدید انھی کو زیب دیتا تھا۔ تجدید کے معنے ہیں دین کو نیا کر دینا یعنی لوگوں کے دلوں میں دین پر عمل کے بارے میں جو کمی واقع ہوگئی تھی، اس میں از سر نو اضافہ کرنے کے اسباب بروئے کار لانا اور احکامِ الٰہی کی تبلیغ واشاعت کی جدوجہد کرنا۔ بے شک یہ خصوصیات میاں صاحب میں بہ درجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ انھوں نے غیر اسلامی رسوم کو ختم کرنے کی کوشش کی، بدعات کو مٹانے کا عزم کیا، لوگوں میں دین کے متعلق جو غلط رجحانات پیدا ہوگئے تھے، ان میں اصلاح کے لیے میدانِ عمل میں اترے۔ ان کا اصل مقصد ہی یہ تھا کہ اللہ کی مخلوق میں شعائر اسلام سے محبت کا جذبہ ابھرے، امورِ دین میں ترقی کا عمل جاری ہو، اصلاحی کام کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو، بدعت اور سنت میں شریعت نے جس فرق کی نشان دہی کی ہے، وہ سب کے سامنے نمایاں ہو۔ برائی کے ارتکاب کے اسباب کا خاتمہ ہو اور نہی عن المنکر کے لیے فضا سازگار ہو، علوم قرآن وحدیث کی تعلیم وترویج کے لیے لوگوں میں دلچسپی پیدا ہو اور ان میں ایک ایسی جماعت معرضِ وجود

میں آئے جو قرآن وحدیث کی اشاعت کے لیے اپنے آپ کو وقف کردے۔ میاں صاحب نے ستر برس تک قرآن وحدیث کا درس دیا اور لاتعداد لوگوں نے ان سے استفادہ کیا اور پھر آگے چل کر ان لوگوں نے مختلف مقامات پر تدریس کے حلقے قائم کیے اور لوگوں کو کتاب وسنت کی تعلیم سے روشناس کرایا۔ ان کے شاگردوں کا حصر ممکن نہیں۔

میاں صاحب درویش منش عالم تھے۔ انھوں نے دہلی میں اپنی تعلیم رسمیہ مکمل کی اور پھر دہلی ہی میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا جو زندگی کے آخری دم تک جاری رہا۔ انھوں نے کہیں ملازمت نہیں کی، کسی کے دست نگر نہیں ہوئے، کوئی دولت جمع نہیں کی، کبھی کسی سرمایہ دار کے دروازے پر نہیں گئے، کوئی سرکاری عہدہ قبول نہیں کیا، قاضی القضاۃ کا منصب پیش کیا گیا، اسے بھی ٹھکرا دیا۔ کسی کی مخالفت کی کبھی پروا نہیں کی۔ علم کو کسی وقت بھی ذریعۂ معاش نہیں بنایا، غربت کی زندگی بسر کرتے رہے، فاقوں پر فاقے آئے مگر دلّی کو نہیں چھوڑا اور جس مقام پر حضرت استاذ شاہ محمد اسحاق صاحب نے بٹھا دیا، تمام عمر وہیں بیٹھے رہے۔ اس شہر میں بے پناہ اثر ورسوخ کے باوجود اپنا ذاتی مکان نہیں بنایا۔ آخر وقت تک کرائے کے مکان میں رہے۔ قابل ترین تلامذہ اور جلیل القدر علماے دین کی اتنی تعداد اپنے بعد چھوڑی کہ جس کو گنتی شمار میں لانا ممکن نہیں۔

ان کی تدریسی مساعی کی وجہ سے برصغیر کے اہل علم میں قرآن وحدیث کے تراجم کا شوق پیدا ہوا، تفاسیر قرآن اور شروح حدیث کے ذوق نے کروٹ لی، مسجدیں تعمیر اور آباد ہوئیں، لوگوں نے راہِ سنت کو اپنایا اور جگہ جگہ مدارس قائم کیے۔ بے شک یہ سب کوششیں اور تمام تگ وتاز اس حقیقت پر دلالت کناں ہیں کہ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ اپنے دور کے مجدد تھے اور ان کی تجدید دین کے آثار پوری اسلامی دنیا پر بالعموم اور برصغیر پاک وہند پر (جس میں بنگلہ دیش بھی شامل ہے) بالخصوص نمایاں تھے۔

پیکرِ حسنات

جیسا کہ گزشتہ صفحات سے ہمیں معلوم ہوا، حضرت میاں صاحب کی زندگی کے لیل ونہار حسنات سے عبارت اور اعمالِ خیر کے حسین ترین قالب میں ڈھلے ہوئے تھے۔ طہارت وپاکیزگی ان کا شیوہ اور عبادتِ الٰہی ان کا معمول تھا۔ عفو ودرگزر ان کا خاصۂ حیات اور سخاوت وجودت ان کا شب وروز کا مشغلہ تھا۔ زہد وقناعت ان کا پیشہ تھا اور انکسار وتواضع ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی۔ تحمل ورفق ان کا لازمۂ زندگی اور خدمت خلق ان کا سرمایۂ عمل تھا۔ صبر ان کا جزوِ حیات اور اعتدال ان کا رفیق سفر تھا۔ حیا کو ان کے متاعِ زیست کی حیثیت حاصل تھی اور شاکراً لانعمہ کی وہ خوب صورت

تصویر اور انابت الی اللہ کا کامل ترین نمونہ تھے۔ ان اوصاف سے متصف لوگ ہمیشہ پیدا نہیں ہوتے، مشیت خداوندی سے وہ ایک خاص فضا میں عالم وجود میں آتے ہیں اور ایک خاص ماحول میں ان کی ذہنی بالیدگی اور جسمانی نشوونما کے اسباب اس وقت فراہم کیے جاتے ہیں، جب کہ اس دنیا میں ان کی شدید ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔

اب آیئے حضرت میاں صاحب کی حیاتِ مبارکہ کے مذکورہ بالا عنوانات کی مختصر الفاظ میں شرح بیان کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ان کی طہارت وپاکیزگی کے متعلق چند الفاظ......!

اس باب میں ہمارے نزدیک سب سے قابل اعتماد ذریعہ حضرت میاں صاحب کے اوّلیں تذکرہ نگار جناب مولانا فضل حسین بہاری کا بیان ہے، جو میاں صاحب کے شاگرد اور ان کی عملی تگ ودو کے چشم دید گواہ ہیں، لہٰذا ان کے متعلق ان کے بیان کو بنیادی اہمیت دی جائے گی۔ وہ فرماتے ہیں کہ سوائے ان تین چار گھنٹوں کے جو نیند کی حالت میں گزرتے تھے، مشکل ہی سے کسی ایسے وقت کی نشان دہی کی جاسکتی ہے، جب حضرت میاں صاحب باوضو نہ ہوں۔ وہ شب کو ایک بجے بیدار ہوجاتے اور وضو کر کے نماز تہجد پڑھنا شروع کر دیتے تھے۔ ساڑھے تین بجے تک یہ عمل جاری رہتا۔ اس کے بعد مسجد میں جاتے۔ پھر مسجد کے اندر یا صحن میں بیٹھ کر مراقبے کی سی کیفیت اختیار کر لیتے اور ذکر الٰہی میں مصروف ہوجاتے۔ اس وقت بالعموم نہایت دردناک لہجے میں موقعے کی مناسبت سے عربی، فارسی اور اردو کے اشعار بھی پڑھتے۔ نمازِ فجر کے بعد قرآنِ مجید کا درس ہوتا۔ پھر گیارہ بجے تک طلبا کو حدیث شریف پڑھاتے۔ جیب میں تسبیح بھی رہتی اور وہ ہاتھ میں بھی منتقل ہوجاتی۔ ماثورہ اوراد واذکار پڑھنے کا سلسلہ بھی جاری رکھتے۔ گیارہ بجے مسجد سے گھر تشریف لے جاتے اور بارہ بجے واپس مسجد آجاتے۔ اس وقت سے مغرب تک تین وقتوں کی نمازوں اور درس کے سوا اور کوئی کام نہ ہوتا۔ مغرب کی نماز پڑھ کر گھر چلے جاتے اور پھر ثلث شب کے قریب نماز عشا کے لیے مسجد آتے۔ حوائج ضروریہ کے اوقات کے علاوہ اس تمام وقت میں وہ باوضو اور طاہر رہتے۔ نماز نہایت اعتدال اور خشوع وخضوع سے پڑھتے۔ قرأت میں ایسی خشیت طاری ہوتی اور اس طرح اللہ کی طرف رجوع فرماتے کہ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ کی کیفیت طاری ہوجاتی۔

اب حضرت میاں صاحب کی عفت مآبی اور پاک بازی کی طرف چند اشارے:

میاں صاحب عین عالم جوانی میں دہلی میں آئے تھے اور سب سے پہلے ان کا تعلق مولانا سید عبدالخالق صاحب سے ہوا تھا۔ چھ سال وہ ان سے حصولِ علم کرتے رہے اور اس اثنا میں تھوڑا بہت تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے درس میں بھی ان کی حاضری رہی

اور ان سے مستفید ہوئے۔ چھ سال کی اس طویل مدت میں مولانا عبدالخالق صاحب پر بھی ان کی عفت کے تمام پہلو ظاہر ہوگئے تھے جس سے متاثر ہو کر انھوں نے ان سے اپنی بیٹی کا رشتہ کیا اور حضرت شاہ محمد اسحاق اور ان کے برادر صغیر شاہ محمد یعقوب پر بھی آشکار ہوگیا تھا کہ یہ شابِ صالح اور جوانِ عفت مآب ہے، اسی لیے انھوں نے ان کے نکاح کی کفالت کی ذمہ داری قبول فرمائی اور خود نکاح خوانی کا فریضہ انجام دیا۔ اور اس تقریب سعید کی خوشی میں دونوں عظیم بھائیوں (شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب) نے تمام رات درس قرآن وحدیث کا سلسلہ جاری رکھا، جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔

میاں صاحب کی پاک بازی اور عفت شناسی کی نہ اس سے کوئی بڑی شہادت پیش کی جا سکتی ہے اور نہ اس سے کوئی بڑا ثبوت لایا جاسکتا ہے۔

خادم خلق

حضرت میاں صاحب اپنے عہد کے بہت بڑے عالم اور بہت بڑے محدث ہونے کے ساتھ بہت بڑے خادم خلق بھی تھے۔ وہ عام لوگوں کی بھی خدمت کرتے تھے اور طلبا کی بھی......! سردی، گرمی، برسات ہر موسم میں وہ لوگوں کی خدمت کے لیے تیار رہتے اور ان کی مدد کے لیے پیادہ پا کہیں سے کہیں چلے جاتے۔ بازار سے لوگوں کی چیزیں خرید لاتے بلکہ گھروں میں آواز دیتے کہ میں بازار جارہا ہوں، کسی نے کوئی چیز منگوانی ہو تو منگوالے۔ بارش ہو یا گرمی اور سردی طلبا کا کھانا خود مدرسے اور مسجد میں پہنچاتے۔ رمضان میں سحری کے وقت بالخصوص طلبا کے لیے بروقت کھانا پہنچانے کا اہتمام فرماتے۔ بارش کی حالت میں جب کہ طلبا کو مدرسے کے دروازے پر جا کر کھانا لینا مشکل ہوتا اور مدرسے کی گلی میں گھٹنوں تک پانی کھڑا ہوجاتا، مولانا فضل حسین بہاری فرماتے ہیں کہ اس حالت میں، میں نے اپنے کانوں سے میاں صاحب کی آواز مدرسے کے اندر سنی کہ وہ گلی میں کھانا دستر خوان میں لپیٹے ہوئے ہر طالب کا نام لے کر بار بار پکار رہے ہیں: اجی فلاں مولوی صاحب اپنی روٹی لے لو۔ اجی فلاں مولوی صاحب اپنی روٹی لے لو...... بتائیے اس قسم کی خدمت کوئی عالم دین کسی کی کرسکتا ہے اور کوئی استاد یا مدرسے کا مہتمم طلبا کے لیے اتنا مہربان اور مشفق ہوسکتا ہے......؟

نکاح خوانی کا سلسلہ

مولانا فضل حسین بہاری کے بقول میاں صاحب کے زمانے میں دہلی کی کل آبادی دو ڈھائی

لاکھ کے قریب ہوگی۔ مسلمان بھی بہت بڑی تعداد میں آباد تھے، جن میں بڑے بڑے رئیس بھی تھے، متوسط درجے کے لوگ بھی تھے اور غریب بھی تھے۔ اگر کسی کے نکاح کا موقع آتا تو ہر شخص کی آرزو ہوتی کہ اس کے بیٹے بیٹی یا رشتے دار کا نکاح میاں صاحب پڑھائیں۔ اس سلسلے میں کوئی ان کی خدمت میں آتا تو انکار نہ فرماتے، بلا تامل اس کے ساتھ چل پڑتے اور نکاح پڑھاتے۔ نکاح پڑھوانے والے بھی ہمیشہ اس کا خیال رکھتے اور میاں صاحب کے اس عمل کا احترام کرتے۔

ایک خاتون کا فیصلہ

ایک مرتبہ ایک نیک بخت عورت کا اپنے سوتیلے بیٹے سے وراثت کے مال کی تقسیم پر کوئی جھگڑا ہوگیا۔ معاملہ میاں صاحب تک پہنچا تو انھوں نے عورت کو سمجھانے کی کوشش کی، مگر عورت اپنی بات پر بہ ضد رہی۔ پھر میاں صاحب نے اس عورت سے کہا: ارے ہم نے تیری نانی کا نکاح پڑھایا، تیری ماں کا نکاح پڑھایا، تیرا نکاح پڑھایا۔ ہم تمھارے خیر خواہ ہیں۔

یہ الفاظ سن کر وہ عورت رونے لگی اور عرض کیا: حضور! جس طرح آپ چاہیں تقسیم کردیں۔ ہم کو منظور ہے۔

لوگوں کی غمی شادی میں شرکت

میاں صاحب طبعی طور سے نہایت ملنسار تھے اور اپنے ملنے والوں کی غمی شادی میں شریک ہوتے تھے۔ جس طرح وہ لوگوں کی شادیوں میں شرکت فرماتے تھے، اسی طرح ان کی غمی کے موقعے پر بھی ان کے گھروں میں جاتے اور جنازوں میں شامل ہوتے تھے۔ یہ ان کے اخلاق کی بلندی کی علامت تھی۔ وہ نرم مزاج اور عالی کردار عالم دین تھے۔ امیر اور غریب ان کے نزدیک برابر تھے۔ ہر مرنے والے کو وہ قابل تکریم قرار دیتے تھے اور اس کی تجہیز وتکفین میں شمولیت ان کے نقطۂ نظر کے مطابق ضروری تھی۔

لوگوں کی سفارش

اپنے مخالفوں اور معاندوں کے لیے انھوں نے ہمیشہ عفو و درگزر سے کام لیا۔ ایک شخص رام پور کا رہنے والا تھا اور میاں صاحب کا سخت مخالف تھا۔ جس سال میاں صاحب حج کے لیے گئے تھے وہ بھی گیا تھا۔ ہر موقعے پر وہ میاں صاحب کی ایذا رسانی کے لیے کوشاں رہا۔ حتی کہ اس نے میاں صاحب کے قتل کا منصوبہ بھی بنایا، لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ میاں صاحب کو اس کی تمام حرکات کا علم تھا، لیکن کچھ نہیں کہتے تھے۔ حج سے واپس آئے تو ایک دن وہ مسجد میں میاں صاحب سے ملنے آیا۔

میاں صاحب نہایت خندہ پیشانی سے ملے اور اس سے خیر وعافیت پوچھی۔ اس نے ایک سلسلے میں میاں صاحب سے درخواست کی کہ آپ نواب رام پور کے نام میرے لیے سفارشی خط لکھ دیں تو میرا کام ہوجائے گا۔ میاں صاحب نے فرمایا بھائی میں غریب آدمی ہوں، میری سفارش کا نواب صاحب کے نزدیک کوئی وزن نہیں ہوگا۔ لیکن اس نے اصرار کیا کہ آپ ضرور خط لکھ دیں، نواب صاحب آپ کی سفارش مانیں گے۔

میاں صاحب نے فرمایا اگر تم اصرار کرتے ہو تو میں خط لکھ دوں گا۔ عصر کے بعد آکر خط لے جانا۔ اس کا پتا مولانا تلطف حسین کو بھی چل گیا جو سفر حج میں حضرت میاں صاحب کے ساتھ تھے اور انھیں معلوم تھا کہ اس شخص نے میاں صاحب کو کتنی تکلیفیں پہنچائی تھیں۔ چناں چہ وہ عصر کے بعد میاں صاحب کے پاس آکر بیٹھ گئے، ادھر خط لینے کے لیے رام پوری صاحب بھی آگئے۔ میاں صاحب نے ان کو خط دیا تو مولوی تلطف حسین نے جھٹ سے کھڑے ہوکر وہ خط اس شخص سے چھین لیا اور پھاڑ دیا۔ پھر میاں صاحب سے کہا کہ آپ کو پتا ہے یہ شخص مکہ مکرمہ میں کتنا آپ کے درپے آزار رہا ہے اور آپ اس کو سفارشی خط دے رہے ہیں۔ میاں صاحب نے کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

مولوی تلطف حسین چلے گئے تو میاں صاحب نے رام پوری صاحب سے فرمایا اب تم جاؤ۔ کل اتنے بجے میرے مکان کی گلی میں آنا، میں تم کو وہاں خط دے دوں گا۔ مولوی تلطف حسین صاحب کو کسی ذریعے سے اس کا بھی پتا چل گیا، لیکن وہ خاموش رہے۔ وہ جانتے تھے کہ اب بھی انھیں خط سے روکا گیا تو وہ خود اس کے گھر جا کر اسے خط دے آئیں گے۔ بہر حال وہ حضرت میاں صاحب کا سفارشی خط لے کر نواب رام پور کے پاس گیا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔

یہ تھے حضرت میاں نذیر حسین صاحب۔ اس قسم کی عادات وخصائل کا عالم دین اب کہیں نہیں ملے گا جو اپنے سخت تریں مخالفوں سے بھی اس قدر ہم دردی کا اظہار کرتا ہو۔

میاں صاحب کے شاگردوں میں ایک شخص محمد شاہ پنجابی تھا جو غالباً میاں صاحب کے مخالفوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا اور میاں صاحب کی مخالفت کرنے لگا تھا۔ اس کی ہمیشہ یہ عادت رہی کہ جب اسے روپے کی ضرورت پڑی، وہ بے تکلف میاں صاحب کے پاس آیا اور اپنی ضرورت کے مطابق ان سے روپے لے گیا۔ طلبا میاں صاحب سے اس کے بارے میں کچھ کہتے تو میاں صاحب خاموش رہتے۔ فارسی کا یہ شعر میاں صاحب پر پوری طرح صادق آتا تھا۔

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا
دلِ دشمناں ہم نہ کردند تنگ

قتل کا ارادہ کرنے والے کا انجام

میاں صاحب کے زمانے میں دہلی میں ایک بزرگ عطاء اللہ سوداگر پنجابی فروکش تھے جو میاں صاحب کے مخلص ترین عقیدت مند تھے اور اکثر ان کی خدمت میں آیا کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے کہا کہ "میں میاں صاحب سے بہت ڈرتا ہوں۔" پوچھا گیا "کیوں ڈرتے ہو؟" انھوں نے بتایا کہ ایک دن میاں صاحب کے ایک مخالف نے ان کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا اور وہ تلوار پکڑ کر پھاٹک حبش خاں میں ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں اسے کوئی دیکھ نہ سکے۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ میاں صاحب عشا کی نماز کے لیے مسجد میں جائیں گے تو آتے یا جاتے ہوئے انھیں قتل کردیا جائے گا۔ چناں چہ میاں صاحب وہاں آئے تو وہ تلوار ہاتھ میں تھامے ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میاں صاحب نے اسے ڈانٹتے ہوئے فرمایا: اگر میں بنی فاطمہ ہوں تو تو اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہوسکے گا۔ یہ الفاظ سنتے ہی اس کے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا، ہاتھ سے تلوار گر گئی اور وہ گھر کی طرف بھاگا، گھر پہنچتے ہی اس کے پیٹ میں اتنا شدید درد اٹھا کہ زندگی سے مایوس ہوگیا۔ اب لوگوں کو بلا کر اس نے کہا کہ میں غضب الٰہی میں مبتلا ہوں اور اس ابتلا کی وجہ یہ ہے۔ چناں چہ اسی کی زبان سے لوگوں میں اس واقعہ کی تشہیر ہوئی اور وہ اسی دن مرگیا۔

ایثار نفس کی انتہا

حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی روایت کرتے ہیں کہ شروع شروع میں جب حضرت میاں صاحب عسرت کا شکار تھے اور اکثر فاقے تک نوبت پہنچ جاتی تھی، مولوی محمد دین پنجابی ان کے مہمان ہوئے، میاں صاحب دونوں وقت اپنے حصے کا کھانا ان کو پیش کردیتے تھے۔ تین دن اور تین رات مسلسل یہی ہوتا رہا اور خود میاں صاحب فاقے میں رہے۔ اس حالت میں نہ حضرت کی پابندئ اوقات میں فرق آیا اور نہ عام معمولات میں کوئی کمی بیشی ہوئی۔ نہ ان دنوں کسی کو ان کے فاقوں کا پتا چلا۔ البتہ بعض اوقات اتنا ہوتا تھا کہ بیٹھ کر نہ پڑھا سکتے تو لیٹ کر پڑھانے لگتے، سبق میں ناغہ بالکل نہ کرتے۔ یہ ان کے ایثارِ نفس کی ایک مثال ہے اور یہی معنے ہیں **یؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ** کے۔

سخاوت وجودت

اپنے ذاتی کوائف اور اس زمانے کے حالات کے مطابق میاں صاحب میں سخاوت وجودت کا بے حد جذبہ پایا جاتا تھا۔ مسجد کے دروازے پر حاجت مند اور مسکین کھڑے ہوتے تو میاں صاحب

خود ان کے پاس جاتے اور اس طرح چپکے سے انھیں کچھ دے آتے کہ کسی کو خبر نہ ہو پاتی۔

طلبا کی امداد

مولانا عبدالحمید سوہدروی بیان کرتے ہیں کہ "ایک روز میاں صاحب نے مجھے دو روپے دیے۔ میرے پاس چوں کہ اپنے خرچ کے لیے پیسے موجود تھے، اس لیے میں نے معذرت کی اور روپے لینے سے انکار کیا لیکن انھوں نے بہ اصرار مجھے دو روپے عنایت فرمائے۔"

انھی مولانا عبدالحمید سوہدروی کا بیان ہے کہ ایک دن نماز ظہر یا عصر میں حضرت میاں صاحب پہلی صف میں تھے۔ ان کے دائیں جانب ایک طالب علم تھا۔ میاں صاحب کے پیچھے دوسری صف میں میں تھا۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی اسی جگہ بیٹھے ہوئے انتہائی اخفا کے ساتھ میاں صاحب نے طالب علم کو کچھ دیا۔ میرا خیال ہے اس صدقے کی خبر سوائے دینے اور لینے والے کے کسی کو نہ ہوئی۔ مجھے بھی اس لیے پتا چلا کہ اتفاقاً میں ان کے پیچھے تھا، لیکن حضرت میاں صاحب کو یا اس طالب علم کو میرے دیکھنے کی بھی خبر نہ ہوئی۔ یہ ہے رجل یتصدق بیمینه یخفیها من شماله اور انفاق فی السر کا مطلب۔

تقویٰ اختیار کرنے کی نصیحت

تقوے کے بارے میں قرآنِ مجید میں فرمایا گیا ہے ان اکرمکم عند اللّٰہ اَتْقٰکُمْ یعنی اللہ کے نزدیک تم میں بہتر شخص وہ ہے جسے تقوے کی نعمت عطا کی گئی ہے۔ جب علم حدیث کی تحصیل کے بعد میاں صاحب مدرسے کے طلبا کو رخصت کرتے تو فرماتے اوصیکم بتقوی اللہ ...... (میں تمھیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی نصیحت کرتا ہوں۔)

تقوے کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم کا تعلق عادات وعبادات سے ہے، اور دوسری کا ماکل ومشارب سے۔ حضرت میاں صاحب تقوے کی ان دونوں قسموں پر عامل تھے اور طلبا کو بھی ان پر عمل پیرا ہونے کی تاکید فرماتے تھے۔ چناں چہ ان کے تمام شاگرد تقوے کے اوصاف سے متصف تھے۔

عفو تقصیر اور اس کا نتیجہ

مولانا محمد بدر الحسن سہوانی بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے میاں صاحب کی دعوت کی۔ میاں صاحب تشریف لائے، مگر کھانے سے قبل انھیں متلی سی ہوئی اور قے آنے لگی۔ اس لیے انھوں نے کھانا تناول نہیں فرمایا اور گھر تشریف لے گئے۔ ان کے تشریف لے جانے کے بعد میرے ملازم کے پیٹ میں شدید درد ہونے لگا، جس سے وہ نیم بسمل ہوگیا۔ اس کا نام عبدالنبی تھا اور رام پور کا

رہنے والا تھا۔ میاں صاحب کے بارے میں اس کے دل میں سخت عداوت کے جراثیم پائے جاتے تھے۔ جب تکلیف بہت بڑھ گئی اور وہ اپنی زندگی سے مایوس ہوگیا تو اس نے مولانا محمد بدر الحسن سہوانی سے منت سماجت کی کہ آپ میاں صاحب سے میرا قصور معاف کرا دیجیے۔ یہ درد نہیں ہے بلکہ اللہ کی طرف سے میری غلطی کی سزا مجھے مل رہی ہے...... مولانا محمد بدر الحسن کے اصل واقعہ دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ میاں صاحب سے سخت عداوت کی بنا پر میں نے بکرے کے گوشت کے بجائے ان کے لیے خنزیر کا گوشت پکایا تھا، مگر ان کو تو اللہ نے اس کے کھانے سے محفوظ رکھا اور مجھ پر شدید درد کی صورت میں عذابِ الٰہی نازل ہوگیا۔

قصہ مختصر یہ کہ ملازم کی درخواست پر مولانا ممدوح اسے میاں صاحب کے حضور لے گئے اور ان سے سارا واقعہ بیان کیا۔ میاں صاحب نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ پھر مولانا سہوانی نے میاں صاحب سے ملازم کی تقصیر معاف کرنے کی سفارش کی تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے ان الفاظ میں دعا کی۔

اے مجیب الدعوات۔ تیرے رسول کریم ﷺ کے ساتھ لوگوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔
دھوکے بھی دیے، شعبدے بھی کیے۔ پھر اگر مجھ ناچیز بندے کے ساتھ کسی نے کچھ کیا ہے
تو تو اسے معاف فرما۔ تو ارحم الراحمین ہے اور اسے ہدایت فرما۔ تو ہادی الضالین ہے۔

چناں چہ اسی وقت اللہ نے اس کو درد سے نجات بخش دی اور وہ میاں صاحب کے دست مبارک پر تائب ہوا۔ آپ کی بیعت کی اور اس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ اس کے بعد وہ ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلا گیا تھا اور وہیں بود و باش اختیار کر لی تھی۔

سادہ غذا اور سادہ زندگی

غذا میں سادگی کا یہ حال تھا کہ زیادہ تر سرکے کے ساتھ روٹی کھاتے یا فقط ستو پر اکتفا فرماتے یا شہد کے ساتھ روٹی کھالیتے۔ کبھی بھنے ہوئے چنوں پر گزارا کر لیتے۔ کبھی روٹی اور معمولی سالن اور کبھی روٹی اور شہد پر بس کرتے۔ حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی ان کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے ایک دن دوپہر کے وقت ان کی دعوت کی۔ اپنے ایک ساتھی کو ان کی خدمت میں بھیجا کہ کھانے کا وقت ہوگیا ہے، تشریف لایئے۔ مولانا فرماتے ہیں جب کافی دیر تک تشریف نہ لائے تو میں خود حاضر ہوا۔ دیکھا کہ روٹی اور سرکہ تناول فرما رہے ہیں۔ میرے دل کی اس وقت جو کیفیت ہوئی، اسے کن الفاظ میں بیان کروں۔ صرف یہی عرض کیا، ”غالباً آپ کو میری دعوت کا خیال نہیں رہا ہوگا۔“

یہ اپنے دور کے برصغیر کے سب سے بڑے اور سب سے مشہور عالم کی حالت تھی۔ کیا موجودہ

دور کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا عالم اس کا تصور کر سکتا ہے؟ کسی بڑے کو تو خیر اس قسم کا معاملہ خواب میں بھی پیش نہیں آ سکتا۔

ایک بزرگ جناب میر شاہ جہاں صاحب حضرت میاں صاحب کے عزیزوں میں سے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے چند سوالات تحریری صورت میں میاں صاحب کی خدمت میں بھیجے۔ میاں صاحب نے ان کا جواب ۱۰۔ جمادی الاخریٰ ۱۳۱۸ھ (۸۔اکتوبر ۱۹۰۰ء) کو ارسال فرمایا۔ جواب میں ایک فقرہ یہ تھا کہ "دولت نہ کبھی ہمارے پاس ہوئی، نہ اب ہے، جو کسی کے پاس چھوڑ جاؤں۔ خرچ کے موافق اللہ تعالیٰ دیتا رہا، یہ اس کا احسان ہے۔"

میاں صاحب کے جاں نثار معتقدین میں سے دہلی کے ایک مشہور سوداگر میاں عطاء اللہ پنجابی تھے۔ انھوں نے ایک دن عرض کیا کہ حضور آپ بہت ضعیف ہوگئے ہیں، ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھانے میں آپ کو تکلیف ہوتی ہے۔ روئی کا گدّہ بنا دیتا ہوں۔ اس پر بیٹھ کر طلبا کو پڑھایا کیجیے۔ فرمایا: "پرانی قبر پر کیا گچ کرو گے۔" ان کی درخواست میاں صاحب نے منظور نہیں فرمائی۔ یہی معنے ہیں حدیث کے ان الفاظ کے **کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل۔**

(دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرو، جیسے کہ تم اجنبی ہو یا مسافر ہو۔)

قناعت پسندی اور جرم کی معافی

حضرت میاں صاحب نہایت قناعت پسند اور درویش منش عالم تھے۔ والیہ بھوپال نواب سکندر جہاں بیگم اپنی ریاست کے مدار المہام منشی جمال الدین صدیقی کے ساتھ دہلی آئیں اور حضرت میاں صاحب سے ملیں۔ ان سے ریاست کا عہدۂ **قاضی القضاۃ** قبول کرنے کی درخواست کی۔ میاں صاحب نے انکار کر دیا۔ فرمایا میں تو ریاست کے **قاضی القضاۃ** کے منصب عالی پر فائز ہو کر حاکمانہ مسند پر بیٹھ جاؤں گا اور ٹھاٹھ سے امیرانہ زندگی بسر کروں گا لیکن یہ غریب طلبا جو چٹائی پر بیٹھ کر علم حدیث حاصل کرنے کے متمنی ہیں، مجھے کہاں ملیں گے......؟ یہی شرح ہے حدیث پاک کے ان دعائیہ الفاظ کی **اللھم احینی مسکینا وامتنی مسکینا واحشرنی فی زمرۃ المساکین۔**

(اے اللہ! مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھ، مسکینی ہی کی حالت میں موت دے اور قیامت کو مسکینوں کی جماعت میں اٹھا۔)

میاں صاحب کو مختلف مقامات سے روزانہ بہت سے خطوط آتے تھے۔ ایک دن ایک خط آیا جس میں لکھا تھا کہ میں آپ کی فلاں فلاں کتابیں جو تقریباً سو روپے کی ہوں گی، بلا اجازت لے کر یہاں کول (علی گڑھ) آ گیا ہوں۔ آپ مجھے معاف کر دیں اور تفسیر جلالین بھیج دیں۔ میاں صاحب

نے تفسیر جلالین بازار سے خریدی اور اسے بھیج دی۔ ساتھ ہی خط لکھا کہ کتابیں لے جانے کا فکر نہیں، لیکن آپ یہاں سے چلے کیوں گئے؟ آیئے اور ہم سے ملیے۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ میاں صاحب کا دہلی میں اپنا مکان نہیں تھا، کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ مکان کے جس حصے میں ان کی رہائش تھی، وہ صرف ایک سائبان تھا جو گرمیوں کے موسم میں دوپہر کے بعد اتنا گرم ہو جاتا تھا کہ کسی دوسرے آدمی کے لیے اس میں تھوڑی دیر بیٹھنا بھی مشکل ہو جاتا، لیکن میاں صاحب وہیں بیٹھ کر لوگوں کے خطوط کے جواب دیتے اور وہیں فتویٰ نویسی کرتے۔ کوئی طالب علم گرمی کی شدت کے متعلق کہتا تو بہ طور مزاح فرماتے کہ میں جس سائبان میں رہتا ہوں تم ایک گھنٹا وہاں سو جاؤ تو تمھیں دو روپے دوں گا۔

طلبا کے لیے مسجد میں شطرنجی کا فرش تھا مگر میاں صاحب خود ہمیشہ اور ہر موسم میں چٹائی یا ٹاٹ پر بیٹھتے اور اس بے تکلفی سے بیٹھتے کہ کسی کو کچھ کہنے اور دوسری جگہ بیٹھنے کے لیے اصرار کرنے کا موقع نہ ملتا۔

کمزور کی تکریم اور خدمت

١٨٥٧ء کے بعد تیموری خاندان کے شہزادے بے حد مصائب میں مبتلا ہو گئے تھے۔ جب وہ میاں صاحب کے پاس آتے تو آپ ان کی تکریم کے لیے کھڑے ہو جاتے اور جو کچھ نقدی یا کسی اور صورت میں بن پڑتا ان کو پیش کرتے۔ کوئی شخص غائبانہ ان کی کسی حرکت یا وضع قطع پر تعریض کرتا تو اسے روکتے اور سرد آہ بھر کر فرماتے: آج ان کی یہ حالت ہے ورنہ ہم جیسوں کا تو یہ سلام لینا بھی پسند نہ کرتے تھے۔

حضرت میاں صاحب کی عادت تھی کہ بازار سے خود سودا خریدنے جاتے اور خود ہی اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر لاتے۔ کوئی شاگرد یا کوئی اور شخص آگے بڑھ کر اٹھانے کی کوشش کرتا تو اھل المال احق بہ (مال کا مالک اس کا زیادہ حق دار ہے) کہہ کر اسے روک دیتے۔ حالت تدریس میں کسی کتاب کی ضرورت ہوتی تو مسند درس سے اٹھ کر خود کتاب لاتے۔ بے شک اس کے لیے بار بار جانا پڑتا، لیکن کسی طالب علم کو نہ کہتے کہ فلاں جگہ سے فلاں کتاب اٹھا لاؤ۔ کسی سے کسی کام کے لیے کہنا ان کی عادتِ مبارکہ کے خلاف تھا۔ نہ صرف اپنا کام خود کرتے بلکہ دوسرے کا کام کرنے کی بھی کوشش فرماتے۔

حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی راوی ہیں کہ ان کے زمانۂ طالب علمی میں ایک روز ایک مجذوم شخص میاں صاحب کے پاس آیا اور بڑی بے تکلفی سے ان کے سامنے آ کر بیٹھ گیا اور جاہلانہ

انداز میں کہنے لگا:

میاں نجیر حسین (نذیر حسین) دو کام ہیں۔ بتا پہلے کون سا کام کرے گا؟

میاں صاحب نے فرمایا: تو جس کام کو کہے گا، پہلے وہی کروں گا۔

اس نے کہا: پہلے خدا کا کام کر۔ بتا کہ الحمد سرپھ (شریف) امام کے پیچھے پڑھی جائے یا نہیں اور رپھ یدین (رفع یدین) بھی کرنا چاہیے یا نہیں؟

میاں صاحب نے دونوں مسئلے اسے بتائے اور اسے اطمینان ہوگیا تو کہا:

لے اب میرا کام کر۔ میں بھوکا ہوں۔ گھر سے کھانا لا کر کھلا۔

میاں صاحب مکان پر تشریف لے گئے اور اسے کھانا لا کر کھلایا۔

ایک اور واقعہ سنیے۔ اس کے راوی بھی حافظ عبدالمنان وزیر آبادی ہیں اور یہ واقعہ انہی کو پیش آیا تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں بیت الخلا کی طرف جارہا تھا۔ ایک بیل راستہ روکے بیٹھا تھا۔ میں نابینا آدمی مجھے معلوم نہیں تھا۔ اس اثنا میں کسی نے چپکے سے میرا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف کو لے جا کر مجھے بیت الخلا میں بٹھا دیا۔ کلوخ بھی لا کر دے دیئے۔ جب میں حوائج ضروریہ سے فارغ ہوکر چلا تو اس نے پھر مجھے وہاں سے نکال کر نہایت آرام سے راستے پر لا کر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ تم جانتے ہو، کون آدمی آج تمھارا قائد بنا تھا اور بیل کے سینگ سے کس نے تمھاری جان بچائی؟ میں نے کہا میں اندھا آدمی مجھے کیا معلوم کس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے بیل سے بچایا۔ اس نے کہا وہ حضرت میاں صاحب تھے۔

حلم اور صبر وضبط

میاں صاحب بے حد متحمل مزاج اور حلیم الطبع تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد کا بیان ہے کہ میاں صاحب جب سفر حج سے واپس لوٹے تو دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر استقبال کرنے والوں کا بے پناہ ازدحام تھا۔ مصافحہ اور دست بوسی کرنے والوں میں میاں صاحب کا ایک سخت معاند بھی موجود تھا۔ جب خاص خاص لوگ میاں صاحب کو اپنے حلقے میں لیے پلیٹ فارم سے باہر لا رہے تھے تو ایک شخص آیا، اس نے مصافحہ اور دست بوسی کے بہانے ان کے ہاتھ کے انگوٹھے میں اس زور سے دانت کاٹا کہ خون جاری ہوگیا اور انگوٹھا سخت مجروح ہوا۔ میاں صاحب نے فوراً اس انداز سے انگوٹھا اپنی چادر میں چھپا لیا کہ کسی کو اس واقعہ کا علم نہ ہوا۔ جب آپ مسجد میں پہنچے تو پانی لے کر اس خون آلودہ ہاتھ کو دھویا، تب لوگوں کو اس واقعہ کا علم ہوا۔ جس شخص نے یہ مکروہ حرکت کی تھی، میاں صاحب اسے پہچانتے تھے، لیکن لوگوں کے بے حد اصرار کے باوجود اس کا نام نہیں بتایا۔ یہ تھا میاں صاحب کا صبر اور حلم۔

سرسید احمد خاں مرحوم آثار الصنادید میں میاں صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''باوجود اس کمال اور اس استعداد کے مزاج میں خاکساری اور حلم کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ بہ اعتبار سن کے جوان اور بہ اعتبار طبیعت کے حلیم اور بہ اعتبار وضع متین۔''

گزشتہ صفحات میں یہ واقعہ بیان کیا جا چکا ہے کہ میاں صاحب نے نواب رام پور سے اپنے ایک سخت مخالف کی سفارش کی جو مانی گئی۔ اب سفارش کا ایک اور واقعہ سنیے۔ ایک دفعہ چند عرب دہلی آئے اور میاں صاحب سے ملے۔ وہ کسی مالی امداد کے سلسلے میں بعض رؤسائے دہلی کے پاس میاں صاحب کو لے جانا چاہتے تھے اور میاں صاحب اس کے لیے تیار نہ تھے۔ انھوں نے ہر چند معذرت کی لیکن عرب انھیں زبردستی اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ جس رئیس کے پاس جاتے، اس سے فرماتے کہ یہ لوگ اہل حاجت ہیں اور مجھے زبردستی سفارش کے لیے اپنے ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ بتائیے اب میں کیا کروں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں وہ جاتے، توقع سے بڑھ کر ملتا۔ اس طرح انھیں اچھی خاصی رقم مل گئی۔ یہ میاں صاحب کا حلم تھا اور حلم کے سلسلے میں فارسی کے ایک شاعر نے خوب صورت شعر کہا ہے:

تیغ حلم از تیغ آہن تیز تر
بل زِصد لشکر ظفر انگیز تر

موت سامنے کھڑی ہو تو صبر وثبات کی مضبوط تر دیواریں بھی ہل جاتی ہیں اور عقل وہوش کی بنیادیں اکھڑ جاتی ہیں۔ لیکن حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ کو زندگی میں نہایت خطرناک مواقع پیش آئے اور اللہ نے ان کو صبر وضبط اور استقلال وثبات کی نعمتِ بے پایاں سے نوازے رکھا۔ مثلاً:

راولپنڈی کی قید کا زمانہ نہایت الم انگیز تھا اور انھیں روزانہ پھانسی کی دھمکی دی جاتی تھی، مگر اللہ تعالیٰ کی مدد ان کے شامل حال رہی اور انھوں نے ایک لمحے کے لیے بھی اضطراب کا اظہار نہیں کیا۔ مطالعہ کتب بھی اطمینان سے جاری رکھا اور ایک شاگرد کو صحیح بخاری پڑھائی۔

اسی طرح ۱۸۵۷ء کا زمانہ بہ درجہ غایت اندوہناک زمانہ تھا۔ اس زمانے میں حضرت مولانا سید عبداللہ غزنوی ان سے صحیح بخاری پڑھتے تھے اور صحن مسجد کے اوپر سے ہر وقت توپ کے گولے گزرتے تھے۔ ایک روز تو یہاں تک ہوا کہ عینِ حالت سبق میں گولا ان دونوں کے سامنے آ کر گرا۔ لیکن یہ بزرگ نہ ہراساں ہوئے اور نہ سبق بند کیا۔

حج بیت اللہ کے موقعے پر بھی یہی کیفیت رہی۔ اس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ اس دار الامن میں بھی حاسدین نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور قتل کرنے کے درپے رہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو صبر کی دولت بخشی اور انھیں دشمن کی ہر آزار سے محفوظ رکھا۔ میاں صاحب کا اللہ تعالیٰ پر توکل کمال

درجے کا تھا۔ اس کی ایک مثال یہاں بیان کی جاتی ہے۔ طلبا کے کھانے کا اہتمام جن صاحب کے ہاتھ میں تھا، ایک دن انھوں نے نمازِ عصر کے بعد میاں صاحب سے کہا کہ آج طلبا کے لیے نہ آٹا ہے اور نہ خریدنے کے لیے کوئی پیسا۔ میاں صاحب نے جواب دیا، اس کی فکر نہ آپ کو کرنا چاہیے نہ مجھ کو، جس کے یہ بندے ہیں، وہی ان کے کھانے دانے کا انتظام کرے گا۔ وہ صاحب مایوسانہ صورت میں چلے گئے۔ ابھی وہ مسجد سے نکلنے ہی تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے پانچ روپے میاں صاحب کی خدمت میں پیش کیے۔ میاں صاحب نے فوراً مہتمم کے پیچھے ایک طالب علم کو بھیجا کہ انھیں بلا لائے۔ وہ آئے تو انھیں پانچ روپے دیے اور وہ طلبا کے کھانے پینے کا سامان لینے بازار چلے گئے۔ اس انتہائی سستے زمانے میں جب کہ گندم بارہ آنے من تھی، پانچ روپے کو اچھی خاصی رقم سمجھا جاتا تھا۔

میاں صاحب کو کبھی یہ فکر لاحق نہیں ہوا کہ مسجد کا انتظام کیسے چلے گا، مدرسے کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے، طلبا کی خوراک کا بندوبست کس طرح ہوگا۔ ضرورت کے مطابق اللہ تعالیٰ سب کچھ فراہم کر دیتا تھا۔ حصولِ علم کے لیے ان کی خدمت میں دور دراز کے علاقوں (بلکہ ملکوں) سے طلبا آتے تھے اور سب کی ضرورتیں پوری ہو رہی تھیں اور تعلیم کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری رہتا تھا۔ اس زمانے کے طلبا نے آگے چل کر عالی قدر علما کی حیثیت سے شہرت پائی اور خلق خدا کو مستفید فرمایا۔ کسی نے تدریسی خدمات سرانجام دیں، کسی کو تصنیف وتالیف اور وعظ وتقریر میں امتیاز حاصل ہوا اور متعدد حضرات بہ یک وقت مدرس بھی ہوئے، مصنف بھی ہوئے، واعظ بھی ہوئے اور مقرر بھی......! یعنی ایک ہی عالم بہت سے اوصاف کے مالک ہوئے۔ لوگ نہایت احترام سے ان کا نام لیتے ہیں اور لیتے رہیں گے، ان شاء اللہ العزیز۔

مجاہدۂ نفس

یوں تو حضرت میاں صاحب کی تمام زندگی مجاہدۂ نفس سے تعبیر تھی، جس کا اندازہ صفحاتِ سابقہ میں مندرج واقعات سے ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں ایک دو واقعات اور سن لیجیے۔ صبح گیارہ بجے تک قرآن وحدیث کے درس میں اس طرح مصروف رہتے کہ پہلو تک نہ بدلتے۔ چہرے پر دھوپ آ جاتی مگر پیشانی پر بل نہ آتا۔ مولانا شریف حسین مرحوم کی امامت میں نصف گھنٹا نماز میں لگ جاتا جو بجائے خود ایک مستقل ریاضت تھی یا مجاہدۂ نفس۔ پھر یہ بات صوفیہ کی اصطلاح میں ایک چلّے یا دو چلّے کی نہ تھی بلکہ عنفوانِ شباب سے شروع ہو کر آخرِ عمر تک جاری رہی۔ ایک بجے شب سے بے داری اور قیامِ لیل (تہجد) میں کبھی ناغہ نہ ہوا۔

دھوپ، گرمی، جاڑا، برسات ہر موسم میں بعد مسافت کے باوجود گیارہ بجے دوپہر پیادہ پا جامع مسجد جاتے اور دو بجے واپس آتے۔ چھتری تمام عمر کبھی نہیں لگائی۔ سر پر مخطط موٹی چادر رکھ لیتے اور چل پڑتے۔ ماہِ رمضان میں نمازِ فجر سے نمازِ مغرب تک قرآنِ مجید اور تفسیر جلالین پڑھاتے، بلکہ عام طریقہ یہ تھا کہ آگے آگے خود پڑھتے اور پیچھے پیچھے طلبا کا سلسلۂ قرأت جاری رہتا۔ غیر رمضان میں تو گیارہ سے بارہ بجے تک ایک گھنٹے کا وقفہ ہوجاتا تھا، رمضان میں وہ بھی ختم ہوجاتا تھا۔ تدریس کی حالت میں جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا جوشِ بیان مزید بڑھتا جاتا۔ آواز بلند ہوتی جاتی اور طبیعت میں بشاشت ابھر آتی۔

رمضان المبارک کی راتوں میں دو دفعہ قرآنِ مجید بحالت قیام ہر سال سنتے۔ ایک دفعہ فرضِ عشا کے بعد نمازِ تراویح میں جس کے امام ان کے شاگرد رشید حافظ احمد ہوتے جو فقیہ بھی تھے اور محدث بھی۔ وہ ترتیل وتجوید کے ساتھ تین سیپارے روزانہ سناتے۔ دوسرا قرآن نماز تہجد میں سنتے، جس کے امام ان کے بڑے پوتے حافظ عبدالسلام تھے۔ اس طرح ہر رات میں دو مرتبہ قرآنِ مجید کی سماعت کرتے۔

اس کے بعد طالب علموں کے لیے سحری اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے مسجد اور مدرسے میں جاتے اور ہر شخص کو جگا کر کھلاتے۔ یہ معمولات ان کی زندگی کا جز بن گئے تھے۔ اس سے انھیں راحت محسوس ہوتی تھی۔ اگر ان میں خلل واقع ہوجاتا تو انھیں ذہنی تکلیف پہنچتی۔

اب بے شمار شیوخ الحدیث اور معلم قرآن وحدیث ہوگئے ہیں۔ حضرت میاں صاحب کا تذکرہ کرنے والوں اور ان کے حالات بیان کرنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ لیکن کیا ایسا معلم اور شیخ الحدیث کہیں نظر آتا ہے، جس میں حضرت میاں صاحب کے بے شمار اوصاف میں سے دو چار اوصاف بھی پائے جاتے ہوں......؟

یہاں یہ یاد رہے کہ میاں صاحب کو نہ شیخ الحدیث کہا جاتا تھا، نہ شیخ القرآن کہا جاتا تھا اور نہ صدر مدرس کہا جاتا تھا۔

اللہ اور رسول (ﷺ) کی محبت

میاں صاحب کے حالاتِ زندگی اس حقیقت کی وضاحت کرتے ہیں کہ ان کے قلبِ صافی میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت راسخ ہوچکی تھی اور ان کی لوحِ ذہن پر قرآن وحدیث سے مودتِ صحیحہ کے نشانات مرتسم ہوگئے تھے۔ مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا اَکْثَرَ ذِکْرَہٗ (جو شخص کسی سے محبت کرتا ہے، زیادہ تر اسی کی یاد میں مشغول رہتا ہے) کے مطابق یہی باتیں ان کے وردِ زبان رہتی تھیں۔

حضرت ملا علی قاری فرماتے ہیں: اَهْلُ الْقُرْآنِ اَهْلُ اللّٰهِ وَاَهْلُ الْحَدِيْثِ اَهْلُ رَسُوْلِ اللّٰهِ۔ واقعۃً حضرت میاں صاحب اس قول کے صحیح ترین مصداق تھے اور قرآن وحدیث کی سچی محبت اور اس کے احکام ان کی لحاتِ زندگی میں گھر کر چکے تھے۔

مولانا جامی کا شعر ہے:

خوش آں منبر و مسجد و خانقاہ
کہ دروے بود قیل و قال محمد

میاں صاحب کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ آپ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

مجتے ست کہ دل رانمی دہد آرام
وگرنہ کیست کہ آرامِ جاں نمی خواہد

نفس مطمئنہ

حیاتِ مستعار کے آخری دور میں حضرت مرحوم کو ضیق النفس کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا، لیکن ان کی تدریس قرآن وحدیث کی سرگرمیاں اتنی نمایاں تھیں کہ اس عارضے کے اثرات ان پر حاوی نہیں ہو سکے۔ بلکہ یہ تدریس ہی اس بیماری کی ان کے نزدیک اصل دوا اور غذا تھی۔ عام حالات میں بعض اوقات اس بیماری کی وجہ سے ان کے لیے بیٹھنا اٹھنا مشکل ہوجاتا، لیکن جیسے ہی مسند تدریس کو رونق بخشتے، اور زبان سے قال اللہ وقال الرسول کی صدا فضا میں گونجنے لگتی، بیماری کے اثرات اپنی جگہ چھوڑنا شروع کردیتے اور پھر آہستہ آہستہ پوری بلند آہنگی سے فریضۂ درس کی انجام دہی کا سلسلہ جاری ہوجاتا۔ جو لوگ حضرت کے شدتِ مرض سے آگاہ تھے اور انھوں نے تکلیف کی حالت میں انھیں دیکھا ہوتا تھا، اگر وہ درسِ قرآن وحدیث میں انھیں دیکھتے تو بالکل اندازہ نہیں کرسکتے تھے کہ یہ کسی مرض میں مبتلا ہیں۔ بالکل ہشاش بشاش اور تندرست معلوم ہوتے تھے۔

اہل اللہ اور محبانِ خدا ورسول کے لیے اس قسم کے ریاضات ومجاہدات اطمینانِ روح اور سرور قلب کا باعث بنتے ہیں اور قرآن کی زبان میں ان اوصاف کے حامل شخص کو نفس مطمئنہ کہا جاتا ہے۔

ایک عجیب وغریب کیفیت

بعض اوقات حدیث پاک کا درس دیتے ہوئے حضرت ممدوح پر عجیب وغریب قسم کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ ایک دن صحیح بخاری کے سبق میں نبی ﷺ کی وفات کے متعلق حدیث آئی تو ایک دم دل کی دنیا بدل گئی اور ایسا گریہ طاری ہوا کہ سبق موقوف کردیا۔ یہ حالت دیکھ کر طلبا پر بھی

تاثر نے غلبہ پالیا اور دیکھتے ہی دیکھتے محفلِ درس کا رنگ بدل گیا۔ مولانا فضل حسین بہاری کے بقول اس قسم کا واقعہ پہلے کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ ان کے نزدیک اپنی نوعیت کا یہ پہلا اور آخری واقعہ تھا۔

ہم بھی اس موضوع کی حدیثیں پڑھتے ہیں اور نبی ﷺ کے واقعۂ ارتحال کا مطالعہ بھی کرتے ہیں اور لوگوں کو سناتے بھی ہیں، لیکن ہماری یہ حرماں نصیبی ہے کہ نہ اس کا اثر ہمارے دل پر ہوتا ہے اور نہ ہمارا ذہن اس سے متاثر ہوتا ہے۔ بس ایک واقعہ کی صورت میں اسے بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے سننے والے بھی اس سے کوئی اثر نہیں لیتے۔

غیر اہل حدیث سے مراسم

میاں صاحب اپنے عہد کے معروف تریں اہل حدیث عالم تھے، لیکن اپنے دور کے غیر اہل حدیث حضرات سے بھی مخلصانہ مراسم رکھتے تھے اور ان کے ساتھ ان کی خط وکتابت بھی رہتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک طالب علم نے ان سے درخواست کی کہ مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کے نام خط لکھ دیں کہ وہ اس کی تعلیم وتربیت کریں۔ میاں صاحب نے خط لکھ کر اسے دے دیا۔ مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی نے اس خط کے جواب میں میاں صاحب کو لکھا کہ آپ نے اس شخص کو میرے پاس کیوں بھیج دیا۔ وہ کون سی ایسی شرعی بات ہے جو ہم جانتے ہیں اور آپ نہیں جانتے۔ ہم آپ سے بڑے عالم نہیں ہیں۔

مسئلۂ بیعت

میاں صاحب کا بیعت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ جو لوگ ان کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے کے خواہاں ہوتے، میاں صاحب ان کو اپنے حلقۂ بیعت میں شامل فرماتے اور انھیں نصیحتیں کرتے۔ ان کا کوئی شاگرد بیعت کرنا چاہتا تو فرماتے تم تو ہمارے شاگرد ہو، بس یہی کافی ہے۔ اس کے بعد بھی کوئی اصرار کرتا تو بیعت لے لیتے۔ جس مجمعے میں کسی سے بیعت لیتے تمام حاضرین اس میں شامل ہوجاتے۔

مولانا شاہ مختار الحق اپنے زمانے کے ممتاز عالم تھے۔ وہ بیعت کے لیے حضرت مولانا سید عبداللہ غزنوی کی خدمت میں امرتسر گئے۔ حضرت نے فرمایا تم دہلی جاؤ۔ وہاں کچھ عرصہ حضرت میاں صاحب کی صحبت میں رہو اور ان سے استفادہ کرو۔ ان سے اجازت لے کر یہاں آؤ۔ چناں چہ پہلے وہ دہلی گئے اور کچھ عرصہ میاں صاحب کی خدمت میں گزارا۔ پھر میاں صاحب کا خط لے کر امرتسر گئے اور حضرت عبداللہ صاحب کے حضور وہ خط پیش کیا۔ بعد ازاں حضرت ممدوح نے ان سے

بیعت لی اور حلقۂ مسترشدین میں شامل کیا۔

بریں خوانِ یغما

حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کا نام گزشتہ سطور میں ایک سے زائد مرتبہ آیا ہے۔ وہ نابینا تھے اور حضرت میاں صاحب کے شاگرد تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے وزیر آباد (ضلع گوجراں والا) کو اپنا مسکن بنایا اور بے شمار علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ انھوں نے مولانا عبدالحمید سوہدروی کو اپنا سفارشی خط دے کر حضرت میاں صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ میاں صاحب نے ایک طالم علم کو یہ خط سنانے کا حکم دیا۔ اس میں دو تین مرتبہ تحریر کیا گیا تھا کہ اس طالب علم کا خاص طور سے خیال رکھا جائے۔ میاں صاحب نے خط سنا تو فارسی کا یہ خوب صورت مصرع پڑھا۔

بریں خوانِ یغما چہ دشمن چہ دوست

نہایت برمحل مصرع ہے اور میاں صاحب کے مزاج وعمل کا بہترین عکاس۔

فتوے کی اجرت سے نفرت

حضرت میاں صاحب نے درس وتدریس کے علاوہ فتویٰ نویسی بھی کی۔ اتنے فتوے لکھے اور اتنے استفتا کے جواب دیے کہ اس کا حصر ممکن نہیں۔ ''الحیات بعد الممات'' کے فاضل مصنف مولانا فضل حسین بہاری کا بیان ہے کہ وفات سے ستائیس برس پہلے ایک روز فتویٰ نویسی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے میاں صاحب نے فرمایا تھا کہ میرے سارے فتووں کی نقل رکھی جاتی تو ان کی تعداد کم سے کم فتاویٰ عالم گیری سے چار گنا زیادہ ہوتی، مگر پہلے اس کا کسی نے خیال نہیں کیا (اپنے صاحب زادے کے متعلق فرمایا) اب یہاں شریف حسین نقل رکھنے لگے ہیں۔

اس سے آگے مولانا فضل حسین بہاری فرماتے ہیں: ''اس ستائیس برس کے زمانے میں آپ نے سیکڑوں بلکہ ہزاروں فتوے لکھے ہوں گے، جن میں سے بیشتر فتووں کی نقل آپ کے پوتے حافظ عبدالسلام کے پاس مولوی شریف حسین مرحوم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی غالباً موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو توفیق دے کہ جہاں تک آپ کے فتوے دست یاب ہوسکیں، ان کو جمع کرکے فتاویٰ نذیری کے نام سے چھپوا دے۔'' ❶

❶ الحمد للہ بہت عرصہ پیشتر فتاویٰ نذیریہ کے نام سے میاں صاحب کے فتووں کی تین ضخیم جلدیں چھپ چکی ہیں اور بازار سے مل جاتی ہیں۔ لیکن افسوس ہے یہ تمام فتوے نہیں ہوں گے۔

میاں صاحب فتویٰ نویسی کا کسی سے کوئی صلہ یا کوئی پیسا نہیں لیتے تھے۔ فتویٰ نویسی کو کسبِ معاش کا ذریعہ بنانا ان کے نزدیک نہایت معیوب تھا۔ ان لوگوں کو انتہائی حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے جنھوں نے فتویٰ نویسی کو کسبِ معاش کا ذریعہ بنایا۔ ان کے بارے میں فرمایا کرتے کہ ان کو دو روٹیاں دو جو چاہو لکھ والو۔

کوئی شخص کسی پیرائے سے اپنی موافقت میں فتویٰ لکھوانا چاہتا تو صاف کہہ دیتے کہ اسی لیے تو میں نے کسی کی نوکری نہیں کی۔

ایک شخص نے استفتا کا جواب لینے کے بعد حضرت میاں صاحب کے ہاتھ میں کچھ روپے دیے۔ آپ نے فوراً روپے پھینک دیے اور خفا ہو کر فرمایا تو مجھ کو رشوت دینے کے لیے آیا ہے۔ اس نے معذرت کی اور عرض کیا کہ یہ فتوے کی اجرت نہیں ہے، یوں ہی کچھ پیش کیا ہے۔ فرمایا ''آج سے پہلے بھی تو کبھی مجھے ملا تھا اور کچھ دیا تھا......''؟ بہر کیف میاں صاحب نے اس کے روپے قبول نہیں کیے اور وہ فتویٰ لے کر چلا گیا۔

اب فتوے کی اجرت کسی نہ کسی بہانے عام چلتی ہے۔ ایسے مفتی صاحبان بھی ہوں گے جو خود میاں صاحب کے فتاویٰ نذیریہ کی مدد سے فتوے لکھتے ہوں گے اور مستفتی سے اس کا معاوضہ لیتے ہوں گے۔

امانت

محلے دار یا دوسرے لوگ عام طور سے اپنے زیورات یا نقد روپے یا کوئی اور چیزیں میاں صاحب کے پاس بہ طور امانت رکھ دیتے اور پھر جب چاہتے لے جاتے۔ وہ سب کچھ اسی طرح پڑا رہتا، جس طرح رکھ کر گئے تھے۔

ایک مرتبہ ایک پنجابی سپاہی ایک سو اسّی (۱۸۰) روپے دو مہینے کے وعدے پر میاں صاحب کے پاس امانت رکھ کر دلی سے کہیں باہر چلا گیا۔ جب اس کی واپسی کا وقت قریب آیا تو میاں صاحب نے دیکھا کہ صندوق ٹوٹا ہوا ہے اور اس سے رقم نکال لی گئی ہے۔ سخت تشویش ہوئی۔ بالآخر کسی طرح اس کے آنے سے قبل ایک سو اسّی روپے کا انتظام کرلیا اور اس کے آنے پر اسے یہ رقم دے دی۔ اس کی چوری کا اسے پتا نہیں چلنے دیا۔

ایک قاری کے سوالات کا قصہ

حضرت میاں صاحب کی ذاتِ گرامی گوناگوں خوبیوں کا خوب صورت مجموعہ تھی۔ وہ اپنے پرانے دوستوں اور ہم جماعت لوگوں کا خاص طور سے بہت لحاظ کرتے تھے اور ان کی کوشش ہوتی تھی

کہ کوئی شخص ان سے ناراض نہ ہو اور ان کے کسی عمل سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ اس قسم کا ایک دلچسپ واقعہ سنیے جو الحیات بعد الممات کے مصنف شہیر نے لکھا ہے، میں اسے یہاں اپنے الفاظ میں اختصار سے لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

ایک بزرگ حافظ قاری ابوالخیر فیض محمد سرہندی تھے جو قاری کرم اللہ دہلوی کے شاگرد تھے اور قاری کرم اللہ صاحب حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کے شاگرد تھے۔ قاری ابوالخیر فیض محمد کو میاں صاحب نے قرآن سنایا تھا اور ان سے قرأت سیکھی تھی۔ چناں چہ میاں صاحب کسی کو قرأتِ قرآن کی سند دیتے تو انہی کے واسطے سے ان الفاظ میں دیتے تھے۔ ''**فقد قرأت القرآن علی القاری فیض محمد سرھندی وھو قرأ علی المولوی کرم اللہ الدھلوی وھو قرأ علی الشاہ عبدالقادر الدھلوی وھو قرأ علی ابیہ الشاہ ولی اللہ المحدث الدھلوی**'' ......خود قاری فیض محمد سرہندی نے بھی میاں صاحب سے پڑھا تھا یعنی وہ دونوں ایک دوسرے کے شاگرد اور دوست تھے۔ قاری فیض محمد نواب باندہ کے ہاں ملازم تھے اور فن قرأت میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کی ملازمت کے کئی سال بعد ایک اور شخص قاری عبدالرحمٰن پانی پتی کو بھی نواب باندہ کی سرکار میں ملازمت مل گئی۔ قاری فیض محمد سرہندی چوں کہ پرانے ملازم تھے اور فنِ قرأت کے ماہر بھی تھے، اس لیے ان کا مشاہرہ زیادہ تھا اور قاری عبدالرحمٰن پانی پتی کا کم......! قاری عبدالرحمٰن کو اس کا بہت احساس تھا کہ فیض محمد صرف قاری ہیں اور مجھ سے زیادہ تنخواہ پاتے ہیں اور میں قاری بھی ہوں اور عالم دین بھی ہوں لیکن مجھے کم تنخواہ دی جاتی ہے۔ یہ ان کی ایک معاصرانہ سوچ تھی، جو بہ ظاہر غلط نہ تھی۔ قاری فیض محمد نابینا تھے۔

ایک دن قاری عبدالرحمٰن پانی پتی نے علم قرأت کے متعلق انیس سوالات لکھ کر نواب باندہ کی خدمت میں پیش کیے کہ قاری فیض محمد سرہندی سے ان کے جواب لکھوائے جائیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ یہ ان سوالات کے جواب نہیں لکھ سکیں گے اور میں نواب صاحب سے کہوں گا کہ جب یہ کسی علمی بات کا جواب نہیں دے سکتے تو انھیں مجھ سے زیادہ تنخواہ کیوں دی جاتی ہے۔ نواب صاحب نے جواب کے لیے سوالات قاری فیض محمد کو دیے۔ انھوں نے سوالات سن کر کہا میں سوال وجواب کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا، میں یہ کہتا ہوں کہ جس کو قرأت قرآن کا دعویٰ ہو، وہ میرے سامنے قرآن پڑھے اور مجھ سے سنے۔ لیکن نواب صاحب چوں کہ قاری فیض محمد کا بہت احترام کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ اس میدان میں وہ فتح یاب ہوں، اس لیے انھوں نے جواب کے لیے اصرار کیا۔ قاری فیض محمد نے کہا بہت اچھا میں جواب لکھوا دوں گا۔ چند روز کے بعد نواب صاحب بنارس آئے تو قاری فیض محمد کو بھی اپنے ساتھ لے آئے۔

قیامِ بنارس کے دوران ایک روز نمازِ صبح کے بعد قاری فیض محمد صاحب نے اپنے قائد سے کہا کہ مجھے سرائے میں لے چلو۔ میں نے رات خواب میں دیکھا ہے کہ میرے استاد (میاں نذیر حسین صاحب) بنارس آئے ہیں اور سرائے میں قیام فرما ہیں۔ قائد نے کہا جناب کہاں دلی، کہاں بنارس، میاں صاحب یہاں کیسے آ گئے۔ قاری فیض محمد صاحب نے قدرے سخت لہجے سے فرمایا، میرا خواب جھوٹا نہیں ہوسکتا۔ میاں صاحب یقیناً یہاں آئے ہیں اور سرائے میں ٹھہرے ہیں۔ تم مجھے وہاں لے چلو، چناں چہ وہ ان کے مجبور کرنے پر وہاں لے گیا۔ میاں صاحب واقعی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے قاری فیض محمد کو دیکھا تو جلدی سے ان کی طرف بڑھے اور مصافحہ کرتے ہوئے بے تکلفی سے فرمایا: ارے تم کہاں؟ انھوں نے بتایا کہ نواب باندہ کے ساتھ آیا ہوں۔ پھر جیب سے سوالات نکال کر کہا ان کے جواب لکھ دیں۔ میاں صاحب نے چند منٹ میں جواب لکھ کر انھیں دے دیا اور پھر پوچھا کہ یہ سوال کس نے لکھے ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ قاری عبدالرحمٰن پانی پتی نے لکھے ہیں۔ میاں صاحب نے فرمایا وہ ہمارا پرانا یار نہایت غصہ ور آدمی ہے۔ اسے پتا چل گیا تو مجھ سے بگڑ جائے گا۔ اب جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ تم اس کے سامنے میرا نام ظاہر نہ کرنا اور نواب باندہ کو بھی میرے یہاں آنے کی خبر نہ دینا۔

اب قاری فیض محمد صاحب نہایت خوش تھے۔ وہ جواب لے کر نواب صاحب کے پاس آئے اور کہا یہ لیجیے قاری عبدالرحمٰن کے انیس سوالات کے جواب......! نواب صاحب خود حافظ قرآن اور قاری تھے اور فن قرأت سے دلچسپی رکھتے تھے بلکہ اپنی فوج میں انھوں نے حافظوں اور قاریوں کا ایک خاص دستہ متعین کر رکھا تھا۔ ان کے دربار میں علمائے کرام کا بھی ہر وقت مجمع رہتا تھا اور علمی بحثیں جاری رہتی تھیں۔ نواب صاحب نے سوالات کے جواب پڑھے تو بہت خوش ہوئے، اس وقت جو علمائے کرام وہاں موجود تھے، انھیں بھی وہ سوالات اور جواب سنائے گئے۔ انھوں نے بھی بڑی تحسین کی۔

پھر نواب صاحب نے قاری فیض محمد سے پوچھا کہ یہ جواب کس نے لکھے ہیں؟ کہا میرے استاد نے؟ پوچھا: کس استاد نے؟ بولے دلی والے میاں نذیر حسین نے۔ پوچھا کہ وہ کہاں ہیں؟ کہا سرائے میں قیام فرما ہیں۔ نواب صاحب نے اسی وقت چند معززین کو قاری فیض محمد کے ساتھ سرائے میں بھیجا اور وہ اصرار کر کے میاں صاحب کو ان کے پاس لے گئے۔ نواب صاحب اس وقت باندہ جا رہے تھے، وہ جبراً میاں صاحب کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ لیکن میاں صاحب دوسرے دن کسی نہ کسی طرح وہاں سے آ گئے۔ کیوں کہ یہ رمضان شریف کے آخری دن تھے اور دو چار روز کے بعد ان کے استاذ مکرم حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب دلی سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ جا رہے تھے اور

ملاقات کے لیے میاں صاحب کا حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا ضروری تھا۔

اب آگے چلیے!

قاری عبدالرحمٰن صاحب ان جوابات کی وجہ سے میاں صاحب سے سخت خفا ہوئے۔ وہ قاری فیض محمد کو پریشان کرنا چاہتے تھے، لیکن میاں صاحب کے جواب لکھنے کی بنا پر وہ اپنے اس منصوبے میں ناکام ہو گئے تھے۔

ایک دن قاری عبدالرحمٰن صاحب دہلی میں میاں صاحب کی مسجد میں آئے۔ میاں صاحب بھی مسجد میں تشریف فرما تھے، لیکن قاری صاحب نے دوسری طرف رخ کر کے ایک شخص سے پوچھا کہ مولوی عبدالرب کہاں ہیں (عبد الرب صاحب حضرت میاں صاحب کے سالے تھے) میاں صاحب نے قاری عبدالرحمٰن کی آواز سنی تو ان کی طرف گئے اور زور سے ہاتھ پکڑ کر کہا: عبدالرب کل کا لونڈا جس کو میں نے مار مار کر پڑھایا، اس سے تمھارا کیا تعلق......؟ طالب علمی کے زمانے میں، میں اور تم سات برس ایک حجرے میں رہے۔ اس کا تمھیں کچھ خیال نہیں اور آج عبدالرب کے بارے میں پوچھتے ہو کہ کہاں ہے۔

اس طرح کی باتیں کر کے میاں صاحب نے قاری عبدالرحمٰن کو اپنے پاس بٹھایا اور بے تکلفانہ ہنسی مذاق کی گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

یہ تھا حضرت میاں صاحب کا برتاؤ اپنے دوستوں اور پرانے رفقا کے ساتھ۔ قاری فیض محمد سرہندی کی طرف سے جو جواب لکھا، وہ بھی دوستانہ اور قاری عبدالرحمٰن پانی پتی سے، جس انداز سے ملے وہ بھی دوستی کا آئینہ دار......! نہ قاری فیض محمد پر کسی قسم کا احسان جتایا اور نہ قاری عبدالرحمٰن کی غصیلی طبیعت کا جواب غصے سے دیا۔

اللہ اللہ! یہ ہمارے بزرگ بھی کن اوصاف کے مالک تھے اور کس قسم کی عادات واطوار سے اللہ تعالیٰ نے ان کو نوازا تھا۔ خلوص وللّٰہیت کی نعمت عظمیٰ سے مالا مال۔ ہر ایک کے ساتھ الحب للہ کا مظاہرہ۔

اطاعت رسول ﷺ اور تدریس کا جذبۂ صادقہ

میاں صاحب کے دل میں اطاعت رسول کا جذبہ صادقہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اس کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہ تھا۔ جب کوئی حدیث بیان فرماتے اور اس حدیث کے برعکس کوئی شخص کسی امام فقہ کا قول پیش کرتا تو برہم ہو کر فرماتے۔ سنو! یہ بزرگ جن کا تم نے قول پیش کیا ہے، ہم سے بڑے، میرے باپ سے بڑے، میرے دادا سے بڑے۔ لیکن رسول خدا ﷺ سے ہرگز بڑے نہیں ہیں۔

میاں صاحب کے دور کے ایک بہت بڑے عالم مولوی یار علی تھے جو حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے شاگرد تھے۔ بہت لائق بزرگ تھے۔ انھوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ایک شہر پورنیہ میں وکالت شروع کردی تھی۔ تدریس کی طرف نہیں آئے۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے حضرت میاں صاحب نہایت حسرت انگیز لہجے میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ پیادوں سے وہ کام لیتا ہے جو شہسواروں سے نہیں ہوسکتا، ورنہ آج مولوی یار علی اگر دہلی میں بیٹھ کر درس دیتے تو ان کے سامنے کسی کا چراغ نہ جل سکتا، لیکن افسوس کہ پورنیہ میں وکالت کرنے لگے۔

بچوں سے محبت

بچوں سے میاں صاحب بے حد شفقت کا اظہار فرماتے تھے۔ حضرت مولانا شمس الحق صاحب ڈیانوی (صاحب عون المعبود) کا شمار حضرت میاں صاحب کے ارشد تلامذہ میں ہوتا تھا۔ وہ حضرت کی وفات سے چار مہینے قبل اپنے چھوٹے بیٹے حافظ ایوب کو (جو اس وقت قرآنِ مجید حفظ کررہا تھا) لے کر دہلی گئے اور میاں صاحب سے اس کے لیے دعا کی درخواست کی۔ میاں صاحب اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور دعائیں دیں۔ پھر قرآن سنانے کو کہا۔ باوجودے کہ اس وقت میاں صاحب کو بہت ثقل سماع ہوگیا تھا، لیکن ہونٹوں کی حرکت سے غلط اور صحیح کا اندازہ کرکے برابر لقمہ دیتے جاتے تھے۔ اس کے بعد اس بچے کو ایک روپیہ انعام دیا جو طویل عرصے تک برکت کے طور پر مولانا شمس الحق صاحب کے گھر میں محفوظ رہا۔

اساتذہ کی اولاد کا احترام

دہلی شہر اور شرفاے دہلی سے حضرت میاں صاحب کو قلبی تعلق پیدا ہوگیا تھا۔ بالخصوص خاندان شاہ ولی اللہ کے ارکان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ حضرت شاہ رفیع الدین کے ایک ہی بیٹے تھے جو خورجہ رہتے تھے۔ ان کی علمی دست گاہ زیادہ نہ تھی۔ وہ دہلی اکثر آتے اور میاں صاحب سے ملاقات کرتے۔ جب وہ مسجد میں داخل ہوتے تو میاں صاحب ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہوجاتے اور انتہائی تکریم سے پیش آتے۔ مفلوک الحال مغل شہزادوں کا بھی وہ بہت اکرام کرتے تھے۔ بالعموم دلّی والوں سے ان کا یہی معاملہ تھا۔ وفات سے پینتیس چالیس برس پہلے ان کے اعزہ واقارب اور اہل وطن نے بار بار کہا کہ آپ نے دلّی میں طویل عرصہ گزار لیا۔ اب وطن آجائیں اور وہاں سکونت اختیار کرلیں تاکہ اس نواح کے لوگوں کو بھی اس سعادت سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملے۔ لیکن میاں صاحب نے حضرت شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور شاہ محمد اسحاق کی مسند خلافت

سے علیحدہ ہونا گوارا نہ کیا اور اسی سرزمین میں مرنے کو ترجیح دی۔

بیٹے کی وفات کا صدمہ اور نواسے نواسیوں سے پیار

میاں صاحب کے ایک ہی بیٹے تھے مولانا سید شریف حسین اور ایک بیٹی تھیں جو میر شاہ جہاں صاحب کی اہلیہ تھیں۔ بیٹے اور بیٹی دونوں کو تمام عمر میاں صاحب نے اپنے گھر رکھا۔ پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کو بھی کبھی اپنے سے جدا نہ کیا۔ نواسے کا نام بدرالاسلام تھا۔ اس کی وفات پر آپ کو سخت صدمہ ہوا، چناں چہ ایک خط میں مولانا شمس الحق صاحب ڈیانوی کو تحریر فرماتے ہیں:
''از حادثۂ جانکاہ انتقال قرۃ العین بدرالاسلام چہ گویم وچہ نویسم نہ جائے ستیز نہ پائے گریز، انا للہ وانا الیہ راجعون۔''

اکلوتے بیٹے مولانا سید شریف حسین نے آپ کے سامنے انتقال کیا۔ مولانا عبدالغفار میدانوی چھپروی نے تعزیتی خط لکھا تو جواب میں تحریر فرمایا۔

راہ چپ کرد حریفانہ بہار از چمنم
غنچہ من ماندم وہنگام شگفتن بگوشت

مولوی حفاظت اللہ مرشد آبادی لکھتے ہیں کہ ''مولوی سید شریف حسین صاحب کے انتقال کی خبر میں نے علی گڑھ میں سنی اور وہاں سے تعزیت کے لیے دہلی گیا۔ اس وقت میاں صاحب مسجد میں تشریف رکھتے تھے۔ بے صبری کا کوئی جملہ آپ کی زبان مبارک سے نہیں سنا۔ صرف اس قدر فرمایا دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ان کی عاقبت بخیر کرے۔ اکلوتا بیٹا کس قدر اپنے باپ کا لاڈلا ہوتا ہے، مگر میاں شریف حسین لڑکپن سے بے تکلف تھے۔ میں نے جو کھلایا وہی کھایا اور جو پہنایا وہی پہنا، کوئی چیز خود مجھ سے کبھی طلب نہ کی۔''

علاوہ بیٹا بیٹی، پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کے میاں صاحب کے دو بھائی بھی تھے، ایک کا نام مولوی سید سجاد حسین تھا اور دوسرے کا مولوی سید توسّل حسین۔ جب میاں صاحب مظفر پور یا رحیم آباد یا صوبہ بہار کے کسی اور مقام میں تشریف لے جاتے تو یہ دونوں بزرگ ملاقات کے لیے تشریف لاتے اور میاں صاحب خواہ کتنے ہی عدیم الفرصت اور دہلی کو واپسی کے لیے مستعجل ہوتے، یہ لوگ ضرور انھیں سورج گڑھ لے جاتے اور جب تک میاں صاحب ان دیار میں تشریف فرما رہتے، یہ دونوں بھائی ان کے ساتھ رہتے۔

بھائیوں کے علاوہ میاں صاحب اپنے بھتیجوں کو بھی بہت چاہتے تھے۔ سید توسّل حسین کے بیٹے مولوی محمد عبدالحفیظ کو اپنے ساتھ دہلی لے گئے اور اچھی طرح ان کی تعلیم وتربیت فرمائی۔

سورج گڑھ اور اس کے نواح سے جو شخص دہلی جاتا میاں صاحب اس کا بہت خیال رکھتے اور اس کی خدمت وتواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔

اساتذہ کی تعظیم

جناب میاں صاحب اپنے اساتذہ کا ذکر نہایت مؤدبانہ الفاظ میں کرتے تھے۔ ان سے متعلق کسی بات کا تذکرہ فرماتے تو بہ صورت جمع ''ہمارے حضرات'' کے الفاظ استعمال فرماتے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی اور حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے اسمائے گرامی بالخصوص بہ درجہ غایت ادب سے زبان پر لاتے۔ قرآن اور حدیث کی کسی عبارت کا ترجمہ کرنا مقصود ہوتا تو فرماتے مجھ سے اس کا ترجمہ سنو جو ہمارے بزرگوں سے سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہے اور بیانِ مسائل میں بھی انہی بزرگانِ عالی قدر کے اقوال بہ سند پیش فرماتے اور ارشاد ہوتا ''ہمارے حضرات یوں فرماتے ہیں۔'' اس پر کوئی طالب علم اگر یہ کہہ دیتا کہ حضرات کا کہنا سند نہیں ہوسکتا، اصل سند قرآن وحدیث ہے تو خفگی کے انداز میں فرماتے۔ ''تم ان کے متعلق ایسی باتیں کرتے ہو، کیا یہ حضرات گھس کٹے تھے؟ یوں ہی باتیں بناتے تھے؟''

ایک مرتبہ میاں صاحب ممدوح رحیم آباد سے آرہے تھے۔ مولانا محمد ابراہیم آروی بھی ساتھ تھے۔ انھوں نے خواتین کے لباس کے بارے میں پوچھا کہ ان کے لیے ساڑھی پہننا جائز ہے یا ناجائز؟

فرمایا: ہمارے حضرات ساڑھی پہننے کو جائز قرار دیتے تھے۔

مولانا آروی نے عرض کیا: حضرات کا کہنا حجت شرعی تو نہیں ہوسکتا۔

فرمایا: ''تمھارے نزدیک یہ سب حضرات گھس کٹے تھے، تم ہی ایک شیخ چلی پیدا ہوئے ہو؟''

یوں تو میاں صاحب خاندانِ ولی اللّٰہی کے سب ارکان کے مداح تھے اور ان کے علم وفضل کی تعریف فرماتے تھے لیکن حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور مولانا اسماعیل شہید کی نسبت اکثر فرمایا کرتے کہ ''میں ان دونوں دادا پوتے کی فضیلت کا بہت قائل ہوں جو صرف قرآن وحدیث سے استنباطِ مسائل کرتے تھے۔ ان کی تحریروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دریائے فیضانِ الٰہی جوش مار رہا ہے۔''

جناب شاہ عبدالعزیز صاحب کے بارے میں فرماتے کہ افسوس ہے زمانۂ شباب ہی میں ان کی بصارت جاتی رہی، لیکن ذہانت آخر وقت قائم رہی اور وہ بہت بڑی نعمت تھی جو بارگاہِ الٰہی سے ان کو عطا ہوئی تھی۔

ایک مرتبہ بخاری شریف پڑھا رہے تھے کہ کسی حدیث کی تائید میں شیخ سعدی کی بوستاں کا

ایک شعر پڑھا۔ ایک طالب علم بول اٹھا کہ بوستاں کیا بخاری کی شرح ہے کہ اس کے شعر کا حوالہ دیا گیا ہے؟

فرمایا: تمھیں کیا معلوم کہ بوستاں کیا ہے؟ مجھ سے بوستاں پڑھو تو اس کی حقیقت کا تمھیں پتا چلے۔ ❶

انتقام لینے سے پرہیز

کوئی میاں صاحب کی تنقیص کرتا یا انھیں نقصان پہنچاتا تو اس سے انتقام نہیں لیتے تھے اور ہنسی مذاق میں بات ٹال دیتے تھے۔ ایک روز نمازِ صبح اور درسِ قرآن کے بعد ایک مطبوعہ نسخہ جیب سے نکال کر فرمایا۔ یہ نظم ہمیں ایک دوست نے ڈاک میں تحفتاً بھیجی ہے۔ پھر نظم حاضرین کو سنانا شروع کی جس میں میاں صاحب کی شدید مخالفت کی گئی تھی۔ اس کا ایک ایک شعر وہ بار بار پڑھتے اور نہایت خوشی سے ہنس ہنس کر اس کی تشریح فرماتے۔

ظہر کے بعد ایک شخص نے عرض کی کہ صبح والی نظم کے جواب میں فلاں شخص ستر (۷۰) شعر لکھ چکے ہیں اور مزید لکھ رہے ہیں۔

فرمایا: ارے میاں اس کا جواب لکھ کر کیا کرو گے۔ اس نے ہمیں کچھ دیا ہی ہے، ہم سے کچھ لیا تو نہیں، اگرچہ گالیاں دی ہیں۔ یہ فرما کر اس کا جواب لکھنے سے روک دیا۔

اگر کوئی شخص میاں صاحب کی کوئی ذاتی چیز چوری کر لیتا تو یہ معلوم ہونے پر بھی کہ اس نے فلاں چیز چوری کی ہے، اس کو بالکل نہ جتاتے، نہ اشارے کنائے میں اسے کچھ کہتے، بلکہ چشم پوشی سے کام لیتے، دوسروں کو بھی اس کا ذکر کرنے سے منع فرماتے۔ کسی نے لاہور سے ان کو نہایت نفیس چادر بہ طور تحفہ بھیجی۔ ایک دن اسے اوڑھ کر مسجد میں آئے اور ایک شخص نے اسے ہاتھ لگا کر دیکھا اور بڑا متعجب ہوا۔ میاں صاحب وہ چادر مسجد میں بھول گئے۔ یاد آنے پر اسے تلاش کیا گیا، لیکن نہ ملی۔ تین چار روز بعد بعض لوگوں نے دیکھا کہ جس شخص نے اس چادر کو ہاتھ لگا کر دیکھا اور اس کی نفاست پر تعجب کا اظہار کیا تھا، اس کا لڑکا اسے بازار میں اوڑھے ٹہل رہا تھا۔ دیکھنے والوں نے میاں صاحب کو اطلاع دی۔ آپ نے بے پروائی سے فرمایا:

چھوڑو اس بات کو۔

اطلاع دینے والوں نے خیال کیا کہ میاں صاحب کو یا تو ان کی بات کی سمجھ نہیں آئی یا ان کی

---

❶ یہ واقعات اختصار کے ساتھ ''الحیات بعد الممات'' سے لیے گئے ہیں۔

بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس لیے انھوں نے دوبارہ عرض کیا اور کہا کہ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو ہم اس لڑکے کو پکڑ کر آپ کے سامنے لے آتے ہیں، آپ خود وہ چادر دیکھ لیں۔ میاں صاحب نے نہایت برہمی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

کیا دنیا میں اس قسم کی وہی ایک چادر بنی تھی، دوسری نہیں بنی اور نہ کہیں سے ملتی ہے؟

آخر بتانے والوں کو ہی ندامت ہوئی اور وہ لڑکا سب کے سامنے اس کو اوڑھے پھرتا اور اوڑھ کر مسجد میں آتا تھا۔

خط کا جواب

خط کا جواب دینا بلند اخلاقی کی علامت اور خط کا جواب نہ دینا بہت بڑی بداخلاقی ہے۔ حضرت میاں صاحب کو روزانہ متعدد خطوط موصول ہوتے تھے۔ کسی خط میں کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تھا، کسی میں کسی کام کے سلسلے میں مشورہ لیا جاتا تھا اور کسی میں دعائے خیر کی درخواست کی جاتی تھی۔ میاں صاحب بالالتزام ہر خط کا جواب لکھتے تھے۔ خط میں اپنے آپ کو عاجز و مسکین ظاہر کرتے اور مخاطب کو عالم و فاضل اور منبع حسنات کی حیثیت سے یاد فرماتے۔

بعض طلبا بھی میاں صاحب سے اپنے گھر خط لکھواتے کہ وہ تندرست ہیں اور فلاں فلاں کتابیں پڑھ رہے ہیں۔ یہ میاں صاحب کے حسن اخلاق کی انتہا تھی کہ طلبا کی بات رد نہیں کرتے تھے اور ان کے کہنے پر ان کے گھر بھی خط لکھتے تھے۔

دورانِ درس ہنسی مذاق

کوئی طالب علم سبق میں حاضر نہ ہوتا تو اس کے متعلق پوچھتے کہ وہ کیوں نہیں آیا۔ اگر معلوم ہوجاتا کہ وہ بیمار ہے تو اس کی عیادت کے لیے اس کے پاس تشریف لے جاتے، اس کے پاس بیٹھتے، اسے تسلی دیتے، اس کے لیے دوا دارو کا انتظام کرتے۔ جب تک وہ صحت یاب نہ ہوجاتا، وہ تشویش میں مبتلا رہتے۔ اس کی خبر گیری اور علاج معالجے میں بعض اوقات سبق کا بھی ناغہ ہوجاتا۔

بسا اوقات دوران سبق میں ہنسی مذاق کا سلسلہ بھی شروع ہوجاتا تھا۔ کسی سے کوئی صیغہ پوچھتے، کسی سے ترکیب۔ اگر بتانے میں دیر ہوجاتی تو فرماتے، اگر صحیح بتاؤ گے تو مٹھائی کھلاؤں گا۔ کسی سے کہتے قلاقند کھلائی جائے گی۔ پھر فرماتے صحیح بتانے والے کو ایک روپیہ انعام دوں گا، دو روپے انعام دوں گا۔ اس طرح طلبا کا امتحان بھی ہوجاتا اور ان سے ہنسی مذاق کی باتیں بھی ہوجاتیں، جس سے طلبا بھی خوش ہوتے اور یہ عظیم استاد بھی اپنا دل بہلا لیتے۔ اس قسم کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ

حضرت میاں صاحب زندہ دل اور ہنس مکھ تھے۔

ایک مرتبہ عبارت پڑھتے ہوئے قاری نے مُشْعَانٌ کو شمعان پڑھا۔ آگے چل کر پھر حروف کی غلط تقدیم وتاخیر ہوگئی۔ کسی نے ٹوکا تو میاں صاحب نے ہنس کر فرمایا: پڑھنے دو جس طرح پڑھتا ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو نسخہ کو نخسہ کہا کرتے ہیں۔

ایک دفعہ میاں صاحب رحیم آباد گئے۔ وہاں کے ایک بزرگ شیخ احمد اللہ اپنے چھوٹے بیٹے یاسین کو لے کر حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا اس کا امتحان لیجیے۔ حضرت نے اسے تسلی دیتے ہوئے بڑے نرم الفاظ میں پوچھا: کیا پڑھتے ہو؟

عرض کیا: شرح وقایہ اور میر قطبی۔

پھر آپ نے کوئی سوال کیا تو یاسین صاحب سوچنے لگے۔ وہیں حضرت حافظ عبداللہ غازی پوری بیٹھے تھے جو حضرت میاں صاحب کے شاگرد تھے اور استاذ الاساتذہ تھے، انھوں نے اشارتاً یاسین کو کچھ بتانا چاہا۔ میاں صاحب نے فرمایا: سنیے صاحب! میں نے لڑکے سے پوچھا ہے، اسے بتانے دو۔ آپ چاہتے ہیں تو آپ سے بعد میں پوچھوں گا۔

میاں صاحب اثنائے سبق میں کوئی اصلاحی قسم کا لطیفہ بھی بیان فرمادیتے تھے۔ ایک دن فرمایا کہ ایک بہت بڑے سجادہ نشین بزرگ تھے جن کا نام تھا ''شاہ عطا کریم''۔ ان کی خانقاہ بھی تھی، مدرسہ بھی تھا اور وہ پابند صوم وصلوٰۃ بھی تھے۔ طلبا ومریدین کا بھی بڑا حلقہ تھا۔ ایک دن ایک شخص آیا اور اس نے پوچھا کہ میاں عطا کریم صاحب کہاں ہیں؟ مرید اس کو مارنے کو دوڑے کہ تم نے حضرت کی بے ادبی کی ہے اور صحیح طور سے ان کا نام نہیں لیا۔ اس نے پوچھا صحیح نام کیا ہے؟ بولے صحیح نام ہے جناب حضرت سید شاہ عطا کریم صاحب مدظلہ۔ اس نے کہا ٹھیک ہے آئندہ اسی طرح نام لیا کروں گا۔ اتنے میں اذان کا وقت ہوگیا اور حضرت شاہ صاحب بھی مسجد میں تشریف لے آئے۔ اس نووارد نے اذان دینا شروع کی اور بجائے **اشهد ان محمد رسول الله** کے کہا **"اشهد ان جناب حضرت سيد شاه محمدا رسول الله صاحب مدظله."** اب مرید پھر اسے مارنے کو دوڑے اور بولے تم یہ کیا کہہ رہے ہو اور کس طرح اذان دے رہے ہو؟ اس نے پوچھا کیا ہوا؟ اور کیسے اذان دوں؟ مریدوں نے جواب دیا: **اشهد ان محمدا رسول الله** کہو۔ وہ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا حضور آپ کو تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ جناب حضرت سید شاہ عطا کریم صاحب مدظلہ کہا جائے اور نبی ﷺ کو جن کی ہم جوتی کی خاک کے برابر بھی نہیں صرف محمد رسول اللہ کہا جائے، یہ کہاں کا انصاف ہے؟

اس پر شاہ صاحب نے مریدوں کو ڈانٹا کہ تم نبی ﷺ کی بھی توہین کرتے ہو اور ہمیں بھی

ذلیل کرتے ہو۔

یہ ایک ایسا لطیفہ ہے، جس سے جاہل مریدوں کی ذہنیت کا پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے پیر کے لیے تو بڑے بڑے القاب استعمال کرتے ہیں اور ان کے احترام میں دور تک چلے جاتے ہیں، لیکن احکام پیغمبر ﷺ کو صرف اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ ان کا اسم گرامی کانوں میں پڑے تو دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے چوم لیے جائیں۔ اگر یہ ہوگیا تو بیڑا پار ہے۔

شعر سے دلچسپی

حضرت میاں صاحب عربی، اردو اور فارسی ادبیات سے بے حد دلچسپی رکھتے تھے اور ان تینوں زبانوں پر جو اس وقت ملک کے پڑھے لکھے حلقوں میں رائج تھیں، میاں صاحب کو عبور حاصل تھا۔

مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) میں میاں صاحب کے حلقۂ شاگردی میں شامل تھے۔ رمضان کا مہینا آیا تو تفسیر جلالین شروع ہوئی۔ بعض طلبا گھر جانے کے لیے بے تاب تھے، اس لیے روزانہ تفسیر جلالین کے دو دو پارے پڑھے جانے لگے۔ پہلے مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی بھی تفسیر کے سبق میں شامل تھے، لیکن پھر انھوں نے سبق میں شمولیت کا سلسلہ ختم کر دیا تھا۔ میاں صاحب نے ایک دن بلا کر سبق میں شمولیت نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو فرمایا، جس طرح تفسیر پڑھائی جاتی ہے، وہ تو مجھے یہاں بیٹھ کر پڑھے بغیر بھی آتی ہے۔ یہ جواب سن کر میاں صاحب خاموش ہوگئے۔

ایک دن تفسیر کی ایک عبارت کا مطلب میاں صاحب نے چند طلبا سے پوچھا تو وہ نہ بتا سکے۔ فرمایا مولوی عبدالعزیز کو بلاؤ۔ وہ آئے تو فرمایا ہم لوگوں کو اس عبارت کا مطلب بتائیے۔ انھوں نے جوڑ توڑ کر جو کچھ بتایا میاں صاحب نے اس پر اعتراض کیا تو وہ سوچنے لگے۔ لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ اس پر میاں صاحب نے فرمایا:

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست
شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

استاد کی جوتی سیدھی کیے بغیر علمی پیچیدگیاں حل نہیں ہوتیں۔ یہ کہہ کر تفسیر کے اس مشکل مقام کی خود وضاحت کی اور فرمایا کہ بہت سے ایسے مقامات ہوتے ہیں، جہاں استاذ کی ضرورت پڑتی ہے۔

پھر گفتگو کا رخ اس شعر کی طرف مڑ گیا، اور میاں صاحب نے واقعہ بیان کیا کہ ریزیڈنٹ لکھنؤ کے مترجم نے نواب سعادت علی خاں کی مجلس میں کہا کہ ”شیخ سعدی نے گلستاں میں یہ عجیب بات

ملحوظ رکھی ہے کہ اس کے اشعار قوافی بدل کر بھی پڑھے جائیں تو بے معنی نہیں ہوتے۔ چناں چہ اس کے ایک نسخے میں ''خفتہ باشد'' کے بجائے ''خفیہ باشد'' لکھا ہے، ''شاید کہ پلنگ خفیہ باشد۔'' انشاء اللہ خاں انشا بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ انھوں نے لطیفے کے طور پر کہا بجا فرمایا آپ نے ایک نسخے میں بہ تبدیلیٔ قوافی، قطعہ اس طرح ہے۔

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد
ہر بیشہ گماں مبرکہ خالی ست
شاید کہ پلنگ خفیہ باشد

اس پر خوب قہقہہ لگا اور مترجم صاحب کو نواب صاحب اور ریزیڈنٹ صاحب دونوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا۔

آٹھ لاکھ لوگ عامل بالحدیث

میاں صاحب ابتدا میں کئی سال صرف ونحو پڑھاتے رہے۔ علم فقہ کا مطالعہ بھی بہت کیا اور بہت مدت تک اس کی اہم کتابوں کا سلسلۂ تدریس باقاعدہ جاری رکھا۔ چناں چہ سرسید مرحوم آثار الصنادید میں لکھتے ہیں:

''زبدۂ اہل کمال، اسوۂ اربابِ فضل وافضال مولوی نذیر حسین صاحب بہت صاحب استعداد ہیں، خصوصاً فقہ میں ایسی استعداد کامل بہم پہنچائی ہے کہ اپنے نظائر وقرائن سے گوے سبقت لے گئے ہیں۔ روایت کشی میں آج بے نظیر ہیں۔''

پھر جب درس حدیث میں مشغول ہوئے تو دوسرے علوم وفنون سے توجہ ہٹا کر اسی کے ہو کر رہ گئے۔ ساٹھ برس تک دہلی میں صرف حدیث کا درس دیتے رہے اور اسی عمل خیر میں زندگی بسر کردی۔ مسلمانوں کو جو دعوت دی حدیث رسول (ﷺ) کی دی، جیسا کہ تفصیل سے آگے آئے گا، آٹھ لاکھ لوگوں کو عامل بالحدیث بنایا۔

ایک خواب اور اس کی تعبیر

حضرت مرحوم کا ایک خواب اور اس کی تعبیر انہی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔ سید عبدالعزیز (ساکن صمدن ضلع فرخ آباد) کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''مجھے اپنے اللہ سے امید ہے کہ تم کو وہ اولادِ صالح دے گا اور یہ بھی قوی بھروسا ہے کہ سب سے زیادہ تعداد ہوگی۔ میں نے رات کو خواب میں دیکھا تھا کہ تم کئی لڑکوں کی

انگلیاں پکڑے ہوئے آ رہے ہو اور چند بچے تمھارے پیچھے پیچھے ہیں۔ یہ خواب منتج نتائج حسنہ ہے اور تعبیر کثرتِ اولاد کے ساتھ ہے۔ اللہ جل شانہ تمھاری پیروی تمھاری اولاد کو بخشے گا اور میں ضرور دیکھوں گا۔ اسی مسجد میں دروازے کے سامنے تم کو آتے دیکھا ہے اور تم اس جگہ آ کے بیٹھے تھے، جہاں تم نے مجھ سے ایک مرتبہ سنن ابوداؤد پر بحث کی۔'' ❶

چناں چہ خواب کی تعبیر صحیح ثابت ہوئی اور سید عبدالعزیز کو اللہ تعالیٰ نے نیک اولاد عطا فرمائی اور ان کے بیٹے علمائے دین ہوئے اور میاں صاحب نے ان کو دیکھا۔ خود سید عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

''میں ۱۹۰۰ء میں دہلی گیا تھا۔ یہ گویا آخری فیض یاب ہونا تھا۔ میرے ساتھ بیٹے تھے۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔'' ❷

دو طالب علموں کا جھگڑا

۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) میں ایک بنگالی طالب علم میاں صاحب کے درسِ حدیث میں شامل تھا۔ اس کا نام تو تراب علی تھا لیکن میاں صاحب از راہِ مزاح اسے خاکی شاہ کہا کرتے تھے۔ اس کا کسی معاملے میں ایک طالب علم سے جھگڑا ہو گیا۔ ایک روز ایک دوسرے سے جھگڑتے ہوئے دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ میاں صاحب نے دیکھا تو فوراً اٹھے اور دونوں کو الگ الگ کیا۔ پھر سامنے بٹھا کر سمجھانے لگے۔ فرمایا توبہ توبہ تم لوگ حدیث پڑھنے آئے ہو اور اس طرح لڑائی کرتے ہو۔ **کونوا عبادا اللہ اخوانا** ۔ پھر حلوائی کی دکان سے چار آنے کا شکر ملا ہوا دودھ منگوا کر دونوں کو پلایا اور گلے ملا کر صلح صفائی کرائی۔

لطافت وظرافت

قرآن وحدیث کے اتنے بڑے عالم اور فنونِ گوناگوں کے اتنے بڑے فاضل اور بے شمار علما وصلحا کے استاذ ہونے کے باوجود حضرت میاں صاحب بے حد ظریف الطبع اور خوش مزاج تھے۔ اس کی بعض مثالیں گزشتہ سطور میں بیان کی جا چکی ہیں۔ دو تین اور سنیے، جن سے ان کی لطافت وظرافت کا اندازہ ہو گا۔ ایک مرتبہ ایک نابینا حافظ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کوئی مشکل سا

---

❶ الحیات بعد الممات، ص: ۱۸۷
❷ الحیات بعد الممات، ص: ۱۸۷

مسئلہ پوچھا۔ آپ نے مسئلہ بتا دیا۔ پھر فرمایا ع

اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی

حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی نابینا تھے اور میاں صاحب کے حلقۂ درس میں شامل تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص دعوت کرتا تو میاں صاحب ہمیں ضرور اپنے ساتھ لے جاتے اور اپنے قریب بٹھاتے۔ وہ کھانا کھاتے جاتے اور ہڈیاں میرے آگے رکھتے جاتے۔ کھانے کے بعد مزاحاً مجھے فرماتے: ''ارے اندھے تو تو سب سے زیادہ کھا گیا۔''

طلبا میں کسی کو شوقین مزاج دیکھتے تو ہنس کر فرماتے: ''گانٹھ میں کوڑی نہیں، باقی پور کی سیر۔''

اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد سورج گڑھ گئے تو ان کے ایک ماموں نے حیرت انگیز الفاظ میں کہا: ''سنا ہے تم نے دلّی میں شادی کر لی ہے اور اپنے خاندان سادات کے نام کو بٹا لگا دیا ہے۔''

فرمایا: حضور! اس میں میرا کیا قصور۔ پہلے ہی سے ایسا ہوتا آیا ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بی بی شہر بانو سے بیاہے گئے جو ہرمز کسریٰ کی بیٹی تھیں اور ابوالائمہ امام زین العابدین انھی کے بطن سے تھے۔ پھر یہ شعر پڑھے:

میں ہی نہیں ہوں شیفتۂ رنگ گندمی
اوّل سے ہوتی آئی ہے آدم کو دیکھیے

نہ من تنہا دریں مے خانہ مستم
جنید و شبلی و عطار ہم مست

اس کے بعد انھیں سمجھایا کہ شریعت میں نسب وغیرہ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بس شرافت اور صالحیت دیکھنی چاہیے۔

پنجابی طلبا سے کوئی معاملہ پیش آتا تو فرماتے۔ دیکھو صائب کہتا ہے۔

گبر و مسلماں ہم یک آبی اند
وائے بریں قوم کہ پنجابی اند

وضع قطع میں سادگی

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ میاں صاحب نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ معمولی لباس پہنتے اور صحیح معنوں میں بوریا نشین تھے۔ ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھاتے تھے۔ باہر سے کوئی ناواقف آتا تو بالکل نہیں پہچان سکتا تھا کہ ان میں سے میاں صاحب کون ہیں۔ بار ہا ایسا ہوتا کہ کوئی شخص ان سے ملنے

کے لیے آیا اور وہ طلبا میں بیٹھے، انھیں پڑھا رہے ہیں مگر وہ شخص آ کر کہتا کہ مولانا نذیر حسین صاحب کہاں ہیں؟ بتانے کے باوجود بھی بسا اوقات اسے یقین نہ آتا کہ جس عظیم شخصیت سے وہ ملاقات کے لیے آیا ہے، وہ یہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو اوصافِ بوقلموں کا عظیم الشان مجموعہ بنایا تھا۔ وہ واعظ ہیں، مدرس ہیں، خطیب ہیں، محدث ہیں، محقق ہیں، مفتی ہیں، مجتہد ہیں، حاضر جواب ہیں، اردو، عربی اور فارسی کے ماہر ہیں اور ان زبانوں میں تصنیف وتالیف کا ملکہ بھی رکھتے ہیں اور گفتگو میں بھی پوری مہارت حاصل ہے۔ وہ شاعر نہیں ہیں، لیکن اپنے وقت کے بہت بڑے سخن شناس ہیں اور ہزاروں شعر زبانی یاد ہیں جو نہایت مناسب موقعے پر لکھتے بھی ہیں اور پڑھتے بھی ہیں۔ تاریخ دان ہیں، عبادت گزار ہیں، زاہد و متقی ہیں، صاف گو اور فراخ حوصلہ ہیں۔ خوش طبیعت، درویش منش اور حکیم فرزانہ ہیں۔ دیگر علوم کے ساتھ منطق وفلسفہ میں بھی ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ سب کے خیر اندیش اور سب کے ہم درد ہیں، کلمہ حق بلند کرنے میں بے حد جری اور نہی عن المنکر میں نہایت تیز ہیں، انتہائی ذہین اور وسیع المطالعہ ہیں۔ یہ اوصاف ان میں ایک خاص انداز اور انتہائی سلیقے کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ان پر بہت بڑا احسان ہے، جس کا وہ بہ درجہ غایت شکر ادا کرتے ہیں۔ وہ امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کے بہت مداح ہیں اور ان سے استفادہ فرماتے ہیں، لیکن ساتھ ہی فرماتے ہیں: ”اس تبحر علمی کے باوجود ذرہ سی رسی حنبلیت کی لگی رہ گئی ہے۔“

دلّی ان کے زمانے کے علمائے دین کا مرکز اور بہت سی اونچی شخصیات کا مسکن تھا۔ ان میں مدرس بھی تھے، فقیہ بھی تھے، شاعر بھی تھے، مغل شہزادے بھی تھے، مقرر بھی تھے، مجاہد فی سبیل اللہ بھی تھے، خوش نویس بھی تھے، مشائخ کرام بھی تھے، صوفیا بھی تھے، اطبا بھی تھے، قاری بھی تھے، مصنف بھی تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ میاں صاحب ان سب سے مراسم رکھتے تھے اور ان کے ساتھ ان کی نشست وبرخواست کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس میں البتہ شبہ نہیں کہ ان میں سے بعض یا زیادہ کے ساتھ میاں صاحب کے تعلقات قائم تھے۔

میاں صاحب اس وقت دلّی آئے تھے، جب دلّی بلکہ پورے ہندوستان میں مغلوں کا تھوڑا بہت اثر حکمرانی قائم تھا اور وہاں کی قدیم معاشرتی روایات اور سماجی اقدار کے آثار کسی حد تک موجود تھے اور لوگ ایک دوسرے کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لیکن اس سے تیس سال بعد (۱۸۵۷ء) میں دہلی کی آزادی ختم ہوگئی تھی اور اس کی جگہ تمام ہندوستان پر انگریزی اقتدار کا منحوس شامیانہ تن گیا تھا۔ میاں صاحب نے دہلی کی دونوں حالتوں کو دیکھا۔ اس کی آزاد فضاؤں کا مشاہدہ بھی کیا اور اس کی محکومی کے وحشت ناک دور کا جائزہ بھی لیا۔

مسائل شرعی اور تقاضاے وقت

میاں صاحب دہلی کے باشندے نہیں تھے، وہ ایک طالب علم کی حیثیت سے اس شہر میں آئے تھے، لیکن پھر ایک وقت آیا کہ علمی لحاظ سے وہ اس شہر کا مرجع قرار پاگئے اور جو اہم مسئلہ پیش آیا، اس کے حل کے لیے لوگوں نے انھی کی طرف رجوع کیا۔ بے شبہ دینی مسائل کی عقدہ کشائی میں وہ مسند اجتہاد پر فائز تھے۔ ذیل میں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۲۹۴ھ کے رمضان المبارک کی ۲۹ تاریخ کو دہلی کا مطلع ابر آلود ہوگیا اور عید کا چاند نظر نہ آیا۔ رات کو صبح کے وقت اجمیر اور کلکتہ سے ٹیلی گرام آیا کہ ''چاند ہوگیا۔'' میاں صاحب نے دن کو آٹھ یا نو بجے روزہ افطار کرنے کا حکم دیا۔ اب حقیقت حال معلوم کرنے کے لیے لوگ کثیر تعداد میں میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ ان کے لیے ہر ایک کو جواب دینا مشکل تھا۔ انھوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ ایک برتن میں پانی ڈال کر سامنے رکھا اور جب لوگ آتے تو اس میں سے ایک گھونٹ پانی لیتے۔ اس طرح سب کو معلوم ہوگیا کہ آج روزہ نہیں ہے۔

مسائل شرعیہ میں وہ وقت کی ضرورت کے مطابق اپنی وسعت معلومات کی روشنی میں مجتہدانہ بصیرت سے کام لیتے اور تقلیدی جکڑ بندیوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتے تھے۔ انگریزی تعلیم کو جب کفر سمجھا جاتا تھا، اس وقت میاں صاحب کا نقطہ نظر یہ تھا کہ تعلیم کا حصول جائز ہے، جس میں انگریزی بھی شامل ہے۔

بعض لوگ سرکاری ملازمت کو حرام قرار دیتے تھے، لیکن میاں صاحب سرکاری نوکری کو حلال ٹھہراتے تھے۔ چناں چہ سید عبدالعزیز صمدنی کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ''تم تحصیل دار ہوگئے، بہت اچھا ہوا، خدا نے چاہا تو اور بھی ترقی ہوگی۔ مگر دیانت داری اور خداترسی سے کام لینا، کسی کو بے وجہ نہ ستانا۔ اللہ جل شانہ نے جب ہزاروں افراد پر تم کو حکومت دی ہے، تو ان سب کو مثل اپنے سمجھو۔ تم میں کوئی فضیلت نہیں ہے، صرف خدا کا فضل ہے۔ اپنے ماتحت اشخاص سے حد درجہ پاس ولحاظ کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ کسی پر غصہ ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ ایک اور بات قابل لحاظ ہے اور یاد رکھنے کی ہے۔ وہ یہ کہ سرکاری مشاغل میں کبھی تعصب نہ کرنا اور کبھی کسی سے دل شکنی کے الفاظ نہ کہنا، ورنہ کسی کام کے نہ رہوگے، فقیر کو یہ باتیں ہمیشہ سے ناپسند ہیں۔ کبھی پہرہ دروازے پر نہ رکھنا، اہل حاجت کی بات خوب اچھی طرح سننا چاہیے۔''

ایک بزرگ میر قادر علی تھے۔ انھوں نے میاں صاحب سے انگریزی حکومت کی ملازمت کے بارے میں دریافت کیا اور اس کے متعلق کسی شبہے کا اظہار کیا۔ اس کے جواب میں میاں صاحب

لکھتے ہیں:

''سنیے! مال حلال کو لقمۂ طیب کہتے ہیں، مال حرام کو لقمۂ نجس۔ اور ان دونوں کی آمیزش کو مشتبہ۔ اپنے زورِ بازو سے جائز پیشے سے جو جنس ونقد حاصل کیا جائے وہی طیب ہے اور جو اس کے خلاف ہے، وہ ظاہر ہے۔ بس اسی پر کاربند رہیے۔ یہ مزخرفات جو جہال صوفیہ نے کلام اللہ اور کلام الرسول کے خلاف پھیلائے ہیں، ان کی طرف بالکل دھیان نہ دیجیے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی تفسیر مولوی عبدالعزیز سلمہ سے کسی روز سن لیجیے، وہ قرآن سے سنائیں گے (کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے غیر مسلم بادشاہ کی ملازمت کی) پھر یہ بھی دیکھیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہاں پرورش پائی اور کہاں کا ٹکڑا کھایا۔ ان سب امور کا خوب مطالعہ کیجیے اور زیادہ تفتیش سے اپنے قلب مطمئنہ کو پریشان نہ کیجیے، ورنہ نماز روزے میں بھی آپ کی طبیعت منتشر ہوگی اور پھر زندگی کسی کام کی نہ رہے گی۔''

سید عبدالعزیز تحصیل دار متھرا اپنے حالات میں لکھتے ہیں کہ ''ابتداءً انگلشیہ یا کسی سرکار میں انسلاک کا ارادہ نہ تھا، محض میاں صاحب مرحوم کے ارشاد سے قبول کرلیا۔''

بات بالکل سیدھی ہے کہ اگر کوئی دیانت دار مسلمان ملازمت نہیں کرے گا تو اس کی جگہ کوئی غیر مسلم آجائے گا جو ممکن ہے بددیانت ہو اور لوگوں کو پریشان کرے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ غیر مسلم کی ملازمت قبول کرلینی چاہیے اور لوگوں کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

میاں صاحب کا ایک اور اجتہاد ملاحظہ ہو۔ کلاک یعنی آواز والی گھڑی جب نئی نئی ایجاد ہوئی تھی تو اکثر علما نے اس کو مزامیر سے تشبیہ دی اور فتویٰ دیا کہ اسے گھر میں رکھنا جائز نہیں۔ لیکن میاں صاحب نے اسے سب سے پہلے اپنی مسجد میں آویزاں کیا اور اس کے جواز کا فتویٰ دیا۔

تار کی خبر شہادت کو بھی بعض علما نے غیر معتبر قرار دیا تھا۔ میاں صاحب نے سب سے پہلے اس کی صحت اور اس کے قابل اعتبار ہونے کا فتویٰ دیا۔

انگریزی رنگ کے استعمال کو بہت سے لوگوں نے ناجائز کہا لیکن میاں صاحب نے صرف زبانی کلامی بات کو کافی نہیں سمجھا بلکہ دلّی کے ماہر رنگ سازوں کو جمع کرکے ان کی مدد سے اس کے اجزا کی تحقیق کی اور جواز کا فتویٰ دیا۔

یورپین طرز کے لباس کو علمائے کرام مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ کے ذیل میں لاکر ممنوع قرار دیتے تھے، لیکن میاں صاحب نے بجز اس لباس کے جو قومی یا مذہبی مختصات سے تعلق رکھتا ہے، مثلاً ان کی خاص قسم کی ٹوپی یا زنار یا عورتوں کا بے پردہ لباس، باقی دوسرے لباسوں کی نسبت لا باس بہ فرمایا اور استدلال اسی رومی جبے وغیرہ سے کیا جو رسول اللہ ﷺ کو روم سے بہ صورت تحفہ

آیا تھا اور آپ نے اسے پہنا تھا، حالاں کہ روم میں اس وقت سوائے نصاریٰ کے دوسری کوئی قوم آباد نہ تھی۔

بعض لوگ اوپلے (پاتھی) سے کھانا پکانے کو منع کرتے تھے، لیکن میاں صاحب نے فتویٰ دیا کہ ماکول اللحم حیوانات مثلاً اونٹ، بھینس، گائے، بکری کا پیشاب اور گوبر پاک ہے اور اوپلے بھینس اور گائے کے گوبر سے بنائے جاتے ہیں، اس لیے ان سے کھانا پکانا جائز ہے۔

بات یہ ہے کہ اوپلے کو اگر ناپاک قرار دے دیا جائے اور اس سے کھانا پکانا ناجائز ہو تو غریب لوگ سخت مشکل میں پھنس جائیں۔ اسی قسم کے معاملات ہیں جن کا مجتہد کو خیال رہتا ہے اور زمانے کی ضروریات اور حالات اس کے مدنظر ہوتے ہیں اور شریعت کے نقطۂ نظر سے وہ پیش آمدہ مسائل پر غور کرتا ہے۔

سرکاری ملازمت اختیار کرنے کے سلسلے میں بھی میاں صاحب لوگوں کی طبائع کا جائزہ لیتے تھے۔ مولانا محمد حسین بٹالوی ان کے ذہین تریں شاگرد تھے۔ تحصیل علم کے بعد وہ اپنے وطن آئے تو ملازمت اختیار کرلی۔ حضرت میاں صاحب کو پتا چلا تو انھیں خط لکھا کہ "تم نے حدیث رسول اللہ ﷺ اسی دن کے لیے پڑھی تھی کہ نوکری کرو۔" چناں چہ مولانا ممدوح نے ملازمت ترک کردی اور پھر کبھی اس کا خیال بھی نہیں آیا۔ لیکن اپنے ایک اور شاگرد سید عبدالعزیز صمدنی تحصیل دار ہوئے تو نہایت خوشی کا اظہار فرمایا اور انھیں لکھا کہ آپ بہت اچھے منصب پر فائز ہوگئے ہیں۔ اب یتیموں، غریبوں اور حق داروں کا خیال رکھیں۔ کسی کو آپ کے عہدے کی وجہ سے تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے۔

اس کی آخر کیا وجہ ہے کہ ایک شاگرد کی ملازمت پر ناراضی کا اظہار کیا اور دوسرے کی ملازمت پر خوش ہوئے؟

یہ ناراضی اور خوشی حضرت میاں صاحب کی مردم شناسی کی بہت بڑی دلیل ہے۔ مولانا محمد حسین بٹالوی ابتدا ہی سے محققانہ ذہن رکھتے تھے اور مختلف مسائل سے متعلق تحقیق کے جوہر سے مالا مال تھے۔ تحریر ونگارش میں اپنے ہم عصروں سے آگے تھے اور تیز روقلم اور مؤثر اسلوبِ نگارش کے مالک تھے۔ اس لیے حضرت استاذ چاہتے تھے کہ وہ اپنی خداداد صلاحیتیں اس خدمت کے لیے وقف کردیں، چناں چہ انھوں نے کرم فرما استاذ اور مردم شناس ناصح کی نصیحت پر عمل کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان سے بہت کام لیا۔ غلام احمد قادیانی پر پہلا فتوائے کفران کا عظیم کارنامہ ہے۔ اس فتوے کو بہ دلائل ترتیب دیا اور پورے ملک کے علمائے کرام سے اس پر دستخط کرائے۔

جن لوگوں کو مولانا بٹالوی کی تحریریں پڑھنے کا موقع ملا ہے، انھیں معلوم ہے کہ وہ جس مسئلے کو موضوعِ بحث بناتے ہیں، اس کے تمام پہلوؤں کی نہایت خوب صورتی سے وضاحت کرتے

چلے جاتے ہیں اور اپنے موقف کی تائید میں دلائل کے انبار لگا دیتے ہیں۔ ان کی تحریر میں کہیں جھول نہیں اور ان کی تحقیق میں کہیں سقم نہیں۔ ان کا مطالعہ دلائل فراہم کرنے میں، ذہن سوچنے میں اور سمندِ قلم میدانِ قرطاس پر دوڑنے میں ابن تیمیہ کا مقابلہ کرتا ہے۔ فرق صرف عربی اور اردو میں اظہارِ افکار کا ہے۔

اب اس پر غور کیجیے کہ سید عبدالعزیز صمدنی کی ملازمت پر حضرت استاذ کیوں خوش ہوئے اور انھیں مسرت سے لبریز مکتوب کیوں تحریر فرمایا؟

یہ بھی حضرت کی پروازِ ذہن اور قوتِ فہم کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ بات یہ ہے کہ اس علاقے (متھرا وغیرہ) کی بہت بڑی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی، اور وہ ہندو تعلیم یافتہ بھی تھے اور بے حد متعصب بھی تھے۔ اس علاقے میں کسی مسلمان عالم دین کا تحصیل داری جیسے بڑے منصب پر فائز ہونا بڑی بات تھی۔ اس نواح کے مسلمان بھی اپنے مذہب پر عمل کے بارے میں کم زور تھے۔ سید عبدالعزیز ایسے بڑے عالم کا اس علاقے میں تحصیل دار ہوکر جانا متعدد وجوہ سے فائدہ مند اور باعث مسرت تھا۔ کم علم اور کم عمل مسلمانوں میں احکام اسلام کی صحیح تبلیغ، حکمانہ طور سے مستحقین کی داد رسی، ہندوؤں میں مسلمان عالم دین افسر کی دیانت داری کا اثر۔ محکمۂ مال میں جو رشوت کا سلسلہ چلا آرہا تھا، اس کا خاتمہ۔ یہ اور اس قسم کے بہت سے فوائد تھے، جو سید عبدالعزیز صاحب کی منصب تحصیل داری سے حاصل ہوسکتے تھے، اور قرائن بتاتے ہیں کہ حاصل ہوئے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت میاں سید نذیر حسین صاحب رحمہ اللہ اپنے عہد کے جہاں بہت بڑے معلمِ قرآن وحدیث اور بہت بڑے ماہر فقہ وکلام تھے، وہاں بہت بڑے مجتہد، بہت بڑے مردم شناس اور وقت کی رفتار پر گہری نگاہ رکھنے والے بزرگ تھے۔ انھوں نے جو قدم اٹھایا، صحیح سمت کو اٹھایا۔ گفتار، کردار اور عمل میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا اور ان کی زندگی کے شب وروز، صالحیت کا قابلِ رشک نمونہ تھے۔

مرزا قادیانی کے خلاف فتوائے تکفیر

میاں صاحب کے سوانح حیات کا ایک قابل تذکرہ باب فتوائے تکفیر ہے۔ اس متن کی مختصر الفاظ میں تشریح یہ ہے کہ جنوری ۱۸۹۱ء میں جب مرزا غلام احمد قادیانی نے مثل مسیح یا مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا تو سب سے پہلے جس عالم دین نے اس دعوے کو کفر سے تعبیر کیا اور اس کے خلاف ایک فتویٰ تیار کیا جس نے ''پہلا فتوائے تکفیر'' کے نام سے شہرت پائی، وہ حضرت میاں صاحب کے شاگرد حضرت مولانا محمد حسین بٹالوی تھے۔ مولانا بٹالوی نے ایک سوال نامہ ترتیب دیا جس میں

مرزا قادیانی کے عقائد تحریر کر کے اپنے استاد محترم شیخ الکل حضرت میاں سید نذیر حسین صاحب کی خدمت میں پیش کیا کہ جو شخص یہ عقائد رکھتا ہے، وہ مسلمان ہے یا دائرۂ اسلام سے خارج ہے......؟ میاں صاحب نے تحریری جواب دیا کہ ان عقائد کا حامل شخص دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ اس کے بعد مولانا بٹالوی نے ہندوستان کے ہر مسلک کے اکثر علمائے کرام سے ذاتی طور پر رابطہ پیدا کیا اور خود ان کے پاس پہنچے۔ بعض اصحابِ علم کی خدمت میں اپنے نمائندے بھیجے اور اس فتوے پر ان کے دستخط کرائے۔ چناں چہ مرزا قادیانی نے مولانا محمد حسین بٹالوی کے خلاف لکھنا شروع کیا اور ان کے لیے "اوّل المکفرین" کے الفاظ تحریر کیے۔ یعنی یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے مجھے کافر قرار دیا۔ مرزا صاحب نے یہ بھی لکھا کہ میاں نذیر حسین کو اسی شخص نے میرے متعلق اطلاع دی اور میرے خلاف فتویٰ مرتب کر کے ان کو پیش کیا اور اس پر ان کی تصدیقی مہر لگوائی اور پھر اسے ملک کے تمام مسالکِ فقہ کے علما تک پہنچایا اور اس کے نتیجے میں مجھے کافر گردانا گیا۔

اس کے بعد ۲۹۔ ستمبر ۱۸۹۱ء کو مرزا قادیانی دہلی گئے اور بازار بلی ماراں میں ٹھہرے۔ فتوائے تکفیر کی وجہ سے شہر میں ان کی سخت مخالفت ہو رہی تھی۔ انھوں نے ۲۔ اکتوبر ۱۸۹۱ء کو ایک اشتہار شائع کیا جس میں حضرت میاں صاحب کو مناظرے کا چیلنج دیا۔ میاں صاحب نے یہ چیلنج قبول کیا۔ لیکن مرزا صاحب میدان میں نہیں آئے۔ اس وقت مولانا محمد حسین بٹالوی بھی دہلی پہنچ چکے تھے۔ یہ ایک طویل قصہ ہے۔ میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے خلاف جو اوّلیں فتوائے تکفیر مولانا محمد حسین بٹالوی نے مرتب کیا تھا، اس پر حضرت میاں صاحب نے اپنی مہر ثبت فرمائی تھی اور پھر یہ معاملہ بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ مرزا قادیانی نے اپنی تحریروں میں اپنی عادت کے مطابق ان کے بارے میں نہایت ناشائستہ الفاظ استعمال کیے۔ یہ ایک طویل موضوع ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے کا یہ محل نہیں۔ صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ حضرت میاں صاحب کی بے شمار خدماتِ دینیہ میں سے ایک خدمت یہ بھی ہے کہ انھوں نے مرزا قادیانی پر کفر کا فتویٰ لگایا۔

وقت کی پابندی

حضرت میاں صاحب کی تمام زندگی علم و عمل سے تعبیر تھی اور اس کے بہت سے واقعات سے ہم آگاہ ہو چکے ہیں۔ وہ وقت کے نہایت پابند تھے، ان کے درس و تدریس کے اوقات کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ وہ دن کا آغاز درسِ قرآن سے کرتے تھے۔ نمازِ فجر کے بعد مسجد میں قرآن کا درس دیتے، جس میں اس محلے کے اور دوسرے محلوں کے لوگ کثیر تعداد میں شریک ہوتے تھے۔ طلبا بھی اس میں شرکت کرتے۔ حاضرین حلقہ بنا کر بیٹھتے اور ہر شخص کے سامنے ایک ایک مترجم قرآن ہوتا

تھا۔ قاری ایک رکوع تلاوت کر کے پہلے شاہ عبدالقادر دہلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ پڑھتا۔ پھر حاشیہ سے "فائدہ" پڑھتا، جس میں آیات کی شانِ نزول وغیرہ کا بیان ہوتا۔ بعد ازاں حضرت میاں صاحب عام فہم طریقے سے تفسیر بیان فرماتے۔

درسِ قرآن کے بعد گیارہ بجے تک کتب حدیث پڑھی جاتیں، جن میں صحیح بخاری کا سبق خصوصیت سے پڑھا جاتا اور زیادہ وقت اسی میں صرف ہوتا۔ صحیح بخاری کے سبق میں علما وطلبا کی ایک بڑی جماعت شامل ہوتی، جن کی تعداد بالعموم ستر کے قریب ہوتی۔ نمازوں اور کھانے کے اوقات نکال کر تمام دن درس وتدریس کا سلسلہ چلتا۔

نمازِ مغرب کے بعد مکان پر تشریف لے جاتے اور فتووں کا جواب تحریر فرماتے، فتووں کی تعداد ان کے سوانح نگار کے بقول روزانہ پانچ سے بیس تک ہوتی۔ یعنی کبھی پانچ چھ، کبھی دس گیارہ اور کبھی اٹھارہ بیس۔ رات کو نماز عشا کے بعد تقریباً چار گھنٹے آرام فرماتے، اس کے بعد تہجد میں مشغول ہوجاتے۔ بعض دفعہ بعض فتووں کا جواب تہجد کے بعد بھی لکھتے۔ وہ مصروف تریں زندگی بسر کرتے تھے اور ان کی مصروفیات خالص علمی نوعیت کی تھیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا زندگی کے آخری دور میں انھیں ضیق النفس کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا۔ اس میں شدت آجاتی تو بسا اوقات طلبا سبق موقوف کردینے کی درخواست کرتے۔ لیکن آپ یہ درخواست منظور نہ فرماتے۔ ارشاد ہوتا چلیے پڑھیے۔ یہ سلسلہ تو اسی طرح رہتا ہے۔ ہم دم بھر میں مرتے ہیں اور دم بھر میں جیتے ہیں۔ سبق شروع ہونے کے تھوڑی دیر بعد طبیعت بحال ہوجاتی اور پھر اسی جوش وجذبے سے پڑھانے لگتے۔

وفات سے بارہ تیرہ برس پہلے ثقل سماع کا عارضہ ہوگیا تھا لیکن بصارت بالکل ٹھیک رہی۔ تمام عمر عینک نہیں لگائی۔ ہمیشہ سادہ غذا کھائی اور جفاکشی ومحنت میں زندگی بسر کی۔

حضرت کا سراپا اور لباس

حضرت میاں صاحب کے سوانح نگار مولانا فضل حسین بہاری جو اُن کے شاگرد بھی تھے، ان کا سراپا اس طرح بیان کرتے ہیں: قد مائل بہ درازی، ہڈیاں بہت چوڑی، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ جوانی میں بہت تنومند ہوں گے، چہرہ لمبا، آنکھیں متوسط، پیشانی کشادہ، سر متوسط، ناک اونچی اور لمبی، کان بڑے بڑے، داڑھی کے بال کم، نہ گنجان نہ بھاری، گردن متوسط، سینہ متوسط، ہاتھ پاؤں، شانے، بازو اور ران لمبے۔ پنڈلیاں بھی کچھ لمبی لیکن نہایت مناسب انداز سے۔ پنڈلیاں صاف تھیں، ان پر بال نہیں تھے۔ سر اور مونچھ منڈھے ہوئے، رنگ گندمی، چلتے بہت تیز تھے۔

اب حضرت ممدوح کے لباس کی طرف آتے ہیں۔ الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ یہ بھی سوانح نگار کی زبانی سنیے......! حج سے قبل چھوٹا سا عمامہ مخطط بہ خط سرخ وسیاہ چارخانہ مئو اور اعظم گڑھ کا بنا ہوا پہنتے تھے۔ عمامہ ایسی سادگی سے باندھا جاتا کہ درس کے وقت بار بار کھلتا اور وہ ہاتھ سے اس کے پیچ دباتے جاتے۔ بسا اوقات بالکل کھل جاتا اور پھر جلدی سے سر پر لپیٹ لیتے یا اتار کر اپنے پاس رکھ لیتے۔ کبھی گول ٹوپی پہنتے جس کی نوک کسی قدر اوپر کو نکلی ہوتی۔ کرتہ سامنے چاک والا زیب تن فرماتے جو بالکل معمولی کپڑے کا ہوتا، ایک تکمہ اور گنڈی لگی ہوئی، زانو کے برابر اور کبھی اس سے بھی اونچا۔

زیادہ تر ڈھیلے پائنچوں والا پائجامہ پہنتے، جسے خلطہ کہا جاتا ہے، آدھی پنڈلی تک اونچا۔

پاؤں میں جوتا ادھوڑی کے چمڑے کا دلّی کا بنا ہوا، پاؤں سے تھوڑا سا بڑا۔ اس کی ایڑی دبا لیتے۔

دھوپ میں کپڑے کی چارخانہ چادر سر پر رکھتے۔ (ان کے استاذ مکرم حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب بھی اسی طرح کرتے تھے) چھتری کبھی نہیں لگائی۔ مکان محلہ پھاٹک حبش خاں میں تھا اور جامع مسجد وہاں سے تقریباً ایک میل تھی، لیکن سخت موسم گرما میں نمازِ جمعہ کے لیے گھر سے پیدل جامع مسجد جاتے۔

جاڑوں میں چھینٹ کا روئی دار انگرکھا پہنتے جسے ''دگلا'' کہا جاتا ہے اور اوپر دولائی اوڑھتے۔

سفرِ حج کے لیے گھر سے تہبند باندھ کر چلے اور پھر اس سے تقریباً بیس برس بعد تک زندہ رہے، لیکن پائجامہ نہیں پہنا۔ آخر وقت تک تہبند ہی باندھتے رہے۔ لباس اور عام طریق زندگی کے لیے فرمایا کرتے تھے: کن فی الدنیا کاحد من الناس (دنیا میں اسی طرح رہو، جس طرح عام لوگ رہتے ہیں۔) کسی معاملے میں تکلف نہ فرماتے۔ سادگی سے رہتے۔ زندگی کے تمام معاملات میں تکلفات سے ہمیشہ نفرت رہی۔

تصنیف وتالیف

مندرجہ ذیل سطور میں حضرت کی تصنیف وتالیف کے بارے میں چند گزارشات۔

حضرت میاں صاحب کے سوانح نگار شاگرد مولانا فضل حسین بہاری مرحوم ومغفور نے عنوانِ ضمیمہ جات کے تحت ضمیمہ اوّل میں ان کی تصانیف کی فہرست دی ہے اور لکھا ہے کہ

''میاں صاحب کی تصنیف وتالیف کی صحیح تعداد تو غالباً کوئی شخص بتا نہیں سکتا۔ وفات سے ستائیس برس پہلے انھوں نے فرمایا تھا کہ اگر میرے کل فتوے کی نقلیں رکھی جاتیں تو

چار فتاویٰ عالم گیری کے برابر ہوتیں۔ اس کے بعد خدا جانے اس ستائیس برس میں کس قدر فتوے لکھے“ ...... تاہم فاضل سوانح نگار نے حضرت کی ۵۷ مطبوعہ تالیفات کے نام لکھے ہیں جن میں چھوٹے بڑے رسائل اور فتوے بھی شامل ہیں اور لکھا ہے کہ یہ ”آپ کی تالیفات کے مقابل میں اندکے از بسیار بلکہ یکے از ہزار کی نسبت رکھتے ہیں۔“

اس سے آگے مصنف نے چند مطبوعہ رسائل وکتب کے نام درج کیے ہیں، ان میں چند نام یہ ہیں: الایمان یزید وینقص ۔ پیری مریدی۔ سماع وغنا ومزامیر۔ توثیق عبادہ بن صامت در قرأتِ فاتحہ خلف امام۔ مولانا اسماعیل شہید اور سید احمد شہید علیہما الرحمہ قابل تعظیم تھے۔ تحقیق حدیث جابر بن سمرہ درباب رفع الیدین۔ لفظ ما کی تحقیق نسبت ما اهل لغیر الله۔ جواب جانور منذور لغیر اللہ۔ جواب مسئلہ استوا۔ تقویۃ الایمان (مصنفہ مولانا اسماعیل شہید) کی توثیق۔ دیہات میں جمعہ کی نماز۔ چلتی ہوئی ریل گاڑی میں نماز۔ قرأت فاتحہ خلف الامام کی تحقیق بحوالہ محلّٰی شرح موطا شیخ سلام اللہ حنفی۔

فتاویٰ نذیریہ

حضرت کی ۵۷ تصانیف میں سے بعض فتوے بھی ہیں جو فتاویٰ نذیریہ میں چھپ گئے ہیں۔ فتاویٰ نذیریہ پہلی دفعہ ۱۹۱۳ء (۱۳۳۱ھ) میں حضرت کے دو محقق وفاضل تلامذہ حضرت مولانا شمس الحق ڈیانوی اور حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری کی مساعیٔ جمیلہ اور نظرِ ثانی سے حضرت میاں صاحب کے نبیرگانِ عالی قدر (حضرت سید محمد عبدالسلام اور حضرت سید محمد ابوالحسن) کے اہتمام میں دہلی سے شائع ہوا تھا جو دو جلدوں پر مشتمل تھا۔ اس اشاعت میں عربی اور فارسی عبارتوں کا ترجمہ نہیں کیا گیا تھا۔

اس فتاوے کو اہل علم میں اتنی مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کی مانگ اتنی بڑھی کہ اشاعت سے تھوڑا عرصہ بعد یہ نایاب ہوگیا اور لوگ اس کی شدید ضرورت محسوس کررہے تھے۔ چناں چہ اہل حدیث اکادمی لاہور نے اس کو دوبارہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ پھر اس میں درج شدہ عربی اور فارسی عبارتوں کا اردو ترجمہ کیا گیا، جس سے اس کی ضخامت کافی بڑھ گئی اور اسے ۱۳۹۰ھ (۱۹۷۱ء) میں تین جلدوں میں شائع کیا گیا۔ پہلی جلد فہرست مضامین اور مقدمہ سمیت ۷۴۸ صفحات پر، دوسری جلد ۶۳۲ صفحات پر اور تیسری جلد ۵۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس اشاعت میں مندرجہ ذیل امور کا اہتمام کیا گیا ہے۔

○ ...... بعض مسائل متعلقہ ابواب کے سوا دوسرے ابواب میں ضمناً آگئے تھے مثلاً نماز کے بعض مسائل بیوع یا نکاح کے سوالات کے ساتھ مذکور ہوگئے تھے، لیکن موجودہ اشاعت میں ان میں

سے اکثر مسائل متعلقہ موضوع کے تحت لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

- ......عربی اور فارسی عبارتوں کے اردو ترجمے حاشیے میں کر دیے گئے ہیں۔
- ......اشاعت اوّل میں فہرست مضامین مختصر تھی، موجودہ اشاعت میں تفصیل سے دی گئی ہے۔
- ......فتاویٰ میں جن مفتیانِ کرام اور تصدیق کنندہ حضرات کے اسمائے گرامی آئے ہیں، تیسری جلد کے آخر میں حروفِ تہجی کی ترتیب سے ان کی فہرست دی گئی ہے۔ یعنی فتاویٰ نذیریہ کی تینوں جلدوں کا مکمل اشاریہ بنا دیا گیا ہے۔

اس طرح فتاویٰ نذیریہ کی اس اشاعت کو ایک خاص امتیاز حاصل ہو گیا ہے۔

معیار الحق

حضرت میاں صاحب کی ایک نہایت اہم تصنیف ''معیار الحق'' ہے جو مقدمہ سمیت ۴۹۰ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کا ایک خاص پس منظر ہے۔ بات یہ ہے کہ مولانا اسماعیل شہید کی تصانیف میں سے دو کتابیں اس دور کے بعض لوگوں کے لیے بڑی تکلیف کا باعث بنیں۔

ان میں سے ایک کتاب ''تنویر العینین فی اثبات رفع الیدین'' ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ مولانا شہید نے اس میں رسول اللہ ﷺ کی وہ احادیث جمع فرما دی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں رفع یدین کرنا سنت ہے اور نبی ﷺ رفع یدین کیا کرتے تھے۔

دوسری کتاب ''ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح'' ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور اپنے موضوع کی معرکہ آرا کتاب ہے۔ اس کتاب میں واضح کیا گیا ہے کہ بدعت کیا ہے اور سنت کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے۔ اردو ترجمے کے ساتھ یہ کتاب دو یا تین مرتبہ چھپ چکی ہے۔

ان دونوں کتابوں میں نہایت متانت کے ساتھ مدلّل انداز میں تقلید پر بحث کی گئی ہے۔ اور بھی بعض مسائل پر گفتگو کی گئی ہے جو احناف اور اہل حدیث کے درمیان وجہ اختلاف ہیں۔ ان کتابوں کے جواب میں ایک عالم دین مولوی محمد شاہ پنجابی نے ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) میں ''تنویر الحق'' کے نام سے کتاب لکھی۔ مولوی محمد شاہ پنجابی موجودہ جغرافیائی اعتبار سے ضلع پاک پٹن کے ایک گاؤں ''پیر سکندرہ'' کے باشندے تھے اور چار سال دہلی میں حضرت میاں صاحب کے حلقہ شاگردی میں رہے تھے، وہ چوں کہ غیر معروف تھے، اس لیے انھوں نے اس دور کے ایک معروف عالم دین مولانا نواب قطب الدین سے رابطہ پیدا کیا کہ وہ یہ کتاب اپنے نام سے شائع کر دیں، لیکن نواب قطب الدین

بے حد دھیمے مزاج کے عالم تھے اور اس قسم کی بحثوں میں نہیں پڑتے تھے، اس لیے انھوں نے اس کتاب کو اپنے نام سے شائع کرنے سے انکار کر دیا، لیکن مولوی محمد شاہ نے ان کی بہت زیادہ منت خوشامد کی تو وہ از راہِ شرافت خاموش ہو گئے اور ان کے نام سے کتاب معرض اشاعت میں آ گئی۔

میاں صاحب کو یہ کتاب پہنچی تو انھوں نے کتاب کی زبان اور اسلوبِ تحریر کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ کتاب نواب قطب الدین کی تصنیف نہیں ہے، بلکہ محمد شاہ پنجابی کی تصنیف ہے۔

حضرت میاں صاحب نے اس کتاب کے جواب میں "معیار الحق" لکھی جو اپنے موضوع کی نہایت اہم اور پُر از معلومات کتاب ہے۔ اس میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے فقہی مقام و مرتبے کی بھی وضاحت کی گئی ہے اور جو باتیں حضرت امام کی طرف منسوب کی گئی ہیں، ان کے متعلق بھی تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

ائمہ اربعہ کی تقلید کے بارے میں خود ائمہ کے نقطہ نظر سے اصل حقیقت کو مصرح کیا گیا ہے۔ ہر بات باحوالہ بیان کی گئی ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ حضرت میاں صاحب کا دائرۂ معلومات کس قدر وسیع تھا اور مختلف موضوعات کی کتابوں پر وہ کتنی عمیق نگاہ رکھتے تھے۔ زبان کی صفائی، مطالعے کی گہرائی، بیان کی پختگی، قلم کی شستگی، اسلوب کی سنجیدگی، ان کے وہ اوصاف ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انتہائی فراوانی کے ساتھ ان کو عطا فرمائے ہیں۔

میاں صاحب کی تصنیف "معیار الحق" کے جواب میں مولانا ارشاد حسین رام پوری نے "انتصار الحق" کے نام سے کتاب لکھی۔ پھر انتصار الحق کے ردّ میں میاں صاحب کے چار شاگردوں نے علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھیں، وہ کتابیں ہیں: ① براہین اثنا عشر، ② تلخیص الانظار فی مابنی علیہ الانتصار، ③ اختیار الحق اور ④ بحر زخار۔

بیماری اور ذکر واذکار

اب آئندہ سطور میں حضرت کی بیماری کا تذکرہ۔

وفات سے دس بارہ برس پہلے میاں صاحب کے گھٹنوں میں درد ہونے لگا تھا، اس لیے ہاتھ میں چھڑی رکھنے لگے تھے اور مسجد میں زیادہ تر ڈولی میں تشریف لاتے تھے۔ پھر وفات سے نو دس مہینے قبل تکلیف بڑھ گئی اور صاحب فراش ہو گئے۔ آخری ایام حیات میں بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بیماری اور سخت کمزوری میں بھی کسی قسم کی فرمائش نہیں کی اور نہ کسی سے یہ کہا کہ مجھے فلاں چیز کی ضرورت ہے۔

حضرت میاں صاحب تسبیح بالعموم ہاتھ میں رکھتے اور ذکر اذکار کرتے رہتے تھے۔ آخری دنوں

میں کم زوری زیادہ ہوگئی تو تسبیح ہاتھ سے گر جاتی تھی اور بے چینی سے اسے تلاش کرتے تھے، جب اردگرد بیٹھنے والوں کو معلوم ہوگیا کہ تسبیح ہاتھ سے گر جانے کی وجہ سے انھیں پریشانی ہوتی ہے تو وہ فوراً تسبیح اٹھا کر ان کے ہاتھ میں تھما دیتے اور وہ پڑھنے میں مصروف ہوجاتے۔ اگر تسبیح جلدی سے ہاتھ میں نہ آتی تو انگلیوں پر پڑھتے رہتے۔ کبھی تسبیح خود ہی بستر پر رکھ دیتے، کبھی گلے میں ڈال لیتے۔ غرض زبان پر ہر وقت تسبیح وتحمید کا سلسلہ جاری رہتا۔ بے ہوشی کی حالت میں بھی ذکر الٰہی سے ان کی انگلیاں حرکت میں رہتیں اور لب اللہ کی یاد میں ہلتے رہتے۔

مولانا تلطف حسین بیان کرتے ہیں کہ ایک دن مجھ سے فرمایا گھٹنوں میں درد بہت ہے۔ میں نے عرض کیا حضور کو کیا تکلیف ہے۔ آپ کو خوب معلوم ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام پر کتنی تکلیفوں کا دور گزرا، دعا فرمایئے اللہ تعالیٰ آپ کے اعمال قبول فرمائے، لغزشوں سے درگزر کرے اور مغفرت فرمائے۔ یہ سن کر مسکرائے اور فرمایا سچ کہا آپ نے۔ پھر دعا کرنے لگے اور ساری تکلیف بھول گئے۔

مولانا ممدوح مزید فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نے عرض کیا: حضور کو کسی چیز کی ضرورت ہے تو حکم کیجیے، میں حاضر کروں۔ فرمایا: کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

حضرت کے داماد میر شاہ جہاں صاحب اور بیٹی اور نواسیوں نے بیماری کے دنوں میں آپ کی بے حد خدمت کی۔ آپ نے اپنی صاحب زادی اور نواسیوں کو وصیت فرمائی کہ میرے مرنے کے بعد صبر کرنا اور یہ دعا کثرت سے کرنا: **اللھم اغفرلہ وارحمہ**

میاں صاحب کے سوانح نگار مولانا فضل حسین بہاری لکھتے ہیں کہ مولانا تلطف حسین بہاری نے دہلی میں مجھے بتایا کہ جب حضرت مرحوم کے شاگردوں کے نام مجھے یاد آتے تو میں ان کے سامنے ان کا ذکر کرتا اور پوچھتا کہ آپ کو ان میں سے کسی سے کوئی شکایت تو نہیں ہے؟ فرماتے نہیں صاحب مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ پھر اپنے شاگردوں میں سے کسی کا نام خود انھیں یاد آجاتا تو پوچھتے کہ "فلاں کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ اس کا کوئی خط آیا یا نہیں؟" اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے شاگردوں کا انھیں زندگی کے آخری دور تک خیال رہا۔

مولانا تلطف حسین کے بقول کسی انداز میں ایک دن ان سے ان کے مقام تدفین کے بارے میں عرض کیا گیا اور بتایا گیا کہ جناب شاہ عبدالعزیز صاحب کے مقبرے میں بھی جگہ کا انتظام کیا جاچکا ہے۔

جواب میں فرمایا کہ "انتقال کے بعد تم صرف اتنا کیجیو کہ سنت کے مطابق اپنے ہاتھ سے مجھے غسل دو اور تکفین کرو۔ پھر بے شک اپنے گھر چلے جاؤ۔ اس کے بعد جس کے دل میں جو آئے کرے۔"

وہ کہتے ہیں: آخری وقت میں مجھ سے بہت کچھ فرمایا۔ مگر میری سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔ البتہ اتنی بات سمجھ میں آئی: ''اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ کا خیال رکھنا۔ باقی سب فضول اور بے کار ہے، سب کو دفع کرو۔''

وفات اور تکفین وتدفین

مولانا تلطف حسین فرماتے ہیں: ۱۰۔ رجب ۱۳۲۰ھ (۱۳۔ اکتوبر ۱۹۰۲ء) کو دوشنبہ کے دن مغرب کی اذان ہوئی۔ میں نماز کے لیے مسجد میں چلا گیا۔ نماز سے فارغ ہو کر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ علم وفضل کا یہ نیّر درخشاں غروب ہو چکا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

کفن وغیرہ سب چیزیں پہلے سے موجود تھیں۔ وصیت کے مطابق فوراً غسل دے کر کفن پہنایا گیا اور میت کو چارپائی پر ڈال کر مسجد میں لا کر رکھ دیا گیا۔

اس وقت بے شمار لوگ مسجد میں موجود تھے۔ دوسرے دن سہ شنبہ کو نو بجے عید گاہ میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور قبرستان شیدی پورہ میں ان کے صاحب زادے مولانا شریف حسین کی قبر کے قریب اس عالم اجل کو دفن کر دیا گیا۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ

جنازے میں ہر مسلک فقہی کے کثیر تعداد میں لوگ شریک تھے۔ نمازِ جنازہ ان کے پوتے مولانا سید عبدالسلام نے پڑھائی۔

اولاد واحفاد اور بھائی

حضرت میاں صاحب کے ایک ہی بیٹے تھے اور وہ تھے مولانا سید شریف حسین۔ ابتدا سے انتہا تک تمام مروّجہ تعلیم انھوں نے اپنے والد عالی قدر سے حاصل کی اور زندگی بھر لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رکھا۔ باپ سے ہر وقت کے انسلاک اور استفادے کی وجہ سے معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ بالخصوص کتب منقول میں بڑی مہارت تھی اور مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے۔ میاں صاحب کی خدمت میں بہت سے استفتا آتے تھے، ان میں سے متعدد کے جواب میاں شریف حسین ہی دیتے تھے۔ کافی عرصہ طلبا کو پڑھاتے بھی رہے۔ خوش نویس تھے اور خط نستعلیق کے ماہر۔ خوش نویسی میں دہلی کے معروف خطاط میر پنجہ کش کے شاگرد تھے۔ نہایت متین، کم سخن اور سادگی پسند تھے۔ پنجگانہ نماز کی امامت وہی کراتے تھے۔ نماز میں تعدیل ارکان کا اس درجہ اہتمام فرماتے کہ صبح کی نماز تقریباً پون گھنٹے میں اور ظہر کی نصف گھنٹے میں ختم کرتے۔ میاں صاحب ان کی غیر موجودگی میں اکثر فرماتے کہ جیسا میرا امام ہے، ایسا امام دہلی سے کلکتہ تک نہیں ملے گا۔

نواب سید صدیق حسن خاں اور شیخ حسین بن محسن یمنی دونوں میاں شریف حسین کی سند میں ان کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ حلیہ یہ تھا: چوڑی ہڈی، چہرہ، آنکھیں، پیشانی، سر، ناک، کان، قد سب متوسط۔ ڈاڑھی گنجان اور گول۔ بدن بلغمی، رنگ سیاہی مائل، سر اور مونچھ منڈواتے تھے۔

لباس یہ تھا: پورے سر پر دوپلی ٹوپی، دلی کی طرز کا انگرکھا، سفید پائجامہ، ہاتھ میں بڑا سا سفید رومال۔ جاڑوں میں دولائی اور روئی دار دگلا۔

۶۔ جمادی الاخریٰ ۱۳۰۴ھ (۲۔ مارچ ۱۸۸۷ء) کو باپ کے سامنے وفات پائی۔ [1] انا لله وانا اليه راجعون۔

میاں صاحب کی ایک صاحب زادی تھیں، جن کی شادی میر شاہ جہاں سے ہوئی تھی۔ صاحب زادی کی تین بیٹیاں تھیں۔ ایک بیٹا تھا، جس کا نام بدر الاسلام تھا۔ دس گیارہ سال کی عمر میں وفات پا گیا تھا۔ میاں صاحب اپنے اس نواسے سے بہت محبت کرتے تھے۔

میاں سید شریف حسین کے دو بیٹے تھے۔ ایک حافظ سید عبدالسلام اور دوسرے سید نورالحسن۔ ان کے علاوہ بیٹیاں بھی تھیں۔

میاں صاحب کے دو بھائی تھے جو ان سے عمر میں چھوٹے تھے۔ منجھلے کا نام مولوی حافظ سید سجاد حسین تھا۔ انھوں نے بڑی عمر میں قرآن حفظ کیا تھا۔ عابد وزاہد اور متقی بزرگ تھے۔ دوسرے بھائی کا نام مولوی سید توسل حسین تھا۔ یہ بھی بہت نیک تھے۔ میاں صاحب جو سب سے بڑے تھے، سب کے بعد فوت ہوئے۔

اخبارات کا خراجِ عقیدت

حضرت میاں صاحب کی وفات کی خبر اس وقت کے ہندوستان کے تقریباً تمام اخبارات نے نمایاں طور سے شائع کی اور اداریوں میں شدید افسوس کا اظہار کیا۔ الہ آباد (یوپی) کا انگریزی اخبار "پانیر" مشہور اخبار تھا۔ اس نے تعزیتی اداریہ لکھا۔ لیکن میاں صاحب کے سوانح نگار مولانا فضل حسین بہاری نے صرف تین اخباروں کے اداریے نقل کیے ہیں۔ ایک علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کا، ایک اخبار وکیل امرتسر کا اور ایک اخبار دارالعلوم دہلی کا۔ ان کے اداریوں کی بھی تلخیص کی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ تمام اخبارات کے تعزیتی مضامین یا اداریے جمع کیے جائیں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے، اس لیے انھوں نے مذکورہ اخبارات کے مضامین کے علاوہ اور کسی اخبار کا نہ کوئی مضمون شائع

---

[1] الحیات بعد الممات، ص: ۲۷۷، ۲۷۸

کیا ہے، نہ تعزیتی اداریہ۔

یہ اداریے اور مضامین حضرت میاں صاحب اور ان کی خدمات کے بارے میں تاریخی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے یہاں شائع کیے جارہے ہیں۔ پہلے ملاحظہ فرمایئے علی گڑھ انسٹیٹیوٹ کا اداریہ جو اس کے چیف ایڈیٹر نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خان نے ۲۳۔ اکتوبر ۱۹۰۲ء کے شمارے میں ''افسوس ناک واقعہ'' کے عنوان سے لکھا۔

''اس ہفتے کے واقعات میں ایک نہایت اندوہناک واقعہ جو غالباً ہندوستان کے مسلمانوں میں نہایت حسرت وافسوس کے ساتھ پڑھا جائے گا یہ ہے کہ

شمس العلما مولوی سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی نے ایک سو دس برس کی عمر میں دس مہینے کی طویل علالت کے بعد ۱۰۔ رجب یوم دو شنبہ کو مابین المغرب والعشاء انتقال فرمایا اور اُن کی وفات سے ہندوستان میں حدیث کا چراغ گل ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ قصبہ سورج گڑھ ضلع مونگیر کے خاندان سادات میں سے تھے جن کے مورث عالم گیر کے عہد میں عہدۂ قضا پر مامور تھے۔ ابتدائی تعلیم غالباً آپ نے اپنے وطن میں حاصل کی۔ عنوان شباب میں آپ دہلی میں وارد ہوئے جو اس وقت ہندوستان میں علم اور شائستگی کا مرکز تھا اور دینیات کی کتابیں حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب اور مولانا عبدالخالق صاحب سے پڑھیں، اگرچہ آپ کو بالاستیعاب [1] شاہ صاحب کے حلقۂ درس میں شریک ہونے کا موقع نہ ملا مگر اس میں شک نہیں کہ آپ کو حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں نسبت تلمذ ہے چناں چہ مولانا قطب الدین نے اپنی کسی تصنیف میں اِس امر کی تصریح کی ہے۔

آپ ایک جید فاضل اور مسلم الثبوت محدث تھے۔ روایاتِ فقہی کا جو استحضار آپ کو حاصل تھا وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ آپ کے مناقب میں صرف اس قدر بیان کردینا کافی ہے کہ آپ نصف صدی سے زیادہ عرصے تک علم حدیث کی تدریس میں مصروف رہے اور عمر کا ایک معتدبہ حصہ اس متبرک علم کی خدمت میں بسر ہوا۔

ہزارہا طالبانِ حدیث آپ کے حلقۂ درس میں شریک ہوکر فیض یاب ہوئے۔ ہماری دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس عطا فرمائے اور اُن کے پس ماندوں کو صبر جمیل کی توفیق دے۔''

اخبار وکیل امرت سر ۱۷۔ اکتوبر ۱۹۰۲ء کی اشاعت میں لکھتا ہے:

''شمس العلماء مولانا مولوی سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کی علالت طبع کی خبر ہم اپنے

---

[1] اس کی تحقیقات کہ آپ نے کن کن اساتذہ سے کون کون سے فن کی کتابیں پڑھیں، گزشتہ صفحات میں ہوچکی اور یہ بات بھی ثابت کردی گئی کہ آپ مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب کی خدمت میں بارہ، تیرہ برس تک [illegible] اوران سے تحصیل علم کی۔

کسی گزشتہ پرچے میں لکھ چکے ہیں۔ اب دہلی کے ایک پرائیویٹ خط سے معلوم ہوا کہ حضرت ممدوح ۱۳۔ اکتوبر کو رہگرا ے عالم جاودانی ہوئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حق تو یوں ہے کہ آپ سلف صالحین کی یادگار باقی تھے۔ علم وعمل اور زہد واتقا میں پایۂ بلند رکھتے تھے۔ سن مبارک سو سے متجاوز تھا اور یہ کہنا داخل مبالغہ نہیں کہ آپ دہلی مرحوم کے آخری نوحہ خواں تھے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے ان بزرگ واروں کی صورتیں دیکھی تھیں، بلکہ اُن کی ہم طرحی کا شرف حاصل کیا تھا جن سے دہلی کو فی الحقیقت فخر ہے اور جو دہلی کیا ہندوستان بھر کے لیے مایۂ ناز تھے۔ جن دنوں سرسید مرحوم نے آثار الصنادید لکھی ہے اُن دنوں دہلی واقعی اہل کمال سے سرتا سر ماموری تھی اور ہر ایک فن کے باکمال آدمی موجود تھے۔ باوجود اُس فراوانی کے مولانا اُس زمانے میں بھی اس لائق سمجھے گئے تھے کہ اُن کا نام اُن چیدہ بزرگ واروں کی فہرست میں داخل ہو جو ہندوستان کے لیے موجب افتخار شمار ہوتے ہیں۔

”پس اِس سے ظاہر ہے کہ اِس کساد بازاریٔ فضل وہنر میں اُن کی قدر وقیمت کیا ہونی چاہیے۔ مولانا مغفور نے باوجود کبرسنی اور ضعف پیری کے سلسلۂ درس وتدریس آخری وقت تک نہ چھوڑا اور اطراف واکناف کے طلبا جو علم حدیث حاصل کرنے کے شوق میں ممالک دور دراز سے آپ کی خدمت میں آتے تھے ہمیشہ مستفیض ہوتے تھے۔“

اب اخبار دارالعلوم دہلی مطبوعہ ۱۷۔ اکتوبر ۱۹۰۲ء مطابق ۱۵۔ رجب ۱۳۲۰ھ کا مضمون پڑھیے، جس کا عنوان ہے، ”وفات حسرت آیات جناب شمس العلما مولانا مولوی سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی۔“

مضمون درد ہجر کی تابِ رقم نہیں
ہے شور ہائے ہائے صریرِ قلم نہیں

”بڑے افسوس سے لکھا جاتا ہے کہ ۱۳۔ اکتوبر کی شام کو شمس العلماء حضرت مولانا مولوی سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ منحوس شام مسلمانانِ عالم میں قیامت تک یادگار رہے گی جس میں حدیث نبوی کا آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔

”آہ اے بدنصیب قوم تیرے سارے فخر مٹ گئے۔ تجھے ناز تھا کہ اِس گئے گزرے زمانے میں تو ایسے عظیم الشان شخص کا وجود باجود رکھتی ہے جو شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ اسحاق صاحب کی بابرکت مجلسوں کا فیض یافتہ اور حدیث اور فقہ اسلام کا لاثانی عالم تھا، جس نے دس نہ بیس اکٹھے پچھتر سال سلسلۂ درس وتدریس جاری رکھا ہو، جس کے متبرک حلقہ درس سے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

آوازیں اِس پچھتر سال میں ایک دن بھی خاموش نہ ہوئی ہوں، جس نے ایک سو سات سال کا طویل زمانہ عمر بچپن سے لے کر دمِ واپسیں تک مقدس اسلام کے مقدس علوم کی تعلیم وتعلم میں بسر کردیا۔ ہائے ہائے خدا کے جلیل القدر آخری پیغمبر ﷺ (دل وجانم فدائے نامش باد) کی پاک حدیثوں کے اکیلے ہاں ہاں اکیلے حافظ کو ہم ہزار من مٹی کے بوجھ کے نیچے دبا کے آتے ہیں اور یہی ہاتھ جو اُس خلیق اور مقدس انسان سے مصافحے کرتے تھے آج اُسے قبر کے سپرد کررہے ہیں۔

''مرنے والے خدا تجھے فردوس بریں میں جگہ دے اور تجھے پیارے نبی ﷺ کا قرب عطا کرے۔ ہمارے پاس تیرے لیے، تیرے احسانات کے لیے کچھ نہیں سوا اِس کے کہ ہم ایصالِ ثواب کریں اور دعا کریں کہ خدا تیری بے لوث دینی خدمتوں کے بڑے بھاری سلسلے کو قبول فرمائے اور اِس کا تجھے اجرِ عظیم بخشے۔ ظاہراً تو تو معبودِ حقیقی کے پاس تن تنہا چلا ہے، جہاں نہ تیرے آٹھ لاکھ معتقدوں میں سے کوئی ساتھ ہے، نہ تیرے ہزار در ہزار شاگردوں میں سے کوئی ہمراہ۔ تیری اولاد اور تیرے غم گسار بادیدۂ پرنم تجھے تک رہے ہیں کہ تو اپنی کٹھن اور دشوار گزار منزل میں بے یار ومددگار چلا جارہا ہے، کوئی نہیں جو تیرا ساتھ دے اور کوئی نہیں جو تیری ہمراہی اختیار کرے، لیکن درحقیقت باطناً ایک انمول زادِ آخرت تیرے ساتھ ہے اور تو خدا کے ہاں یقیناً اُسی فرحت وشادمانی کے ساتھ جارہا ہے جیسا کہ ایک فتح مند شہنشاہ دن رات کی یلغاروں اور حملوں کے بعد اپنے غنیم پر فتح پاتا اور پھر بادل خورسند اپنے دارالخلافت کی طرف مراجعت کرتا ہے۔ تو نے بے شک اُس سچے عشق سے جو تجھے حبیب خدا ﷺ کے ساتھ تھا اپنی بزرگ اور عالی شان لائف خدمت اسلام میں صرف کی اور سچے ارشاد علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل کا اِس گئے گزرے زمانے میں نمونہ بن کے ہمیں دکھا دیا۔ اسی کا اجر ہوگا جو ہمیشہ کی مسرتوں کا تجھے وارث بنائے گا اور تجھے تمام کلفتوں سے نجات دے گا۔ افسوس تیرے بعد ہمیں چاروں طرف سناٹا ہی سناٹا نظر آتا ہے۔ آہ یا تو وہ زمانہ تھا کہ ہلال اسلام آسمان دنیا پر ماہ دو ہفتہ بن گیا تھا اور اُس کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی سے سارا عالم بقعہ نور بنا ہوا تھا، اور یا اب یہ وقت ہے کہ وہ ماہ کامل ہماری نظروں سے نہاں ہوگیا ہے۔ اِس کی ہلکی اور بدلی میں چھپے ہوئے چاند کی سی چاندنی ہمیں کبھی دکھائی دے جاتی ہے اور وہی ہمارے برق وباد کی طرح دوڑنے والی رقیب قوموں کی نگاہیں خیرہ کردیتی ہے۔

''حبش خاں کے پھاٹک سے شمس العلماء مولوی سید نذیر حسین صاحب کا جنازہ نہیں اٹھایا گیا بلکہ ایک شورِ قیامت اٹھایا گیا ہے جو اسلامی دنیا میں صدیوں تک برقرار رہے گا۔ مرحوم کے بعد ان کا کوئی ہم پلہ جانشین نظر نہیں آتا جسے علم حدیث کی اس مناسبت ذاتی کے سبب جو شمس العلماء میں قدرت نے ودیعت کی تھی اُن کا قائم مقام قرار دیا جاسکے۔ اُن کے دماغ کی ساخت ہی اِس ڈھنگ

کی تھی جس میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث کا سمندر سما گیا۔ جن لوگوں نے آپ کو حدیث شریف پڑھاتے دیکھا ہے انھیں اِس بات کا بخوبی تجربہ ہوگیا ہے کہ اِس بڑھاپے کے زمانے میں آپ کی یاد داشت کا کیا عالم تھا اور کس صفائی اور روانی کے ساتھ آپ گھنٹوں پڑھاتے رہتے تھے۔ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ پڑھانے میں جس وقت کسی حدیث کی نسبت تکرار ہوتی تھی اور یہ ضرورت آ کے پڑتی تھی کہ اِس حدیث کے موافق یا مخالف کتنی حدیثیں ہیں اور کس کس جگہ ہیں، آپ فوراً بتا دیتے تھے کہ فلاں حدیث فلاں کتاب کے فلاں باب سے نکال لو، اور فلاں حدیث فلاں کتاب کے فلاں باب سے۔ اسی طرح وہ تمام حدیثیں جو اِس متنازع فیہ حدیث کے متعلق کتب صحاح میں ہوتی چند منٹوں میں نکل آتی تھیں۔ ایک جید حافظ قرآن کو کسی آیت کے پتا دینے میں تامل ہونا ممکن تھا لیکن شمس العلماء کے لیے بالکل ناممکن تھا کہ اُن میں سے کسی حدیث کا یوں ہی سا مطلب بتایا جائے اور وہ بجنسہ صحاح میں اُسی وقت نہ نکلوا دیں۔ اور پھر ایک دو یا دس بیس حدیثوں کی نسبت نہیں حدیث شریف کی ساتوں صحیح کتابوں کی نسبت آپ کے حافظے کی یہی کیفیت تھی۔ اسی وجہ سے درحقیقت شمس العلماء کی ذات مسلمانوں کے لیے فخر ومباہات کا باعث تھی۔ کیوں کہ جس طرح کلام اللہ کا یہ خاص معجزہ ہے کہ ہر زمانہ اور ہر وقت میں لاکھوں سینے اِس کی حفاظت کے لیے محفوظ تختیاں بنے رہتے ہیں، اُسی طرح کلامِ رسول (ﷺ) کی حفاظت کرنے والا بھی زمانے میں کوئی نہ کوئی موجود ہی رہتا ہے، جو حافظے کی قوت سے نگہبانی کرتا ہے، جیسا کہ اِس زمانے میں اللہ بخشے حضرت شیخ شمس العلماء تھے۔ درحقیقت یہ اسلام کی زندہ برکات ہیں جو ہر زمانے میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے مقابل کوئی دوسرے مذہب والا ہرگز ایسا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ کتاب جسے وہ آسمانی سمجھتا ہو زمانے کی دست برد سے اس طرح محفوظ رہی ہو جیسا کہ قرآنِ مجید۔ قرآنِ شریف تو خیر خالق اکبر کا خاص کلام ہے جس کی نسبت وہ وعدہ فرماتا ہے: **انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون** اور جو اسی وعدۂ ربانی کی نسبت سر ولیم میور صاحب جیسے دشمنوں سے اپنے تیرہ سو برس سے بلاشائبۂ تحریف بجنسہ محفوظ چلے آنے کا اقرار کراچکی ہو، اور وہ علانیہ تسلیم کرچکے ہوں کہ ”دنیا میں اور کوئی ایسی کتاب نہیں جو اِتنے بڑے عرصے تک اِس طرح محفوظ رہی۔“

”لیکن حدیث جو حضور سرور عالم (ﷺ) کا کلام ہے جو آپ نے بہ مصداق **وماینطق عن الهوی ان هو الا وحی یوحی** ارشاد فرمایا اور اُسے آپ کے جلیل القدر صحابہ اور تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اکٹھا کیا، اُس کے حافظ بھی اس امت عالیہ میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ کیا کوئی عیسائی دعویٰ کرسکتا ہے کہ اُن مضامین کو چھوڑ کر جو ابتدائی صدی عیسوی کے خوش اعتقاد عیسائیوں میں مقبول تھے اور جن کا ابھی تک کچھ کچھ حصہ چلا آتا ہے، صرف بائبل کے کبھی کسی زمانے میں ایسے

حافظ ہوئے ہیں جنھوں نے زمانے کی دست برد سے بچانے کے لیے اُسے اپنے سینے کی تختیوں پر کندہ کیا ہو؟ کیا کوئی آریہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ اُن کے ویدوں کی کسی زمانے میں اس طرح حفاظت کی گئی ہے، جس طرح مسلمان اپنی مقدس کتاب کی ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں؟ اگر یہ دعویٰ ممکن نہ ہوتو سمجھ لینا چاہیے کہ کوئی انسانی کتاب ہرگز آسمانی کتاب کی سی وقعت اور عزت نہیں پاسکتی، اور وہ کتاب کبھی معزز نہیں سمجھی جاسکتی جس میں انسانی ہاتھوں کی آمیزش ہوئی ہو۔

''شمس العلماء کا درس وتدریس سال بھر سے موقوف تھا۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ شیخوخت نے آپ کو انتہائی ضعف وناتوانی پر پہنچا دیا تھا۔ اگر چہ ایک عرصے سے آپ کا اُٹھنا بیٹھنا دوسروں کے سہارے پر موقوف تھا لیکن یہ نقاہت جو سال بھر سے پیدا ہوگئی پہلے نہ تھی۔ آپ اِس بڑھاپے میں بھی بہت ہی کم بیمار ہوا کرتے تھے، کیوں کہ بہت ہی محتاط تھے، یہاں تک کہ پانی کا بھی بہت ہی کم استعمال کرتے تھے اور کئی کئی دن صرف چاے پر گزار دیتے تھے۔ آخر عمر میں گوتمام قواے جسمانی مضمحل ہوگئے تھے لیکن حافظہ بدستور درست تھا اور اِسے بڑے تعجب کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، کیوں کہ انسان جہاں ستر بہتر ہوا اُسے صبح کا کھایا شام کو یاد نہیں رہتا۔ کہاں کہ سو سے زیادہ عمر گزر جاے اور پھر حافظے کی قوت اِسی طرح بنی رہے۔ یہ سب حدیث شریف کی برکت تھی، جس میں آپ کا انتقال ہوا وہ کوئی خاص بیماری نہ تھی۔ جس مرض نے ایک سال سے آپ کو بٹھا دیا تھا، وہی مرض الموت تھا جو بالآخر جنازہ اُٹھوا کے گیا۔

''۱۳۔ اکتوبر کی شام کو قریباً سات بجے آپ نے اپنی جان جان وجہاں آفریں کو سپرد کی اور یہ خبر بجلی کی تیزی کی طرح اُسی وقت تمام شہر میں پھیل گئی۔ تجہیز وتکفین رات ہی رات میں ہوگئی تھی۔ چناں چہ ہزاروں ماتم زدہ لوگوں کے ساتھ صبح آٹھ بجے جنازہ اٹھایا گیا اور نو ساڑھے نو بجے شیدی پورہ میں دفن کیا گیا۔ نمازِ جنازہ بارہ تیرہ ہزار آدمیوں کے ساتھ آپ کے سعادت مند پوتے مولوی سید عبدالسلام صاحب نے عیدگاہ کے چبوترے پر پڑھائی۔ جنازے پر خلقت کا اِس درجہ ہجوم تھا کہ بہت سے لوگوں کو کندھا دینا بھی نصیب نہیں ہوا۔ قریب قریب شہر کے تمام مسلمان عمائد اور علما جنازے کے ساتھ تھے جن میں بعض کے نام نامی درج ذیل ہیں:

صاحب زادہ عبدالصمد خاں صاحب چشتی، صاحب زادہ محمد عمر صاحب چشتی، مولانا مولوی عبدالحق صاحب مصنف تفسیر حقانی، شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب، مولوی حفیظ اللہ صاحب، مولوی عبدالقادر صاحب، مولوی محمد ابراہیم صاحب، مولوی عبدالرحمٰن صاحب راسخ، مولوی حبیب احمد صاحب مدرس فتح پوری، مولوی سید احمد صاحب، مولانا نواب ضمیر الدین احمد میرزا صاحب برادر رئیس لوہارو، مولوی محمد عبدالاحد صاحب، مولوی محمد عبدالمجید صاحب، ابوالحبیب مولوی محبوب احمد صاحب،

مولوی تلطف حسین صاحب، غرض کہ اخبار میں گنجائش نہیں کہ تمام رؤسا کے نام لکھے جائیں۔

''مرحوم کے اوصافِ حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ کے لکھنے کا یہ موقع نہیں ہے، خدا کرے کہ آپ کی سوانح عمری لکھنے کے لیے کوئی خدا کا بندہ کھڑا ہو، اور اُس کی شان وحیثیت کے مواقع قلم بند کرے۔ فقیر دین محمد ایڈیٹر دارالعلوم کو اگر فرصت ہوتی اور اُس کے پاس کافی میٹریل ہوتا تو اِس سعادت کا وہ خود ہی فخر حاصل کرتا۔ بہرحال یقین ہے کہ ''سلف ہلپ'' کی قدر کرنے والی طبیعتیں اس عظیم الشان سوانح عمری کے لیے شوق ظاہر کریں گی اور کوئی محنت کش سعید الفطرت انسان اُن کے شوق کو پورا کرنے کے لیے ہمت چست کرے گا۔ مرحوم شمس العلماء کی سوانح عمری میں یہ بات خاص طور پر تذکرے کے لائق ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے آپ کے درس وتدریس کا سلسلہ فقہ اور حدیث دونوں کی نسبت تھا، لیکن غدر کے بعد آپ نے صرف حدیث شریف کو مخصوص کرلیا تھا اور اِسی وجہ سے آپ کے آخری عمر کے شاگردوں میں زیادہ تر وہی لوگ شامل ہوتے تھے جنھیں علم دین میں سب سے زیادہ حدیث سے دلبستگی ہوتی تھی۔ اگر مسلمانوں کی بدقسمتی سے مقلدین وغیر مقلدین کے جھگڑے نہ اٹھتے تو غالباً آپ کا فیض تدریس اس سے بھی زیادہ وسیع ہوتا۔

''ہم اپنے مصیبت زدہ دل کی ان سطروں میں بھڑاس نکالنے کے بعد اس مضمون کو مرحوم کے لیے دعائے مغفرت پر ختم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو مرحوم کی ذات سے عقیدت مندی ہوگی، وہ اپنا بہترین فرض تصور کریں گے کہ جس طرح مرحوم کے زمانے میں فیض کا چشمہ جاری تھا اور ہر مسلمان علمی استفادے کرسکتا تھا اُسی طرح اب بھی اُس کے برقرار رکھنے کی کوشش کی جائے گی اور آپ کے اعزہ اور خصوصاً مولوی عبدالسلام صاحب کے دردمند دل سے ہم دردی کا اظہار کیا جائے گا۔

میاں صاحب کی نماز جنازہ صلوٰۃ علی الغائب غالباً ہندوستان کے تمام شہروں، قصبوں اور بیشتر قریوں میں پڑھی گئی۔''

....

افسوس ہے، اس زمانے کے تمام اخبارات کے تعزیتی مضامین حضرت کے سوانح نگار نے درج کتاب نہیں کیے۔ جو انھوں نے درج کیے، وہ ہم نے یہاں لکھ دیے۔ اب ان کا کہیں سے ملنا محال ہے۔

نثر کے علاوہ بذریعہ نظم بھی ان کی وفات پر اظہار حزن وملال کیا گیا۔ عربی میں بھی، فارسی میں بھی اور اردو میں بھی۔ چناں چہ سوانح نگار مولانا فضل حسین بہاری فرماتے ہیں:

''اخباراتِ ہندوستان میں جس طرح بذریعہ مضمون نگاری کے آپ کا ماتم کیا گیا اِسی طرح

ہندو ایران کے شاعروں نے قطعات تاریخ کے ذریعے سے اپنا فرض ماتم ادا کیا۔ اُن سب کو جمع کرنا تو سخت دشوار ہے، کیوں کہ آپ کے انتقال کے بعد سے غالبًا پورے سال بھر تک بعض ہفتہ وار اخبار اُردو کی ہر اشاعت میں قطعات اور مادہ ہائے تاریخ مسلسل بالالتزام شائع ہوتے رہے۔ ہم صرف بعض قطعات تاریخ و مادہ ہائے تاریخ پر اکتفا کرتے ہیں۔

"مولوی حکیم مختار احمد صاحب حنفی ساکن موضع کرہٹیا ضلع مظفر پور نے ایک قطعہ تاریخ عربی میں لکھا جو خصوصیت کے ساتھ اس لیے سب سے پہلے لکھے جانے کے قابل ہے کہ بیں شعروں کا قطعہ ہے اور ہر مصرع بجائے خود بغیر تعمیہ وتخرجہ کے تاریخ ہے جس سے ۲۱۔۱۳۲۰ ہجری نکلتے ہیں یا ۱۳۱۰و۱۱ فصلی۔

"پچھلے دس شعروں میں اس سوانح عمری کا بیان ہے۔ ان مصرعوں سے ۱۰۱۔۱۳۲۰ھ و ۱۱۔۱۳۱۰ فصلی نکلتے ہیں، جن سنوں میں سوانح عمری لکھنے کی ابتدا کی گئی اور لکھی جاتی تھی۔ بعض موانع کے سبب سے بہت دنوں تک سوانح نگاری کا کام بند رہا اِس لیے اس کی اشاعت میں بھی غیر معمولی توقف ہوا اور سن بھی بدل گئے معہذا اس قطعے میں بڑی محنت کی گئی ہے، کیوں کہ چالیسوں مصرعے چالیس مادۂ تاریخ پر مشتمل ہیں اور بجائے بسم اللہ کے جو عبارت لکھی گئی ہے وہ بھی مادۂ تاریخ ہے۔ اِس طرح اکتالیس تاریخیں ہیں اور چوں کہ تعمیہ وتخرجہ سے ہر مصرع پاک ہے، اس لیے حک وتبدیل کی گنجائش نہیں۔ کوئی لفظ یا حرف بدل نہیں سکتا جب تک بدل ومبدل منہ کے حروف اور اعداد برابر نہ ہوں۔

بسم اللہ المفیض العلیم

فات نور الفرقه السبحانیه — انه احیی الاصول الغالیه
۲۰ ۱۳ھ — ۲۰ ۱۳ھ

ربنا اکرم بهذا وافیا — انت معطی العافیات العالیه
۲۰ ۱۳ھ — ۲۰ ۱۳ھ

فیضه نهر مجید باقی — فضله عمّ البلاد الصافیه
۲۰ ۱۳ھ — ۲۰ ۱۳ھ

کان بحر الخلق او عین العلی — کان تاج المدر کات الباتیه
۲۰ ۱۳ھ — ۲۰ ۱۳ھ

مخزن الطلابل شمس الوفا — شیخ اصحاب العقول الجاویه
۲۰ ۱۳ھ — ۱۰ ۱۳ھ

رمزفن المجتبیٰ نہر الصفا	صدر ارباب الثنا یا الصافیہ
۲۰ ۱۳ھ	۱۰ ۱۳ف
مصدر الاسرار تاج الاولیا	فخر دین الامۃ الربانیہ
۱۰ ۱۳ف	۲۰ ۱۳ھ
کان اهل الفیض بل بحر الهدیٰ	کان مفنی المنکرات العاریہ
۲۰ ۱۳ھ	۱۰ ۱۳ف
ماتن معیار حق مقرن	شمس افلاک الفتاوی الجاریہ
۱۰ ۱۳ف	۱۰ ۱۳ف
استمع یا مهتدی عام الوصال	فات بدر السنۃ الفرقانیہ
۱۰ ۱۳ف	۱۰ ۱۳ف
قد تمنی شرح ندب السالک	فخر فسط الحکمۃ السینائیہ
۱۰ ۱۳ف	۱۰ ۱۳ف
قدوفٰی متنا متینا وافلا	نور شرف الامۃ القرآنیہ
۱۰ ۱۳ف	۱۰ ۱۳ف
اسمہ فضل الحسین الجامع	نعتہ رمز الصدور الصافیہ
۲۰ ۱۳ھ	۲۰ ۱۳ھ
مثلہ معدوم عصر فی العلاج	مفخر اهل الفنون العالیہ
۲۰ ۱۳ھ	۲۰ ۱۳ھ
ابقراط الدهر فی نهر الشفا	بل ریاض الحکمۃ الیونانیہ
۱۰ ۱۳ف	۱۰ ۱۳ف
عین فیض الطب او عین العطا	ضوء قلب الحکمۃ اللقمانیہ
۱۰ ۱۳ف	۱۰ ۱۳ف
نور بیت الطب جاءت نفسہ	فرح شرع الحکمۃ البقراطیہ
۱۰ ۱۳ف	۲۰ ۱۳ھ
استمع یا مقبلا عام الکتاب	وهو شرح الواقعات الفانیہ
۲۰ ۱۳ھ	۱۱ ۱۳ف

واسمعوا عام الکتاب ثانیاً .شاعت المجموعة الرحمانیه

۱۱ ۱۳ف ۱۰ ۱۳ف

هاوها قل یا صبیحی ثالثا جاء شرح الکیفیات الطاریه

۱۱ ۱۳ف ۲۱ ۱۳ھ

قطعات وقصائد

یہ ایک منفرد قطعہ تاریخ ہے جو ہم نے قارئین کے مطالعہ کے لیے یہاں درج کردیا ہے۔ ان کے علاوہ مولانا حافظ محمد عبدالمنان وفا غازی پوری، مولانا حافظ عبدالرحمٰن بقا غازی پوری، مولانا عبدالکریم (ساکن بندر کوچین)، سید جمیل احمد جمیل سہوانی، مولوی محمد ادریس بن مولانا محمد شمس الحق، قاضی طلا محمد خاں پشاوری، سید علی نعمت شاہ صاحب پھلواروی، مولانا عبدالجبار عمر پوری، مولانا عبدالغفور نیر داناپوری، قاضی ابواسماعیل یوسف حسین صابری، مولانا ضمیر الحق آروی کے طویل قصائد ہیں جو حضرت کی سوانح عمری کے صفحہ ۲۳۵ سے صفحہ ۲۶۱ تک مندرج ہیں۔ ایک طویل حزنیہ فارسی خط مع چالیس عربی اشعار کے حضرت مولانا سید عبدالجبار غزنوی کا ہے جو صفحہ ۲۲۲ سے صفحہ ۲۲۶ تک پھیلا ہوا ہے۔

میاں صاحب علما و مشائخ کی نظر میں

ان قطعات وقصائد کے بعد حضرت میاں صاحب کے متعلق بہت سے مشائخ اور علمائے کرام کی آرائے گرامی ان حضرات کے تعارف کے ساتھ درج کتاب کی گئی ہیں۔ وہ حضرات ہیں مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادی، مولانا محمد تھانوی، مولانا علی احمد ٹونکی، مولانا بشیر الدین قنوجی، مولانا احمد شرقی، شیخ عبداللہ بن اویس سنوسی حسینی، شیخ احمد بن احمد بن علی تونسی مغربی، شیخ ابوعلی محمد بن ہاشم سامرودی، مولانا سخاوت علی جون پوری، مولانا احمد علی سہارن پوری، شیخ حسین بن محسن انصاری یمنی، مولانا عبدالحی فرنگی محل لکھنوی، حضرت سید نواب صدیق حسن خاں بھوپالی، حضرت مولانا سید عبداللہ غزنوی رحمہم اللہ تعالیٰ۔ یہ آرائے گرامی ''معاصرین علمائے معتبرین اور شیوخ کی ارائیں'' کے عنوان سے کتاب کے صفحہ ۲۶۱ سے شروع ہوتی ہیں اور ان حضرات کے تعارف کے ساتھ صفحہ ۲۷۷ پر ختم ہوتی ہیں۔

کتاب کے صفحہ ۳۴۲ سے ۳۶۵ تک حضرت میاں صاحب کے ان شاگردوں کے نام لکھے گئے ہیں جن کا تعلق اس دور کے ہندوستان کے مختلف صوبوں اور ضلعوں سے ہے۔ صفحہ ۳۶۶ اور ۳۶۷ پر بیرونِ ملک سے تعلق رکھنے والے شاگردوں کے نام مرقوم ہیں۔ یہ فہرست پانچ سو ناموں پر مشتمل ہے جو نامکمل ہے۔

تلامذہ ومعتقدین کی تعداد

مولانا تلطف حسین کا ذکر کتاب کے مختلف مقامات پر متعدد مرتبہ آیا ہے، ان کے اور ایک اور بزرگ حافظ محمد حسین کے مطابق شاگردوں کی تعداد کم سے کم بیس ہزار ہوگی اور معتقدین کی تعداد ۸۰ لاکھ تک بیان کی جاتی ہے۔

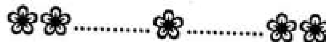
میاں صاحب کے سوانح نگار مولانا فضل حسین بہاری (کتاب کے صفحہ ۳۵۵ پر) تحریر فرماتے ہیں کہ میں بہ تقریب کارونیشن یکم جنوری ۱۹۰۳ء کو دہلی گیا تو جناب مولوی تلطف حسین سے دریافت کیا کہ آپ پچیس چھبیس برس سفر وحضر میں میاں صاحب کے ساتھ رہے، آپ نے ان کے تلامذہ کی کوئی فہرست مرتب کی یا نہیں؟

انھوں نے جواب میں فرمایا کہ جب طلبا کے کھانے کا انتظام میرے ذمے تھا، اس وقت میں نے ایک رجسٹر بنایا تھا اور تین برس تک لکھنے کا انتظام کیا، اس رجسٹر میں بارہ ہزار طلبا کے نام درج ہوئے تھے۔ پھر اپنے کثرت اشغال اور تجارت کے باعث یہ انتظام قائم نہ رکھ سکا۔

مولانا فضل حسین بہاری مزید فرماتے ہیں کہ اس کے بعد ۲۰۔ فروری ۱۹۰۳ء کو میری حافظ محمد حسین ضریر البصر پنجابی سے ملاقات ہوئی تو ان سے میں نے دریافت کیا کہ وہ میاں صاحب کے حلقۂ شاگردی میں کب آئے؟ لیکن میں نے ان سے مولوی تلطف حسین سے اپنی ملاقات اور اس موضوع پر بات چیت کا ذکر نہیں کیا۔ حافظ صاحب موصوف نے اپنے متعلق بتایا کہ جس وقت میں دہلی میاں صاحب نے پڑھنے کے لیے گیا تو میرا نمبر اس وقت بارہ ہزار تھا۔ اس کے علاوہ نمبر شمار کا ایک اور رجسٹر بھی تھا۔

قطعیت کے ساتھ تو حضرت شیخ الکل کے شاگردوں کی تعداد بتانا ممکن نہیں، لیکن یہ اندازہ کسی قدر صحیح معلوم ہوتا ہے کہ بیس ہزار لوگوں نے ان کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیے۔ پھر ان حضرات نے بھی آگے چل کر تصنیفی، تدریسی، تبلیغی اور سیاسی میدانوں میں بہ درجہ غایت خدمات سرانجام دیں اور ان میں سے ہر ایک نے بے شمار علما وطلبا کو مستفید فرمایا۔ اس طرح حضرت کے شاگردوں کے شاگردوں کی خدمات کا وسعت پذیر سلسلہ اب تک جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ دینی مدارس قائم رہیں گے اور کتاب وسنت کی تعلیم کا پھیلاؤ ان کے ذریعے قیامت تک ہوتا رہے گا، ان شاء اللہ العزیز۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ حضرت میاں صاحب اور ان کے اساتذہ اور تلامذہ کرام کو جنت الفردوس میں بلند مراتب عطا فرمائے، آمین یا رب العالمین۔



حضرت میاں صاحب کے

گیارہ تلامذۂ کرام

حضرت میاں صاحب کے

گیارہ تلامذۂ کرام

۱	مولانا شمس الحق عظیم آبادی
۲	مولانا عبد العزیز رحیم آبادی
۳	مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری
۴	مولانا محمد بشیر فاروقی سہسوانی
۵	مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی
۶	مولانا ابوعبدالرحمٰن محمد پنجابی
۷	مولانا ابومحمد ابراہیم آروی
۸	مولانا محمد حسین لکھوی
۹	مولانا عبدالغفار نشر مہدانوی
۱۰	مولانا رفیع الدین شکرانوی
۱۱	مولانا فقیر اللہ مدراسی



مولانا شمس الحق عظیم آبادی

برصغیر کے لاتعداد اصحابِ علم نے انتہائی اہتمام کے ساتھ حدیث رسول (ﷺ) کی خدمت کی اور کررہے ہیں۔ کسی نے درس وتدریس کے ذریعے یہ فریضہ سرانجام دینے کا عزم کیا، کسی نے مختلف کتب حدیث کی شروح وتعلیقات کو ضبط تحریر میں لانے کی طرف عنانِ توجہ مبذول کی، کسی نے کسی کتاب کے اردو یا کسی اور زبان میں ترجمے کو ضروری قرار دیا، کسی صاحب نے تخریج کو موضوع تحقیق ٹھہرایا اور کسی نے اقسامِ حدیث کی وضاحت کی۔ خدمت حدیث کے یہ تمام طریقے نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ اہل حدیث علمائے کرام نے بالخصوص اس عظیم کام کی طرف اعتنا کیا اور ان کی تگ وتاز سے علومِ حدیث کی اشاعت کا دائرہ بے حد وسیع ہوا، اور پھر معاملہ یہاں تک بڑھا کہ اس سلسلے میں ان کے عزم وہمت کی وجہ سے اس نے ایک بہت بڑی تحریک کی شکل اختیار کرلی، جسے شیخ محمد منیر دمشقی "نہضہ عظیم" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے مصر کے چودھویں صدی ہجری کے ممتاز مصنف ومحقق علامہ سید رشید رضا بڑی وضاحت سے تحریر فرماتے ہیں:

لولا عناية اخواننا علماء الهند فى هذا العصر لقضى عليها بالزوال من امصار الشرق، فقد ضعفت فى مصر والشام والعراق والحجاز منذ القرن العاشر للهجرة حتّٰى بلغت منتهى الضعف فى اوائل هذا القرن الرابع عشر . ❶

یعنی ہندوستان کے علمائے اہل حدیث نے علومِ حدیث کے تحفظ کی طرف خاص طور پر توجہ مبذول کی۔ اگر اس دور میں ہمارے یہ بھائی ایسا نہ کرتے تو مشرقی ممالک سے یہ علم ختم ہوجاتا۔ مصر، شام، عراق اور حجاز میں تو یہ علم دسویں صدی ہجری سے روبہ زوال ہوگیا تھا اور چودھویں صدی ہجری کے آغاز میں تو زوال کی انتہا تک پہنچ گیا تھا۔

اعترافِ حقیقت

ہندوستان یعنی برصغیر کے اہل علم نے نشر واشاعت حدیث کے لیے جو بھرپور کوششیں کی، ان کا ذکر علامہ رشید رضا کے علاوہ عرب ممالک کے بعض اور اصحاب تحقیق نے بھی کیا ہے۔ خود ہندوستان کے معروف حنفی عالم مولانا مناظر احسن گیلانی نے صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ اس سلسلے میں بنیادی

❶ مقدمہ مفتاح کنوز السنہ، طبع دوم ۱۹۸۷ء (۱۴۰۸ھ)، سہیل اکیڈمی۔ لاہور

کام اہل حدیث علمائے کرام ہی کا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

> اس کو تسلیم کرنا چاہیے کہ اپنے دین کے اساسی سرچشموں (قرآن وحدیث) کی طرف توجہ ہندوستان کے حنفی مسلمانوں کی جو پلٹی، اس میں اہل حدیث اور غیر مقلدین کی اس تحریک کو بھی دخل ہے، عمومیت غیر مقلد تو نہ ہوئی، لیکن تقلید جامد اور کورانہ اعتماد کا طلسم ضرور ٹوٹا۔ ❶

جماعت احناف ہی کے ایک بزرگ مولانا سید رشید احمد ارشد کا ایک مقالہ ''ہندو پاکستان میں علم حدیث'' کے عنوان سے ماہنامہ ''البلاغ'' (کراچی) میں شائع ہوا تھا۔ اس مقالے میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

> آخری زمانے میں حدیث کی تدریس واشاعت سے ہندوستان میں اہل حدیث کا ایک فرقہ پیدا ہوگیا تھا جو ائمہ کی تقلید کی مخالفت کرتا تھا، اس کی وجہ سے حنفی علما میں بھی کتب حدیث کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا اور وہ فقہی مسائل کو احادیث کی روشنی میں ثابت کرنے پر متوجہ ہوئے۔ اس طرح اس فرقے کا وجود علم حدیث کی ترقی کا باعث بنا۔ ❷

ان سطور میں مقالہ نگار نے اہل حدیث کے خلاف تعصب کا جو زہریلا انداز اختیار کیا ہے، وہ تو بالکل ظاہر ہے اور ہم اس وقت اس سے تعرض نہیں کرنا چاہتے، یہاں صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ اہل حدیث کے متعصب تریں مخالف بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ برصغیر میں نبی ﷺ کی احادیث مبارکہ کے اصل مبلغ اہل حدیث ہیں۔ احناف نے اہل حدیث کو دیکھ کر اس موضوع کی طرف توجہ کی اور وہ بھی صرف اس لیے کہ کھینچ تان کر احادیث سے اپنے چند فقہی مسائل ثابت کرسکیں، اور یہ کارِ خیر ماشاء اللہ وہ انجام دے رہے ہیں۔

اہل حدیث فرقہ نہیں

واقعات کی روشنی میں دیکھا جائے تو اہل حدیث کوئی ایسا فرقہ نہیں جو ہندوستان میں پیدا ہوا بلکہ اسلامی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس ملک کے لوگ پہلی صدی ہجری ہی میں اسلام سے آشنا ہوگئے تھے اور نبی ﷺ کے فرامین وارشادات سے انھیں آگاہی حاصل ہونے لگی تھی، اس لیے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد باسعادت (۱۵ ہجری) میں اس سرزمین میں صحابہ کرام کی آمد شروع

---

❶ ماہنامہ ''برہان'' دہلی۔ اگست ۱۹۸۵ء

❷ ماہنامہ ''البلاغ'' کراچی۔ ذی الحجہ ۱۳۸۷ھ

ہوگئی تھی، پھر تابعین اور تبع تابعین کا ورودِ سعید بھی یہاں ہوا۔ اس پاک باز جماعت کے ذی شان ارکان حدیث رسول (ﷺ) اپنے ساتھ لے کر آئے تھے، جس کی انھوں نے یہاں تبلیغ کی اور اس سرزمین کے باشندے اس سے متاثر ہوئے۔ اس کے نتیجے میں بہت سے مقامات پر قال اللہ وقال الرسول کی دل نواز صدائیں گونجنے لگیں۔ لیکن اُس زمانے میں آبادیوں کا یہ قرب واتصال نہ تھا جو بعد میں ہوا۔ انسانی آبادی کا دائرہ محدود تھا اور لوگ ایک دوسرے سے دور دراز مقامات پر رہتے تھے۔ نہ تحریر وکتابت کا کوئی قابل ذکر سلسلہ تھا، نہ اس وقت تصنیف وتالیف کا اس نواح میں کوئی رواج ہوا تھا، نہ مدارس وجامعات کا قیام عمل میں آیا تھا اور نہ مطابع کا کوئی تصور کہیں پایا جاتا تھا۔ پڑھنے پڑھانے اور حدیث کی تعلیم وتعلم کا دائرہ بہت محدود تھا، تاہم جو تھا، وہ مؤثر تھا اور اس کے اثرات وآثار آہستہ آہستہ پھیلتے گئے۔

اشاعتِ حدیث کی لہر

تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری میں پوری دنیا میں ترقی کی لہر اٹھی اور پھر تعلیم کا رواج بھی عام ہوا، مدارس بھی وسیع تعداد میں جاری ہوئے، تصنیف وتالیف کے لیے بھی فضا ہموار ہوئی، مطبعے بھی قائم ہوئے اور کتابوں کی نشر واشاعت بھی عام ہونے لگی۔ برصغیر کے لوگوں پر بھی اس کا اثر پڑا اور وہ اپنے اپنے انداز میں مصروفِ عمل ہوئے۔ اسی دور (بارھویں صدی ہجری) میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تبلیغی وتصنیفی مہمات نے شہرت پائی۔ پھر ان کے صاحب زادگانِ گرامی قدر (حضرت شاہ عبدالعزیز محدث، حضرت شاہ رفیع الدین اور حضرت شاہ عبدالقادر) اور ان کے شاگردوں کی تدریسی وتصنیفی خدمات کا ایک طویل سلسلہ چلا۔ مولانا اسماعیل شہید، میاں سید نذیر حسین دہلوی، نواب سید صدیق حسن خاں، مولانا شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادی، مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری، مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری، مولانا محمد ابراہیم آروی، حافظ محمد لکھوی، سید عبداللہ غزنوی، امام سید عبدالجبار غزنوی، مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی اور دیگر بہت سے حضراتِ عالی قدر اسی سلسلۃ الذہب کے تابندہ موتی ہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

ان سطور میں اپنے محدود علم کے مطابق صرف حضرت مولانا شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادی کے بارے میں چند گزارشات پیش کرنا مقصود ہے۔ لیکن اس سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ انھیں "عظیم آبادی" کیوں کہا جاتا ہے اور عظیم آباد کہاں واقع ہے اور کس شہر کا نام ہے۔

ویہارہ سے بہار

ہندوستان کے اِس وقت اٹھائیس صوبے ہیں، جن میں ایک صوبے کا نام صوبہ بہار ہے۔

''بہار'' دراصل لفظ ''ویہارہ'' تھا۔ ویہارہ سنسکرت زبان کا لفظ ہے، اس کے لغوی معنی ہیں مدرسہ، دارالعلوم، خانقاہ، دبستان اور مرکزِ علم ...... مولانا عبدالرقیب حقانی نے ''ارضِ بہار اور مسلمان'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو علمی اکیڈمی فاؤنڈیشن کراچی کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اپنے موضوع کی یہ بڑی اہم اور دلچسپ کتاب ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''ویہارہ بدھ مذہب کے علمی اور عملی مرکزوں کا نام تھا۔ صوبہ بہار کے کھنڈرات میں اب تک سیکڑوں ویہاروں کی نشانیاں ملتی ہیں۔'' [صفحہ:۲۰]

ان ویہاروں یعنی درس گاہوں میں کسی زمانے میں طلباے علم آتے اور بدھ مذہب کے اساتذہ سے علم حاصل کرتے تھے۔ پھر یہی لفظ بگڑ کر ''بہار'' ہو گیا اور صوبے کا نام بھی بہار پڑ گیا۔

اس صوبے کا دارالحکومت ''پٹنہ'' ہے اور یہی وہ پٹنہ ہے جہاں ایشیا کی مشہور لائبریری ''خدا بخش اورنٹیل لائبریری'' قائم ہے، جس میں مختلف موضوعات اور دنیا کی مختلف زبانوں کی لاکھوں کتابیں موجود ہیں اور بے شمار شائقین علم روزانہ ان کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس لائبریری کی طرف سے کتابیں شائع بھی کی جاتی ہیں۔

اس علاقے میں جب مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تو اس کا پہلا دار الحکومت بہار شریف تھا جو وہاں کا ایک تاریخی شہر ہے اور وہ بختیار خلجی کے عہدے لے کر شیر شاہ سوری کے زمانے تک اس صوبے کا صدر مقام رہا۔ شیر شاہ سوری نے جب شہر پاٹلی پتر میں قلعہ تعمیر کرایا تو ۱۵۴۱ء میں بہار شریف کے بجاے صوبے کا دارالحکومت پاٹلی پتر کو بنا دیا گیا، جسے آگے چل کر ''پٹنہ'' کہا جانے لگا۔ اس علاقے میں بہت سے علما، مصنفین، مجاہدین، سیاست دان اور صوفیاے کرام پیدا ہوئے، جنھوں نے اپنے اپنے دائرے میں بے حد خدمات سرانجام دیں اور بڑی شہرت پائی۔ ان میں شیخ شرف الدین منیری، قاضی محب اللہ بہاری، مولانا ولایت علی صادق پوری، سید میاں نذیر حسین، علامہ شمس الحق عظیم آبادی، سر سید علی امام اور سید سلیمان ندوی جیسے اکابر شامل ہیں۔

عظیم آباد کہنے کی وجہ

اسی پٹنہ کو ''عظیم آباد'' کہا جاتا ہے۔ اسے عظیم آباد کہنے کی وجہ یہ ہے کہ مغل حکمران اورنگ زیب عالم گیر نے اپنے پوتے عظیم الشان کو صوبہ بہار کا گورنر مقرر کر کے یہاں بھیجا تو اس کے نام کی مناسبت سے اس شہر کا نام پاٹلی پتر سے تبدیل کر کے ''عظیم آباد'' رکھ دیا گیا، لیکن برطانوی دورِ حکومت میں اسے پٹنہ کہا جانے لگا اور اب بھی پٹنہ ہے اور صوبہ بہار کا دارالحکومت ہے۔ یعنی ہندوؤں کے دورِ اقتدار میں اس کا نام پاٹلی پتر تھا، مغلوں کے چھٹے حکمران اورنگ زیب عالم گیر کے

عہد حکومت میں اس کا تسمیہ عظیم آباد ہوا اور انگریزوں کے زمانے میں اسے پٹنہ کہا جانے لگا۔ وہاں کے بعض علمائے کرام کو "صادق پوری" کی نسبت سے پکارا جاتا ہے۔ صادق پور اس شہر کے ایک محلے کا نام ہے جس میں یہ حضرات سکونت پذیر تھے۔

یہاں یہ عرض کردیں کہ پاکستان کے بعض اہل علم نے برصغیر کے مشہور محدث علامہ محمد بن طاہر پٹنی (مصنف مجمع بحار الانوار اور تذکرۃ الموضوعات) کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کا وطن پٹنہ تھا اور ہندوستان کے اسی مشہور شہر کی طرف ان کی نسبت ہے اور انھیں محمد طاہر پٹنی کہا جاتا ہے۔ ان حضرات کی یہ بات قرین صحت نہیں۔ علامہ محمد بن طاہر پٹنی کا تعلق وطینت ہندوستان کے علاقہ گجرات کاٹھیاواڑ کے موضع پٹن (نہروالا) سے ہے، اسی لیے انھیں پٹنی (یا عربی میں فتنی) کی نسبت وطنیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ صوبہ بہار کے دارالحکومت پٹنہ سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔ علامہ ممدوح کے زمانے میں اس مقام کو جہاں یہ شہر واقع ہے "پاٹلی پتر" کہا جاتا تھا۔ "پٹنہ" نام کی شہرت تو اسے انگریزی حکومت کے زمانے میں ہوئی۔ علامہ ممدوح کا زمانہ اس سے بہت پہلے کا ہے۔ وہ ۹۱۳ھ میں پیدا اور ۹۸۶ھ میں فوت ہوئے۔ یعنی وہ دسویں صدی ہجری کے ہندوستانی محدث ہیں، جب کہ "پٹنہ" نام کا کوئی قریہ یا شہر ہندوستان میں اس وقت موجود نہ تھا۔

اب آئندہ سطور میں حضرت مولانا شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ کے حالات ملاحظہ فرمائیے۔ ان کے جو حالات میسر آسکے اور وہ جن کتابوں میں مرقوم ہیں ان میں دو کتابیں ہمارے محقق دوست محمد عزیر صاحب کی تصنیف کردہ ہیں۔ ایک عربی میں حیات المحدث شمس الحق واعمالہ ہے۔ یہ کتاب ۳۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اور ادارۃ البحوث الاسلامیہ والدعوۃ والافتا، جامعہ سلفیہ، بنارس (ہندوستان) کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اور دوسری اردو میں ہے، "مولانا شمس الحق عظیم آبادی۔ حیات اور خدمات"۔ یہ کتاب علمی اکیڈمی کراچی نے شائع کی ہے اور اس کے ۱۴۰ صفحات ہیں۔ ان کے علاوہ نزہۃ الخواطر کی آٹھویں جلد میں سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے ان کے مختصر حالات تحریر کیے ہیں۔ "ارضِ بہار اور مسلمان" حضرت مولانا کے پوتے جناب عبدالرقیب صاحب حقانی کی پر از معلومات تصنیف ہے جو ہندوستان کے مردم خیز خطے صوبہ بہار کے دورِ قدیم اور عہدِ جدید کے بہت سے پہلوؤں کی خوب صورت اسلوب میں وضاحت کرتی ہے۔ اس کتاب میں اس صوبے کی ان مسلمان شخصیتوں کا بہترین انداز میں تذکرہ کیا گیا ہے، جن کا مذہب وتصوف، علم وحکمت، شعر وادب، تصنیف وتالیف اور سیاسیاتِ ملکی سے کوئی تعلق رہا ہے۔ انہی عظیم شخصیات میں حضرت مولانا ممدوح کا تذکرہ کیا گیا ہے جو کتاب کے صفحہ ۱۷۹ سے صفحہ ۲۰۲ تک چلا گیا ہے۔ میں نے اپنے اس مضمون میں حضرت مولانا عظیم آبادی سے متعلق ان کتابوں کے علاوہ بعض دیگر کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔

مولانا شمس الحق دادیہال اور نانیہال دونوں طرف سے صدیقی ہیں اور ان کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے، جس کے چند ابتدائی نام یہ ہیں: شمس الحق بن امیر علی بن مقصود علی بن غلام حیدر بن ہدایت اللہ بن محمد زاہد بن نور محمد بن علاء الدین ......

آبا واجداد اور اصل مسکن

مولانا کے آبا واجداد کا اصل مسکن موضع ہرداس بگھہ تھا جو ضلع پٹنہ کے فتوحہ ریلوے اسٹیشن سے دومیل کے فاصلے پر واقع ہے۔ مولانا کے پردادا شیخ غلام حیدر اپنے علاقے کے صاحبِ ثروت بزرگ تھے جو عظیم آباد (پٹنہ) کے محلّہ گزری میں کئی بڑی بڑی کوٹھیوں کے مالک تھے۔ مولانا کے والد امیر علی کا قیام مختلف اوقات میں دونوں جگہ رہتا تھا، ہرداس بگھہ میں بھی اور گزری محلّہ (پٹنہ) میں بھی۔ ربیع الاوّل ۱۲۶۳ھ (مارچ ۱۸۴۷ء) میں ان کی شادی مولانا گوہر علی کی صاحب زادی سے ہوئی جو پٹنہ کے رمنہ محلّہ اور موضع ڈیانواں کے رئیس تھے۔ مولانا گوہر علی کی ایک ہی لڑکی تھی اور وہ اسے اپنے پاس ہی رکھنا چاہتے تھے۔ چناں چہ شادی کے بعد مولوی امیر علی اپنے سسرال کے گھر رمنہ محلّہ (پٹنہ) میں رہنے لگے۔

امیر علی نیک طینت اور انکسار پیشہ بزرگ تھے۔ اس زمانے کے ذریعۂ تعلیم کے مطابق انھوں نے فارسی کی بعض کتابیں گھر میں اپنے بعض بزرگوں سے پڑھیں۔ فقہ کی شرح وقایہ اور علم نحو کی شرح جامی اور دیگر کتابیں رمنہ محلّہ (پٹنہ) میں وہاں کے اصحابِ علم سے پڑھیں۔ اس طرح وہ علوم دینیہ سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ ان کی ولادت ۱۲۴۳ھ میں ہوئی تھی اور وفات ۱۲۸۴ھ میں محلّہ رمنہ (پٹنہ) میں ہوئی۔ اپنے آبائی گاؤں ہرداس بگھہ میں انھیں دفن کیا گیا۔

مولانا شمس الحق کی والدہ بھی نہایت نیک اور صالحہ خاتون تھیں۔ ان کی ولادت ماہِ صفر ۱۲۴۹ھ (جولائی ۱۸۳۳ء) میں محلّہ رمنہ (پٹنہ) میں ہوئی تھی۔ ربیع الاوّل ۱۲۶۳ھ (مارچ ۱۸۴۷ء) میں ان کی شادی ہوئی اور ۱۳۱۲ھ (۱۸۸۵ء) میں اپنے پوتوں اور خاندان کے بعض افراد کے ساتھ حج بیت اللہ کیا۔ حج سے کئی سال بعد تک زندہ رہیں لیکن تاریخ وفات کا علم نہیں ہوسکا۔ ان کی اولاد پانچ لڑکیاں تھیں اور چار لڑکے۔ سب سے بڑے لڑکے کبیر الحق اور ان سے چھوٹے ظہیر الحق تھے، دونوں چھوٹی عمر میں وفات پا گئے تھے۔ تیسرے لڑکے مولانا شمس الحق تھے جن کے حالات آئندہ سطور میں بیان ہو رہے ہیں اور چوتھے مولانا محمد اشرف تھے، جن کا انتقال ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) میں ہوا۔

مولانا شمس الحق کے نانا مولانا گوہر علی ۱۲۱۳ھ (۹۹-۱۷۹۸ء) میں بمقام ڈیانواں پیدا

ہوئے۔ دنیوی وجاہت کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی میں دست گاہ رکھتے تھے۔ ۱۹۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۸۷ھ (۲۲۔ نومبر ۱۸۶۱ء) کو انتقال ہوا اور ڈیانواں میں مدفون ہوئے۔

اب آیئے حضرت مولانا شمس الحق کی طرف.....!

ولادت

مولانا ممدوح ۲۷۔ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ (۱۹۔ جولائی ۱۸۵۷ء) کو عظیم آباد (پٹنہ) کے محلہ رمنہ میں اپنے ننیہال کے گھر پیدا ہوئے۔ یہ زمانہ ہندوستان میں نہایت ہنگاموں کا زمانہ تھا۔ اسی زمانے میں ہندوستان کی مغل حکومت کا خاتمہ ہوا اور یہ وسیع ملک انگریزوں کے قبضے میں آیا۔ مسلمان بالخصوص اس زمانے میں مصائب کا شکار ہوئے۔ یہ ایک طویل اور دردناک داستان ہے، جس کے بیان کا یہ محل نہیں۔

مولانا شمس الحق پانچ سال کی عمر کے ہوئے تو اپنی والدہ کے ساتھ ڈیانواں چلے گئے اور وہیں مستقل طور سے اقامت اختیار کر لی۔ ان کی والدہ بھی یہیں سکونت پذیر تھیں۔ ڈیانواں ان کے ننیہال کا گاؤں تھا جو ضلع پٹنہ (عظیم آباد) کا ایک ریلوے اسٹیشن ہے۔ یہ گاؤں مسلمان شرفا کا مسکن تھا اور یہاں کے لوگ علم وشائستگی میں شہرت رکھتے تھے۔ مولانا شمس الحق نے آگے چل کر گاؤں کی سکونت کے اعتبار سے ڈیانوی اور ضلعی اعتبار سے عظیم آبادی کی نسبت سے شہرت پائی۔ چناں چہ مولانا ڈیانوی یا مولانا عظیم آبادی سے یہی مولانا شمس الحق مراد ہیں۔

۱۲۸۴ھ (۶۸۔۱۸۶۷ء) میں جب کہ شمس الحق کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی، ان کے والد مکرم مولوی امیر علی وفات پا گئے۔ ان کی والدہ، نانی اور بڑے ماموں مولوی محمد احسن نے نہایت ذمہ داری سے ان کی تربیت کی اور ان کی تعلیم کا اہتمام کیا۔

تعلیم کا آغاز اور مختلف اساتذہ سے استفادہ

مولانا محمد ابراہیم نگرنہسوی اس نواح کے مشہور عالم تھے، ان سے تعلیم کا آغاز کیا اور انھوں نے سورہ ''اقراء'' پڑھائی۔ پھر ڈیانواں ہی میں حافظ اصغر علی رام پوری، مولوی سید راحت حسین بھتوی اور مولوی عبدالحکیم شیخ پوری سے ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ فارسی کی بعض کتابوں میں بھی انہی سے استفادہ کیا۔

بعد ازاں مولانا لطف العلی بہاری سے باقاعدہ عربی تعلیم کا آغاز کیا۔ ان سے شرح جامی، قطبی، میبذی، اصول شاشی، نورالانوار، شرح وقایہ، کنز الدقائق اور جامع ترمذی وغیرہ کتابیں پڑھیں جو نحو،

منطق، فقہ، اصولِ فقہ اور حدیث کے علوم پر مشتمل ہیں۔ اس اثنا میں اپنے ماموں مولوی نور احمد ڈیانوی سے بھی استفادے کا سلسلہ جاری رہا۔

تحصیل علم کے لیے پہلی دفعہ ۱۲۹۲ھ میں ڈیانواں سے باہر نکلے اور لکھنؤ پہنچے۔ اس وقت وہ انیس برس کے خوب صورت جوان تھے۔ لکھنؤ میں مولانا فضل اللہ لکھنوی سے معقولات کی بعض کتابوں کی تکمیل کی۔ ایک برس وہاں رہے۔ پھر ۲۶۔ محرم ۱۲۹۳ھ (۲۲۔ فروری ۱۸۷۶ء) کو مولانا بشیر الدین قنوجی کی خدمت میں مراد آباد چلے گئے، ان سے کافی استفادہ کیا۔ ایک سال وہاں قیام رہا۔ وہاں سے ربیع الاوّل ۱۲۹۴ھ (اپریل ۱۸۷۷ء) میں واپس ڈیانواں تشریف لے گئے۔ اس سے دو ڈھائی مہینے بعد ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۴ھ (۲۔ جون ۱۸۷۷ء) کو دوبارہ مراد آباد کا عزم کیا اور مولانا بشیر الدین قنوجی کی خدمت میں حاضری دی۔ ان سے معقولات اور معانی و بلاغت کی کتابوں کے علاوہ قرآنِ مجید کا ترجمہ پڑھا اور تفسیر، حدیث اور فقہ وعقائد کی تعلیم حاصل کی۔

حضرت میاں صاحب کی خدمت میں

۱۲۹۵ھ کے محرم کی ابتدائی تاریخوں میں حضرت میاں سید نذیر حسین کی خدمت میں دہلی تشریف لے گئے اور ان سے علم حدیث میں مستفید ہوئے۔ آخر محرم ۱۲۹۶ھ (جنوری ۱۸۷۹ء) میں میاں صاحب سے سند حدیث حاصل کی اور اپنے وطن واپس آئے۔ [1] ایک سال ان کی خدمت میں رہے۔ وطن آ کر درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مشغول ہوگئے۔ چھ سال بعد ۱۳۰۲ھ میں پھر عازمِ دہلی ہوئے اور حضرت میاں صاحب کی خدمت میں حاضری دی۔ کچھ عرصہ ان سے استفادہ کیا اور دوسری دفعہ سند لے کر ۱۳۰۳ھ میں اپنے وطن ڈیانواں تشریف لائے۔ دونوں مرتبہ دہلی میں میاں صاحب کی خدمت میں قیام کا عرصہ ڈھائی سال کے قریب ہے۔ اس عرصے میں ان سے ترجمہ قرآن پڑھا، نیز تفسیر جلالین، صحاح ستہ، موطا امام مالک، سنن دارمی، سنن دارقطنی اور شرح نخبۃ الفکر (نزہۃ النظر) کتابیں سبقاً سبقاً پڑھیں اور فتوے بھی قلم بند کیے۔ [2]

حضرت مولانا شمس الحق دہلی کے دوسرے سفر میں شیخ حسین بن محسن یمانی انصاری (متوفی ۱۳۲۷ھ) کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے اور صحاح ستہ کے اطراف پڑھ کر ان سے عام اجازت

---

[1] جناب محمد عزیر صاحب لکھتے ہیں کہ یہ سند آج بھی خدا بخش لائبریری میں زیر رقم ۳۱۹۶ بخط مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی موجود ہے، جس کا ذکر اس کے عربی مخطوطات کی فہرست ''مفتاح الکنوز'' ج:۳، ص:۲۴ میں کیا گیا ہے۔ (مولانا شمس الحق۔ حیات اور خدمات، ص:۵۲۔ حاشیہ نمبر۱)

[2] مولانا شمس الحق ص:۵۲ بحوالہ یادگارِ گوہری، ص:۱۰۹

حاصل کی۔ اس کے علاوہ بھی مختلف اوقات میں وہ متعدد مرتبہ شیخ موصوف کی خدمت میں حاضر ہو کر مستفید ہوئے۔

ابتدائے زندگی ہی سے مولانا اتباعِ سنت کے پابند اور اعمال وعقائد میں صحابہ وتابعین اور سلف صالحین کے نقطہ نظر کو اپنانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ خود فرماتے ہیں:

مولانا عظیم الدین نگرنہسوی (متوفی ۱۳۰۶ھ) کے پند ونصائح سے بڑا فائدہ حاصل ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اتباعِ سنت کا شوق انھی کے واسطے سے ہم کو عطا فرمایا ہے اور میرے رفیق حبیب مولوی تلطف حسین محی الدین پوری (۱۳۳۴ھ) نے بھی ان امور میں میری مدد کی ہے، جزاھما اللہ خیرا۔ ❶

پہلے بتایا گیا ہے کہ مولانا عظیم آبادی پہلی دفعہ حصولِ علم کے لیے محرم ۱۲۹۳ھ کو مولانا بشیر الدین قنوجی کے پاس مراد آباد گئے اور ربیع الاوّل ۱۲۹۴ھ کو واپس ڈیانواں آئے تھے۔ تقریباً سوا سال مولانا قنوجی کی خدمت میں رہے۔ واپسی کے چند روز بعد ہی ۱۵۔ ربیع الاوّل ۱۲۹۴ھ (۳۰۔ مارچ ۱۸۷۷ء) کو ان کی شادی چھپرہ کے ایک بزرگ مولوی عبداللطیف صدیقی کی صاحب زادی سے ہوئی۔ اس وقت وہ اکیس برس کے جوان رعنا تھے۔

سلسلۂ درس وتدریس

حضرت میاں صاحب سے پہلی مرتبہ سند حدیث لے کر مولانا عظیم آبادی محرم ۱۲۹۶ھ (جنوری ۱۸۷۹ء) میں اپنے وطن ڈیانواں واپس آئے تھے اور آتے ہی درس وتدریس اور دیگر علمی کاموں میں مشغول ہوگئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر تیئس سال کی تھی۔ اس سے چھ سال بعد ۱۳۰۲ھ میں دوبارہ میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ۱۳۰۳ھ میں واپس تشریف لائے تو پھر باقاعدگی کے ساتھ مسند درس آراستہ کی اور اپنے آپ کو تدریس کے لیے وقف کر دیا۔ ان کی وجہ سے اس چھوٹے سے گاؤں کو بے حد شہرت حاصل ہوئی اور عرب، ایران، افغانستان وغیرہ کے بے شمار طلباے علم ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور تحصیل علم کرنے لگے۔ مولانا سب سے نہایت لطف وکرم سے پیش آتے اور بڑی محبت اور شفقت سے انھیں مختلف علوم متداولہ کی کتابیں پڑھاتے، لیکن حدیث ان کا خاص موضوع تھا، چناں چہ حدیث اور اس سے متعلقہ علوم کی تعلیم انتہائی رغبت وشوق کے ساتھ دیتے۔ طلبا کے لیے وہ خود ہی کتابیں مہیا فرماتے، خود ہی ان کے ضروری اخراجات کی کفالت کرتے اور خود ہی ان کے خورونوش کا انتظام کرتے۔ مہمانوں کی آمد ورفت بھی ان کے پاس بہ کثرت

---

❶ مولانا شمس الحق حیات اور خدمات، ص: ۵۳

رہتی تھی، ان کی بھی دل کھول کر خدمت کرتے۔ مہمانوں میں اس عہد کے بڑے بڑے علما بھی شامل ہوتے تھے۔ وہ سب سے خندہ پیشانی سے ملتے۔ ان کی آمد کو اپنے لیے باعث اعزاز اور ان کی خدمت کو موجب سعادت قرار دیتے۔ نہایت فراخ حوصلہ اور وسیع القلب عالم تھے۔ گھر سے آسودہ حال اور صاحبِ ثروت تھے۔

چند تلامذہ کرام

جن حضرات نے مولانا شمس الحق عظیم آبادی سے تعلیم حاصل کی، ان سب کو شمار میں لانا ممکن نہیں۔ البتہ ان میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ یہ وہ بزرگانِ عالی قدر ہیں، جنھوں نے حصولِ علم کے بعد تصنیفی اور تدریسی صورت میں بے پناہ خدمات سرانجام دیں اور بے شمار حضرات ان کے علم وفضل سے فیض یاب ہوئے۔ یہ چند نام جناب محمد عزیر صاحب کی کتاب (مولانا شمس الحق۔ حیات اور خدمات) سے یہاں نقل کیے جا رہے ہیں۔

① ...... مولانا احمد اللہ پرتاب گڑھی۔ (وفات ۱۲۔ ربیع الاوّل ۱۳۶۲ھ ...... ۱۹۔ مارچ ۱۹۴۳ء)

② ...... مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی۔ (وفات ۷۔ صفر ۱۳۸۱ھ ...... ۲۱۔ جولائی ۱۹۶۱ء)

③ ...... مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی۔ (وفات ۳۔ صفر ۱۳۶۹ھ ...... ۲۵۔ نومبر ۱۹۴۹ء)

④ ...... مولانا عبدالحمید سوہدروی۔ (وفات۔ ۷۔ جمادی الاخریٰ ۱۳۳۰ھ ...... ۲۴۔ مئی ۱۹۱۲ء)

⑤ ...... مولانا فضل اللہ مدراسی۔ (وفات ۱۳۶۱ھ ...... ۱۹۴۲ء)

⑥ ...... مولانا محمد اشرف ڈیانوی۔ یہ مولانا عظیم آبادی کے چھوٹے بھائی تھے۔ (وفات ۱۳۲۶ھ ...... ۱۹۰۸ء)

⑦ ...... مولانا ابوعبداللہ محمد زبیر ڈیانوی۔ (وفات ۱۳۶۹ھ ...... ۱۹۱۱ء)

⑧ ...... حکیم محمد ادریس بن مولانا عظیم آبادی ڈیانوی۔ (وفات جمادی الاخریٰ ۱۳۸۰ھ ...... دسمبر ۱۹۶۰ء)

⑨ ...... مولانا عین الدین مُنیا برجی

⑩ ...... حافظ محمد ایوب ڈیانوی۔ (وفات ۱۳۴۲ھ ...... ۱۹۲۴ء)

⑪ ...... مولانا محمد موسیٰ ڈیانوی۔

⑫ ...... مولانا عبدالجبار ڈیانوی۔ (وفات ۱۳۱۹ھ ...... ۱۹۰۱ء)

⑬ ...... شیخ عبدالحق الفاسی مراکشی۔ (وفات ۱۳۸۳ھ ...... ۱۹۶۳ء)

⑭ ...... علامہ اسماعیل خطیب الازہری

سفر حج اور علماے حجاز سے استفادہ

زمانۂ تدریس میں مولانا عظیم آبادی نے ۱۰۔ رجب ۱۳۱۱ھ (۱۷۔ جنوری ۱۸۹۴ء) کو اپنے مسکن ڈیانواں سے حج بیت اللہ کے لیے شدِ رحال کیا اور حج وزیارت کا فریضہ سرانجام دینے کے علاوہ وہاں کے متعدد اصحابِ علم سے ملاقات کی اور استفادہ کیا۔ مندرجہ ذیل مشائخ کرام سے سند واجازہ کا شرف حاصل ہوا۔

① ...... علامہ خیر الدین ابوالبرکات نعمان بن محمود آلوسی حنفی بغدادی۔ (وفات ۱۳۱۷ھ)
② ...... شیخ احمد بن ابراہیم بن عیسیٰ نجدی ثم مکی، حنبلی۔ (وفات ۱۳۲۹ھ)
③ ...... شیخ احمد بن احمد بن علی مغربی تونسی ثم مکی۔ (وفات ۱۳۱۴ھ)
④ ...... قاضی عبدالعزیز بن صالح بن مرشد حنبلی شرقی۔ (وفات ۱۳۲۴ھ)
⑤ ...... شیخ عبدالرحمٰن بن عبداللہ السراج حنفی طائفی۔ (وفات ۱۳۱۵ھ)
⑥ ...... شیخ محمد بن سلیمان حسب اللہ شافعی مکی۔ (وفات ۱۳۳۵ھ)
⑦ ...... شیخ ابراہیم بن احمد بن سلیمان مغربی ثم مکی۔
⑧ ...... شیخ محمد فالح بن محمد بن عبداللہ ظاہری المہنادی مالکی مدنی۔ (وفات ۱۳۲۸ھ)

حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کرنے اور ان مشائخ کرام سے چھ ماہ مستفید ہونے کے بعد ۱۰۔ محرم ۱۳۱۲ھ (۱۴۔ جولائی ۱۸۹۴ء) کو واپس ڈیانواں تشریف لائے۔

اہم ترین مشاغل

مندرجہ ذیل چھ امور حضرت مولانا عظیم آبادی کے اہم ترین مشاغل تھے اور وہ زندگی بھر انہی امور کی انجام دہی میں مشغول رہے۔

① ...... درس وتدریس
② ...... وعظ وتذکیر
③ ...... تصنیف وتالیف
④ ...... فتویٰ نویسی
⑤ ...... کتابیں جمع کرنے کا شوق
⑥ ...... کتب حدیث کی ترویج واشاعت

اب آئندہ سطور میں ان مشاغل ستہ یا معمولاتِ ستہ کی مختصر الفاظ میں وضاحت۔

گزشتہ سطور میں حضرت کے درس وتدریس کا تذکرہ چند الفاظ میں کردیا گیا ہے اور ان کے بعض لائق تکریم تلامذہ کے اسمائے گرامی بھی بتائے جاچکے ہیں۔ اس کے بعد حضرت کے وعظ وتذکیر اور دعوت وارشاد کے متعلق عرض کرنا ضروری ہے۔

وعظ وتذکیر اور اس کے اثرات

حضرت مولانا نہایت مؤثر وعظ فرماتے تھے اور ان کے مواعظ سے ان کے اہل علاقہ کو بے حد فیض پہنچا۔ بدعات ومحدثات کا جو ان کے دلوں میں راسخ ہوچکی تھیں، مولانا کے دل پذیر وعظوں اور دعوت وارشاد کے مؤثر انداز سے خاتمہ ہوا۔ خواتین غیر شرعی رسوم کی بالخصوص مرتکب ہوتی ہیں، لیکن مولانا ممدوح کی تبلیغ سے خواتین بہت متاثر ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بدعات ورسوم سے کنارہ کش ہونے کی توفیق مرحمت فرمائی۔ ان کی نانی کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنے اس نواسے سے فرمایا کرتی تھیں کہ ''تم جس وقت اللہ کی باتیں سناتے ہو، اس وقت بزرگ معلوم ہوتے ہو۔''[1]

جو لوگ مدتوں سے جاہلانہ رسوم کا ارتکاب کررہے ہوں اور عرصۂ دراز سے فسق وفجور میں مبتلا ہوں، ان کے لیے ان کو ترک کرنا اور تائب ہونا بہت مشکل ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو راہِ ہدایت پر گامزن فرمایا اور وہ اقوال واعمال میں کتاب وسنت کے اطاعت گزار ہوئے۔

کتبِ حدیث کی ترویج واشاعت

وعظ وارشاد کے سلسلے کے چند اشاروں کے بعد کتبِ حدیث کی ترویج واشاعت کے بارے میں مولانا ممدوح کی مساعی کا تذکرہ نہایت اختصار کے ساتھ۔

حضرت ممدوح نے صرف ۵۶ سال عمر پائی، جس میں اکیس بائیس سال حصولِ تعلیم میں گزرے، باقی تینتیس چونتیس سال میں انھوں نے درس وتدریس بھی کی، وعظ وتذکیر کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور کتبِ حدیث کی نشر واشاعت کے لیے بھی بے حد خدمات سرانجام دیں۔ اس اثنا میں اپنی وقیع تریں تصانیف کے علاوہ انھوں نے منذری کی مختصر السنن، امام ابن قیم کی تہذیب السنن اور امام سیوطی کی اسعاف المبطا وغیرہ متعدد کتابیں باقاعدہ تصحیح وتعلیق کے بعد اپنے خرچ سے شائع کیں۔

قاضی محمد مچھلی شہری (متوفی ۱۳۲۰ھ) مشہور عالم دین تھے اور تقریباً پچیس کتابوں کے مصنف تھے، ان کی وفات کے بعد مولانا عظیم آبادی نے ان کے بیٹوں سے بار بار کہا کہ وہ ان کی کتابیں شائع کرنا چاہتے ہیں، ان کے مسودات انھیں دیے جائیں، لیکن ان کے بیٹوں نے مولانا کے فرمان

[1] مولانا شمس الحق عظیم آبادی، ص: ۵۸ بحوالہ یادگار گوہری، ص: ۹۳

پر عمل نہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تصانیف میں سے کوئی کتاب بھی چھپ نہ سکی۔ [2]

جس طرح حضرت نواب صدیق حسن خاں نے اپنے خرچ سے بہت سی اہم کتابیں شائع کیں، اسی طرح مولانا عظیم آبادی نے بھی یہ خدمت سرانجام دی اور بڑی فراخ حوصلگی سے دی۔

ان کے فرمان کے مطابق تصنیف شدہ کتابیں

حضرت مولانا عظیم آبادی کی اپنی تصانیف کا ذکر تو آگے آئے گا، یہاں ان تصانیف کا ذکر کیا جاتا ہے جو مختلف حضرات نے ان کے فرمان کے مطابق تصنیف کیں۔ اس سے مقصد محض کتاب وسنت کی حمایت وتائید اور سلف صالحین کے نقطہ نظر کو اجاگر کرنا تھا۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

○ ڈاکٹر عمر کریم پٹنوی اور سید عبدالغفور عظیم آبادی نے حدیث رسول (ﷺ) ائمہ حدیث اور امام بخاری کے خلاف زبانِ طعن دراز کی تو مولانا عظیم آبادی نے اپنے لائق شاگرد اور نامور عالم مولانا ابوالقاسم بنارسی کو میدان میں اتارا اور ان کی مالی اور علمی اعانت کی۔ انھوں نے اس موضوع پر جو کتابیں لکھیں، وہ یہ ہیں: ① حل مشکلاتِ بخاری، ② الامر المبرم لابطال الکرام المحکم، ③ ماء حمیم للمولوی عمر کریم، ④ صراطِ مستقیم لہدایۃ عمر کریم، ⑤ الریح العقیم لحسم بناء عمر کریم، ⑥ الارجون القدیم فی افشاء ہفوات عمر کریم، ⑦ الرای العظیم لمولوی عمر کریم۔ یہ تمام کتابیں مولانا عظیم آبادی نے اپنے خرچ سے شائع کرائیں۔

○ مولانا شبلی نعمانی کی تصانیف سے بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا اور آئندہ کریں گے۔ ان کی تصانیف میں ایک مشہور کتاب ''سیرۃ النعمان'' ہے جو حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے متعدد مقامات پر تاریخی اعتبار سے مولانا شبلی نے ٹھوکر کھائی ہے۔ اس میں انھوں نے محدثین کو ہدفِ تنقید ٹھہرایا ہے، امام بخاری رحمہ اللہ کو بالخصوص نشانہ نقد وجرح قرار دیا ہے۔ یہ کتاب پڑھ کر مولانا عظیم آبادی نے ضروری سمجھا کہ امام بخاری کے حالات میں ایک مستقل کتاب لکھی جائے، جس میں امام کے محدثانہ کارناموں اور ان کی تحقیقی عظمت کو اجاگر کیا جائے، چناں چہ اس کے لیے انھوں نے اپنے عہد کے بہت بڑے محقق حضرت مولانا عبدالسلام مبارک پوری سے بات کی اور انھیں ''سیرۃ البخاری'' لکھنے پر آمادہ کیا۔ طباعت وغیرہ کے سلسلے میں تعاون کے علاوہ کتاب کے سو نسخے خریدنے کا وعدہ فرمایا، لیکن افسوس ہے کتاب کی اشاعت سے پہلے ہی مولانا عظیم آبادی (۱۹۱۱ء میں) وفات پاگئے۔ یہ کتاب اپنے موضوع کی بے مثال کتاب ہے۔

---

❶ تراجم علمائے حدیث ہند، ص: ۳۸۰

یہ کتاب پہلی مرتبہ فاضل مصنف کی زندگی میں ۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) میں شائع ہوئی تھی اور مصنف کا انتقال رجب ۱۳۴۲ھ (فروری ۱۹۲۴ء) میں ہوا۔ دوسری دفعہ یہ کتاب محرم ۱۳۶۶ھ (دسمبر ۱۹۴۶ء) میں چھپی۔ لیکن میرے سامنے اہل حدیث اکیڈمی لاہور کی مطبوعہ کتاب ہے، جس کی تاریخ طباعت ستمبر ۱۹۶۸ء ہے اور 20x30=16 سائز کے 480 صفحات پر مشتمل ہے۔

سیرۃ النعمان کے جواب میں حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی نے بھی ''حسن البیان فیما فی سیرۃ النعمان'' کے نام سے کتاب لکھی۔ یہ اس قدر مدلل کتاب ہے کہ آج تک کوئی حنفی عالم اس کا جواب نہ دے سکا۔ بلکہ خود مولانا شبلی نے اس قسم کے موضوع پر لکھنا چھوڑ دیا۔

○ مولانا ظہیر احسن شوق نیموی اس زمانے کے ایک معروف حنفی المسلک عالم ومصنف تھے جن کا انتقال ۱۳۲۲ھ میں ہوا۔ انھوں نے اہل حدیث کی مخالفت میں بعض رسائل تحریر کیے تو مولانا عظیم آبادی کے کہنے پر مولانا محمد سعید بنارسی (متوفی رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ ...... نومبر ۱۹۰۴ء) نے ان کا جواب لکھا۔

○ اسی طرح مولانا عظیم آبادی نے مولانا ظہیر احسن شوق نیموی کی بعض تحریرات کے جوابات مولانا ابوالمکارم محمد علی مئوی (۱۳۵۳ھ......۱۹۳۳ء) سے لکھوائے۔

نکاحِ بیوگان کا مسئلہ

مولانا عظیم آبادی اتباعِ سنت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے اور بدعات سے بے حد نفور تھے۔ ہندوؤں کے اثر کی وجہ سے ان کے زمانے میں بیوہ عورتوں کے نکاح کو مسلمان اپنی توہین قرار دیتے تھے، لیکن مولانا عظیم آبادی نے اس غلط نظریے کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اپنی بعض قریبی رشتے دار بیوہ عورتوں کے نکاح کرائے۔ اس زمانے میں یہ بہت بڑا جہاد اور مشکل ترین کام تھا جو مولانا نے انتہائی ہمت سے کیا۔

جماعتی تنظیم میں دلچسپی

اپنی تمام تدریسی وتصنیفی مصروفیات کے باوجود مولانا عظیم آبادی جماعتی تنظیم میں بھی کامل دلچسپی رکھتے تھے۔ دسمبر ۱۹۰۶ء کو آرہ میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کی تاسیس عمل میں آئی تو مولانا نے بے حد مسرت کا اظہار فرمایا اور اس کے ہر پروگرام میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ اس کے خازن مقرر کیے گئے اور آخرت وقت تک اس منصب پر فائز رہے۔ حساب کتاب میں بے حد محتاط تھے، اس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے مولانا ثناء اللہ امرتسری کے نام ۱۴۔ مارچ ۱۹۱۱ء کو لکھا۔ یہ

خط نہایت دردناک ہے۔ غالباً یہ ان کی زندگی کا آخری خط ہے جو انھوں نے اپنے دست مبارک سے تحریر فرمایا۔ یہ خط آئندہ صفحات میں درج کیا جارہا ہے۔

اصلاحی اور علمی تحریکوں میں شمولیت

مولانا مرحوم اپنے عہد کی بہت سی اصلاحی اور علمی تحریکوں میں شامل رہے اور ان کی مالی امداد کرتے رہے، مثلاً دارالعلوم ندوۃ العلما کے حامی تھے اور اس کی ہر قسم کی اعانت فرماتے تھے۔ مولانا عبدالرحیم صادق پوری نے پٹنہ میں مدرسہ اصلاح المسلمین قائم کیا تو کافی عرصہ اس کے سیکرٹری رہے۔ ۱۲۹۷ھ میں آرہ میں مولانا ابومحمد ابراہیم نے مدرسہ احمدیہ جاری کیا تو مولانا عظیم آبادی اس کے اہم رکن تھے اور اس کی تعمیر وترقی میں کوشاں رہتے تھے۔ دائرۃ المعارف النظامیہ (حیدر آباد دکن) کے رکن تھے۔ تہذیب التہذیب اور تذکرۃ الحفاظ وغیرہ متعدد کتابیں اس ادارے کی طرف سے انھی کے مشورے سے شائع کی گئیں۔ [1]

اصحابِ علم سے تعلقات ومراسم

مولانا عظیم آبادی ہندوستان کے بہت بڑے اہل حدیث عالم تھے، لیکن ہر مسلک فقہی کے اہل علم سے گہرے عالمانہ مراسم رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جہاں اہل حدیث نہایت احترام کے الفاظ سے ان کا تذکرہ کرتے ہیں، وہاں غیر اہل حدیث بھی انتہائی اکرام کے ساتھ ان کی علمی مساعی کا ذکر فرماتے ہیں۔ چناں چہ مولانا سید عبدالحی حسنی نزہۃ الخواطر میں ان کے ترجمے کا آغاز الشیخ العالم الکبیر المحدث کے پرعظمت الفاظ سے کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

> وعكف على التدريس والتصنيف، والتذكير، وبذل جهدَه في نصرة السنة، والطريقة السلفيه، واشاعة كتب الحديث، وجمع كتبها التى كانت عزيزة الوجود فى السنة المطهرة وانفق مالا فى طبع بعض الكتب، وله منة عظيمة علىٰ اهل العلم بذالك. [2]

یعنی فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا عظیم آبادی درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور وعظ وتذکیر میں مشغول ہوگئے اور اپنی تمام تر کوششیں سنت رسول (ﷺ) کی ترویج، طریقہ سلف کی حمایت اور کتب حدیث کی اشاعت کے لیے وقف فرمادیں۔ سنت مطہرہ

---

[1] مولانا شمس الحق عظیم آبادی۔ حیات اور خدمات، ص:۶۲ بحوالہ ہفت روزہ اہل حدیث امرتسر، مؤرخہ ۲۸۔ اپریل ۱۹۱۱ء۔

[2] نزہۃ الخواطر، ج:۸، ص:۱۷۹

کی تبلیغ کے لیے انھوں نے نہایت اہم نادر ونایاب کتابیں جمع کیں اور خطیر رقم خرچ کرکے بعض کتابوں کی طباعت کا اہتمام کیا۔ اہل علم پر ان کا یہ بہت بڑا احسان ہے۔

بلند اخلاق اور اہل علم کے معاون

مولانا سید عبدالحی حسنی ان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

كان حليماً متواضعاً، كريماً عفيفاً، صاحب صلاح وطريقة ظاهرة محباً لاهل العلم ...... كان يحبني لله سبحانه وكنت احبه، وكانت بيني وبينه من المراسلة مالم تنتقطع الى يوم وفاته ❶.

یعنی حلیم الطبع، متواضع، شریف النفس، پاک دامن اور عمدہ اطوار عالم تھے۔ اہل علم سے محبت رکھتے تھے ...... مجھ سے اللہ کے لیے محبت کا برتاؤ فرماتے تھے اور میں بھی ان سے محبت کرتا تھا۔ میرے اور ان کے درمیان ان کی وفات تک خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا۔

حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری فرماتے ہیں:

اخلاق کی یہ کیفیت تھی کہ کبھی ان کی پیشانی پر بل نہیں دیکھا بلکہ حدیث شریف **تبسمک فی وجه اخیک صدقة** پر پورے عامل تھے۔ میں نے اس حدیث کے عامل علما کو کم دیکھا ہے۔ ❷

نہایت بلند اخلاق، سخی، مہمان نواز، فیاض طبع اور اہل علم کے قدر دان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے گھر عام طور سے علما وطلبا کا مجمع لگا رہتا تھا۔ ان کا کتب خانہ اہل علم کے لیے ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ شائقین علم کو بلا تامل اپنی کتابیں عاریۃً دے دیتے تھے۔ بعض اوقات ہدیۃً عنایت فرما دیتے تھے۔ شرح بخاری کے ان کے کتب خانے میں کئی نسخے تھے، ان میں سے ایک نسخہ کتب خانہ اصلاح المسلمین پٹنہ کو اور دوسرا مولوی محمد پٹوی مالک مطبع احمدی کو دے دیا۔

اہل علم کی علمی اعانت کرنا ان کے نزدیک ضروری تھا۔ چناں چہ مولانا سید عبدالحی حسنی نے اپنی کتابوں **نزهة الخواطر** اور **الثقافة الاسلامية في الهند** کی ترتیب وتالیف میں ان کے کتب خانے سے بہت مواد حاصل کیا۔ دوسروں کی علمی مدد، فروتنی اور تواضع ان کا شیوہ تھا۔ بے حد نرم کلام اور

❶ نزہۃ الخواطر، ج:۸، ص:۱۸۰

❷ مولانا شمس الحق عظیم آبادی، ص:۶۵ بحوالہ اخبار ''اہل حدیث'' (امرتسر) مؤرخہ ۳۱۔ مارچ ۱۹۱۱ء)

نرم مزاج تھے۔ کتاب وسنت کے عظیم مبلغ تھے اور اس کے لیے ہمیشہ بہ درجہ غایت مستعد رہتے تھے۔

مولانا عظیم آبادی کا عظیم کتب خانہ

کہا جاتا ہے کہ اُس دور میں مولانا عظیم آبادی کے کتب خانے کا شمار ہندوستان کے عظیم کتب خانوں میں ہوتا تھا جو مختلف علوم وفنون کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں پر محیط تھا۔ بنارس کے ٹاؤن ہال میں ۱۴۔ اپریل ۱۹۰۶ء کو ندوۃ العلما کی طرف سے نادر وکم یاب کتابوں کی نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس نمائش میں فن حدیث کی بعض بہت ہی قدیم اور نایاب کتابیں مولانا عظیم آبادی کے کتب خانے سے آئی تھیں۔ مولانا شبلی کی تحریر کے مطابق وہ یہ کتابیں تھیں: **مسند عبد بن حمید الکشی** (۲۴۹ھ) **مسند ابی عوانہ** (۳۱۶ھ) **مصنف ابن ابی شیبہ** (۲۳۵ھ) **معربۃ السنن والآثار للبیھقی** (۴۵۸) **معالم السنن للخطابی** (۳۸۸) **تھذیب سنن ابی لابن قیم** (۷۵۱) **کشف الاستار عن زوائد مسند البزار للھیشمی** (۷۰۷)۔

تفسیر، حدیث، شروحِ حدیث، فقہ، رجال، اصول، تاریخ وغیرہ ہر موضوع کی بے شمار کتابیں ان کے کتب خانے کی زینت تھیں۔ ان کے بعد ان کتابوں کا کیا حال ہوا؟ اس کا جواب آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمایئے۔

تصانیف

اب خود حضرت مولانا عظیم آبادی کی اپنی تصانیف کی فہرست پر نگاہ ڈالیے اور اندازہ فرمایئے کہ یہ فہرست کتنی وسیع اور کتنی عظیم الشان ہے۔

(۱)...... **غایۃ المقصود فی حل سنن ابی داؤد**: حضرت مولانا اس نام سے سنن ابی داؤد کی مبسوط اور مفصل شرح لکھنا چاہتے تھے جو متعدد جلدوں پر مشتمل ہوتی، لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوسکا۔ اس کی صرف ایک جلد مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوئی۔ یہ شرح کہاں تک لکھی جا چکی تھی؟ اس کا صحیح جواب دینا مشکل ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے اکیس پاروں کی شرح مکمل ہوگئی تھی۔ مسودے کی دو جلدیں خدابخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہیں، جن میں کتاب الطہارہ کی شرح مکمل ہے اور چند ابواب کتاب الصلوٰۃ کے بھی ہیں۔ باقی جلدوں کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کا کیا ہوا۔ جن حضرات کو اس شرح کے دست یاب ابواب کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے، وہ اس کے انداز واسلوب سے بہت متاثر ہیں۔

(۲)...... **عون المعبود علی سنن ابی داؤد**: یہ بھی سنن ابی داؤد کی شرح ہے جو چار ضخیم

جلدوں پر محیط ہے۔ اسے غایۃ المقصود کے خلاصے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ شرح ۱۳۱۸ھ سے ۱۳۲۳ھ تک چھپی۔ اس کی تصنیف میں سات سال صرف ہوئے۔ سید شاہ جہاں دہلوی نے اس کے قطعہ تاریخ میں اس مدت کی وضاحت کی ہے۔

ہوئی سات سال میں تیار
جان و دل ، مال و زر کھپانے سے

عون المعبود میں حضرتِ شارح نے غایۃ المقصود کی اہم خصوصیات بیان فرما دی ہیں۔ علامہ محمد منیر دمشقی کے بقول عون المعبود کے بعد جن حضرات نے ابوداؤد کی شرحیں لکھیں، سب نے اس کے علمی نکات بیان کیے۔

كل من جاء بعده من شيوخ الهند وغيره استمدوا من شرحه.[1]

یعنی حضرت مولانا شمس الحق عظیم آبادی کے بعد ہند اور بیرونِ ہند کے جن شارحین نے ابوداؤد کی شروح لکھیں، انھوں نے عون المعبود سے استفادہ کیا۔

یہ شرح بہت مقبول ہوئی، ہندوستان، پاکستان، لبنان اور سعودی عرب میں کئی دفعہ شائع ہوئی اور اہل علم اس کے مندرجات سے بے حد مستفید ہوئے۔

(۳)...... **التعليق المغني على سنن الدار قطني**: خدمت حدیث کے باب میں مولانا عظیم آبادی کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے حدیث کی مشہور کتاب دارقطنی کا متن پہلی دفعہ اپنی محققانہ تعلیقات کے ساتھ شائع کیا۔ یہ متن تین قلمی نسخوں کی مدد سے مرتب کیا گیا۔ کتاب کے مقدمے میں حضرت مرتب رحمہ اللہ نے امام دارقطنی اور سنن دارقطنی کے بارے میں بہت سی علمی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ یہ کتاب پہلی دفعہ ۱۳۱۰ھ میں مطبع فاروقی دہلی سے دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس کا عکس پاکستان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ ایک اور ایڈیشن شیخ عبداللہ یمانی کی تصحیح کے ساتھ ۱۹۶۶ء میں مدینہ منورہ سے معرضِ اشاعت میں آیا۔ اس کا عکس بھی لبنان اور پاکستان میں چھپا۔

(٤)...... **رفع الالتباس عن بعض الناس**: حضرت امام بخاری رحمہ اللہ "قال بعض الناس" کے الفاظ سے حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر بعض مسائل میں جو اعتراضات کرتے ہیں، ان اعتراضات کو غلط ثابت کرنے کے لیے کسی حنفی عالم نے "بعض الناس فی دفع الوسواس" کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا۔ مولانا عظیم آبادی نے اس کے جواب میں رفع الالتباس عن بعض الناس کے نام سے ایک رسالہ تحریر فرمایا۔ یہ رسالہ صرف ۳۴ صفحات پر مشتمل ہے جو پہلی دفعہ ۱۳۱۱ھ میں مطبع فاروقی

[1] تفريظات عون المعبود، ج:٤

دہلی سے شائع ہوا۔ یہ رسالہ دوسری دفعہ ۱۹۵۸ء میں حضرت مولانا عبدالتواب ملتانی نے شائع کیا۔ تیسری دفعہ یہ رسالہ جناب محمد عزیر صاحب کی تصحیح وترتیب سے ۱۳۹۶ھ میں جامعہ سلفیہ بنارس (ہندوستان) کی طرف سے ٹائپ پر شائع کیا گیا۔ مولانا عظیم آبادی نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ذکر بے حد احترام سے کیا ہے اور ان کی فقہی خدمات کی تحسین فرمائی ہے۔

(۵)...... **اعلام اهل العصر باحكام ركعتی الفجر:** اپنے موضوع کی یہ نہایت اہم کتاب ہے جو ۶۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلی دفعہ ۱۳۰۵ھ میں مطبع انصاری (دہلی) نے شائع کی۔ دوسری دفعہ ۱۹۷۴ء میں مولانا ارشاد الحق اثری نے تخریج وحواشی کے ساتھ ادارہ علوم اثریہ (فیصل آباد) کی طرف سے شائع کیا۔ جناب محمد عزیر صاحب فرماتے ہیں کہ مولانا عظیم آبادی کے ہاتھ کا تحریر فرمودہ اس کا ایک نسخہ خدا بخش لائبریری (پٹنہ) میں موجود ہے۔ اس نسخے کے ۸۵ اوراق ہیں۔ [1]

(۶)...... **المكتوب اللطيف الى المحدث الشريف:** ۱۳۱۲ھ میں حضرت مولانا عظیم آبادی نے مکہ مکرمہ سے حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کو ایک طویل خط لکھا تھا، جس میں اجازۂ عام سے متعلق چند سوالات کیے تھے۔ اس رسالے میں حضرت میاں صاحب کا جوابی خط بھی موجود ہے جو پانچ رسالوں کے ایک مجموعے کے ساتھ ۱۳۱۴ھ میں مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوا۔ اس کا قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔

(۷)...... **القول المحقق:** یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے جو فارسی زبان میں چھ صفحات پر مشتمل ہے اور اعلام اہل العصر باحکام رکعتی الفجر کے ساتھ چھپ گیا ہے۔ مولانا نے اس میں اس سوال کا جواب تحریر فرمایا ہے کہ ''جانورانِ ماکول اللحم راخصی کردن جہت تطیب لحم جائز ست یانہ؟''

> یعنی جن جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہے، کیا ان کے گوشت کو بہتر اور عمدہ بنانے کے خیال سے انھیں خصی کرنا جائز ہے یا نہیں؟

مولانا عظیم آبادی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس مسئلے میں علمائے سلف کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک جانور ماکول اللحم ہو یا غیر ماکول اللحم اس کا خصی کرنا جائز نہیں ہے۔ بعض کے نزدیک گوشت کی عمدگی کے لیے ماکول اللحم کا خصی کرنا جائز ہے اور غیر ماکول اللحم کا جائز نہیں ہے۔ اس کے بعد کتاب وسنت سے دونوں فریقوں (مانعین ومجوزین) کے دلائل نقل کیے ہیں۔ پھر فریق اول کے دلائل کو رد کیا ہے اور فریق ثانی کو صحیح قرار دیا ہے۔ یعنی ماکول اللحم جانور کا خصی کرنا

[1] حیات المحدث شمس الحق واعمالہ، ص:۷۳

جائز ہے اور غیر ماکول اللحم کا ناجائز ہے۔ یہ بڑی عمدہ بحث ہے جو اس رسالے میں کی گئی ہے۔[1]

(۸)...... **عقود الجمان فی جواز تعلیم الکتابة للنسوان**: یہ رسالہ بھی فارسی زبان میں ہے اور پہلی دفعہ "سبل السلام شرح بلوغ المرام" کے ساتھ ۱۳۱۱ھ میں مطبع فاروقی دہلی سے شائع ہوا تھا۔ کسی نامعلوم شخص نے اس کا عربی ترجمہ کیا تھا جو شیخ محمد بن عبدالعزیز بن مانع کی تعلیقات کے ساتھ ۱۳۸۱ھ (۱۹۶۱ء) میں (مشتمل بر ۲۲ صفحات) دمشق سے شائع ہوا تھا۔ اس رسالے میں احادیث کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ عورتوں کو لکھانا پڑھانا جائز ہے۔ اصل فارسی رسالے کا ایک قلمی نسخہ ۱۳۰۷ھ کا مؤلف کے ہاتھ کا مکتوبہ خدابخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔ قلمی نسخے کے آٹھ ورق ہیں۔[2]

(۹)...... **الاقوال الصحیحه فی احکام السیکة**: یہ رسالہ ۳۲ صفحات پر محیط ہے جو ۱۲۹۷ھ میں مطبع فاروقی دہلی سے شائع ہوا۔ اس میں بچے کے عقیقے، اس کے کان میں اذان دینے اور اس کا نام رکھنے کے سلسلے میں احادیث رسول (ﷺ) اور ائمہ سلف کے اقوال کی روشنی میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ رسالہ فارسی زبان میں ہے اور اپنے موضوع کا نہایت عمدہ رسالہ ہے۔

(۱۰)...... **غنیة الالمعی**: یہ چھوٹا سا عربی رسالہ جو پندرہ صفحات پر مشتمل ہے، ۱۳۱۱ھ میں مطبع انصاری دہلی سے المعجم الصغیر للطبرانی کے ساتھ شائع ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن المکتبة السلفیه (مدینہ منورہ) سے ۱۳۸۸ھ (۱۹۶۸ء) میں چھپا۔ اس میں حدیث وفقہ سے متعلق تین مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ "**هذا الحدیث لا یصح**" اور "**لا یثبت**" دونوں لفظوں میں کیا فرق ہے؟ کیا دونوں کے ایک ہی معنے ہیں یا مختلف ہیں؟ حضرت مولانا عظیم آبادی نے اس کا تفصیل سے جواب دیا ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا **وضع الایدی علی الصدر** والی حدیث صحیح ہے؟ مولانا نے اس کا مفصل جواب دیا ہے اور اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ فوت شدہ شخص کی طرف سے جانور کی قربانی کی جاسکتی ہے اور اس کا ثواب فوت شدہ شخص کو پہنچتا ہے؟ مولانا نے جواب دیا ہے کہ قربانی کی جاسکتی ہے اور اس کا ثواب فوت شدہ شخص کو پہنچتا ہے۔ اس رسالے میں اس موضوع پر مفصل بحث کی گئی ہے جو بڑی دلچسپ ہے۔

---

[1] حیات المحدث شمس الحق واعمالہ، ص:۲۰۱، تا ۲۰۳

[2] تفصیل کے لیے دیکھیے، حیات المحدث شمس الحق واعمالہ، ص:۱۳۱ تا ۱۳۹

(۱۱)...... **التحقیقات العلی باثبات فرضیة الجمعة فی القری**: یہ رسالہ اردو میں ہے اور بڑی تقطیع کے ۲۵ صفحات پر مشتمل ہے جو ۱۳۰۹ھ میں مطبع احمدی پٹنہ سے شائع ہوا تھا۔ اس کا قلمی نسخہ حضرت مصنف کے ہاتھ کا تحریر کردہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔

اس رسالے میں حسب ذیل تین معروف سوالوں کے جواب دیے گئے ہیں۔

○...... دیہات میں جمعہ پڑھنے کی فرضیت حدیث سے ثابت ہوتی ہے یا نہیں؟

○...... کتب حنفیہ میں نمازِ جمعہ کے لیے جن شروط وقیود کا ذکر کیا گیا ہے کیا وہ احادیث صحیحہ سے ماخوذ ہیں یا نہیں؟

○...... بعض لوگ نمازِ جمعہ ادا کرنے کے بعد نمازِ ظہر بھی پڑھتے ہیں، یہ جائز ہے یا نہیں؟

پہلے سوال کا جواب مولانا عظیم آبادی نے دلائل کے ساتھ یہ دیا ہے کہ نصوص کی رو سے جمعہ پڑھنا تمام مسلمانوں پر فرض ہے، البتہ غلام، عورت، بچے اور مریض اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اس فرضیت عامہ کی رو سے دیہات اور شہر کے رہنے والوں میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اگر دیہات کے لوگ جمعہ نہیں پڑھیں گے تو وہ اس وعید میں شامل ہوں گے جو تارک جمعہ کے لیے احادیث صحیحہ میں وارد ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ احادیث مرفوعہ میں نمازِ جمعہ کے لیے وہ شروط وقیود کہیں مذکور نہیں ہیں جن کا کتب حنفیہ میں ذکر کیا جاتا ہے۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ نمازِ جمعہ اپنی جگہ فرض عین ہے، جس سے نماز ظہر کی فرضیت ساقط ہوجاتی ہے۔ نمازِ جمعہ کے بعد بہ صورتِ احتیاط نماز ظہر نہیں پڑھنی چاہیے۔

مولانا عظیم آبادی نے تینوں سوالوں کے جواب تفصیل سے دیے ہیں۔

(۱۲)...... **تعلیقات علی اسعاف المبطا برجال الموطا**: علامہ سیوطی کی کتاب ''اسعاف المبطا'' پر مولانا ممدوح کی یہ مختصر مگر مفید تعلیق ہے جو بڑے سائز کے ۵۰ صفحات پر محتوی ہے۔ یہ رسالہ ۱۳۲۰ھ میں مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعض مقامات پر سیوطی کی ان غلطیوں کی نشان دہی بھی کی گئی ہے جو انھوں نے رواۃ کے ناموں، کنیتوں اور القابات کے سلسلے میں کی ہیں، اور صحیح بات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

(۱۳)...... **الکلام المبین فی الجھر بالتامین والرد علی القول المتین**: یہ رسالہ اردو میں مولوی محمد علی صاحب مرزا پوری کے رسالے ''القول المتین فی اخفاء التامین'' کے جواب میں لکھا تھا۔ مولانا عظیم آبادی کا یہ رسالہ ۱۳۰۳ھ میں مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوا تھا جو ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں آمین بالجہر کا مسئلہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

(۱٤)...... **ھدایة النجدین الی حکم المعانقة والمصافحة بعد العیدین**: یہ ایک اردو

رسالہ ہے جو ۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ رسالہ اس استفتا کا جواب ہے کہ نماز عیدین کے بعد معانقہ ومصافحہ جائز ہے یا نہیں؟ اسے ایک بزرگ ولی اللہ خاں نے مطبع احسن المطابع گوبند عطار (پٹنہ) سے شائع کیا تھا۔ مولانا عظیم آبادی نے اس مسئلے پر طویل بحث کے بعد لکھا ہے کہ معانقہ ومصافحہ کا یہ سلسلہ قرن ثالث تک بالکل نہیں تھا۔ اس کے بعد جاری ہوا ہے۔ اگرچہ یہ طویل مدت سے چلا آرہا ہے، لیکن بدعت ہے۔ حضرت مولانا کا یہ ایک علمی اور محققانہ رسالہ ہے۔ جناب محمد عزیز صاحب نے ''حیات المحدث شمس الحق واعمالہ'' میں اس کا عربی ترجمہ شائع کردیا ہے جو کتاب کے صفحہ ۲۲۰ سے شروع ہوکر صفحہ ۲۲۷ تک چلا گیا ہے۔

(۱۵)...... **فتویٰ ردّ تعزیہ داری:** یہ بھی اردو میں ہے جو کسی زمانے میں مطبع سعید المطابع (بنارس) سے شائع ہوا تھا۔

یہ حضرت مولانا شمس الحق عظیم آبادی کی مطبوعہ کتابیں تھیں۔ اب ذیل میں بہ ترتیب نمبر شمار ان کی چند غیر مطبوعہ کتابوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(۱۶)...... **تنقیح المسائل:** یہ مولانا کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے، جنھیں وہ اپنی زندگی میں مرتب نہ فرما سکے۔ یہ عربی، اردو اور فارسی زبانوں میں ہیں اور ان کے دو مجموعے خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہیں۔

(۱۷)...... **الرسالہ فی الفقہ:** اس کا تعلق بھی شاید فتاویٰ ہی سے ہو۔ اس کا قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری میں موجود ہے جو ۱۳۱۱ھ کا مولانا کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

(۱۸)...... **ہدایۃ اللوذعی بنکات الترمذی:** اس کا ایک ناقص قلمی نسخہ مشتمل بربارہ صفحات خدا بخش لائبریری میں موجود ہے۔

(۱۹)...... **الوجازہ فی الاجازہ:** اس کتاب میں مولانا عظیم آبادی نے حدیث کی تمام کتابوں کے مؤلفین تک اپنی سندیں جمع کردی ہیں۔ شروع میں اپنے ان گیارہ اساتذہ کا ذکر فرمایا ہے جن سے انھوں نے علم حدیث کے متعلق استفادہ کیا۔ اس فہرست میں تین ہندوستانی ہیں اور وہ ہیں مولانا بشیر الدین قنوجی، حضرت سید میاں نذیر حسین دہلوی، شیخ حسین بن محسن یمانی انصاری اور آٹھ عرب اساتذہ ہیں، جن سے حجاز میں سند حدیث حاصل کی۔ ان میں سے ہر استاذ نے مولانا عظیم آبادی کو اپنے تمام سلسلہ ہائے سند سے روایت کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔

اس کتاب کے دو قلمی نسخے خدا بخش لائبریری میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک نسخہ حضرت مؤلف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

(۲۰)...... **فضل الباری شرح ثلاثیات البخاری:** اس کتاب کے بارے میں حضرت مولانا

عبیداللہ رحمانی مبارک پوری تحریر فرماتے ہیں: ''افسوس ہے کہ علامہ اس شرح کو اپنی زندگی میں مکمل نہ کر سکے۔'' [1]

(۲۱)...... **النجم الوهاج في شرح مقدمة الصحيح لمسلم بن الحجاج:** جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، یہ مقدمہ امام مسلم کی مبسوط شرح ہے۔ [2]

(۲۲)...... **تعليقات على سنن النسائي:** اس میں سنن نسائی کے بعض مشکل مقامات کو حل کیا گیا ہے۔ مولانا عبدالسلام مبارک پوری فرماتے ہیں۔ علامہ ابوالطیب نے ان مقامات کو حل کیا ہے، اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔ [3]

(۲۳)...... **نخبة التواريخ:** یہ قلمی کتاب فارسی زبان میں ہے۔ اس میں بزبانِ فارسی قدیم وجدید علما کے حالات مرقوم ہیں۔ اس کا ایک اقتباس جو دس سطروں پر مشتمل ہے، حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے سوانح نگار مولانا فضل حسین بہاری نے اپنی کتاب ''الحیاۃ بعد الممات'' میں نقل کیا ہے۔ یہ دس سطری اقتباس حضرت میاں صاحب کے بارے میں ہے۔ [4]

(۲٤)...... **تذكرة النبلاء في تراجم العلماء:** یہ کتاب بھی فارسی میں ہے اور علما وزعما کے حالات پر مشتمل ہے۔ حضرت مصنف کے اس قلمی نسخے سے متعدد اصحابِ علم نے استفادہ کیا۔ مثلاً مولانا سید عبدالحی حسنی نے نزہۃ الخواطر کی تصنیف کا آغاز کیا تو حضرت مولانا عظیم آبادی نے ان کو یہ نسخہ بھیج دیا اور انھوں نے اس کے حوالے سے جن بزرگانِ دین کا تذکرہ کیا، جناب محمد عزیر صاحب کے نزدیک ان کی تعداد تیس تک پہنچتی ہے۔ نزہۃ الخواطر کی ساتویں اور آٹھویں جلد میں بالخصوص اس کتاب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھنوی نے ''بناء الخلان'' لکھنا شروع کی تو انھوں نے مولانا عظیم آبادی سے تراجم علمائے صوبہ بہار وغیرہ طلب کیے اور ان کی طلب پر مولانا نے اپنے مسودے کے بعض اجزا ان کو بھیج دیے، مگر پھر کئی دفعہ طلب کرنے کے باوجود وہ اجزاء مولانا عبدالحی فرنگی محلی واپس نہ کر سکے۔ اسی اثنا میں مولانا عبدالحی وفات پا گئے، ان کی وفات کے بعد مولوی خادم حسین نے بمشکل چند اجزا واپس کیے۔ پھر اور لوگوں نے بھی اس نسخے کے بعض اجزا ان سے طلب کیے اور استفادہ کر کے واپس بھیج دیے۔

---

[1] سیرۃ البخاری (شائع کردہ اہل حدیث اکیڈمی، لاہور) صفحہ ۲۶۱۔ حاشیہ نمبر 1

[2] تفصیل کے لیے دیکھیے، حیات المحدث شمس الحق واعمالہ، ص: ۲۰۷ تا ۲۱۲

[3] سیرۃ البخاری (اہل حدیث اکیڈمی لاہور۔ ستمبر ۱۹۶۸ء) صفحہ ۴۶۹۔ حاشیہ نمبر 1

[4] الحیات بعد الممات، ص: ۲۷۳، ۲۷۴

اس فقیر نے اپنی کتاب فقہائے ہند میں (جو دس جلدوں پر مشتمل ہے) نزہۃ الخواطرؒ کے حوالے سے تذکرۃ النبلا فی تراجم العلماء میں مرقوم متعدد حضرات کے حالات بیان کیے ہیں۔ یہ نہایت اہم کتاب ہے۔ اس سے مولانا محمد ادریس نگرامی نے بھی ''تذکرہ علمائے حال'' کی تصنیف کے وقت استفادہ کیا ہے۔

(۲۵)...... **نہایۃ الرسوخ فی معجم الشیوخ**: یہ کتاب عربی میں تھی۔ اس میں مولانا عظیم آبادی نے اپنے اساتذہ اور ان شیوخ کے حالات بیان کیے ہیں جو ان کے سلسلۂ اسناد میں آئے۔ عون المعبود جلد اوّل کے مقدمہ (صفحہ ۳ اور ۴) میں گیارہ شیوخ کے مختصر حالات اسی کتاب سے نقل کیے گئے ہیں اور وہ گیارہ شیوخ مندرجہ ذیل ہیں:

① ...... میاں سید نذیر حسین دہلوی (وفات ۱۳۲۰ھ)
② ...... حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی (وفات ۱۲۶۲ھ)
③ ...... شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (وفات ۱۲۳۹ھ)
④ ...... شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (وفات ۱۱۷۶ھ)
⑤ ...... شیخ ابراہیم کردی کورانی (وفات ۱۱۰۱ھ)
⑥ ...... علامہ عبدالرحمٰن بن سلیمان اہدل (وفات ۱۱۵۰ھ)
⑦ ...... شیخ محمد بن سند (وفات ۱۱۸۰ھ)
⑧ ...... شیخ محمد عابد سندھی (وفات ۱۱۵۷ھ)
⑨ ...... شیخ صالح بن محمد الفلانی (وفات ۱۲۱۸ھ)
⑩ ...... شیخ عبدالرحمٰن کنزیری (وفات ۱۱۷۲ھ)
⑪ ...... شیخ عبداللطیف البیرونی

یہ کتاب بھی طبع نہیں ہوئی اور کسی لائبریری میں بھی اس کا سراغ نہیں ملا۔ معلوم ہوتا ہے جس طرح حضرت مؤلف کے بہت سے مسودے ضائع ہوگئے، اسی طرح یہ مسودہ بھی ضائع ہوگیا۔

(۲۶)...... **النور اللامع فی اخبار صلاۃ الجمعۃ عن النبی الشافع**: اس کتاب میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، فرضیت جمعہ کے متعلق احادیث جمع کردی گئی ہیں۔ یہ کتاب عربی زبان میں تھی۔ یہ کتاب نہ شائع ہوئی اور نہ کسی لائبریری میں اس کا کوئی نسخہ پایا جاتا ہے۔ یہ کتاب نامکمل رہی۔ [1]

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج:۸، ص:۱۸۰

(۲۷)...... **تحفة المجتهدين الابرار فی اخبار صلاة الوتر وقيام رمضان عن النبی المختار:** مولانا عظیم آبادی نے اس کتاب میں وتر اور قیام رمضان کے سلسلے کی احادیث جمع فرما دی تھیں اور ان پر محققانہ اسلوب میں گفتگو کی تھی۔ لیکن یہ کتاب کہیں موجود نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بھی عربی میں تھی اور حضرت مصنف اسے مکمل نہیں کر پائے تھے۔ ❶

(۲۸)...... **تفريح المتذكرين بذكر كتب المتاخرين:** یہ کتاب فارسی میں تھی، لیکن نامکمل رہی۔ اس میں غالباً ان کتابوں کا تذکرہ مقصود تھا جو آخری دور یعنی تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری کے علماے ہند نے تصنیف کیں۔ اس کا بھی کوئی نسخہ کہیں نہیں ملتا۔

مولانا ابویحییٰ امام خاں نوشہروی نے لکھا ہے کہ یہ کتاب عربی میں ہے۔ ❷ لیکن محمد عزیر صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا ابویحییٰ امام خان نوشہروی کو سہو ہوگیا ہے۔ یہ کتاب عربی میں نہیں فارسی میں تھی۔ ❸

(۲۹)...... **غاية البيان فی حكم استعمال العنبر والزعفران:** مولانا عظیم آبادی نے یہ کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا، معلوم نہیں اس ارادے کو عملی جامہ پہنا سکے یا نہیں، البتہ اس سے متعلق تفصیلی بحث عون المعبود میں موجود ہے، جس سے ان کے نظریات کا پتا چل سکتا ہے۔ ❹

(۳۰)...... **سوانح عمری مولانا عبدالله جهاؤ میاں الله آبادی:** اس کا تذکرہ مولوی ابوضیا محمد قمر الدین الٰہ آبادی نے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مولانا عظیم آبادی نے جھاؤ میاں صاحب کے حالات جمع کیے تھے، لیکن نامکمل ہونے کی وجہ سے شائع نہ ہوسکے۔ ❺

یہ حالات الگ صورت میں تو محفوظ نہ رہ سکے، لیکن سید عبدالحی حسنی نے تذکرۃ النبلا کے حوالے سے نزہۃ الخواطر میں مولانا عبد اللہ جھاؤں صاحب کے حالات بیان کیے ہیں۔ ❻ اس کا مطلب یہ ہے کہ جھاؤں میاں صاحب کے حالات مولانا عظیم آبادی نے تذکرۃ النبلا میں تحریر فرمائے ہیں۔

مندرجہ بالا تصانیف کے علاوہ حدیث کی مختلف کتابوں کے مختلف مقامات پر کہیں مختصر اور کہیں

---

❶ ایضاً
❷ ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات، ص:۷۷ (ناشر مکتبہ نذیریہ چیچہ وطنی۔ ۱۹۷۰ء)
❸ مولانا شمس الحق عظیم آبادی، ص:۸۹ بحوالہ یادگار گوہری، ص:۱۱۰
❹ مولانا شمس الحق عظیم آبادی، ص:۹۰
❺ ایضاً، ص:۹۰
❻ ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر، ج:۷، ص:۳۰۴ تا ۳۰۶

قدرے تفصیل سے مولانا عظیم آبادی نے حواشی وتعلیقات سپرد قلم فرمائے۔ یہ حواشی وتعلیقات ''مجموعہ تسویدات'' کے عنوان سے خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہیں۔

مولانا ابویحییٰ امام خاں نوشہروی نے تین اور کتابیں مولانا عظیم آبادی کی طرف منسوب کی ہیں اور وہ ہیں: ① فتویٰ فوٹو گرافی، ② مسائل متین اور ③ فیض ابتدائی۔ [1] یہاں بھی مولانا ابویحییٰ نوشہروی سے سہو ہوا ہے۔ ان تینوں کتابوں کے مصنف مولانا عظیم آبادی نہیں ہیں بلکہ مولانا ابوطاہر بہاری ہیں۔ [2]

اسی طرح خدا بخش لائبریری کی فہرست ''مفتاح الکنوز'' میں ''فہرس المجلد الاوّل من مسند ابی عوانہ'' کا مؤلف مولانا عظیم آبادی کو بتایا گیا ہے، یہ بھی صحیح نہیں۔ [3]

مولانا عظیم آبادی کے مکتوبات

اب مولانا عظیم آبادی کے مکتوبات ملاحظہ فرمائیے۔ یہ نو مکتوبات ہیں جو جناب محمد عزیر صاحب نے اپنی کتاب ''مولانا شمس الحق عظیم آبادی'' میں درج کیے ہیں۔ ضروری وضاحتوں کے ساتھ یہ مکتوبات کتاب کے صفحہ ۹۶ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۲۲ تک چلے گئے ہیں۔ بہت سی معلومات ان مکتوبات میں آگئی ہیں۔ پہلے چار مکتوب نزہۃ الخواطر کے مصنف مولانا سید عبدالحی حسنی (متوفی ۱۳۴۱ھ) کے نام ہیں۔ یہ چاروں مکتوبات عزیر صاحب نے رائے بریلی جا کر سید عبدالحی حسنی کے صاحب زادۂ گرامی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کے البم سے نقل کیے ہیں۔

دو مکتوب مولانا ابومحمد عبداللہ چھپراوی (متوفی ۱۳۴۸ھ) کے نام ہیں جن میں مولانا عظیم آبادی نے مولانا چھپراوی کی تصنیف ''رفع الغواشی عن وجوہ الترجمۃ والحواشی'' پر تبصرہ فرمایا ہے۔ یہ کتاب اردو میں ہے اور دو جلدوں میں ہے۔ اس میں ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے ترجمہ قرآن کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ مولانا ابومحمد عبداللہ چھپراوی کی ایک اور کتاب ''البیان لتراجم القرآن'' ہے۔ اس کتاب میں چند دوسرے اردو اور انگریزی تراجم قرآن کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مولانا چھپراوی کے نام مولانا عظیم آبادی کے یہ دونوں مکتوب ان کی کتاب ''البیان لتراجم القرآن'' مطبوعہ کلکتہ (۱۳۴۶ھ) سے نقل کیے گئے ہیں۔ مولانا ممدوح نے یکم رمضان المبارک ۱۳۴۱ھ (۱۸۔ اپریل ۱۹۲۳ء) کو وفات پائی۔

---

[1] ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات، ص:۵۸۔ شائع کردہ مکتبہ نذیریہ، چیچہ وطنی۔ ۱۹۷۰ء

[2] مولانا شمس الحق عظیم آبادی، ص:۹۳

[3] مولانا شمس الحق عظیم آبادی، ص:۹۳

ایک مکتوب مولانا عبدالحق ملتانی (متوفی ۱۳۶۵ھ) کے نام ہے۔ یہ مکتوب اخبار ''الاعتصام'' مؤرخہ ۲۰۔ نومبر ۱۹۷۰ء سے نقل کیا گیا ہے۔

ایک خط مولانا ثناء اللہ امرتسری کے نام ہے جو ۲۱۔ مارچ ۱۹۱۱ء کے اخبار ''اہل حدیث'' (امرتسر) سے نقل کیا گیا ہے۔ غالباً مولانا عظیم آبادی کا کسی شخص کے نام یہ آخری خط ہے۔ اس سے چند روز بعد مولانا وفات پا گئے۔

ایک خط عربی میں ہے جو فاس (مراکش) کے ایک اہل علم شیخ عبدالحفیظ بن محمد طاہر کے نام ہے۔ اس میں مولانا عظیم آبادی کا ایک عربی قصیدہ بھی شامل ہے۔ یہ خط ۲۶۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۷ھ (۱۵۔ جون ۱۹۰۹ء) کا مرقومہ ہے۔

یہ فقیر یہاں مولانا عظیم آبادی کے دو مکتوب درج کرنا چاہتا ہے۔ ایک مکتوب سید عبدالحی حسنی کے نام جو انھوں نے ۱۶۔ ربیع الثانی ۱۳۲۷ھ (۷۔ مئی ۱۹۰۹ء) کو ارسال فرمایا۔ اس مکتوب سے پتا چلے گا کہ مولانا عظیم آبادی اہل علم سے کس قدر منکسرانہ انداز میں مخاطب ہوتے ہیں اور ان کا کتنا احترام کرتے ہیں۔ پھر اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ اہل علم کی کتنی علمی مدد فرماتے ہیں۔ اس خط میں فاضل مرتب (محمد عزیر صاحب) کی توضیحات شامل نہیں ہے۔ دوسرا خط وہ درج کرنا چاہتا ہوں جو انھوں نے مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم کے نام تحریر فرمایا...... پہلے ذیل میں سید عبدالحی حسنی کے نام خط کا مطالعہ فرمائیے۔

بگرامی خدمت ذی درجت مخدومی ومکرمی جامع الفضائل السید السند مولوی عبدالحی دامت مجدکم۔

بعد سلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ورضوانہ واضح سامی شریف باد۔ محبت نامہ آپ کا پا کر ممنون ومشکور ہوئے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ خیرا

للہ الحمد والمنۃ کہ آپ نے تذکرہ علمائے ہند لکھنا شروع کیا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو انجام کو پہنچا دے۔ [1] ہم کو جس قدر تذکرہ علمائے ہند کے لکھنے کا شوق تھا، وہ ہے، اس کو بیان نہیں کر سکتے ہیں۔ جس زمانے میں مولوی عبدالحی صاحب مرحوم لکھنوی نے ''ابناء الخلان'' لکھنا شروع کیا تھا اسی زمانے میں ہم نے بھی لکھنا شروع کیا تھا، مگر میری تاریخ ہنوز ناتمام ہی نہیں بلکہ اجزا اس کے متفرق وغائب ہوگئے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ مولوی عبدالحی صاحب رحمہ اللہ نے ہم سے تراجم علمائے صوبہ بہار وغیرہ طلب کیا۔ ہم نے بعض اجزا ان کے پاس روانہ کردیے، مگر باوجود چند بار طلب کرنے کے

[1] ''تذکرہ علمائے ہند'' سے مراد نزہۃ الخواطر ہے جو مولانا سید عبدالحی حسنی نے عربی میں آٹھ جلدوں میں مکمل کی۔ آٹھویں جلد میں سید عبدالحی حسنی کے فرزند گرامی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مرحوم نے بہت سے اضافے کیے ہیں۔

وفات تک ان کی، میرے اجزا واپس نہیں آئے۔ پھر بعد وفات ان کی، مولوی خادم حسین صاحب نے بمشکل کچھ اجزا روانہ کیے۔

اس کے بعد ایک مولوی صاحب جو داناپور میں رہتے ہیں، ❶ انھوں نے ایک تذکرہ علمائے ہند لکھنا شروع کیا، اور پندرہ بیس جزء میں کتاب کو تمام کر کے امرتسر وکیل اخبار کے یہاں طبع کے لیے بھیجا۔ مگر ابھی تک طبع نہیں ہوئی ہے۔

پھر مولوی محمد صاحب شاہ جہان پوری مرحوم ومغفور نے ایک تذکرہ لکھنا شروع کیا اور قریب دو تین سو تراجم کے انھوں نے جمع بھی کیا۔ مگر نوبت اتمامِ کتاب نہ پہنچی اور انھوں نے وفات کیا۔

اس لیے افسوس کہ میری کتاب پوری کیا ہوگی، اجزا بھی اس کے منتشر وضائع ہوئے۔ اب آپ نے اس کا قصد فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ پورا کرے۔ میرے پاس بعض تراجم بطور مسودہ چھٹہ کے موجود ہیں، ان سب کو ہم جمع کر کے بذریعہ پولندہ روانہ کریں گے۔ آپ از راہِ مہربانی دو یک ماہ میں ان مسودات میں سے جس قدر مضمون مناسب معلوم فرماویں انتخاب کرلیں اور پھر مسودہ کو ضرور واپس فرما دیں۔ ❷ اور ہم شاہجہان پور سے بھی مسودہ سب واپس طلب کرتے ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

صاحب ''دراسات اللبیب'' کا ترجمہ بھی ہم نے تاریخ فارسی کشمیر سے نقل کیا ہے۔ ❸ ان کی تاریخ وفات اس مصرع سے ہے:

''قطرۂ دُر ببحر واصل شد''

---

❶ ان سے مولانا ابوالحسنات عبدالغفور داناپوری (متوفی ۱۳۳۳ھ) مراد ہیں جو اپنے عہد کے مشہور اہل حدیث عالم تھے۔ انھوں نے ''تاریخ محدثین ہند'' اور ''تاریخ علمائے صوبہ بہار'' دو کتابیں لکھنا شروع کی تھیں اور دونوں کی فہرستوں کا کچھ حصہ بھی سید عبدالحی حسنی کے نام روانہ کیا تھا، لیکن حیرت ہے کہ اس کے باوجود سید عبدالحی حسنی نزہۃ الخواطر جلد ۸ صفحہ ۲۷۱، ۲۷۲ میں جہاں ان کے حالات مرقوم ہیں، اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتے۔ ان کی تاریخ وفات بھی وہاں مذکور نہیں۔ (مولانا شمس الحق عظیم آبادی، ص: ۹۸۔ حاشیہ نمبر ۳)

❷ جناب محمد عزیر صاحب کے بقول سید عبدالحی حسنی نے مولانا عظیم آبادی کو مسودہ واپس نہیں بھیجا اور سب کچھ ضائع ہو گیا۔ (مولانا شمس الحق عظیم آبادی، ص: ۹۹۔ حاشیہ نمبر ۳)

❸ اس سے سندھ کے مشہور عالم ومصنف مولانا محمد معین ٹھٹھوی مراد ہیں۔ ان کی تصنیف ''دراسات اللبیب'' عربی میں ہے جو تقلید شخصی کے رد میں ہے۔ وہ اکیس کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں سے سترہ عربی میں ہیں اور چار فارسی میں۔ ان کی ایک کتاب کا نام ''اثبات رفع الیدین فی الصلوٰۃ'' فارسی میں ہے۔ وہ فارسی اور اردو کے شاعر بھی تھے۔ فارسی میں تسلیم اور اردو میں بیراگی تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے ۱۱۶۱ھ میں ٹھٹھہ (سندھ) میں وفات پائی۔ میں نے ان کے حالات اپنی کتاب فقہائے ہند کی پانچویں جلد کے حصہ دوم (یعنی چھٹی جلد) میں لکھے ہیں۔ (دیکھیے صفحہ ۲۳۲ تا ۲۴۱)

میرا ترجمہ میرے ایک عزیز نے ''یادگارِ گوہری'' میں لکھا ہے۔ وہ کتاب بھی آپ کے پاس بھیج دیں گے۔ ہم بقدر امکان آپ کی اس تاریخ میں پوری مدد کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ❶

آپ کوشش فرمایئے کہ اجزاء ''ابناء الخلان'' مؤلفہ مولوی عبدالحی صاحب مرحوم آپ کو ان کے ورثا سے مل جائے اور مولوی نعیم صاحب مرحوم لکھنوی بھی ایک تاریخ جمع کرتے تھے۔ اس کے اجزا کو ان کے ورثا سے حاصل فرمایئے اور جتنے لوگوں نے مختصر رسائل جیسے مولوی ادریس صاحب نگرامی وغیرہ نے تاریخ میں لکھے ہیں سب کو جمع فرمایئے، کچھ نہ کچھ مدد ضرور ملے گی۔

آپ کا نام دفتر ندوہ میں تو برابر دیکھتے تھے۔ اب آپ کا پورا حال معلوم ہوا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ کچھ کتابیں آپ کے پاس پہنچیں گی۔ فقط

۱۶۔ ربیع الثانی (۱۳۲۷ھ)

محمد شمس الحق عفی عنہ

ایک خط مولانا عظیم آبادی نے ۶۔ ربیع الاوّل ۱۳۲۸ھ (۶۔ مارچ ۱۹۱۰ء) کو سید عبدالحی حسنی کے نام تحریر فرمایا۔ اس میں انھیں بعض مفید مشورے دیے گئے ہیں۔ مثلاً لکھا ہے کہ حضرت مولانا عبداللہ غزنوی کے حالات ضرور لکھنے چاہئیں۔ ❷ مولانا عظیم آبادی نے ان کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ وہ ملا حبیب اللہ قندھاری کے شاگرد تھے۔ ❸

شیخ محمد حیات سندھی کے حالات لکھنے کی بھی تاکید فرمائی ہے۔ شیخ محمد حیات سندھی کی تاریخ

---

❶ مولانا عظیم آبادی کے نانا مولانا گوہری علی صدیقی تھے جو پٹنہ کے محلّہ رمنہ اور موضع ڈیانواں کے رئیس تھے۔ ۱۲۱۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۸ھ (۱۵۔ نومبر ۱۸۶۱ء) کو وفات پائی۔ ان کے حالات میں مولانا عظیم آبادی کے ماموں زاد بھائی مولانا محمد زبیر ڈیانوی نے ''یادگار گوہری'' کے نام سے کتاب تصنیف کی تھی، جسے اس خاندان کے حالات سے متعلق ایک مستند ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کتاب میں خود مولانا عظیم آبادی کے بارے میں بھی بہت کچھ مرقوم ہے۔ مولانا عظیم آبادی کی وفات سے صرف تین مہینے بعد (۱۳۲۹ھ) میں مولانا محمد زبیر ڈیانوی وفات پا گئے تھے۔

❷ حضرت عبداللہ غزنوی ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۱ء) کو قلعہ بہادر خیل (ضلع غزنی، افغانستان) میں پیدا ہوئے اور ۱۵۔ ربیع الاوّل ۱۲۹۸ھ (۱۵۔ فروری ۱۸۸۱ء) کو امرتسر میں فوت ہوئے۔ میں نے فقہائے ہند کی جلد ۹ میں ان کے تفصیلی حالات لکھے ہیں۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴۷ تا ۲۱۹) فقہائے ہند کی یہ جلد دارالعلوم تقویۃ الاسلام (مدرسہ غزنویہ) لاہور کے نصاب میں بھی شامل رہی۔

❸ ملا حبیب اللہ کا کڑ قندھاری کے حالات میں نے اپنے زمانۂ ادارت میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے ترجمان ماہنامہ ''المعارف'' بابت ماہ فروری ۱۹۸۴ء میں افغانستان کے ایک فارسی مجلّے ''سائنس'' سے اردو ترجمہ کرا کے شائع کیے تھے۔ ملا ممدوح ۱۲۱۳ھ میں پیدا اور رمضان المبارک ۱۲۶۵ھ (اگست ۱۸۴۹ء) میں فوت ہوئے۔ (ملاحظہ ہو المعارف تاریخ مذکور صفحہ ۳ تا ۲۲)

ولادت اور ان کے ابتدائی حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ البتہ ان کی تاریخ وفات ۲۶۔ صفر ۱۱۶۳ھ (۲۴۔ جنوری ۱۷۵۰ء) ہے۔ ان کے مفصل حالات میں نے فقہاے ہند جلد پنجم حصہ دوم (چھٹی جلد) میں لکھے ہیں۔ [1]

اسی طرح مولانا ممدوح نے سید عبدالحی حسنی کو شیخ ابوالحسن سندھی کا ترجمہ لکھنے کا مشورہ بھی دیا ہے۔ ان کا ترجمہ میں نے بھی اپنی کتاب فقہاے ہند میں تحریر کیا ہے۔ [2]

اب مولانا عظیم آبادی کا ایک اور مکتوبِ گرامی ملاحظہ کیجیے جو انھوں نے مولانا ثناء اللہ امرتسری کے نام تحریر فرمایا۔ مولانا امرتسری کے بقول مولانا عظیم آبادی کے ہاتھ کا تحریر فرمودہ غالباً یہ آخری خط ہے۔ اس کا تعلق آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے مالی معاملات اور ڈیانواں میں پھیلے ہوئے شدید مرضِ طاعون سے ہے۔ یہ خط عزیر صاحب نے اپنی کتاب میں ۳۱۔ مارچ ۱۹۱۱ء کے ہفت روزہ ''اہل حدیث'' (امرتسر) سے نقل کیا ہے جو بے حد دردناک خط ہے۔

از عاجز فقیر محمد شمس الحق عفی عنہ

بخدمت شریف جامع الفضائل مجی مکرمی مولوی ثناء اللہ صاحب دامت محبتکم

بعد سلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

محبت نامہ کارڈ ڈیانواں آ کر وصول پایا اور یوم دوم رجسٹری بھی دہلی چاندنی چوک کوٹھی حاجی علی جان مرحوم، مولوی حافظ عبدالغفار صاحب کے پاس روانہ کردیا، اور تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہم عرصہ سے علیل ہیں اور ضعف غالب ہوا جاتا ہے اور غذا بہت کم۔ اس لیے بنظر تبدیل آب وہوا کے ڈیانواں سے مع سامانِ سفر کے روانہ ہوئے اور پہلے جبل راجگیر پر اقامت چاہتے تھے۔ پھر بعد یک ماہ کے سفر دہلی وغیرہ کرتے۔ اسی خیال سے اپنے طالب العلم سب کو بھی رخصت کردیا اور سب کام کو بند کر کے روانہ ہوئے۔ حاجی زکریا خاں صاحب کا اصرار تھا کہ ملک متوسط کی طرف روانہ ہوں، اور انھوں نے کوئی دقیقہ اصرار کا اٹھا نہیں رکھا۔ مگر چوں کہ خیال جبل راجگیر کا تھا، اس لیے ملک متوسط کی طرف نہیں گئے اور راجگیر کی طرف روانہ ہوئے۔ مگر عرصہ ایک سال سے اطراف پٹنہ وبہار میں سخت طاعون ہے اور بہت لوگ نقصان ہوئے۔ بعد روانگی میرے معلوم ہوا کہ ڈیانواں میں بھی طاعون آ گیا اور بہت زور ہے، مجبور نہایت حیرانی وپریشانی کی حالت میں واپس آئے اور اللہ اللہ علامت ''یوم یفر المرء من اخیہ'' کی پایا۔ ایسا چھوٹا قریہ اور یہ حالت۔ اللہ تعالیٰ رحم فرماوے

---

[1] دیکھیے صفحہ ۱۳۷ تا ۱۸۰

[2] ملاحظہ ہو فقہاے ہند جلد ششم، ص:۸۶، ۸۷

اور امن عطا کرے۔ میرے سارے خدام بیمار اور بعض بعض بخوف دوسری جگہوں میں چلے گئے۔ عجیب حالت نازک ہے، اللہ تعالیٰ رحم فرماوے۔ میرے مختار و منشی اور جو لوگ کام دفتر کا کرنے والے ہیں، سب کے سب چپکے سے روانہ ہو گئے۔ یہ قریہ گویا اس وقت خالی ہے۔ ہم اس وقت یہ خط لکھتے ہیں اور طبیعت بالکل حاضر نہیں ہے۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ کوٹھی حاجی علی جان مرحوم کو امین کانفرنس قرار دیا۔ اس سے کانفرنس کو ان شاء اللہ تعالیٰ فائدہ معتد بہا پہنچے گا، کیوں کہ دیانت اور راست بازی میں یہ کوٹھی ضرب المثل ہے۔ کتابِ حساب و کتاب کانفرنس اور تحویل اس کی ایک صندوق میں محفوظ ہے، اور منشی جی میری کنجی لے کر کہیں ٹل گئے ہیں۔ جب انتشار کم ہو اور منشی جی واپس آویں تب ہم باقی تحویل اور کتابِ کانفرنس جو صندوق کے اندر ہے، دہلی روانہ کر دیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس وقت جس قدر تحویل باہر دوسری جگہ رکھی تھی یعنی نو سو (۹۰۰) روپے، اس کو ہم نے بذریعہ نوٹ کے روانہ کر دیا، آدھا اس کا روانہ ہوا ہے اور آدھا اس کے بعد آنے رسید کے روانہ ہوگا۔ آپ اطمینان رکھیں۔ یہ سب کیفیت ہم نے مکرمی مولوی عبدالغفار صاحب کو بھی لکھ دیا ہے۔ اللہ اللہ ہر دن دو تین موت ہوتی ہے۔ سارے لوگ جھونپڑی میں بدحواس ہیں۔ اشخاص چند اندر مکان کے بستی میں ہیں۔

یہ قریہ صغیرہ، حکم میں قریہ کبیرہ کے ہے۔ چوں کہ ساری اشیا مایحتاج الیھا ہر وقت ملتی ہیں۔ مگر آج کل چوں کہ سارے لوگ بھاگے ہوئے ہیں، ایک پیسہ کی چینی بھی نہیں ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ رحم فرماوے۔

زیادہ والسلام مع الشوق

۱۲۔ ربیع الاوّل۔ بروز سہ شنبہ

محمد شمس الحق عفی عنہ۔ از ڈیانواں، ضلع پٹنہ

وفات

اب مولانا عظیم آبادی کی وفات کے متعلق سنیے جو مسلمانانِ ہند کے لیے بالعموم اور جماعت اہلِ حدیث کے لیے بالخصوص نہایت الم ناک حادثہ تھا۔ ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۱ء میں طاعون کی وبا یوں تو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی، لیکن صوبہ بہار کا ضلع پٹنہ جو مولانا عظیم آبادی کا وطن تھا، خاص طور سے اس کی لپیٹ میں تھا۔ اوپر مولانا ثناء اللہ امرتسری کے نام ان کا خط ہم نے پڑھا۔ یہ خط انھوں نے ۱۲۔ ربیع الاوّل کو لکھا تھا۔ اس سے دوسرے دن ۱۳۔ ربیع الاوّل کو خود ان پر طاعون کا حملہ ہوا، وہ چھ دن اس موذی مرض میں مبتلا رہے۔ ۱۹۔ ربیع الاوّل ۱۳۲۹ھ (۲۰۔ مارچ ۱۹۱۱ء) کو بروز سوموار صبح

۶ بجے ان کا انتقال ہوگیا۔ انھوں نے صرف ۵۶ برس عمر پائی۔ نظم ونثر میں بہت سے اصحابِ علم نے ان کی موت پر اظہار حزن وملال کیا۔ مولانا ابوالقاسم بناری نے ان کی وفات پر بالکل صحیح کہا کہ ''جس وقت دنیا کا آفتاب طلوع ہوا، اسی وقت دین کا آفتاب (شمس الحق) غروب ہوا۔''

اللھم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه.

اولاد

مولانا عظیم آبادی کی اولاد چھ لڑکیاں اور تین لڑکے تھے۔ لڑکوں کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

① ...... محمد شعیب: یہ بچہ پانچ ماہ کی عمر میں ۱۷۔ رجب ۱۲۹۷ھ (۲۶۔ جولائی ۱۸۸۰ء) کو انتقال کر گیا تھا۔

② ...... حکیم محمد ادریس: یہ ۱۶۔ رجب ۱۲۹۸ھ (۱۴۔ جون ۱۸۸۱ء) کو پیدا ہوئے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد علم طب پڑھا اور اپنے علاقے کے ایک بڑے طبیب کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ان کی ایک کتاب کا پتا چلتا ہے، جس کا نام ''اعدل الاقوال فی بیان الظلم علی العباد'' ہے۔ اخبار ''اہل حدیث'' (امرتسر) میں ان کے بعض مضامین بھی شائع ہوئے۔ والد عالی مقام کی وفات کے بعد جامع ازہر کے نام سے ڈیانواں میں ایک مدرسہ جاری کیا تھا۔

آزادیٔ برصغیر کے بعد حکیم صاحب ممدوح ڈھاکہ چلے گئے تھے، جسے اس زمانے میں مشرقی پاکستان کہا جاتا تھا، وہیں دسمبر ۱۹۶۰ء میں وفات پائی۔ ان کے سات لڑکیاں اور چار لڑکے تھے۔

③ ...... مولانا حافظ عبدالفتاح: انھیں محمد ایوب بھی کہا جاتا تھا۔ ۷۔ محرم ۱۳۰۵ھ (۲۶۔ ستمبر ۱۸۸۷ء) کو پیدا ہوئے۔ قرآنِ مجید حفظ کیا اور دینیات کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۳۱۲ھ میں حج بیت اللہ کے لیے گئے تو حجاز کے بعض علما ومشائخ سے استفادہ کیا۔ ۱۹۳۴ء میں وفات پائی اور تین بیٹے اپنے پیچھے چھوڑے۔

کتب خانہ حوادث کی زد میں

گزشتہ صفحات میں یہ فقیر عرض کر چکا ہے کہ حضرت مولانا عظیم آبادی کی وفات کے بعد ان کے کتب خانے کو جو حوادث پیش آئے، اس کا ذکر آئندہ سطور میں کیا جائے گا۔ ہم اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ ان کا کتب خانہ مختلف علوم کے نوادر کا احاطہ کیے ہوئے تھا اور یہ نوادر انھوں نے انتہائی شوق اور بے حد کوشش سے خطیر رقوم خرچ کر کے جمع کیے تھے۔ بڑے بڑے شائقینِ مطالعہ

دور دراز علاقوں سے آتے اور اس عظیم الشان کتب خانے سے استفادہ کرتے تھے۔ ۱۴۔ اپریل ۱۹۰۶ء کو ندوۃ العلماء کے اہتمام میں بنارس کے ٹاؤن ہال میں نادر وکم یاب کتابوں کی جو نمائش کی گئی تھی، اس میں مولانا عظیم آبادی کی بہت سی نادر کتابیں آئی تھیں، جن کا ذکر الندوہ (جلد۳، نمبر۲) اور مقالات شبلی (جلد ۷ صفحہ ۱۱۱) میں مولانا شبلی نے بھی کیا ہے اور مولانا ثناء اللہ امرتسری نے بھی اخبار ''اہل حدیث'' مؤرخہ ۳۱۔ مارچ ۱۹۱۱ء میں اس کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اس کتب خانے کے متعلق سیرۃ البخاری کے فاضل مصنف مولانا عبدالسلام مبارک پوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> ''علامہ ابوالطیب محمد شمس الحق عظیم آبادی کا کتب خانہ بھی قابل دید ہے۔ اس کتب خانے میں علامہ موصوف نے ہر فن کی کار آمد کتابیں فراہم کی ہیں اور وہ شب وروز اسی دھن میں رہتے ہیں۔ معقولات، ادب، لغت، تاریخ، سمیت تمام علوم اسلامیہ موجود ہیں۔ فن حدیث کے متعلق اس قدر مواد فراہم ہے کہ اکثر نامی کتب خانے اس سے خالی ہیں۔ اکثر نسخ قلمیہ ایسے ایسے نادر موجود ہیں جن سے یورپ کے بڑے بڑے کتب خانے خالی ہیں۔ ساتھ اس کے آپ مستفیدین اور اہل علم کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں اور کتابیں عاریۃً دے دیتے ہیں۔ بہت کشادہ دلی سے کام لیتے ہیں۔'' ❶

حضرت مولانا عبدالسلام مبارک پوری کے ان الفاظ کے آگے ان کے فرزند گرامی قدر شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ رحمانی مبارک پوری رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''افسوس اب اس کتب خانے سے علامہ مرحوم کے اخلاف میں سے نہ کوئی خود فائدہ اٹھانے والا ہے، نہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے والا۔'' ❷

یہ کتب خانہ بڑے حادثوں کی زد میں آیا۔ پہلا حادثہ ۱۹۴۶ء میں پیش آیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے، جب ڈیانواں کے علاقے میں مسلم کش فسادات ہوئے اور بہت سے لوگوں نے ادھر اُدھر سے آ کر مولانا عظیم آبادی کے مکان میں پناہ لی۔ لائبریری کے کمروں میں بھی ان کا قیام ہوا۔ اس وقت بہت سی کتابیں ضائع ہوگئیں۔ بعض پناہ گزینوں نے جو علم سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے، ان کتابوں کو کھانا وغیرہ پکانے کے لیے چولھوں میں جلا ڈالا۔

دوسرا حادثہ ۱۹۷۱ء میں پیش آیا، جب مشرقی پاکستان میں بنگلہ دیش کے قیام کی تحریک نے سر

---

❶ سیرۃ البخاری صفحہ ۳۵، ۳۶۔ حاشیہ نمبر ۱ (شائع کردہ اہل حدیث اکیڈمی، لاہور)

❷ سیرۃ البخاری، ص: ۳۶۔ حاشیہ

اٹھایا اور فسادات ہوئے اور سخت خوں ریزی ہوئی۔ اس وقت مولانا عظیم آبادی کے بڑے بیٹے حکیم محمد ادریس میر پور (ڈھاکہ) میں مقیم تھے اور کتب خانے کے بہت سے اہم نوادر حکیم صاحب کے داماد بھتیجے جناب محمد ابوالقاسم صاحب کی تحویل میں تھے۔ فسادات کے بعد ان نوادر کا کچھ پتا نہ چلا کہ ضائع ہوگئے یا کسی اہل علم کے پاس محفوظ ہیں۔

اس عظیم الشان کتب خانے کا یہ انتہائی دردناک انجام ہے۔

جناب محمد عزیر صاحب نے اس سلسلے میں ایک اطمینان بخش بات بھی تحریر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس کتب خانے سے متعلق مجھ سے جناب عبدالرقیب صاحب نے بیان کیا کہ اس کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ حکیم محمد ادریس صاحب نے خدا بخش لائبریری (پٹنہ) کو دے دیا تھا۔ یہ حصہ ڈیانواں کلکشن کے نام سے اب تک محفوظ ہے۔

اس سے آگے وہ لکھتے ہیں کہ خدا بخش لائبریر کے عربی مخطوطات کی فہرست (مفتاح الکنوز) جلد سوم میں مولانا عظیم آبادی کے کتب خانے کی بے شمار کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ غیر مطبوعہ فہرست جلد چہارم میں بھی اس کتب خانے کی بہت سی کتابوں کے نام نظر آتے ہیں۔[1]

اس عظیم الشان کتب خانے کے بارے میں یہ ایک اطمینان بخش بات ہے۔ اگر مولانا کی جمع کردہ کتابیں پٹنہ کی خدابخش لائبریری میں منتقل ہوگئی ہیں تو بالکل صحیح مقام پر گئی ہیں۔ اہل علم ان سے علمی فوائد حاصل کریں گے اور یہ مولانا عظیم آبادی کے لیے صدقہ جاریہ ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مولانا عظیم آبادی کا حلیہ

آج جب یہ سطور لکھی جارہی ہیں، ۲۹۔ اکتوبر ۲۰۰۶ء ہے۔ آج سے سوا انیس برس پہلے ۱۲۔ جولائی ۱۹۸۷ء کو مولانا محمد حنیف ندوی نے وفات پائی اور انیس برس ستائیس روز قبل ۳۔ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کا انتقال ہوا۔ اس سے چار پانچ سال قبل (میرے خیال میں) ۱۹۸۲ء یا اس کے پس وپیش کی بات ہے کہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں مجھے اور مولانا محمد حنیف ندوی کو مولانا عطاء اللہ صاحب نے اطلاع دی کہ کراچی سے حضرت مولانا شمس الحق صاحب عظیم آبادی کے ایک عزیز تشریف لائے ہیں اور آپ لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ اتفاق سے میں اس دن دفتر نہیں جاسکا تھا، اس لیے تعمیل ارشاد نہ کرسکا، لیکن مولانا محمد حنیف ندوی اطلاع ملتے ہی مولانا عطاء اللہ صاحب کے مکان پر پہنچے اور ان سے ملاقات کی۔ دوسرے دن میں دفتر گیا تو مولانا ندوی

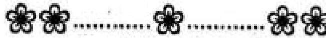
---

[1] دیکھیے مولانا شمس الحق عظیم آبادی۔ حیات اور خدمات، ص: ۷۳

نے مجھے یہ بات بتائی اور ساتھ ہی فرمایا کہ مولانا عظیم آبادی کے پوتے تشریف لائے ہیں۔ وہ بڑے وجیہ، خوب رو اور پورے قد وقامت کے ہیں۔ انھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا بھی بڑے وجیہ اور خوب صورت ہوں گے اور ڈیل ڈول کے اعتبار سے بارعب شخصیت کے مالک......!
فرمایا: تم ان سے ضرور ملو، وہ تمھیں یاد کر رہے تھے۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مولانا عطاء اللہ صاحب کی طرف سے مجھے پیغام آیا کہ آج یہاں پہنچو۔ میں حاضر ہوا تو وہ صاحب تشریف فرما تھے۔ افسوس ہے ان کا اسم گرامی ذہن میں نہیں رہا۔ نہایت تپاک سے ملے۔ لمبا قد، متناسب جسم، چوڑا چہرہ، سرخی مائل گندمی رنگ۔ چھوٹی داڑھی جو سفید اور سیاہ بالوں کا خوب صورت مجموعہ تھی۔ دھیمے اور منکسرانہ لہجے میں بات کرتے تھے۔ اس سے کچھ عرصہ بعد مجھے ان کا خط ملا تھا، جس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ وہ مولانا عظیم آبادی کے سوانح حیات قلم بند کر رہے ہیں۔ نیز وہ ان کی بعض کتابیں بھی چھاپنا چاہتے ہیں۔

معلوم نہیں مولانا عظیم آبادی پر لکھنے والے کسی صاحب نے ان کا حلیہ بھی بیان کیا ہے یا نہیں۔ میں نے ان سے متعلق متعدد حضرات کی تحریریں پڑھی ہیں۔ لیکن ان کے حلیے کے متعلق کسی صاحب کی کوئی تحریر میری نظر سے نہیں گزری۔ اب غالباً کوئی ایسا شخص نہیں ہوگا جو اس کی وضاحت کر سکے۔



مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی

برصغیر کے ماہرین حدیث کی ذی قدر جماعت اور حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے ارشد تلامذہ کی وسعت پذیر فہرست میں حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کا اسم گرامی نہایت نمایاں حروف میں مرقوم دکھائی دیتا ہے۔ اس عظیم شخصیت کے حالات آئندہ سطور میں قدرے تفصیل سے بیان کیے جاتے ہیں۔

صوبہ بہار

ہندوستان کے صوبہ بہار کو کسی زمانے میں مردم خیز خطے کی حیثیت حاصل تھی۔ اس خطے کے مختلف علاقوں میں بے شمار علمائے دین پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے اپنے دور میں بے پناہ علمی اور دینی خدمات سرانجام دیں اور بہت سے سیاسی لیڈروں نے جنم لیا جو برصغیر کی تحریکات آزادی میں ہمیشہ پیش پیش رہے اور ان کی جدوجہد کی وجہ سے یہ ملک آزادی کی نعمت سے سرفراز ہوا۔ علمائے دین میں حضرت سید نذیر حسین دہلوی، شاہ عین الحق پھلواروی، مولانا شمس الحق عظیم آبادی، سید سلیمان ندوی، مولانا ابراہیم آروی، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا راغب احسن، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا عبدالرؤف جھنڈا نگری اور مولانا فضل حسین بہاری جیسے لا تعداد حضرات شامل ہیں جو اپنی خدمات بوقلموں کی وجہ سے کامرانی کے بلند مقام پر فائز ہوئے۔

علمائے عظام ہی کی بابرکت صف میں مولانا یحییٰ علی صادق پوری، مولانا احمد اللہ صادق پوری اور مولانا عبدالرحیم صادق پوری کے اسمائے گرامی مرقوم ہیں جنھیں ہندوستان کو آزاد کرانے اور اسلام کی سربلندی کے لیے کوشاں ہونے کے جرم میں انگریزوں نے قید کر کے جزائر انڈیان (کالے پانی) بھیجا اور ان میں سے بعض بزرگ وہیں وفات پا گئے۔ یہ شدید ترین سزائیں تھیں، جو انھیں دی گئیں، لیکن وہ شدید ترین سزائیں آگے چل کر برصغیر کے لیے انگریزوں کی محکومی سے نجات کا باعث ہوئیں۔

سید عنایت علی صادق پوری، سید ولایت علی اور ان کے علاقے اور خاندان کے دیگر لوگوں کے نام بھی اسی پاک باز گروہ میں شامل ہیں جنھوں نے آزاد قبائل میں جا کر آزادی کی جنگیں لڑیں اور جماعت مجاہدین کی وہابی تحریک کو آگے بڑھایا اور اس تحریک کے بہادر ارکان ۱۹۴۷ء تک باقاعدہ

انگریزی اقتدار سے برسرپیکار رہے۔ جماعت مجاہدین اب بھی کسی نہ کسی طریقے سے زندہ ہے اور اپنے انداز میں حالات کے مطابق جدوجہد کررہی ہے۔

صوبہ بہار کے سیاسی رہنماؤں کے وسیع حلقے میں سید محمود، سید حسن امام، بیرسٹر سید عبدالعزیز اور عبدالقیوم انصاری جیسے پیکر عزم وہمت لوگوں کے نام بھی آتے ہیں۔

خدا بخش لائبریری کے بانی جسٹس خدا بخش کا تعلق بھی اسی صوبے کے شہر پٹنہ سے تھا، جسے کسی زمانے میں عظیم آباد کہا جاتا تھا اور یہ شہر صوبہ بہار کا دارالحکومت ہے۔ اس صوبے کی خدا بخش لائبریری مختلف موضوعات سے متعلق کتابوں کی تعداد اور اپنی وسعت وحجم کے اعتبار سے تمام دنیا کے علمی حلقوں میں مشہور ہے۔

آج بھی یہ صوبہ علم وعلما کی کثرت، ان کی تدریسی وتصنیفی تگ ودو اور ان کی سیاسی جدوجہد کے سبب سے ایک خاص انفرادیت رکھتا ہے۔ اسی صوبے کے ایک فاضل ڈاکٹر قیام الدین احمد (پروفیسر تاریخ پٹنہ یونیورسٹی) نے "Wahabi Movement in India" کے نام سے ۱۹۶۱ء میں انگریزی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ ''ہندوستان میں وہابی تحریک'' کے نام سے پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی نے اس کا اردو ترجمہ کیا۔ اصل انگریزی مقالہ اور اردو ترجمہ دونوں کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں اور اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں نے ان کتابوں سے بے حد استفادہ کیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ مصنف اور مترجم دونوں کا تعلق عظیم آباد کے اس خاندان سے ہے جس کے بزرگوں کو قیدی بنا کر اور زنجیروں میں جکڑ کر انگریزی عہد اقتدار میں کالے پانی (جزائر انڈمان) بھیجا گیا تھا۔

مولانا رحیم آبادی کا خاندان

مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کے صوبہ بہار کی چند علمی وسیاسی شخصیات کے مختصر تذکرے کے بعد چند الفاظ میں ان کے خاندان کا تعارف بھی ضروری ہے۔ مولانا رحیم آبادی اپنے عہد کے آسودہ حال خاندان کے آسودہ حال فرد تھے۔ ان کے والد کا نام شیخ احمد اللہ تھا جو اچھی خاصی زمینوں کے مالک تھے اور بڑے جرأت مند اور بلند حوصلہ شخص تھے۔ فضل الرحمٰن سلفی لکھتے ہیں:

''اگر یہ کہا جائے کہ وہ اپنے علاقے کے بے تاج بادشاہ تھے تو بے جا نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو مال ودولت کے ساتھ ساتھ شان وشوکت اور رعب ودبدبہ (بھی) عطا کیا تھا۔'' [1]

اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا تھا کہ ایک مرتبہ ''انگریزوں نے رحیم آباد میں نیل کی کھیتی اور

---

[1] مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی۔ حیات اور خدمات، صفحہ: ۱۴

اس کی تیاری کے لیے زمین خریدی اور اینٹ سیمنٹ وغیرہ اکٹھا کیا تو (شیخ احمد اللہ نے) سارا سامان غائب کرادیا اور اپنی زندگی میں وہاں نیل کی کھیتی اور اس کی تیاری نہ ہونے دی۔" ❶

"انگریز حکام جن سے لوگ سخت خوف کھاتے اور جن کا سامنا کرنے سے گریز کرتے تھے، وہ بھی جب رحیم آباد میں شیخ صاحب کی حویلی کے سامنے سے گزرتے تو سواری سے اتر جاتے اور سر سے ہیٹ اتار دیتے تھے۔" ❷

انگریزی حکام کے سامنے قدم جما لینا اور ان کو کسی انداز سے مرعوب کرنا تو بہت اچھی بات تھی، ان کو اس جرأت کی داد دینا چاہیے، لیکن بسا اوقات وہ خود اپنے لوگوں سے بھی سختی کا برتاؤ کرتے اور انھیں تکلیف پہنچانے میں راحت محسوس کرتے تھے۔ ایک مرتبہ علاقے کے ایک بڑے آدمی سے کسی بات پر اختلاف ہوا تو اس کے چالیس بیل، گاڑی اور بہت سا سامان غائب کرادیا۔ ❸

ان کے حالات سے اس قسم کے بعض اور واقعات کا بھی پتا چلتا ہے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی اور خیر وشر میں تمیز کرنے کی صلاحیت عطا فرمائی تو گزشتہ تمام امور سے توبہ کرکے اسلام کی خدمت اور مسلک سلف کی ترویج واشاعت میں مصروف ہوگئے اور اپنی پوری طاقت اور مال و دولت کو اس عمل خیر کے لیے وقف کردیا۔ ❹

ایک بزرگ حافظ محمد صدیق صاحب مرحوم نے ۱۲، ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کے اخبار "اہل حدیث" (امرتسر) میں مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کے سوانح حیات تحریر فرمائے تھے۔ مولانا رحیم آبادی کے والد محترم کی جود وسخاوت اور اتباعِ سنت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"رئیس الموحدین جناب شیخ احمد اللہ صاحب رئیس موضع رحیم آباد بہت بڑے جواد، کریم، محب اہل علم، متقی، عابد اور متبع سنت بزرگ گزرے ہیں۔ ان کے مناقب واوصاف کا اس سے پتا چلتا ہے کہ استاذ الاساتذہ استاذی المکرّم مولانا حافظ عبداللہ صاحب محدث غازی پوری رحمہ اللہ کبھی کبھی اس قسم کے تذکروں میں فرمایا کرتے تھے کہ بڑے لوگوں میں جناب نواب صدیق حسن خاں صاحب رحمہ اللہ اور چھوٹے رئیسوں میں جناب شیخ احمد اللہ صاحب مرحوم نے توحید وسنت کی اشاعت میں جس مالی انفاق وایثار سے کام لیا ہے، اس میں یہ حضرات اپنی نظیر آپ ہیں، رحمهم الله تعالیٰ"

---

❶ ایضاً
❷ ایضاً
❸ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی۔ حالات اور خدمات، ص:۱۵
❹ ایضاً

اولاد اور ان کی تعلیم وتربیت

شیخ احمد اللہ کی اولادِ نرینہ پانچ بیٹے تھے اور وہ تھے عبدالرحیم، عبدالوہاب، عبدالعزیز، محمد یاسین اور محمد یحییٰ۔ ان کی تعلیم وتربیت کا انھوں نے رحیم آباد میں مدرسہ جاری کرکے وہیں انتظام کیا اور اس کے لیے وقت کے معروف اساتذہ کی خدمات حاصل کیں۔ ان اساتذہ میں حافظ مٹھو دربھنگوی، حافظ محمد رمضان (ساکن باندہ) مولانا عظمت اللہ (ساکن بہپورہ) مولانا محمود عالم رام پوری اور مولانا محمد یحییٰ بہاری کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

بڑے بیٹے عبدالرحیم نے اسی مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد دہلی کا رخ کیا اور وہاں کے بعض اساتذہ سے مستفید ہوئے۔ آخر میں حضرت میاں سید نذیر حسین کے حلقۂ درس میں شمولیت کی اور ان سے حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ دہلی میں علم طب بھی پڑھا۔ فراغت کے بعد واپس اپنے وطن رحیم آباد آئے اور اپنے والد محترم شیخ احمد اللہ کے جاری کردہ مدرسے میں خدمت تدریس میں مصروف ہوگئے۔ مدرسے کے اساتذہ وطلبا کے اخراجات کے ذمہ دار شیخ احمد اللہ صاحب تھے۔ مولانا عبدالرحیم اپنے مدرسے میں پڑھاتے بھی تھے، لوگوں کا مفت علاج بھی کرتے تھے اور زمینوں کا انتظام بھی ان کے سپرد تھا۔ وہ عالمانہ شان سے رہتے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں ۹۴ سال کی عمر پاکر فوت ہوئے۔ ان کے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کا سلسلہ ماشاء اللہ بہت وسیع ہے۔

دوسرے بیٹے عبدالوہاب تھے۔ ان کی تعلیم بھی اسی گھر کے مدرسے میں ہوئی۔ دینی تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے وکالت پڑھی اور پھر وکالت ہی کو پیشہ بنالیا، تمام عمر وکالت کرتے رہے۔ اللہ کے فضل سے ان کی اولاد بہت پھیلی اور وہ سب لوگ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اچھے عہدوں پر فائز ہوئے۔ ان میں سے بعض حضرات پاکستان آگئے تھے لیکن زیادہ تر ہندوستان میں رہے۔ دونوں ملکوں کے رہنے والے خوش حالی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

شیخ احمد اللہ کے تیسرے بیٹے مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی تھے، جن کے حالات آئندہ صفحات میں بیان کیے جارہے ہیں۔

چوتھے حافظ محمد یاسین تھے۔ انھوں نے گھر میں قرآنِ مجید حفظ کیا اور عربی وفارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ پھر حضرت میاں صاحب کے حلقۂ درس میں شامل ہونے کے لیے دہلی کو روانہ ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ احمد اللہ صاحب کے سب لڑکوں سے یہ زیادہ ذہین تھے۔ لیکن چھوٹی عمر میں وفات پاگئے۔

پانچویں لڑکے محمد یحییٰ تھے۔ انھوں نے بھی دینی تعلیم حاصل کی۔ بارعب شخصیت کے مالک

تھے۔ ان کی اولاد میں سے بعض ہندوستان میں قیام پذیر ہیں اور بعض پاکستان آ گئے تھے۔ دینی اور دنیوی اعتبار سے یہ سب لوگ آسودگی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

مولانا رحیم آبادی کی ولادت

شیخ احمد اللہ کے مختصر حالات اور ان کے چار لڑکوں (عبدالرحیم، عبدالوہاب، محمد یاسین اور محمد یحییٰ) کے تعارف کے بعد اب مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کے واقعاتِ زندگی بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مولانا ممدوح قمری حساب سے ۱۲۷۰ھ میں پیدا ہوئے جو عیسوی حساب سے ۱۸۵۴ء بنتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ان کی ولادت مغل دور کے آخری حکمران بہادر شاہ ظفر کے آخری عہد حکومت میں ہوئی۔ بہادر شاہ اگرچہ برائے نام بادشاہ تھا اور اس کا دائرہ حکمرانی سمٹ کر قلعہ معلیٰ کی چار دیواری میں محدود ہوگیا تھا، تاہم اسے بادشاہ ہی کہا جاتا تھا اور یہ قلعہ معلیٰ میں تخت حکمرانی پر متمکن تھا اور کسی بھی صورت میں سہی، آخر یہ مسلمانوں کی بادشاہت تھی۔ یعنی مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی نے اپنے بچپن کے چار سال مغلوں کی مسلمان حکومت میں گزارے۔ اس کے بعد ۱۸۵۷ء آ گیا اور پھر اسی سال ہندوستان سے مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور مولانا ممدوح ہندوستان کے کروڑوں باشندوں کے ساتھ انگریزوں کی ماتحتی میں چلے گئے۔

مولانا کی والدہ کا نام بی بی مخدومن تھا اور وہ میر معشوق علی کی بیٹی تھیں جو چک جہاں گرادفہ (عرف گدولور) کے رہنے والے تھے۔

تعلیم وتربیت

کچھ بڑے ہوئے تو تعلیم وتربیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ والد مکرم نے بیٹے کو پہلے حفظ قرآن کی راہ پر لگایا۔ اس کے لیے گھر ہی میں انتظام کیا اور حافظ مٹھو در بھنگوی کی خدمات حاصل کیں، پھر حافظ محمد رمضان (ساکن باندہ) کے حلقۂ شاگردی میں دے دیے گئے۔ قرآنِ مجید حفظ کرنے کے بعد عربی اور فارسی کی تعلیم کو ضروری سمجھا گیا۔ متداول نصاب کی ابتدائی اور متوسط درسوں کی کتابیں مولوی عظمت اللہ، مولوی محمود عالم رام پوری اور مولوی محمد یحییٰ عظیم آبادی نے گھر ہی میں پڑھیں۔

حضرت میاں صاحب کی خدمت میں

اس کے بعد دینیات کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) میں انھیں حضرت میاں سید نذیر حسین کی خدمت میں دہلی بھیج دیا گیا۔ وہاں دو سال قیام رہا۔ اس اثنا میں صحاح ستہ کی تکمیل کی۔

اس کے علاوہ موطا امام مالک، سنن دارمی، جامع صغیر، ہدایہ، جلالین اور اصول حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ منطق، فلسفہ، معانی، صرف ونحو اور دیگر علوم کی کتابیں بھی مختلف اساتذہ سے پڑھیں۔ بائیس سال کی عمر میں تمام مروّجہ علوم کی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ اور ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۵ء) میں حضرت میاں صاحب سے سند فراغت لی۔

مولانا رحیم آبادی نہایت ذہین اور قوی حافظہ تھے۔ علومِ متداولہ پر انھوں نے زمانہ طالب علمی ہی میں عبور حاصل کرلیا تھا۔ بعض اوقات درس میں شریک ہی نہیں ہوتے تھے کہ جو کچھ آج پڑھنا ہے، اس کا مجھے خوب علم ہے۔ چناں چہ ایک دن میاں صاحب طلبا کو پڑھا رہے تھے، دیکھا کہ عبدالعزیز سبق میں حاضر نہیں ہیں۔ میاں صاحب نے بلا کر غیر حاضری کی وجہ پوچھی تو بولے یہ سبق مجھے آتا تھا، اس لیے حاضر نہیں ہوا۔ میاں صاحب ''اچھا'' کہہ کر خاموش ہوگئے۔

ایک دن پھر دیکھا کہ وہ طلبا کی جماعت سے غیر حاضر ہیں۔ میاں صاحب نے بلا کر پھر غیر حاضری کی وجہ پوچھی تو اسی قسم کا جواب دیا جو پہلے دیا تھا۔ اب میاں صاحب نے کوئی ایسی بات پوچھی، جس کا اس سبق سے تعلق تھا، اس کا صحیح جواب تو نہ دے سکے، لیکن طبیعت چوں کہ مناظرانہ پائی تھی لہٰذا خاموش نہ رہ سکے اور اِدھر اُدھر کی غیر متعلق باتیں کرنے لگے۔ میاں صاحب نے فرمایا کہ زیر درس کتاب کے بعض مباحث میں بعض نئی بحثیں بھی ہوتی ہیں، اس لیے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ میں ہر درسی کتاب کے ہر مسئلے پر عبور رکھتا ہوں۔ پھر فارسی کا یہ شعر پڑھا

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالیست   شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

(ہر جنگل کو خالی نہ سمجھو، ممکن ہے کہیں شیر سو رہا ہو)

علم طبّ کی تحصیل

قیام دہلی کے دوران میں مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی نے دہلی کے بعض نامور اطبا سے علم طب کی تحصیل کی۔ اس زمانے میں دینیات کی تعلیم کے بعد یا اس کے دوران ہی میں عام طور سے علمائے کرام علم طب کے حصول کی کوشش بھی کرتے تھے۔ اس سے ان کا مقصود یہ ہوتا تھا کہ تحصیل علم کے بعد کسی کے احسان مند نہ ہوں۔ تدریسی اور تبلیغی خدمات بغیر کسی معاوضے کے ادا کی جائیں اور ذریعہ معاش طبابت کو بنایا جائے۔ لیکن مولانا رحیم آبادی تو زمیندار اور مال دار گھرانے کے فرد تھے، علم طبّ سے ان کا مقصد محض خدمت خلق تھا۔ چناں چہ انھوں نے کوئی باقاعدہ مطب قائم نہیں کیا البتہ مریضوں کو ضروری مشورے ضرور دیتے رہے۔

قیامِ دہلی کے زمانے میں انھوں نے ماہر طباخوں اور باورچیوں سے طباخی کا طریقہ بھی سیکھا،

چناں چہ وہ ایک ماہر طباخ بھی تھے اور ہر قسم کے کھانے پاسکتے تھے اور بہ وقت ضرورت پکاتے بھی تھے۔ اس وقت مغل حکومت کے اختتام پر تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا اور دہلی میں مغل حکمرانوں اور حاکموں کے بعض طباخ موجود تھے جو مختلف قسم کے شاہی کھانے پکاتے رہے تھے، مولانا نے ان سے رابطہ قائم کرکے اس فن سے آگاہی حاصل کی۔

اسی اثنا میں انھوں نے گھڑ سواری میں مہارت پیدا کی۔ دہلی کو ہندوستان کے دارالحکومت کی حیثیت حاصل تھی، فوج کا مرکز بھی وہی شہر تھا اور بہتر سے بہتر گھڑ سوار کثیر تعداد میں وہاں موجود تھے۔ مولانا نے یہ فن بھی دہلی کے ماہر گھڑ سواروں سے سیکھا۔ چناں چہ وہ سرکش سے سرکش گھوڑے کو رام کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ دراصل ابتدا ہی سے مجاہدانہ طبیعت کے مالک تھے اور جماعت مجاہدین سے متاثر و متعلق تھے، اسی تعلق وتاثر کی بنا پر وہ گھڑ سواری وغیرہ امور میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔

مسند تدریس

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا۔ مولانا رحیم آبادی ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۵ء) میں فارغ التحصیل ہوئے تھے۔ اسی سال وہ اپنے وطن رحیم آباد آئے اور آتے ہی مسند تدریس آراستہ کی اور اس اہم کام میں مشغول ہوگئے۔ اس وقت وہ تیئس برس کے جوان رعنا تھے۔ محنت، مستعدی، احساسِ ذمہ داری، جذبہ خدمت دین، صالحیت اور صلاحیت یہ چھ عناصر تھے جن کو ان کی حیاتِ مبارکہ کے لازمی عناصر کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ عناصر نعم الرفیق کے طور پر تمام عمر ان کے ساتھ رہے۔

رحیم آباد کے جس مدرسے میں وہ فریضہ تدریس سرانجام دیتے تھے، وہ مدرسہ بہت عرصہ پیشتر ان کے والد ماجد شیخ احمد اللہ نے جاری کیا تھا۔ اس مدرسے میں مقامی طلبا کے علاوہ متعدد بیرونی طلبا بھی تحصیل علم کرتے تھے، جن کی تمام ضروریات کی کفالت شیخ احمد اللہ نے اپنے ذمے لے رکھی تھیں۔ یعنی ان کے قیام وطعام اور درسی کتابوں پر جو کچھ خرچ ہوتا تھا، وہ شیخ صاحب اپنی گرہ سے ادا کرتے تھے۔

تدریس کے ساتھ خطابت وامامت کا فریضہ بھی مولانا عبدالعزیز اپنے قصبے رحیم آباد میں ادا فرماتے تھے۔ نیز اس علاقے کے مختلف مقامات میں وعظ وتبلیغ کے لیے بھی مولانا جاتے تھے، جس سے بے شمار لوگوں کو فائدہ پہنچا اور کتاب وسنت کی اشاعت کا دائرہ وسیع ہوا۔ آٹھ سال رحیم آباد میں مولانا کی تدریس وخطابت کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری رہا۔ اس اثنا میں لوگ کثیر تعداد میں بدعات اور غلط رسوم وعوائد سے تائب ہوئے اور اللہ کی وحدانیت اور کتاب وسنت پر عمل کا داعیہ ان

کے ذہن وفکر کی تہوں میں جاگزیں ہوا۔

مولانا رحیم آبادی کا تذکرہ کرتے ہوئے حکیم عبدالحیی حسنی لکھتے ہیں:

الشیخ الفاضل عبدالعزیز بن احمد الله السلفی الرحیم آبادی المظفر پوری. احد العلماء المشهورین. ولد سنة سبعین ومأتین والف بقریة رحیم آباد من اعمال مظفر پور، وقرأ العلم علی المولوی محمود عالم الرام پوری والحکیم عبدالسلام الدهلوی ثم العظیم آبادی ومولانا محمد یحیی بن منوّر حسن الهرنی العظیم آبادی. ثم سافر الی دهلی واخذ الفقة والحدیث عن شیخنا المحدث نذیر حسین الحسینی الدهلوی سنة اثنتین وتسعین ومأتین والف . ثم رجع الی بلدته وجدّ فی البحث والاشتغال حتّی حصلت له ملکة راسخة فی الخلاف والمذهب .❶

”یعنی شیخ فاضل عبدالعزیز بن احمد اللہ سلفی رحیم آبادی کا شمار علماے مشاہیر میں ہوتا تھا۔ وہ ۱۲۷۰ھ کو رحیم آباد (اعمال مظفر پور) میں پیدا ہوئے اور مولانا محمود عالم رام پوری، حکیم عبدالسلام دہلوی ثم عظیم آبادی اور مولانا محمد یحییٰ بن منور حسن ہرنی عظیم آبادی سے حصول علم کیا۔ پھر عازم دہلی ہوئے اور وہاں ۱۲۹۲ھ میں ہمارے شیخ محدث نذیر حسین حسینی دہلوی سے حدیث وفقہ کے علوم کی تحصیل کی۔ بعد ازاں اپنے وطن تشریف لائے اور تدریس وتبلیغ میں مصروف ہوئے، یہاں تک کہ انھیں مناظرات وخلافیات اور مذہبی علوم ومباحث میں ملکہ راسخہ حاصل ہوگیا۔“❷

مظفر پور

آٹھ سال کے بعد تبدیلی کی لہر چلی اور حالات میں کچھ ایسا تغیر رونما ہوا کہ اس کے نتیجے میں مولانا عبدالعزیز اپنے مولد ومسکن رحیم آباد کی سکونت ترک کرکے اہل وعیال سمیت مظفر پور چلے گئے جو اس علاقے کا ضلعی مقام تھا۔ مظفر پور کے محلّہ چھوٹی کلیانی کی ایک مسجد کو انھوں نے اپنا مرکز قرار دیا اور وہاں ایک درس گاہ کی بنیاد رکھی۔ وہاں کے ایک بزرگ کا نام ”دون خان“ تھا جو شہر کی

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج:۸،ص:۲۵۶، ۲۵۷

❷ حضرت سید نذیر حسین دہلوی کے حلقہ درس سے ۱۲۹۲ھ میں نہیں بلکہ ۱۲۹۳ھ میں فارغ ہوئے، جیسا کہ ان کے سوانح نگار کے حوالے سے پہلے لکھا جاچکا ہے۔ (دیکھیے مولانا عبدالعزیز۔ حیات اور خدمات،ص:۲۱۔ نیز ملاحظہ ہو حسن البیان میں مختصر سوانح حیات از مولانا عطاء اللہ حنیف،ص:۵ ذیلی عنوان ”تدریس“ کے تحت)

ایک باأثر شخصیت تھے۔ وہ بزرگ مولانا رحیم آبادی کے طرزِ گفتگو اور اندازِ تقریر وتدریس سے بہت متاثر ہوئے اور جلد ہی یہ تاثر مولانا سے عقیدت کی صورت اختیار کرگیا۔ اسی اثنا میں ان کے ایک بھتیجے محمود عالم مولانا کے حلقہ درس میں شامل ہوگئے جو آگے چل کر اس علاقے کے عالم دین کی حیثیت سے ابھرے اور مبلغ اور مدرس کے طور پر خدمات سرانجام دینے لگے۔

مولانا رحیم آبادی کا مظفر پور آنا اللہ تعالیٰ کی رحمت ثابت ہوا۔ چوں کہ یہ ضلع کا صدر مقام تھا، اس لیے اس شہر میں مختلف مقامات سے بے شمار لوگ آتے اور مولانا سے ملتے تھے۔ مولانا نے آتے ہی یہاں مدرسہ جاری کرلیا تھا، ان کی تدریسی سرگرمیوں سے بہت سے شائقین علم پہلے سے آگاہ تھے۔ اب شہر میں تشریف لانے کی بنا پر ان کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا اور وہ مرجع عوام قرار پاگئے۔ طلبا حصولِ علم کے لیے آنے لگے اور عام لوگوں کو ان کے وعظ وخطابت نے اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ مسائل پوچھنے اور فتوے لینے کے لیے بھی روزانہ بہت سے لوگ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اس طرح پورے علاقے میں ان کے علم وتحقیق کے اثرات پھیل گئے۔ اس زمانے میں جن حضرات نے ان سے فیض حاصل کیا اور ان کے حلقہ شاگردی میں شامل ہوئے، ان سب کا تذکرہ تو شاید کوئی بھی نہ کرسکے، البتہ اس علاقے کے جن بزرگوں کے نام ان کے شاگردوں کی فہرست میں لیے جاتے ہیں، ان میں مولانا ابوطاہر بہاری، مولانا مولا بخش براکری، مولانا محمد اسحاق آروی، حافظ محمد حنیف آروی، حافظ عبداللہ رحیم آبادی، حافظ عبداللہ لانگری شامل ہیں۔

مظفر پور میں قیام کی وجہ سے ان کا حلقہ احباب بھی وسیع ہوا، ان کی دعوت وتبلیغ کے دائرے نے بھی وسعت اختیار کرلی اور عمل بالحدیث کی تحریک بھی دور دراز علاقوں تک پہنچی۔ مولانا ممدوح ضلع مظفر پور کے مختلف دیہات وقصبات میں تشریف لے جاتے اور اپنے مواعظ میں لوگوں کو کتاب وسنت پر عمل کی دعوت دیتے، جس سے سامعین نہایت متاثر ہوتے اور ان کے ارشادات کو لائق عمل قرار دیتے۔

مولانا رحیم آبادی دس سال مظفر پور میں قیام فرما رہے۔ مظفر آباد میں ان کی قائم کردہ درس گاہ نے آگے چل کر مدرسہ احمدیہ کے نام سے شہرت پائی اور نصف صدی سے زائد عرصے تک تشنگانِ علم اس چشمہ صافی سے اپنی علمی پیاس بجھاتے رہے۔

مظفر پور میں قیام کے دوران جہاں بہت سے مسلمانوں نے مولانا رحیم آبادی کے مواعظ سے اثر پذیر ہوکر بدعات ومحدثات کو ترک کیا اور مسلک اہل حدیث سے وابستگی اختیار کی وہاں بعض غیر مسلم بھی حلقہ اسلام میں داخل ہوئے اور اپنے علاقے میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کا سبب بنیں۔ اسلام قبول کرنے والوں میں بعض اونچی ذات کے ہندو بھی شامل تھے، جس کی تفصیل مولانا محمد فضل

الرحمٰن سلفی نے اپنی کتاب ''مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی۔ حیات وخدمات'' میں بیان کی ہے اور ان کے بعض واقعات بھی تحریر فرمائے ہیں۔

رحیم آباد میں واپسی

مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی نے مظفر پور شہر اور اس کے قرب وجوار میں بے حد خدمات سرانجام دیں۔ دس سال کے بعد حالات نے پھر پلٹا کھایا اور والد مکرم کے حکم سے اپنے وطن رحیم آباد واپس آگئے۔ یہاں بھی وہی درس وتدریس اور تبلیغ وخطابت کا سلسلہ جاری فرمایا۔ اب رحیم آباد کو علم وعلما کے مرکز کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ کوئی عالم دین آرہے ہیں کوئی جارہے ہیں۔ اور وعظ وتبلیغ کے سلسلے جاری ہیں۔ حضرت میاں سید نذیر حسین کے لیے تو رحیم آباد کو اپنے گھر کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ متعدد مرتبہ یہاں تشریف لائے اور کئی کئی دن مقیم رہے۔ ان کے علاوہ استاذ الاساتذہ حضرت حافظ عبداللہ غازی پوری، شاہ عین الحق پھلواروی، مولانا ابومحمد ابراہیم آروی اور دیگر بہت سے حضرات یہاں اکثر تشریف لاتے اور لوگوں کو اپنے مواعظ حسنہ سے مستفیض فرماتے رہے۔ ان اکابر علما کی اس نواح میں آمد باعث برکت اور ذریعہ تبلیغ توحید تھی۔ اس کے وسیع اثرات اب بھی اس علاقے میں موجود ہیں۔

مساجد سے متعلق جھگڑے اور فیصلے

برصغیر میں مساجد کے متعلق تھوڑا بہت جھگڑا ہمیشہ چلتا رہا۔ کبھی ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کا اور کبھی احناف اور اہل حدیث کا۔ بارہا ایسا ہوا کہ غیر مسلموں نے مسلمانوں سے کہا کہ یہ جگہ مندر یا گوردوارے کی ہے یہاں ہم مسجد نہیں تعمیر ہونے دیں گے یا احناف نے اہل حدیث سے جھگڑا شروع کردیا کہ یہ جگہ ہماری ہے، یہاں اہل حدیث کی مسجد نہیں بن سکتی۔ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کے زمانے میں بھی اس قسم کے جھگڑوں نے سر اٹھایا۔ مثلاً تاج پور کی مسجد کے بارے میں شدید اختلاف پیدا ہوا۔ وہاں احناف کی اکثریت تھی اور انھوں نے اس مسجد میں اہل حدیث جماعت کے لوگوں کو نماز پڑھنے اور پڑھانے سے روکنے کی کوشش کی، لیکن مولانا عبدالعزیز کے والد شیخ احمد اللہ صاحب نے سختی سے مقابلہ کیا۔ معاملہ عدالت تک پہنچا اور مسجد اہل حدیث کے قبضے میں آئی۔

اسی طرح سیتا مڑھی شہر کے کورٹ بازار کی مسجد کے امام ایک بزرگ حافظ نصر اللہ نابینا تھے جو بہت ذہین عالم دین اور متقی شخص تھے۔ انھوں نے مسلک اہل حدیث اختیار کیا تو احناف کی طرف سے انھیں بے حد اذیتیں پہنچائی گئیں اور انھیں مسجد سے نکال دیا گیا۔ یہ معاملہ بھی عدالت میں گیا

اور فروری ۱۹۰۶ء میں فیصلہ اہل حدیث کے حق میں ہوا۔ اس مسجد کے حصول کے لیے خود مولانا عبدالعزیز میدان میں اترے اور کامیاب ہوئے۔

۱۹۰۹ء میں جمال پور میں اہل حدیث اور احناف کے درمیان جھگڑا ہوا اور یہ جھگڑا یہاں تک پہنچا کہ احناف نے اہل حدیث نمازیوں کو مسجد سے نکال دیا۔ اس سلسلے میں بھی مولانا رحیم آبادی آگے بڑھے اور ان کی کوشش سے مسجد اہل حدیث جماعت کے قبضے میں آئی۔

مولانا رحیم آبادی کے سوانح نگار مولانا فضل الرحمٰن سلفی کی زبانی مظفر پور کی ریلوے مسجد کا ذکر بھی سنتے جائیے۔ یہ کم وبیش ایک سو سال قبل کا واقعہ ہے۔ جب ریلوے حکام نے مظفر پور اسٹیشن کو وسیع کرنے کا منصوبہ بنایا تو دیکھا کہ وہاں قدیم دور کی ایک مسجد ہے جو ان کے طے شدہ منصوبے کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ ریلوے کے انگریز حکام نے مسلمانوں سے رابطہ پیدا کیا اور اس مسجد کو منہدم کر کے اس کے بدلے میں اس سے زیادہ جگہ دینے اور اس کو اپنے خرچ سے تعمیر کرنے کا وعدہ کیا، لیکن مسلمان رضا مند نہ ہوئے۔ محکمۂ ریلوے کا جنرل منیجر خود مظفر پور آیا اور مسلمانوں سے بات کی۔ مولانا رحیم آبادی کو پتا چلا تو وہ بھی مظفر پور پہنچے اور جنرل منیجر سے گفتگو کی اور اس کو دلائل سے سمجھایا کہ مسجد جہاں تعمیر ہو جائے، وہ ہمیشہ مسجد ہی رہے گی اسے منہدم نہیں کیا جا سکتا، نہ اس کا کسی دوسری جگہ تبادلہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ مسجد اب بھی وہاں موجود ہے چناں چہ مولانا فضل الرحمٰن سلفی لکھتے ہیں:

> ”مظفر پور ریلوے اسٹیشن پر جہاں ریلوے لائن کا جال بچھا ہوا ہے، آج بھی ایک گنبد دار مسجد چاروں طرف سے لائن سے گھری ہوئی نظر آتی ہے، جہاں پنجگانہ نماز کے علاوہ جمعہ کی نماز بھی ادا کی جاتی ہے۔“ ❶

یہاں ایک اور مسجد کا ذکر بھی ضروری ہے جو دربھنگا شہر میں ہے اور جسے ”جھگڑوا مسجد“ کہا جاتا ہے۔ یہ بھی تقریباً سو سال پیشتر کا واقعہ ہے۔ مہاراجا دربھنگا نے شہر کے وسط میں اپنا محل بنانا چاہا تو اس کی حد بندی کرتے وقت دیکھا کہ ایک کونے میں پہلے سے مسجد تعمیر کی گئی ہے، جس کی وجہ سے محل کی چار دیواری میں ٹیڑھ آ رہی ہے۔ دیوار سیدھی رکھنے کے لیے مسجد کا انہدام ضروری تھا۔ اس کے لیے وہاں کے مسلمانوں سے بات کی گئی اور انھیں مسجد کی جگہ سے زیادہ جگہ دینے کی پیش کش کی گئی۔ مہاراجا کا اصرار بڑھا تو دربھنگا کے بعض سرکردہ افراد مولانا رحیم آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ وہ وہاں جا کر مہاراجا سے بات کریں۔ مولانا تشریف لائے، مہاراجا سے بات کی

---

❶ سوانح مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، ص: ۴۹

اور معاملہ ختم ہوگیا۔ مسجد اپنی جگہ قائم رہی۔ موجودہ قلعے کی کچ چاردیواری آج بھی مولانا رحیم آبادی کے اس عظیم کارنامے کی شہادت دے رہی ہے۔

مولانا فضل الرحمٰن سلفی تحریر فرماتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے مولانا رحیم آبادی کے تعلقات اطراف دربھنگا سے تو ضرور تھے لیکن شہر دربھنگا میں ان کا کوئی اثر نہ تھا۔ یہی مسجد دربھنگا والوں سے ان کے تعلقات بڑھانے کا باعث ہوئی جو آگے چل کر ایک مرکز کی حیثیت اختیار کرگئی۔ [1]

ہندو مسلم فسادات

متحدہ ہندوستان میں بعض اوقات چھوٹے یا بڑے پیمانے پر ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ بھی چل پڑتا تھا۔ عام طور سے اس کا سبب گاے کی قربانی ہوتا تھا۔ سیتا مڑھی کے علاقے میں ایک بستی کو حسن پور برہروا کہا جاتا ہے۔ وہاں گاے کی قربانی کی وجہ سے ہندوؤں نے بہت بڑی تعداد میں جمع ہوکر اس وقت مسلمانوں پر حملہ کردیا جب کہ وہ نماز جمعہ پڑھ رہے تھے۔ مسلمان اس حملے سے بالکل بے خبر تھے اور خالی ہاتھ تھے۔ لیکن ہندو چوں کہ ایک منصوبے کے تحت حملہ آور ہوئے تھے، اس لیے ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس تھے۔ مسجد آبادی سے کچھ فاصلے پر تھی اور مسلمان مسجد میں محصور تھے، ان کے لیے مسجد سے باہر نکلنا مشکل تھا۔ لیکن اللہ کی قدرت ملاحظہ ہو کہ ایک دبلا پتلا اور بہ ظاہر کمزور جسم کا مسلمان ہاتھ میں ایک معمولی سی چھڑی لے کر مسجد سے باہر نکلا اور ایک پہلوان قسم کے حملہ آور کی طرف اس تیزی سے بڑھا کہ اس کی تلوار اس کے ہاتھ سے چھین لی اور چند لمحوں میں اس تلوار سے تین ہٹے کٹے حملہ آوروں کو قتل کردیا۔ یہ منظر دیکھ کر حملہ آور بھاگ گئے اور محصور مسلمان مسجد سے باہر آگئے۔ تھوڑی دیر بعد پولیس آئی اور متعدد مسلمانوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ ان پر سیشن کورٹ میں مقدمہ چلا۔ پھر اپیل کلکتہ ہائی کورٹ میں گئی۔ کئی سال کیس چلتا رہا، بالآخر جون ۱۹۱۴ء میں فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوگیا۔ شروع سے لے کر آخر تک اس انتہائی سستے زمانے میں اس مقدمے میں اسی (۸۰) ہزار روپے خرچ ہوئے۔ یہ تمام روپے حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی نے اپنی گرہ سے خرچ کیے۔

اس مقدمے کی پیروی ایک شخص مولوی عبداللہ (سیتا مڑھی) کرتے تھے، لیکن اخراجات کی تمام تر ذمہ داری مولانا رحیم آبادی پر تھی۔ مولانا ممدوح نے اس مقدمے کے سلسلے میں کبھی کسی سے ایک

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے سوانح مولانا رحیم آبادی، ص: ۵۰

پیسا بھی نہیں مانگا۔ اس کے متعلق ایک عجیب واقعہ سنیے جو مولانا فضل الرحمٰن سلفی نے ایک بزرگ حافظ محمد سلیمان کنگئی والے کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ مولوی عبداللہ صاحب صبح سویرے رحیم آباد آئے اور مولانا سے کہا کہ آج مقدمہ کی تاریخ ہے اور خرچ نہیں ہے۔ مولانا نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: اب بتا رہے ہو، پہلے کیوں نہیں بتایا۔ پھر ایک شخص بابو عبداللہ کو حکم دیا کہ ان کو ناشتہ کراؤ۔ جب بابو عبداللہ ان کو ناشتہ کرا چکے تو قلم دان منگوایا اور اسے کھول کر اس میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر مولوی عبداللہ صاحب کو دی۔ بابو عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ ان دنوں مولانا کے پاس پیسے نہیں ہیں اور قلم دان خالی ہے۔ [1] لیکن نوٹوں کی یہ گڈی کہاں سے آئی؟ یہ اللہ ہی جانتا ہے۔

اسی طرح کا ایک معاملہ اسی نواح کے ایک بڑے زمیندار ہندو چودھری نانپور کے سلسلے میں پیش آیا، جس کی اس وقت زمین کی سالانہ آمدنی سوا لاکھ کے قریب تھی۔ اس کے علاقے میں مسلمان بڑی تعداد میں آباد تھے اور وہ ان پر بہت ظلم ڈھاتا تھا۔ مسلمان اس کے خلاف مقدمہ لے کر عدالت میں گئے۔ ایک سال مقدمہ چلتا رہا۔ ایک دولت مند اور علاقے کے بااثر ہندو سے مقابلہ تھا، مالی لحاظ سے مسلمانوں کے لیے یہ پریشان کن صورت حال تھی۔ تنگ آکر مسلمان مقدمہ واپس لینے پر غور کرنے لگے۔ اتفاق سے یہ واقعہ مولانا رحیم آبادی کے علم میں آیا تو انھوں نے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کی اور ہندو ظالم سرمایہ دار کے مقابلے میں خود میدان میں اترے اور آخری عدالت تک مقدمہ لڑا، جس میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا فرمائی۔ اس مقدمے پر مولانا کے پچاس ہزار سے زائدہ روپے خرچ ہوئے۔ [2]

آریہ سماجیوں سے مناظرہ

مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی وسیع العلم، وسیع المطالعہ اور حاضر جواب عالم تھے۔ وہ نہ صرف اسلامی علوم پر عبور رکھتے تھے بلکہ ہندوؤں اور عیسائیوں کے عقائد وافکار سے بھی خوب آگاہ تھے اور وہ لوگ اسلام پر جس طرح کے اعتراضات کرتے تھے، اس کا انھیں علم تھا۔ چناں چہ انھوں نے آریہ سماجیوں سے بعض مسائل میں مناظرے بھی کیے۔ ان کا ایک مناظرہ آج سے ایک سو پانچ سال قبل ۱۶۔ اگست ۱۹۰۳ء کو موضع ''دیوریہ'' میں ہوا۔ یہ تحریری مناظرہ تھا۔ مناظرے کی مطبوعہ روداد سے

---

[1] سوانح مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، ص: ۴۷، ۴۸

[2] تفصیل کے لیے دیکھیے: سوانح مولانا رحیم آبادی، ص: ۱۷۰، ۱۷۱

پتا چلتا ہے کہ مناظرے سے پہلے پورا ایک ہفتہ فریقین کی تقریریں ہوتی رہیں جو اس علاقے کے بے شمار ہندوؤں اور مسلمانوں نے سنیں۔ اس موقعے پر اہل حدیث اور احناف میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ آریہ سماجیوں کے مقابلے میں سب ایک تھے۔ اہل حدیث اور حنفی علمائے کرام کی تعداد چالیس کے پس وپیش تھی۔ آریہ مناظروں کے جوابات مختلف علمائے کرام نے دیئے۔ مولانا رحیم آبادی کے جوابات کا ایک خاص انداز تھا، جس میں انفرادیت کا پہلو نمایاں تھا۔ مناظرے کی روداد کا مرتب اس کا ان الفاظ میں تذکرہ کرتا ہے:

> ''مولوی صاحبان بلاناغہ چار بجے دن سے نو بجے رات تک برابر مضامین علمی واخلاقی سے حاضرین کو بہرہ مند کرتے رہے۔ جناب مولانا شاہ عین الحق صاحب سابق سجادہ نشین پھلواری اور جناب سید المحد ثین مولانا حافظ عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی کا وعظ سب علمائے کرام کے مواعظ سے پُر اثر تھا۔ ان کے وعظ سن کر ہندو اور مسلمان اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔'' [1]

مناظرہ مرشد آباد

متحدہ ہندوستان میں مناظروں کا عام رواج تھا اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی اپنے عہد کے بہت بڑے مناظر تھے۔ احناف کے علما سے ان کے متعدد موضوعات پر مناظرے ہوئے، جن میں ایک مناظرہ بنگال کے شہر مرشد آباد میں آج سے ایک سو پچیس سال قبل ۱۳۰۵ھ (۱۸۸۸ء) ہوا۔ یہ مناظرہ ''وجوبِ تقلید'' کے موضوع پر ہوا تھا جو پانچ روز جاری رہا۔ اس میں عام لوگوں کے علاوہ اہل حدیث اور احناف کے بہت سے علمائے کرام نے شرکت کی تھی۔ احناف کی طرف سے ہر روز مناظر بدلتے رہے، حتی کہ مولانا ہدایت اللہ منطقی جون پوری اور مولانا عبدالحق مصنف تفسیر حقانی جیسے مشہور علمائے احناف بھی میدان مناظرہ میں اترے۔ اہل حدیث علما میں سے مولانا محمد سعید بنارسی اور دیگر جید علما موجود تھے، لیکن مناظر اکیلے مولانا رحیم آبادی تھے جو پانچ روز احناف کے معروف علما کا مقابلہ کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے بنگال میں مولانا رحیم آبادی کے علم وفضل اور فن مناظرہ میں مہارت کی دھوم مچ گئی۔ مناظرے میں مولانا ممدوح نے آیت کریمہ ''فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون'' کی ایسی تفسیر بیان فرمائی جس سے اہل علم نہایت متاثر ہوئے۔ خود حضرت میاں سید نذیر حسین صاحب رحمہ اللہ نے اس پر بے حد مسرت کا اظہار فرمایا۔ [2]

---

[1] مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، ص:۵۱

[2] ارضِ بہار اور مسلمان، ص:۳۵۱

آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس

حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری نے اخبار ''اہل حدیث'' میں کئی دفعہ جماعت کے خواص و عوام کو جماعتی تنظیم کی طرف توجہ دلائی، اور اکتوبر ۱۹۰۶ء کی مختلف اشاعتوں میں بالخصوص اس سلسلے میں علمائے اہل حدیث پر زور دیا کہ وہ اسے منظم کرنے کی سعی کریں۔ بعض علما سے اس موضوع پر زبانی بھی گفتگو کی۔ دسمبر ۱۹۰۶ء میں مدرسہ احمدیہ آرہ کے ''مذاکرہ علمیہ'' کا سالانہ جلسہ منعقد ہونے والا تھا، جس میں ملک کے تمام بڑے بڑے علمائے کرام کی شرکت یقینی تھی۔ چناں چہ پروگرام کے مطابق ۲۲، ۲۳ دسمبر ۱۹۰۶ء کو یہ جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسے میں حسب معمول جماعت کے تمام مشہور علمائے عظام شریک ہوئے۔ اسی موقعے پر باہم مشورے سے ''آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس'' کے نام سے جماعتی تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے صدر حضرت حافظ عبداللہ غازی پوری کو اور ناظم اعلیٰ مولانا ثناء اللہ امرتسری کو منتخب کیا گیا۔ پورے ملک میں اس تنظیم کو متعارف کرانے اور جماعت کے لوگوں کو اس سے وابستگی پر آمادہ کرنے کے لیے ایک تین رکنی وفد بنایا گیا جو حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی پر مشتمل تھا۔

یہ آج سے ایک صدی سے زیادہ عرصہ قبل کی بات ہے۔ اس وقت موجودہ دور کی طرح ملک میں نہ ریل گاڑیوں کی کثرت تھی، نہ سڑکیں تھیں اور نہ موٹریں اور کاریں تھیں۔ لوگ یا تو پیدل سفر کرتے تھے یا بیل گاڑیوں پر کہیں آتے جاتے تھے یا اونٹ ان کا ذریعۂ آمد ورفت تھے۔ اس زمانے میں ان تینوں بزرگوں نے جو گھر سے آسودہ حال تھے، بے شمار شہروں، قصبوں اور دیہات کے سفر کیے، مسجدوں میں گئے، علما سے گفتگو کی، عوام سے رابطے پیدا کیے، لوگوں کو جمع کرکے ان میں تقریریں کیں اور انھیں جماعتی تنظیم کے فوائد سے آگاہ کیا اور بکھری ہوئی جماعت کے افراد کو ایک سلک میں منسلک ہونے کی دعوت دی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو کامیابی عطا فرمائی۔ اس لیے کہ نیت نیک تھی اور مقاصد بلند تھے۔

مذاکرہ علمیہ

ابھی بتایا گیا ہے کہ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا قیام مدرسہ احمدیہ آرہ کے سالانہ ''مذاکرہ علمیہ'' کے انعقاد کے موقعے پر عمل میں آیا۔ سوال یہ ہے کہ ''مذاکرہ علمیہ'' کیا شے ہے؟

اس سوال کا جواب جناب عبدالرقیب حقانی ان الفاظ میں دیتے ہیں:

''مذاکرہ علمیہ ایک قسم کا سالانہ جلسہ تھا جس کو مولانا عبدالعزیز نے قائم کیا تھا اور ہر

سال مختلف مقامات میں ہوا کرتا تھا۔ اس کی نوعیت کانووکیشن کی سی تھی، جس طرح یونیورسٹیاں اپنا کانووکیشن منعقد کرتی ہیں اور فارغ التحصیل طلبا کو سرٹیفکیٹ یا اسناد دیا کرتی ہیں۔ یہ جلسہ مذاکرہ علمیہ بھی اسی نوعیت کی چیز تھی۔ اس میں ہندوستان کے بڑے بڑے علما مدعو کیے جاتے تھے۔ فارغ التحصیل طلبا کی دستار بندی ہوتی تھی اور انھیں اسناد فراغت دی جاتی تھیں۔ جو سب سے بڑا اور مشہور عالم ہوتا تھا، دستار بندی اس کے ہاتھ سے ہوتی تھی۔ وہی فارغ التحصیل طلبا کو خطاب کرتا تھا جس کی نوعیت بعینہٖ کانووکیشن ایڈریس کی ہوا کرتی تھی۔ جب تک مدرسہ احمدیہ آرہ باقی رہا، اس وقت تک یہ جلسہ عظیم بھی ارکانِ مدرسہ کی جانب سے نہایت شان وشوکت کے ساتھ منعقد ہوتا رہا۔ پھر جب اس مدرسے کا باقی رہنا مشکل نظر آنے لگا تو مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی نے اس کو در بھنگا منتقل فرمادیا۔"[1]

مدارس کا قیام

مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی نہایت مہمان نواز اور پیکر سخاوت تھے۔ ایثار وقربانی میں اپنی مثال آپ تھے۔ ان کا دستر خوان مہمانوں کے لیے وسیع تھا اور وہ مہمانوں کی خدمت کرکے بہت خوش ہوتے تھے۔ وہ تہجد گزار اور عالی ہمت عالم تھے۔ تبلیغ کے لیے انھوں نے متعدد مدارس جاری کیے۔ ہندوستان میں مسلک اہل حدیث کی مشہور دینی درس گاہوں مثلاً جامعہ احمدیہ سلفیہ لہریا سرائے در بھنگا، مدرسہ اسلامیہ گھوگھر، مدرسہ عربیہ مدھوبنی اور مدرسہ اصلاح المسلمین پٹنہ (قائم شدہ ۱۳۰۸ھ) کی تاسیس مولانا ممدوح کے مبارک ہاتھوں سے عمل میں آئی۔ اس کے علاوہ مدرسہ محمدیہ محمد پور کواری، (ضلع در بھنگا) کے بانیوں میں بھی مولانا شامل تھے۔ مولانا کی علمی فضیلت قابل تعریف تھی۔ مولانا رحیم آبادی نے اشاعت دین اور تبلیغ کے ذریعے تحریک اصلاحِ تجدید کی آب یاری کی اور پورے ہندوستان کو اپنی تگ وتاز کا مرکز بنایا۔[2]

خطابت

مولانا رحیم آبادی جہاں بہت بڑے مدرس، محقق، محدث، مناظر اور مجاہد فی سبیل اللہ تھے، وہاں بہت بڑے خطیب اور مقرر بھی تھے۔ تقسیم ہند سے قبل آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے ملک

---

[1] ارض بہار اور مسلمان، ص: ۳۵۳

[2] ایضاً، ص: ۳۵۳، ۳۵۴

کے مختلف شہروں میں چوبیس سالانہ جلسے ہوئے۔ ان میں سے چار جلسوں کی صدارت کا اعزاز مولانا ممدوح کو حاصل ہوا، اور وہ جلسے مندرجہ ذیل تھے:

① ...... امرتسر: دوسرا سالانہ جلسہ — منعقدہ ۱۴، ۱۵، ۱۶ مارچ ۱۹۱۳ء

② ...... علی گڑھ: چوتھا سالانہ جلسہ — منعقدہ ۱۳، ۱۴، ۱۵ مارچ ۱۹۱۵ء

③ ...... بنارس: پانچواں سالانہ جلسہ — منعقدہ ۲۵، ۲۶، ۲۷ فروری ۱۹۱۶ء

④ ...... کلکتہ: چھٹا سالانہ جلسہ — منعقدہ ۷، ۸، ۹ مارچ ۱۹۱۷ء

بنارس کے جلسے میں اہل حدیث کے علاوہ بے شمار احناف بھی سامعین میں موجود تھے، جن میں احناف کے جید علما بھی تھے۔ مولانا رحیم آبادی کی تقریر اس درجہ پر اثر اور مدلل تھی کہ علماے احناف پکار اٹھے کہ یہ شخص اس عہد کا امام غزالی ہے۔

اب قدرے تفصیل سے کانفرنس کے جلسہ منعقدہ پشاور کے متعلق چند باتیں سنیے۔ یہ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا تیسرا سالانہ جلسہ تھا جو خان بہادر ارباب عبدالرؤف خاں (رئیس پشاور) کے زیر صدارت ۲۷، ۲۸، ۲۹ مارچ ۱۹۱۴ء (مطابق ۲۹، ۳۰، ربیع الثانی و یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۳۲ھ) کو ہوا تھا۔ یہ سطور ۸۔ جنوری ۲۰۰۷ء (مطابق ۱۷ ذوالحجہ ۱۴۲۷ھ) کو لکھی جارہی ہیں۔ اس اعتبار سے اس جلسے کے انعقاد پر عیسوی تاریخ کے حساب سے ۹۳ سال اور قمری حساب سے ۹۶ برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے یعنی پانچ سال کم ایک صدی۔ اس طویل مدت میں دنیا بدل گئی اور کہیں سے کہیں چلی گئی۔ کم سے کم تین پرانی نسلیں ختم ہوگئیں اور تین نئی نسلوں نے ان کی جگہ لے لی۔ اس وقت صوبہ سرحد کے پٹھان دینی تعلیم سے زیادہ شناسائی نہیں رکھتے تھے اور وہابیوں کے سخت مخالف تھے۔ اس پورے علاقے میں شاید گنتی کے چند اہل حدیث ہوں گے، ان میں بھی غالباً کوئی بڑا اور با اثر عالم دین نہ ہوگا۔ اُس وقت وہاں اہل حدیث کے جلسے کا انعقاد بہت مشکل کام تھا۔ چناں چہ جلسے کا اعلان ہوتے ہی حدیث وسنت سے زیادہ نا آشنا پٹھانوں نے ہنگامہ بپا کردیا اور اپنے طور پر تہیہ کرلیا کہ وہابیوں کا جلسہ نہیں ہونے دیں گے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ ان دنوں حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی بیمار تھے اور ان کا پروگرام جلسے میں تشریف لانے کا نہیں تھا۔

آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے ناظم اعلیٰ مولانا ثناء اللہ امرتسری تھے اور جلسے کے منتظمین ان کی ہدایات کے مطابق کام کررہے تھے، لیکن جب ان حضرات کو مقامی طور سے پٹھانوں کی شدید مخالفت اور ہنگامہ آرائی کا پتا چلا تو یہ انتہائی پریشان ہوئے۔ اب فیصلہ کیا گیا کہ حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کو ہر صورت میں پشاور بلایا جائے۔ چناں چہ مولانا کو تمام صورتِ حال سے مطلع کیا گیا اور یہاں تشریف لانے کی درخواست کی گئی۔ ناسازیٔ طبع کے باوجود جماعتی خدمت کی

پٹنا پر صوبہ بہار سے طویل سفر کر کے مولانا رحیم آبادی پشاور تشریف لائے۔ جلسے کا آغاز خطبہ جمعہ سے ہونا تھا اور یہ فریضہ خود مولانا ہی کو انجام دینا تھا۔ بہت بڑا مجمع تھا اور مخالفین کثیر تعداد میں موجود تھے۔ مولانا منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ خطبہ مسنونہ پڑھا۔ اس کے بعد قرآن کی چند آیات تلاوت کیں اور پٹھانوں کو مخاطب کر کے فرمایا میں بیمار ہوں اور سیکڑوں میل کا لمبا سفر طے کر کے آپ کی خدمت میں خدا کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ آپ اطمینان سے میری باتیں سنیں۔ اگر آپ کو یہ باتیں پسند آئیں تو مجھے بہت خوشی ہوگی اور پسند نہ آئیں تو آپ کہہ دیں کہ جلسہ نہیں ہونا چاہیے تو جلسہ نہیں ہوگا۔ مولانا کی یہ بات سن کر ہنگامہ آرائی کرنے والے خاموش ہوگئے۔ پھر مولانا نے تقریر شروع کی اور قرآن کی آیات پڑھ کر ان کے مطالب بیان کرنے لگے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سامعین پر جادو کر دیا گیا ہے۔ مولانا تقریر کر رہے تھے اور وہ لوگ شدت تاثر سے رو رہے تھے۔ وہ تمام مخالفت ختم ہو چکی تھی جو ہفتوں اور مہینوں سے پورے زور کے ساتھ ہو رہی تھی۔

دوسرے دن ہفتہ تھا۔ وقت مقررہ پر لوگ جلسہ سننے کے لیے آئے۔ مخالفین بھی آئے، لیکن مولانا بیماری کی وجہ سے تشریف نہیں لائے تھے، وہ اپنی قیام گاہ پر ہی رہے۔ تقریروں کے پروگرام میں بھی ان کا نام نہیں لکھا گیا تھا۔ اب وہی مخالف لوگ پھر بھڑک اٹھے اور شور مچایا کہ کل والے بوڑھے مولوی صاحب آئیں گے اور تقریر کریں گے تو ہم جلسہ ہونے دیں گے، ورنہ جلسہ نہیں ہو سکے گا۔ انھیں ہر چند سمجھایا گیا کہ وہ بیمار ہیں اور ان کا آنا اور تقریر کرنا مشکل ہے، لیکن وہ نہیں مانے۔ انھوں نے کہا کہ اگر وہ پیدل نہیں آسکتے تو ہم انھیں کندھوں پر اٹھا کر لائیں گے اور ان کی تقریر سنیں گے۔

مولانا کو منتظمین نے یہ باتیں بتائیں تو وہ دوا کھا کر جلسہ گاہ میں تشریف لائے اور لوگوں سے اپنی بیماری کا ذکر بھی کیا اور تقریر بھی کی، جس سے سامعین بے حد متاثر ہوئے۔

اس نواح میں غالباً یہ اہل حدیث کا پہلا جلسہ عام تھا، جس میں ملک کے بہت سے جلیل القدر علمائے کرام تشریف لائے تھے۔ اب تو ماشاء اللہ صوبہ سرحد کے بلاد وقصبات اور دیہات میں اہل حدیث کے بہت سے علمائے کرام موجود ہیں اور ان کے باقاعدہ مدارس قائم ہیں۔ بے شمار مسجدیں ہیں اور لوگ ان کی باتیں سنتے اور متاثر ہوتے ہیں۔ اہل حدیث کے رسائل وجرائد بھی صوبہ سرحد سے شائع ہو رہے ہیں، جن میں مسلک اہل حدیث کی وضاحت کی جاتی ہے۔

درگا پوجا اور تعزیہ کا جلوس

مولانا رحیم آبادی جماعت اہل حدیث کے قائد کی حیثیت سے تمام معاملات میں اپنی جماعت

کے مفادات کو ترجیح دیتے تھے اور یہ ایک فطرتی بات تھی۔ لیکن جب مسئلہ مسلمان اور غیر مسلمان کا سامنے آجاتا تو وہ ہر صورت میں مسلمان کی حمایت کرتے تھے۔ وہ ذاتی اور خاندانی اعتبار سے اپنے علاقے کی ایک اہم شخصیت تھے۔ اللہ نے ان کو اس دور کے معاشرے میں بڑا اعزاز بخشا تھا اور وہ علمی وسیاسی اور قومی مسائل کے حل وکشود کے سلسلے میں مرجع عوام تھے۔ اور عوام کے اعتماد پر پورا اترتے تھے۔ ۱۹۱۱ء کی بات ہے کہ ۱۰۔ محرم کو تعزیہ کا جلوس اور ہندوؤں کے تہوار ''درگا پوجا'' کا جلوس اتفاق سے دونوں ایک دن میں آگئے۔ موضع تاج پور میں اس مسئلے نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان زبردست تناؤ کی شکل اختیار کرلی۔ شیعہ کہتے تھے کہ ۱۰۔ محرم کو ہم ضرور جلوس نکالیں گے۔ یہ ہمارا مذہبی اعتبار سے مقرر دن ہے۔ ہندوؤں کو اصرار تھا کہ درگا پوجا ہمارے دھرم کا معاملہ ہے، ہمارا جلوس وقت مقررہ پر ضرور نکلے گا۔ اب ظاہر ہے دونوں مذاہب کے جلوس ایک ہجوم کے ساتھ گلیوں میں آئیں گے تو فساد کا خطرہ پیدا ہوگا۔ یہ نہایت نازک مسئلہ اور فریقین کے لیے خالص مذہبی معاملہ تھا اور پریشانی کا باعث......! ضلعی حکام کو پتا چلا تو وہ بھی تاج پور پہنچ گئے۔

اب ضلعی حکام کی تجویز سے فریقین کے بیانات لینے کے بعد طے یہ ہوا کہ مسلمان ہندوؤں میں سے اور ہندو مسلمانوں میں سے ایک ایک ثالث منتخب کریں اور یہ دونوں ثالث جو فیصلہ کریں، فریقین اس فیصلے کو تسلیم کرلیں۔

ہندوؤں کو معلوم تھا کہ مولانا عبدالعزیز تعزیے کے مخالف ہیں، اس لیے انھوں نے مولانا کو اپنا ثالث منتخب کرلیا۔ ضلع کے حاکم اعلیٰ نے مولانا سے تنہائی میں بات کی تو انھوں نے حاکم سے فرمایا آپ جو فیصلہ کرنا چاہتے ہیں خود ہی کریں، ثالثوں کے ذریعے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ ساتھ ہی اسے رائے دی کہ تعزیے کا جلوس نکلنا چاہیے۔ چناں چہ حاکم ضلع نے یہی فیصلہ کردیا جو مولانا چاہتے تھے۔

جب لوگوں کو مولانا کی رائے کا علم ہوا تو ان میں سے بعض حضرات نے مولانا سے کہا کہ آپ تو تعزیے کے جلوس کو خلاف شرع قرار دیتے ہیں، آپ نے اس موقعے پر شیعہ حضرات کی حمایت کیوں کی؟ مولانا نے جواب دیا: میں تعزیے کا سخت مخالف ہو اور اس جلوس کو غیر شرعی قرار دیتا ہوں، لیکن اس معاملے کی حیثیت دوسری ہے۔ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اسم گرامی کے مقابلے میں کالی ماتا اور درگا کا نام بلند ہونے کو ہرگز ترجیح نہیں دے سکتا۔ [1]

---

[1] مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی۔ حیات اور خدمات، ص: ۱۱۶، ۱۱۷

دربھنگا میں فساد کا خطرہ

ہندو مسلم فساد کا خطرہ مولانا رحیم آبادی کے زمانے میں اس علاقے میں کئی دفعہ ابھرا، لیکن ہر دفعہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہر قسم کی گزند سے محفوظ رکھا۔ مولانا ممدوح کی وفات سے چند ماہ پہلے ۱۹۱۷ء میں شہر آرہ ہولناک فساد کی زد میں آ گیا۔ اس وقت اچانک بڑے خوف ناک حالات پیدا ہوگئے تھے۔ ہندو بھی مسلمانوں کے خلاف پوری طرح مسلح ہوکر میدان میں نکل آئے تھے اور انگریزی حکومت بھی لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل پیرا تھی۔ اس وقت بھی بیماری کے باوجود مولانا ممدوح نے اپنا فرض ادا کیا اور مسلمانوں کی امداد کے لیے کمربستہ ہوئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو پیچھے ہٹ گئے اور خطرات کے بادل چھٹ گئے۔

انہی دنوں دربھنگا شہر میں مسلمانوں پر ہندوؤں کے حملے کی افواہ پھیل گئی اور فضا پر خوف وہراس کے بادل تن گئے۔ مسلمانوں نے منظم ہوکر ایک اجلاس کا اہتمام کیا۔ مولانا بیمار بھی تھے اور انتہائی کمزور بھی تھے۔ اجلاس میں تقریر کے لیے علاقے کے مسلمانوں کا کوئی لیڈر سامنے نہ آیا۔ بالآخر کسی نہ کسی طرح مولانا ممدوح ہی سٹیج پر آئے اور تقریر شروع کی تو اللہ نے مدد فرمائی اور دو گھنٹے نہایت جوش مگر توازن کے ساتھ خطاب کیا جس کی وجہ سے مسلمانوں میں حوصلہ پیدا ہوا اور فساد کی فضا ختم ہوگئی۔

اسی طرح اور بھی متعدد مقامات میں خدشات ابھرے اور مولانا کی کوشش سے حالات نے اعتدال کی صورت اختیار کر لی۔

جماعت مجاہدین کی امداد

مولانا رحیم آبادی کا اس جماعت مجاہدین سے بھی گہرا تعلق تھا جو برصغیر کی آزادی اور اس خطہ ارض میں اسلامی نظامِ حکومت کی تنفیذ کے لیے سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید نے قائم کی تھی۔ یہ اپنی نوعیت کی برصغیر میں اولیں جماعت تھی، جس نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے آزاد قبائل میں جاکر باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کی۔ ابتدا میں اس کی ٹکر پنجاب کی سکھ حکومت سے ہوئی، جس کی باگ ڈور رنجیت سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ بہت سی لڑائیوں کے بعد سید احمد اور مولانا اسماعیل دہلوی ۶۔ مئی ۱۸۳۱ء کو اپنے سیکڑوں مجاہدوں کے ساتھ بالاکوٹ کے میدان میں جامِ شہادت نوش کر گئے تو بقیۃ السیف حضرات نے از سرِ نو اس جماعت کی تنظیم کی اور پھر باقاعدہ طور سے اس جماعت نے اپنی جہادی سرگرمیوں کا رخ ہندوستان کی انگریزی حکومت کی طرف پھیر دیا۔

یہ ایک طویل کہانی ہے جو بہت سے دردناک واقعات پر محیط ہے۔ اس کی تفصیلات اس موضوع کی انگریزی اور اردو کتابوں میں مندرج ہیں۔ خود انگریز مصنفین نے اس سلسلے کے واقعات کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اردو میں جن اصحابِ قلم نے جماعت مجاہدین کی تاریخ مرتب کی ہے، ان میں مولانا غلام رسول مہر کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے اس موضوع کی تمام جزئیات نہایت صراحت سے اپنی ضخیم تصانیف ① سید احمد شہید، ② جماعت مجاہدین اور ③ سرگزشت مجاہدین میں قلم بند کردی ہیں۔ اس موضوع کی یہ بے مثال محققانہ کتابیں ہیں، جن کا مطالعہ ہر اس شخص کو کرنا چاہیے جو اس موضوع سے دلچسپی رکھتا اور اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا خواہاں ہو۔

اسی جماعت مجاہدین سے مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کا تعلق تھا بلکہ وہ اپنے علاقے میں اس جماعت کے امیر تھے۔ انھوں نے اس علاقے میں باقاعدہ جماعتی نظم قائم کیا اور عشر وزکوٰۃ وغیرہ کی جو رقم وصول ہوتی، وہ مولانا کے ذریعے سرحد پار کی جماعت مجاہدین کو بھیجی جاتی تھی۔

سرحد پار کی مرکزی جماعت مجاہدین کے امیر اور سرکردہ حضرات کو جب مولانا رحیم آبادی کی مستعدی اور ان کے حلقہ معتقدین کی وسعت کا پتا چلا تو انھوں نے براہِ راست امدادی رقوم کی فراہمی کی ذمہ داری مولانا کو سونپ دی۔ اس زمانے میں یہ بے حد نازک اور خطرناک کام تھا جو ان کے سپرد کیا گیا تھا لیکن اس مردِ حق شناس نے اس خطرناک مرحلے کو طے کرنے کا فیصلہ کرلیا، جس پر وہ عمر کے آخری لمحے تک قائم رہے۔ حکومت برطانیہ کی خفیہ پولیس ان کی ہر حرکت پر نگاہ رکھتی اور سخت نگرانی کرتی تھی اور اس کی رپورٹیں اعلیٰ حکام کو پہنچائی جاتی تھیں۔

زندگی کے آخری دور میں یعنی وفات سے چند ماہ قبل دربھنگا کے انگریز کلکٹر نے مولانا کو طلب کیا اور ایک تحریر پیش کی کہ آپ اس پر دستخط کردیں تو حکومت ان تمام رپورٹوں کو ختم کردے گی جو آپ کے متعلق تیار کی گئی ہیں۔ ہم لوگ آپ کی خلافِ حکومت سرگرمیوں کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ اس تحریر کا مفاد یہ تھا کہ جو الزامات مجھ پر لگائے جاتے ہیں، وہ غلط ہیں۔

یہ تحریر دیکھ کر اور انگریز کلکٹر کی بات سن کر مولانا نے فرمایا: آپ اہل کتاب ہیں اور میری عمر کے سن وسال بھی آپ کے سامنے ہیں۔ ظاہر حالات کے مطابق اب میں اس دنیا میں چند روز کا مہمان ہوں۔ خدا سے ملنے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ اس تحریر پر دستخط کرا کے آپ مجھے کیوں گنہگار کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو ایک اہل دین ہونے کی وجہ سے میرے دین کا بھی خیال کرنا چاہیے۔

مولانا کے یہ الفاظ سن کر کلکٹر صاحب خاموش ہوگئے اور مولانا واپس تشریف لے آئے، لیکن خفیہ پولیس نے اپنا سلسلۂ کار جاری رکھا۔ یہاں تک کہ وفات سے قبل گرفتاری کا وارنٹ جاری

ہوگیا۔ کسی نے اس کا ذکر کیا تو فرمایا اس وارنٹ کا کیا ہے، اب تو اصلی وارنٹ جاری ہوگیا ہے۔

خفیہ پولیس کا ایک افسر مولانا کا معتقد تھا۔ وہ ان کے ایامِ مرض میں دوسرے تیسرے دن ان کے گھر آتا اور انھیں دیکھ جاتا تھا۔ بالآخر اسی حالت میں مولانا وفات پا گئے۔

مولانا کی وفات کے بعد بھی مجاہدین کی امداد کا سلسلہ باقاعدہ چلتا رہا۔ اس کا انتظام ان کے عقیدت مندوں اور شاگردوں (حافظ عبداللہ اور بابو عبداللہ وغیرہ) نے سنبھال لیا تھا۔ کچھ عرصے بعد ڈاکٹر سید محمد فرید صاحب نے اس خدمت کی ذمہ داری قبول کرلی۔ ان کی دعوت پر پٹنہ سے مولانا عبدالخبیر صاحب دارالعلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگا تشریف لائے، وہاں شہر اور اس کے قرب وجوار کے بہت سے لوگ حاضر ہوئے اور انھوں نے مولانا عبدالخبیر کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ❶

مولانا غلام رسول مہر کی ایک تحریر

حافظ عنایت اللہ اثری مشہور عالم دین تھے جو جماعت مجاہدین سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا اصل مسکن وزیر آباد ضلع گوجراں والا تھا۔ حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے شاگرد تھے۔ بہت سی عربی اور اردو کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کے بعض افکار سے اہل حدیث علمائے کرام نے اختلاف کا اظہار بھی کیا ہے۔ وزیر آباد سے وہ گجرات چلے گئے تھے اور وہاں کی جامع مسجد اہل حدیث کے خطیب مقرر کرلیے گئے تھے۔ جماعت مجاہدین سے وابستگی کے نتیجے میں انگریزی حکومت نے ان کو بے حد اذیتوں سے دوچار کیا۔ انھوں نے ۱۰۔ اور ۱۱۔ مئی ۱۹۸۰ء کی درمیانی شب کو گجرات میں وفات پائی۔ ان کے ضمن میں مولانا غلام رسول مہر نے اپنی تصنیف ''سرگزشت مجاہدین'' میں حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس وقت حافظ عنایت اللہ اثری زندہ تھے۔ مہر صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''حافظ عنایت اللہ وزیر آباد کے رہنے والے اور حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے شاگرد ہیں۔ غالباً ۱۹۱۳ء سے جماعت مجاہدین کے ساتھ ان کی وابستگی کا آغاز ہوا۔ مارچ ۱۹۱۳ء میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا اجلاس بہ مقام امرتسر منعقد ہوا تھا۔ اس میں مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی بھی تشریف لائے۔ ❷ اجلاس کے بعد وزیر آباد کو بھی اپنے قدوم سے مشرف فرمایا۔ حافظ عنایت اللہ اس زمانے میں حافظ عبدالمنان سے پڑھتے بھی تھے اور اپنی دکان پر درزی کا کام بھی کرتے تھے۔ مولانا رحیم آبادی نے بھی کچھ کام دیا، وہ پورا کردیا تو مولانا رحیم آبادی بہت خوش ہوئے۔ دہلی پہنچ

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے: مولانا عبدالعزیز۔ حیات اور خدمات، ص: ۶۰ تا ۶۲

❷ گزشتہ صفحات میں بتایا جاچکا ہے کہ یہ اجلاس ۱۴، ۱۵، ۱۶ مارچ ۱۹۱۳ء کو مولانا رحیم آبادی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔

کر تار کے ذریعے سے بلایا۔ تعلیم کے لیے حافظ عبداللہ غازی پوری کے سپرد کیا جو مدرسہ ریاض العلوم میں پڑھاتے تھے اور میرزا ولی اللہ بیگ سے فرمایا کہ عنایت اللہ کو بنوٹ سکھا دیجیے۔

''مولانا رحیم آبادی جب دہلی تشریف لاتے تو شیخ عطاء الرحمٰن اور شیخ عبدالرحمٰن کے ہاں پھاٹک حبش خاں میں قیام فرماتے۔ جمعہ پڑھاتے تو خطبے میں سورۂ قٓ اول سے آخر تک پڑھتے اور مختصر سی تقریر بھی فرماتے۔

''پھر وہ اور حافظ عبداللہ غازی پوری اور دوسرے علما وروٗسائے دہلی اوکھلا میں جمع ہوتے۔ وہاں بنوٹ کے کرتب دکھائے جاتے، جنھیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ انھیں اور حافظ عبداللہ غازی پوری کو مجاہدین سے بڑی الفت تھی اور جہاد کا بہت شوق تھا۔ اسی خیال سے وہ موزوں جوانوں کو منتخب کر کے ان کے لیے سپاہیانہ فنون کے سیکھنے کا انتظام فرمایا کرتے تھے۔ گھر سے آسودہ حال تھے۔ ہزاروں روپے جماعتی کاموں میں خرچ کیے۔ مولانا شبلی کی سیرۃ النعمان پر جو انتقاد انھوں نے ''حسن البیان'' کے نام سے شائع کیا، اس کا جواب آج تک کوئی نہ دے سکا۔''[1]

مولانا محمد اسماعیل سلفی کے چند ارشادات

حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کی محققانہ تصنیف ''حسن البیان فیما فی سیرۃ النعمان'' جو مولانا شبلی کی کتاب ''سیرۃ النعمان'' کے جواب میں معرضِ اشاعت میں آئی تھی، اس کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۶۶ء میں اہل حدیث اکادمی لاہور نے شائع کیا۔ اس پر طویل مقدمہ جو ۳۹ صفحات میں پھیلا ہوا ہے حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم نے لکھا۔ مقدمہ بہت سے علمی فوائد کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کے آخر کی چند سطریں ذیل میں درج کی جاتی ہیں جن کا تعلق مولانا رحیم آبادی کے سیاسی رجحانات، انگریز دشمنی اور جماعت مجاہدین کی مالی اعانت سے ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

''مولانا رحیم آبادی کے حقیقت پسند مزاج نے محسوس فرمایا کہ مذہبی، فقہی اور فرقہ وارانہ منازعات کی اصل علت ہندوستان میں انگریز کی بالادستی ہے۔ جب تک یہ دیو ملک میں کار فرما ہے، ملک میں امن ممکن نہیں۔ اس ضمن میں مولانا کے دو پروگرام تھے، سیاسی اور تبلیغی۔ سیاسی پروگرام پر عمل کے دو طریقے تھے۔ اول تحریک مجاہدین کی سرپرستی جو اس وقت انگریز کے مظالم کی وجہ سے انڈر گراوٗنڈ ہو چکی تھی، اکابر دیوبند اس سے تعلق توڑ چکے تھے، اکابر پٹنہ اپنی زندگیاں اس راہ میں وقف کر چکے تھے اور لاکھوں روپے مولانا رحیم آبادی مرحوم کی وساطت سے تحریک کو ملتے تھے۔ مرحوم

[1] سرگزشت مجاہدین، صفحہ: ۶۴۳، ۶۴۴

خود بڑے دولت مند اور بڑے زمیندار تھے۔ ان کا تعلق کھاتے پیتے خاندان سے تھا۔ واجبی ضروریات کے بعد پوری آمدنی تحریک مجاہدین میں صرف فرمادیتے تھے۔ مرحوم کے یہ خیالات تحریک عدم تعاون سے برسوں پہلے تھے۔

''دوسرا طریقہ انگریزی مال کے بائی کاٹ کا تھا۔ خود مولانا مرحوم گاڑھا کھدر گھر کا بنا ہوا پہنتے۔ سردیوں میں کشمیری شال استعمال فرماتے۔ قلم سے لکھتے۔ نب اور انگریزی قلم کا استعمال سخت ناپسند فرماتے۔ مولانا ثناء اللہ مرحوم تبلیغی امور میں ان کے شریک کار تھے۔ مولانا نے تبلیغ کے لیے آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کی تاسیس کی اور مدرسہ احمدیہ سلفیہ آرہ (بہار) کی سرپرستی فرمائی۔ ساتھ ہی انگریز کے خلاف جہاد کا محاذ بھی برابر کھولے رکھا۔

''مولانا کے مزاج میں عجیب تنوع تھا۔ ایک طرف وہ ان حضرات کے ساتھ اہل حدیث کانفرنس کے سٹیج پر کام کرتے، دوسری طرف مولانا فضل الٰہی وزیرآبادی ؒ، صوفی ولی محمد مرحوم فتوحی والا، اکبر شاہ آف ستھانہ، مولوی الٰہی بخش بمباں والا، قاضی عبدالرحیم صاحب، قاضی عبید اللہ اور قاضی عبدالرؤف (قاضی کوٹ) اور مولانا عبدالقادر قصوری کے ساتھ جماعت مجاہدین کا کام کرتے تھے، اور یہ کام اس رازداری اور خوب صورتی سے ہوتا تھا کہ انگریز کی عقابی نگاہیں برسوں اس کا سراغ نہ لگا سکیں۔ معلوم نہیں یہ اطلاع کہاں تک درست ہے کہ مرحوم کی گرفتاری کے احکام اس دن پہنچے، جب مرحوم اپنی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو کر جنت کے دروازے پر پہنچ کر داخلے کی اجازت کے لیے دستک دے رہے تھے اور **طبتم فادخلوها خالدین** کی آواز کے منتظر تھے۔ پولیس جنازہ دیکھ کر واپس آئی۔ **اللهم اغفرله وارحمه وادخله الجنة**، آمین

''میں نے مولانا مرحوم کو پہلی دفعہ وزیرآباد میں دیکھا۔ جمعے کے دن مولانا فضل الٰہی صاحب کے ہاں کھانا تناول فرما کر مسجد اہل حدیث میں آئے۔ مرحوم حضرت الاستاذ الامام مولانا الشیخ حافظ عبدالمنان صاحب نے منبر خالی فرمادیا۔ میری عمر غالباً اس وقت دس گیارہ سال ہوگی۔ وعظ میں عجیب رقت تھی۔ غالباً وعظ اخلاص فی العمل کے موضوع پر تھا۔ میں صغر سنی کے باوجود انتہائی رقت محسوس کررہا تھا اور پورے مجمعے پر یہی کیفیت طاری تھی۔

''اس کے بعد مولانا کئی دفعہ تشریف لاتے رہے، زیارت ہوتی رہی، لیکن بچپن کی وجہ سے استفادے کی جرأت نہ ہوسکی۔ **وکان امر الله قدراً مقدوراً**

''پھر میں ۱۶۔۱۹۱۷ء میں حصول تعلیم کے لیے دہلی آیا۔ وہاں بھی زیارت کا موقع ملتا رہا۔ عموماً مجلس میں خاموشی ہوتی۔ یہ مبارک مجلس گلہ اور قہقہہ دونوں سے خالی ہوتی۔ آخری زیارت علی

گڑھ اہل حدیث کانفرنس کے اجلاس میں ہوئی۔ [1]

”مدراس کانفرنس میں غالباً کسی نے یہ شعر پڑھا:

کیا خوب ہوتا وہ بھی گر آج زندہ ہوتے

عبد العزیز نامی حسن البیان والے

(شعر سن کر) پوری مجلس اشک بار ہوگئی۔ حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم اکثر یہ شعر پڑھتے اور آنکھیں برسنے لگتیں۔ مرحوم کو مولانا رحیم آبادی سے والہانہ محبت تھی اور وہ ان کی رفاقت پر ہمیشہ فخر فرماتے تھے۔ آہ! یہ مقدس گروہ منهم من قضى نحبه ومنهم من ينتظر وما بدلوا تبديلا کے تحت خدائی قانون کے مطابق اپنی وفاداریاں نباہ کر اللہ کو پیارے ہوگئے۔“ [2]

وضع داری

مولانا رحیم آبادی نہایت وضع دار عالم دین تھے۔ ہر مذہب و مسلک کے علما کا احترام کرتے تھے اور گفتگو میں نہایت محتاط تھے۔ مسائل میں اختلاف کو وہیں تک محدود رکھتے تھے۔ معاشرتی زندگی

---

[1] یہاں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی سے سبقت قلم ہوگیا ہے۔ علی گڑھ کا اجلاس آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا چوتھا اجلاس تھا، جس کے صدر حضرت مولانا رحیم آبادی تھے اور یہ اجلاس ۱۳، ۱۴، ۱۵ مارچ ۱۹۱۵ء کو ہوا تھا، جب کہ مولانا سلفی نے اوپر کی سطر میں تحریر فرمایا ہے کہ وہ ۱۶۔ ۱۹۱۷ء میں حصول تعلیم کے لیے دہلی گئے تو مولانا کی زیارت کا موقع ملتا رہا۔ اس حساب سے آخری زیارت علی گڑھ کے اجلاس میں نہیں ہوسکتی، کسی اور اجلاس میں ہوئی ہوگی۔

[2] مقدمہ حسن البیان فیما فی سیرۃ النعمان۔ مطبوعہ ۱۹۶۱ء۔ ۱۳۸۵ھ۔ اہل حدیث اکادمی۔ لاہور، ص: ۳۷ تا ۳۹

مدراس کا جلسہ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا ساتواں سالانہ جلسہ تھا جو مولانا رحیم آبادی کی وفات سے ڈھائی مہینے بعد ۳، ۴، ۵ مئی ۱۹۱۸ء کو حضرت حافظ عبداللہ غازی پوری کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں ایک مدراسی لڑکے عبدالعزیز نے جو نظم پڑھی تھی، اس کے تین شعر مندرجہ ذیل ہیں۔ شعر سن کر لوگوں کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی تھی۔ مولانا کی وفات کا صدمہ تازہ تھا اور لوگ بہت مغموم تھے۔

شکر خدا کہ جمع ہیں ہندوستان والے — علمائے خیر امت شیریں زبان والے

جن کے مشاہدہ کو آنکھیں ترس رہی تھیں — لو دیکھ لو عزیزو! عز و شان والے

کیا خوب ہوتا وہ بھی گر آج زندہ ہوتے — عبدالعزیز نامی حسن البیان والے

اسی مدراس کے جلسے میں مولوی محمد حسن صاحب کے بیٹے نے ایک فارسی نظم پڑھی تھی، جس کا ایک مصرع یہ تھا۔ چہ خوش بودے اگر عبدالعزیز ایں جلوہ می دیدے

اس پر بھی لوگ تڑپ اٹھے تھے۔ [سوانح مولانا رحیم آبادی، ص: ۱۳۶]

میں بگاڑ نہیں پیدا ہونے دیتے تھے۔ تفسیر حقانی کے مصنف مولانا عبدالحق صاحب ان کے ہم درس رہ چکے تھے اور ان سے مرشد آباد میں وجوبِ تقلید کے موضوع پر مناظرہ بھی کیا تھا۔ لیکن مولانا ان کو پرانے دوست کے الفاظ سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ [1]

مدرسہ رحمانیہ دہلی

برصغیر میں قیام مدارس کے سلسلے میں جماعت اہل حدیث کے خواص وعوام ہمیشہ سرگرم رہے۔ ان کی کوششوں سے بے شمار شہروں اور قصبوں میں دینی مدارس جاری ہوئے اور مشہور علما نے وہاں تدریس کے سلسلے شروع کیے۔ دیہات میں بھی لاتعداد درس گاہوں کا قیام عمل میں آیا، جن میں قال اللہ وقال الرسول کی دل نواز صدائیں بلند ہوئیں اور اللہ کے فضل سے اب بھی بلند ہو رہی ہیں اور ان شاء اللہ بلند ہوتی رہیں گی۔

دہلی کو اس باب میں بے شبہ مرکزیت حاصل رہی ہے۔ یہ شہر ہر زمانے میں جلیل القدر علما کا محور اور فقید المثال مدرسین کا مسکن رہا ہے۔ پرانی تاریخ کو جانے دیجیے، بیسویں صدی عیسوی میں اس شہر میں جن دینی مدارس کا اجرا ہوا، ان میں مدرسہ رحمانیہ اپنی بہت سی خصوصیات کے اعتبار سے بے حد اہمیت رکھتا تھا۔ اس مدرسے کے قیام کے اولین مجوز حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی تھے اور اس کے بانی تھے دہلی کے دو مخیّر بھائی شیخ عبدالرحمٰن اور عطاء الرحمٰن۔ حضرت مولانا رحیم آبادی کی دہلی میں آمد ورفت رہتی تھی۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں وضاحت ہو چکی، مولانا ممدوح جہاں جید عالم دین تھے، وہاں اچھے خاصے زمیندار اور دولت مند بھی تھے۔ پھر اللہ کی راہ میں مال ودولت خرچ کرنے کا جذبہ صادقہ بھی رکھتے تھے۔ ان کے ان اوصاف کی وجہ سے لوگ ان سے بہت متاثر تھے اور ان کی بات مانتے تھے۔ شیخ عبدالرحمٰن اور عطاء الرحمٰن تو خاص طور سے ان کے عقیدت مند تھے اور انھیں انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

ایک مرتبہ مولانا رحیم آبادی کی دہلی تشریف آوری ہوئی۔ شیخ عبدالرحمٰن اور عطاء الرحمٰن کے ہاں قیام تھا۔ اس وقت ان کی کسی خاتون کو کوئی تکلیف تھی جس کے متعلق خیال ہوا کہ یہ جناتی اثر ہے۔ مولانا کی خدمت میں عرض کیا گیا تو انھوں نے تعویذ دے دیا اور مریضہ صحت یاب ہوگئیں۔

اسی اثنا میں یہ حادثہ پیش آیا کہ شیخ صاحبان کا بھانجا گم ہوگیا۔ اسے بہت تلاش کیا گیا اور تلاش پر بڑی رقم بھی خرچ ہوئی، لیکن اس کا پتا نہ چل سکا۔ ایک دن کسی نے اس کو بنگال کے ایک ریلوے اسٹیشن ''پاربتی پور'' کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے دیکھا اور اسے پکڑ لیا۔ شیخ صاحب کو دہلی

---

[1] مختصر سوانح حیات مولانا رحیم آبادی از مولانا عطاء اللہ حنیف (حسن البیان مطبوعہ لاہور، ص ک)

اطلاع دی گئی تو انھوں نے آدمی بھیجا اور لڑکا اپنے گھر پہنچ گیا۔

اس بچے کے بہ خیریت مل جانے کی خوشی میں یہ لوگ شکرانے کے طور پر اپنی کچھ دولت خرچ کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ مولانا رحیم آبادی سے بات ہوئی تو انھوں نے فرمایا کہ اس خوشی پر اللہ کا بہترین شکر ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جدید طرزِ عمارت کا ایک دینی مدرسہ قائم کر دیا جائے۔ چناں چہ مولانا کے مشورے اور تجویز کے مطابق شیخ عبدالرحمٰن اور عطاء الرحمٰن کے ناموں کی مناسبت سے دہلی میں "مدرسہ رحمانیہ" کے نام سے مدرسہ جاری کر دیا گیا، جس میں ملک کے متعدد مشہور علمائے کرام اور مدرسین عظام نے خدمات سرانجام دیں اور اس کی افادیت کا دائرہ بہت وسیع ہوا۔ اس مدرسے کی تعمیر پر اس سستے زمانے (۱۹۲۱ء) میں ایک لاکھ روپے کی رقم خرچ ہوئی تھی جو بہت بڑی رقم تھی۔ اس مدرسے کا پورا نام "دارالحدیث رحمانیہ" تھا۔ اس کے قیام کا مشورہ دینے والے مولانا رحیم آبادی تو ۷۔ مارچ ۱۹۱۷ء کو وفات پا گئے۔ لیکن اس کی تعمیر اور دیگر ضروریات کی تکمیل سے فراغت پا کر اس کا افتتاح ان کی وفات سے تین سال چار مہینے بعد ۱۹۔ جولائی ۱۹۲۱ء کو کیا گیا۔

دارالحدیث رحمانیہ اگست ۱۹۴۷ء تک جاری رہا۔ تدریسی، تعلیمی اور انتظامی اعتبار سے دارالحدیث رحمانیہ نے بہت شہرت پائی۔ صرف چھبیس برس کی عمر پا کر اگست ۱۹۴۷ء کے خون ریز ہنگاموں میں یہ دارالحدیث ختم ہو گیا۔ شیخ عطاء الرحمٰن مرحوم کے صاحب زادے شیخ عبدالوہاب آزادیٔ برصغیر کے زمانے میں یہ عمارت اس کے وسیع کتب خانے سمیت جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) کے سپرد کر کے کراچی آ گئے۔ اب یہ تعلیمی ادارہ ایک اور انداز سے جامعہ ملیہ کے تدریسی پروگرام کے مطابق چل رہا ہے۔

شعر و شاعری

مولانا رحیم آبادی کو شعر و شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ اپنے عہد میں فارسی، عربی اور اردو کے اچھے شاعر تھے۔ ان کا فارسی کلام "حسن البیان" کے شروع میں شائع ہوا ہے۔ اور بھی مختلف مقامات میں ان کے اشعار ملتے ہیں۔ ہندی اور فارسی زبانوں میں ملے جلے چند اشعار کا بھی پتا چلتا ہے جو بے حد دلچسپ ہیں۔ یہ اشعار انھوں نے ایک شخص اودھ بابو کے بارے میں کہے تھے۔ اودھ بابو اصلاً ہندو تھے اور ایک کالج میں اردو اور فارسی کے پروفیسر تھے۔ انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن عوام میں اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا پورا خاندان دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائے تو قبولِ اسلام کا اظہار کیا جائے۔ اسی اثنا میں مظفر پور میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اب مسلمانوں اور ہندوؤں میں اختلاف کی فضا پیدا ہو گئی، جس نے تناؤ کی شکل اختیار کر لی۔ مسلمان

چاہتے تھے کہ ان کا جنازہ پڑھ کر انھیں قبرستان میں دفن کیا جائے، لیکن ہندو اپنے مذہب کے مطابق ان کو جلانے پر اصرار کررہے تھے۔ بالآخر کلکٹر آیا، اور اس نے فیصلہ کیا کہ مسلمان ان کا جنازہ پڑھ کر لاش ہندوؤں کے حوالے کردیں۔ لیکن مسلمان اس پر آمادہ نہ ہوئے، انھوں نے کہا کہ جلانا ہی ہے تو پھر جنازہ پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ لاش ہندوؤں کے حوالے کردی گئی۔ ❶

مولانا نے اودھ بابو کے بارے میں ہندی اور فارسی زبان کے امتزاج سے چند اشعار کہے تھے، جو یہاں درج کیے جاتے ہیں۔ ان اشعار کا مطلب کچھ اس طرح ہے کہ اودھ بابو کے بغیر جی تڑپ رہا ہے۔ وہ ملے تو دل کا غنچہ کھلے ...... اس کی محبت سے نفس کا ہر تار ہلتا رہتا ہے۔ نہ اودھ بابو جی مجھ سے میرے درد وغم کے متعلق پوچھتا ہے، نہ رگھوناتھ نندن مجھ سے بات کرتا ہے ...... نہ کوئی ان سے جا کر عزیز خستہ حال کے بارے میں کچھ کہتا ہے ...... اب اُن سے دور ہوجاؤ، افسوس ہے انھوں نے مجھے بے حال کردیا۔

اب اشعا پڑھیے اور شاعر کو داد دیجیے۔

جیرا تڑپت بن ترے ، یک رہ بہ کنی سویم نظرے
ہم راسے تھوکا ہے لاج کرت چوں غنچہ شگفتہ بادیگرے
جیرا ہمرا ہترے بنو دارد زلچید نہا اثرے
ہے لاگی لگن ایسی کہ بھیو ہر تار نفس مثل شررے
نہ بابو اودھ جی پوچھت ہیں چوں درد غم من شورہ سرے
اور نہ رگھو نندن من موہن دارد زمن بیچارہ سرے
نہ کو کہت ہے جا ان سے حالِ عزیز خستہ دروں
دورا! ان کے اے وائے من بے بال و پرے ❷

مولانا ثناء اللہ سے بیت بازی میں مقابلہ

مولانا رحیم آبادی کو جس طرح علوم دینیہ سے متعلق مختلف اہل علم کی عربی اور فارسی کی عبارتوں کی عبارتیں زبانی یاد تھیں، اسی طرح بے شمار شعرا کے اشعار بھی ازبر تھے اور یہ بھی معلوم تھا کہ کون

---

❶ مولانا عبدالعزیز۔ حیات وخدمات، ص:۸۷۔ میرا خیال ہے اگر ایسی صورت کہیں پیدا ہوجائے تو مسلمانوں کو اپنے مذہب کے مطابق جنازہ پڑھ لینا چاہیے۔ ان شاء اللہ جنازہ میت کی مغفرت کا باعث ہوگا۔

❷ مولانا عبدالعزیز۔ حیات اور خدمات، ص:۸۶، ۸۷ ...... میں نے یہ اشعار اسی طرح درج کردیے ہیں، جس طرح کتاب میں درج ہیں۔ ان کے غلط یا صحیح ہونے کا مجھے علم نہیں۔

سا شعر کس شاعر کا ہے۔ ان کے سوانح نگار فضل الرحمٰن سلفی لکھتے ہیں:

"مولانا نے مرض الموت میں خود ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک مرتبہ میں اور ثناء اللہ ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔ رات کسی طرح کاٹنی تھی۔ میں نے ثناء اللہ سے کہا کہ سنتا ہوں تم کو بہت اشعار یاد ہیں۔ کیوں نہیں ہم لوگ بیت بازی کریں، سفر آسان ہوجائے گا۔ وہ تیار ہوگئے اور ہم لوگوں کی بیت بازی شروع ہوگئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کو اشعار بہت یاد ہیں، لیکن ایک خامی ابھی بھی ہے۔ اشعار تو یاد ہیں لیکن کون سا شعر کس شاعر کا ہے، وہ اکثر یاد نہیں رکھتا۔ لیکن میں نے جتنے اشعار پڑھے، ان سب شاعروں کے نام بھی بتادیے۔" ❶

مولانا امرتسری کا ایک اندراج

مولانا رحیم آبادی کی وفات پر اخبار "اہل حدیث" کے مختلف شماروں میں بہت کچھ لکھا گیا۔ ان میں ایک اندراج مولانا ثناء اللہ امرتسری کا ملاحظہ فرمایئے جو انھوں نے مولانا رحیم آبادی کے بارے میں حافظ محمد صدیق صاحب کے ایک مضمون مرقومہ اخبار "اہل حدیث" مؤرخہ ۱۲، ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کے آخر میں تحریر فرمایا۔ اس اندارج سے مولانا رحیم آبادی کی حیاتِ طیبہ کے بعض دلچسپ وضع دارانہ پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ مولانا امرتسری فرماتے ہیں:

"میں نے جو بات قابل قدر مولانا مرحوم میں دیکھی (جس کی وجہ سے میں اس وقت زار وزار رو رہا ہوں،) یہ تھی کہ آپ دوستوں کے بڑے قدر دان تھے اور مخلصوں پر فدا تھے۔ ایام جلسۂ دہلی میں ایک حجام آپ نے بلایا اور اس سے پیار کی باتیں کیں۔ میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ فرمایا اس کا باپ میرا دوست تھا۔ ہم ایام طالب علمی میں اس کے حمام میں نہایا کرتے تھے۔ پھر آپ اس کے ساتھ اس کے مکان پر بھی گئے اور اس پر بہت کچھ نظر عنایت فرمائی۔ طبیعت میں غصہ بے حد تھا مگر غیر قائم، چڑھا اور اترا۔ مجھے خط میں کبھی مولوی نہ لکھتے بلکہ جبی ثناء اللہ لکھتے۔ ایک دفعہ کسی موقعے پر حاضرین کو مذاقیہ فرمایا تم لوگوں نے اس نوجوان کو مولانا کہہ کر خراب کردیا، میں تو کبھی اس کو مولوی بھی نہیں کہتا۔ آپ جب ہم کو کسی امر میں ڈانٹتے تو میں یہ شعر پڑھتا، اور ان کی خفگی فوراً ختم ہوجاتی۔

❶ مولانا عبدالعزیز...... حیات اور خدمات، ص:۸۶، ۸۷

عاشقاں از ہیبت تیغِ تو سر پیچیدہ اند
جائی بے چارہ راچوں دیگراں پنداشتی

''حافظ محمد صدیق صاحب کے اس مضمون سے مجھے وہ صحبت یاد آ گئی۔ ایک طرف مولانا شمس الحق ہیں، دوسری طرف مولانا حافظ عبداللہ (غازی پوری) تیسری طرف مولانا شاہ عین الحق، چوتھی طرف مولانا رحیم آبادی وغیرہ حضرات جلسۂ آرہ میں تشریف فرما تھے۔ یہ لوگ خود تو مزے میں جا پہنچے مگر ہم کو بدمزہ کر گئے۔ آہ!

غالب ہے نہ شیفتہ نہ نیر باقی
وحشت ہے نہ سالک ہے نہ انور باقی
حالی اب اسی کو بزمِ یاراں سمجھو
یاروں کے جو داغ ہیں دل پہ باقی

مشکل مسائل کی عقدہ کشائی

مولانا رحیم آبادی کا علم ہر وقت تازہ رہتا تھا۔ وہ نہایت حاضر جواب تھے اور بارگاہِ خداوندی سے ذہن بے حد رسا پایا تھا۔ حضرت شاہ عین الحق پھلواروی فرمایا کرتے تھے کہ کوئی بھی مشکل عبارت ہو، اس کا صحیح مطلب وہی ہوتا تھا جو مولانا رحیم آبادی بیان فرماتے تھے۔ اس سلسلے کے بہت سے واقعات میں سے تین واقعات یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

① ...... مولانا عبدالسلام مبارک پوری امام بخاری رحمہ اللہ کے حالات میں ''سیرت بخاری'' کے نام سے کتاب لکھ رہے تھے کہ ایک مقام پر ایک عبارت کا صحیح مفہوم ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ حضرت حافظ عبداللہ غازی پوری، مولانا شمس الحق ڈیانوی، اور شاہ عین الحق پھلواروی اور بعض دیگر حضراتِ علما سے رجوع کیا گیا لیکن جوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی جملہ یا کوئی لفظ حذف ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے مطلب صاف نہیں ہو رہا ہے۔ اس سے کچھ عرصہ بعد مولانا رحیم آبادی پٹنے تشریف لے گئے، اور اس عبارت کا مطلب ان سے پوچھا گیا تو فرمایا یہاں کوئی جملہ یا لفظ حذف نہیں ہوا۔ مطلب بالکل صاف ہے اور وہ یہ ہے۔ مولانا کی وضاحت سے مشکل حل ہو گئی۔

② ...... مولانا عبدالسلام مبارک پوری نے ''سیرتِ بخاری'' لکھنا شروع کی تو وہ پریشان ہوئے کہ حضرتِ امام نے بخاری شریف کے آغاز میں حمد کیوں نہیں لکھی......؟ اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے؟

مولانا رحیم آبادی سے اس سوال کا جواب پوچھا گیا تو نہایت سادگی سے جواب دیا:

الحمد للّٰہ ھو الثناء باللسان لا بالکتابۃ .

④......حضرت مولانا شمس الحق محدث ڈیانوی جب ابوداؤد کی شرح لکھ رہے تھے، ایک حدیث کا مطلب واضح نہیں ہورہا تھا۔ حافظ عبداللہ غازی پوری اور شاہ عین الحق پھلواروی سے بھی بات ہوئی اور انھوں نے اس پر غور کیا مگر عقدہ کھل نہ سکا۔ مولانا رحیم آبادی سے اس کا مطلب پوچھا گیا تو انھوں نے اس پر ایسی عمدہ تقریر کی اور اس طرح اس کی شرح بیان فرمائی کہ سب حیران رہ گئے اور عقدہ وا ہوگیا۔ مولانا شمس الحق ڈیانوی نے اسے فوراً قلم بند کرلیا اور عربی میں ترجمہ کرکے مولانا رحیم آبادی کو دکھایا۔ ❶

نمازِ تہجد

اللہ تعالیٰ نے مولانا رحیم آبادی کو علم وتحقیق کے ساتھ ساتھ زہد وتقویٰ کی نعمت بھی فراوانی سے عطا فرمائی تھی۔ ان سے تہجد کی نماز کبھی فوت نہیں ہوئی۔ صحت، علالت، حضر، سفر، یہاں تک کہ ریل کے سفر میں بھی اس کا التزام رہا۔ جب بیماری نے زیادہ غلبہ پالیا تو بستر پر ہی تہجد کی نماز ادا فرمانے لگے تھے، روزانہ قرآنِ مجید کے دو یا تین پارے بھی پڑھ لیتے۔ نماز نہایت خشوع وخضوع سے پڑھتے۔ نماز میں ان پر نبی ﷺ کے فرمان **ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ** کی کیفیت طاری ہوجاتی۔ دیکھنے والے بھی اس کیفیت سے راحت محسوس کرتے۔ ❷

مولانا رحیم آباری کا جوانی کا زمانہ تھا کہ مولوی لیاقت علی نے اطلاع دی کہ موضع رگھے پورہ میں تبلیغ کے لیے جانا بہت ضروری ہے۔ چناں چہ ان کی تحریک پر اسی وقت رحیم آباد سے روانہ ہوگئے۔ دربھنگا تک ریل پر آئے۔ اس سے آگے رگھے پورہ تک بیس میل کا فاصلہ پیدل طے کیا۔ وہاں چند روز وعظ وتبلیغ کا سلسلہ جاری رہا اور لوگ ان کے انداز کلام اور طریق وعظ سے بہت متاثر ہوئے اور احکامِ شریعت کی پابندی کا عمل جاری ہوا۔ مولانا کو چائے نوشی کی عادت تھی اور بڑے شوق اور اہتمام سے چائے پیتے تھے۔ مگر رگھے پورہ میں نہ چائے کے لیے پیالی نہ طشتری۔ نہ کسی کو وہاں چائے پینے کی عادت۔ اپنے دست مبارک سے خود ہی مٹی کی ہانڈی میں چائے بناتے اور مٹی کے پیالے میں نوش فرماتے۔ اس چائے کی لذت کو عمر بھر یاد رکھا۔ ❸

---

❶ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی۔ حیات اور خدمات، ص: ۱۵۶، ۱۵۷۔

❷ مولانا عبدالعزیز، ص: ۱۶۲۔

❸ مولانا عبدالعزیز۔ حیات اور خدمات، ص: ۱۶۷، ۱۶۸

نیپال کا تبلیغی سفر

ایک مرتبہ ایک بزرگ حافظ نواب علی نے مولانا کو بتایا کہ نیپال کے علاقے کی دینی حالت بہت خراب ہے۔ مسلمان شرک میں مبتلا ہیں۔ وہاں کی ایک بستی کا نام "بندز جھولا" ہے۔ اس بستی کے مسلمانوں اور مشرک ہندوؤں میں بہ ظاہر کوئی فرق نہیں۔ مولانا فوراً تبلیغ دین کی غرض سے وہاں جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ بیل گاڑی کی سواری تھی۔ کچھ زادِ راہ ساتھ لیا اور چل پڑے۔ دور کا سفر۔ ساتھی بھوک سے سخت پریشان۔ مولانا کے پاس جو کچھ تھا سب رفقائے سفر کو کھلا دیا۔ راستے میں کھانے کو کوئی چیز میسر نہ آئی۔ اس تکلیف کو دیکھ کر حافظ نواب علی رونے لگے۔ لیکن مولانا کے صبر اور جفاکشی کا یہ عالم تھا کہ ان کو تسلی دیتے اور بار بار فرماتے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تکلیفوں کے مقابلے میں اس تکلیف کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ تو ان کے مقابلے میں عیش ہے۔ کئی دن کے مشکل تریں سفر کے بعد وہاں پہنچے۔

کچھ دیر آرام کیا۔ پھر مسلمانوں کی حالت دیکھی۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ ان کے نام ہندوؤں کی طرح رام لال، بجو میاں، چھمن میاں وغیرہ۔ شکل اور لباس بھی بالکل ہندوؤں کی مانند۔ سر کے بال بھی ہندوؤں کے سے۔ مندروں میں جاکر ہندوؤں کے دیوتاؤں کی پرستش کرتے۔ گردن میں کنٹھی۔ کہلاتے مسلمان ہی تھے۔ لیکن نہ اللہ کا پتا نہ رسول کا۔

مولانا رحیم آبادی ایک عرصے تک وہاں رہے۔ لوگوں کو کفر اور شرک کے ارتکاب سے روکا اور اسلامی احکام کی تبلیغ فرمائی۔ مولانا کا کمال یہ تھا کہ آہستہ آہستہ نہایت نرمی سے لوگوں کو سمجھاتے اور دین حق کی باتیں بتاتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد نیپال کے مسلمانوں کی حالت بدل گئی۔ پھر اسی بستی "بندر جھولا" میں مسجد تعمیر ہوئی۔ پانچ وقت اذان ہونے لگی اور باقاعدہ باجماعت نمازیں ادا کرنے کا سلسلہ شروع ہوا اور اللہ اکبر کی صدائیں گونجنے لگیں۔ اب یہ بستی نیپال میں تبلیغ اسلام کا ایک بڑا مرکز ہے۔ [1]

توکل علی اللہ اور مہمان نوازی

مولانا رحیم آبادی کی جودت وسخاوت، فراخ دستی، وسعت قلب، جماعت کی امداد، مجاہدین کی اعانت، مستحقین کی نصرت، توکل علی اللہ اور مہمان نوازی کی متعدد مثالیں گزشتہ صفحات میں دی

---

[1] مولانا عبدالعزیز۔ حیات اور خدمات، ص: ۱۶۸

جا چکی ہیں۔ اب ایک مثال اور ملاحظہ فرمائیے۔

کئی سال مولانا مظفر پور میں مقیم رہے۔ اس طویل مدت میں انھوں نے والد مکرم سے کوئی پیسا نہیں لیا اور نہ اس سلسلے میں والد کو تکلیف دینے کی ضرورت محسوس کی۔ اللہ پر بھروسا کیا اور کسی سے اپنی کسی ضرورت کا اظہار بھی نہیں کیا۔ اس زمانے میں جو لوگ ان کے ساتھ اقامت گزیں تھے، ان کا بیان ہے کہ روزانہ استعمال کی چیزیں بازار سے ادھار آتی تھیں۔ جب دکان دار کو ان کی قیمت ادا کرنا ہوتی تو کسی کو حکم دیتے کہ بستر کے نیچے دیکھو ان شاء اللہ کچھ مل جائے گا، ٹھیک اتنی رقم مل جاتی، جتنی دکان دار کو ادا کرنا ہوتی۔ کبھی ارشاد فرماتے پان دان کے نیچے دیکھو، وہاں بھی دیکھا جاتا تو مطلوبہ رقم موجود ہوتی۔ مطلب یہ کہ اس بے سروسامانی کے زمانے میں بھی دستر خوان بہت وسیع تھا اور ضرورت کی ہر شے میسر تھی۔

ان کے والد مکرم شیخ احمد اللہ کو جب پتا چلا کہ مظفر پور میں عبدالعزیز گھر سے کوئی امداد لیے بغیر نہایت آسودگی کی زندگی بسر کر رہے ہیں تو اس کی تحقیق کے لیے خود مظفر پور پہنچے اور دس گیارہ دن وہاں رہے۔ جب دیکھا کہ کھانے کے وقت دستر خوان پر ہمیشہ بریانی، قورمہ، مرغ، کباب وغیرہ سے مہمانوں کی تواضع کی جا رہی ہے تو انھیں سخت تعجب ہوا اور ایک روز آخر پوچھ ہی لیا کہ "میاں عبدالعزیز آخر کب تک یہ تکلف ہوتا رہے گا؟" جواب دیا: "ابا جان جب تک خدا دیتا رہے گا۔" لوگ کہا کرتے تھے کہ مولانا کو اللہ کی طرف سے غیبی امداد ملتی ہے۔ [1]

مزدور کی مزدوری

مولانا ممدوح مہمانوں اور دوستوں پر ہی خرچ نہیں کرتے تھے، اپنے گھریلو ملازموں اور زمین کے کارندوں کا بھی پورا خیال رکھتے تھے اور ان کو بروقت اور صحیح مزدوری دیتے تھے اور ان سے بے حد نرمی کا سلوک فرماتے تھے۔ ان کے والد کے زمانے میں مزدور کی مزدوری ایک آنہ یومیہ تھی۔ ایک آنہ اس وقت چار پیسے کا تھا۔ آدھا پیسا بھی چلتا تھا، دھیلا بھی چلتا تھا اور دمڑی بھی چلتی تھی۔ لیکن مولانا کے خیال میں مزدور کی روزانہ کی ایک آنہ مزدوری بہت کم تھی۔ چناں چہ زمینوں اور جائداد کا انتظام خود مولانا ممدوح کے ہاتھ میں آیا تو انھوں نے مزدور کی مزدوری بڑھا کر تین آنے یومیہ کر دی، جس پر مزدور بہت خوش ہوئے۔ پھر جب ان کے بڑے بھائی حج سے واپس آئے تو زمین اور جائداد کا انتظام ان کے سپرد کر دیا اور خود علمی کاموں میں مصروف ہو گئے۔ [2]

---

[1] مولانا عبدالعزیز۔ حیات اور خدمات، ص: ۱۶۷

[2] مولانا عبدالعزیز۔ حیات اور خدمات، ص: ۱۶۷

تصانیف

مولانا رحیم آبادی ہمہ اوصاف موصوف عالم دین تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اسماء الرجال، ادبیات، فلسفہ، منطق، اسلامی تاریخ وغیرہ تمام علوم میں مہارت رکھتے تھے۔ پھر خطابت، تقریر، تدریس، فتویٰ نویسی، تبلیغ اور روز مرہ کے اسفا اور ہم دردیٔ خلائق بھی ان کے دل پسند مشاغل تھے۔ ہر آن کوئی نہ کوئی مصروفیت انھیں لاحق رہتی تھی، جس کا تذکرہ بہت حد تک گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ ان گوناگوں مشاغل و مصروفیات کی بنا پر اگرچہ وہ زیادہ تصنیفی خدمات سرانجام نہیں دے سکے، تاہم جو کچھ لکھا نہایت محققانہ انداز میں لکھا اور اس دقت نظر اور خوش اسلوبی سے لکھا کہ کوئی اس کا جواب نہ دے سکا۔ ان کی تحریری اور تصنیفی کاوشوں کا ذکر مندرجہ ذیل سطور میں کیا جاتا ہے۔

(۱)...... **حسن البیان فیما فی سیرۃ النعمان:** یہ کتاب مولانا ممدوح نے مولانا شبلی کی کتاب ”سیرۃ النعمان“ کے جواب میں لکھی۔ مولانا شبلی بے شک بہت بڑے عالم اور مؤرخ ہیں، لیکن انھوں نے ”سیرۃ النعمان“ میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے حالات لکھتے وقت مختلف مقامات میں بہت ٹھوکر کھائی ہے اور ان کا اشہب قلم صحت و انصاف کے دائرے سے باہر نکل گیا ہے۔ انھوں نے محدثین پر تنقید کی اور امام بخاری کو ہدفِ نقد و جرح ٹھہرایا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی مجلس تدوین فقہ کا جس انداز میں ذکر کیا اور ان کے ارکان کے سنین کا جس نہج سے تذکرہ کیا، اس کا تاریخ سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ مولانا رحیم آبادی نے ”سیرۃ النعمان“ کی اشاعت کے فوراً بعد اس کے جواب میں ”حسن البیان فیما فی سیرۃ النعمان“ لکھی، جس میں شبلی کی تمام تاریخی اور تحقیقی لغزشوں کی تفصیل سے نشان دہی کی اور اس کے مقابلے میں صحیح صورتِ حال کی وضاحت فرمائی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شبلی نے یہ کتاب پڑھ کر ”سیرۃ النعمان“ سے اپنے تحریر کردہ بہت سے حصے نکال دیے۔ لیکن پھر بھی (نرم الفاظ میں کہنا چاہیے کہ) بہت سے تسامحات اس کتاب میں موجود ہیں۔

حسن البیان مولانا رحیم آبادی کی ایسی محققانہ تصنیف ہے کہ آج تک کوئی شخص اس کا جواب نہ دے سکا، بلکہ خود مولانا شبلی اس قسم کے موضوعات پر طبع آزمائی سے ہے کنارہ کش ہو گئے۔

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۳۱۱ھ میں مطبع فاروقی دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ دوسری دفعہ جید پریس دہلی سے ایک بزرگ محمد سعید صاحب کی کوشش سے معرضِ اشاعت میں آئی۔ تیسری دفعہ ۱۳۸۵ھ میں اہل حدیث اکادمی لاہور نے شائع کی۔ اس اشاعت پر مولانا عطاء اللہ حنیف نے مولانا رحیم آبادی کے مختصر حالات قلم بند کیے ہیں جو صرف چار صفحات پر مشتمل ہیں اور حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی نے ”مسئلہ درایت و فقہ راوی کا تاریخی و تحقیقی جائزہ“ کے عنوان سے طویل مقدمہ تحریر فرمایا جو ۳۹

صفحات پر محیط ہے (اس کا ذکر پہلے بھی کیا جاچکا ہے۔)

ضرورت ہے کہ یہ کتاب نئے انداز سے بعض وضاحتوں کے ساتھ خوب صورت طریقے سے کمپوز کر کے شائع کی جائے۔ تیسری طباعت میں پروف ریڈنگ کی بعض غلطیاں بھی موجود ہیں۔

(۲)...... **سواء الطریق**: اس کتاب میں مولانا ممدوح نے مشکوٰۃ شریف کی ان احادیث کو جمع کر دیا ہے جو صاحب مشکوٰۃ نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے درج کی ہیں۔ ان احادیث کا صاف ستھرا اردو ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ کتاب چار جلدوں پر محیط ہے۔ پہلی دفعہ ۱۳۳۴ھ میں مطبع فاروقی دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ پھر دارالعلوم احمدیہ سلفیہ نے دوسری اور تیسری بار اس کی طباعت کا اہتمام کیا۔

(۳)...... **هداية المعتدی فی القرأة للمقتدی**: کسی زمانے میں ایک حنفی عالم نے "تحقیق قرأۃ المقتدی" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا تھا، جس میں بتایا گیا تھا کہ امام کے پیچھے مقتدی کو سورۂ فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیے۔ مولانا رحیم آبادی نے حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے فرمان کے مطابق "ہدایۃ المعتدی فی القرأۃ للمقتدی" کے نام سے اس رسالے کا جواب دیا۔ یہ کتاب پہلی دفعہ مطبع فاروقی دہلی سے ۱۳۱۰ھ میں شائع ہوئی تھی۔ اپنے موضوع کی نہایت اہم کتاب ہے، لیکن اب نایاب ہے۔

(٤)...... **روداد مناظرہ مرشد آباد**: ۱۳۰۵ھ میں مرشد آباد (بنگال) میں وجوب تقلید کے موضوع پر احناف کے بعض مشہور علما سے مولانا رحیم آبادی کا مناظرہ ہوا تھا (اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) یہ نہایت اہمیت کا حامل مناظرہ تھا۔ اس کی روداد اسی زمانے میں کتابی شکل میں چھپی تھی، جس پر حضرت حافظ عبداللہ غازی پوری اور مولانا محمد ابراہیم آروی کی تقاریظ بھی شائع ہوئی تھیں۔

(٥)...... وضو کی ترتیب کے موضوع پر شیعہ حضرات کے ایک رسالے کا جواب لکھا، جس میں قرآن کی آیت **اذا قمتم الی الصلوة** کی تفسیر بیان فرمائی ہے۔

(٦)...... **رمی الجمرہ**: یہ رسالہ ایک رسالے "الجمرہ" کے جواب میں لکھا تھا۔

(۷)...... **الرق المنشور فی رد فتح الشکور**: یہ کتاب ۱۳۰۶ھ میں مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوئی تھی جو حافظ عبدالشکور (موضع ٹانڈہ) کے رسالے "فتح الشکور" کا جواب ہے۔ اس پر مصنف کا نام مولانا محمود عالم درج ہے۔ لیکن مولانا رحیم آبادی کے سوانح نگار مولانا فضل الرحمٰن سلفی نے اسے مولانا رحیم آبادی کی تصانیف میں شامل کیا ہے۔ [1]

[1] ملاحظہ ہو مولانا عبدالعزیز۔ حیات اور خدمات، ص: ۱۶۱

مولانا فضل الرحمٰن سلفی مولانا رحیم آبادی کی تصانیف کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''بعض رسائل کے مسودات طباعت کے مرحلے سے نہ گزر سکے اور افسوس کہ آج تک مکمل طور پر وہ جواہر ریزے عوام تک نہ پہنچ سکے۔ اس سلسے میں ایک تو سورہ ''ق'' کی تفسیر اور دوسرا ''قرآنِ مجید کی سورتوں کا خلاصہ۔'' ان دونوں رسائل کی کچھ قسطیں ''مجلّہ سلفیہ'' (دربھنگا) میں شائع ہوئیں، لیکن افسوس کہ مکمل نہ ہوسکیں۔ اگر اب بھی ذمہ دارانِ دارالعلوم احمدیہ سلفیہ اس کی طباعت کرادیں تو ایک یادگار رہ جائے۔'' ❶

ازدواجی زندگی

اس عنوان کے تحت مولانا ممدوح کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ ان کی پہلی شادی ان کے والد مکرم شیخ احمد اللہ نے موضع ''گدو پورشمہ تھاتھن'' میں کی۔ یہ خاتون شوہر نام دار کے ساتھ ہی رحیم آباد سے مظفر پور چلی گئی تھیں۔ وہیں ۱۸۸۷ء میں فوت ہوئیں۔ ان کے بطن سے تین بیٹوں نے جنم لیا۔ آگے چل کر ان بیٹوں کو اللہ تعالیٰ نے اولاد عطا فرمائی۔

مولانا نے دوسری شادی صوبہ بنگال کے ضلع دیناج پور میں کی۔ ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، جس کا نام بی بی حبیبہ رکھا گیا۔ لڑکا کوئی نہیں۔ اس بیٹی کو بھی اللہ نے اولاد کی نعمت سے نوازا۔

تیسری شادی شہر آرہ میں مولانا محمد ابراہیم آروی کی بھانجی بی بی امۃ اللہ سے ہوئی۔ ان سے ایک لڑکی عطیہ پیدا ہوئیں۔ ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے اولاد عطا فرمائی۔

مولانا نے اپنے پیچھے اولادِ ذکور نہیں چھوڑی۔ البتہ ان کے بہت سے نواسے نواسیاں ہوئے، جنھوں نے دینی اور دنیوی اعتبار سے بہتر زندگی بسر کی اور کررہے ہیں۔ غالباً وہ سب لوگ آزادی کے بعد ہندوستان ہی میں رہے، پاکستان نہیں آئے۔

مولانا کے شاگردوں اور عقیدت مندوں کو حیطۂ شمار میں لانا ممکن نہیں۔

مرض

جیسا کہ گزشتہ سطور سے ہم پڑھتے آرہے ہیں مولانا رحیم آبادی ہر وقت علمی کاموں میں مصروف رہتے تھے اور اس سلسلے میں انھیں دور دراز کے سفر بھی کرنا پڑتے تھے۔ مسلسل محنت اور بھاگ دوڑ سے بعض امراض بھی انھیں لاحق ہوگئے تھے، جن میں ایک بڑا مرض ذیابیطس کا تھا۔ اس مرض کے لیے جہاں مستقل علاج کی ضرورت ہے، وہاں پرہیز اور آرام بھی ضروری ہے۔ بالخصوص

❶ ایضاً، ص: ۸۳

کھانے پینے میں بے حد احتیاط کرنا چاہیے۔ لیکن مولانا کا معاملہ یہ تھا کہ وہ پشاور سے لے کر آسام تک اور ہمالہ سے لے کر مدراس تک تبلیغی دورے کرتے تھے۔ ان حالات میں پرہیز اور آرام اور احتیاط کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بالآخر مرض نے ان کے جسم پر قبضہ کرلیا اور بدن زخمی ہوگیا۔ ڈاکٹر سید محمد فرید اس وقت دربھنگا اسپتال میں تھے، وہ تقریباً روزانہ رحیم آباد آتے اور معائنہ کرکے زخموں پر مرہم پٹی کرتے۔ بعض اطبا کی خدمات بھی حاصل تھیں۔ مگر مرض روز بروز بلکہ لحہ بہ لحہ بڑھتا گیا۔ عقیدت مندوں اور شاگردوں کو پتا چلا تو وہ بھی ملک کے مختلف حصوں سے تیمار داری کے لیے رحیم آباد حاضر ہونے لگے۔

وفات

بالآخر وہ وقت آ گیا، جس کی آمد پر نبی ﷺ نے لوگوں کو **لقنوا موتکم لا الٰہ الا اللہ** کا حکم دیا ہے۔ چناں چہ ان کے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ **لا الٰہ الا اللہ** کا ورد کرنے لگے۔ خود مولانا کے لب مبارک بھی حرکت کررہے تھے۔ قریب کھڑے ایک شخص نے منھ کے قریب کان لگائے تو کہا سید الاستغفار کا ورد فرما رہے ہیں۔ یہ سن کر لوگ خاموش ہوگئے۔ کم وبیش ۶۵ سال کی عمر پاکر علم وعمل کا یہ خورشید انور، علما کا رہبر، عوام کا ہادی، ہر شخص کا دلی خیر خواہ، تبلیغ حدیث کا خوگر، اخلاص کا پیکر سید الاستغفار کا ورد کرتا ہوا، ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہوگیا اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملا۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون**

یہ اتوار کا دن تھا اور قمری حساب سے تاریخ تھی ۴۔ جمادی الاخریٰ ۱۳۳۶ھ اور عیسوی حساب سے ۱۷۔ مارچ ۱۹۱۸ء......![1]

جنازہ اور تدفین

حضرت مرحوم کے جنازے میں دور ونزدیک اور جماعت اور غیر جماعت کے ہزاروں لوگوں نے شرکت کی۔

مولانا مرحوم ومغفور نے اپنی زندگی ہی میں قبرستان کے پہلے دروازے کے سامنے تدفین کے لیے جگہ تجویز کررکھی تھی، لیکن آخری وقت میں وصیت فرمائی کہ پہلی جگہ پر تدفین کے متعلق میرا ارادہ

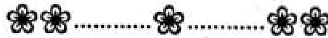
---

[1] مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی۔ حیات اور خدمات، ص: ۱۲۴۔
سید عبدالحی حسنی نے لکھا ہے: مات برحیم آباد نحو سنة ثلاثین وثلاث مأة والف. نزہۃ الخواطر، ج:۸، ص:۲۵۷ (یعنی رحیم آباد میں ۱۳۳۰ھ کے قریب وفات پائی) سید صاحب ممدوح کی یہ بات قرین صحت نہیں۔

بدل گیا ہے اب مجھے قبرستان میں حافظ محمد عمر کے قریب دفن کیا جائے۔ اس لیے کہ وہ صالح نوجوان تھا، اس کی رفاقت میرے لیے مناسب ہوگی، چناں چہ ان کی وصیت کے مطابق خاندانی قبرستان میں شب کے دس بجے انھیں دفن کر دیا گیا۔

اللھم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه ووسع مدخله وادخله جنت الفردوس .

ان کی وفات کے بعد بہت سے حضرات نے نظم ونثر میں اظہارِ حزن وملال کیا، جسے ان کے سوانح نگار مولانا فضل الرحمٰن سلفی نے اپنی کتاب میں درج کر دیا ہے۔



مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ضلع اعظم گڑھ کا ایک مشہور قصبہ مبارک پور ہے۔ اس قصبے کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ طویل مدت سے علم اور اصحابِ علم کے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں ایک انصاری خاندان آباد ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے علم کے ساتھ عمل کی نعمت عظمیٰ بھی عطا فرمائی ہے۔ اس خاندان کی جس عالی قدر شخصیت کے متعلق ان سطور میں چند گزارشات پیش کرنا مقصود ہے، ان کا اسم گرامی حضرت مولانا محمد عبدالرحمٰن تھا اور کنیت ابوالعلیٰ تھی۔ والد کا نام نامی حافظ عبدالرحیم اور جد امجد کا حاجی شیخ بہادر تھا۔ حاجی شیخ بہادر دیانت واتقا کے اعتبار سے اس قصبے کے ممتاز فرد تھے۔ [1]

حافظ عبدالرحیم مبارک پوری

حاجی شیخ بہادر کے صاحب زادے حافظ عبدالرحیم تھے، انھیں بھی بارگاہِ خداوندی سے ممتاز مقام ودیعت فرمایا گیا تھا۔ وہ "بڑے حافظ صاحب" کے عرف سے معروف تھے۔ انھوں نے قرآنِ مجید کی قرأت وتجوید کا علم قاضی امام الدین جون پوری سے حاصل کیا تھا جو اپنے عہد اور علاقے میں اس فن کے بہت بڑے عالم تھے۔ پھر اس مرتبۂ کمال کو پہنچے کہ جب تک مبارک پور اور اس کے قرب وجوار کا کوئی شخص حفظ قرآن کے بعد حافظ عبدالرحیم کو قرآنِ مجید نہ سنا لیتا، اسے پورا حافظ قرآن نہیں قرار دیا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے کہنا چاہیے کہ اس عہد میں اس نواح کے تمام حفاظ ان کے شاگرد تھے۔ [2]

حافظ عبدالرحیم اپنے علاقے کے مشہور طبیب بھی تھے اور نامور عالم دین بھی۔ انھوں نے حدیث وفقہ، منطق وفلسفہ اور صرف ونحو وغیرہ علومِ مروّجہ اپنے دور کے مشاہیر اساتذہ سے حاصل کیے تھے، جن میں قاضی محمد مچھلی شہری، مولانا محمد فیض اللہ مئوی اور ملا محمد حسام الدین مئوی کے اسمائے گرامی خاص طور سے لائق تذکرہ ہیں۔ مؤخر الذکر دونوں حضرات کے سامنے انھوں نے غازی پور کے مدرسہ چشمہ رحمت میں زانوئے شاگردی تہ کیے تھے۔

حصولِ علم کے بعد حافظ عبدالرحیم مبارک پوری نے مبارک پور میں خود سلسلۂ تدریس جاری

---

[1] تذکرہ علمائے مبارک پور، ص: ۱۴۵

[2] مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری۔ حیات اور خدمات، ص: ۴۱

کیا۔ ان کے شاگردوں میں حافظ شاہ نظام الدین سریانوی اور سیرۃ البخاری کے مصنف شہیر مولانا عبدالسلام مبارک پوری شامل ہیں۔

مبارک پور اور اس کے مضافات میں مسلک اہل حدیث کی نشر واشاعت میں حضرت حافظ عبدالرحیم مبارک پوری کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ وہ اس مسلک کے بہت بڑے داعی اور مبلغ تھے۔ انھوں نے رمضان المبارک ۱۳۳۰ھ (ستمبر۱۹۱۲ء) میں وفات پائی۔

اولادِ نرینہ

حضرت حافظ عبدالرحیم مبارک پوری کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑے شیخ محمد علی، ان سے چھوٹے حکیم محمد شفیع اور سب سے چھوٹے مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ۔ یوں تو شیخ محمد علی اور حکیم محمد شفیع کو بھی اللہ تعالیٰ نے علم وصالحیت کے جوہر سے نوازا تھا، لیکن آئندہ سطور میں صرف ان کے برادرِ اصغر حضرت مولانا ابوالعلی محمد عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ کے علمی وتصنیفی کوائف معرضِ بیان میں لانا مقصود ہے۔

ولادت اور تعلیم وتربیت

حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری کی ولادت ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۵ء) میں ضلع اعظم گڑھ کے قصبہ مبارک پور کے محلّہ صوفی پورہ میں ہوئی۔ ان کا گھرانا شرف ومجد اور فضل وکمال کا گھرانا تھا اور اس گھرانے کے افراد تقویٰ وعرفان کی دولت سے مالا مال تھے۔ مولانا ممدوح نے اسی پاکیزہ ماحول میں تربیت پائی اور انہی خوش گوار فضاؤں میں حصولِ علم کی راہ پر گامزن ہوئے۔

آغازِ تعلیم

قرآنِ مجید اور عربی وفارسی کی ابتدائی کتابیں اپنے محلے کے مدرسے میں پڑھیں۔ اس کے بعد قرب وجوار کے اہل علم سے استفادہ کیا، جن میں مولانا خدا بخش مہراج گنجی (متوفی ۱۳۳۳ھ) مولانا فیض اللہ مئوی (متوفی ۱۳۔ ربیع الاوّل ۱۳۱۶ھ) مولانا محمد سلیم پھری ہاوی (متوفی ۱۳۲۴ھ) مولانا حسام الدین مئوی (متوفی ۱۳۱۰ھ) اور مولانا سلامت اللہ جیراج پوری (متوفی ۳۰۔ ربیع الاوّل ۱۳۲۳ھ) شامل ہیں۔ ان گرامی قدر اساتذہ سے حضرت مولانا نے فارسی ادب وانشا، صرف ونحو، فقہ واصول اور منطق وغیرہ علوم کی کتابیں پڑھیں۔

تحصیل علم کے لیے سفر

جب عمر کی کچھ منزلیں طے کر چکے اور مختلف علوم متداولہ کی بعض کتابیں قرب وجوار کے اساتذہ سے پڑھ لیں تو اپنے مسکن سے باہر قدم نکالا۔ اس زمانے میں مبارک پور سے کچھ فاصلے پر دو مشہور مدرسے تھے۔ ایک جون پور میں احناف کا مدرسہ تھا جو وہاں کے رئیس منشی امام بخش نے مولانا سخاوت علی کی تحریک پر ۱۲۶۷ھ میں جاری کیا تھا۔ اس کے پہلے صدر مدرس مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی تھے۔ ان کے بعد ۱۲۷۷ھ میں اس کے صدر مدرس مولانا محمد یوسف فرنگی محلی کو مقرر کیا گیا تھا۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کے ممتاز شاگرد مولانا ہدایت اللہ خاں رام پوری بھی اس کے صدر مدرس بنائے گئے تھے۔

دوسرا مدرسہ چشمۂ رحمت تھا جو غازی پور میں مولانا رحمت اللہ فرنگی محلی نے ۱۸۶۹ء میں شہر کے وسط میں پانچ روپے ماہ وار کرائے کا مکان لے کر جاری کیا تھا۔ تھوڑے عرصے میں اس مدرسے نے شہرت حاصل کر لی تھی اور یوپی اور بہار کے دور دراز علاقوں سے شائقین علم آ کر اس میں تحصیل علم کرنے لگے تھے۔ مدرسہ چشمہ رحمت میں عربی، فارسی، اردو کے علاوہ ہندی، سنسکرت اور انگریزی کی بھی ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں مسلمان طلبا کے علاوہ ہندو طلبا بھی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس کے اساتذہ کی عالی قدر جماعت میں حضرت مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری جیسے اکابر اصحابِ علم شامل تھے جو طلبا کو تفسیر، حدیث، فقہ، ادب اور معانی وبیان کی کتابیں پڑھاتے تھے۔ یعنی منقولات ومعقولات کی تعلیم کا پورا انتظام تھا۔ حضرت مولانا مبارک پوری پانچ سال یہاں حضرت حافظ عبداللہ غازی پوری رحمہ اللہ سے حصولِ علم میں مشغول رہے۔ حضرت مولانا رحمہ اللہ کے والد مکرم حافظ عبدالرحیم مرحوم ومغفور بھی مدرسہ چشمہ رحمت سے فیض یاب تھے۔

حضرت میاں صاحب کی خدمت میں

حضرت مولانا مبارک پوری نے مدرسہ چشمہ رحمت میں حضرت حافظ عبداللہ غازی پوری سے خوب استفادہ کیا۔ وہ بھی لائق شاگرد کی صلاحیتوں سے بہت متاثر تھے اور ان پر بے حد شفقت فرماتے تھے۔ اسی تاثر وشفقت کا نتیجہ تھا کہ حضرت استاذ نے علم کے اس بے پناہ شائق شاگرد کو حضرت میاں سید نذیر حسین رحمہ اللہ کی خدمت میں دہلی جانے کا مشورہ دیا۔ چناں چہ انھوں نے دہلی کے لیے شد رحال کیا اور حضرت میاں صاحب کے حلقہ درس میں شامل ہوئے۔

حصولِ سند

یہ ۱۳۰۶ھ کا واقعہ ہے۔ اس وقت حضرت مولانا مبارک پورے عالم شباب میں تھے اور حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ عمر مبارک کی ۸۶ منزلیں طے کر چکے تھے۔ حضرت میاں صاحب سے انھوں نے صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داود، اواخر نسائی، اوائل ابن ماجہ، مشکوٰۃ المصابیح، بلوغ المرام، تفسیر جلالین، تفسیر بیضاوی، اوائل ہدایہ اور نخبۃ الفکر کا اکثر حصہ پڑھا۔ نیز سوا چھ پاروں کا، قرآنِ مجید کا ترجمہ سنایا اور کتب مذکورہ کے علاوہ دیگر کتب حدیث وتفسیر اور فقہ کی سند حاصل کی۔ سند کے آخر میں حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ نے یہ الفاظ تحریر فرمائے۔

واوصیہ بتقوی اللّٰہ تعالٰی فی السر والعلانیۃ واشاعۃ السنۃ السنیۃ بلا خوف لومۃ لائم . حرر ۱۳۰۶ الھجریۃ المقدسۃ.[1]

مقدمہ تحفۃ الاحوذی میں حضرت میاں صاحب کے متعلق مرقوم ہے:

ھو بخاری زمانہ فی علوم الحدیث وفقھہ وابوحنیفۃ اوانہ فی الاجتھاد وشروطہ، وسیبویہ دورانہ فی العربیۃ، وجرجانی ایامہ فی البلاغۃ، وشبلی عصرہٖ فی السلوک والعرفان والارشاد، وابن ادھم دھرہٖ فی الزھد واستحقار الدنیا، وابن حنبل اباتہ فی الورع والتقوی والقول بالحق والصبر علی المکارہ . اٰیۃ من اٰیات اللّٰہ وحجۃ من حجج اللّٰہ .[2]

"یعنی حضرت میاں صاحب علوم حدیث اور اس کی فقاہت میں اپنے وقت کے امام بخاری، اجتہاد میں ابوحنیفہ، عربیت میں سیبویہ، بلاغت میں جرجانی، سلوک اور عرفان وارشاد میں شبلی، زہد وتقویٰ میں ابن ادھم اور صبر واستقامت اور راست بازی میں احمد بن حنبل تھے۔" (رحمہم اللہ)

حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ موضع سورج گڑھ (ضلع مونگیر، صوبہ بہار) میں ۱۲۲۰ھ (۱۸۰۵ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۰۔ رجب ۱۳۲۰ھ (۱۳۔ اکتوبر ۱۹۰۲ء) کو دہلی میں وفات پائی۔ بے شک وہ شیخ العرب والعجم تھے۔ ان سے بے شمار علما وطلبا نے علمی اور روحانی فیض حاصل کیا۔

---

1. سند کی پوری عبارت کے لیے ملاحظہ ہو، تحفۃ الاحوذی، ج:۱، ص:۱
2. مقدمہ تحفۃ الاحوذی کے آخر میں ص ۲ (ترجمۃ المولف رحمہ اللہ از مولانا عبدالسمیع مبارک پوری)

دیگر اصحابِ فضل سے حصولِ اسناد

۱۳۱۳ھ میں حضرت مولانا مبارک پوری رحمہ اللہ نے اپنے والد مکرم حافظ عبدالرحیم کے استاذِ محترم مولانا محمد بن عبدالعزیز مچھلی شہری سے سند لی۔ وہ بہ یک واسطہ امام شوکانی رحمہ اللہ کے شاگرد تھے۔ یہ سلسلہ سند اس طرح ہے:

ابو العلی محمد عبدالرحمن المبارک فوری عن علامة محمد بن عبدالعزیز المدعو بالشیخ محمد الهاشمی الجعفری عن الشیخ ابی الفضل عبدالخالق البنارسی عن امام المحدثین القاضی محمد بن علی الشوکانی .

مولانا محمد ہاشمی جعفری ۱۲۵۲ھ کو پیدا اور ۱۳۔ جمادی الاخریٰ ۱۳۲۰ھ کو فوت ہوئے۔

۱۳۱۴ھ میں قیام آرہ کے زمانے میں مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری نے شیخ العرب والعجم قاضی حسین بن محسن انصاری یمانی سے سند لی۔

حضرت قاضی حسین بن محسن انصاری کی تاریخ ولادت ۱۴۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۵ھ اور تاریخ وفات ۱۰۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۷ھ ہے۔

ان دونوں اصحابِ فضل سے حضرت ممدوح نے فارغ التحصیل ہونے کے کئی سال بعد بعض کتب حدیث کے چند مقامات سنا کر اس وقت سندات لیں، جب کہ آپ باقاعدہ خدمت تدریس سرانجام دے رہے تھے۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا جس کا انھیں ان بزرگانِ ذی اکرام کی بارگاہِ فضیلت سے مستحق قرار دیا گیا۔ اس قسم کی حصولِ سند کا مطلب اپنی سند کو عالی ثابت کرنا ہوتا ہے اور یہ سلسلہ اسلاف سے چلا آرہا ہے۔

حضرت مولانا مبارک پوری کے والد محترم حافظ عبدالرحیم نے کسی زمانے میں ایک مکان میں درس گاہ قائم کی تھی، جس میں طلبا تعلیم حاصل کرتے تھے۔ مولانا مبارک پوری فارغ التحصیل ہو کر آئے تو انھوں نے بھی اس درس گاہ میں سلسلۂ تدریس شروع کر دیا۔ اس درس گاہ کا نام دار التعلیم تھا۔ اس مدرسے نے بڑی ترقی کی۔ تدریس کے علاوہ مولانا مبارک پوری یہاں فتویٰ نویسی کی خدمت بھی سرانجام دیتے تھے۔ اس مدرسے کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی تھی۔ تھوڑی مدت میں مختلف علاقوں کے طلبا کافی تعداد میں اس مدرسے میں داخل ہوئے اور کسب علم کیا۔ ان طلبا کی وسیع جماعت میں سیرۃ البخاری کے مصنف شہیر مولانا عبدالسلام مبارک پوری، دنیاے اسلام کے ممتاز عالم ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی، مولانا عبداللہ نجدی، شارح مشکوٰۃ مولانا عبید اللہ رحمانی، معروف مصنف ومعلم مولانا نذیر احمد رحمانی املوی اور مولانا حکیم خدابخش شامل ہیں۔ ان حضرات نے مدرسہ دار التعلیم

میں حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری سے اخذ علم کیا۔ یہ مدرسہ اب بھی قائم ہے اور تشنگانِ علوم اس کے اساتذہ سے استفادہ کرتے ہیں۔ ❶

مدرسہ دارالتعلیم میں خدمت تدریس کے علاوہ مولانا مبارک پوری رحمہ اللہ نے اضلاع گونڈہ وبستی وغیرہ کے تبلیغی دورے کیے اور ان اضلاع کے لوگ ان کی تبلیغی مساعی سے بے حد متاثر ہوئے۔ بلرام پور (ضلع گونڈہ) میں اسلامی مدرسہ قائم کیا، جس میں ایک مدت تک وہ قرآن وحدیث کا درس دیتے رہے۔

۱۹۰۴ء (۱۳۳۹ھ) میں ایک مقام اللہ نگر میں دینی مدرسے کی تاسیس کی، جس کا نام وہاں کے لوگوں نے ''فیض العلوم'' رکھا۔ ۱۹۰۷ء میں کنڈو، بونڈیہار کے سرکردہ لوگوں کی دعوت پر تشریف لے گئے تو وہاں دریاے راپتی کے کنارے جامعہ سراج العلوم کی بنیاد رکھی۔ یہاں ان سے بہت سے شائقین علم نے اکتسابِ فیض کیا۔

حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ کے شاگرد رشید مولانا ابراہیم صاحب آروی مرحوم نے آرہ میں مدرسہ احمدیہ کے نام سے ایک دارالعلوم جاری کیا تھا۔ حضرت حافظ عبداللہ غازی پوری رحمہ اللہ کے حکم سے مولانا مبارک پوری ۱۹۱۰ء میں مدرسہ احمدیہ (آرہ) میں درس وتدریس میں مشغول ہوئے۔

کلکتہ کے مدرسہ دارالقرآن والحدیث میں بھی چند سال ان کی تدریسی سرگرمیاں جاری رہیں۔ اس کے بعد اپنے وطن مبارک پور واپس تشریف لے آئے اور پھر تدریس کے لیے کہیں نہیں گئے۔ گھر میں بیٹھ کر تصنیف وتالیف کو اپنا مقصدِ حیات قرار دے لیا۔

اس اثنا میں سعودی عرب کے حکمران سلطان عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن مرحوم نے بھی ان کو بیت اللہ شریف میں درسِ حدیث کے لیے دعوت دی، لیکن اس وقت وہ جامع ترمذی کی شرح تحفۃ الاحوذی لکھ رہے تھے، اس لیے سلطان موصوف سے معذرت کردی اور فرمایا اب میں شرحِ ترمذی کے اہم کام میں مصروف ہوں۔

دارالحدیث رحمانیہ دہلی کے ناظم شیخ عطاء الرحمٰن مرحوم نے گراں قدر مشاہرے پر دارالحدیث کی صدر مدرسی کے لیے طلب کیا۔ اس پر بھی معذرت فرما دی۔ ❷

---

❶ ملاحظہ ہو مولانا محمد عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری۔ حیات اور خدمات، ص: ۷۹، ۸۰۔ نیز جماعت اہل حدیث کی تدریسی خدمات، ص: ۶۴، ۶۵۔

❷ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مقدمہ تحفۃ الاحوذی (ترجمۃ المولف) اور ''مولانا محمد عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری۔ حیات اور خدمات'' از ڈاکٹر عین الحق قاسمی، ص: ۸

حضرت مولانا مبارک پوری رحمہ اللہ کی عمر مبارک کے بائیس تیئس سال درس وتدریس کی وادیوں میں گزرے اور اس اثنا میں مبارک پور، بستی، آرہ اور کلکتہ وغیرہ کی درس گاہوں میں انھوں نے جلیل القدر معلم کی حیثیت سے بے پناہ خدمات سرانجام دیں اور علما وطلبا کی کثیر تعداد نے ان سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ ان حضرات میں مولانا عبدالسلام مبارک پوری، ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی، مولانا عبیداللہ رحمانی، مولانا نذیر احمد رحمانی املوی، محترمہ رقیہ بنت علامہ خلیل عرب، مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی، مولانا حکیم عبدالسمیع مبارک پوری، مولانا محمد امین اثری، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا محمد اسحاق اثری، مولانا عبداللہ نجدی، مولانا شاہ محمد سریانوی، مولانا حکیم عبدالرزاق صادق پوری شامل ہیں۔ پھر آگے چل کر ان میں سے ہر عالم نے تدریسی، تصنیفی اور تبلیغی شعبوں میں بے حد تگ ودو کی اور لوگوں نے ان سے بہت فیض پایا۔

حضرت مولانا کی تصنیفی جدوجہد

آیئے اب آئندہ سطور میں حضرت مولانا مبارک پوری رحمہ اللہ کی تصنیفی جدوجہد سے آگاہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ ۱۳۲۰ھ میں ان کو حضرت مولانا شمس الحق صاحب ڈیانوی رحمہ اللہ نے تصنیفی کام میں معاونت کے لیے اپنے ہاں بلا لیا تھا۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ۱۳۲۰ھ سے لے کر ۱۳۲۳ھ تک چار سال وہ مولانا ڈیانوی کے پاس قیام فرما رہے۔ لیکن مولانا محمد عزیر کی تحقیق کے مطابق ۱۳۱۷ھ سے ۱۳۲۳ھ تک سات سال ان کا قیام مولانا ڈیانوی کے ہاں رہا۔ [1]

مشہور روایت یہ ہے کہ اس اثنا میں مولانا مبارک پوری نے سنن ابی داؤد کی شرح عون المعبود کی تصنیف کے سلسلے میں مولانا ڈیانوی کی معاونت فرمائی۔ لیکن عون المعبود کے مقدمے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوداؤد کی شرح ''غایۃ المقصود'' کی تصنیف میں ان کی معاونت کی تھی۔ [2]

اب حضرت مولانا مبارک پوری کی تصانیف کا تذکرہ ......!

ان کی تصانیف کی تعداد بیس تک پہنچتی ہے، جن میں سے گیارہ مطبوعہ ہیں اور نو غیر مطبوعہ۔

پہلے مطبوعہ کا تذکرہ۔

① ...... تحفۃ الاحوذی شرح جامع ترمذی: یہ حضرت مرحوم کی نہایت مہتم بالشان کتاب ہے جو

---

1. حیات المحدث شمس الحق واعمالہ از مولانا محمد عزیر، ص: ۲۹۷
2. اس کی تفصیل حضرت مولانا شمس الحق کے تذکرے میں ملاحظہ فرمایئے۔

چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور ایک جلد میں مقدمہ ہے۔ مقدمہ ۳۴۴ صفحات پر محیط ہے۔ مقدمہ کے آخر میں حضرت مولانا مبارک پوری کے مختصر حالاتِ زندگی مولانا ابوالفضل عبد السمیع مبارک پوری کے رقم فرمودہ ہیں۔ مقدمے سمیت اس کی پانچ جلدیں ہوئیں۔

جامع ترمذی کی متعدد حضرات علما نے شرحیں لکھی ہیں۔ حضرت مولانا مبارک پوری کو یہ شرح ضبط تحریر میں لانے کی تحریک اس وقت ہوئی تھی جب وہ گونڈہ اور بستی وغیرہ میں قیام فرما تھے۔ مولانا نے اس کی تصنیف کا کام شروع بھی فرما دیا تھا۔ لیکن اس کی تکمیل بعد میں ہوئی۔ [1]

تحفۃ الاحوذی کے مقدمے کا جو حصہ حضرت مولانا مبارک پوری اپنی بعض جسمانی کمزوریوں کی وجہ سے نہیں لکھ پائے تھے، اس کی تکمیل حضرت کی وفات کے بعد حضرت مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی اور مولانا عبدالصمد صاحب مبارک پوری نے فرمائی اور یہ مقدمہ ۱۳۵۹ھ میں جید برقی پریس دہلی سے شائع ہوا۔

تحفۃ الاحوذی مع مقدمہ کے بہت چھپی، بہت مقبول ہوئی اور بہت پڑھی گئی۔ حضرت مصنف رحمہ اللہ کا یہ عظیم الشان کارنامہ ہے اور حدیث رسول (ﷺ) کی بہت بڑی خدمت ...... ۱۴۰۴ھ میں یہ عظیم الشان کتاب ہمارے مرحوم دوست مولانا محمد صادق خلیل نے اپنے اشاعتی و تصنیفی ادارے ''ضیاء السنۃ ادارۃ الترجمہ والتصانیف'' رحمت آباد فیصل آباد کی طرف سے شائع کی تھی۔

② ...... مقدمہ تحفۃ الاحوذی: اس کے متعلق بعض گزارشات گزشتہ سطور میں پیش کی جا چکی ہیں۔

③ ...... ابکار المنن فی تنقید آثار السنن: یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور اس میں مولانا ظہیر احسن شوق نیموی (متوفی ۱۳۲۲ھ) کی کتاب آثار السنن (جز اوّل) پر تنقید کی گئی ہے، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔

مولانا ظہیر احسن شوق نیموی اس عہد کے مشہور حنفی المسلک عالم تھے اور مولانا مبارک پوری کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے ''آثار السنن'' کے نام سے بہ زعم خویش بلوغ المرام کے انداز میں کتاب لکھی، جس میں مسائل حنفیہ تقلید وغیرہ کی تائید میں ضعیف حدیثیں جمع کی گئی تھیں۔ مولانا مبارک پوری نے ''ابکار المنن فی تنقید آثار السنن'' کے نام سے اس کا جواب لکھا۔ یہ کتاب تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔

④ ...... تحقیق الکلام فی وجوب القرأۃ خلف الامام: یہ کتاب اردو زبان میں ہے اور دو حصوں میں ہے۔ اس میں احادیث کی رو سے ثابت کیا گیا ہے کہ نماز میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا

---

[1] مولانا محمد عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری۔ حیات اور خدمات، ص: ۳۵ بحوالہ یادگار مجلہ، ص: ۸۰، ۸۱

واجب ہے۔ اس موضوع پر احناف کے نقطہ نظر کا تفصیل سے جواب دیا گیا ہے۔

یہ اہم کتاب متعدد مرتبہ چھپی۔ مولانا عبدالشکور شاہ نے بھی ۱۹۶۸ء میں ادارہ علوم اثریہ سانگلہ ہل (ضلع شیخوپورہ) کی طرف سے شائع کی تھی۔

⑤...... خیر الماعون فی منع الفرار من الطاعون: ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء میں مبارک پور میں طاعون کی وبا پھیل گئی تھی، جس کی وجہ سے بہت سے لوگ مر گئے تھے اور جو بچ گئے وہ وہاں سے دوسرے علاقوں میں بھاگنے لگے تھے۔ اس وقت مولانا عبدالعلیم صاحب مبارک پوری نے ''کتاب الشہادۃ'' اور مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری نے کتاب ''خیر الماعون فی منع الفرار من الطاعون'' لکھی۔ یہ کتاب اردو زبان میں ہے۔ اس میں احادیث اور آثار صحابہ کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ طاعون زدہ علاقے سے بھاگنا نہیں چاہیے۔

⑥...... کتاب الجنائز: یہ کتاب بھی اردو زبان میں ہے اور اس میں انسان کی وفات سے تدفین تک کے ضروری مسائل کتاب وسنت کی روشنی میں بیان کیے گئے ہیں۔

⑦...... القول السدید فیما یتعلق بتکبیرات العید: یہ کتاب بھی اردو زبان میں ہے اور غالباً اس زمانے کی تصنیف ہے جب حضرت مولانا مبارک پوری مدرسہ دارالقرآن والحدیث کلکتہ میں تدریسی خدمات انجام دیتے تھے۔ اس میں تکبیراتِ عیدین کے متعلق چند سوالوں کا جواب دیا گیا ہے اور صحیح دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ نماز عیدین کی پہلی رکعت میں قرأت سے پہلے سات تکبیریں اور دوسری رکعت میں قرأت سے پہلے پانچ تکبیریں کہنی چاہئیں۔ اس مسئلے کی وضاحت کے سلسلے میں یہ نہایت اہم کتاب ہے۔

⑧...... نور الابصار: یہ بھی اردو زبان میں ہے۔ اس میں ثابت کیا گیا ہے کہ جمعہ ہر جگہ پڑھنا چاہیے، شہروں میں بھی اور قصبات و دیہات میں بھی۔ کتاب کے سرورق پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ قول درج ہے: جمعوا حیثما کنتم

''یعنی تم جہاں کہیں بھی ہو، جمعہ ضرور پڑھو۔''

⑨...... تنویر الابصار فی تائید نور الابصار: یہ بھی اردو زبان میں ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ مولانا کی پہلی کتاب یعنی ''نور الابصار'' کی تائید میں ہے۔

⑩...... ضیاء الابصار فی رد تبصرۃ الانظار: مولانا ظہیر احسن شوق نیموی نے مولانا مبارک پوری کے رسالے ''تنویر الابصار'' کا جواب ''تبصرۃ الانظار'' کے نام سے لکھا تھا جو ان کے رسالے ''سیر بنگال'' کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ مولانا مبارک پوری نے اس کے رد میں رسالہ ''ضیاء الابصار'' لکھا۔ اس کا پورا نام ''ضیاء الابصار فی رد تبصرۃ الانظار'' ہے۔ یہ رسالہ اردو میں ہے۔

⑪...... القالة الحسنیٰ فی المصافحة بالید الیمنیٰ: اردو زبان کے اس کتابچے میں حضرت مولانا مبارک پوری ﷫ نے ثابت کیا ہے کہ مصافحہ دائیں ہاتھ سے کرنا چاہیے، بائیں ہاتھ کو اس میں نہیں ملانا چاہیے، یعنی ایک ہی ہاتھ سے مصافحہ کیا جائے اور وہ ہے دایاں ہاتھ۔ یہی احادیث صحیحہ اور آثار صحابہ سے ثابت ہے۔ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا نہ کسی حدیث سے ثابت ہے، نہ کسی صحابی کے اثر سے، نہ کسی تابعی کے قول وفعل سے اور نہ ائمہ اربعہ یعنی (امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل) میں سے کسی امام سے۔

یہ تھیں حضرت مولانا مبارک پوری ﷫ کی مطبوعہ کتابیں۔ ان میں سے پہلی تین کتابیں یعنی تحفۃ الاحوذی، مقدمہ تحفۃ الاحوذی اور ابکار المنن فی تنقید آثار السنن عربی میں ہیں، باقی آٹھ اردو میں ہیں، نام سب کے عربی قسم کے ہیں۔

اب حضرت مرحوم کی غیر مطبوعہ کتابوں کی طرف آتے ہیں۔

①...... الدر المکنون فی تائید خیر الماعون: اردو زبان میں یہ رسالہ مولانا نے اپنی مطبوعہ کتاب ”خیر الماعون فی منع الفرار من الطاعون“ کی تائید میں لکھا ہے۔ غیر مطبوعہ ہے۔

②...... الوشاح الابریزی فی حکم الدواء الانکلیزی: یہ غیر مطبوعہ اردو رسالہ انگریزی ادویہ کے استعمال کے بارے میں ہے۔

③...... ارشاد الہائم الیٰ منع خصاء البہائم: اس رسالے میں جانوروں کو خصی کرنے کی ممانعت بیان کی گئی ہے۔ رسالہ اردو زبان میں ہے۔

④...... رفع الیدین للدعاء بعد الصلوات المکتوبۃ: اس میں فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کے متعلق وضاحت کی گئی ہے، لیکن یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ اس موضوع پر مولانا نے کیا موقف اختیار فرمایا ہے۔ کتاب غیر مطبوعہ ہے اور اردو میں ہے۔

⑤...... الکلمة الحسنیٰ فی المصافحة بالید الیمنیٰ: دائیں ہاتھ یعنی ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنے کے بارے میں۔ یہ رسالہ اردو میں ہے اور نامکمل ہے۔

⑥...... رسالة فی مسائل العشر: دس مسائل کے بارے میں نامکمل اردو مخطوطہ۔ یہ معلوم نہیں کہ دس مسائل کون سے ہیں۔

⑦...... رسالہ فی رکعة الوتر: رکعت وتر کے موضوع پر مولانا کا اردو میں قلمی رسالہ۔ ۱۷ صفحات کا یہ رسالہ مولانا مبارک پوری کے اپنے ہاتھ کا مرقومہ ہے۔

⑧...... تنقید الدرة الغرہ: مولانا ظہیر احسن شوق نیموی کا ایک رسالہ ”الدرة الغرة فی وضع الیدین علی الصدر وتحت السرة“ ہے، جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ نماز میں ہاتھ سینے پر نہ باندھے

جائیں بلکہ ناف کے نیچے باندھے جائیں۔ مولانا مبارک پوری نے اپنے رسالے ''تنقید الدرۃ الغرہ'' میں مولانا شوق نیموی کے اس رسالے پر تنقید فرمائی ہے۔ یہ قلمی رسالہ نامکمل ہے اور اردو میں ہے۔

سلسلۂ افتا

قرآن، حدیث، فقہ، ادبیات، خلافیات، درسیات ہر موضوع پر مولانا مبارک پوری وسیع نظر رکھتے تھے اور ہر اسلامی وفقہی مسئلے پر بے تکلف گفتگو فرماتے تھے۔ مسائل کے استخراج واستنباط میں مرتبہ اجتہاد پر فائز تھے۔ تمام مسالک فقہ کی چھوٹی بڑی کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ تدریس وتصنیف کے ساتھ ساتھ ان کا سلسلۂ افتا بھی جاری رہتا تھا اور ہر مسلک کے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مسائل پوچھتے تھے، وہ بلا تامل سب کو جواب دیتے تھے۔ زبانی مسائل بھی بیان فرماتے تھے اور تحریری جواب سے بھی نوازتے تھے۔ قاضی اطہر مبارک پوری لکھتے ہیں:

''بینائی سے محروم ہوجانے کے بعد بعض درسی کتابوں کی عبارتیں زبانی پڑھا کرتے تھے اور ہر قسم کے فتوے لکھوایا کرتے تھے۔'' [1]

قاضی صاحب ممدوح آگے تحریر فرماتے ہیں:

''ہر مکتب خیال کے لوگ مولانا سے علمی مسائل دریافت کرتے تھے اور وہ ہر مسلک والے کو اس کے مسلک کے مطابق مسئلہ بتاتے تھے۔'' [2]

مولانا کے والد حافظ عبدالرحیم صاحب کو لوگ ''بڑے حافظ صاحب'' کہا کرتے تھے اور مولانا ''بڑے مولانا صاحب'' کے لقب سے متعارف تھے۔ [3]

مولانا صفی الرحمٰن صاحب مبارک پوری مسائل شرعی پر حضرت کی وسعت نظر کے بارے میں مولانا عبدالکبیر صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''شیعہ حضرات اپنے مسلک کے متعلق آپ کے بیان کردہ مسئلے کو اپنے علما کے بتلائے ہوئے مسئلے کے مقابل زیادہ صحیح سمجھتے تھے۔'' [4]

---

1. تذکرہ علمائے مبارک پور، ص:۱۴۹
2. ایضاً
3. تذکرہ علمائے مبارک پور، ص:۱۵۰
4. مولانا محمد عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری۔ حیات وخدمات، ص:۲۰۶

فتاویٰ نذیریہ کی ترتیب

فتاویٰ کے سلسلے میں حضرت مولانا مبارک پوری کی ایک بہت بڑی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے حضرت مولانا شمس الحق صاحب ڈیانوی کی فرمائش پر اپنے استاذ عالی قدر حضرت میاں سید نذیر حسین صاحب دہلوی رحمہ اللہ کے فتوے دو ضخیم جلدوں میں مرتب کیے اور جا بجا اپنے فتوے بھی ان میں شامل کیے۔ علاوہ ازیں بہت سے مطول، متوسط اور مختصر فتوے خود لکھے، جن کا شمار میں لانا مشکل ہے۔ ❶

آخر عمر میں اپنے استاذ مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری کے فتوے مولانا مبارک پوری نے فقہی ابواب کی ترتیب سے جمع کیے تھے جو چھپ نہیں سکے۔ ❷

یہ معلوم نہ ہوسکا کہ حضرت حافظ صاحب غازی پوری رحمہ اللہ کے فتاوے کا یہ مجموعہ کہاں ہے جو مولانا مبارک پوری نے فقہی ابواب کی صورت میں مرتب کیا تھا۔ اگر وہ موجود ہے (اور مذکورہ بالا الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجود ہے) تو اسے شائع کرنا چاہیے۔ فتاوے کے سلسلے کا یقیناً یہ بہترین مجموعہ ہوگا۔ اس کی اشاعت کی طرف توجہ فرمائی جائے تو یہ ایک عظیم دینی خدمت ہوگی۔

حضرت مولانا مبارک پوری کے فتاوے

خود حضرت مبارک پوری رحمہ اللہ نے فتاویٰ نویسی کے سلسلے میں بے حد علمی و تحقیقی کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ مقدمہ تحفۃ الاحوذی میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ممدوح فتویٰ نویسی کے معاملے میں بہت محتاط تھے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ وہ کسی استفتا کا جواب لکھنا چاہتے تو اس کے متعلق اپنے پاس تشریف لانے والے علماے کرام سے مشورہ کرتے اور اس کی تمام جزئیات پر غور وفکر کے بعد اس کا جواب تحریر فرماتے۔ یقیناً ان کے فتاوے کو بہت بڑے علمی سرمایے کی حیثیت حاصل ہے اور روز مرہ کی زندگی میں پیش آنے والے مختلف مسائل کے بارے میں ان کی تحقیق ایک جلیل القدر مجتہد عالم کی تحقیق ہے، ان کی جمع وتدوین اور اشاعت نہایت ضروری ہے۔

پتا چلا ہے کہ حضرت مرحوم کے پرپوتے ڈاکٹر رضاء اللہ صاحب مبارک پوری (استاذ جامعہ سلفیہ بنارس) نے فتاوے کے اس ذخیرہ کی جمع وترتیب کا کام شروع کردیا تھا۔ لیکن افسوس ہے ۳۰۔ مارچ ۲۰۰۳ء کو بمبئی میں (جہاں وہ جمعیت اہل حدیث کی دو روزہ کانفرنس میں شرکت کے لیے

---

❶ ایضاً

❷ ایضاً

تشریف لے گئے تھے) اچانک حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال کر گئے۔ وفات کے وقت ان کی عمر صرف ۴۹/ برس تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم ایک مکتوب میں جو انھوں نے ۳۱۔ دسمبر ۱۹۹۳ء کو ڈاکٹر عین الحق قاسمی کے نام ارسال فرمایا، لکھتے ہیں:

''جہاں تک فتویٰ نویسی کا تعلق ہے تو محدث مبارک پوری ﷫ اس فن سے شروع ہی سے منسلک رہے، چناں چہ اپنے استاذِ محترم جناب مولانا عبداللہ صاحب غازی پوری ﷫ کے فتاوے کی تنسیق وترتیب کا کام کیا تھا، جس کا ایک نسخہ ابھی جلد تک موجود تھا، مگر کچھ معترضین کی نظر [1] ہوگیا۔ اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری [2] شاید اس سلسلے میں کچھ رہنمائی کرسکیں۔ اسی طرح دوسرے استاذ محدث مولانا نذیر حسین صاحب (میاں صاحب) کے فتاوے کی ترتیب بھی آپ ہی نے دی تھی اور اس میں آپ کے فتاوے بھی مختلف اشکال میں ملتے ہیں، کبھی تائید کی شکل میں کبھی مخالفت [3] کی شکل میں اور کبھی مستقل آپ کے لکھے ہوئے فتاوے کی شکل میں، جس پر میاں صاحب کی تائید ہوتی ہے۔ اندازہ یہی ہے کہ فتاویٰ نذیریہ میں ایک ثلث (کم از کم) آپ کے فتاوے ملتے ہیں۔

''میرے پاس جو مجموعہ ہے، بہ ظاہر ایسا لگتا ہے کہ تایا محترم حکیم عبدالسلام صاحب ﷫ نے مختلف طریقوں سے انھیں جمع کیا ہے، کیوں کہ ان میں کچھ فتوے ایسے ہیں جو کسی پرچے سے منقول ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کی نقول موجود تھیں، چناں چہ ان میں بعض فتوے ایسے بھی ہیں کہ مستفتی کے سوالات موجود نہیں ہیں اور صراحت کردی گئی ہے کہ سوالات کے کاغذات نہیں مل سکے، اس لیے صرف جوابات پر اکتفا کیا گیا ہے اور کچھ ردود (کذا؟) کی شکل میں ہیں۔

''فتویٰ نویسی میں بھی مولانا مرحوم نے اپنی محدثانہ روش کو نہیں چھوڑا ہے۔ کتاب وسنت ہی کی روشنی میں ہر سوال کا جواب دینے کی کامیاب کوشش ہے۔ احادیث میں تحفۃ الاحوذی کا ہی اسلوب پایا جاتا ہے یعنی روایت ودرایت کا اسلوب۔

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ''نذر'' لکھنا چاہتے تھے، سبقت قلم سے ''نظر'' لکھا گیا۔

[2] حضرت مولانا عبیداللہ رحمانی کے صاحب زادے مراد ہیں۔

[3] مخالفت کا مطلب، اختلاف ہے، جیسے بعض شرعی مسائل میں بعض اوقات اہل علم باہم مختلف آرا رکھتے ہیں۔

"یہ میری اب تک کی معلومات کا خلاصہ ہے۔ مجموعے کو نقل کر لیا ہے، اب فتاویٰ نذیریہ سے ان کے فتاوے کو چھانٹ رہا ہوں، کیوں کہ یہی مشورے کے بعد طے پایا ہے کہ مجموعہ اور فتاویٰ نذیریہ سے ان کے فتاویٰ کو الگ کر کے ایک ساتھ شائع کیا جائے۔ بر وقت کتاب الجنائز کی تعریب [1] سے فراغت کے بعد اس کی تبییض میں لگا ہوا ہوں، اس سے فراغت مل جائے تو فتاویٰ پر لگوں گا۔" [2]

طبابت وحکمت

زمانہ قدیم میں علم طب کو بے حد اہمیت حاصل تھی۔ دینی تعلیم حاصل کرنے والے لوگ خاص طور سے اس علم کو مرکز توجہ ٹھہراتے اور طالب علمی کے دور میں یا فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس علم کی کتابیں فن طب کے ماہرین سے باقاعدہ سبقاً سبقاً پڑھتے تھے۔ ان کتابوں میں موجز القانون، حمیات شیخ، کلیات نفیسی، معالجات سدیدی اور شرح اسباب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

حضرت مولانا مبارک پوری رحمہ اللہ کے خاندان کے پرانے اہل علم اس فن سے دلچسپی رکھتے تھے۔ حضرت مرحوم کے والد حافظ عبدالرحیم صاحب اپنے شہر اور علاقے کے مشہور طبیب تھے۔ مولانا مبارک پوری نے بھی یہ علم پڑھا۔ یعنی یہ علم انھیں اپنے خاندان کی طرف سے ورثے میں ملا تھا۔ اس کا ذکر قاضی اطہر مبارک پوری نے بھی کیا ہے۔ [3]

اس عہد کے اطبا زہد وتقویٰ کی دولت سے بھی بہرہ ور ہوتے تھے اور نادار مریضوں کا مفت بھی علاج کرتے تھے۔ بلکہ اگر انھیں اپنے گاؤں یا گرد وپیش کے کسی گاؤں کے مریض کا پتا چل جاتا تو خود اس کے گھر جاتے اور علاج کرتے یا اسے نسخہ لکھ کر دیتے۔ یہ کام چوں کہ اخلاص پر مبنی ہوتا تھا، اس لیے ان اطبا کے علاج سے اللہ مریض کو صحت بخشتا تھا۔

حضرت مرحوم بھی طبیب تھے اور یہی ان کا ذریعہ آمدنی تھا۔ چناں چہ حضرت کے شاگرد ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی لکھتے ہیں:

> سوائے طبابت کے مولانا کا کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا، اس کے باوجود جود وسخا میں جماعت علما میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ عصر سے مغرب تک کا وقت انھوں نے مریضوں

---

[1] اس سے معلوم ہوا کہ حضرت مولانا مبارک پوری کی اردو تصنیف کتاب الجنائز کا ڈاکٹر رضاء اللہ مبارک پوری مرحوم نے عربی زبان میں ترجمہ کر دیا ہے۔

[2] مولانا محمد عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری۔ حیات وخدمات، ص: ۲۰۷، ۲۰۸

[3] تذکرہ علمائے مبارک پور، ص: ۱۴۹

کے لیے خاص کر رکھا تھا۔ تعجب ہے مولانا کے تذکرہ نگاروں میں سے کسی نے بھی ان کی مہارتِ طب کا ذکر نہیں کیا، حالاں کہ یہ ان کی نمایاں خصوصیت، بہترین صفت اور انبیا و مرسلین بالخصوص خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی اقتدا ہے، کیوں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ارواح وابدان دونوں کے طبیب تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ حضرت مولانا کو طب نفوس کے ساتھ ساتھ طب ابدان کا بھی وافر حصہ ملا تھا جو دراصل نبی ﷺ کی میراث ہے۔ مولانا غریبوں سے علاج کی اجرت نہیں لیتے تھے، البتہ امیر لوگ جو اجرت دیتے، وہ قبول فرما لیتے تھے۔ اسی طرح مولانا صاحب صحیحین کی اس حدیث پر پوری طرح عمل پیرا تھے، جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ سب سے بہترین کھانا آدمی کے اپنے ہاتھ کی کمائی کا ہے اور اللہ کے نبی داوٗد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے۔ [1]

ڈاکٹر رضاء اللہ مبارک پوری مرحوم ایک مکتوب میں جو انھوں نے ۳۱۔ دسمبر ۱۹۹۳ء کو ڈاکٹر عین الحق قاسمی کے نام جامعہ سلفیہ بنارس سے ارسال کیا، لکھتے ہیں:

استاذ محترم ڈاکٹر تقی الدین ہلالی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے اور شاید "**الدعوة الى الله فى اقطار مختلفه**" نامی کتاب میں بھی لکھا ہے کہ مولانا طبابت کرتے تھے اور صرف دو تین گھنٹے دکان میں وقت دیتے تھے، بقیہ اوقات تعلیم وتعلم اور تالیف کتب میں گزارتے تھے۔ اس کی تائید محترمہ پھوپھی صاحبہ کے بیان سے ہوتی ہے، وہ کہا کرتی ہیں کہ چچا جان (یعنی مولانا صاحب) ہفتے عشرے میں ایک دن ہم چھوٹی بچیوں کو دکان صاف کرنے کا حکم دیتے تھے۔ اس پر ہمیں بڑی خوشی ہوتی تھی، کیوں کہ دکان کی صفائی کرتے وقت اِدھر اُدھر سے پیسے ملا کرتے تھے، جو ہمارے ہوتے تھے۔ اس لیے ہم اس دن کا بڑی شدت سے انتظار کرتے تھے۔

حضرت مولانا مبارک پوری کے بھتیجے حاجی عبدالسلام بن حکیم محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں:

حضرت مولانا رحمہ اللہ کا اصل کام تصنیف وتالیف کا تھا۔ اس اثنا میں وہ کچھ طبابت بھی کر لیا کرتے تھے۔ طبابت میں نسخہ نویسی کی فیس بالکل نہیں لیتے تھے، عطار جو آپ کے گھرانے ہی کا تھا، دواؤں کے پیسے لیتا تھا۔

---

[1] مولانا محمد عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری۔ حیات اور خدمات، ص: ۲۱۴۔ بحوالہ مجلہ صوت الجامعۃ (عربی) ماہ ستمبر ۱۹۷۳ء (جامعہ سلفیہ بنارس) ص: ۲۵، ۲۶

حکیم عبدالسمیع صاحب نے مولانا عبدالرحمٰن صاحب ہی سے پڑھا تھا۔ وہ ہمیشہ مولانا کے ساتھ رہے، دوا باندھنے میں بھی اور دوسرے کاموں میں بھی۔ انھوں نے امراضِ چشم میں بڑی مہارت پیدا کر لی تھی۔ ایک سرمہ مشہور ہے جو پہلے حکیم محمد شفیع صاحب نے بنایا تھا، اسی کو مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے جاری رکھا جو بعد میں "حکیم عبدالسمیع کا سرمہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ ❶

ضلع بستی کے ایک صاحب نے بذریعہ خط حضرت مولانا مبارک پوری سے کچھ دوائیں طلب کی تھیں اور دو مریضوں کا مرض بتا کر مشورہ لیا تھا۔ ایک مریض کا نام دریاؤ تھا اور ایک کا جگو۔ خط لکھنے والے کا نام عبدالرحیم ہے۔ خط ملاحظہ فرمایئے:

مولانا صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ...... دوائیں مطلوب ہیں۔ اطریفل کشنیزی (نصف پاؤ)، اطریفل سنائی (ایک پاؤ) مریض دریاؤ، جس کا مرض یہ ہے کہ کلیجہ وتمام جسم پھڑکنے لگتا ہے اور سن سناہٹ پیدا ہو جاتی ہے اور سر میں چکر آ جاتا ہے۔ اس مرض کی دوا کا تخمینا آپ نے دو روپیہ میں ڈھائی تین تک کیا تھا۔ دوسرے مریض جگو ہیں، جن کی بیماری یہ ہے کہ وہ بالکل سست رہتے ہیں اور کسی سے بولتے نہیں۔ اگر کام کرنے کو کہا جائے تو کرتے بھی نہیں، جن کی تشخیص آپ کر چکے ہیں، نوشادر (پاؤ) معجون ملین (پاؤ) خمیرہ گاؤ زبان (پاؤ) گل روغن (پاؤ) یہ سب دوائیں اور مریضوں کو لکھا گیا ہے۔ دریاؤ کی دوا کا وقت خورد ونوش۔ ہر اک کی قیمت علیحدہ لکھی جائے تو از حد مشکور ہوں گا۔

پتا یہ ہے: ضلع بستی۔ ڈاک خانہ لوٹن۔ مدرسہ اسلامیہ بھرا پورہ، مدرس عبدالرحیم کو ملے ......۱۳۔ مارچ ۱۹۳۰ء ❷

اللہ! اللہ!! حضرت مولانا رحمہ اللہ کے ساتھ ان دو غیر معروف مریضوں (دریاؤ اور جگو) اور تیسرے مکتوب نگار عبدالرحیم بھی تاریخ کا حصہ بن گئے۔ کسی نے کتنی صحیح بات کی ہے۔ صحبت صالح ترا صالح کند۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ کے دواخانے کا نام "دواخانہ مفید عام" تھا۔ آج بھی اس خاندان میں علم وفضل کے ساتھ ساتھ طبابت کی قدیم روایت قائم ہے۔ ڈاکٹری سلسلہ بھی جاری ہوگیا ہے۔ یہ سلسلہ ڈاکٹر محمد تقی صاحب اعظمی اور حکیم سیف الرحمٰن احوذی کے ذریعے سے جاری ہے۔ ان کے دواخانے

---

❶ مولانا محمد عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری۔ حیات اور خدمات، ص: ۲۱۶

❷ ایضاً، ص: ۲۱۷۔

کا وہی بابرکت نام ہے، دواخانہ مفید عام۔

خوش خطی

حضرت مولانا مبارک پوری رحمہ اللہ نہایت خوش خط تھے۔ اردو خط بھی بہت خوب صورت تھا اور عربی خط بھی......! ڈاکٹر عین الحق قاسمی نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے میں ان کے اردو عربی دونوں اسالیب خط کے نمونے دے دیے ہیں......!

حلیہ مبارک اور لباس

افسوس ہے اس فقیر کو ان کی زیارت کا شرف حاصل نہیں۔ لیکن خوشی کی بات ہے کہ قاضی اطہر مبارک پوری نے ان کا حلیہ مبارک بھی بیان کردیا ہے اور لباس بھی۔

قد میانہ، بدن گداز، رنگ گندمی، چہرہ خوب صورت ابھرا ہوا۔ سفید گاڑھے کا مغلئی پائجامہ، نیچا کرتہ، گول ٹوپی، کندھے پر بڑا رومال، ہاتھ میں چھڑی۔ [1]

ڈاکٹر عین الحق قاسمی لکھتے ہیں کہ مولانا محمد عمر مبارک پوری نے جو حضرت محدث مبارک پوری کے مستفیدین میں سے تھے، راقم الحروف کو حضرت کا یہی حلیہ بتایا تھا۔ [2]

مولانا امین احسن اصلاحی ان کے حلقہ شاگردی میں رہے ہیں۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

ان کا چہرہ نہایت معصوم تھا۔ بچوں کے سوا ان سے زیادہ معصوم چہرہ میں نے کسی کا نہیں دیکھا۔ ان کو دیکھ کر ان سے بے ساختہ محبت کرنے کو جی چاہتا تھا...... میں نے ان کی زبان سے کبھی ایک لفظ بھی ایسا نہیں سنا جس سے کم از کم یہی ظاہر ہوتا ہو کہ وہ اپنے آپ کو ایک عالم ہی سمجھتے ہیں۔ [3]

اخلاق وعادات

مقدمہ تحفۃ الاحوذی میں حضرت مولانا مبارک پوری کے حالات بیان کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ حضرت مولانا رحمہ اللہ عالی کردار اور بلند اخلاق عالم دین تھے۔ عمدہ ترین عادات واطوار کے مالک۔ تقویٰ شعار، دنیوی مال ومنال سے بے نیاز۔ کسی کی دولت کو قبول نہ فرماتے۔ دنیا کی کوئی حرص ان میں نہ تھی۔ (پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ) دارالحدیث رحمانیہ دہلی اس وقت اہل حدیث کا

---

[1] تذکرہ علمائے مبارک پور، ص:۱۵۱

[2] مولانا محمد عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری۔ حیات اور خدمات، ص: ۲۱۸

[3] ہفت روزہ ''المنبر'' (لائل پور) ۳۔ اگست ۱۹۵۵ء

بہت بڑا مدرسہ تھا جسے دہلی کے امیر ترین دو بھائی (شیخ عبدالرحمٰن اور عطاء الرحمٰن) بڑی فراخ دلی کے ساتھ چلا رہے تھے۔ ان کی طرف سے معقول مشاہرے پر حضرت مولانا کو وہاں کی صدر مدرسی کی پیش کش ہوئی، لیکن مولانا نے یہ پیش کش قبول نہیں فرمائی۔ اسی طرح سعودی حکومت نے حرم شریف میں گراں قدر تنخواہ پر انھیں درس کے لیے دعوت دی، یہ دعوت بھی قبول نہیں کی۔ فرمایا: بہ قدر کفاف جو کچھ مجھے مل رہا ہے، میں اس پر خوش ہوں۔

نہایت متواضع، منکسر اور ملنسار تھے۔ علما وطلبا سے بہ درجہ غایت محبت رکھتے تھے۔ ہر طالب علم کی ذہنی اور علمی صلاحیت کا خیال رکھتے اور اس نہج سے بات کرتے جو وہ آسانی سے سمجھ سکتا۔

علما وطلبا کے علاوہ غیر تعلیم یافتہ لوگوں سے رابطہ رکھتے۔ رشتے داروں اور غیر رشتے داروں سب سے حسن سلوک کا برتاؤ فرماتے۔ سب کی بات توجہ سے سنتے اور مشورہ لینے والوں کو مفید مشورہ دیتے۔

ان کا زیادہ تر وقت درس وتدریس، مطالعہ وتصنیف اور قرآن وحدیث کے مسائل پر غور وتدبر میں صرف ہوتا یا عبادت اور ذکر الٰہی میں مشغول ہوجاتے۔ نرم کلام اور شیریں گفتار تھے۔ وقار ومتانت کا پیکر اور رعب وجلال کے مالک۔ لوگوں سے ملتے اور ان کی ضروری باتیں سنتے لیکن کسی کو ان کی مجلس میں کسی شخص کی غیبت کرنے یا کسی کے متعلق ناشائستہ الفاظ کہنے کی مجال نہ تھی۔ اگر کسی کی زبان سے اس قسم کا کوئی لفظ نکل جاتا تو سخت ناگواری کا اظہار کرتے۔ ان اوصاف وکمالات کی وجہ سے لوگ ان سے انتہائی متاثر تھے اور ان کے دلوں میں ان کی بے پناہ قدر تھی۔ گونڈہ، بستی اور دیگر مقامات کے بہت سے لوگ ان کے حلقہ بیعت میں شامل تھے۔

انھیں تجدد، فیشن اور یورپی تہذیب وثقافت سے شدید نفرت تھی۔ طلبا اور عقیدت مندوں کو مغربی لباس اور طور طریق سے روکتے اور سادگی کا درس دیتے۔ یہ اور اس قسم کی بہت سی باتیں مقدمہ تحفۃ الاحوذی میں مرقوم ہیں۔ جب مسند درس پر بیٹھ جاتے تو دوران درس کوئی کتنا ہی بڑا آدمی آجاتا، اس کی طرف توجہ نہ فرماتے اور کسی کی پروا کیے بغیر تدریس کا سلسلہ جاری رکھتے۔ اختتام درس کے بعد اس کی طرف توجہ فرماتے اور اس سے بات چیت کرتے۔ [1]

زاہدانہ وغریبانہ زندگی

۱۹۵۵ء میں فیصل آباد سے مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف مرحوم کا ہفت روزہ ''المنبر'' شائع ہوتا تھا، اس کے اگست ۱۹۵۵ء کے شمارے میں حضرت مولانا مبارک پوری کے اخلاق اور عادات واطوار

---

[1] مولانا محمد عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری۔ حیات اور خدمات، ص: ۲۰۰۔ بحوالہ یادگار مجلہ، ص: ۸۸

کے بارے میں حضرت کے شاگرد مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کا مضمون شائع ہوا تھا جو اپنے موضوع کا جامع مضمون تھا۔ مولانا اصلاحی اس میں رقم طراز ہیں۔

مولانا (مبارک پوری) حقیقی معنوں میں زاہد تھے۔ انھوں نے دنیا کمانے کی کوئی فکر نہیں کی۔ آخر عمر میں تو تمام ترغیبات کو نظر انداز کر کے صرف فن حدیث کو لے کر اپنے حجرے میں معتکف ہوگئے تھے۔ ان کی زندگی نہایت درویشانہ اور غریبانہ تھی۔ حالاں کہ اگر وہ چاہتے تو بڑے عیش وآرام کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ وہ پشاور سے لے کر کلکتے تک اہل حدیث علما اور عوام کے مرکز عقیدت تھے اور سعودی حکومت بھی ایک زمانے میں ان کی خدمات حاصل کرنے کی متمنی تھی۔ لیکن وہ شرح ترمذی کا کام لے کر اس طرح دنیا سے منقطع ہو کر بیٹھ گئے کہ پھر موت کے سوا ان کے زاویے سے ان کو کوئی دوسرا نہ اٹھا سکا۔

مجسمۂ صبر و شکر

مولانا امین احسن اصلاحی مزید لکھتے ہیں:

اہل علم سے ان کی گفتگو ہمیشہ زیادہ تر مشکلاتِ حدیث سے متعلق ہوتی تھی۔ میں نے کبھی ان کی زبان سے کسی شخص کی غیبت یا ہجو نہیں سنی۔ خرابیٔ صحت، آنکھوں کی معذوری، کام کی کثرت اور رفقائے کار کی قلت کا شکوہ بھی کبھی ان کی زبان سے نہیں سنا، حالاں کہ یہ ساری تکلیفیں فی الواقع ان کو تھیں اور اگر نہ بھی ہوتیں تو بھی اگر وہ ان کا ذکر کرتے تو لوگ نہایت عقیدت سے ان کی بات سنتے، مگر وہ مجسمۂ صبر و شکر تھے، کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے۔

تقویٰ اور خشیت الٰہی

حضرت مرحوم کے بارے میں قاضی اطہر مبارک پوری مرحوم کی کتاب ''تذکرہ علمائے مبارک پور'' میں مرقوم بعض باتیں پہلے بیان کی جاچکی ہیں۔ ان کا تعلق ان کے شہر مبارک پور سے تھا اور وہ انھیں خوب جانتے تھے۔ فرماتے ہیں:

> مولانا کی زندگی سلف صالحین کا نمونہ تھی۔ علم وفضل، تقویٰ وطہارت، زہد وقناعت، انزوا وعزلت اور سادگی میں اپنی مثال آپ تھے۔ دنیا میں رہ کر دنیا سے بے گانہ۔ درس وتدریس، تصنیف وتالیف، طبابت وحکمت زندگی کے مشاغل تھے۔ خشیت الٰہی کا غلبہ تھا۔ سنا ہے جہری نماز نہیں پڑھاتے تھے، کیوں کہ رو دیا کرتے تھے۔ ان کے ایک عزیز شیخ شبلی کا انتقال ہوا، مولانا نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی تو آخری تکبیر میں بے

قابو ہوگئے، مشکل سے تکبیر پوری کر سکے۔ اس جنازے میں راقم بھی شامل تھا۔ [1]

حکیم عبدالحی حسنی نے بھی نزہۃ الخواطر میں مولانا مبارک پوری رحمہ اللہ کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے عربی الفاظ کا مطلب یہ ہے:

مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری علمائے ربانیین میں سے ایک عالم باعمل، خشوع وخضوع کے پیکر، رقیق القلب، کثیر البکاء، سخی اور طلبا کے لیے ایثار پیشہ اور انتہائی خیر خواہ۔ خورش و پوشش میں تکلف سے دور، دنیا سے بے نیاز، عہدہ ومنصب اور تنخواہوں کی حرص سے پاک۔ مطالعہ وتصنیف اور ذکر اللہ میں مشغول۔ سلیم الطبع، صاحب اللسان مگر خاموشی پسند۔ [2]

قوتِ حافظہ

حضرت مولانا مثالی قوتِ حافظہ کے مالک تھے۔ قاضی اطہر مبارک پوری رقم طراز ہیں:

ان کی قوتِ حافظہ بھی خداداد تھی۔ بینائی سے محروم ہوجانے کے بعد بھی بعض درسی کتابوں کی عبارتیں زبانی پڑھایا کرتے تھے اور ہر قسم کے فتوے لکھوایا کرتے تھے۔ [3]

حضرت کے حافظے کے متعلق مولانا امین احسن اصلاحی اپنے زمانہ طالب علمی کے واقعات بیان کرتے ہوئے ہفت روزہ ''المنیر'' لائل پور کے اگست ۱۹۵۵ء کے شمارے میں تحریر کرتے ہیں:

''ان کا حافظہ اتنا اچھا تھا کہ آنکھوں کی معذوری ان کے لیے کوئی بڑی رکاوٹ نہیں بن سکتی تھی۔ مجھے بارہا ایسا موقع پیش آیا کہ کسی ضرورت کے لیے انھوں نے کوئی کتاب نکلوائی اور بڑی آسانی کے ساتھ محض اپنے حافظے اور اپنے اندازے کے بل بوتے پر مطلوبہ حدیث یا مطلوبہ عبارت تلاش کروالی۔ بعض اوقات وہ یہ تک بتا دیتے کہ فلاں عبارت یا فلاں حدیث صفحے کے کس جانب یا کس حصے میں ہوگی۔ ان کا یہ استحضار میرے لیے اکثر حیرت کا باعث بنتا۔''

طلبا کے ساتھ شفقت ...... ایک حیرت انگیز واقعہ

حضرت مولانا مبارک پوری طلبا کے ساتھ انتہائی مشفقانہ رویہ اختیار فرماتے اور ان سے نہایت شفقت کا اظہار کرتے تھے۔ اس کا تذکرہ مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم نے بھی اپنے مضمون محررہ ''المنیر'' فیصل آباد (اگست ۱۹۵۵ء) میں کیا ہے اور ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی نے بھی ایک

---

1. تذکرہ علمائے مبارک پور، ص:۱۵۰
2. نزہۃ الخواطر، ج:۸، ص:۲۴۳
3. تذکرہ علمائے مبارک پور، ص:۱۴۹

مقالے مطبوعہ ''صوت الجامعۃ'' (بنارس) میں فرمایا ہے۔ ذیل میں ڈاکٹر ہلالی صاحب کا بیان کردہ واقعہ ملاحظہ کیجیے جو بے حد اثر انگیز ہے۔ لکھتے ہیں:

''مبارک پور میں مولانا نے استفادے کی غرض سے میرے قیام کے دوران شدید اصرار کے ساتھ مجھے اپنے ہاں مہمان کی حیثیت سے رکھا۔ چناں چہ نہ مجھے کسی ہوٹل میں جانا پڑا اور نہ کھانا کہیں سے خریدنے کی نوبت آئی۔ جب مبارک پور سے میری روانگی کا وقت آیا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اعظم گڑھ تک ٹرین سے جاؤں گا تو مولانا نے فرمایا کہ ٹرین سے نہ جاؤ، ہماری جان پہچان کے دو آدمی بیل گاڑی لے کر اعظم گڑھ جانے والے ہیں، ان کے ساتھ چلے جانا۔ یہ تمھارے لیے زیادہ آسان ہوگا۔ ادھر ان دونوں حضرات نے طے کیا تھا کہ آدھی رات کو نکلیں گے۔ چناں چہ عشا کی نماز کے بعد میں نے مولانا کو الوداع کہنا چاہا تو فرمایا روانگی کے وقت میں رخصت کرنے آؤں گا۔ میں نے عرض کی آپ کو زحمت ہوگی، نیند میں خلل پڑے گا۔ فرمایا کوئی بات نہیں ...... چناں چہ جب روانگی کا وقت ہوا اور میں اپنا بیگ اٹھا کر اپنے مسجد والے حجرے سے باہر نکلا تو مولانا کو موجود پایا۔ پھر ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے وہاں پہنچے جہاں وہ دونوں حضرات گاڑی لے کر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ رخصت کے وقت جب انھوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا: ''استودع الله دينك وامانتك وخواتيم عملك، زوّدك الله التقوىٰ ويسرلك الخير اينما توجهت'' تو اس کے ساتھ ہی انھوں نے چپکے سے میرے ہاتھ میں کوئی کاغذ تھمایا۔ میں نے محسوس کیا کہ نوٹ کی شکل میں کچھ رقم ہے تو میں نے واپس کرنا چاہا اور ''کہا جزاک اللہ، آپ نے تو لطف وکرم کی انتہا کردی، اس کی کیا ضرورت ہے۔'' اس پر انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ان دونوں حضرات سے کچھ دور ہوئے تو زور زور سے رونے لگے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور کہے جا رہے تھے، ''لے لو اسے، لے لو اسے۔'' چناں چہ میں نے وہ روپیہ لے لیا۔ ان کا رونا دیکھ کر میرے بدن میں کپکپی طاری ہوگئی اور میں بہت شرمندہ ہوا کہ میرا روپیہ لوٹانا ہی ان کے اس شدید گریہ کا سبب بنا۔ چناں چہ میں نے ان سے معافی چاہی اور انھوں نے معاف کردیا۔ سسکیاں لیتے ہوئے آنکھوں سے آنسو پونچھے اور ذرا سنبھلے تو میرا ہاتھ پکڑا اور گاڑی کی طرف بڑھے۔ پھر میں نے ان کو الوداع کہا اور گاڑی پر سوار ہوگیا۔ یہ تمام خیالات اور انفعالات میرے ذہن میں گھومتے رہے، یہاں تک کہ فجر کا وقت ہوگیا تو ہم لوگ نماز کے لیے رکے۔ میں نے ان دونوں حضرات کی امامت کی۔ جب میں نے قراءت شروع کی تو اس واقعہ کے تصور سے رو پڑا۔'' [1]

---

[1] مولانا محمد عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری۔ حیات وخدمات، ص: ۲۲۶ تا ۲۲۸۔ بحوالہ صوت الجامعہ، جامعہ سلفیہ بنارس (ستمبر ۱۹۷۳ء) مضمون ''اہل الحدیث فی الہند۔''

مولانا مبارک پوری طلبا سے جس شفقت کا اظہار فرماتے اور تعلیم کے سلسلے میں انھیں جس قسم کے صائب اور صحیح مشورے دیتے، اس سلسلے کا ایک واقعہ قاضی اطہر مبارک پور کا پڑھیے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں مولانا کی خدمت میں بہ سلسلہ علاج آتا جاتا تھا۔ کبھی کبھی یوں ہی چلا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ مولانا نے پوچھا: ''کون کون سی کتابیں پڑھتے ہو؟'' میں نے کتابوں کے نام بتائے تو فرمایا: ''منطق میں بہت پیچھے ہو، اس میں محنت کرو۔'' ان کی علمی مشغولیت اور تصنیفی انہماک دیکھ کر لکھنے پڑھنے کا حوصلہ ملا۔ ان کی زبان سے پہلی بار عربی کا یہ مقولہ سنا تھا: ''من ساوی یوماہ فھو فی الخسران.'' یعنی جس شخص کے دونوں دن برابر ہوں وہ نقصان میں ہے۔ ہر اگلا دن پچھلے دن سے بڑھا ہونا چاہیے۔ یہ جملہ آج تک کام دے رہا ہے۔'' [1]

بلند ترین علمی مرتبہ

اللہ نے مولانا مرحوم کی ذات میں بہت سے اوصاف جمع فرما دیے تھے۔ وہ تمام علوم مروّجہ میں مہارت رکھتے تھے۔ جن حضرات نے ان کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے، انھیں معلوم ہے کہ وہ اونچے درجے کے محقق اور بلند پایہ مصنف تھے۔ تدریس کا بھی انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ حدیث میں وہ درجۂ امامت پر فائز تھے۔ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی فرماتے ہیں:

''میں اپنے رب کو شاہد بنا کر کہتا ہوں کہ ہمارے شیخ عبدالرحمٰن بن عبدالرحیم مبارک پوری رحمہ اللہ اگر تیسری صدی ہجری کی شخصیت ہوتے تو آپ کی تمام وہ حدیثیں جنھیں آپ نبی کریم ﷺ سے یا آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم سے روایت کرتے، صحیح ترین احادیث ہوتیں اور ہر وہ چیز جسے آپ روایت کرتے، حجت بنتی اور اس بات میں دو آدمیوں کا بھی اختلاف نہ ہوتا۔'' [2]

---

[1] ''میری طالب علمی: قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔'' ص:۱۴۔ مطبوعہ مبارک پور۔ ۱۹۸۷۔ قاضی اطہر مبارک پوری نے ۱۴۔ جولائی ۱۹۹۶ء کو وفات پائی۔

[2] مولانا محمد عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری، ص:۲۳۲۔ بحوالہ ''صوت الجامعہ'' (بنارس) ماہ رجب ۱۳۹۴ھ۔ نیز دیکھیے سہ ماہی ''تحقیقات اسلامی'' علی گڑھ۔ دسمبر ۱۹۹۲ء۔ مضمون ''ہندوستان میں علما و محدثین کی دینی خدمات'' از مولانا غازی عزیر صاحب......

آنکھ کی تکلیف

زندگی کے آخری دور میں حضرت مولانا مبارک پوری کو آنکھ کی تکلیف ہوگئی تھی، یعنی نزول الماء کے مرض میں مبتلا ہوگئے تھے، جسے موتیا بند کہا جاتا ہے اور اس مرض کی وجہ سے پہلے ضعف بصارت ہوا، پھر تھوڑے عرصے میں بصارت ختم ہوگئی۔ اس وقت وہ تحفۃ الاحوذی (شرح جامع ترمذی) کی آخری جلد لکھ رہے تھے۔ اب انھوں نے اپنے عزیزوں حضرت مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری اور مولانا عبدالصمد مبارک پوری کی خدمات حاصل کیں اور ان کے تعاون سے اس کی آخری دو جلدیں مکمل فرمائیں۔

اس زمانے میں آنکھوں کے علاج نے زیادہ ترقی نہیں کی تھی۔ کہیں کہیں اس کا علاج ہوتا تھا۔ حضرت مرحوم کے خاندان کے لوگوں نے بار بار کہا کہ لکھنؤ یا دہلی جاکر آنکھ کا آپریشن کرایا جائے، دیگر حضرات نے بھی بہت اصرار کیا لیکن مولانا مرحوم صبر وشکر سے کام لے رہے تھے اور اللہ کی رضا پر راضی تھے۔ اب چلنا پھرنا بھی مشکل ہوگیا تھا اور تصنیف وتالیف کا تسلسل قائم رکھنے میں دشواری پیش آگئی تھی۔

آپریشن اور نظر کی بحالی

اسی حالت میں رجب ۱۳۵۳ھ میں تحفۃ الاحوذی کی آخری جلد کی طباعت کے لیے دہلی کا عزم کیا۔ افرادِ خانہ اور سب رفقائے کرام نے مشورہ دیا کہ دہلی میں آنکھ کا آپریشن ضرور کرایا جائے۔ چناں چہ دہلی جاکر ایک آنکھ کا آپریشن کرایا گیا۔ آپریشن کامیاب رہا اور بینائی بحال ہوگئی۔ سب نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور میل جول رکھنے والے تمام حضرات بے حد خوش ہوئے۔

اختلاجِ قلب اور وفات

دہلی سے واپس وطن (مبارک پور) تشریف لائے تو اختلاجِ قلب کے دورے پڑنے لگے اور اس مرض کی شدت میں روز بہ روز اضافہ ہوتا گیا۔ شعبان کا آخری نصف شدید تکلیف میں گزرا، رمضان شریف میں بھی یہی کیفیت رہی۔ اس کے ساتھ ہی بخار ہونے لگا۔ تیزی کے ساتھ تکلیفیں بڑھنے لگیں اور لمحہ بہ لمحہ وقت موعود قریب آتا گیا۔ بالآخر یہ نیر تاباں جو تمام عمر تصنیف وتالیف اور درس وتدریس کی صورت میں دنیا میں روشنی پھیلاتا رہا تھا، ۱۶۔ شوال ۱۳۵۳ھ (۲۲۔ جنوری ۱۹۳۵ء) کی رات کے آخری حصے میں ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

تجہیز وتکفین اور تدفین

اسی روز نمازِ عصر کے بعد تجہیز وتکفین کا مرحلہ طے ہوا۔ نمازِ جنازہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب صدر المدرسین مدرسہ فیض عام مئو نے پڑھائی، جس میں تمام مسالک فقہی کے لوگوں نے بہت بڑی تعداد میں شرکت کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس علاقے کی تاریخ میں اس سے پہلے کسی کے جنازے میں انسانوں کا اتنا بڑا ہجوم دیکھنے میں نہیں آیا۔ [1]

حضرت مولانا کو ان کے آبائی قبرستان میں دفن کیا گیا اور قبر کے سرہانے تاریخ کا کتبہ نصب ہے، جس پر یہ الفاظ کندہ ہیں:

''حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب المتوفی ۱۶۔شوال ۱۳۵۳۔۱۹۳۵ء''

اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه. اللهم نور قبره ووسع مدخله وادخله جنت الفردوس.

حضرت مرحوم کی وفات پر متعدد اہل علم نے لکھا۔ تعزیتی مضامین بھی لکھے گئے اور اشعار کی صورت میں بھی عربی، فارسی، اردو میں اظہارِ تعزیت کیا گیا۔ اس دور کے لکھنے والے سب بزرگانِ ذی مرتبت اپنی اپنی باری سے اللہ کے حضور پہنچ چکے ہیں، رحمہم اللہ تعالیٰ

میری عمر حضرت کی وفات کے وقت دس سال سے کم تھی اور میں اپنے وطن کوٹ کپورہ میں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف مرحوم ومغفور سے ابتدائی درسی کتابیں پڑھتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ استاذ محترم کو حضرت کی وفات کی خبر پہنچی تو انھوں نے نہایت افسردہ لہجے میں بتایا تھا کہ جامع ترمذی کی شرح تحفۃ الاحوذی کے مصنف مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری وفات پاگئے۔ وہ تحفۃ الاحوذی کے علاوہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔

میں نے حضرت کا اسم گرامی سب سے پہلے جناب مولانا عطاء اللہ حنیف مرحوم سے سنا تھا۔ پھر کاروانِ زندگی کچھ آگے بڑھا اور ذہن میں علمائے ذی اکرام کے حالات سے آگاہ ہونے کا جذبہ ابھرا تو حضرت مرحوم کے واقعات کی جستجو شروع کی، جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

حضرت مولانا کے حالات

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے حضرت مولانا مبارک پوری کی وفات سے فوری بعد کی اردو کی

---

[1] تذکرہ علمائے مبارک پور، ص: ۱۵۶۔ مقدمہ تحفۃ الاحوذی۔ یادگار مجلہ، ص: ۸۹۔ مولانا محمد عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری۔ ص: ۲۴۳، ۲۴۴۔

نثری اور شعری اخباری تحریروں کے علاوہ ''تراجم علماے حدیث ہند'' پہلی کتاب ہے، جس میں مولانا ابویحییٰ امام خاں نوشہروی نے حضرت کے متعلق مضمون لکھا۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ان کی وفات سے تین سال بعد ۱۹۳۸ء میں دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں شائع شدہ مضمون صرف چھ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں بھی دو صفحے اشعار نے لے لیے ہیں۔ مضمون اگرچہ بہت مختصر ہے تاہم حوالے کا مضمون ہے۔

عربی میں مقدمہ تحفۃ الاحوذی کے آخر میں ''ترجمۃ المؤلف'' کے عنوان سے مولانا عبدالسمیع مبارک پوری کا مقالہ چودہ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ نہایت جان دار اور پر از معلومات مقالہ ہے۔

عربی میں ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی کا مقالہ ''اہل الحدیث فی الہند'' ہے جو ستمبر ۱۹۷۳ء کے ''صوت الجامعہ'' (بنارس) میں چھپا، یہ تاثراتی اور واقعاتی مقالہ انتہائی اثر انگیز ہے۔ اس کے چند اقتباسات گزشتہ صفحات میں درج کیے گئے ہیں۔ جن کے پڑھنے سے حضرت مولانا مبارک پوری کی عظمت کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ اس میں رفیع القدر شاگرد نے عظیم المرتبت استاد کی سیرت اور خدمات پر جس انداز میں روشنی ڈالی ہے، وہ انتہائی قابل قدر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے محبوب و محسن استاذ کی خدمت میں درد و اخلاص میں ڈوبا ہوا نذرانہ پیش کر کے صحیح معنوں میں حق شاگردی ادا کیا ہے۔

اسی طرح مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کا مضمون (مطبوعہ اگست ۱۹۵۵ء ہفت روزہ ''المنیر'' فیصل آباد) حضرت مبارک پوری رحمہ اللہ کے متعلق جہاں بہت سی علمی و تحقیقی معلومات کی وضاحت کرتا ہے، وہاں ان کے تواضع، انکسار اور علما و طلبا سے ان کی شفقت و رافت کا بھی آئینہ دار ہے۔

پھر حضرت رحمہ اللہ کے ہم وطن و ہم مسکن قاضی اطہر مبارک پوری مرحوم نے ''تذکرہ علماے مبارک پور'' میں جس جذبہ عقیدت اور خلوصِ قلب کے ساتھ حضرت مولانا اور ان کے خاندان کے اہل علم کا تذکرہ کیا ہے، اس سے یہ فقیر بہت متاثر ہوا ہے۔ لیکن ''الرحیق المختوم'' کے فاضل مصنف مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری ایک مکتوب میں ڈاکٹر عین الحق قاسمی کو تحریر فرماتے ہیں:

''قاضی اطہر نے ''تذکرہ علماے مبارک پور'' میں مولانا (مبارک پوری) کا تذکرہ کرتے ہوئے کچھ جہالت ہی کا ثبوت دیا ہے۔''

اس سے آگے قاضی اطہر مبارک پوری کی ''جہالت'' کے ثبوت میں چند مثالیں دے کر قاضی صاحب کے بارے میں رقم فرمایا ہے:

''اس طرزِ فہم سے اندیشہ ہے کہ ان صاحب نے مزید گل کھلائے ہوں گے، اس لیے

ان سے استفادہ کرنا ہو تو ذرا بچ اور سنبھل کر۔" ❶

مرحوم و مغفور مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری نے قاضی اطہر مبارک پوری کی "جہالت" کے ثبوت میں جو مثالیں بیان فرمائی ہیں، یہ فقیر ان پر اظہار رائے نہیں کرنا چاہتا، اس لیے کہ یہ گنہگار حضرت مبارک پوری رحمہ اللہ کے خانوادۂ ذی عظمت کے ہر فرد کو انتہائی احترام کا مستحق گردانتا ہے۔ اس موقعے پر میں صرف یہ عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ حضرت مولانا رحمہ اللہ الفاظ کے استعمال میں بے حد محتاط تھے۔ ان کے عقیدت مند بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ ان کے گھرانے کے لائق احترام اہل علم اس باب میں ان کا تتبع کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔ انھیں خوب معلوم ہے کہ الفاظ کا کبھی قحط نہیں پڑا۔ علمائے لغت نے ہر زبان کے الفاظ بہ درجہ غایت محنت اور احتیاط کے ساتھ کتب لغات میں محفوظ کر کے لکھنے اور بولنے والوں کے حوالے کر دیے ہیں، ان الفاظ سے فائدہ اٹھانا اور مناسب اسلوب میں استعمال کرنا لکھنے اور بولنے والوں کا کام ہے۔

اس درجہ عظیم القدر خاندان کے کسی فاضل رکن کی تفہیم ہرگز میرا منصب نہیں، لیکن ان کی خدمت میں اتنی سی گزارش پیش کرنے کا حق تو بہر حال پہنچنا چاہیے کہ "جہالت" کی جگہ کوئی اور لفظ بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ مثلاً اس قسم کے مقامات پر "سہو" کا لفظ بھی بولا جا سکتا ہے، "غلط فہمی" کہنے سے بھی مطلب حل ہو جاتا ہے، "ناواقفیت" کے لفظ سے بھی کام چلایا جا سکتا ہے، "لغزش فہم" کی ترکیب سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ ان سطور کے راقم کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کسی اہل علم کی طرف "جہالت" وغیرہ کے الفاظ منسوب کرنے سے اہل علم کے لیے دامن کشاں رہنا زیادہ مناسب ہے۔ تحقیق وکاوش سے تعلق رکھنے اور تصنیف وتالیف میں منہمک رہنے والے شخص کی صاف لفظوں میں تجہیل کرنا میرے خیال میں حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ کے زاویۂ فکر سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ پھر نبی ﷺ کے خوش بخت سیرت نگاروں پر تو خاص طور سے لازم آتا ہے کہ کسی چھوٹے بڑے کے بارے میں اظہار رائے کرتے وقت الفاظ کے انتخاب میں بہ درجہ غایت احتیاط کا ثبوت بہم پہنچانے کی کوشش فرمائیں کہ نبی ﷺ کا طرزِ عمل اور اسوۂ حسنہ یہی تھا۔

مولانا صفی الرحمٰن صاحب فرماتے ہیں: "ان [قاضی اطہر مبارک پوری] سے استفادہ کرنا ہو تو ذرا بچ اور سنبھل کر۔"

گزارش یہ ہے کہ جس شخص کے پاس وہی کتاب ہے جو قاضی صاحب ممدوح نے لکھی ہے اور وہی اس کا ذریعۂ استفادہ ہے، اس کے لیے مولانا صفی الرحمٰن کی نصیحت پر عمل کرنے یعنی بچنے اور

---

❶ مولانا محمد عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری، ص: ۷۸

سنبھلنے کی کیا صورت ہوگی؟ حضرت مولانا مبارک پوری رحمہ اللہ کی وفات پر ستر سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اور (میری معلومات کے مطابق) ان کے خاندان کے تمام ارکان ماشاء اللہ اصحابِ علم اور اربابِ قلم ہیں۔ ان میں سے کسی معزز رکن نے آج تک (عربی کی بات نہیں کرتا) اردو میں حضرت رحمہ اللہ کے حالات میں کوئی کتاب نہیں لکھی۔ اب فرمایئے اردو دان طبقہ کیا کرے؟ کس سے استفادہ کرے؟ اتنے جلیل القدر عالم، اتنے عظیم مصنف اور رفیع المرتبت محدث کے حالات معلوم کرنے کے لیے میرے جیسے تھوڑی بہت اردو پڑھنے والے لوگ کس کے دروازے پر دستک دیں اور کس سے پتا کریں کہ ان سے متعلق واقعات کے لیے کہاں کہاں بچا اور سنبھلا جائے اور کہاں کہاں بچنے اور سنبھلنے کی ضرورت نہیں ہے؟

یہ فقیر حضرت مولانا مبارک پوری رحمہ اللہ کے اہل علم اخلاف کی خدمت میں نہایت ادب سے عرض کرنا چاہتا ہے کہ ان پر بالخصوص یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی صاحب اردو میں حضرت کے مفصل حالات تحریر فرمائیں اور ان کی خدماتِ گوناگوں کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کریں۔ ان کی حیات مبارکہ کے بہت سے گوشے ضبط تحریر میں آگئے ہیں اور بہت سے پردۂ خفا میں ہیں، جن کی صراحت کرنا ضروری ہے۔ کسی کی جہالت کا اعلان کرنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا، میدانِ عمل میں اتریں گے تو بات بنے گی۔

یہ مضمون اپریل ۲۰۰۴ء میں لکھا گیا تھا اور اپریل اور مئی ۲۰۰۴ء کے ''الاعتصام'' کے تین شماروں میں چھپا تھا۔ اس وقت مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری زندہ تھے۔ ان کا سانحۂ ارتحال یکم دسمبر ۲۰۰۶ء کو پیش آیا۔ لیکن ان سطور میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے، ان میں اگرچہ قاضی اطہر مبارک پوری کی وجہ سے مولانا ممدوح کا ذکر آیا ہے، لیکن کسی اہل علم سے متعلق اظہارِ رائے میں الفاظ کے استعمال کا معاملہ ہم سب سے تعلق رکھتا ہے۔ کوشش کرنی چاہیے کہ اس میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ بہر حال وہی مضمون کچھ ردّ وبدل کے ساتھ ''دبستانِ حدیث'' میں درج کر دیا گیا ہے۔

بات موضوع کے دائرے سے باہر تو نہیں نکلی البتہ تھوڑا سا دوسرا رخ اختیار کر گئی۔ اپنی محدود معلومات کے مطابق میں عرض یہ کر رہا تھا کہ حضرت مولانا مبارک پوری رحمہ اللہ کے بارے میں اب تک کیا کچھ لکھا گیا ہے۔

نزہۃ الخواطر کی آٹھویں جلد میں حضرت مرحوم کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

ہمارے دوست پروفیسر ڈاکٹر عبدالغفور راشد نے حضرت پر عربی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا، جس پر انھیں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔ یہ مقالہ بے شمار دیگر مقالوں کی طرح یونیورسٹی کے شعبۂ مقالات میں پڑا ہے۔ اس کی دو یا تین کاپیاں ان کے پاس بھی ہوں گی۔

اس مقالے سے ہمارے دوست فاضل مقالہ نگار کو تو ذاتی طور سے بے شک فائدہ پہنچا۔ ان کے رفقاے کار میں ان کی عربی دانی کی بھی شہرت ہوگئی ہوگی، لیکن حضرت مرحوم کے حالات سے آگاہ ہونے کے خواہش مندوں کو کیا فائدہ پہنچا......؟

حال ہی میں مجھے برادر عزیز مولانا محمد عارف جاوید محمدی صاحب نے کویت سے ایک کتاب بھجوائی ہے، جس کا نام ہے ''مولانا محمد عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری۔ حیات وخدمات''۔ یہ دراصل پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جو ڈاکٹر عین الحق قاسمی نے لکھنؤ یونیورسٹی کی طرف سے لکھا اور انھیں اس پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔ مقالہ بڑی محنت اور تحقیق سے لکھا گیا ہے اور حضرت مولانا کی گھریلو اور عملی زندگی کے (غالباً) تمام گوشے اس میں آگئے ہیں۔ بہت سی باتیں انھوں نے حضرت مرحوم کے اعزہ واقارب سے خود مل کر یا خط وکتابت کے ذریعے حاصل کی ہیں۔ حضرت مولانا کا اور ان سے تعلق رکھنے والے حضرات کا تذکرہ ڈاکٹر قاسمی بے حد احترام سے کرتے ہیں۔ اس موضوع پر انھوں نے مقالہ کیوں لکھا؟ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ پیش لفظ میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''شکر ہے اس خداے بزرگ وبرتر کا، جس نے اپنے ایک بہت ہی چھوٹے بندے کو ایک بہت ہی بڑے انسان کی حیات وخدمات لکھنے کی توفیق دی۔
>
> ''مولانا محمد عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری (۱۲۸۳ھ ...... ۱۳۵۳ھ) رحمہ اللہ کی حیات وخدمات پر لکھا گیا یہ مقالہ نہ کسی مرید کا ہے نہ شاگرد کا، نہ معتقد غالی کا ہے نہ شخصیت پرست کا، نہ فرد خانہ کا ہے نہ عزیز ورشتے دار کا، نہ ہم مسلک کا ہے نہ مقلد جامد کا، نہ تملق پسند کا ہے نہ بندۂ غرض کا، بلکہ یہ ایک حق پسند اور حق جو طالب علم کا ہے، جس کی حیثیت علم وفن اور بحث وتحقیق کے میدان میں ایک مبتدی کی ہے۔ اس مقالے میں مولانا محدث مبارک پوری کی حیات وخدمات کا ''معروضی'' جائزہ لیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی شخصیت جتنی عظیم رہی ہے، اتنی ابھی تک اس کی طرف توجہ نہیں کی جاسکی ہے۔
>
> ''عرب وعجم میں ان کے علمی کارنامے بالخصوص ''تحفۃ الاحوذی'' کی مقبولیت ہی ان کی شخصیت کا تعارف ہے۔ ان کے تفصیلی سوانحی حالات ابھی تک لوگوں کے سامنے نہیں آسکے ہیں۔ مقدمہ تحفۃ الاحوذی میں ''ترجمۃ المؤلف'' کے عنوان سے جس قدر لکھا گیا ہے، میری معلومات کی حد تک ابھی تک اس پر کوئی خاص اضافہ نہیں ہوسکا ہے۔ ضرورت تھی کہ مولانا محدث مبارک پوری کی حیات وخدمات کا تفصیلی تعارف کرایا جاتا، چناں چہ میں نے اس کا بیڑا اٹھایا اور کام شروع کردیا۔ اس کا ذکر جب میں نے مشہور

مصنف اور مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری سے کیا تو فرمایا: ''بہت اچھا۔ یہ ہمارے ذمہ ایک قرض تھا۔ محنت سے کام کرو تو یہ علمی قرض ادا ہوجائے۔ جو تعاون ہوسکے گا، کروں گا۔'' اپنی کتاب ''تذکرہ علماے مبارک پوری'' اور ''میری طالب علمی: قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' ہدیۃً عنایت فرمائی۔ آہ! مولانا قاضی اطہر مبارک پوری اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ مؤرخہ ۲۸۔صفر ۱۴۱۷ھ مطابق (۱۴۔ جولائی ۱۹۹۶ء) کو بروز یک شنبہ رات ۹ بج کر ۵۵ منٹ پر اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ انھیں کروٹ کروٹ چین نصیب کرے۔ وہ آج زندہ ہوتے تو اس علمی قرض کو ادا ہوتے دیکھ کر کتنا خوش ہوتے۔'' [1]

ڈاکٹر عین الحق قاسمی کا یہ مقالہ اگست ۱۹۹۸ء کو لکھنؤ یونیورسٹی نے منظور کیا اور ۲۰۰۲ء میں مصنف نے اسے کتابی شکل میں شائع کردیا جو ۲۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

فاضل مصنف حضرت مولانا مبارک پوری کا ذکر بے حد احترام سے کرتے ہیں اور انھیں بالعموم ''مولانا محدث مبارک پوری'' لکھتے ہیں۔ مولانا کی سندوں پر بھی ''محمد عبدالرحمٰن'' لکھا گیا ہے اور وہ خود بھی اپنا اسم گرامی اسی طرح تحریر فرماتے تھے، یعنی ''محمد عبدالرحمٰن''۔ ان کے نزدیک لفظ ''محمد'' ان کے نام کا جز تھا، اس لیے لائق احترام مصنف ان کا نام نامی اسی طرح رقم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کا یہی نام تھا۔

ڈاکٹر عین الحق قاسمی نے آخر میں ''کتابیات'' کی فہرست درج کی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت مولانا مبارک پوری رحمہ اللہ کے ایک عزیز عبدالکبیر عبدالقوی مبارک پوری ۱۹۸۲ء میں مدینہ یونیورسٹی کے طالبِ علم تھے اور انھوں نے وہاں عربی میں مولانا کے متعلق مقالہ لکھا تھا، جس کا عنوان ہے ''حیات المحدث محمد عبدالرحمٰن المبارک فوری''۔ صاحب مقالہ نے اپنا یہ مقالہ ڈاکٹر عین الحق قاسمی کو برائے استفادہ بھیجا تھا۔ اس مقالے کی ایک کاپی میرے پاس بھی ہے جو مجھے ازراہ کرم مولانا عارف جاوید محمدی نے کویت سے ارسال فرمائی ہے۔ مقالہ پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی، اس لیے کہ یہ حضرت مبارک پوری رحمہ اللہ کے خاندان کے ایک فاضل رکن کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے، لیکن گزارش یہ ہے کہ اس میں ضروری اضافے کر کے اب تک اسے شائع کیوں نہیں کیا گیا؟ مقالہ پچیس چھبیس سال پہلے لکھا گیا تھا۔ اس وقت حضرت مرحوم کے خاندان کے بھی اور خاندان کے علاوہ بھی بہت سے ایسے حضرات موجود تھے، جنھوں نے حضرت کو بہت قریب سے دیکھا اور ان سے استفادہ کیا تھا

[1] مولانا محمد عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری، ص: ۱۴، ۱۵

اور فاضل مقالہ نگار نے ان سے معلومات حاصل کی ہیں، اس اعتبار سے یہ مقالہ مستند اور صحیح ترین مواد پر مشتمل ہے۔ لہٰذا ضروری اضافوں کے ساتھ اسے عربی میں بھی شائع کرنا چاہیے اور اس کا اردو ترجمہ بھی معرضِ اشاعت میں آنا چاہیے۔

حضرت مولانا مبارک پوری رحمہ اللہ کے سانحہ ارتحال پر ۷۷ سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ اب ان کے خاندان یا تعلق داروں یا شاگردوں میں معلوم نہیں کوئی ایسے بزرگ ہیں یا نہیں، جنھوں نے حضرت مرحوم کی زیارت کی ہو، البتہ ان سطور کی تحریر تک پاکستان میں ایک جلیل القدر عالم موجود تھے جنھیں حضرت کی زیارت کا شرف حاصل تھا، وہ تھے حضرت مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ تعالیٰ۔

ان کا ایک طویل انٹرویو ماہنامہ ''شہادت'' (اسلام آباد) کے دسمبر ۱۹۹۶ء کے شمارے میں چھپا تھا جو اس کے چیف ایڈیٹر جناب خالد سیال نے ان سے کیا تھا۔ انٹرویو بہت سی معلومات کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور نہایت دلچسپ ہے۔ سوالات بھی اپنے اندر وزن رکھتے ہیں اور جواب بھی پروقار ہیں، زبان کے لحاظ سے بھی اور بیانِ واقعات کی صورت میں بھی......!

مولانا عبدالغفار حسن سے سوال کیا گیا:

''زندگی میں آپ کی پسندیدہ شخصیت کون سی رہی ہے؟''

مولانا جواب دیتے ہیں: ''مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری کو میں بہت بڑا عالم سمجھتا ہوں۔ وہ میرے پسندیدہ مصنف بھی ہیں، ان کی سوچ اور فکر بڑی متوازن تھی۔ ایک لحاظ سے وہ میرے استاد بھی تھے۔ وہ دارالحدیث رحمانیہ (دہلی) میں اکثر ٹھہرا کرتے تھے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ ایک دفعہ انھوں نے ہمارا امتحان بھی لیا تھا۔ میں ان کے زہد و تقویٰ اور علم سے بہت متاثر تھا۔ وہ دنیا کے حریص نہیں تھے۔ ان کی کتاب تحفۃ الاحوذی عرب ممالک میں بڑی معروف ہے۔ ہم عصر اساتذہ اور علما میں ان کی شخصیت ہر لحاظ سے نمایاں اور ممتاز تھی۔''

یہاں ایک بات عرض کرنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ یہ کہ علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے ''معارف'' میں وفیات کے سلسلے میں بہت سے حضرات پر لکھا اور جس شخصیت پر لکھا (اختصار کے ساتھ یا کسی قدر تفصیل کے ساتھ) بہت خوب صورت انداز میں لکھا۔ ان شخصیات میں علما کے علاوہ غیر علما بھی شامل ہیں بلکہ اس وسیع فہرست میں غیر مسلم بھی موجود ہیں اور یہ ایک منفرد سلسلہ وفیات ہے۔ معارف میں شائع شدہ یہ تمام مواد کتابی صورت میں ''یادِ رفتگاں'' کے نام سے چھپ گیا ہے۔ سید صاحب مرحوم کی یہ قابل قدر تحریریں ہیں، لیکن تعجب ہے سید صاحب نے مولانا مبارک پوری کے بارے میں کچھ نہ لکھا۔ خدا جانے ان کی توجہ اس طرف کیوں نہ گئی۔ حال آں کہ وہ ان کے بالکل قریب تھے۔ مبارک پور کا قصبہ ضلع اعظم گڑھ میں ہے اور علم و علما کے اعتبار سے پرثروت قصبہ ہے۔

معذرت

گزشتہ سطور میں کسی حد تک حضرت مولانا مبارک پوری رحمہ اللہ کے خاندان کا تذکرہ بھی کر دیا گیا ہے، ان کے دورِ طالب علمی کے بارے میں بھی چند باتیں عرض کر دی گئی ہیں، ان کے جلیل القدر اساتذہ کے اسمائے گرامی سے بھی قارئین کرام کو مطلع کر دیا گیا ہے۔ ان کے بعض لائق تکریم تلامذہ سے بھی چند الفاظ میں قارئین کرام کو متعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے، ان کی تصانیف کی فہرست بھی درج کر دی گئی ہے، ان کے زہد وتقویٰ اور اخلاق حسنہ کی بھی ایک جھلک قارئین کے سامنے لائی گئی ہے اور پھر ان کے صبر وشکر اور ضبط وتحمل کی طرف بھی ضروری اشارے کیے گئے ہیں۔ غرض نہایت اختصار کے ساتھ ابتدا سے لے کر آخر دم تک ان کی حیات مستعار کے بعض واقعات ضبط کتابت میں لانے کی سعی کی گئی ہے۔ عین ممکن ہے بیان واقعہ یا کتابت تاریخ وغیرہ میں مجھ سے کہیں لغزشِ فہم ہوگئی ہو اور نادانستہ طور سے کسی مقام پر قلم ٹھوکر کھا گیا ہو، اس پر خوانندگانِ محترم سے معذرت چاہتا ہوں اور درخواست گزار ہوں کہ میری غلطی سے مجھے مطلع فرمایا جائے۔

علاوہ ازیں اگر حضرت مولانا کے لائق تکریم خاندان کے کسی معزز رکن کے بارے میں اس فقیر کے قلم کی زبان سے کوئی ایسا لفظ نکل گیا ہو جو بہ ظاہر ناشائستگی کی ذیل میں آتا ہو تو اس پر یہ فقیر بہ صمیم قلب طالب عفو ہے۔

اور اب ایک خواب

اب آخر میں ایک خواب بیان کرنا چاہتا ہوں، جس کی تعبیر میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ممکن ہے قارئین محترم میں سے کوئی صاحب اس کی تعبیر بیان فرماسکیں۔ یہ سطور ۱۸۔ اپریل ۲۰۰۴ء کو لکھی جارہی ہیں۔ خواب آج سے تقریباً دو سال پہلے دیکھا تھا۔

خواب بیان کرنے سے پہلے یہ عرض کر دوں کہ میرا چھوٹا سا مکان ہے اور میں عام طور سے تحریری کام بیٹھک میں کرتا ہوں۔ بیٹھک کا ایک دروازہ گلی کی طرف ہے اور ایک اندر کی طرف......! بیٹھک میں ایک چارپائی رکھی گئی ہے۔ تھک جاؤں یا نیند غلبہ پالے تو چارپائی پر لیٹ جاتا ہوں۔ بیٹھک کے ساتھ ایک کمرہ ہے اور اس کے ساتھ ایک اور کمرہ ہے...... اب خواب سنیے......!

میں معمول کے مطابق اپنی جگہ بیٹھا کچھ لکھ رہا ہوں۔ چہرہ مشرق کی طرف ہے۔ میرے بالکل سامنے کھڑکی ہے جسے جالی لگی ہوئی ہے، ململ کی سفید دستار کا ایک سرا چارپائی پر آتا ہے۔ پھر آہستہ

آہستہ خود بخود حرکت کرتی ہوئی پوری دستار چارپائی پر سے ہوتی ہوئی میرے سامنے میری میز کے اس مقام پر آجاتی ہے جہاں میں لکھ رہا ہوں۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ یہ دستار حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کی ہے، میں اس پر خوش ہوتا ہوں، لیکن حضرت مولانا مدنی وہاں نہیں ہیں۔ دستار مبارک میں نے ہاتھ میں پکڑ لی ہے۔ میرے ذہن میں آتا ہے کہ بیٹھک کے ساتھ والے کمرے میں حافظ عبدالرشید ارشد (مالک مکتبہ رشیدیہ وایڈیٹر ماہنامہ الرشید) کرسی پر بیٹھے ہیں۔ میں یہ دستار یہ الفاظ کہہ کر انھیں دینا چاہتا ہوں کہ آپ دیوبندی ہیں اور حضرت مدنی کے عقیدت مند ہیں، اس لیے آپ اس کے اصل حق دار ہیں، لیکن جب میں دستار لے کر اندر حافظ عبدالرشید ارشد کو دینے کے لیے جاتا ہوں تو حافظ صاحب وہاں نہیں ہیں، حالاں کہ اس سے قبل وہ وہاں موجود تھے۔ اب دستار میرے ہاتھ میں ہے اور میں حیران ہوں کہ حافظ صاحب کہاں گئے...... پھر مجھے معلوم نہیں کہ دستار کہاں گئی۔ میرے پاس رہی یا کہیں رکھ دی۔ دستار میں نے دی بہرحال کسی کو نہیں......!

وہیں کھڑے کھڑے مجھے پتا چلا کہ اگلے کمرے میں حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ تشریف فرما ہیں۔ میں اس کمرے میں گیا تو دیکھا کہ حضرت مولانا چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں، شمال کی طرف پاؤں اور بجانب جنوب سر مبارک ہے۔ اوپر گرم چادر اوڑھ رکھی ہے۔ اس کا رنگ ڈارک براؤن سمجھیے۔ (میں سردیوں میں اسی رنگ کی چادر اوڑھتا ہوں اور اکثر لوگ اسی رنگ کی چادر اوڑھتے ہیں) حضرت مولانا مبارک پوری رحمہ اللہ کا چہرہ مبارک چادر کے اندر ہے اور مجھے نظر نہیں آرہا۔ لیکن چادر کے اندر سے چہرہ، سر، پاؤں اور گھٹنے وغیرہ اعضا نمایاں ہیں۔ میں قریب جا کر کہتا ہوں، ''السلام علیکم''۔ وہ نہایت میٹھی اور بے حد خوش گوار آواز میں (میرے احساس کے مطابق مسکراتے ہوئے) فرماتے ہیں ''وعلیکم السلام تشریف رکھیے''۔ مجھے خیال گزرتا ہے کہ حضرت مولانا چادر کے اندر سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ میں کھڑا ہوں اور عرض کرتا ہوں: ''آپ آرام فرمائیے۔''

(ان کا چہرہ چادر کے اندر ہی ہے) وہ دوبارہ فرماتے ہیں: ''تشریف رکھیے۔''

میں پھر عرض کرتا ہوں: ''آپ آرام فرمائیے۔''

وہ پھر اسی انداز میں مسکراتے ہوئے فرماتے ہیں: ''تشریف رکھیے۔''

(حضرت مولانا مبارک پوری رحمہ اللہ کے یہ نہایت مسرت آفریں الفاظ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں اور میں انھیں لیٹے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔)

حضرت کے دو یا تین دفعہ ''تشریف رکھیے'' فرمانے پر میں ان کے قدموں کی طرف پائنتی میں اس انداز سے چارپائی کی ''باہی'' پر بیٹھ جاتا ہوں کہ انھیں میری وجہ سے تکلیف نہ ہو...... بس اتنے میں میری آنکھ کھل جاتی ہے اور میں حیران ہوتا ہوں کہ یہ کیا خواب ہے۔

میں نے حالت خواب میں حضرت مولانا مبارک پوری کو نہیں دیکھا اور انھوں نے چہرۂ مبارک سے کپڑا نہیں اٹھایا۔ لیکن مجھے ان کے قریب کھڑے ہوئے ایک تو یہ محسوس ہوا کہ وہ بہت خوش ہیں اور مسکراتے ہوئے مجھے فرما رہے ہیں: ''تشریف رکھیے۔''

دوسری بات چشم تصور میں اس وقت یہ آئی اور اس طرح آئی کہ گویا میں انھیں چادر کے اندر سے دیکھ رہا ہوں کہ ان کا قد میانہ ہے، جسم گداز ہے، چہرہ مبارک قدرے چوڑا ہے، رنگ گندمی ہے اور ناک نقشہ بہت مناسب ہے۔ یعنی سراپا بالکل وہی ہے جو قاضی اطہر مبارک پوری مرحوم کی کتاب تذکرہ علماے مبارک پور کے حوالے سے گزشتہ صفحات میں بیان کیا گیا ہے، بلکہ جب یہ سراپا قاضی صاحب مرحوم کی کتاب میں پڑھ رہا تھا تو خواب والا سراپا میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ کیوں کہ خواب قاضی صاحب کی کتاب پڑھنے سے تقریباً دو سال پہلے کا ہے۔

یہاں یہ عرض کردوں کہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی زیارت کا شرف مجھے دو دفعہ حاصل ہوا ہے۔ ایک دفعہ دس گیارہ سال کی عمر میں ان کی تقریر سنی۔ وہ ضلع فیروز پور کے ایک تحصیلی مقام ''زیرہ'' میں تشریف لائے تھے۔ حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی مرحوم ان دنوں ہمارے ہاں کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ) میں خدمت تدریس وخطابت سرانجام دیتے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے مولانا سمیت بہت سے لوگ خاص طور سے بس لے کر وہاں گئے تھے۔ رات کو حضرت مولانا مدنی کی تقریر سنی تھی۔

دوسری مرتبہ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں دہلی میں جمعیت علماے ہند کے دفتر میں ایک میٹنگ تھی جو مولانا مدنی کی صدارت میں ہوئی تھی اور دو دن جاری رہی تھی۔ اس میٹنگ میں متحدہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کے کم وبیش دو سو افراد شامل تھے، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا عطاء اللہ حنیف اور مولانا عبدالمجید سوہدروی بھی تشریف فرما تھے۔ میں بھی اس میٹنگ میں شریک تھا۔ اس میٹنگ میں مولانا مدنی کو بہت قریب سے دیکھا اور ان کی باتیں سنیں۔ اس وقت میری عمر انیس بیس سال کی تھی۔

اس خواب کے جو اوپر بیان کیا گیا ہے، میرے خیال میں دو حصے ہیں۔ ایک حصے کا تعلق حضرت مولانا مدنی کی سفید دستار مبارک سے ہے جو چارپائی سے ہوتی ہوئی میری طرف آئی اور میں نے بڑی خوشی سے پکڑی۔ دیوبندی مسلک کے عالم ومصنف حافظ عبدالرشید ارشد کو پیش کرنا چاہی لیکن وہ آناً فاناً کہیں غائب ہوگئے اور دستار میرے ہاتھ میں رہی۔ پھر پتا نہ چلا کہ اس کا کیا بنا۔ مولانا مدنی خود وہاں نہیں ہیں۔

دوسرے حصے کا تعلق حضرت مولانا مبارک پوری سے ہے، وہ جو کچھ فرما رہے ہیں، نہایت شیریں آواز اور مؤثر تریں انداز میں فرما رہے ہیں۔ وہ میرے غریب خانے میں چادر اوڑھے لیٹے

ہوئے ہیں، میں انھیں دیکھ نہیں رہا اس لیے کہ ان کا چہرہ چادر میں ہے۔ انھوں نے میرے سلام کا انتہائی شفقت سے جواب دیا۔ مجھے ''تشریف رکھیے'' کے الفاظ سے بیٹھنے کو فرمایا اور میں تعمیل ارشاد کرتا ہوا بیٹھ گیا۔

قارئین کرام سے درخواست ہے کہ اگر اس خواب کا شمار ان کے نزدیک اضغاث احلام میں نہیں ہوتا اور یہ تعبیر طلب ہے تو



اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ ۔

❀❀............❀............❀❀

مولانا محمد بشیر فاروقی سہسوانی

ہندوستان کے صوبہ یو پی کا ایک قدیم شہر ''سہسوان'' کے نام سے موسوم ہے جو صدیوں سے قائم ہے اور اپنی ایک تاریخ رکھتا ہے۔ اس شہر کی بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہمیشہ اہل علم کا مرکز اور اصحابِ فضل کا مسکن رہا ہے۔ اہل حدیث اہل علم بھی کثیر تعداد میں اس شہر میں آباد رہے ہیں اور آباد ہیں۔ یہاں کے ایک مشہور عالم دین حضرت مولانا محمد بشیر فاروقی تھے، جن کے والد کا اسم گرامی حکیم بدر الدین اور دادا کا نام نامی صدر الدین فاروقی تھا۔ صدر الدین درحقیقت پنجاب کے ایک مقام ''تھانیسر'' کے رہنے والے تھے، وہیں سے عالم جوانی میں سہسوان چلے گئے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا تھا، اس لیے یہ فاروقی یا عمری کی نسبت سے پکارے جاتے تھے۔ سہسوان میں ایک عالم دین مولانا شرف علی متمکن تھے۔ انھوں نے نوجوان صدر الدین فاروقی کی ذاتی شرافت اور حسب ونسب سے متاثر ہو کر اپنی بیٹی ان کے عقد میں دے دی۔

اس خاتون سے مولوی صدر الدین صاحب کے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ ایک بدر الدین جن کی ولادت تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں ہوئی اور دوسرے نیاز احمد......! دونوں نے دہلی جا کر وہاں کے علما وفضلا سے حصولِ علم کیا۔ مروّجہ علوم درسیہ کے علاوہ فن طب میں بھی مہارت پیدا کی اور حکیم بدر الدین فاروقی اور حکیم نیاز احمد فاروقی کے نام سے شہرت پائی۔

حکیم بدر الدین فاروقی نے دہلی میں حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی سے طب کی مشہور کتاب القانون بالاستیعاب پڑھی۔ بعد ازاں لکھنؤ کا عزم کیا جسے اس وقت شاہانِ اودھ کے دار الحکومت کی حیثیت حاصل تھی۔ وہاں رسال دار فقیر محمد نے ان کی بے حد قدر کی اور انھیں اپنا خاص مشیر مقرر کیا۔ پھر رؤسائے سلطنت اور شاہی محلات میں ان کی شہرت پہنچی اور انھیں نہایت اعزاز کا مستحق قرار دیا گیا۔

حکیم بدر الدین فاروقی نے رئیسانہ ذہن پایا تھا اور ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرتے تھے۔ لکھنؤ کے ہر حلقے میں انھیں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اطبا کی جماعت میں بالخصوص ان کا مرتبہ بڑا بلند تھا۔ انھوں نے ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) میں مرض سرطان سے قصبہ سندیلہ میں وفات پائی۔

حکیم بدرالدین فاروقی مرحوم کے چھوٹے بھائی حکیم نیاز احمد فاروقی حصولِ علم کے بعد دہلی ہی میں رہے اور وہاں انھوں نے درس وتدریس اور طبابت کا سلسلہ جاری رکھا۔ دہلی میں حضرت میاں سید نذیر حسین رحمہ اللہ نے ان سے شرح سلّم ملاحسن اور کلیاتِ نفیسی وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ حکیم نیاز احمد

فاروقی کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہوسکا۔ ان کے فرزند گرامی کا نام حکیم محمد نور الحسن فاروقی تھا جوفن طب میں مہارت کے علاوہ علوم دینیہ میں بھی دست رس رکھتے تھے۔ چند فقہی مسائل میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھنوی سے ان کی تحریری بحثیں رہیں۔ حکیم محمد نور الحسن فاروقی بعض حضرات کے اصرار پر متھرا چلے گئے تھے۔ وہیں ۱۲۹۷ھ کے آخر میں جو عیسوی حساب سے ۱۸۸۰ء کا بھی آخر تھا، بہ عمر ۶۴ سال وفات پائی۔

اب آیئے حکیم بدرالدین فاروقی کی اولاد کی طرف......!

حکیم صاحب ممدوح کے چار بیٹے تھے۔ بڑے حکیم محمد خورشید حسن فاروقی۔ ان سے چھوٹے مولانا محمد بشیر فاروقی۔ ان سے چھوٹے حکیم محمد نذیر اور سب سے چھوٹے مولانا حکیم محمد مظہر علی فاروقی۔ آئندہ سطور میں مولانا محمد بشیر فاروقی کے حالاتِ زندگی بیان کرنا مقصود ہے جو اپنے عہد کے جلیل القدر عالم، بہت بڑے مدرس، مشہور واعظ، نامور مناظر، ممتاز مصنف اور نہایت متقی بزرگ تھے۔

حضرت مولانا محمد بشیر فاروقی سہسوانی ۱۲۵۲ھ (۳۶۔۱۸۳۷ء) میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے والد محترم حکیم بدر الدین لکھنؤ میں سکونت پذیر تھے۔ محمد بشیر کی تعلیم کا آغاز والد گرامی کے سایہ عاطفت میں ہوا۔ بچپن ہی میں ذہانت کی دولت سے بہرہ ور تھے۔ ابھی تعلیم کی راہ پر گامزن ہوئے تین چار سال کا عرصہ ہوا تھا اور آٹھ نو سال کی عمر کو پہنچے تھے کہ والد گرامی وفات پا گئے۔ اب ان کا لکھنؤ میں رہنا مشکل ہوگیا تھا، اس لیے وہاں سے اپنے وطن سہسوان آ گئے۔ چند سال وہاں رہے اور مولانا سید امیر حسن محدث کے حلقہ درس میں شامل ہو کر ان سے استفادہ کیا۔ پھر تحصیل علم کے شوق نے مزید جوش مارا تو لکھنؤ کی راہ لی، جہاں ان کے جاننے اور ان کے والد (حکیم بدر الدین فاروقی) سے تعلق رکھنے والے بہت سے اصحابِ علم موجود تھے۔ یہ ۱۲۷۳ھ کی بات ہے۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال کے پس وپیش تھی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ہندوستان کے لوگوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی شروع کی تھی اور اس میں انھیں ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔ برصغیر کی سیاسی تاریخ میں اسے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کہا جاتا ہے۔

لکھنؤ میں مولانا محمد بشیر نے مفتی محمد واجد علی بنارسی اور بعض فضلاے فرنگی محل سے معقولات ومنقولات کی کتابیں پڑھیں۔ پھر لکھنؤ سے متھرا گئے۔ وہاں اپنے چچا زاد بھائی حکیم نور الحسن سے استفادہ کیا۔ متھرا سے عازم دہلی ہوئے۔ وہاں کے مدرسین سے تفسیر وحدیث اور فقہ واصول کی تکمیل کی۔ دہلی میں حضرت میاں سید نذیر حسین رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضری دی اور کتب حدیث کے لیے ان کے حضور زانوے شاگردی تہ کیے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد خودمسند تدریس آراستہ کی اور اس کا آغاز سلہٹ سے کیا۔ ایک

سال وہاں یہ خدمت انجام دی۔ پھر شہسرام گئے۔ ایک سال وہاں قیام رہا۔ اس وقت زیادہ رجحان منطق وفلسفہ، ادبیات اور فقہ واصول کی طرف تھا۔ فقہ حنفی کی روشنی میں فتوے تحریر فرماتے تھے۔ پھر مولانا سید امیر حسن سہسوانی کے فیض صحبت سے قرآن وحدیث سے تعلق بڑھا تو تحقیق کا رخ بدل گیا اور خالص کتاب وسنت کو مطمح نظر قرار دے لیا۔ اب تقلید کی جگہ عمل بالحدیث نے لے لی تھی اور ہر معاملے میں مسلک محدثین اور اقوالِ صحابہ وآثارِ سلف کو پیش نگاہ رکھا جاتا تھا۔ میاں صاحب کے حلقۂ درس میں شرکت سے تو بالکل کایا پلٹ گئی تھی۔ بہ الفاظ واضح کہنا چاہیے کہ حنفیت کو چھوڑ کر دائرہ اہل حدیثیت میں داخل ہوگئے تھے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد (جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا) سلہٹ اور شہسرام میں کچھ وقت گزارا۔ یہ عارضی سا سلسلہ تھا۔ ملازمت کی باقاعدہ ابتدا سینٹ جانسن کالج آگرہ سے کی۔ وہاں عربی اور فارسی کے پروفیسر کے طور پر پندرہ سال خدمت سرانجام دیتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی اپنے مکان پر صبح وشام خالص دینیات کی تدریس کی سرگرمیاں بھی جاری رکھیں۔ طلبا کی کثیر تعداد ان کے حلقہ درس میں شامل ہوئی اور بے شمار تشنگانِ علوم نے ان سے استفادہ کیا۔ قیام آگرہ کے دور ہی میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ مکہ مکرمہ میں شیخ احمد شرقی اور مولانا محمد سہارن پوری سے بعض کتابیں پڑھیں۔

اس زمانے میں حضرت نواب سید صدیق حسن خاں صاحب کی وجہ سے بھوپال کو مرکز علم اور مجمع علما کی حیثیت حاصل تھی۔ ۵۔محرم ۱۲۹۵ھ (۱۰۔جنوری ۱۸۷۸ء) کو مولانا محمد بشیر بھوپال پہنچ گئے۔ نواب صاحب نے انھیں دیکھ کر نہایت مسرت کا اظہار کیا اور بے حد تکریم سے پیش آئے۔ ریاست کے مدارس کے افسر اعلیٰ مقرر کیے گئے۔ اس کے علاوہ ریاست کا محکمہ افتا بھی ان کے سپرد ہوا۔ لوگ تحریری صورت میں جو فقہی مسائل دریافت کرتے تھے، ان سب کے جواب مولانا محمد بشیر فاروقی سہسوانی دیتے تھے، اس لیے کہ اس عہد میں وہ ریاست بھوپال کے سب سے بڑے عالم تھے اور انھیں کتاب وسنت اور فقہیات کے ماہر سمجھا جاتا تھا اور یہ بات بالکل صحیح تھی۔ قیام بھوپال کے زمانے میں مولانا محمد بشیر سہسوانی نے درس وتدریس کا ہنگامہ بھی جاری رکھا اور بہت سے علما وطلبا نے ان سے تفسیر وحدیث اور دیگر علوم مروّجہ میں حصول فیض کیا۔ ان کے اندازِ تفہیم اور طریق تدریس سے طلبائے علم نہایت متاثر ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں مولانا ممدوح نے شیخ حسین بن محسن انصاری یمانی سے مستفید ہونے کا شرف حاصل کیا۔

ریاست کے مدارس کی نگرانی، فتویٰ نویسی اور درس وتدریس کے علاوہ مولانا ممدوح تصنیف وتالیف کا فریضہ بھی سرانجام دیتے تھے۔ وہ اپنے عہد کے عظیم محقق اور ممتاز مصنف تھے۔ ان کی

تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

①...... **القول المحقق المحکم فی زیارۃ القبر الحبیب الاکرم:** یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے جو انھوں نے حج بیت اللہ سے واپس آ کر آگرہ میں لکھا۔ اس کے جواب میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے الکلام المبرور کے نام سے ایک رسالہ تحریر کیا۔

②...... مولانا محمد بشیر فاروقی نے مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے اس رسالے کا جواب ''القول المنصور'' کے نام سے دیا۔ مولانا فرنگی محلی نے اس کے جواب میں المذہب الماثور کے نام سے کتاب لکھی۔

③...... **اتمام الحجۃ علی من اوجب الزیارۃ کالحجۃ:** مولانا محمد بشیر کی اس موضوع پر یہ ایک محققانہ کتاب ہے جو السعی المشکور کے نام سے معروف ہے۔

اصل معاملہ یہ تھا کہ مولانا محمد بشیر فاروقی جب حج سے واپس آئے تو انھوں نے القول المحقق المحکم کے نام سے چھوٹا سا رسالہ لکھا، جس میں ثابت کیا کہ نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت ضروری نہیں۔ اس کا جواب مولانا محمد بشیر الدین قنوجی اور سید امداد العلی ڈپٹی کلکٹر آگرہ نے دیا۔ انھوں نے اپنے انداز میں نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کو واجب قرار دیا۔ پھر ان حضرات نے مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے درخواست کی کہ وہ مولانا محمد بشیر فاروقی کی کتاب کا جواب تحریر فرمائیں۔ ان حضرات نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا تھا، وہ بھی مولانا فرنگی محلی کی خدمت میں ارسال کر دیا۔ اس کے بعد مولانا محمد بشیر اور مولانا عبدالحی کے درمیان اس موضوع پر تحریری مقابلہ شروع ہو گیا۔

④...... **صیانۃ الانسان عن وسوسۃ شیخ دحلان:** اس زمانے کے مفتی مکہ شیخ احمد دحلان اور مولانا محمد بشیر کے درمیان بعض مسائل میں مناظرہ ہوا تھا۔ مولانا نے شیخ دحلان کے رد میں یہ کتاب تصنیف فرمائی جو علمائے نجد میں بہت مقبول ہوئی اور کئی دفعہ چھپی۔

⑤...... **البرھان العجاب فی فرضیۃ ام الکتاب:** یہ کتاب مولانا محمد بشیر نے زندگی کے آخری دور میں دہلی میں لکھی تھی جس میں مسئلہ قرأت فاتحہ خلف الامام پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اس موضوع کی یہ ایک محققانہ کتاب ہے جو مولانا کی وفات کے بعد ان کے شاگرد رشید حضرت مولانا احمد اللہ صاحب پرتاپ گڑھی دہلوی (متوفی ۱۹۔ مارچ ۱۹۴۳ء) نے شائع کی تھی۔

⑥...... **القول المحمود فی رد جواز السود:** اس کتاب میں سودی کاروبار اور اس کی تمام صورتوں کو حرام اور شریعت اسلامی کے خلاف قرار دیا گیا ہے۔

گزشتہ سطور سے معلوم ہو چکا ہے کہ بعض مسائل میں مولانا محمد بشیر فاروقی سہسوانی اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے درمیان تحریری صورت میں سلسلۂ بحث جاری رہتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان

دونوں علمائے کرام میں باہمی مودت والفت اور احترام واکرام کا رشتہ بھی بہت مضبوط تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ مولانا فاروقی جب بھی لکھنؤ جاتے مولانا فرنگی محلی کے ہاں قیام فرماتے۔ مولانا فاروقی بہت بڑے واعظ تھے اور لوگ بے حد شوق سے ان کے وعظ میں شرکت کرتے اور اس سے اثر پذیر ہوتے تھے۔ مولانا فرنگی محلی ان کو کئی کئی دن اپنے گھر اصرار کرکے بہ طور مہمان ٹھہراتے اور مختلف مقامات میں ان کے وعظ کراتے، خود بھی وعظ میں شرکت فرماتے۔

بعض مسائل میں حضرت نواب صدیق حسن خاں اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے درمیان بھی بحثیں ہوئیں۔ ان دنوں مولانا محمد بشیر فاروقی بھوپال میں قیام فرما تھے۔ مولانا فرنگی محلی کو شبہ ہوا کہ ان کے اعتراضات کے جواب خود نواب صاحب نہیں دیتے بلکہ مولانا محمد بشیر فاروقی دیتے ہیں۔ مولانا فرنگی محلی نے کہیں یہ لکھ بھی دیا۔ لیکن مولانا فاروقی نے اس سے انکار فرمایا اور مولانا فرنگی محلی کو یقین دلایا کہ اس بحث میں میرا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اس ضمن میں جو کچھ لکھتے ہیں، خود نواب صاحب لکھتے ہیں۔ اس یقین دہانی کو مولانا فرنگی محلی نے قبول فرمایا اور معاملہ ختم ہوگیا۔

مولانا فاروقی کو بھوپال میں خدمت دین سرانجام دیتے بارہ سال کا عرصہ ہوا تھا کہ یکم رجب ۱۳۰۷ھ (۲۱۔ فروری ۱۸۹۰ء) کو حضرت نواب صدیق حسن خاں نے سفر آخرت اختیار فرمایا اور اس کے ساتھ ہی مولانا فاروقی نے بھوپال کی سکونت ترک کرنے کا عزم فرما لیا۔ لیکن نواب صاحب کی اہلیہ محترمہ (نواب شاہ جہاں بیگم) نے ان کو وہاں سے جانے نہیں دیا اور ان کا سلسلۂ وعظ وتبلیغ جاری رہا۔ اس طرح بارہ سال مزید گزر گئے۔ ۲۹۔ صفر ۱۳۱۹ھ (یکم جون ۱۹۰۱ء) کو نواب شاہ جہاں بیگم بھی اس دنیائے فانی سے رحلت کر گئیں تو ان کی جگہ نواب سلطان جہاں بیگم نے ریاست بھوپال کی زمامِ حکومت ہاتھ میں لی۔ اب طرزِ حکومت بہت حد تک بدل گیا تھا۔ پرانی بساط تقریباً الٹ گئی تھی اور نئے حالات پیدا ہوگئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علمائے دین بھوپال سے رخصت ہونے لگے۔ اسی اثنا میں مولانا محمد بشیر فاروقی نے بھی رختِ سفر باندھ لیا۔

مولانا ممدوح نے پچیس سال کا طویل عرصہ بھوپال میں گزارا۔ یہاں انھوں نے وعظ وتبلیغ، درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کی صورت میں بے حد خدمات سرانجام دیں۔ دہلی میں ان کے عالی قدر استاذ حضرت میاں سید نذیر حسین رحمہ اللہ جو ایک مدت سے علما وطلبا کو مستفید فرما رہے تھے، پیرانہ سالی اور ضعف کی وجہ سے درس وتدریس کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکتے تھے۔ اس لیے وہاں کے لوگوں کا اصرار تھا کہ مولانا محمد بشیر فاروقی دہلی تشریف لائیں اور اپنے استاذِ گرامی قدر کی مسند درس حدیث پر متمکن ہوں۔ خود مولانا بھی دہلی جانے اور وہاں درس قرآن وحدیث اور وعظ وخطابت کا سلسلہ شروع کرنے کے خواہاں تھے۔ چناں چہ وہ دہلی تشریف لے گئے اور مسجد حوض والی (نئی

سڑک) میں متمکن ہوئے اور چھ سال (زندگی کے آخری دم تک) وہاں شائقین کو درس حدیث دیتے اور تفسیر قرآن سناتے رہے۔

ڈپٹی نذیر احمد مرحوم بہت بڑے عالم اور معروف ادیب تھے۔ قرآنِ مجید کے مترجم اور مفسر بھی تھے۔ ❶ اپنے تبحر علمی کی بنا پر کسی عالم کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ جب انھیں پتا چلا کہ مولانا محمد بشیر حوض والی مسجد میں درس قرآن دیتے ہیں تو طنزیہ انداز میں کہا دیکھیں گے ان کو کس طرح قرآن کی تفسیر بیان کرتے ہیں۔ لیکن جب ان کا درس قرآن سنا تو فریفتہ ہوگئے۔ پھر باقاعدہ ان کے درس میں حاضر ہونے لگے۔ فرمایا کرتے تھے یہ ملا نے مولوی محمد بشیر کو نہیں سمجھ سکتے، ان کی قدر مجھ سے پوچھو جوان سے قرآن پڑھ رہا ہوں۔

۱۳۱۲ھ کے پس وپیش مولانا محمد بشیر فاروقی کا مرزا غلام احمد قادیانی سے دہلی میں مناظرہ ہوا۔ اس وقت مولانا ممدوح بھوپال میں تھے۔ مرزا قادیانی نے دہلی آکر اپنی مسیحیت کا ڈھنڈورا پیٹا تو اس کی اطلاع بھوپال میں مولانا کو بھی پہنچی اور والیہ بھوپال بیگم شاہ جہان کو بھی اس کا پتا چلا تو انھوں نے باشندگانِ دہلی کی درخواست پر مرزا غلام احمد سے۔ مناظرے کے لیے مولانا محمد بشیر کو دہلی بھیجا۔ موضوعِ مناظرہ حیات وممات مسیح تھا۔ مرزا صاحب تقریری مناظرے پر رضا مند نہ ہوئے تو تحریری بحث شروع ہوئی۔ مرزا صاحب نے پہلے تو حسب معمول تاویلات سے کام لیا لیکن جب مولانا کی گرفت مضبوط ہوئی اور انھوں نے حیاتِ مسیح پر دلائل دینا شروع کیے تو مرزا صاحب یہ کہہ کر میدان چھوڑ گئے کہ ان کے خسر صاحب تشریف لارہے ہیں، اس لیے ان کے استقبال کے لیے دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر ان کا جانا ضروری ہے۔ مولانا نے ''خسر'' کا لفظ سنا تو قرآنِ مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ . ❷

اس مناظرے کی کیفیت، اس کا پورا تحریری مواد اور مرزا صاحب کا اس سے فرار سب کچھ کتابی شکل میں شائع ہوگیا تھا۔ اس کتاب کا نام ہے ''**الحق الصریح فی اثبات حیات المسیح**''، یہ کتاب مطبع انصاری دہلی میں چھپی تھی۔

---

❶ ڈپٹی صاحب کے ضروری حالات میں نے اپنی کتاب ''برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن'' میں بیان کیے ہیں (ملاحظہ ہو صفحہ ۶۴۷ تا ۶۵۸) یہ کتاب مکتبہ قدوسیہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

❷ یہ سورۂ حج کی آیت نمبر گیارہ ہے۔ اس کا یہ ترجمہ ہے: اس نے دنیا اور آخرت دونوں جہان کا نقصان اٹھایا۔ واقعی یہ کھلا نقصان ہے۔

حضرت مولانا محمد بشیر فاروقی بہت سی خصوصیات کے حامل اور متعدد اوصافِ حسنہ کے مالک تھے۔ مہمان نواز، اہل علم کے قدر دان، ہر مسلک فقہ کے علما سے محبت و تعلق رکھنے والے، ظریف الطبع، متواضع، ایثار و کرم کے پیکر، غربا و مساکین کے ہم درد و معاون، خوش لباس، خوش کلام، کشادہ ذہن، لطیفہ گو، حاضر جواب۔ عُجب وخود نمائی سے نفور، اعزہ واقربا اور احباب سے حسن سلوک رکھنے والے۔

کتاب ''حیات العلما'' کے فاضل مصنف مولانا سید محمد عبدالباقی سہسوانی کئی سال ان کے ساتھ رہے، اور آگرہ اور بھوپال کے زمانۂ قیام میں ان کے حلقۂ شاگردی میں شمولیت کا انھیں شرف حاصل ہوا۔ دہلی میں بھی ان کے درسِ قرآن میں ان کو شرکت کے مواقع ملے۔ وہ اپنے عظیم المرتبت استاد کے حالات واوصاف بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ ان کی بعض تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس کے سوا دیگر بہت سے رسائل دینیہ آپ کے قلم سے نکلے جو بعض تلامذہ کی جانب منسوب ہیں۔'' ❶

یعنی ان کی جن تصانیف کا ذکر گزشتہ سطور میں کیا گیا ہے، ان کے علاوہ بھی کتنے ہی رسائل ہیں جو انھوں نے دینی مسائل سے متعلق تحریر فرمائے اور اپنے بعض لائق شاگردوں کے نام سے چھپوائے۔

مولانا سید عبدالباری سہسوانی مزید لکھتے ہیں:

راقم سطور نے آپ سے آگرہ وبھوپال میں فنونِ عقلیہ ونقلیہ اکتساب کیے۔ دہلی میں آپ کے چشمہ فیض سے گروہِ طلبا بلکہ تمام شہر مستفید ہوتا رہا۔ مختلف علوم وفنون کا درس دیتے اور ہر روز بعد نماز صبح مسجد چوک میں ترجمہ وتفسیر قرآن بالحدیث دو گھنٹے بیان فرماتے اور اہل شوق دور دور سے آکر سنتے تھے۔ ❷

مولانا ممدوح کے زمانہ قیام بھوپال کے سلسلے میں فاضل مصنف لکھتے ہیں:

''طلبائے علم کو بہ طور خود درس تفسیر وحدیث وغیرہ سے مستفید فرماتے اور اجوبہ مسائل مستفتی بہا مجتہدانہ تحقیق کے ساتھ تحریر کرتے۔ ہر جمعہ کو مسجد قاضی صاحب میں وعظ قرآن وحدیث کہتے۔

''مسائل شرعیہ میں اپنی تحقیق کو بے خطر ظاہر فرماتے اور منکرین پر تحریراً وتقریراً اتمامِ

---

❶ حیات العلما، صفحہ ۹۶

❷ ایضاً

حجت کرتے۔ انکسارِ نفس وتواضع وحسن خلق بہ درجہ غایت تھا۔"

فاضل مصنف اس سے آگے رقم طراز ہیں:

"اقتدائے سنت نبوی ونصرت حق مرکوزِ خاطر وترک مستحب ناگوار طبع تھا۔ بھوپال بلکہ تمام ہندوستان میں اپنے علم وفضل کا سکہ بٹھا دیا اور علمائے عصر پر اپنی فضیلت علمی وقوت اجتہاد کو ثابت کر دیا۔"

ان کی تقویٰ شعاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ورع وتقویٰ وعبادت وشب بے داری بصدق واخلاص رکھتے تھے۔ رقت قلب وخشیت الٰہی کا اثر وعظ پُر تاثیر سے ظاہر ہوتا تھا۔"

عید الاضحیٰ کی قربانی کے بارے میں ان کی تحقیق یہ تھی کہ یہ ایامِ تشریق میں محدود نہیں ہے بلکہ ماہِ ذی الحجہ کے آخر تک قربانی کی جاسکتی ہے۔ مولانا سید عبدالباقی سہوانی لکھتے ہیں کہ حضرت نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ کی وفات کے بعد مولانا محمد بشیر نے بھوپال میں ایک اشتہار شائع کیا تھا جس میں لکھا تھا کہ قربانی کے لیے ایامِ تشریق کو مخصوص کرنا دعوائے بے دلیل ہے اور اس کے خلاف ادلۂ شرعیہ موجود ہیں۔ علمائے عصر سے اس سلسلے میں کچھ بحثیں ہوئیں مگر مولانا کے دعوے کی تردید نہ ہوسکی۔ اس مسئلے کے متعلق تفصیلات انھوں نے کتابی صورت میں جمع کی تھیں۔ لیکن افسوس ہے وہ کتاب شائع نہ ہوسکی۔

مولانا محمد بشیر فاروقی سہوانی نے بہ عمر ۷۴ سال ۲۹۔ جمادی الاخریٰ ۱۳۲۶ھ (۲۹۔ جون ۱۹۰۸ء) کو دہلی میں وفات پائی اور اپنے استاذِ عالی قدر حضرت میاں سید نذیر حسین کے جوار میں قبرستانِ شیدی پورہ میں دفن کیے گئے۔ مولانا سید نظر احمد سہوانی نے بہ تضمن حدیث نبوی **قَدْ دَخَلَ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ** (۱۳۲۶ھ) مادۂ تاریخ وفات نکالا۔ مولانا سید اعجاز احمد سہوانی نے لفظ "مغفور" (۱۳۲۶ھ) سے تاریخ ارتحال برآمد کی۔ نیز مولانا اعجاز احمد نے عربی میں ایک فصیح وبلیغ قصیدہ کہا، جس کے چند اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

خَطْبٌ اَبَادَ نُفُوْسَنَا لَكَبِيْرٌ
وَكَذَا الزَّمَانُ عَلَى النُّفُوْسِ يَجُوْرُ
اَمَّا الْهُدٰى فَتَضَعْضَعَتْ اَرْكَانُهٗ
وَالدِّيْنُ اَسْقَمَهٗ ضَنًى وَّفُتُوْرٌ
شَمْسُ الضُّحٰى اَفَلَتْ وَغَابَ شُرُوْقُهٗ
فَاِذَا النَّهَارُ كَلَيْلِنَا دَ يَجُوْرُ

قَدْ مَاتَ مَنْ مَّاتَ الْعُلُوْمُ بِمَوْتِهٖ
لَا سِیَّمَا الْاَخْبَارُ وَالتَّفْسِیْرُ
تَبْکِیْ عَلَیْہِ مَسَاجِدُ وَ مَنَابِرُ
وَلِاَھْلِ عِلْمٍ رَنَّۃٌ وَّ زَفِیْرُ
قَدْ کَانَ مُجْتَھِدًا مُصِیْبًا نَاسِکًا
یَحْمِی الشَّرَائِعَ سَعْیُہُ الْمَشْکُوْرُ
مُتَخَاشِعًا لِلّٰہِ مُنْقَادًا لَہٗ
مُتَـلَالِاءٌ مِنْ وَجْھِہِ التَّنْوِیْرُ
نَقَّادُ اِسْنَادِ الْحَدِیْثِ وَمَتْنِہٖ
کَشَّافُ اَسْرَارِ الْکِتَابِ بَصِیْرٌ
لَمَّا سَاَلْتُ الْقَلْبَ عَامَ وَفَاتِہٖ
فَاَجَابَنِیْ تَارِیْخُہٗ مَغْفُوْرٌ

ان اشعار کا ترجمہ یہ ہے:

جس مصیبت نے ہماری جانوں کو تباہ کر دیا وہ بہت بڑی ہے اور لوگوں پر زمانہ اسی قسم کے ظلم ڈھاتا ہے۔

ہدایت ورہنمائی کے ستون ہی کم زور پڑ گئے اور ہلنے لگے اور دین کو ضعف واضمحلال نے بیمار کر دیا۔

نصف النہار کا سورج غروب ہوگیا اور اس کی تابانیاں غائب ہوگئیں تو ہمارا دن بھی ہماری رات کی طرح سیاہ وتاریک ہے۔

جو شخص فوت ہوگیا یقیناً اس کی موت سے تمام علوم مرگئے، خصوصاً احادیث وتفسیر کے علوم۔

اس کی وفات پر مسجدیں اور منبر بھی رو رہے ہیں۔ اہل علم بھی غم ناک ہیں اور سسکیوں کی آوازیں آرہی ہیں۔

وہ مجتہد، راست رو اور عبادت گزار تھے۔ وہ نیکی کی راہوں کی حمایت کرتے تھے اور ان کی کوشش کی قدر کی جاتی تھی۔

اللہ کے لیے عاجزی کرنے والے تھے اور اس کے فرماں بردار تھے۔ ان کے چہرے پر روشنی چمک رہی تھی۔

حدیث کی اسناد ومتن کو خوب پرکھنے والے تھے۔ کتاب اللہ کے اسرار ورموز کھولنے والے نہایت بابصیرت تھے۔

جب میں نے دل سے ان کی وفات کا سال پوچھا تو اس نے ان کی تاریخ وفات ''مغفور'' (۱۳۲۶) بتائی۔

مولانا محمد بشیر فاروقی سہسوانی کے حالات کے لیے مندرجہ ذیل کتابیں ملاحظہ فرمائیے۔

① ...... حیات العلماء: مولانا سید عبدالباقی سہسوانی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔۱۹۲۲ء ......۱۳۴۰ھ۔ صفحہ ۹۰ تا ۹۷

② ...... نزہۃ الخواطر (جلد آٹھ) حکیم سید عبدالحی حسنی۔ صفحہ ۴۱۵۔ ۴۱۶

③ ...... تراجم علمائے حدیث ہند۔ مولانا ابویحییٰ امام خاں نوشہروی۔ مکتبہ اہل حدیث ٹرسٹ، کورٹ روڈ۔ کراچی۔ صفحہ ۲۴۹ تا ۲۵۶



مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی

۱۹۴۱ء میں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے برادرِ کبیر حافظ عبداللہ بھوجیانی ہمارے ہاں کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ) میں فروکش تھے۔ قرأت و تجوید کا علم انھوں نے پانی پت میں وہاں کے فن قرأت کے مشہور عالم جناب قاری محی الاسلام سے پڑھا تھا اور کتب حدیث کا درس دہلی جا کر حضرت مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی سے لیا تھا۔ حافظ صاحب مرحوم نے طویل علالت کے بعد ۱۷ اور ۱۸۔ اپریل ۱۹۵۹ء کی درمیانی شب کو اپنے برادرِ صغیر مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے گھر لاہور میں وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۱۹۴۱ء ہی کی بات ہے کہ حافظ عبداللہ بھوجیانی کی دعوت پر حضرت مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی کوٹ کپورے تشریف لائے اور چند روز وہاں ان کا قیام رہا۔ گورا رنگ، پروقار چہرہ، تیکھے نقوش، کھلی پیشانی، آنکھوں پر نظر کی عینک۔ سر پر سفید عمامہ، قدرے لمبی قمیص اور پاجامہ زیب تن۔ کم گو اور نرم کلام۔ علم کا خزانہ اور فنونِ حدیث کے بحرِ بے کراں۔ وہ سات آٹھ دن وہاں رہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے حضرت ممدوح کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت مولانا شرف الدین کا مقامِ ولادت گجرات (پنجاب) تھا۔ لیکن ان کے خاندانی پس منظر کا علم نہیں ہوسکا۔ مولانا ابویحییٰ امام خاں نوشہروی نے ''تراجم علمائے حدیث ہند'' ۱۹۳۷ء میں لکھی تھی اور دہلی میں رہ کر لکھی تھی۔ اُن کا مولانا شرف الدین سے رابطہ رہتا تھا۔ اس کتاب سے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ مولانا کے والد کا نام امام الدین تھا اور وہ ''اعوان راجپوت'' تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اعوان اور راجپوت دو الگ الگ برادریاں ہیں۔ اعوانوں کا دعویٰ یہ ہے کہ اصلاً ان کا تعلق علاقہ عرب سے ہے اور ان کے آبا واجداد صدیوں پیشتر عرب سے برصغیر میں آئے تھے۔ اس کے برخلاف راجپوتوں کا تعلق زمانۂ اسلام سے قبل ہی سے برصغیر سے ہے۔ اس لیے واقعاتی اعتبار سے دونوں برادریاں ایک نہیں ہیں، الگ الگ ہیں۔ لیکن چوں کہ برصغیر میں مختلف برادریاں آپس میں مل جل گئی ہیں اور ان کا باہم رشتے ناطوں کا سلسلہ چل پڑا ہے، اس لیے اعوان راجپوت کا تضاد ختم ہوگیا ہے۔

مولانا ابویحییٰ امام خاں نوشہروی کی مذکورہ کتاب ۱۹۳۸ء میں چھپی تھی۔ اس میں حضرت مولانا ابوسعید شرف الدین کی ''عمر تقریباً ۶۰ سال'' لکھی ہے۔ یقیناً یہ مولانا سے پوچھ کر لکھی ہوگی۔ اس

کے معنی یہ ہیں کہ وہ ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ کی وفات کے بعد ان کی خالہ انھیں اپنے ساتھ شاہ پور لے گئی تھیں۔ شاہ پور اس وقت ضلع سرگودھا میں تھا۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ان کے والد (امام الدین) کب فوت ہوئے، نہ یہ پتا چلا کہ یہ کتنے بہن بھائی تھے اور ان کے رشتے داروں میں کوئی شخص پڑھا لکھا بھی تھا یا نہیں؟ اس کا بھی صحیح طور سے علم نہیں ہوسکا کہ ان کا مولد گجرات شہر تھا یا علاقہ گجرات کا کوئی اور مقام۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ والدہ کی وفات کے وقت بیٹے کی کیا عمر تھی۔ اس بات کا البتہ پتا چلتا ہے کہ انھیں ابتدائے عمر ہی سے حصولِ علم کا شوق تھا اور شاہ پور کے بعض اساتذہ سے انھوں نے ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ کتنا عرصہ شاہ پور رہے اور کس استاذ سے کیا کچھ پڑھا۔ یہ آج سے کم وبیش ایک سو پچیس سال قبل کی بات ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا شرف الدین کی خالہ کو بھی علم سے دلچسپی تھی اور خود مولانا کے اسلاف بھی علم وعلما سے تھوڑا بہت تعلق رکھتے تھے، اسی لیے مولانا ممدوح کا بچپن میں اس طرف رجحان ہوا۔

شاہ پور کے اساتذہ سے چند ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد ان میں حصولِ علم کا جذبہ مزید بے دار ہوا اور وہ طویل سفر طے کرکے ملتان آگئے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب نہ سڑکیں تھیں، نہ راستے ہم وار تھے۔ یعنی موجودہ دور کی کوئی بھی سفری سہولت حاصل نہ تھی۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ اس دور میں انھیں کسی طرح پتا چل گیا کہ ملتان شہر میں کسی عالم دین کا سلسلۂ تدریس جاری ہے اور وہ عالم دین تھے مولانا سلطان محمود ملتانی، جن کے لائق فرزند مولانا عبدالحق محدث ملتانی بھی وہیں باپ کے ساتھ خدمت تدریس سرانجام دیتے تھے۔

مولانا شرف الدین نے منطق کی شرح تہذیب اور علم نحو کی شرح جامی مولانا عبدالحق ملتانی سے پڑھیں۔ نیز مشکوٰۃ کا کچھ حصہ بھی انہی سے پڑھا۔ ترجمہ قرآن اور تفسیر جلالین کے آخری حصے کی تکمیل مولانا سلطان محمود ملتانی سے کی۔ ان کے ایک استاذ مولانا خلیل الرحمٰن مظفر گڑھی تھے۔ ان سے جو کتابیں پڑھیں وہ یہ ہیں: قطبی، میر قطبی، ہدیہ سعیدیہ، شرح ہدایۃ الحکمت، میبذی، نور الانوار، تفسیر جامع البیان اور مشکوٰۃ شریف کے تین ربعے۔ بعد ازاں پھر مولانا عبدالحق ملتانی کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیں۔

① جامع ترمذی، ② صحیح مسلم، ③ سنن ابی داود اور ④ سنن نسائی کے چند اجزا۔ علاوہ ازیں مختلف فنون کی چند کتابیں۔

ملتان سے دہلی کا عزم کیا جسے اس عہد میں علم وفضل کے گہوارے کی حیثیت حاصل تھی۔ وہاں جن اساتذہ کے حضور زانوئے شاگردی تہ کیے، وہ تھے مولانا محمد بشیر سہسوانی، حافظ عبداللہ بیگ،

مولانا حکیم محمد ابراہیم سنبھلی، ڈپٹی نذیر احمد، حکیم عبدالرشید خاں، حافظ عبدالوہاب نابینا، مولانا منفعت علی ﷭۔ ان حضرات سے بعض کتابیں دوبارہ پڑھیں اور درسِ نظامی کی بعض کتابوں کی تکمیل فرمائی۔

حضرت میاں سید نذیر حسین اور (صاحب عون المعبود) مولانا شمس الحق ڈیانوی سے بھی استفادہ کیا۔ حضرت شیخ حسین عرب یمنی سے اجازہ وسندِ حدیث حاصل کی۔

تکمیل تعلیم کے بعد دہلی ہی کو اپنا مسکن قرار دے لیا اور وہاں کے ایک عالم دین مولانا عبدالغفور نے اپنی دختر ان کے عقد میں دے دی۔

سلسلۂ تدریس کا آغاز اس طرح ہوا کہ ضلع علی گڑھ کے ایک قصبے ''دتاوَلی'' میں ایک صاحب مولانا محمد یونس خاں سکونت پذیر تھے۔ ان کے دو صاحب زادوں مولوی محمد انس خاں اور مولوی محمد مونس خاں کو صرف ونحو کی ابتدائی کتابوں سے لے کر حدیث کی کتابوں تک تعلیم دی۔ کچھ عرصہ دہلی کے مدرسہ ریاض العلوم میں فریضہ تدریس انجام دیا۔ حضرت میاں نذیر حسین ﷫ کی مسند درس پر بھی فائز رہے۔ بعد ازاں دہلی کے پھاٹک حبش خاں میں ۳۔ ربیع الاوّل ۱۳۵۰ھ (۲۰۔ جولائی ۱۹۳۱ء) کو ''مدرسہ سعیدیہ عربیہ'' کے نام سے خود اپنا مدرسہ جاری کیا۔ اس مدرسے میں مولانا ممدوح سے بے شمار حضرات نے کتب احادیث پڑھیں اور ان سے سندیں لیں، پھر ان کے شاگردوں نے بہت سے اصحابِ علم کو پڑھایا۔ حضرت ممدوح کے شاگردوں میں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، ان کے برادر کبیر حافظ عبداللہ بھوجیانی، مولانا عبدالعزیز سعیدی، حضرت سید محبّ اللہ شاہ راشدی، سید بدیع الدین شاہ راشدی، شیخ الحدیث مولانا علی محمد سعیدی ﷭ (مرتب فتاویٰ علمائے اہل حدیث) اور دیگر لا تعداد حضرات شامل ہیں۔ حضرت مولانا شرف الدین دہلوی کم وبیش ساٹھ سال مسند درس پر متمکن رہے۔ اس اثنا میں برصغیر کے جن شائقین علم نے ان سے فیض حاصل کیا، ان کو شمار میں لانا ممکن نہیں۔ پھر آگے چل کر ان کے تلامذہ نے جو تدریسی اور تحریری خدمات سرانجام دیں، اس کا بھی احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔

اب ان کی تصانیف کی طرف آتے ہیں:

تدریس کے علاوہ حضرت مولانا تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی سرگرم رہے۔ ان کی تصنیفی مساعی خدمت حدیث پر مشتمل ہیں، جس کی تفصیل اس طرح ہے۔

① ...... تنقیح الرواۃ: یہ مشکوۃ شریف کی عمدہ تریں شرح ہے جو انھوں نے ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی نگرانی میں مکمل کی تھی۔ اس کی پہلی جلد چھپ گئی تھی۔ دوسری جلد کا مسودہ ڈپٹی صاحب نے دہلی کے مطبع مجتبائی کے مالکوں کو طباعت کے لیے دیا تھا کہ ان سے گم ہوگیا۔ اس کا مولانا کو

سخت صدمہ پہنچا اور اس کا کئی مرتبہ انھوں نے اپنی علمی مجلسوں میں ذکر بھی فرمایا۔ لیکن غالباً ۱۹۵۷ء میں وہ مسودہ مل گیا۔ ملا اس طرح کہ دہلی سے مطبع مجتبائی کے سامان کے ساتھ جو کاغذات و مسودات وغیرہ کراچی منتقل ہوئے، حسن اتفاق سے ان میں یہ مسودہ بھی تھا۔ اس کا حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف کو پتا چلا تو انھوں نے معقول رقم خرچ کر کے یہ مسودہ مطبع مجتبائی کے مالکوں سے خرید لیا۔ طویل مدت گزرنے کی وجہ سے اس مسودے کا بہت سا حصہ بوسیدہ ہوگیا تھا اور کچھ حصے کو دیمک نے چاٹ لیا تھا۔ اب یہ مسودہ اللہ کے فضل سے محفوظ ہے۔

②...... صحیح بخاری میں مندرج آیات کی تخریج اور جمع وتدوین۔

③......شرح ابن ماجہ کے چند اجزا۔

④...... حاشیہ نصب الرایہ فی تخریج الہدایہ۔

⑤...... برہان العجاب فی فرضیۃ ام الکتاب: حضرت مولانا محمد بشیر سہسوانی کی تصنیف ہے، جسے ان کی وفات کے بعد مولانا احمد اللہ دہلوی نے شائع کیا۔ مولانا شرف الدین دہلوی نے اس کا اردو ترجمہ کیا۔

⑥...... برقِ اسلام: یہ حافظ محمد اسلم جیراج پوری کی کتاب ''علم حدیث'' کا جواب ہے۔ اس کتاب میں حافظ صاحب نے حدیث کے بہت سے پہلوؤں پر تنقید کی ہے۔ مولانا شرف الدین نے نہایت سلجھے ہوئے انداز میں نبی ﷺ کی احادیث مبارکہ کا دفاع فرمایا ہے۔

⑦......مولانا نے ایک کتاب ''خدا پرستی'' لکھی جو ''شخصیت پرستی'' کے جواب میں ہے۔

⑧......حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کے ''فتاویٰ ثنائیہ'' کے متعدد مقامات پر طویل حواشی لکھے اور بعض فتوؤں میں اضافے کیے۔

⑨...... حجیت حدیث کے سلسلے میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں تحقیقی مقالے لکھے۔

⑩......مسند امام احمد بن حنبل پر بھی کچھ کام کیا تھا۔

اس کے علاوہ بھی ان کی بعض تحریری کاوشوں کا پتا چلتا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد حضرت مولانا شرف الدین دہلی کی سکونت ترک کر کے پاکستان تشریف لے آئے تھے۔ یہاں آ کر وہ تقریباً چھ مہینے اپنے شاگرد مولانا عبدالعزیز سعیدی کے پاس چک نمبر ۵۵ پی (ضلع رحیم یار خاں) میں رہے۔ دہلی جیسے بڑے شہر سے آ کر مولانا ممدوح ایک ایسے گاؤں میں سکونت پذیر ہوئے جو شہری آبادی سے کئی میل دور تھا اور جہاں ضرورت کی کوئی چیز میسر نہ تھی۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس گاؤں میں تشریف لانے سے قبل ان کے شاگرد مولانا عبدالعزیز نہایت تنگ دستی کی گرفت میں تھے۔ اللہ

کی قدرتِ کاملہ ملاحظہ ہو کہ عالی قدر استاذ کے ورود کے ساتھ ہی شاگرد کی مالی حالت سنبھل گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے حالات بالکل بدل دیے۔

سید بدیع الدین راشدی نے تقسیم ملک سے پہلے دہلی جا کر حضرت مولانا سے استفادہ کیا تھا اور ان سے سند حدیث لی تھی۔ اب وہ پاکستان آئے تو فاضل شاگردو نے ان کو اپنے مدرسے میں نیو سعید آباد (ضلع حیدر آباد) تشریف لانے کی دعوت دی، چناں چہ مولانا وہاں گئے اور کچھ عرصہ نیو سعید آباد ان کا قیام رہا۔ کچھ عرصہ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے دار العلوم تقویۃ الاسلام (لاہور) میں اور کچھ مدت تاندلیاں والا (ضلع فیصل آباد) میں مقیم رہے۔ لاہور میں ان سطور کا راقم ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ میں اس زمانے میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' کا ایڈیٹر تھا۔ میری درخواست پر انھوں نے ''الاعتصام'' کے لیے چند مضامین بھی عنایت فرمائے۔

۱۹۴۲ء کے مارچ میں ایک سلسلے میں مجھے دہلی جانے اور وہاں چند روز رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس اثنا میں اپنے ایک ساتھی محمد علی (مرحوم) کی رفاقت میں حضرت مولانا شرف الدین کی خدمت میں بھی حاضر دی۔ یہ صبح کا وقت تھا۔ انھوں نے ہمیں ناشتہ کرایا۔ وہ سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور یہ ناشتہ ان کی سادگی کی شہادت دے رہا تھا۔ حضرت مولانا معقولات ومنقولات پر عبور رکھتے تھے۔ درسیات کے ماہر کامل...... مطالعہ بہت وسیع تھا اور اہل علم کے قدر دان تھے۔ کم گو، منکسر المزاج اور نہایت متواضع...... اسلاف کا صحیح تریں نمونہ...... سادہ مگر صاف ستھرا لباس پہنتے تھے۔

وہ گوشہ نشین تھے مگر ان کی نظر آفاقی تھی۔ خاموش طبع تھے مگر ان کی خاموشی میں بے پناہ گویائی پنہاں تھی۔ وہ عمر کی بہت سی منزلیں طے کر چکے تھے مگر ان کا ذہن جوان تھا اور قوتِ حافظہ مضبوط تھی۔ تحقیق وکاوش کی قوتیں متحرک اور جان دار تھیں۔ وہ تنہائی پسند تھے مگر اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ روایت ہے کہ وہ ہمیشہ تنگ دست رہے، لیکن ان میں کمال یہ تھا کہ اپنی تکلیف کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ شانِ بے نیازی ان کا طرۂ امتیاز تھا۔

اس استاذ الاساتذہ عالم دین اور ہمہ گیر اوصاف کی حامل شخصیت نے ۲۱۔ جولائی ۱۹۶۱ء (۷ صفر ۱۳۸۱ھ) کو کراچی میں وفات پائی۔

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون



مولانا ابوعبدالرحمٰن محمد پنجابی

برصغیر پاک و ہند میں (جس میں بنگلہ دیش بھی شامل ہے) بے شمار اصحاب علم پیدا ہوئے جنھوں نے حدیث رسول (ﷺ) کی بے حد خدمت کی۔ ان عالی قدر حضرات میں حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کا اسم گرامی خاص طور سے لائق تذکرہ ہے۔ طویل عرصے تک دہلی میں ان کی مسند تدریس حدیث آراستہ رہی اور ہزاروں شائقین حدیث نے ان سے کسب فیض کیا۔ پھر آگے چل کر ان سے فیض حاصل کرنے والوں نے بھی تدریسی اور تحریری صورت میں حدیث کی اشاعت کو اپنا فریضہ قرار دیا۔ یہی وہ پاک باز گروہ ہے، جس کی کوششوں سے اس بابرکت علم کی تحصیل کے دائرے وسیع ہوئے اور ارشادات پیغمبر (ﷺ) کی دلنواز صدائیں بلند ہوئیں۔

اس طائفۂ مبلغینِ حدیث کے ایک جلیل القدر رکن مولانا ابوعبدالرحمٰن محمد پنجابی تھے جو ضلع منٹگمری کے ایک قصبے فرید آباد کے سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ماں باپ نے ان کا نام بہادر سنگھ رکھا تھا۔ وہ قبول اسلام کے لیے گھر سے نکلے اور وزیر آباد (ضلع گوجراں والا) میں حضرت حافظ عبدالمنان محدث وزیر آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا اور کچھ اسلامی تعلیم حاصل کی۔ حضرت حافظ صاحب نے ان کا اسلامی نام محمد رکھا۔ کچھ عرصے کے بعد انھوں نے اپنی کنیت ابوعبدالرحمٰن رکھی۔ مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے انھوں نے دہلی کا قصد کیا اور حضرت میاں صاحب کے آستانۂ فضیلت پر حاضری دی۔ ان سے کتب حدیث پڑھیں اور وہاں کے مطبع انصاری کے مالک مولانا عبدالمجید سے رابطہ ہوا تو انھوں نے تصحیح کتب حدیث کی خدمت ان کے سپرد کی جو ان کے ذوق و مزاج کے عین مطابق تھی۔ اس مطبعے کے لیے انھوں نے سنن نسائی کی تصحیح کی اور اس کی شرح لکھی جسے بہترین شرح قرار دیا جاتا ہے۔ کتب حدیث کی صحت کے سلسلے میں مطبع انصاری (دہلی) بے مثال مطبع تھا جس سے مصر کے اہل علم بھی متاثر تھے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمہ قرآن میں بھی مولانا ابوعبدالرحمٰن محمد نے بہت محنت کی، جس کا ڈپٹی صاحب نے واضح الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

مولانا ابوعبدالرحمٰن محمد پنجابی کے حالات سب سے پہلے بہ صورت مضمون نومبر ۱۹۵۰ء کے ماہنامہ ''برہان'' (دہلی) میں شائع ہوئے جو ایک ذی علم مرحوم بزرگ منشی عبدالقدیر کے تحریر کردہ ہیں۔ اس کے بعد یہ مضمون ۱۵۔ دسمبر ۱۹۵۰ء کے ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں شائع ہوا۔ میرے

سامنے اس وقت ''برہان'' بھی ہے اور ''الاعتصام'' بھی۔ اب یہ مضمون ''دبستان حدیث'' میں شائع کیا جارہا ہے۔ مضمون اگرچہ مختصر ہے تاہم اس میں ضروری باتیں آ گئی ہیں۔

مولانا ممدوح کا انتقال ۱۹۰۱ میں اور ان کی اہلیہ محترمہ کا اس سے ایک سال بعد ۱۹۰۲ میں ہوا۔

اب ذیل میں مضمون ملاحظہ فرمائیے۔

ان کا اصلی نام بہادر سنگھ تھا۔ باپ کا نام سردار ہیرا سنگھ اور دادا کا نام سردار جھنڈا سنگھ تھا۔ قصبہ فرید آباد ضلع منٹگمری (پنجاب) کے رہنے والے تھے اور معزز سکھ زمیندار گھرانے کے فرد تھے۔ اس قصبے میں ایک سکول تھا۔ اس کے صدر مدرس ایک فاضل مولوی صاحب تھے۔ لڑکے مولوی صاحب کی حسن تربیت، طریقہ تعلیم اور شفقت سے بے حد مانوس تھے۔ ٹیکسٹ بک کمیٹی کے منظور شدہ نصاب تعلیم کے علاوہ مولوی صاحب خالی اوقات میں اکثر طلبا کو قصص الانبیا کا بھی درس دیا کرتے تھے۔ لڑکے شوق سے پڑھتے تھے اور مولوی صاحب سے بہت متاثر تھے۔ قصبے کے باشندے بھی مولوی صاحب کی تعظیم و تکریم کرتے تھے اور ان کی خدمت کو سعادت کا باعث خیال کرتے تھے۔

ایک روز ایک ذیل دار صاحب مدرسے میں آئے اور مولوی صاحب کو علیحدہ لے جا کر اصل بات بتائی اور کہا کہ میں پانچویں جماعت کے طلبا کا امتحان لینا چاہتا ہوں۔ میں ذیل دار ہوں۔ خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ میری ایک اکلوتی لڑکی ہے جسے میں نے ناز و نعمت سے پالا ہے۔ اب وہ شادی کے قابل ہوگئی ہے۔ اس کی کتخدائی کی فکر دامن گیر ہے۔ باوجود تلاش کے کوئی لڑکا میری مرضی کے مطابق نہیں ملا۔ اب میں نے یہ طے کیا ہے کہ لڑکوں کا امتحان لوں۔ جو سب سے قابل نکلے میں توکل بر خدا اسی کے ساتھ اس کی شادی کردوں۔ آپ بھی اس کار خیر میں میری مدد فرمائیں۔

مولوی صاحب نے اس طریقہ انتخاب کو پسند کیا اور امتحان لینے کی اجازت دے دی۔ چناں چہ ذیل دار صاحب نے ایک ایک لڑکے سے مختلف سوال کیے اور ہر ایک کی ذہنی اور فکری قابلیت کا اندازہ لگایا۔ اس آزمائش میں بہادر سنگھ اول آئے۔ بعد اطمینان، مولوی صاحب اور ذیل دار صاحب بہادر سنگھ کے والد کے پاس گئے۔ بات پختہ ہوگئی اور چند روز کے بعد بڑی دھوم دھام اور چاؤ سے ذیل دار صاحب نے اپنی لڑکی بہادر سنگھ کے ساتھ بیاہ دی۔ چناں چہ ابتدائی رسوم کے بعد لڑکی سسرال میں رہنے لگی۔

کچھ عرصہ بعد بہادر سنگھ اور ان کے تین ساتھیوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ قصبے سے نکل چلو۔ ایک نے طے کیا کہ وہ جوگی بنے گا۔ باقی تین نے تبدیلِ مذہب کا ارادہ کیا۔ عین وقت پر اہل قصبہ کو چاروں لڑکوں کی سازش کا علم ہوگیا اور باہم چرچے ہونے لگے کہ کیا کیا جائے۔ دو لڑکے تو اپنے والدین کے قابو آگئے اور دو نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگئے۔ مفرورین کے تعاقب میں اہل دیہہ

گھوڑوں پر نکلے مگر کسی کا کھوج نہ لگا۔ جوگی بننے والے کا تو پتا ہی نہیں کہ وہ کس پہاڑ کی کھوہ میں جا بیٹھا۔ مگر بہادر سنگھ سیدھے مولانا حافظ عبدالمنان صاحب کے پاس وزیر آباد پہنچے اور مشرف بہ اسلام ہوکر ان ہی کے پاس رہنے اور دینیات پڑھنے لگے۔ کیسوں کو پٹوں میں تبدیل کرلیا۔ ایک سال کے بعد قصبے والوں کو ان کا سراغ مل گیا۔ چناں چہ بہت سے اقربا وزیر آباد آئے اور سمجھا بجھا کر بہادر سنگھ کو ہمراہ لے گئے اور وہاں ان کی کڑی نگرانی رکھی۔ ظاہر ہے بہادر سنگھ کے ساتھ نرم گرم سبھی قسم کا سلوک ہوا ہوگا مگر بہادر سنگھ نے کہا میں تو اسلام قبول کرچکا۔ اب کسی شرط پر اس سے لوٹنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ آپ کا جو جی چاہے کیجیے۔ سب کچھ برداشت کروں گا۔ اس بات سے دونوں وقت کھانا کھانے کے سلسلے میں ایک کہرام سا مچا کرتا تھا کیوں کہ بہادر سنگھ چوکے کے باہر کھانا کھاتے تھے۔

بہادر سنگھ پر حقانیت غالب آچکی تھی۔ صداقت ان کے دل میں گھر کرچکی تھی۔ ہر وقت کے مظاہروں کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ایک روز موقع پاکر وہ پھر کھسک گئے اور سیدھے لاہور پہنچ گئے اور کسی مسجد میں مقیم ہوکر دینی تعلیم کے حصول میں منہک ہوگئے۔ گزارے کے لیے دو ٹیوشن تلاش کرلیے۔ تقریباً سال بھر کے بعد یہاں بھی ان کو کسی نے پہچان لیا۔ چناں چہ ان کے والد دوبارہ لاہور آکر ان کو فرید آباد لے گئے اور سخت نگرانی میں رکھا۔ اس دو ڈھائی سال کے عرصے میں وہ کافی لکھ پڑھ گئے تھے۔ اچھے خاصے جوان اور سوچ سمجھ والے ہوگئے تھے۔ جب لوگ ان کو سمجھاتے تو وہ بدلائل ان کو قائل کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے والد صاحب (ہیرا سنگھ) کے رویے میں تبدیلی آگئی، وہ مائل بہ اسلام ہوتے گئے اور عقیدۃً مذبذب ہوگئے۔ بہادر سنگھ کو انھوں نے ڈھیل دے دی کہ جس رنگ میں رہنا چاہو رہو۔ خوش رہو۔ نگرانی ترک کردی۔

بہادر سنگھ کے دماغ میں دینی تعلیم کا شوق گھر کرچکا تھا۔ ہر وقت اسی فکر میں رہتے کہ ہوسکے تو پھر قصبے سے چلا جاؤں۔ چناں چہ موقع پاتے ہی وہ دارالعلوم دیوبند پہنچے اور چند سال میں فارغ التحصیل ہوکر دہلی آگئے اور فتح پوری میں مقیم ہوئے۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ دہلی میں کہاں کہاں تعلیم پائی۔ بہر صورت دہلی میں ان کی بہت قدر ہوئی۔ شمس العلما مولانا نذیر حسین صاحب عرف میاں صاحب کے باعث پھاٹک حبش خاں میں ان کو ایک مکان کرایہ پر مل گیا۔ مولوی عبدالمجید صاحب مناظر کے مطبع انصاری میں کتب دینیات کے مصحح ہوگئے۔ ان کا میل جول شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی، مولوی عبدالرب صاحب، مہر شاہجہان صاحب، مولوی تلطف حسین صاحب وغیرہم اور دیگر بزرگوں سے ہوگیا، اور ان کی قابلیت کے جوہر کھلے تو مولوی نذیر احمد صاحب نے ترجمہ قرآن جیسا مشکل کام ان کے سپرد کیا جس کو انھوں نے بہ احسن وجوہ انجام دیا۔

یہی ترجمہ بعد میں مولوی نذیر احمد صاحب کا ترجمہ کہلایا اور انھی کی ذات گرامی کے باعث (مطبع انصاری) اپنی صحت کے اعتبار سے ہندوستان بھر میں مشہور ہوا۔ ۱۸۹۳ء میں مجھے بھی ان سے ''صرف بہائی'' کے چند اسباق پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔

بہادر سنگھ کو ان سب بزرگوں نے مشورہ دیا کہ اب وہ خود اپنے وطن جائیں اور گھر والوں اور دوستوں کو پند و نصائح کریں۔ چناں چہ انھوں نے ان کی رائے پر عمل کیا اور بغیر اطلاع کے فرید آباد پہنچے تو اہل دیہہ نے ان کا خیر مقدم کیا۔ مگر دوسرے ہی روز پھر سب جمع ہوئے اور انھوں نے ان کے والد (سردار ہیرا سنگھ) کا بائی کاٹ کر دیا اور یہ الزام لگایا کہ وہ بباطن مسلمان ہوگئے ہیں اور یہ کہ انھوں نے بہادر سنگھ کو فراری کے مواقع بہم پہنچائے۔ اس حرکت سے قریب کے دیہات میں بہت چرچے ہوئے اور لوگ ان کو دیکھنے اور ملنے کے لیے دور دور سے آئے اور ان کے مواعظِ حسنہ سے فیض یاب ہونے لگے۔ انھوں نے اچھی خاصی تبلیغ شروع کر دی۔ مسائل دریافت کرنے والوں اور فتاویٰ حاصل کرنے والوں کا تانتا سا لگ گیا۔ گھر والے اس سے بہت پریشان تھے کہ کیا کیا جائے۔ وقت پر وہیں اذان دینا اور وہیں نماز پڑھنا کوئی بات ہی نہ تھی۔ گھر والے ان کو بہادر سنگھ کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ آئندہ انھیں صرف ''محمد'' کہہ کر پکارا کریں۔ اسے ان سب نے اس شرط پر تسلیم کیا کہ وہ گھر پر نماز نہ پڑھا کریں بلکہ قصبے سے دور ادا کیا کریں۔ اس سے ان کی دل آزاری ہوتی ہے۔ انھوں نے ان کی یہ شرط مان لی اور قصبے سے تھوڑے فاصلے پر ایک چاہ کے قریب، ایک درخت کے نیچے قیام گاہ بنائی اور کافی عرصہ اسی حالت میں گزارا۔

ایک روز کرنا خدا کا کیا ہوا کہ وہ اپنے گھر کے دالان یا کمرے میں کہیں آرام کر رہے تھے کہ ان کی اہلیہ محترمہ کوئی شے لینے یا رکھنے کے لیے برابر کی کوٹھڑی میں جانا چاہتی تھی۔ جیسے ہی وہ پاس سے گزری انھوں نے جرأت کرکے آنچل پکڑ کر اسے روک لیا۔ اس سے قبل تبدیلیٔ مذہب کی بنا پر دونوں میاں بیوی کے لب پر مہر خاموشی تھی۔ انھوں نے کہا کہ بولنا چالنا کیوں بند کر رکھا ہے۔ میں وہی ہوں جو چند سال پیشتر تھا۔ میرا تمھارا رشتہ قطع ہونے والا نہیں ہے۔ کہو اب تمھاری کیا مرضی ہے؟ اس عفیفہ نے جواب دیا کہ میری کوئی مرضی نہیں۔ مرضی تو آپ کی ہے۔ میں آپ کی ہوچکی ہوں۔ ہر حال میں اسی گھر میں رہوں گی اور یہاں سے مر کر ہی نکلوں گی، اور آپ کا جو حکم ہوگا اسے بجا لاؤں گی۔ مولوی صاحب نے کہا کہ اگر یہی بات ہے تو میں بھی تمھارا ہو چکا ہوں۔ اگر تم اسلام قبول کرلو گی تو ہم میاں بیوی رہ سکتے ہیں اور میں تمھارے اسلام لانے سے اپنے تئیں بہت خوش قسمت سمجھوں گا۔ اہلیہ محترمہ نے رضا مندی ظاہر کی تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے، جس نے تمھارے دل میں تبدیلی پیدا کی ہے، وہی آئندہ کے لیے بھی کوئی

صورت پیدا کردے گا۔ اسی فکر میں کہ اب کیا کیا جائے وہ دریا پار ایک گاؤں میں وہاں کے نمبردار سے جو نابینا تھا مشورے کے لیے گئے۔ نمبردار بہت بارسوخ اور ہر دلعزیز تھا۔ اس نے کہا مولوی صاحب گھبرانے کی بات نہیں، خدا کارساز ہے۔ ان شاء اللہ جو ہوگا بہتر ہوگا۔ اس کے بعد اس نے ان کا لائحہ کار مرتب کیا اور وہ قصبے میں واپس آگئے۔ چند روز بعد دیوالی کا تہوار تھا۔ گھر میں چراغاں ہوا۔ خوب زور شور سے تہوار منایا گیا۔ رات کے آخری حصے میں یکے بعد دیگرے سب گھر والوں پر نیند غالب آگئی تو وہ خدا پر بھروسا کر کے مع اہلیہ محترمہ کے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ قصبے کے باہر کچھ فاصلے پر ان کو دو گھوڑے تیار کھڑے ملے۔ دونوں میاں بیوی گھوڑوں پر سوار ہو کر دریا کے کنارے پہنچے۔ وہاں دو کشتیاں پہلے سے موجود تھیں۔ دونوں ایک کشتی پر سوار ہو کر دریا پار کر گئے اور نابینا نمبردار کے مکان پر پہنچے۔ علی الصباح اس گاؤں کی مسجد میں ان کی اہلیہ مشرف بہ اسلام ہوئیں۔ تجدید نکاح اور ایجاب و قبول ہوا اور نمبردار نے اپنے آدمیوں کی معیت میں اس خوش قسمت جوڑے کو دہلی روانہ کردیا۔ پروگرام یہ تھا کہ دو گھوڑے تو میاں بیوی کے واسطے تھے ہی مگر دریا تک راستے کے دونوں جانب تقریباً دو سو لٹھ بند زمیندار بھی حفاظت کے لیے راستے کے دور یہ اس طرح کھڑے تھے جیسے وائسرائے کی گزرگاہ پر پولیس یا فوج کے جوان کھڑے ہوتے ہیں۔

جوں جوں ان کے گھوڑے آگے چلتے گئے، زمیندار سمٹ سمٹ کر ان کے پیچھے چلتے گئے اور کشتیوں پر سوار ہو کر دونوں کی طرف سے باراتی بن گئے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ کشتیوں کو دریا کے پار اس وقت تک نہیں جانے دیا گیا جب تک کہ میاں بیوی دہلی روانہ نہ ہو گئے۔

صبح گھر والوں نے جب دونوں کو غائب پایا تو کہرام مچ گیا۔ اہلیہ محترمہ کے والد کو بادل ناخواستہ اطلاع دی گئی جو فرط غم میں اس جوڑے کو ڈھونڈنے نکلے اور اس کے بعد وہ آج تک واپس نہیں آئے اور نہ وہ اپنی لڑکی اور داماد سے کہیں ملے۔

دہلی میں مدت مدید رہنے کے بعد جب مولوی محمد صاحب صاحبِ اولاد ہو گئے تو مع بال بچوں کے فرید آباد تشریف لے گئے مگر اس مرتبہ ان کے والد بزرگ وار کا انتقال ہو چکا تھا۔ پھر اس کے بعد بھی بار بار وطن جاتے رہے اور عزیزوں سے ملتے رہے۔ ان کے بڑے بھائی سردار کاہن سنگھ بھی ملنے کے لیے دو مرتبہ دہلی آئے۔ خط و کتابت بھی ہوتی رہی اور تمام اختلاف مٹ گئے۔ مولوی صاحب موصوف دہلی میں بہت ہی کثیر المشاغل رہتے تھے۔ بے حد متقی اور ملنسار تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے اپنے جامع المصحف کے دیباچے میں ان کے متعلق ذیل کی عبارت لکھی ہے۔

ترجمے کے حق میں یہ ایک فال نیک تھی کہ حسن اتفاق سے مولوی ابو عبدالرحمٰن محمد صاحب ہاتھ آگئے اور وہ شروع سے آخر تک میرے شریک بلکہ ایک اعتبار سے شریک غالب اور مددگار رہے۔ ہم

دونوں آمنے سامنے بیٹھتے۔ بیچ میں میز خالی ہوتی۔ میرے ہاتھ میں قرآن مجید، اور کبھی میں نے حفظ پر اعتماد کیا تو قرآن بھی نہ سہی۔ مولوی محمد صاحب کے گردا گرد تراجم اور تفاسیر اور کتب لغت۔ میں ایک جملے یا ایک آیت کا ترجمہ جو الفاظ قرآن سے سمجھتا بولتا اور مولوی محمد صاحب اس کو قلم بند کرتے اور پھر مجھ میں اور مولوی صاحب میں بحث ہوتی اور اختلاف کی صورت میں تراجم اور تفاسیر اور لغت کی طرف رجوع کیا جاتا۔ اس طرح پر سارے قرآن کا ترجمہ کیا گیا۔ براہِ راست قرآن کا ترجمہ ہے، نہ کہ دوسرے ترجموں کی طرح ترجمے کا ترجمہ۔ اس کا ماخذ قرآن کے الفاظ ہیں، نہ کہ کسی مفسر یا مترجم کے۔ پھر ہم دونوں نے ترجمہ پر نظر ثانی کی۔ مولوی محمد صاحب ترجمہ پڑھتے اور میں عبارت کی سلاست اور الفاظ کی نشست کا دھیان رکھتا اور ترجمہ کو الفاظ قرآن سے ملاتا اور پھر ہم میں پہلے کی طرح بحث ہوتی۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ بحث میں رنجش بھی ہوجاتی تھی مگر چوں کہ دونوں کی نیت بخیر تھی۔ اس لیے ہم دونوں نے کبھی مناظرے کی حد سے تجاوز نہیں کیا۔ ابھی متفق ہوگئے، ابھی لڑے اور ابھی ملے۔

مولوی محمد صاحب کا انتقال غالباً ۱۹۰۱ء میں اور ان کی اہلیہ محترمہ کا ۱۹۰۲ء میں ہوا۔ تین خورد سال بچے یکے بعد دیگرے فوت ہوئے۔ ایک لڑکی خدیجۃ الکبریٰ اور ایک لڑکا بچے۔ انفولنزا کے دنوں میں ایک سال کے فرق سے یہ بہن بھائی بھی راہیٔ ملک عدم ہوگئے۔ لڑکے کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ اور باپ ہی کی طرح بہت خلیق اور صالح جوان تھا۔ مولوی صاحب مرحوم کے تین نواسے اور ایک نواسی پاکستان میں بقید حیات ہیں۔ صاحب اولاد ہیں اور کاروبار کرتے ہیں۔

مولوی محمد مرحوم کے اعزا نے ان کے لڑکے مولوی عبدالرحمٰن کے نام تین سو بیگھے زمین ان کے حصے کی داخل خارج کرا دی تھی جس کی آمدنی وہ کئی سال تک لیتے رہے۔ اب معلوم نہیں انقلاب کے بعد وہ زمین کس کے قبضے میں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کے رشتہ دار سب کے سب حق پسند اور شریف انسان تھے۔

منشی عبدالقدیر کا مضمون ختم ہوا۔ اس کا خلاصہ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے تعلیقات نسائی کے شروع میں بہ زبان عربی دیا ہے۔ اس سے حضرت مولانا ابوعبدالرحمٰن محمد پنجابی کی خدمت حدیث کے بارے میں مساعیٔ جمیلہ کی مزید وضاحت ہوجاتی ہے۔



مولانا ابومحمد ابراہیم آروی

ہندوستان کے صوبہ بہار کے مختلف مقامات میں بے شمار اہل حدیث علمائے کرام نے جنم لیا اور انھوں نے بے پناہ علمی خدمات سرانجام دیں۔ ان علمائے عالی مقام میں ایک بزرگ حضرت مولانا ابومحمد ابراہیم آروی تھے جو ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۱ء) میں آرہ کے ملکی محلّہ میں پیدا ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق ان کا سالِ ولادت ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اس جلیل القدر عالم کی ولادت ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے چند سال پہلے ہوئی۔ یہ مغل حکومت کا آخری دور تھا اور اس عظیم شخصیت نے اپنی بالکل ابتدائی زندگی کے چند سال آزادی کی فضا میں بسر کیے۔ اس کے بعد اس ملک پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہوگیا۔

مولانا ابومحمد ابراہیم آروی کے والد گرامی کا نام ناظر عبدالعلی تھا۔ وہ اس نواح کے معروف طبیب اور خطاط تھے۔ مولانا آروی کے بڑے بھائی حکیم ظہور الحسن تھے، وہ بھی نامور طبیب اور خوش نویس تھے۔

صوبہ بہار کے بہت سے مقامات کے لوگ حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید دہلوی کی تحریک سے متاثر تھے۔ آرہ کے لوگوں پر بھی ان کی تحریک جہاد اور تحریک اتباعِ کتاب وسنت کا بے حد اثر تھا۔ مولانا ابراہیم آروی کے خاندان کا شمار بھی اس تحریک کے متاثرین میں ہوتا تھا۔ خود مولانا آروی ترویج سنت، استیصال بدعات، تبلیغ دین اور ترویج علم میں پیش پیش رہتے تھے۔

مولانا ابومحمد ابراہیم آروی کے حصول تعلیم کے بارے میں ہفت روزہ ''اہل حدیث'' (امرتسر) مورخہ ۲۴۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء میں مرقوم ہے کہ

> ''ابتدائی کتابیں مولانا محمد ابراہیم آروی نے مولوی حکیم ناصر علی مرحوم، قاضی محمد کریم مرحوم، مولوی نور الحسن آروی اور مولانا الٰہی بخش خاں صاحب بہاری سے پڑھیں۔ متوسط اور اکثر کتابیں مولانا لطف اللہ علی گڑھی سے (علی گڑھ میں) پڑھیں۔ بقیہ کتابیں مولانا سعادت حسین بہاری سے پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ مکہ معظمہ میں مولانا عبدالجبار مہاجر مکی، مولانا محمد انصاری مہاجر مکی، سید محمد دحلان اور شیخ حمید مفتی حنابلہ مکی سے سند قرأت لی۔ نیز مدینہ منورہ میں مولانا عبدالغنی مجددی مدنی سے بھی سند قرأت واجازہ حاصل کی۔ مولانا قاضی محمد مچھلی شہری اور شیخ حسین عرب یمنی سے بھی

سند اجازت حاصل ہوئی۔"

حجاز جانے سے قبل حضرت سید میاں نذیر حسین دہلوی ﷫ کی خدمت میں حاضر ہو کر کتب حدیث کی تکمیل کی اور سند سے مفتخر ہوئے۔

ہندوستان کے اہل علم سے استفادے کے بعد اپنے شہر آرہ میں مسند تدریس آراستہ کی اور اس علاقے میں عمل بالحدیث کی نشر واشاعت کا سلسلہ شروع فرمایا۔ پھر ایک وقت آیا کہ آرہ میں اپنی کوشش سے جامع مسجد تعمیر کرائی اور مدرسہ قائم کیا اور بہت بڑے پیمانے پر تدریس کا آغاز فرمایا۔ ان کے قائم کردہ مدرسے کا نام مدرسہ احمدیہ تھا، جو مدرسہ احمدیہ سلفیہ کی صورت میں اب بھی بحمد اللہ کامیابی سے جاری ہے۔ علاوہ ازیں ان حالات کے مطابق "مطبع خلیلی" کے نام سے ایک بہت بڑا چھاپہ خانہ کھولا۔

سید سلیمان ندوی "حیاتِ شبلی" کے حاشیہ (صفحہ ۳۰۸) میں مولانا محمد ابراہیم آروی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"نئی باتوں میں وہ اچھی باتوں کو قبول کرتے تھے۔ چنانچہ نئے طرز پر انجمن علما اور عربی مدرسہ اور اس میں دار الاقامہ کی بنیاد کا خیال انہی کے دل میں آیا اور انہی نے ۱۸۹۰ء میں "مدرسہ احمدیہ" کے نام سے ایک مجلس بنائی جس کا سال بہ سال جلسہ آرہ میں ہوتا تھا۔ یہ مدرسہ مدتوں خوش اسلوبی سے چلتا رہا۔ ۱۹۰۰ء میں والد مرحوم مجھے اس مدرسہ میں بھیجنا چاہتے تھے، مگر تقدیر کچھ اور تھی۔ یہ تجویز عمل میں نہ آئی۔ مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری سالہا سال اس میں پڑھاتے رہے۔ مولانا عبدالسلام مبارک پوری، مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری اور بہت سے علما یہاں کے شاگرد ہیں ...... پھر یہ مدرسہ آرہ سے در بھنگا منتقل ہوگیا اور مدرسہ احمدیہ سلفیہ کے نام سے مشہور ہے۔"

عربی مدارس کا یہ جدید طرز کا مدرسہ احمدیہ جو مولانا ابو محمد ابراہیم آروی نے جاری کیا تھا دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ سے مدتوں پہلے جاری ہو چکا تھا، لیکن افسوس ہے اس کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ سید سلیمان ندوی مرحوم نے اس کا واضح الفاظ میں ذکر فرمایا ہے اور اس مدرسے کی تعریف کی ہے۔

اس سے آگے حیاتِ شبلی کے صفحہ ۳۱۱ پر سید صاحب لکھتے ہیں:

"ندوہ کے اجلاس منعقدہ ۱۳۱۲ھ کے ایک خصوصی اجلاس میں مولانا ابراہیم آروی نے علومِ جدیدہ کے اضافے کی تجویز کی تائید کی۔"

مولانا ابراہیم آروی ہمیشہ کسی نہ کسی دینی اور علمی جدوجہد میں مصروف رہتے تھے۔ انھوں نے "مذاکرہ علمیہ" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا، جس کا ہر سال (سالانہ) جلسہ منعقد کیا جاتا تھا۔

اس جلسے میں ملک کے مشہور اور ممتاز اہل علم شریک ہوتے تھے۔ ان اہل علم میں حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی، نواب محسن الملک، ڈپٹی نذیر احمد، علامہ شبلی نعمانی اور مولوی ذکاء اللہ کے نام قابل ذکر ہیں جنھوں نے آرہ کے اس سالانہ جلسے میں شرکت فرمائی۔

۲۵۔ دسمبر ۱۹۷۰ء کے اخبار الاعتصام میں مولانا ابومحمد ابراہیم آروی کے متعلق ایک عالم دین مولانا عبدالمالک آروی مرحوم کا مضمون شائع ہوا تھا۔ اس وقت اس اخبار کے ایڈیٹر مولانا عطاء اللہ حنیف تھے۔ مضمون نگار نے مولانا آروی کے بارے میں تحریر فرمایا تھا۔

> ''مولانا مرحوم نہایت حسین اور وجیہ شخصیت کے مالک تھے۔ گورے چٹے، اعضا متناسب، رموزِ پہلوانی سے واقف، صناعی میں یگانہ، موسیقی کے ماہر، شعلہ بیان خطیب، فصیح و بلیغ شاعر، کہنہ مشق انشا پرداز، پختہ قلم خطاط، محدث، مترجم، عربی، فارسی، اردو زبانوں پر قادر، انگریزی سے بہ قدرِ ضرورت آشنا۔ یہ تھیں صفات ہمارے وطن کے اس بدیعہ روزگار انسان کی جو پاک بازی کا پیکر اور تقدس وروحانیات کا مجسمہ تھا، جس کی باتیں رفقا کے لیے دام تسخیر تھیں اور جس کی زندگی کے کارنامے آئندہ نسلوں کے لیے مشعل ہدایت تھے۔''

مولانا ابومحمد ابراہیم آروی کا اُس دور کے مطابق آرہ میں بہت بڑا کتب خانہ تھا۔ اس کتب خانے سے علامہ شبلی اور مولوی ذکاء اللہ جیسے نامور اہل علم اور اپنے وقت کے معروف ادیب استفادہ کرتے تھے۔ وہ کئی کئی دن وہاں آ کر قیام فرماتے اور مولانا آروی کی علمیت اور ان کی لائبریری سے مستفید ہوتے تھے۔ [1]

مولانا آروی بڑے مہمان نواز تھے۔ ان کے مطبخ میں مہمانوں کے لیے انواع واقسام کے کھانے تیار ہوتے تھے۔ مولانا کی اپنی خوراک تو بالکل معمولی تھی۔ موٹے چاول، دال اور ساگ ترکاری وغیرہ پر اکتفا کرتے تھے۔ لیکن مہمانوں کے لیے پُر تکلف کھانا تیار کیا جاتا تھا۔

مولانا ممدوح گھر سے آسودہ حال تھے۔ ان کے والد نے کافی دولت چھوڑی تھی۔ لیکن وہ اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے تھے۔ سرمے دانی کی صنعت کے ماہر تھے اور اپنے ہاتھ سے سرمے دانیاں بناتے تھے۔ اس کے لیے بازار سے جو سامان خریدا جاتا تھا، وہ خود اپنے کندھوں پر اٹھا کر لاتے تھے۔ اپنے ذاتی کام خود انجام دیتے تھے، کسی کو کوئی تکلیف نہ دیتے تھے۔ نہ مدرسے کے طلبا سے کوئی کام کراتے تھے اور نہ مدرسے سے کوئی پیسا لیتے تھے۔ مولوی عبدالمالک آروی کے بقول

---

[1] ارض بہار اور مسلمان، ص: ۳۴۰

”حضرت مولانا ہمارے بزرگانِ سلف اور صوفیاے کرام کے صحیح طور سے نقش قدم پر تھے۔“

حضرت مولانا ابو محمد ابراہیم آروی کے جاری کردہ مدرسہ احمدیہ سے متعدد بڑے بڑے علما نے تحصیل علم کی اور کئی جید علماے عظام اس میں خدمت تدریس سرانجام دیتے رہے، جن میں حضرت مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری اور حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی خاص طور سے لائق تذکرہ ہیں۔ حضرت شاہ عین الحق پھلواروی کا بھی (جنھیں صحیح معنوں میں بہار کے ابراہیم بن ادہم کہا جاسکتا ہے) کچھ عرصہ اس درس گاہ میں فیض درس جاری رہا۔

آرہ میں مولانا ابراہیم آروی پہلے عالم دین ہیں، جنھوں نے رمضان المبارک کے آخری عشرے میں شب قدر کے لیے بے داری اور عبادت وقرآن خوانی کا اہتمام کیا۔ ورنہ اس سے قبل لوگ شب برأت (شعبان کی چودھویں رات) کو جاگتے اور مصروف عبادت رہتے تھے۔

رمضان کے آخری عشرے کی راتوں کو مولانا خود جاگتے اور لوگوں کو تہجد ونوافل پڑھنے کی تلقین فرماتے۔ ان راتوں میں مولانا وعظ فرمایا کرتے اور ان کا وعظ نہایت مؤثر ہوتا تھا۔ ان کو دیکھ کر شہر کی دوسری مسجدوں میں بھی رمضان کے آخری عشرے کی راتوں میں بے داری اور تلاوتِ قرآن کا التزام ہونے لگا۔

مولانا آروی کا وعظ لوگ انتہائی شوق اور انہاک سے سنتے اور تاثر کا یہ عالم تھا کہ نماز کے وقت بازاروں اور گلیوں میں سبزی بیچنے والی عورتیں مصلے بچھا کر نماز پڑھنا شروع کردیتیں۔ [1]

سید سلیمان ندوی ”حیات شبلی“ میں رقم فرماتے ہیں کہ مولانا ابراہیم آروی نہایت پردرد وعظ کہتے تھے۔ وعظ میں خود روتے اور دوسروں کو رلاتے۔ ندوہ کے اجلاس منعقدہ ۱۳۱۱ھ کے پہلے اجلاس میں مولانا ابراہیم آروی نے دلپذیر وعظ فرمایا۔ [2]

سید صاحب فرماتے ہیں ۱۳۱۷ھ میں بھوپال کی مجلس نظارۃ المعارف قائم ہوئی (جو ایک تعلیمی مجلس تھی) اس کے ایک رکن مولانا ابراہیم آروی تھے، مولانا شبلی بھی اس مجلس کے رکن تھے۔

مولانا آروی کے زمانے اور علاقے میں ایک مدت سے یہ غلط رواج چلا آرہا تھا کہ کسی عورت کا شوہر فوت ہوجاتا تو اس کا نکاح ثانی نہیں کیا جاتا تھا، اگرچہ وہ کسی عمر کی ہوتی، تمام عمر گھر میں بیٹھی رہتی تھی۔ یہ نہایت قبیح رسم تھی جو ہندوؤں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں میں آئی تھی۔ شریف اور کھاتے پیتے گھرانوں میں تو نکاح بیوگان کا تصور بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ کیوں کہ یہ ان کی عزت کے

---

1. ملاحظہ ہو ارض بہار اور مسلمان، ص: ۳۴۱
2. حیات شبلی، ص: ۳۰۶

خلاف تھا۔ مولانا آروی نے جرأت کر کے اس خلافِ شرع رسم کے خلاف آواز بلند کی۔ مولانا ایک معزز گھرانے کے فرد تھے اور اس رسم کی مخالفت کرنا نہایت مشکل تھا۔ لیکن انھوں نے اس رسم بد کو ختم کرنے کا آغاز اپنے گھر سے کیا اور سب سے پہلے اپنی بیوہ بہن کا نکاح کیا، حالاں کہ وہ کبر سنی کو پہنچ گئی تھی اور عابدہ وزاہدہ خاتون تھی۔ اپنی ایک بیٹی کا بھی عقد ثانی کیا۔ اپنے مرحوم بھائی کی بیوہ کو ایک شخص کے نکاح میں دیا۔ خود ایک شریف بیوہ عورت کو اپنے عقد میں لائے۔ یہ نہایت جرأت مندانہ اور حوصلے کا کام تھا جو مولانا نے انجام دیا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اس قبیح رسم کا خاتمہ ہو گیا اور بے شمار لوگوں نے اپنی بیوہ بیٹیوں اور بہنوں کے نکاح ثانی کیے۔

مولانا آروی جہاں ممتاز مدرس اور بہت بڑے واعظ ومقرر تھے، وہاں نامور مصنف اور مترجم بھی تھے۔ ان کی بیس تصانیف کا پتا چلتا ہے، جن میں قرآنِ مجید کے چند پاروں کی ایک تفسیر بھی ہے جو تفسیر خلیلی کے نام سے موسوم ہے اور اس کا ذکر ہم اپنی کتاب ''برصغیر کے اہل حدیث خدامِ قرآن'' میں کر چکے ہیں۔ [1]

مولانا آروی کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

① ...... تفسیر خلیلی: یہ قرآنِ مجید کے پہلے، دوسرے، انتیسویں اور تیسویں چار پاروں کی تفسیر ہے۔
② ...... طریق النجاۃ: یہ مشکوۃ شریف کے کچھ حصے کا اردو ترجمہ ہے۔
③ ...... تفسیر ابن کثیر: ترجمہ پارہ اول۔
④ ...... تلقین التصریف: علم صرف کے موضوع پر ایک رسالہ۔
⑤ ...... تہذیب التصریف: اس کا تعلق بھی علم صرف ہے۔
⑥ ...... ارشاد الطلاب: یہ رسالہ علم نحو کے بارے میں ہے۔
⑦ ...... ارشاد الطلب الیٰ علم الادب: اس کا تعلق بھی علم نحو سے ہے۔
⑧ ...... تسہیل التعلیم:
⑨ ...... طرزِ معاشرت: معاشرتی امور سے متعلق
⑩ ...... یتامیٰ: یتیموں کے حقوق ومعاملات کے بارے میں۔
⑪ ...... خیر الوظائف:
⑫ ...... صلوٰۃ النبی:

---

[1] ملاحظہ ہو ''برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن'' کے بہرۂ الف میں مولانا ابو محمد ابراہیم آروی ...... مولانا ممدوح کی کنیت ابو محمد تھی اور نام محمد ابراہیم تھا۔

⑬...... صلاح وتقویٰ:

⑭......سلیمان وبلقیس:

⑮...... اتفاق:

⑯...... بادشاہ مجازی وحقیقی:

⑰......غنچۂ مراد:

⑱......قول میسور: ایک لیکچر جو انھوں نے حیدر آباد (دکن) میں دیا۔

⑲...... فارسی کی پہلی کتاب:

⑳...... فارسی کی دوسری کتاب:

یہ کتابیں ان کی اپنی تصنیف فرمودہ ہیں یا ان میں سے بعض کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالغفار مہدانوی سے امام بخاری کی کتاب ''الادب المفرد'' کا اردو ترجمہ کرایا جو ان کے اپنے پریس مطبع خلیلی میں چھپا۔

مولانا ابراہیم آروی کے تراجم احادیث کے بارے میں مولوی عبدالمالک آروی مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

''یہ کتابیں اس وقت لکھی گئیں جب کہ مولانا وحید الزمان خاں صاحب (نواب وقارنواز جنگ بہادر) مہاجر مکی اور ان کے بڑے بھائی [1] کے اردو تراجم جو صحاح ستہ کے متعلق ہیں، ابھی شائع نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے یہ سب سے پہلا شرف صوبہ بہار کو اور بہار میں آرہ کو حاصل ہے کہ وہاں کے ایک عالم نے صحیح احادیث کو بامحاورہ اردو میں پیش کیا۔'' [2]

سرسید احمد خاں سے مولانا آروی اچھے مراسم رکھتے تھے۔ چناں چہ کتاب ''مکتوبات سرسید'' جلد اوّل شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور (مطبوعہ جون ۱۹۷۶) میرے سامنے ہے، جس میں مولانا ممدوح کے نام سرسید کے تین مکتوب (از صفحہ ۵۳۱ تا صفحہ ۵۳۶) شائع ہوئے ہیں۔ (مکتوبات سرسید کی ایک ہی جلد شائع ہوئی ہے) اس کتاب میں ۸۰ حضرات کے نام سرسید کے مکتوبات درج ہیں اور مولانا آروی کا آخری یعنی ۸۰واں نام ہے۔ یہ کتاب ۵۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ مرتب کتاب نے تقریباً ہر مکتوب الیہ کا تھوڑا بہت تعارف کرایا ہے، لیکن مولانا آروی کا تعارف نہیں کرایا گیا۔ غالباً مولانا کے متعلق انھیں معلومات حاصل نہ تھیں۔

---

❶ مولانا بدیع الزمان

❷ ہفت روزہ ''الاعتصام'' (لاہور) ۲۵۔ دسمبر ۱۹۷۰ء

مولانا آروی کے نام سرسید کے خطوط ان کے کسی استفسار کے جواب میں ہیں اور بے حد دلچسپ ہیں۔ ہر خط میں سرسید مولانا کو ان الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں:

"جناب مولانا مخدوم ومکرم من مولوی محمد ابراہیم صاحب زاد فیضہ"

پہلے خط میں "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" لکھا ہے۔ دوسرے اور تیسرے میں "سلامِ مسنون" لکھا ہے۔ پہلا خط ۱۴۔ دسمبر ۱۸۹۴ء کو لکھا۔ دوسرا ۵۔ فروری ۱۸۹۵ء کو اور تیسرا خط ۱۰ فروری ۱۸۹۵ء کو تحریر کیا۔ تینوں خط علی گڑھ سے لکھے ہیں۔ ہر خط کے نیچے لکھا ہے۔ "خاکسار۔ سید احمد"۔

میرا جی تو چاہتا ہے کہ سرسید کے تینوں خطوط یہاں درج کر دیے جائیں، کیوں کہ وہ قارئین کے لیے فائدے سے خالی نہیں ہوں گے، لیکن میں صرف دوسرا خط درج کروں گا۔ پہلے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے ان سے ان کی تصانیف طلب کی ہیں، اس کے جواب میں سرسید نے جو خط لکھا ہے، اس کی چند سطریں یہاں درج کی جاتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"آپ کا نوازش نامہ مورخہ نہم دسمبر پہنچا۔ ممنون ہوا۔ میں آپ کے عنایت نامے کو باعث افتخار اور آپ کے دعائیہ کلمات کو باعث نجات سمجھتا ہوں۔ آپ نے باوجود اس کے کہ جو حقیقت حال میری تصنیفات کی تھی (اور جو) میں نے پوست کندہ آپ کی خدمت میں عرض کر دی تھی، دوبارہ آپ نے ان کو طلب فرمایا ہے۔ میں ان کو نذر کرنے سے افتخار حاصل کروں گا۔ اس وقت میں رام پور جاتا ہوں۔ دو تین روز میں واپس آؤں گا اور جس قدر کتابیں موجود ہیں، ان کا ایک ایک نسخہ خدمت عالی میں بھیج دوں گا۔"

اس کے بعد اور باتیں بھی ہیں جو سرسید نے مولانا کے مکتوبِ گرامی کے جواب میں لکھی ہیں۔ ان کا تعلق علمائے کرام سے بھی ہے اور عام مسلمانوں سے بھی۔

تیسرا خط بھی دلچسپ ہے۔ خلافِ اسلام رسوم ورواج کے متعلق مولانا اسماعیل شہید کی تحریک اور ان کے نقطہ نظر کی تعریف کرتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں۔

"مولانا اسماعیل شہید اگر اسی قسم کے خیالات میں مبتلا رہتے تو ہندوستان میں سے شرک وبدعت کی تاریکی کیسے دور ہوتی؟"

اس سے آگے تحریر کرتے ہیں:

آپ کو معلوم نہ ہوگا مگر آپ معاف فرمائیے گا کہ میں نے وہابیوں کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔ ایک صرف وہابی۔ دوسرے وہابی اور کریلا۔ تیسرے وہابی کریلا اور نیم چڑھا۔ میں

اپنے تئیں تیسری قسم میں قرار دیتا ہوں۔

اب دوسرا خط ملاحظہ فرمایے۔ اس خط سے پتا چلتا ہے کہ مولانا آروی نے اپنے مدرسے کے سالانہ جلسے میں سرسید اور ان کے بعض رفقا کو شرکت اور تقریر کی دعوت دی تھی۔ اس میں شرکت کی دعوت سرسید اس لیے منظور نہ کرسکے کہ انہی تاریخوں میں وہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لیے لاہور آرہے تھے۔ سرسید کے ایک رفیق محسن الملک مولوی مہدی علی کو مولانا نے سرسید کی معرفت جلسے کی صدارت کے لیے بھی لکھا تھا۔ اب سرسید کا خط پڑھیے:

جناب مولانا مخدوم ومکرم من مولوی محمد ابراہیم صاحب!

سلام مسنون۔ عنایت نامہ پہنچا۔ ممنونِ عنایت ہوا۔ مسلمانوں کی بہتری وفلاح میں جو تدبیر ہوسکے اس میں دل سے شریک ہوں، مگر لومۃ لائم کے خوف سے کسی چیز کو مخفی طور پر، جو ایک نوع کی تدلیس ہے، کرنا نہیں چاہتا۔ ع

نہاں کے ماند آں رازے کز وسازند محفلہا

آپ کی جماعت مقدسہ اور مکرمہ اگر مجھ کو اس قابل نہیں سمجھتی کہ کوئی ممبر اس جماعت کا مجھ سے ملاقات کرے تو آپ کو یہی مناسب ہے کہ میری ملاقات سے مجتنب رہیں۔ انجمن اسلامیہ لاہور کا جلسہ ۲۳، ۲۴ فروری کو ہے اور آپ کے مدرسے کا جلسہ ۲۱ شعبان (مطابق) ۱۷۔ فروری کو ہوگا۔ ہم لوگ غایت درجہ ۲۰۔ فروری کو روانہ پنجاب ہوجائیں گے، کیوں کہ راستے میں ایک آدھ اور جگہ بھی ٹھہرنا ہے۔ انجمن حمایت اسلام کے لیکچراروں میں میرا نام غلط لکھ دیا ہے۔ میں کوئی لیکچر نہیں دینے کا۔ میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ ایک چھوٹا سا لیکچر جو میں نے اپنے کالج کے طالب علموں کو دیا تھا، وہ بھی بیٹھ کر دیا تھا۔ کھڑا نہیں رہ سکا۔ ایک کاپی اس لیکچر کی بھی خدمتِ عالی میں مرسل ہے۔

غرض کہ آپ لوگوں کے جلسے اور ہم لوگوں کی روانگی کی تاریخیں ایسی قریب ہیں کہ نواب محسن الملک مولوی مہدی علی آپ کے مدرسے کے جلسے میں کسی طرح شریک نہیں ہوسکتے۔ بلاشبہ آپ کی یہ تجویز کہ مولوی مہدی علی صدر انجمن جلسہ ہوتے، بہت عمدہ تھی مگر ان کی شرکت بہ سبب روانگی پنجاب غیر ممکن ہے۔

اگر آپ کا تشریف لے جانا لاہور ہوا اور مجھ کو آپ کی ملازمت حاصل ہوئی تو میں اس کو باعث افتخار سمجھوں گا۔

جس صفائی دلی اور سچائی اور نیک دلی اور اخلاصِ قلبی سے آپ نے عنایت نامہ لکھا ہے، میں اس کی نہایت قدر کرتا ہوں۔ مولوی مہدی علی کو ہماری مخالفت سے اس قدر تو فائدہ ہوا کہ آپ کی جماعت کے لوگوں نے ان کو اچھا سمجھا ...... آپ کا عنایت نامہ مولوی مہدی علی کو دکھلاؤں گا ......

لیکچر سید محمود و رسالہ فیصلہ قسمت مسلمانان و دیگر روئداد ہائے کانفرنس مرسل خدمت ہیں۔ والسلام۔

علی گڑھ، ۵۔ فروری ۱۸۹۵ء

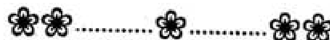
خاکسار، سید احمد

بے شک سرسید کے بعض افکار سے علمائے کرام کو اختلاف تھا اور شدید اختلاف تھا اور صحیح اختلاف تھا۔ لیکن ان کے باہم میل جول کے سلسلے بھی جاری رہتے تھے اور ایک دوسرے سے خط و کتابت بھی تھی۔ یہی مولانا ابراہیم آروی کو دیکھ لیجیے، کتنے بڑے عالم تھے، لیکن سرسید کو بڑے احترام سے خط لکھتے ہیں اور ان کو اپنے جلسے میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں، اور سرسید بھی نہایت مہذبانہ انداز سے ان کے خطوط کا جواب دیتے ہیں۔ اپنے اندازِ ظریفانہ سے تھوڑی بہت طنز بھی کرتے ہیں۔ لیکن ہماری یہ عادت ہے کہ جس سے اختلاف ہے، پھر اختلاف ہی اختلاف ہے۔ اس میں نہ چھوٹے کا خیال ہے، نہ بڑے کا احترام۔ صحیح معاملے میں اختلاف ضرور کیجیے اور اس کا اظہار بھی کیجیے، لیکن اسلوب شائستہ اور مہذبانہ اختیار کیجیے۔ اظہارِ افکار کے وقت قلم اور زبان کو قابو میں رکھیے۔ چھوٹے اور بڑے کے فرق کو سمجھنے کی کوشش بھی کیجیے۔

حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری نے جس زمانے میں تفسیر ثنائی لکھی، اس زمانے کے ہندوستان میں بہت سے گمراہ فرقے موجود تھے اور مولانا نے مناسب مواقع پر تفسیر میں ان کے نظریات پر شدید تنقید کی ہے، لیکن ان کا اندازِ تنقید اتنا شائستہ ہے کہ جن پر تنقید کی گئی ہے، خود وہ بھی اس سے محظوظ ہوتے تھے۔ سرسید پر بھی مولانا نے تنقید کی ہے اور بالکل صحیح کی ہے، لیکن ۱۸۹۸ء میں سرسید فوت ہوگئے تو اس کے بعد مولانا نے تفسیر ثنائی کے ایک مقام پر جو کچھ تحریر فرمایا اس کا مفہوم کچھ اس قسم کا ہے کہ اس مقام پر سرسید نے ٹھوکر کھائی ہے، لیکن اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے، اس لیے ہم ان سے براہِ راست مخاطب نہیں ہوسکتے، البتہ ان کی روح سے مخاطب ہو کر اصل حقیقت بیان کرنا چاہتے ہیں۔

ہندوستان پر انگریزی اقتدار کی وجہ سے اس ملک میں رہنا مولانا آروی کے لیے مشکل ہوگیا تھا۔ چناں چہ بعض دیگر علمائے ہند کی طرح ہندوستان سے ہجرت کر کے وہ مدینہ منورہ چلے گئے تھے۔ ۶۔ ذی الحجہ ۱۳۱۹ھ (۱۵۔ مارچ ۱۹۰۲ء) کو مکہ معظمہ میں فوت ہوئے اور قبرستان جنت المعلیٰ میں دفن کیے گئے۔ ان کے سالِ ولادت میں (جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا) اختلاف ہے۔ اگر سالِ ولادت ۱۲۶۷ھ ہو تو ۵۳ برس عمر پائی اور سالِ ولادت ۱۲۶۴ھ ہو تو عمر تقریباً ۵۶ برس بنتی ہے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ



مولانا محمد حسین لکھوی

یہ فقیر لکھوی خاندان کے جن اکابر علماے کرام کی زیارت سے سعادت اندوز ہوا، ان میں حضرت مولانا محمد حسین لکھوی کا اسم گرامی لائق تذکرہ ہے، اس لیے کہ وہ حضرت حافظ بارک اللہ لکھوی کے پوتے اور مفسر قرآن حضرت حافظ محمد لکھوی کے فرزند عالی قدر تھے۔ ان کی تاریخ ولادت کا پتا نہیں چل سکا۔ یہ بھی معلوم نہیں ہوسکا کہ انھوں نے کتنی عمر پائی۔

قدرے بھرا ہوا گداز جسم، گندمی رنگ، چوڑا چہرہ، کشادہ پیشانی، کھدر کا کرتہ اور کھدر کا تہبند، سفید عمامہ، رعب دار آواز اور خوش گفتار، میں نے پہلی دفعہ انھیں موضع لکھوکے میں اپنے خاندان کے بعض چھوٹے بڑے افراد کے ساتھ اس ''ماچے'' پر بیٹھے اور باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا جو گاؤں میں داخل ہونے والی گلی کے باہر پڑا ہوتا تھا۔ اس ماچے کی ہیئت کذائی اور لمبائی چوڑائی کا ذکر میں نے ان گزارشات میں کیا ہے جو حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے متعلق تحریر کی گئی ہیں۔

مولانا محمد حسین لکھوی نے مروجہ علوم کی ابتدائی اور اوسط درجات کی کتابیں مولانا عبدالقادر لکھوی اور اپنے برادر کبیر مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی سے پڑھیں۔ کتب حدیث کے لیے دہلی کا عزم کیا اور حضرت میاں سید نذیر حسین رحمہ اللہ کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور ان سے سندِ حدیث لی۔

مولانا ممدوح علومِ عقلیہ ونقلیہ کے ماہر اور اپنے آباو اجداد کی طرح نہایت متقی بزرگ تھے۔ اپنے دور کے بہت بڑے مبلغ اور مشہور واعظ تھے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں وعظ فرماتے اور مناسب مواقع پر اپنے والد محترم حافظ محمد لکھوی کے پنجابی اشعار پڑھتے۔ لکھوکے میں خطبہ جمعہ وہی ارشاد فرماتے تھے۔ آواز بے حد شیریں تھی۔ مسدس حالی کے اکثر اشعار ان کے ذہن میں محفوظ تھے اور وہ اشعار وہ بڑے سوز و گداز کے ساتھ پڑھتے تھے۔

اپنے مدرسہ محمدیہ میں کچھ عرصہ طلبا کو پڑھاتے بھی رہے۔ ان کا پڑھانے کا وہی طریقہ تھا جو دیگر لکھوی علماے کرام کا تھا۔

حضرت حافظ محمد لکھوی کی وفات (۱۳۱۱ھ۔۱۸۹۴ء) کے بعد مدرسے کی زمام اہتمام ان کے بڑے فرزند مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے سپرد ہوئی۔ اہتمام کے علاوہ وہ طلبا کو پڑھاتے بھی تھے اور چندے کے لیے قصبات و دیہات میں بھی جاتے تھے۔ پھر جب وہ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تو یہ ذمہ داری صاحب ترجمہ مولانا محمد حسین لکھوی کے کندھوں پر آپڑی جو ان کے برادرِ صغیر تھے۔ مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی نے ۱۸۹۵ء (۱۳۱۳ھ) میں مدینہ منورہ میں وفات

پائی۔ اس وقت سے لے کر ۱۹۴۲ء (۱۳۶۲ھ) تک مدرسے کے اہتمام و انتظام کا فریضہ مولانا محمد حسین لکھوی انجام دیتے رہے۔ یہ ۴۷ سال کی طویل مدت ہے جس میں وہ مدرسے کے لیے پنجاب کے مختلف اضلاع لاہور، قصور، فیروزپور، امرتسر، گورداس پور، ساہی وال، فیصل آباد، ملتان وغیرہ کے دورے فرماتے رہے۔ ان اضلاع کے لوگ جو لکھوی علما سے عقیدت مندانہ اور شاگردانہ تعلق رکھتے تھے، ان کے منتظر رہتے اور مدرسے کے لیے چندہ جمع کر کے ان کی خدمت میں پیش کرتے۔

مولانا ممدوح جہاں تشریف لے جاتے، وہاں رات کو مجمع عام میں وعظ فرماتے اور صبح کو قرآن مجید کا درس دیتے۔ لوگ ان کا وعظ اور درس بے حد شوق سے سنتے۔

مولانا محمد حسین لکھوی جب زیادہ کمزور اور عمر رسیدہ ہوگئے تو مدرسہ محمدیہ کے اہتمام کی ذمہ داری کچھ عرصہ مولانا عطاء اللہ لکھوی کے سپرد رہی۔ لیکن مولانا عطاء اللہ صاحب کو اس سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنے آپ کو صرف تدریسی خدمات کی انجام دہی تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے ان کی طرف سے یہ ذمہ داری مستقل طور پر مولانا معین الدین لکھوی کے سپرد ہوئی۔

بہرحال مولانا محمد حسین لکھوی قرآن و حدیث میں بھی مہارت رکھتے تھے، فقہ و کلام میں بھی انھیں دسترس حاصل تھی، عربی ادبیات میں بھی ان کا مطالعہ وسیع تھا، صرف ونحو، منطق و فلسفہ اور معانی و بیان میں بھی ان کی نظر بہت عمیق تھی اور وعظ و خطابت میں بھی ان کا اسلوب بے حد موثر تھا۔ علوم متداولہ کے مشکل مسائل کے حل وکشود میں اللہ نے ان کو بڑی مہارت عطا فرمائی تھی۔

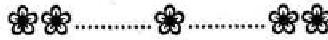
دودمانِ لکھویہ کے اس جلیل القدر عالم نے محرم ۱۳۶۵ھ (جنوری ۱۹۴۶ء) کو اپنے آبائی مسکن لکھوکے میں وفات پائی۔

مولانا ممدوح کی اولاد تین بیٹے تھے اور تین بیٹیاں، بڑے بیٹے مولانا حکیم محمد لکھوی تھے۔ ان سے چھوٹے مولوی حیدر علی اور سب سے چھوٹے مولوی محمد شفیع تھے۔ ان تینوں نے پاکستان آکر وفات پائی۔ آگے ان حضرات کی اولاد کا سلسلہ چلا جو ماشاء اللہ دور تک پھیلا ہوا ہے۔

حضرت مولانا مرحوم کی تین بیٹیوں میں سے سب سے بڑی بیٹی حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے بڑے بیٹے مولانا عبدالرحمٰن لکھوی کے عقد میں آئیں اور ان سے چھوٹی کا نکاح مولوی ثناء اللہ خاکی سے ہوا۔ تیسری اور سب سے چھوٹی بیٹی عالم جوانی میں وفات پاگئی تھیں۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی، بڑی دونوں بیٹیوں کے بفضل خدا اولاد ہوئی اور پھر ان کی اولاد کا سلسلہ ماشاء اللہ آگے بڑھا۔

قیام پاکستان کے بعد لکھوی خاندان نے ضلع اوکاڑہ کو اپنا مسکن بنالیا تھا اور یہ لوگ ضلع اوکاڑہ کی تحصیل رینالہ خورد کے چک نمبر ۱۸ ون ایل میں مقیم ہیں اور وہیں انھیں اپنی متروکہ زمینیں الاٹ ہوئی ہیں۔ بعض حضرات اوکاڑہ اور دیگر مقامات میں کاروبار کرتے ہیں، متعدد حضرات ملازمت کے

پیشے سے منسلک ہیں۔ غرض آسودہ حال لوگ ہیں اور عزت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اوکاڑہ میں جامعہ محمدیہ اور رینالہ خورد میں جامعہ ابوہریرہ کے نام سے ان کے دینی مدارس جاری ہیں، جن میں بے شمار لوگوں نے تعلیم حاصل کی اور کر رہے ہیں۔ جامعہ محمدیہ کے ناظم مولانا محمد علی لکھوی کے صاحب زادے مولانا معین الدین لکھوی ہیں اور جامعہ ابوہریرہ کے مولانا عطاء اللہ لکھوی کے فرزند ارجمند حافظ شفیق الرحمٰن لکھوی ......!



مولانا عبدالغفار نشر مہدانوی

صوبہ بہار (ہندوستان) کے اہل حدیث علما میں ایک جلیل القدر عالم مولانا عبدالغفار نشرمہدانوی تھے۔ افسوس ہے ان کی تاریخ ولادت ووفات کا پتا نہیں چل سکا۔ وہ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کے شاگرد تھے اور میاں صاحب ہی سے سند حدیث حاصل کی تھی۔

مولانا عبدالغفار نشر کا اصل وطن ''مہدانواں'' تھا جو مضافات منیر میں ایک مشہور گاؤں تھا۔ لیکن وہ چھپرہ میں اقامت گزیں ہوگئے تھے۔ حضرت مولانا محمد ابراہیم آروی کے قائم کردہ مدرسہ احمدیہ آرہ کے سرگرم رکن اور مخلص تریں خادم تھے۔ انھوں نے مولانا آروی کی فرمائش پر امام بخاری کی معروف کتاب ''الادب المفرد'' کا ''سلیقہ'' کے نام سے اردو ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ شدہ کتاب ۱۳۰۹ھ میں مولانا آروی نے بڑے اہتمام سے اپنے مطبع خلیلی (آرہ) سے شائع کی تھی۔ اس دور کے ہندوستانی اہل علم میں اس ترجمے کو بہت پسند کیا گیا تھا اور مدرسہ احمدیہ سے تعلق رکھنے والے شائقین علم میں خاص طور سے اس کتاب کو پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔

الادب المفرد کا ترجمہ (سلیقہ) تیرہ سو اٹھائیس (۱۳۲۸) حدیثوں پر مشتمل ہے اور بامحاورہ شگفتہ ترجمہ ہے۔ پوری کتاب تین حصوں میں ختم ہوئی ہے۔ ترجمے کی زبان کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بغض مت رکھا کرو۔ حسد مت کیا کرو۔ اترا مت جایا کرو۔ خدا کے بندو سب بھائی بھائی بن جاؤ اور مسلمان کو تین دن سے زیادہ چھوڑنا حلال نہیں۔'' [صفحہ: ۸۸]

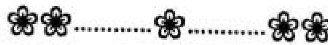
ترجمے کا ایک اور نمونہ ملاحظہ فرمایئے:

''ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک ریشمی حلہ دیکھ کر عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ) اس کو حضور مول لے لیتے اور جمعہ اور جب باہر کے لوگ حضور میں آتے، تب پہنتے۔ آپ نے فرمایا اس کو تو بدنصیب شخص ہی پہنے۔ پھر اسی قسم کے کئی حلے بہ طور ہدیہ کے آئے تو آپ نے اس میں سے ایک حلہ حضرت عمر کو بھی تحفہ بھیجا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے حضور میں حاضر ہو کر عرض کی کہ حضور نے مجھے یہ بھیج دیا، حالاں کہ میں اس کے بارے میں وہ بات سن چکا ہوں جو آپ نے فرمائی تھی۔ آپ نے فرمایا ہم نے تمھیں پہننے کو نہیں دیا بلکہ اس واسطے دیا ہے کہ تم اس کو بیچ ڈالو یا

کسی کو پہنا دو۔ تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ حلہ اپنے ایک مشرک اخیانی بھائی کے پاس بھیج دیا۔" [صفحہ: ۱۸]

اس ترجمے سے پتا چلتا ہے کہ آج سے تقریباً ۹۰ سال قبل صوبہ بہار کے اہل حدیث علما نے جہاں حدیث اور حدیث سے متعلق علوم کی خدمت کی وہاں اردو زبان کو بھی ایک خاص انداز سے قارئین کے سامنے پیش کیا۔

افسوس ہے مولانا عبدالغفار نشر مہدانوی کی تاریخ ہائے ولادت و وفات کا علم نہیں ہوسکا۔ ❶



❶ ارضِ بہار اور مسلمان، ص: ۴۲۷، ۴۲۸

مولانا رفیع الدین شکرانوی

ہندوستان کے صوبہ بہار میں ایک قصبے کا نام شکرانواں تھا، مولانا رفیع الدین کا مولد یہی قصبہ ہے۔ ان کا شمار اس قصبے کے رؤسا میں ہوتا تھا۔ دنیوی وجاہت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کو دینی علوم کی فضیلت سے بھی حصۂ وافر عطا فرمایا تھا۔ انھوں نے حضرت سید عبداللہ غزنوی سے روحانی فیض حاصل کیا اور حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی سے کتب حدیث پڑھیں۔

مولانا رفیع الدین شکرانوی کو کتابیں خریدنے اور ان کا مطالعہ کرنے کا بے حد شوق تھا، چناں چہ اس عہد میں ان کے کتب خانے میں بہت سی نادر اور نایاب کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا، جن میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

① ...... تفسیر ابن جریر طبری: مشتمل بر تیس اجزا۔

② ...... الاستذکار از ابن عبدالبر۔ ③ ...... التمہید از ابن عبدالبر۔

④ ...... محلّی ابن حزم۔

مولانا رفیع الدین شکرانوی کا اس دور میں بہت بڑا مطبع بھی تھا، جس میں حدیث کی متعدد کتابیں طبع ہوئیں۔

مولانا ممدوح قرآن کی تفسیر، قرآن سے کرنے میں بڑے ماہر تھے، لیکن اس موضوع پر ان کی کسی تصنیف کا علم نہیں ہوسکا۔

حدیث کے موضوع پر ان کی ایک کتاب کا پتا چلا ہے، اس کتاب کا نام ہے۔ "رحمة الودود علی سنن ابی داؤد"۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ان کی معروف تصنیف ہے۔

مولانا رفیع الدین شکرانوی کا انتقال ۱۳۳۸ھ (۱۹۲۰ء) میں ہوا۔ [1]

---

[1] ارضِ بہار اور مسلمان، ص: ۳۵۵

مولانا فقیر اللہ مدراسی

آج سے ۸۰۔ ۸۵ سال پیشتر برصغیر کے ایک مشہور اہل حدیث عالم مولانا فقیر اللہ مدراسی گزرے ہیں جنھیں بعض لوگ فقیر اللہ پنجابی، اور بعض فقیر اللہ بنگلوری کہا کرتے تھے۔ مولانا ممدوح ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) کوٹھ مصرال شاہ پور (ضلع خوشاب پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ والدین نے ان کا نام فقیر محمد رکھا تھا، مگر انھوں نے فقیر اللہ کے نام سے شہرت پائی۔ والد کا نام فتح دین اور دادا کا عبداللہ تھا۔ راجپوت برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ گھر کا ماحول دینی اور علمی تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے برادرِ کبیر مولانا محمد سے حاصل کی جو حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد تھے۔ اس کے بعد شیخ حسین عرب سے مستفید ہوئے۔ حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کی خدمت میں حاضری دی اور ان کے چشمہ فیض سے سیراب ہوئے۔ وزیر آباد سے امرتسر کا قصد کیا۔ امرتسر کے مدرسہ غزنویہ کا اس وقت بڑا شہرہ تھا اور اس کی مسند تدریس حدیث پر حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی متمکن تھے۔ مولانا فقیر اللہ نے ان کے علم و عرفان سے خوب استفادہ کیا۔ یعنی ان سے حصولِ علم بھی کیا اور ان کے حلقہ بیعت میں بھی داخل ہوئے۔ امرتسر سے فراغت کے بعد دہلی گئے اور شیخ الکل حضرت میاں سید نذیر حسین کے آستانہ فضیلت پر حاضری دی۔ ان سے کتب حدیث پڑھیں اور سند و اجازہ سے مفتخر ہوئے۔

قیامِ دہلی کے زمانے میں مولانا محمد بشیر سہسوانی سے بھی اکتسابِ علم کیا اور مولانا محمد اسحاق منطقی رام پوری سے منطق و فلسفہ کی انتہائی کتابیں پڑھیں۔ علوم متداولہ کی تحصیل سے فراغت پائی تو مولانا فقیر اللہ مدراسی کی خدمات مطبع مجتبائی (دہلی) کے مالکوں نے کتب حدیث کی تصحیح کے لیے حاصل کرلیں۔ یہ اس زمانے میں نہایت اہم کام تھا جو مولانا فقیر اللہ مدراسی کے سپرد کیا گیا۔ یہ کام اس عہد میں حدیث کے کسی بہت بڑے ماہر ہی کے سپرد کیا جاتا تھا اور مولانا فقیر اللہ مدراسی کا شمار ماہرین حدیث میں ہوتا تھا۔

ان دنوں بنگلور اور اس کے اطراف و اکناف میں ایک حنفی عالم مولانا محمد سلطان احمد بریلوی نے بعض مسائل میں اہل حدیث کے خلاف ایک مہم شروع کررکھی تھی اور اس ضمن میں تحریر و تقریر میں ان کا وہی انداز تھا جو ان حضرات کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کے جواب کے لیے سنجیدہ فکر کے کسی اہل حدیث عالم کی ضرورت تھی، چناں چہ بنگلور کے ایک سوداگر سید عباس شاہ نے حضرت میاں

صاحب کو دہلی خط لکھا جس میں کسی سلجھے ہوئے بڑے عالم کو بنگلور بھیجنے کی درخواست کی گئی تھی۔ حضرت میاں صاحب نے مولانا فقیر اللہ مدراسی کو حکم دیا اور وہ بنگلور پہنچ گئے۔ مولانا فقیر اللہ صاحب نے اس علاقے میں مدلل اسلوب سے وعظ وتقریر کا آغاز کیا، اور مولانا محمد سلطان احمد بریلوی سے ان کے مناظرے بھی ہوئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا محمد سلطان احمد کی اہل حدیث کے خلاف ہنگامہ آرائی ختم ہوگئی اور مولانا فقیر اللہ کے مواعظ سے متاثر ہوکر بہت سے لوگ مسلک اہل حدیث سے وابستہ ہوگئے۔ پھر بنگلور کے لوگوں نے مولانا فقیر اللہ کو دہلی نہیں جانے دیا اور اصرار کر کے ان کو وہیں رکھ لیا۔ مولانا نے وہاں ''مدرسہ نصرۃ الاسلام'' کے نام سے ایک تدریسی ادارہ قائم کیا اور درس وتدریس میں مشغول ہوگئے۔ ایک عرصے تک وہ بنگلور رہے اور ان کی تقریری اور تدریسی مساعی سے بے شمار لوگوں نے فیض حاصل کیا اور ان کے تبحر علمی کی شہرت دور دراز علاقوں تک پہنچی۔

اس وقت پیارم پیٹ (مدراس) میں ایک اہل حدیث عالم مولانا عبدالقادر قیام فرماتے جو اس نواح میں توحید کے معروف مبلغ تھے۔ انھوں نے وفات کے وقت وصیت کی کہ ان کے بعد ان کی جگہ مولانا فقیر اللہ کی خدمات حاصل کی جائیں۔ چناں چہ ان کا انتقال ہوا تو پیارم پیٹ کی جماعت اہل حدیث کے چند سرکردہ ارکان بنگلور پہنچے اور مولانا ممدوح کو پیارم پیٹ (مدراس) لے گئے۔ مولانا نے وہاں مدرسہ احیاء الاسلام قائم کیا اور وعظ وتدریس کی خدمات سرانجام دینے لگے۔ یہ مقام ضلع شمالی آرکاٹ ٹملناڈ میں عمر آباد سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر تھا۔ بنگلور کی طرح پیارم پیٹ اور اس کے قرب وجوار کے لوگ بھی مولانا فقیر اللہ کی تبلیغ توحید اور سلسلہ تدریس سے بہت متاثر ہوئے۔

مولانا فقیر اللہ جماعت مجاہدین سے وابستہ تھے اور صوبہ مدراس سے رقوم جمع کر کے سرحد پار کی جماعت مجاہدین کو بھیجا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہاں خود بھی گئے تھے اور انگریزی حکومت کے خلاف جماعت مجاہدین جس طریقے سے جہاد کررہی تھی، اس سے نہایت متاثر ہوئے تھے۔

مولانا فقیر اللہ سے بے شمار حضرات نے حصول علم کیا۔ ان کے تلامذہ کی صحیح تعداد کا تو شاید اب کسی کو بھی علم نہیں ہوگا، البتہ ان کے تلامذہ میں سے اپنے علاقے میں جن علمائے کرام نے زیادہ شہرت پائی ان میں مولانا سید اسماعیل (بانی جامعہ محمدیہ عربیہ رائید رگ) مولانا فضل اللہ مدراسی (ناظم اوّل جامعہ دارالسلام عمر آباد، مدراس) مولانا محمد عثمان (خطیب بنگلور وسکندر آباد) مولانا بشیر احمد سلیم، مولانا عبدالحلیم گڑیاتم اور مولانا عبدالقادر دکھنی کوٹی شامل ہیں۔

وعظ وتدریس کے علاوہ مولانا ممدوح تصنیفی ذوق بھی رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

① ...... القول المصدوق فی اثبات التشهد للمسبوق -

②...... الثبری من افتراء المفتری۔

③...... الموعظة الحنسه فی خطبة الجمعة بکل لسان من الالسنه۔

④...... اثبات الجهر بالفاتحة فی صلاة الجنازہ۔

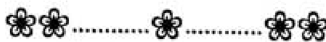
مولانا فقیر اللہ نے دو شادیاں کی تھیں۔ ایک پنجاب میں اور دوسری مدراس میں۔ پہلی بیوی سے جن کا تعلق پنجاب سے تھا، دو بیٹے ہوئے، حافظ عبداللہ اور حافظ احمد سعید۔ اور دو بیٹیاں، جن میں سے ایک کی شادی حضرت مولانا حافظ محمد گوندلوی سے اور دوسری کی مولانا نجم الدین سے ہوئی۔

مولانا فقیر اللہ کی دوسری بیوی جن کا تعلق مدراس سے تھا، وہ ان کے تلمیذ مولانا سید اسماعیل رائیدرگی کی بہن تھیں، ان سے مولانا عطاء اللہ سلفی عمری پیدا ہوئے۔

مولانا فقیر اللہ کے بیٹے حافظ عبداللہ مرحوم کو میں نے دیکھا ہے۔ جس زمانے اخبار ''الاعتصام'' گوجراں والا سے شائع ہوتا تھا، وہ وہاں تشریف لاتے اور دفتر الاعتصام ضرور آتے اور اس فقیر کو سلام عرض کرنے کا موقع دیتے۔ پھر ''الاعتصام'' کا دفتر لاہور منتقل ہوگیا تو یہاں بھی ان کی تشریف آوری کا سلسلہ جاری رہتا۔ نرم مزاج اور متواضع بزرگ تھے۔

مولانا فقیر اللہ کو ذیابیطس کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا۔ انھوں نے ۲۲۔ مئی ۱۹۲۳ء (۶۔ شوال ۱۳۴۱ھ) کو بنگلور میں وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مولانا مرحوم کو پنجاب کے باشندے ہونے کی وجہ سے مولانا فقیر اللہ پنجابی، بنگلور میں طویل عرصے تک اقامت گزینی کی بنا پر مولانا فقیر اللہ بنگلوری اور مدراس میں سکونت پذیری کے سبب سے مولانا فقیر اللہ مدراسی کہا جاتا ہے۔ اور ان کی یہ تینوں نسبتیں بالکل صحیح ہیں۔ ❶



❶ نذرانۂ اشک (تصنیف مولانا ثناء اللہ عمری سابق صدرہ شعبہ انگریزی ہندو کالج مچھلی بندر آندھرا پردیش انڈیا) مطبوعہ ندوۃ المحدثین گوجراں والا۔ صفحہ: ۱۶۰، ۱۶۱، ۲۶۲، ۲۷۳۔

دیگر حضرات

۱	مولانا عبداللہ صدیقی الہ آبادی
۲	نواب سید صدیق حسن خاں
۳	سید ابوالخیر احمد برق حسنی لکھنوی
۴	مولانا عبدالقادر لکھوی
۵	مولانا عطاء اللہ لکھوی
۶	مولانا محمد یونس دہلوی
۷	مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی
۸	مولانا عبدالحق ہاشمی
۹	مولانا عبدالغفار حسن
۱۰	مولانا سلطان محمود
۱۱	مولانا عبدالحق شہید
۱۲	مولانا ابوالفضل عبدالحنان علوی
۱۳	مولانا ابوالحسنات علی محمد سعیدی
۱۴	حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی
۱۵	مولانا عبداللہ
۱۶	مولانا ابوالبرکات احمد
۱۷	حافظ عبدالغفور جہلمی
۱۸	مولانا عبدالغفار ضامرانی
۱۹	مولانا محمود احمد میر پوری
۲۰	مولانا عبدالرشید لداخی ندوی
۲۱	مولانا عبدالقہار سلفی دہلوی
۲۲	مولانا محمد الیاس سلفی
۲۳	مولانا عبدالصمد روف
۲۴	حافظ عبدالرحمٰن گوہڑوی

مولانا عبداللہ صدیقی الٰہ آبادی

ارضِ ہند کے تیرھویں صدی ہجری کے معروف علما میں سے ایک عالم دین کا نام نامی مولانا عبداللہ صدیقی محمدی تھا جوصوبہ یوپی کے شہر الٰہ آباد سے چند میل کے فاصلے پر موضع مئو میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ حضرت مولانا شمس الحق عظیم آبادی کی تصنیف تذکرۃ النبلاء کے حوالے سے سید حکیم عبدالحی حسنی نے نزہۃ الخواطر کی آٹھویں جلد میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مولانا عبداللہ الٰہ آبادی اپنے عہد کے کبار علما میں سے تھے اور مشہور محدث اور شیخ تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے علاقے کے اصحابِ علم سے حاصل کی۔ پھر دہلی کا عزم کیا اور حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور ان سے کتب حدیث پڑھیں۔ متعدد متداول درسی کتابیں مع حواشی وتعلیقات کے اپنے ہاتھ سے لکھیں۔ ان کی تدریسی خدمات کم ہیں اور تصنیفی خدمات کا دائرہ وسیع ہے۔ بعض تصانیف کے مندرجات بے حد شیریں اور بعض کے ترش ہیں۔ ظواہر نصوص پر عمل پیرا تھے اور اپنے مخالفوں کی سخت الفاظ میں تردید کرتے تھے۔ یعنی حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنبلیہ کی مخالفت میں انتہائی تیز تھے۔ اسی طرح صوفیا کے طرق اربعہ قادریہ، مجددیہ، نقشبندیہ اور چشتیہ کی نسبت ان کے نزدیک بہ درجہ غایت ناپسندیدہ تھی۔

ان کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

① ...... **الیم الزغرب فی لغات الحدیث المنتخب**: یہ کتاب حروفِ معجم کے انداز میں مرتب کی گئی ہے۔

② ...... **العروۃ الوثقٰی لمنبع سنۃ سید الوریٰ**: حدیث کی یہ کتاب فقہی ترتیب کے مطابق مرتب کی گئی ہے۔

③ ...... **عمدۃ الصلوٰۃ وفائز النجاۃ**: یہ صرف مسائل نماز پر مشتمل ہے۔

④ ...... **اعتصام السنۃ وقامع البدعہ**: اس کتاب کے دو باب ہیں۔ ایک باب میں آیاتِ قرآنی بیان کی گئی ہیں اور ایک میں احادیث نبوی ﷺ۔ یہ کتاب ۱۲۷۱ھ میں تصنیف کی گئی۔

⑤ ...... **النبراس المنیر لصلوٰۃ الدیاجیر**:

⑥ ...... **معین الابرار علی الصلوٰۃ فی اللیل والنہار**: اس کتاب میں قرآنِ مجید کی وہ آیات جمع کردی گئی ہیں جو نبی ﷺ رات اور دن کی نمازوں میں پڑھا کرتے تھے۔

⑦...... **الریاض الانضر فی الفقه الاکبر:** اس میں صحیح مرفوع احادیث کی روشنی میں نماز کے مسائل ابوابِ فقہ کے مطابق بیان کیے گئے ہیں۔

⑧...... **صمصام الحدید المسلول:** بدعات اور تقلید وغیرہ کے رد میں۔

⑨...... **الاعجاز المتین فی معجزات سید المرسلین:**

⑩...... **سیف الحدید فی قطع المذاهب والتقلید:** فقہی مذاہب اربعہ اور تقلید کے رد میں۔

⑪...... **اللباب فی صلاۃ الاحباب:** یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے۔ ۱۲۶۹ھ میں تصنیف کی۔

⑫...... **العروة المتین فی اتباع سنة سید المرسلین:** یہ کتاب اردو میں ہے۔ سال تصنیف ۱۲۷۳ھ۔

⑬...... **السیف المسلول فی ذم التقلید المخذول:** اردو میں۔ ۱۲۷۳ کی تصنیف۔

حضرت مولانا شمس الحق عظیم آبادی فرماتے ہیں کہ تبلیغ کتاب وسنت میں مولانا عبداللہ الہ آبادی بے حد سخت تھے اور بعض مسائل میں تشدد بہت بڑھ گیا تھا۔

اس زمانے میں طباعت کا سلسلہ بہت محدود تھا۔ لوگ مختلف کتابیں اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ مولانا عبداللہ الہ آبادی کو اپنے ہاتھ سے کتابیں لکھنے کا بہت شوق تھا۔ چناں چہ انھوں نے چار کتابیں اپنے ہاتھ سے لکھیں۔

مولانا عبداللہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے پوتوں سے تحصیل علم کی، بلکہ شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کے حضور بھی زانوے شاگردی تہ کرنے کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔

علاقہ بنگال میں مولانا عبداللہ الہ آبادی کے شاگرد اور عقیدت مند کثیر تعداد میں موجود تھے۔

مولانا عبداللہ الہ آبادی کی تاریخ ولادت اور وفات کا پتا نہیں چل سکا۔[1]



[1] نزہۃ الخواطر، جلد: ۸، ص: ۳۰۴ تا ۳۰۶۔ بحوالہ تذکرۃ النبلاء (تصنیف حضرت مولانا شمس الحق عظیم آبادی)

نواب سید صدیق حسن خاں

حضرت نواب سید صدیق حسن خاں والیٔ بھوپال کا تذکرہ ہم اپنی کتاب ''برصغیر کے اہل حدیث خدامِ قرآن'' میں کر چکے ہیں اور موضوع کی مناسبت سے قرآن سے متعلق ان کی تصانیف کی تفصیل اُس کتاب میں بیان کردی گئی ہے۔ قرآن کے رفیع الشان موضوع پر انھوں نے سات کتابیں تصنیف کیں، جن میں بعض عربی میں ہیں، بعض فارسی میں اور بعض اردو زبان میں......! مجموعی طور سے یہ سات کتابیں دس ہزار صفحات پر محیط ہیں۔

بھوپال کے بارے میں اہم تاریخی معلومات

یہاں ہم کچھ زیادہ تفصیل سے نواب صاحب کی ان تصانیف کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جو انھوں نے حدیث رسول (ﷺ) کے روح پرور موضوع پر تصنیف فرمائیں۔ لیکن اس سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ریاست بھوپال کے بارے میں قارئین کرام کو ضروری معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ چناں چہ مندرجہ تحت سطور میں اختصار کے ساتھ اس ریاست کے ابتدائی دور کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اس موضوع پر جن کتابوں میں کسی قدر وضاحت سے لکھا گیا ہے، وہ ہیں بیگمات بھوپال، اردو کی ترقی میں بھوپال کا حصہ، بھوپال گزیٹر اور حیات سکندری وغیرہ۔ لیکن ان کتابوں کے بعد جو کتاب شائع ہوئی ہے، وہ ہے ''نواب صدیق حسن خاں۔'' یہ دراصل نواب صاحب کے خاندان کی اور بھوپال ہی کی رہنے والی ایک لائق احترام خاتون رضیہ حامد کا مقالہ ہے جو انھوں نے نواب صاحب کے متعلق لکھا ہے۔ اس پر بھوپال یونیورسٹی کی طرف سے انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی ہے۔ یہ مقالہ فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی اتر پردیش (انڈیا) کے مالی تعاون سے ۱۹۸۳ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ نواب صاحب پر ایک ضخیم تحقیقی مقالہ اس سے قبل عربی زبان میں سید اجتبیٰ ندوی نے لکھا تھا، جس پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف سے انھیں ڈاکٹریٹ کی سند ملی۔ پشاور یونیورسٹی کے پروفیسر سعید اللہ نے بھی کیمبرج یونیورسٹی سے نواب صاحب پر انگریزی میں مقالہ لکھا تھا جو چھپ چکا ہے۔ لیکن یہاں ہم بھوپال کی قدیم تاریخ کے سلسلے میں ڈاکٹر رضیہ حامد کی کتاب ''نواب صدیق حسن خاں'' سے زیادہ استفادہ کر رہے ہیں۔

ریاست بھوپال کا بانی سردار دوست محمد خاں تھا جو ۱۶۹۶ء میں افغانستا سے ہندوستان آیا تھا۔ ابتدا میں وہ اورنگ زیب عالم گیر کی فوج میں ملازم ہوا۔ لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد فوج

سے علیحدگی اختیار کر کے ۱۷۰۸ء میں مالوہ آیا اور ایک جاگیر اجارے پر حاصل کی۔ پھر اپنی بہادری اور فراست سے اس کے آس پاس کے علاقے پر قابض ہوگیا۔ اس نے ایک جنگ میں دشمن کے خلاف رانی کملاپتی کی مدد کی تھی، جس کے صلے میں رانی نے اسے بھوجپال (بھوپال) کا علاقہ عطا کیا۔ اس طرح ۱۷۲۲ء میں وسط ہند میں ایک مسلم ریاست کا قیام عمل میں آیا اور اس کے بعد اسے نواب دوست محمد خاں کہا جانے لگا۔

دوست محمد خاں اہل علم کا قدر دان تھا، خود بھی انشا پرداز اور فارسی ادب میں دست گاہ رکھتا تھا اور بہت سے اصحابِ علم اس نے اپنے دربار میں جمع کر لیے تھے، جن میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی۔ افغانستان سے بھی اس نے اپنے اعزہ واقارب اور علما وفضلا کو بلا لیا تھا، جنھیں بھوپال میں آباد کیا، انھیں جاگیریں دیں اور درس وتدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا۔

۱۷۲۶ء میں دوست محمد کا انتقال ہوگیا تو ریاست بھوپال کی عنانِ حکومت اس کے بیٹے نواب یار محمد خاں نے سنبھالی۔ یار محمد خاں اس سے قبل چار سال حیدر آباد (دکن) رہا تھا، جہاں اس نے بہتر طریقے سے علمی اور انتظامی تربیت حاصل کی تھی اور حیدر آباد سے متعدد اہل علم کو اپنے ساتھ بھوپال لے گیا تھا۔ اس کا دورِ حکمرانی قابل تعریف تھا۔ اس نے ۱۷۴۲ء میں وفات پائی۔

اب بھوپال کا تیسرا حکمران یار محمد خاں کے بیٹے نواب فیض محمد خاں کو بنایا گیا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ ریاست میں ایسی خانہ جنگی شروع ہوئی کہ ریاست کا بچنا مشکل ہوگیا۔ فیض محمد خاں کی سوتیلی ماں ماجی ممولا بڑی عقل مند اور مردم شناس عورت تھی۔ ایک برہمن زادہ اس کا پروردہ تھا جو مسلمان ہوگیا تھا۔ ریاست کا قلم دانِ وزارت اس کے سپرد کیا گیا اور اسے دیوان چھوٹے خاں کہا جانے لگا۔ اس نے بڑے تدبر کے ساتھ حکومت کے نظم ونسق کو چلایا اور ریاست افراتفری سے محفوظ ہوگئی۔ ۱۷۷۷ء میں فیض محمد خاں انتقال کر گیا۔ وہ بذاتِ خود بہتر کردار کا حامل تھا، لیکن وہ ایسی پریشانیوں میں گھرا کہ کوئی قابل ذکر کام نہ کرسکا۔

فیض محمد خاں کی وفات کے بعد اس کے بیٹے نواب حیات محمد خاں کو تخت حکومت پر بٹھایا گیا۔ اس کے وزیر دیوان چھوٹے خاں نے بڑی خوش اسلوبی سے حکومت کے نظام کو آگے بڑھایا۔ مختلف مقامات میں مسجدیں تعمیر کرائیں۔ مدارس قائم کیے اور علما کو ان کے مقام ومرتبے کے مطابق اعزازات سے نوازا۔

سید ذوالفقار احمد نقوی اپنی کتاب ''تذکرۂ قضاۃِ بھوپال'' میں لکھتے ہیں:

''چھوٹے خاں نے شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں بایں مضمون عریضہ لکھا کہ آپ بھوپال تشریف لائیں۔ بارہ ہزار کی جاگیر حاضر ہے۔ چند معتبر ادیبوں کو یہ خط اور

پانچ صد روپیہ دے کر دہلی بھیجا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ بڑھاپے میں دہلی چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"[1]

شاہ صاحب خود تو بھوپال نہیں گئے البتہ بعض علما کو اپنی سفارش کے ساتھ بھوپال بھیج دیا تھا جنھوں نے دینی و دنیوی علوم کی نشر و اشاعت میں بڑی جاں فشانی سے کام لیا۔ اس کے نتیجے میں شمالی ہندوستان کی تہذیب و تمدن میں بڑا نکھار پیدا ہوا اور بھوپال، دہلی کا ایک حصہ معلوم ہونے لگا۔[2]

۱۷۹۲ء میں ماجی ممولا اور ۱۷۹۴ء میں دیوان چھوٹے خاں وفات پا گئے تو ریاست بھوپال میں پھر خانہ جنگیوں اور سازشوں کا بازار گرم ہو گیا۔ نواب حیات محمد خاں کم زور حکمران تھا، وہ حالات کا مقابلہ نہ کر سکا اور حکومت سے علیحدہ ہو کر خانہ نشینی اختیار کر لی۔ چناں چہ ۱۷۹۵ء میں ایک جلا وطن شہزادے وزیر محمد خاں نے ریاست کو بچانے کے لیے بھوپال کا عزم کیا۔ وزیر محمد خاں ریاست کے بانی سردار دوست محمد خاں کا پڑپوتا تھا، جسے کسی وجہ سے ریاست بدر کر دیا گیا تھا۔ اس نے ایسی حکمت عملی سے کام لیا کہ تھوڑے عرصے میں نہ صرف تمام اندرونی اور بیرونی سازشوں کا خاتمہ کر دیا بلکہ ریاست میں نئی فتوحات کا آغاز ہو گیا اور اس کی حدود بڑھنے لگیں۔

نواب حیات محمد خاں کا بیٹا غوث محمد خاں ولی عہد تھا۔ اس نے وزیر محمد خاں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں لیکن وزیر محمد خاں نے تدبر اور صبر سے کام لیا اور ریاست کی ترقی میں مصروف رہا۔ اس کے عہد میں ریاست نے واقعی ارتقا کی بہت سی منزلیں طے کیں۔ وزیر محمد خاں دراصل والیٔ ریاست نہ تھا، لیکن ریاست کی طرف سے اسے وزیر الدولہ کا خطاب ملا تھا اور اس نے اپنی کوششوں سے ریاست کو اِدھر اُدھر کی سازشوں کا شکار ہونے سے بچایا تھا۔

حیات محمد خاں جو گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا تھا، ۱۸۰۸ء میں وفات پا گیا، اور اس کے بیٹے غوث محمد خاں نے وزیر محمد خاں کو معزول کر کے ریاست کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ وزیر محمد خاں کے اختیارات کلی طور سے ختم کرنا چاہتا تھا، اس کے لیے اس نے مرہٹوں کی مدد حاصل کی۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر وزیر محمد خاں گنور کے قلعے میں چھپ گیا۔ کچھ عرصے کے بعد مرہٹہ فوج واپس چلی گئی تو وزیر محمد خاں پھر بھوپال آ گیا اور مرہٹوں کی جو تھوڑی بہت فوج بھوپال کی حدود میں موجود تھی، اسے بھگا دیا اور غوث محمد خاں کو گرفتار کر لیا۔ مرہٹے غوث محمد خاں کی حمایت میں دوبارہ میدان

---

[1] نواب صدیق حسن خاں (از ڈاکٹر رضیہ حامد)، صفحہ: ۱۳۷

[2] ایضاً

میں آئے تو وزیر محمد خاں نے مقابلہ کر کے انھیں شکست دی اور ریاست پر مکمل طور پر قبضہ کرلیا۔
۱۸۱۵ء میں نواب وزیر محمد خاں کا انتقال ہوگیا۔

اب بھوپال کے عوام کی مرضی اور حمایت سے وزیر محمد خاں کے بیٹے نظر محمد خاں کو بھوپال کا نواب بنایا گیا۔ نظر محمد خاں اپنے باپ کی رفاقت و تربیت میں ریاستی حالات کے مختلف مراحل سے گزر چکا تھا اور بڑا زیرک اور مدبر شخص تھا۔ اس نے اپنے اور اپنے باپ کے حریف نواب غوث محمد خاں کی بیٹی گوہر بیگم قدسیہ سے شادی کرلی، جس کی وجہ سے تمام باہمی جھگڑے ختم ہوگئے۔ اس کے بعد ۱۸۱۸ء میں نواب نظر محمد خاں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندے یعنی گورنر جنرل سے دوستانہ طرز کا معاہدہ کرلیا، جس کی رو سے ریاست بھوپال کی حفاظت کی ذمہ داری کمپنی نے لے لی اور امن وامان کی فضا پیدا ہوگئی۔

یہ سات نواب ریاست بھوپال کے ابتدائی دور کے حکمران تھے: ① دوست محمد خاں، ② یار محمد خاں، ③ فیض محمد خاں، ④ حیات محمد خاں، ⑤ غوث محمد خاں، ⑥ وزیر محمد خاں اور ⑦ نظر محمد خاں۔ ان ساتوں حکمرانوں کے عہد میں بھوپال کو مجمع العلما کی حیثیت حاصل رہی اور علم وادب نے فروغ پایا۔

نواب قدسیہ بیگم کی حکومت

نواب نظر محمد خاں نے ساڑھے تین سال حکومت کی۔ لوگ اس کے طریق حکومت سے بہت خوش تھے۔ لیکن اچانک طپنچہ (پستول) چلنے سے ۱۱۔ نومبر ۱۸۱۹ء کو اس کا انتقال ہوگیا۔ اس نے صرف ۲۸ سال عمر پائی۔ اس کا کوئی بیٹا نہ تھا، صرف ایک بیٹی تھی، جس کا نام سکندر بیگم تھا، باپ کی وفات کے وقت اس کی عمر ایک سال تین مہینے تھی، اسے اپنے باپ کا جانشین مقرر کیا گیا، لیکن چوں کہ وہ حکومتی کاروبار نہیں چلاسکتی تھی، اس لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجازت سے نواب نظر محمد خاں کی بیوہ قدسیہ بیگم ریاست کی مختار مقرر ہوئیں اور تمام امورِ حکومت انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ ان کے عہد حکومت میں رعایا کو بڑی سہولتیں حاصل ہوئیں۔ بہت سے اہل علم اور اصحابِ فضیلت کو مختلف مقامات سے بلا کر بھوپال میں آباد کیا گیا اور جگہ جگہ مدارس قائم کیے گئے اور تعلیم عام ہوئی۔

نواب قدسیہ بیگم کا زمانہ ریاست بھوپال کے لیے رحمت خداوندی کا زمانہ تھا۔ یہ ایک محبّ وطن اور دین دار حکمران تھیں۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں انھوں نے رباطیں تعمیر کرائیں۔ [1] (یعنی حاجیوں اور مسافروں کی رہائش کے لیے مسافر خانے بنوائے۔)

---

[1] نواب صدیق حسن خاں (از ڈاکٹر رضیہ حامد)، صفحہ: ۱۴۲

نواب سکندر بیگم کی حکومت

۱۸۔ اپریل ۱۸۳۵ء (۱۸۔ ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ) کو نواب جہاں گیر محمد خاں سے سکندر بیگم کی شادی ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی از روئے وصیت جہاں گیر محمد خاں کو ریاست بھوپال کا نواب مقرر کیا گیا۔ لیکن ۹۔ دسمبر ۱۸۴۴ء (۲۸۔ ذیقعدہ ۱۲۶۰ھ) کو عین عالم شباب میں جہاں گیر محمد کا انتقال ہوگیا۔ اس کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی، صرف ایک لڑکی تھی، جس کا نام شاہ جہاں بیگم تھا اور اس کی عمر اس وقت سات سال تھی اور وہ حکومت کا نظام چلانے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی۔ اس لیے اس کی والدہ سکندر بیگم کو ریاست کی مختار مقرر کیا گیا۔ لیکن سکندر بیگم نے صرف مختاری پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ریاست کی مستقل فرماں روائی کے لیے کوشش کی اور اس کوشش میں انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔ انھوں نے ریاست پر اپنا دعواے فرماں روائی پُر زور اور مضبوط دلائل کے ساتھ پیش کیا، جسے انگریزی حکومت صحیح ماننے پر مجبور ہوگئی اور وہ نواب سکندر بیگم کہلائیں۔

اصلاحات اور سلسلۂ تعلیم

نواب سکندر بیگم بڑی منتظم اور سمجھ دار حکمران تھیں۔ انھوں نے ریاست میں بہت سی اصلاحات جاری کیں۔ ڈاک رسانی کا بہترین نظام قائم کیا، مختلف حکومتی دفاتر جدید طریقے سے قائم کیے، ریاست کے بلاد وقصبات کے نقشے بنائے، دفتری احکام میں مختصر نویسی کا حکم دیا، طویل اور مسجع ومقفع عبارتوں سے بچنے کی تاکید کی۔ رعایا کی سہولت کے لیے بعض نئے محکمے قائم کیے، ایک محکمہ احتساب قائم کیا۔ وہ علم وعلما کی بہت قدر دان تھیں۔ بہت سے علما وشعرا ان کی دعوت پر بھوپال آئے اور انھوں نے اس شہر اور ریاست میں مستقل طور سے سکونت اختیار کی۔

نواب سکندر بیگم کو مطالعہ کتب کا بہت شوق تھا اور تصنیف وتالیف سے انھیں بڑی دلچسپی تھی۔ ریاست میں تعلیم عام کرنے کے لیے انھوں نے ہر گاؤں اور قصبے میں مدارس جاری کیے۔ ان مدارس میں عربی، فارسی، اردو، ہندی اور انگریزی تمام زبانوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ انھوں نے ۱۸۵۱ء میں بھوپال میں مطبع سکندری کے نام سے ایک مطبع قائم کیا۔

ان کے داماد اور ان کی بیٹی نواب شاہ جہاں بیگم کے شوہر باقی محمد خاں نے (جنھیں نواب امراؤ دولہ کہا جاتا تھا) اپنے مصارف سے ایک بہت بڑا مدرسہ جاری کیا اور کتب خانہ قائم کیا جو بعد میں ضائع ہوگیا۔

نواب سکندر بیگم مذہبی اعتبار سے بہت مضبوط عقائد کی مالک تھیں اور احکام اسلام پر پابندی

سے عمل کرتی تھیں۔ اسلام کے اصولی اور فروعی مسائل پر انھیں عبور حاصل تھا۔ مسلمانوں کے عام معاملات میں بے حد دلچسپی رکھتی تھیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد دہلی کی جامع مسجد انگریزوں نے نمازیوں کے لیے بند کردی تھی۔ یہ مسجد پانچ سال بند رہی۔ نواب سکندر بیگم دہلی گئیں تو ان کی کوشش سے مسجد واگزار کی گئی اور لوگ اس میں نماز پڑھنے لگے۔

حضرت نواب صدیق حسن خاں ۱۸۵۶ء میں نواب سکندر بیگم کے عہد ہی میں بھوپال آئے اور دربارِ سکندری سے منسلک ہوئے۔ ان کی آمد پر ایک ''دفتر تاریخ'' قائم کیا گیا، جس کے وہ منتظم اعلیٰ ہوئے۔ نواب سکندر بیگم کی بیٹی نواب شاہ جہاں بیگم کا شوہر فوت ہوگیا تھا، پھر نواب صاحب کا اس سے عقد ثانی ہوا۔

نواب صاحب کے بارے میں ضروری باتیں

ریاست بھوپال کی اس مختصر تاریخ کے تذکرے کے بعد اب آیئے نواب سید صدیق حسن خان کی طرف......!

نواب صاحب دنیاے اسلام کے کثیر التصانیف مصنف ہیں۔ ان کی چھوٹی بڑی تصانیف کی کل تعداد ۲۳۰ کے لگ بھگ ہے۔ ان میں سے سات قرآنِ مجید کے متعلق، تینتیس حدیث شریف کے بارے میں، تیس عقائد کے سلسلے میں، بائیس عام فقہی مسائل کے موضوع پر، گیارہ ردتقلید کے متعلق، بائیس تاریخ وسیر کے متعلق، تیرہ مناقب وفضائل کے سلسلے میں، بائیس علوم وادب کے بارے میں، اڑتیس اخلاقیات کے موضوع پر، چھ سیاست کے موضوع پر، ایک شیعیت کے سلسلے میں اور سترہ کتابیں تصوف کے موضوع پر ہیں۔ ان کے علاوہ بعض چھوٹے چھوٹے رسائل بھی مختلف عنوانات سے متعلق تصنیف فرمائے۔

نواب صاحب کا سلسلہ نسب تینتیس واسطوں سے نبی ﷺ تک پہنچتا ہے۔ نواب صاحب کے والد مکرم کا اسم گرامی سید اولاد حسن تھا جو ۱۲۱۰ھ (۹۶-۱۷۹۵ء) میں ہندوستان کے شہر قنوج میں پیدا ہوئے۔ قنوج اور لکھنؤ کے بعض معروف اساتذہ سے حصولِ علم کے بعد سید اولاد حسن ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء) میں دہلی گئے۔ وہاں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور شاہ رفیع الدین رحمہم اللہ سے استفادہ کیا اور شاہ عبدالقادر دہلوی کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ امیر المجاہدین سید احمد شہید کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی۔ ۷۔ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۱ھ (۱۷۔ جنوری ۱۸۲۶ء) کو مجاہدین کا جو پہلا قافلہ سید احمد شہید کی قیادت میں جہاد کے لیے آزاد قبائل کی طرف روانہ ہوا تھا، سید اولاد حسن اس میں شامل تھے۔ انھوں نے کتاب وسنت کی تبلیغ واشاعت کے سلسلے کی سترہ کتابیں تصنیف کیں۔ ۱۲۵۳ھ

(۱۸۴۸ء) میں قنوج میں فوت ہوئے۔ صرف ۴۳ سال عمر پائی۔

سید اولاد حسن کی نرینہ اولاد دو بیٹے تھے۔ بڑے سید احمد حسن عرشی اور چھوٹے سید صدیق حسن۔ باپ کی وفات کے وقت احمد حسن سات برس کے اور صدیق حسن پانچ برس کے تھے۔

نواب صدیق حسن کے ننھیال کا تعلق بانس بریلی سے تھا۔ ان کے نانا مفتی محمد عوض عثمانی اپنے علاقے اور عہد کے ممتاز عالم تھے۔ دنیوی اعتبار سے بھی اونچی حیثیت کے مالک تھے۔ نواب صاحب کی ولادت انہی کے گھر بانس بریلی میں ۱۹۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۸ھ (۱۴۔ اکتوبر ۱۸۳۲ء) کو ہوئی۔

سید اولاد حسن کی وفات کے بعد یہ کم سن بچے انتہائی غربت کی زد میں آ گئے تھے۔ گھر میں اپنے اسلاف کی صرف کتابیں رہ گئی تھیں، جنھیں وہ دیکھتے رہتے تھے اور وہ کتابیں ان کے دل میں تحصیل علم کا جذبہ پیدا کرتی تھیں۔

طلب علم کی راہ پر

نواب صدیق حسن کچھ بڑے ہوئے تو اپنے محلے کے مدرسے میں حصول علم کا آغاز کیا۔ بڑے بھائی سید احمد حسن عرشی سے بھی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ پھر ان کے والد (سید اولاد حسن) کے ایک عقیدت مند سید احمد علی انھیں اپنے وطن فرخ آباد لے گئے۔ وہاں کے بعض اساتذہ سے مختلف علوم کی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں سید احمد شہید کے ایک ارادت کیش ان کو کان پور لے گئے، وہاں کے چند اساتذہ سے استفادہ کیا۔

۱۲۶۹ھ (۱۸۵۳ء) میں سید صدیق حسن عازم دہلی ہوئے جسے اس زمانے میں علم کے گہوارے اور علما کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ وہاں مفتی صدر الدین آزردہ کی خدمت میں حاضری دی اور ایک سال آٹھ مہینے ان سے تحصیل علم میں مصروف رہے۔ اس اثنا میں ان سے تفسیر وحدیث کی بعض کتابوں کے علاوہ منطق وفلسفہ، صرف ونحو، معانی وبیان، فقہ وکلام اور عربی ادبیات کی متعدد کتابوں کی تکمیل کی اور سند لی۔

مفتی صدر الدین آزردہ کے علاوہ جن حضراتِ عالی مقام سے علوم تفسیر وحدیث کا اجازہ حاصل ہوا، ان میں سے بعض رفیع الدرجات علما کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

① ...... شیخ زین العابدین بن محسن بن محمد انصاری۔

② ...... قاضی محمد بن علی شوکانی یمنی کے شاگردِ رشید شیخ عبدالحق محدث نیوتنی بنارسی

③ ...... شیخ حسین عرب یمنی

④ ...... حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسے اور حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی کے

بھائی مولانا شاہ محمد یعقوب مہاجر مکی ...... ان سے بذریعہ خط اجازۂ حدیث حاصل کیا۔

نواب صاحب نہایت ذہین تھے اور حصولِ علم کا بے حد شوق رکھتے تھے۔ قوتِ اخذ بہت تیز تھی اور حافظہ مضبوط تھا۔ اکیس برس کی عمر میں تمام مروّجہ علوم پڑھ لیے تھے اور فارغ التحصیل ہوگئے تھے۔

بھوپال میں ملازمت اور اس کا اختتام

حصولِ علم سے فراغت کے بعد نواب صاحب اپنے وطن قنوج چلے گئے تھے، لیکن گھر کی مالی حالت نہایت اذیت رساں تھی۔ اس لیے تھوڑا عرصہ وہاں رہے۔ پھر تلاشِ ملازمت کے لیے بھوپال آگئے۔ اس وقت ریاست بھوپال کے مدار المہام مولانا جمال الدین صدیقی دہلوی تھے (جو بعد میں نواب صاحب کے سسر ہوئے) بھوپال کی سرکار میں نواب صاحب نے ملازمت کی درخواست دی اور صفر ۱۲۷۲ھ (اکتوبر ۱۸۵۵ء) میں ان کو تیس روپے ماہانہ کی ملازمت مل گئی۔ کچھ مدت بعد حسنِ کارکردگی کی بنا پر عہدۂ میر دبیر پر فائز کیے گئے اور خلعت عطا ہوا۔ لیکن بعض وجوہ کی بنا پر ۱۶۔ محرم ۱۲۷۳ھ (۱۶۔ ستمبر ۱۸۵۶ء) کو ایک سال بعد ملازمت ختم ہوگئی اور واپس گھر چلے گئے۔

اس زمانے میں ریاست بھوپال کی حکمران نواب سکندر بیگم تھیں۔ انھوں نے سید صدیق حسن کو قنوج سے دوبارہ طلب کیا۔ گھر سے چل پڑے، لیکن راستے میں ایسی رکاوٹیں پیش آئیں کہ بر وقت بھوپال نہ پہنچ سکے اور بعض حاسدوں کے کہنے سے ملازمت کا حکم منسوخ کردیا گیا۔ ۱۹۔ ربیع الاوّل ۱۲۷۵ھ (۱۸۔ نومبر ۱۸۵۸ء) کو بھوپال سے نکلے اور ٹونک آگئے۔ ریاست ٹونک کا حکمران اس وقت نواب محمد وزیر خاں تھا۔ اس نے پچاس روپے ماہانہ تنخواہ پر انھیں ملازم رکھا اور ٹونک میں سکونت اختیار کرنے پر اصرار کیا۔ لیکن سید صدیق حسن کا دل اس ماحول سے مانوس نہ ہوا اور تھوڑے عرصے بعد چار ماہ کی رخصت کے لیے درخواست دی۔ اتفاق ملاحظہ ہو کہ اسی اثنا میں ریاست بھوپال کی والیہ نواب سکندر بیگم کی طرف سے پھر فرمانِ طلبی صادر ہوا۔

دورِ عروج

یکم صفر ۱۲۷۶ھ (۲۷۔ اگست ۱۸۵۹ء) کو نواب صدیق حسن بھوپال پہنچے۔ بھوپال میں ان کا یہ تیسرا ورود تھا، جسے آخری اور فاتحانہ ورود کہنا چاہیے۔ ۷۵ روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی اور ریاست بھوپال کی تاریخ نگاری کا فریضہ ان کے سپرد کیا گیا۔ اب روز بروز ترقی کے دروازے ان کے لیے کھلنے لگے اور عروج نے دل کھول کر ان کا استقبال کیا۔ ۲۵۔ شعبان ۱۲۷۷ھ (۱۸۔ مارچ ۱۸۶۱ء)

کو ریاست کے مدار المہام مولانا جمال الدین صدیقی دہلوی نے اپنی بڑی بیٹی ان کے عقد میں دے دی۔ نکاح مولانا عبدالقیوم بن مولانا عبدالحی بڑھانوی نے پڑھایا۔ نواب صاحب نے اب اپنی والدہ مکرمہ اور بہنوں کو بھی قنوج سے بھوپال بلا لیا تھا اور اس خاندان نے مستقل طور پر بھوپال میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

نوابِ شاہ جہاں سے شادی

والیہ بھوپال نواب سکندر بیگم کے انتقال کے بعد ان کی بیٹی نواب شاہ جہاں بیگم نے ریاست کی زمامِ حکومت ہاتھ میں لی۔ ان کا شوہر وفات پا گیا تھا۔ نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ نواب صدیق حسن کی قابلیت، دیانت اور شرافت سے نہایت متاثر ہوئیں۔ اس تاثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے نواب صاحب کو امورِ سلطنت میں شریک کرنے کا فیصلہ کیا اور ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) میں نواب صاحب سے نکاح کر لیا۔ پھر ۲۱۔ ربیع الثانی ۱۲۸۸ھ (۱۰۔ جولائی ۱۸۷۲ء) کو انھیں معتمد المہام کا عہدہ ملا اور ۱۰۔ شعبان ۱۲۸۹ھ (۱۳۔ اکتوبر ۱۸۷۲ء) کو ''نواب والا جاہ امیر الملک سید محمد صدیق حسن خاں'' کے خطاب سے مفتخر ہوئے۔ اس کے ساتھ اور بھی بہت سے اعزازات کے مستحق قرار پائے۔

علم اور اہل علم کی قدر دانی

اب نواب صاحب نے ریاست کے طول وعرض میں مدرسے قائم کیے، یتیم خانے بنوائے، مسجدیں تعمیر کرائیں، لائبریریوں کے قیام کا سلسلہ شروع کیا، سرکاری طور پر ریاست کے مختلف مقامات میں جاروب کشوں کا تقرر کیا گیا، مسجدوں میں باقاعدہ موذن، امام اور خطیب مقرر کیے گئے اور سرکاری خزانے سے ان کو ماہانہ تنخواہیں ملنے لگیں۔ دیگر علوم متداولہ کے علاوہ طلبا کے لیے خوش خطی، انشا پردازی، قانون دانی اور حساب وریاضی کی تعلیم لازمی قرار دی گئی۔ علما وطلبا کے لیے تصنیف وتالیف اور مختلف علمی موضوعات پر تحقیق کے شعبے قائم کیے گئے۔ مدرسین کے لیے ان کی ضرورت اور قابلیت کے مطابق معقول مشاہرات کا اہتمام کیا گیا اور طلبا کو ماہانہ وظائف دینے کا فیصلہ ہوا۔ ہندی زبان کی تعلیم کا انتظام بھی کیا گیا۔ باشندگانِ ریاست کے لیے اخلاقی تربیت کا بالخصوص بندوبست کیا گیا اور اصلاحی کمیٹیاں بنائی گئیں۔ چوری، ڈاکا، رہزنی اور ہر قسم کی برائی کے سد باب کے لیے بھرپور کوششیں کی گئیں۔ ریاست کو دارالامن بنانے کی سعی کی گئی۔ ہندو مسلم اتحاد کو ضروری قرار دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان تمام اعمالِ خیر میں نواب صاحب کو کامیابی عطا فرمائی۔

علما وطلبا میں حفظ حدیث کا جذبہ اور شوق پیدا کرنے کی غرض سے یہ بہت بڑا اقدام کیا گیا کہ

جو شخص صحیح بخاری حفظ کرے گا، اسے ایک ہزار روپے انعام دیا جائے گا اور جو صاحب بلوغ المرام یاد کریں گے ان کی خدمت میں ایک سو روپیہ بہ صورت انعام پیش کیا جائے گا۔ چناں چہ بعض حضرات نے یہ انعامات حاصل کیے۔ ایک طالب علم عبدالتواب غزنوی علی گڑھی نے صحیح بخاری کے حفظ کا سلسلہ شروع کیا تو نواب صاحب نے ان کا تیس روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کردیا۔ مولانا عبدالتواب غزنوی علی گڑھی نے جلیل القدر عالم کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ان سطور کے راقم کو ان کی زیارت کا شرف حاصل ہے۔ اس بے حد سستے زمانے میں ہزار روپے بہت بڑی رقم تھی۔ آج کل کے لاکھ روپے سے بھی شاید زیادہ ہوگی۔

نواب صاحب نے مختلف اسلامی ممالک سے کثیر رقم خرچ کرکے تفسیر ابن کثیر، صحیح بخاری کی شرح فتح الباری، امام شوکانی کی تصنیف نیل الاوطار کے قلمی نسخے حاصل کیے اور پھر ان ضخیم کتابوں کو اپنے خرچ سے طبع کرایا اور اہل علم اور مختلف مدارس میں انھیں مفت تقسیم کیا۔ اس سے قبل یہ کتابیں برصغیر میں دست یاب نہ تھیں۔ نواب صاحب کی کوشش اور زرِ کثیر کے صرف سے یہ عظیم الشان کتابیں اس خطۂ ارض میں پہنچیں اور عام ہوئیں۔

تصانیف

خود نواب صاحب نے نہایت اہم کتابیں تصنیف کیں۔ انھوں نے عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں لکھا اور بہت لکھا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ان کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد ۲۳۰ کے قریب ہے، جن میں ایک سو سے زیادہ کتابیں بڑی ضخیم ہیں اور کئی کئی جلدوں پر محیط ہیں۔

نواب صاحب نے قرآنِ مجید سے متعلق جو کتابیں تصنیف کیں، ان کا تذکرہ ''برصغیر کے اہل حدیث خدامِ قرآن'' میں ہوچکا ہے۔ یہاں ان کی ان تصانیف کا ذکر کیا جاتا ہے جن کا تعلق حدیث شریف سے ہے۔ لیکن اس موقع پر یہ عرض کرنا شاید مناسب ہوگا کہ چند ایک کے سوا نواب صاحب کی تمام تصانیف کے نام عربی تراکیب پر مشتمل ہیں اور ان کی سب تصانیف میرا خیال ہے کسی کے پاس بھی نہیں ہوں گی اور نہ غالباً اس دور کے کسی شخص نے ان کی سب تصانیف دیکھی ہوں گی۔ ہر شخص اپنے مطلب اور ذوق کی کتابوں سے تعلق رکھتا ہے، نواب صاحب کی کتابیں بھی اپنے اپنے ذوق کے مطابق اہل علم نے حاصل کی ہوں گی۔ ان کی کسی کتاب کو دیکھے بغیر صرف نام سے کچھ پتا نہیں چلتا کہ یہ عربی زبان میں ہے یا فارسی زبان میں یا اردو زبان میں۔ بعض حضرات نے ان کی اردو اور فارسی کتابوں کو فقط نام کی وجہ سے عربی کتابوں میں شامل کردیا ہے۔ میں نے ان کی تمام تصانیف دیکھنے کی بہت کوشش کی، لیکن کامیاب نہیں ہوسکا۔ ان کی تصانیف حضرت مولانا عطاء اللہ

حنیف بھوجیانی کے قائم کردہ ادارہ الدعوۃ السّلفیہ کی لائبریری میں موجود ہیں، لیکن سب تصانیف اس میں بھی نہیں ہیں۔ البتہ (جہاں تک میرا خیال ہے) دیگر کتب خانوں سے بہر حال زیادہ ہیں۔ اس ضمن میں جو کچھ معلوم ہوسکا، وہ درج ذیل ہے۔

لیکن ان کی تصانیف کی موضوعاتی ترتیب کو قائم رکھنے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن سے متعلق بھی ان کی تصانیف کا ذکر کردیا جائے۔ یہ سات کتابیں ہیں جو دس ہزار صفحات پر محیط ہیں۔ یہاں ان کے صرف نام لکھے جائیں گے۔ تفصیل ''برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن'' میں ملاحظہ فرمایے۔

①...... فتح البیان فی مقاصد القرآن: عربی زبان میں۔ دس جلدیں۔ چار ہزار سے زائد صفحات۔

②...... ترجمان القرآن بلطائف البیان: اردو میں۔ پندرہ جلدوں پر مشتمل۔ کم وبیش پانچ ہزار صفحات۔

③...... تذکیر الکل بتفسیر الفاتحۃ واربع قل: سورہ فاتحہ، سورہ اخلاص، سورہ فلق اور سورہ الناس کی تفسیر اردو زبان میں۔ صفحات ستر۔

④...... نیل المرام من تفسیر آیات الاحکام: قرآن کی ۲۳۶ آیاتِ احکام کی تفسیر عربی زبان میں۔ چار سو صفحات۔

⑤...... اکسیر فی اصول التفسیر: بہ زبان فارسی۔ دو حصوں پر مشتمل۔ صفحات ایک سو تیس۔

⑥...... افادۃ الشیوخ بمقدار الناسخ والمنسوخ: دو حصوں میں۔ صفحات ایک سو چوبیس۔

⑦...... فصل الخطاب فی فضل الکتاب: اردو زبان میں۔ صفحات بتیس۔

یہ تمام تفسیریں بڑے سائز کی ہیں۔ تفسیر ''ترجمان القرآن'' مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور کی طرف سے شائع کی جارہی ہے۔ یہ نواب صاحب کی سب سے ضخیم کتاب ہے۔

اب ملاحظہ فرمایے پہلے حدیث سے متعلق حضرت نواب صاحب کی عربی کتابیں۔

①...... عون الباری لحل ادلۃ البخاری

②...... السراج الوھاج فی کشف مطالب مسلم بن حجاج

③...... فتح العلام شرح بلوغ المرام

④...... الحطۃ فی ذکر الصحاح الستّہ

⑤...... الروض السام من ترجمۃ بلوغ المرام ومؤلفہ الامام

⑥...... غزل الابرار بالعلم المأثور فی الادعیۃ والاذکار

⑦...... الرحمۃ المھداۃ الی من یرید زیادۃ العلم علی احادیث المشکوۃ

⑧...... العبرة بما جاء فی الغزو والشهادة والهجرة

⑨...... حسن الاسوة بما ثبت عن اللّٰه ورسوله فی النسوة

⑩...... الادراك بتخريج احاديث الاشراك

⑪...... الاذاعة لما كان وما يكون بين يدى الساعة

⑫...... الحرز المكنون من لفظ المعصوم المكنون

⑬...... اكليل الكرامة فی تبيان مقاصد الامامة

⑭...... بلوغ السول من اقضية الرسول

اب حضرت نواب صاحب کی فارسی کتب حدیث

①...... سلسلة العسجد فی مشائخ السند

②...... مسك الختام شرح بلوغ المرام

③...... منهج الوصول الی اصطلاح احاديث الرسول

④...... موائد العوائد من عيون الاخبار والفوائد

مندرجہ ذیل سطور میں حدیث رسول ﷺ کے متعلق نواب صاحب کی اردو کتابوں کی تفصیل ملاحظہ ہو:

①...... اتباع الحسنة فی جمله ايام السنّة

②...... بغية القارى فی ثلاثياتِ بخارى

③...... تقوية الايقان شرح حديث حلاوة الايمان

④...... تميمة الصبى فی ترجمة احاديث النبى

⑤...... توفيق البارى لترجمة الادب المفرد للبخارى

⑥...... جامع السعادات ترجمة المنبهات (لابن حجر)

⑦...... ضوء الشمس حديث بنى الاسلام علی خمس

⑧...... غنية القارى فی ترجمة ثلاثيات البخارى

⑨...... كشف اللثام عن غبرة الاسلام

⑩...... محاسن الاعمال

⑪...... محو الحوبه بالاستغفار والتوبه

⑫...... الداء والدواء

⑬...... هادى القلب السليم الی درجات جنات النعيم

⑭...... غراس الجنه

کتب حدیث بہ سلسلہ لغت

①...... خیر القرین ترجمة الاربعین

②...... عین الیقین ترجمة الاربعین للغزالی

③...... النہج المقبول من شرائع الرسول

④...... نیل الامانی

نواب صاحب نے فقہی مسائل پر بھی کتابیں لکھیں۔ یہ کتابیں بھی اگرچہ تینوں زبانوں میں ہیں، لیکن اردو میں زیادہ ہیں، جن کی تعداد تیرہ ہے، فارسی میں سات اور عربی زبان میں تین کتابیں ہیں۔ ان کتابوں کے نام تعلیم الصلوٰۃ، تعلیم الصوم، تعلیم الزکوٰۃ، تعلیم الحج، تعلیم الذکر والدعاء، فضائل الحج والعمرہ، روز مرۂ اسلام، حل الاسئلۃ المشکلہ، سبیل الرشاد لما یحتاج الیہ العباد وغیرہ ہیں۔ یہ کل بائیس کتابیں ہیں اور ان میں جو مسائل درج کیے گئے ہیں، وہ قرآن وحدیث سے ماخوذ ہیں۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتابیں بھی قرآن اور حدیث کے موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں۔

اسی طرح نواب صاحب کی عقائد سے متعلق تیس کتابوں کا ماخذ بھی قرآن وحدیث ہے۔ ان میں بھی عربی، فارسی اور اردو کی تصانیف شامل ہیں۔ اردو کی اٹھارہ، عربی کی نو اور فارسی کی تین...... ان کتابوں کے مشمولات بھی قرآن اور حدیث سے تعلق رکھتے ہیں۔

نواب صاحب نے تاریخ وسیر کے موضوع پر بائیس کتابیں تصنیف فرمائیں۔ ان تصانیف میں بھی عربی، فارسی، اردو کتابیں شامل ہیں۔ عربی کتابوں میں ابجد العلوم کو بڑی اہمیت حاصل ہے جو بڑے سائز کے تقریباً ایک ہزار صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کتاب کو مختلف تاریخی معلومات کے اعتبار سے ہم دائرۃ المعارف سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ عربی کی التاج المکلل اور ریاض الجنہ فی تراجم اہل السنہ خزینہ علم کی حیثیت رکھتی ہیں۔

پھر فارسی کی اتحاف النبلا حروف تہجی کی ترتیب سے رجال وکتب سے متعلق معلومات کا ایک وسیع ذخیرہ اپنے دامن صفحات میں سمیٹے ہوئے ہے۔ تقصار جیود الاحرار من تذکار جیود الابرار بھی بہت سے عظیم لوگوں کے حالات کا معلومات افزا مجموعہ ہے۔ فارسی ہی میں سلسلۃ العسجد فی ذکر مشائخ السند اپنی نوعت کی بہترین کتاب ہے۔

تاریخ وسیر کے سلسلے کی فارسی کتابوں میں تذکرۂ شمع انجمن، تذکرۂ صبح گلشن اور نگارستانِ سخن اپنی نوعیت کی پر بہار کتابیں ہیں۔ یہ کتابیں جہاں تاریخ وواقعات کے ایک خاص عہد کی صراحت کرتی ہیں، وہاں زبان وطرزِ ادا کی صفائی کا بھی نہایت عمدہ نمونہ ہیں۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ

مصنف کا ذہن کس قدر وسیع ہے اور ان کا قلم علم وادراک کی کن کن وادیوں کو طے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اردو میں نواب صاحب کی خود اپنی سرگزشت حیات ''ابقاء المنن بالقاء المحن'' ترتیب واسلوب اور زبان وبیان کے لحاظ سے بہ درجہ غایت اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں نواب صاحب نے اپنی زندگی کے واقعات خوب صورت انداز میں قلم بند کردیے ہیں۔

اردو ہی میں نواب صاحب کا سفر نامہ حج ''رحلت الصدیق الی بیت العتیق'' لائق مطالعہ ہے اور مختلف مراحل حج کا دلنواز مرقع ہے۔

بوقلموں علوم پر ان کی گرفت کا یہ عالم ہے کہ خالص درسی کتابوں پر بھی انھوں نے حواشی لکھے یا ان کی شرح قلم بند کی مثلاً ''تصریف الریاح'' کے نام سے مراح الارواح کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ کافیہ کی شرح ''صافیہ'' کے نام سے فارسی میں لکھی۔ منطق کی کتاب شرح تہذیب کی شرح عربی میں ''تہذیب'' کے نام سے لکھی۔ میزان کی شرح قسطاس الاذعان لکھی۔

عربی ادبیات میں انشاے عربی، البلغۃ الی اصول اللغۃ، تکمیل العیون بتعارف العلوم والفنون، العلم الخفاف من علم الاشتقاق، ربیع الادب، السحاب المرکوم فی بیان انواع الفنون والعلوم ان کی معروف تصانیف ہیں۔

اردو اور فارسی غزلیات کا مجموعہ دیوان گل رعنا، ان کے ذوق شعری کا بین ثبوت ہے۔ اسی قسم کا ایک اور مجموعہ نفح الطیب من المنزل والحبیب بھی ان سے یادگار ہے۔

اخلاقیات کے موضوع پر بھی ان کا قلم عربی، فارسی اور اردو میں رواں دواں ہے۔ اس ضمن میں ان کی تصانیف میں ایقاظ النیام لصلۃ الارحام، اسعاد العباد بحقوق الوالدین والاولاد، ادامۃ السکر باقامۃ الصبر والشکر، محاسن الاعمال، مکارم الاخلاق شامل ہیں۔

فضائل ومناقب کے باب میں بھی نواب صاحب نے خوب داد تحقیق دی۔ اس سلسلے میں عربی، فارسی، اردو میں ان کی تیرہ کتابوں کی نشان دہی ہوتی ہے، جن میں عربی زبان میں الشمامۃ العنبریہ فی مولد خیر البریہ، کلمۃ العنبریہ فی مدح خیر البریہ۔ فارسی میں جلب المنفعہ فی الذب عن الائمۃ الاربعہ، اور اردو میں السیف المسلول علیٰ من سب الرسول، تکریم المومنین بتقدیم الخلفاء الراشدین، فصل الخطاب من فضل الکتاب شامل ہیں۔

سیاسیات کے متعلق اردو میں حسن المساعی الیٰ اصلاح الرعیۃ والراعی، فلاح البرایا فی اصلاح الراعی والرعایا، عربی میں العبرۃ بما جاء فی الغزو والشہادۃ والہجرۃ، اکلیل الکرامہ فی تبیان فی مقاصد الامامہ اور فارسی میں برگ سبز یعنی دربیان بیعت شامل ہیں۔ سیاسیات کے موضوع کی یہ کتابیں قرآن

حدیث کی روشنی میں لکھی گئی ہیں، اس لیے ہم نے ان میں سے بعض کتابوں کو نواب صاحب کی حدیث سے متعلق کتابوں کی فہرست میں بھی شامل کیا ہے۔

ردّ تقلید میں نواب صاحب نے عربی، فارسی، اردو میں گیارہ کتابیں تصنیف کیں۔ اس موضوع سے متعلق ان کی عربی زبان میں تین کتابیں ہیں، ایک الاقلید لادلۃ الاجتہاد والتقلید، دوسری الطریق المثلیٰ فی ارشاد الیٰ ترک التقلید واتباع ماھو الھویٰ، الجنۃ فی الاسوۃ الحسنۃ۔ اردو میں ایک کتاب بذل المنفعہ لایضاح الارکان الاربعہ ہے۔ اس موضوع پر فارسی زبان میں ان کی تین تصانیف ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ہر موضوع ان کے اشہب فکر کی زد میں ہے اور ہر علمی میدان میں وہ اپنے اقران ومعاصرین سے آگے نظر آتے ہیں۔ پھر جس موضوع کو زیر بحث لاتے ہیں، اس کے تمام پہلوؤں کی خوب صورتی سے وضاحت کرتے چلے جاتے ہیں۔ کسی مقام پر کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ ان کے علم کا بہاؤ ان کے سمند خامہ کو تیز رکھتا ہے۔

نواب صاحب شاعر بھی تھے، عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں انھوں نے شعر کہے۔ بہت سے شعرا کے اشعار انھیں زبانی یاد تھے۔ چناں چہ اپنی بعض تصانیف میں مناسب مواقع پر وہ ایسے خوب صورت شعر درج کرتے ہیں کہ جن سے کلام میں ایک نئی روح ابھر آتی ہے۔ ابقاء المنن میں وہ کثرت سے شعر لاتے ہیں اور ہر شعر نگینے کی طرح ان کے طرزِ بیان میں موزوں ہوتا چلا جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اسی موقعے کے لیے یہ شعر کہا تھا۔

نواب صاحب بے حد فراخ حوصلہ عالم دین تھے اور اختلافِ مسلک کے باوصف اصحابِ علم سے وسیع تعلقات رکھتے تھے اور ان سے میل جول کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے تمام عمر نواب صاحب کی قلمی بحثیں رہیں، لیکن جب انھیں مولانا کے انتقال کی خبر ملی تو اسی وقت تمام دفاتر بند کرنے کا حکم جاری کردیا اور تعزیت کے لیے خود فرنگی محل تشریف لے گئے۔

الزامات اور سلب اختیارات

نواب صاحب کے بے شمار حاسد بھی تھے، جن کے لیے ان کی علمی سرگرمیاں بھی ناقابل برداشت تھیں اور ان کا دنیوی جاہ ومرتبہ بھی شدید ذہنی اذیت کا باعث تھا۔ انھوں نے انگریزی حکومت سے ان کے متعلق اس قسم کی شکایات کا سلسلہ بہت وسیع کردیا تھا کہ ان کے والد (سید اولاد حسن) کا تعلق سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی جماعت مجاہدین سے تھا جو انگریزی حکومت کے خلاف برسر پیکار تھی اور اب بھی سرحد پار کے قبائلی علاقوں میں وہ لوگ انگریزوں سے جہاد میں مصروف ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں بھی اپنے والد کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ وہ

جماعت مجاہدین کے حامی اور انگریزی حکومت کے مخالف ہیں۔ انبالہ وغیرہ کے وہابی مقدمات کے قیدیوں (مولانا احمد اللہ عظیم آبادی، مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی، مولانا محمد جعفر تھانیسری اور ان کے رفقائے کرام کا) معاملہ بھی جنھیں کالے پانی بھیج دیا گیا تھا، انگریزی حکومت کے سامنے تھا، اس لیے انگریزی حکومت ان شکایات سے متاثر ہوئی اور نواب صاحب کو منصب نوابی سے علیحدہ کر دیا گیا۔

نواب صاحب کے خلاف حسب ذیل الزامات عائد کیے گئے:

① ...... ترغیب جہاد اور انگریزی حکومت کی مخالفت

② ...... وہابیت کی تبلیغ یعنی لوگوں کو انگریزوں کے خلاف بغاوت پر اکسانا

③ ...... والیہ بھوپال نواب شاہ جہاں بیگم کو پردہ نشین کر کے ریاست کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لینا۔

④ ...... جاگیروں کی ضبطی

⑤ ...... ریاست کے بندوبست میں سختی کرنا۔

اسی قسم کے چند اور الزامات لگائے گئے تھے۔

نواب صاحب کو ۱۰۔ شعبان ۱۲۸۹ھ (۱۳۔ اکتوبر ۱۸۷۲ء) کو نوابی کا خطاب اور دیگر اختیاریات دیے گئے تھے۔ پھر تیرہ سال بعد ۱۴۔ ذیقعدہ ۱۳۰۲ھ (۲۶۔ ستمبر ۱۸۸۵ء) کو تمام اختیارات سلب کر لیے گئے۔ نوابی کا خطاب بھی واپس لے لیا گیا۔ اس کے بعد صرف اتنا ہوا کہ نواب صاحب کی اہلیہ محترمہ نواب شاہ جہاں بیگم کی کوششوں سے ابتدائے ذی الحجہ ۱۳۰۷ھ (اگست ۱۸۹۰ء) کو نوابی کا خطاب حکومت برطانیہ نے بحال کر دیا تھا۔ ❶

حلیہ

یہاں نواب صاحب کے حلیے، لباس اور اخلاق وعادات کے متعلق چند امور کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ان کا حلیہ یہ تھا: مناسب قد وقامت، سرخ وسفید رنگ، بھرا ہوا خوب صورت چہرہ، کشادہ پیشانی، روشن آنکھیں، چوڑے شانے، جاذبِ نظر ناک نقشہ، بارعب شخصیت کے مالک۔ مردانہ وجاہت کے دل کش پیکر۔ رنگ اس قدر گورا چٹا کہ پہلی نظر میں دیکھنے والے کو انگریز معلوم ہوتے تھے۔ چناں چہ ۱۸۵۷ء کے شدید ہنگامے کے زمانے میں جب وہ سخت مالی پریشانی

---

❶ نواب صاحب نے اپنے حالات اپنی متعدد کتابوں میں تحریر کیے ہیں۔ ابقاء المنن تو پوری کتاب انہی کے حالات پر مشتمل ہے اور یہ ان کی اپنی تصنیف ہے۔

میں مبتلا تھے، ایک صاحب کے گھر بلگرام میں مقیم تھے اور ہندوستان کے لوگ انگریزوں کے خلاف بغاوت میں اتنا آگے نکل گئے تھے کہ انھیں دیکھنا گوارا نہ کرتے تھے۔ ایک دن نواب صاحب دریائے گنگا کے کنارے غسل کر رہے تھے کہ ادھر سے چند ہندوستانیوں کا گزر ہوا۔ انھوں نے انگریز سمجھ کر بندوق کی نالی ان کی طرف کر دی۔ اچانک ایک کسان نے دیکھ لیا۔ وہ اونچی آواز میں پکارا دیکھنا گولی نہ چلانا۔ یہ بڑے حضرت صاحب کے صاحب زادے ہیں، میں انھیں برسوں سے جانتا ہوں۔ یہ سن کر وہ لوگ آگے بڑھ گئے اور نواب صاحب کی جان بچ گئی۔ یوں سمجھیے کہ زندگی دوبارہ ملی۔ اس کے بعد انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی نعت کے طور پر ''القصیدۃ العنبریہ فی مدح خیر البریہ'' کے عنوان سے عربی میں ایک طویل قصیدہ قلم بند فرمایا اور اس قصیدے نے ان کی عربی تصانیف میں نمایاں جگہ پائی۔

لباس اور عادات واطوار

اب نواب صاحب کے لباس اور عادات واطوار کے بارے میں ان کے بڑے صاحب زادے نواب علی حسن خاں کی زبانی سنیے جن کی وضاحت انھوں نے اپنی تصنیف مآثر صدیقی کے حصہ چہارم میں کی ہے۔

لباس سادہ اور سفید بہت پسند تھا۔ کبھی رواج کے مطابق مختلف الوان اور نیم رنگ لباس بھی پہن لیا کرتے تھے۔ البتہ اس کا خیال رہتا تھا کہ لباس خوش وضع اور خوش قطع ہو اور عطر سے معطر ہو۔ عیدین کو عربی لباس زیب تن فرماتے تھے۔

خود فرماتے ہیں: ''عربیت نسب اور عربیت زبان دونوں چیزیں ہمارے لیے باعث فخر ہیں۔'' کرتہ گھنڈی دار نیچی چولی کا، دہلی کی وضع کا انگرکھا۔ دہلی کی وضع ہی کی گول ٹوپی اور قدرے تنگ پائنچے کا پاجامہ زیب تن فرماتے تھے۔ جوتا زیادہ تر امرتسر کا پنجابی ساخت کا استعمال کرتے تھے۔

ذہن کے صاف اور دل کے غنی تھے۔ شیریں بیان، شریف الطبع اور حسن اخلاق کا عمدہ ترین نمونہ تھے۔ حیا اور تواضع میں ان کے دور میں کوئی شخص ان کا ثانی نہ تھا۔ حلم اور بردباری غصے پر غالب تھی۔ بے حد منصف مزاج تھے۔ اپنے مخالفین سے نہایت نرمی سے پیش آتے تھے۔ اہل علم کی بہت ہی تعظیم وتکریم کرتے تھے۔

خود ابقاء المنن میں فرماتے ہیں:

''چوں کہ اللہ تعالیٰ نے حسن عمل اور سوءِ عمل کو میزانِ سعادت وشقاوت قرار دیا ہے، اس لیے میرا دل یہی چاہا کرتا ہے کہ مجھ سے وہ فعل ظہور میں آئے جو میرے معبودِ حقیقی

وحدہ لاشریک کو پسندیدہ ہو۔"

ابقاء المنن میں مزید فرماتے ہیں:

"صحبت اہل جہاں سے تہہ دل سے بے زار رہتا ہوں اور اہل علم کی صحبت کو دوست رکھتا ہوں ...... ایسے لوگوں کی صحبت ہو جو مذاکرۂ علمی یا ذکر الٰہی کریں۔"

اپنے احباب کے ساتھ بہت ہی خلوص ومحبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ احسان کے بدلے میں دوگنا چوگنا احسان کرنے کی سعی فرماتے۔

اکثر نمازِ جمعہ خود پڑھایا کرتے۔ رمضان المبارک میں تراویح ہمیشہ آٹھ رکعت پڑھتے اور نماز تہجد بارہ رکعت ...... نمازِ فجر کے بعد تلاوتِ قرآن اور مختلف ادعیہ کی پابندی کرتے۔ تقویٰ وتورّع کے اوصاف ان کے مزاج میں راسخ ہو چکے تھے۔

شرم وحیا کا اتنا غلبہ تھا کہ کسی بڑے یا چھوٹے مرتبے کے آدمی سے آنکھ ملا کر بات نہیں کرتے تھے۔ دوسرے سے گفتگو کرتے وقت نگاہ ہمیشہ نیچی رکھتے۔

صلہ رحمی کا بہت خیال رکھتے۔ بعض لوگ بہ طور قرض روپیہ لیتے اور پھر واپس نہیں کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کو وہ قرض معاف کردیتے تھے۔ اپنے رشتے داروں سے بے حد محبت کا سلوک کرتے۔

روزانہ کے معمولات

نواب صاحب کے روزانہ کے معمولات یہ تھے کہ نمازِ فجر سے پہلے جاگتے اور تہجد پڑھتے۔ نمازِ فجر کے بعد تلاوت قرآن اور وظائف میں مشغول ہوجاتے۔ اس سے فارغ ہو کر ایک گھنٹا وقائع نویسوں کی باتیں سنتے اور ریاست کے متعلق ضروری ہدایات دیتے۔ پھر تصنیف وتالیف میں مصروف ہوجاتے۔ دوپہر کے وقت کھانا تناول فرماتے اور کھانے کے بعد تھوڑی دیر قیلولہ کرتے۔ پھر نماز ظہر پڑھ کر ریاستی معاملات میں مشغول ہوجاتے۔ اس اثنا میں نمازِ عصر کا وقت ہوجاتا تو نماز پڑھ کر سیر وتفریح کے لیے تشریف لے جاتے۔ مغرب کی نماز کے بعد ضروری خبریں سنتے۔ پھر بچوں کو اور دوسرے شائقین کو تقریباً ایک گھنٹا قرآن وحدیث کا درس دیتے۔ بعض دفعہ علمائے کرام بھی درس میں شرکت کرتے۔ درس کے بعد بسا اوقات شعر وشاعری کا دور بھی چلتا۔ نماز عشا کے بعد کھانا کھا کر سوجاتے۔

نواب صاحب دورِ طالب علمی میں دہلی میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے گھر پر رہے تھے۔ اس پر وہ ان کے نہایت شکر گزار تھے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے نواب مصطفیٰ شیفتہ کو گرفتار کرکے قید میں ڈال دیا تو نواب صاحب کو بے حد ذہنی اذیت پہنچی اور بھاگ دوڑ کرکے انھیں قید سے رہائی دلائی۔

مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے نواب صاحب کی علمی بحثیں جاری رہتی تھیں۔ مولانا عبدالحی صاحب کی وفات کا پتا چلا تو نواب صاحب نے نہایت حزن وملال کا اظہار فرمایا اور ان کی تعزیت کے لیے لکھنؤ کے فرنگی محل پہنچے، جہاں مولانا ممدوح سکونت پذیر تھے۔ فرمایا: آج آفتابِ علم غروب ہوگیا۔ ہمارا اور ان کا اختلاف فقط تحقیقاتِ مسائل تک محدود تھا۔ مولانا کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی۔ ❶

حیاتِ طیبہ کے آخری ایام اور وفات

اب نواب صاحب کی حیاتِ طیبہ کے آخری ایام اور سانحہ موت کا تذکرہ اس کے شاگرد رشید سید ذوالفقار احمد نقوی بھوپالی کی زبانی سنیے۔ سید ذوالفقار احمد نقوی بھوپال کے ممتاز عالم اور وہاں کے مجلس علما کے رکن اعظم تھے۔ ان کا تذکرہ میں اپنی کتاب ''برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن'' میں کرچکا ہوں۔ علمائے برصغیر کے حالات کے سلسلے میں ان کی ایک کتاب کا نام ''قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب'' ہے۔ یہ کتاب اردو زبان میں ہے اور کتب حوالہ میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے نواب صاحب کے آخری ایام اور وفات کے متعلق اس کتاب میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ نواب صاحب نے ۱۷۔ فروری ۱۸۹۰ء کو وفات پائی اور سید ذوالفقار احمد نقوی ان کی وفات سے ۳۱ سال سات مہینے تین دن بعد ۲۴۔ ستمبر ۱۹۲۱ء کو فوت ہوئے۔ اب سید ذوالفقار احمد نقوی کی تحریر ملاحظہ ہو۔

> ''شیخنا المرحوم کی آخری تالیف کتاب ''مقالات الاحسان'' ہے۔ یہ کتاب ترجمہ ہے فتوح الغیب کا جو کہ سیدنا ومولانا حضرت سید عبدالقادر گیلانی رحمہ اللہ کی تالیف ہے۔ جب اس کا طبع ہونا شروع ہوا تو میں نے اور انھوں نے اس کا مقابلہ کیا۔ جب صحت نامہ کا وقت آیا تو وہ بیمار تھے۔ میں نے اور ایک اور شخص نے اس کا مقابلہ ان کے روبرو کیا۔ مرض استسقا ہوگیا تھا۔ نہایت ایذا ہوئی مگر بڑے مستقل مزاج تھے۔ وفات کے وقت تک استقلال رہا۔ ہراس اور بے صبری کا کلمہ ہرگز زبان سے نہیں نکلا۔ ایام بیماری میں شب کو میں ان کے پاس رہتا تھا۔ رات کو نیند نہیں آتی تھی اور نہ لیٹا جاتا تھا۔ پلنگ پر قبلہ رخ بیٹھے رہتے۔ سامنے تکیے رکھ لیتے تھے، ان پر سر رکھ لیا، کبھی اٹھا لیا۔ اسی طرح ساری رات بسر ہوتی تھی۔ اکثر یا ارحم الرحمین کہتے تھے۔ بیماری کی اتنی شدت کہ لکھنے کی طاقت نہیں مگر علم کا شوق وہی ...... مجھ سے کہا بھائی تم آخر اور جگہ بیٹھ کر لکھتے ہو ہمارے

---

❶ ملاحظہ ہو کتاب ''نواب صدیق حسن خاں'' (از ڈاکٹر رضیہ حامد، صفحہ: ۱۳۱، ۱۳۲)

سامنے ہی لکھا کرو۔ میں اس وقت مرأۃ النسواں لکھتا تھا۔ پس میں نے ان کے روبرو لکھنا شروع کیا۔ ظہر سے عصر تک ان کے کمرے میں لکھتا، پھر گھر جاتا، بعد عشا کے پھر آ جاتا تھا۔ رات کو بھی چراغ کے روبرو بیٹھ کر ان کے سامنے لکھتا تھا۔ اس سے ان کو اُنس ہوتا۔ اس اثنا میں باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ کئی دنوں سے اسی طرح ہوتا تھا۔ کبھی فرماتے بھائی آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو مثل دوا کے کہ جب بیمار ہوں تو ان کی حاجت ہو اور ایک مثل غذا کے کہ کسی حالت میں اس سے چارہ نہیں ہے۔

"میری یہی مثال ہے۔ غرضیکہ چہار شنبہ بست و نہم ماہ جمادی الاخریٰ ۱۳۰۷ھ کو ناگاہ جی میں آیا کہ آج ۳ بجے سے ان کی پاس جاؤں۔ چناں چہ جلدی سے کھانا کھا کر ان کے پاس حاضر ہوا تو تکیے پر سر رکھے ہوئے تھے۔ میں نے سلام کیا تو سلام کا جواب دیا اور فرمایا اچھا ہوا سویرے آ گئے۔ پھر باتیں کرتے رہے۔ بے قراری زیادہ تھی۔ دوا علاج ہوتا رہا، مگر کچھ نفع نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح ہوتے ہوتے رات کے بارہ بج گئے۔ اس وقت یا اس سے قبل کہا بھائی آگرہ سے ہماری کتاب نہیں آئی۔ میں نے کہا وہ چھپ گئی۔ اس کا صحت نامہ بھی تیار ہو کر آ گیا۔ فرمایا اچھا ہوا۔ مہینا پورا ہوا اور ہماری تالیف بھی پوری ہوئی۔ پھر کوئی دوا لایا تو پی لی۔ ذرا دیر بعد میں نے کہا کچھ آپ کو تسکین ہے؟ فرمایا کسی قدر......! پھر کہا اب دوا نہیں پئیں گے۔ اتنے میں ایک بج گیا۔ ذرا دیر بعد بے قراری ہوئی تو بسرعت ٹوپی سر سے اتار کر ڈال دی اور ذرا پاؤں پھیلائے اور چہرے پر پسینہ آیا۔ بکشادہ پیشانی بکمال درستیٔ ہوش وحواس جان بحق تسلیم کی۔ اس وقت ایک بجے پر ۳۵ منٹ ہو گئے تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد نماز صبح غسل دیا گیا۔ نماز جنازہ میں ایک خلق کثیر تھی۔ کئی بار نماز ہوئی۔ بروز پنجشنبہ یکم رجب ۱۳۰۷ھ (۱۸۔ فروری ۱۸۹۰ء) کو قبل دوپہر اپنے خاص قبرستان میں مدفون ہوئے۔"

نواب صاحب نے عیسوی حساب سے ۵۷ برس چار مہینے چار دن اور ہجری حساب سے ۵۹ برس ایک مہینا نو دن عمر پائی۔

کتب خانہ اور اولاد

نواب صاحب کا بہت بڑا کتب خانہ تھا جو ان کی وفات کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

نواب صاحب کی اولاد دو بیٹے تھے اور ایک بیٹی۔ بیٹوں میں سے ایک کا نام سید نور الحسن خاں

کلیم تھا اور چھوٹے کا سید علی حسن خاں طاہر۔ ذیل کی سطور میں دونوں کا مختصر الفاظ میں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

سید نور الحسن خاں کلیم بدھ کے روز ۲۱۔ رجب ۱۲۷۸ھ (۲۳۔ مارچ ۱۸۶۲ء) کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ان کی پرورش خدا ترسی، علم دوستی اور صلاح وتقویٰ کے اس ماحول میں ہوئی جس میں قرآن وحدیث کی صدائیں گونجتی تھیں۔ سید نور الحسن خاں کلیم نے جن اساتذہ کرام سے تعلیم حاصل کی وہ علم وعمل کے اعتبار سے اپنے دور کے عظیم لوگ تھے اور وہ تھے قاضی ایوب بن قمر الدین پھلتی، قاضی انور علی لکھنوی، مولوی الٰہی بخش فیض آبادی، مولانا بشیر الدین عثمانی قنوجی، مولانا محمد بشیر سہسوانی، قاضی محمد بن عبدالعزیز جعفری، شیخ حسین بن محسن انصاری اور خود ان کے والد عالی قدر نواب صدیق حسن خاں۔

سید نور الحسن خاں فارسی اور اردو کے شاعر بھی تھے اور کلیم تخلص کرتے تھے۔ آخر عمر میں تصوف سے زیادہ شغف ہوگیا تھا اور امورِ خیر کی انجام دہی میں مشغول رہتے تھے۔ مصنف بھی تھے اور جو کتابیں تصنیف کیں، ان کا تعلق صالحین امت کے واقعات اور حسنات کی ترغیب سے ہے۔ اردو اور فارسی کے شعرا کے تذکرے بھی لکھے۔ مثلاً تذکرۂ طور کلیم، تذکرہ شعراء الفرس، تذکرۂ شعراء ہند، تذکرۂ نگارستانِ سخن، یہ تذکرے فارسی زبان میں ہیں۔ ایک ضخیم کتاب کا نام ''مجموعۂ رسائل'' ہے۔ اس میں تصوف کے بعض موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔

آخر عمر میں بالکل خانہ نشین ہوگئے تھے اور فقیرانہ زندگی بسر کرنے لگے تھے۔ اپنے والد محترم نواب سید صدیق حسن خاں کی کتابوں کا بہت بڑا خزانہ ان کے سامنے تھا، اس سے استفادہ کرتے رہتے تھے۔ نواب شاہ جہاں بیگم کے انتقال کے بعد بھوپال سے لکھنؤ چلے گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۱۳۳۰ھ (۹۶۔۱۸۹۵ء) میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ [1]

نواب صاحب کے دوسرے بیٹے نواب سید علی حسن خاں تھے جو ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ علومِ متداولہ کی تحصیل متعدد مشہور اساتذہ سے کی۔ فارسی کے شاعر تھے اور طاہر تخلص تھا۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ تصانیف یہ ہیں: ① مآثر صدیقی موسوم بہ سیرت والا جاہی۔ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے والد گرامی سید نواب صدیق حسن خاں کے حالات خاصی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ ② شریعۃ الاسلام، ③ فطرۃ الاسلام، ④ سیرۃ الاسلام،

[1] یہ حالات ڈاکٹر رضیہ حامد کی تصنیف ''نواب صدیق حسن خاں۔ حیات، علمی، ادبی، سیاسی، اور مذہبی خدمات'' سے لے گئے ہیں۔ صفحہ ۲۲۰، ۲۲۱۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۸۳ء میں دہلی سے طبع ہوئی تھی۔

⑤ المدنیۃ فی الاسلام، ⑥ اسلام اور اس کا طریق عبادت، ⑦ انتظام خانہ داری، ⑧ نالۂ دل، ⑨ خرمن گل، ⑩ تعلیم وتربیت، ⑪ البیان۔

۱۹۔ نومبر ۱۹۳۶ء (۳۔ رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ) کو اپنی کوٹھی بھوپال ہاؤس لال باغ لکھنؤ میں ۲۷ برس کی عمر میں وفات پائی۔

سید احمد حسن عرشی

اب نواب صاحب کے بھائی سید احمد حسن عرشی کے مختصر حالات ملاحظہ ہوں جو نواب صاحب سے عمر میں دو سال بڑے تھے۔ ۱۹۔ رمضان ۱۲۴۶ھ (۳۔ مارچ ۱۸۳۱ء) کو قنوج میں پیدا ہوئے۔ آغازِ تعلیم گھر ہی میں ہوا۔ پھر تکمیل علوم کان پور، فرخ آباد، بریلی اور علی گڑھ میں ہوئی۔ علی گڑھ میں حضرت شاہ عبدالجلیل سے سلسلۂ تعلیم جاری رہا جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزی حکومت سے جہاد کرتے ہوئے علی گڑھ میں جامِ شہادت نوش کیا۔ کتب حدیث شیخ عبدالغنی مجددی دہلوی سے ان کے زمانۂ قیام مدینہ منورہ میں پڑھیں۔ اسی دور میں شیخ محمد عابد سندھی (متوفی ماہ ربیع الاوّل ۱۲۵۷ھ) سے سند واجازۂ حدیث حاصل ہوا۔ دہلی کے بعض علمائے کرام سے بھی استفادہ کیا۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی اور اردو میں مرزا غالب سے مشورۂ سخن حاصل تھا۔ خود فرماتے ہیں:

مغلوب ہیں سب اہل جہاں میرے سخن سے
ہوں زلہ رُبا غالب اعجاز رقم کا

زیارت حرمین شریفین کے بے حد شائق تھے۔ تیسری مرتبہ بہ ارادۂ حج گھر سے روانہ ہوئے۔ بڑودہ میں مولوی غلام حسین بن مولانا رستم علی قنوجی کے مکان پر ٹھہرے۔ وہیں شدید بخار میں مبتلا ہو کر سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔ یہ حادثہ ۹۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ (۲۳۔ نومبر ۱۸۶۰ء) کو پیش آیا۔ صرف تیس سال عمر پائی۔ ❶

اللھم اغفرلھم وارحمھم وعافھم واعف عنھم

ایک عجیب واقعہ

نواب صاحب کی وجہ سے بہت سے اہل علم بھوپال آئے اور بھوپال نے مجمع علما اور مرکز شعرا کی حیثیت اختیار کرلی۔ ان میں سے متعدد حضرات کا تذکرہ ڈاکٹر رضیہ حامد نے اپنی کتاب ''صدیق

❶ تراجم علمائے حدیث ہند۔ صفحہ ۲۷۴ تا ۲۷۶۔ (مطبوعہ کراچی)

حسن خاں" میں کیا ہے۔ ان بزرگانِ ذی احترام میں سے ایک بزرگ مولوی قدرت اللہ قدرت تھے جو اپنے دور کے مشہور شاعر اور عالم دین تھے۔ ان کا خاندان ہمیشہ فضل وکمال اور شعر وادب میں ممتاز رہا۔ ۱۹۷۳ء میں ہندوستان کے منصب نائب صدارت پر جسٹس ہدایت اللہ فائز تھے، وہ مولوی قدرت اللہ قدرت کے حقیقی پوتے تھے۔ نواب صاحب سے مولوی قدرت اللہ قدرت کے گہرے مراسم تھے اور مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کے مدرسے میں نواب صاحب اور مولوی قدرت اللہ صاحب ہم مکتب تھے اور دونوں کے حجرے بھی قریب قریب تھے۔ اب ایک عجیب واقعہ ملاحظہ فرمایئے جو ڈاکٹر رضیہ حامد نے تحریر فرمایا ہے۔ یہ واقعہ مولانا سید عبدالخالق نقوی پروفیسر عربی اسکول آف فارن لنگویجز دہلی نے محترمہ مصنفہ کے والد مکرم سید فتح علی صاحب سے بیان کیا تھا۔

ایک دن مولوی قدرت اللہ صاحب فجر کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں جانے لگے تو دیکھا کہ صدیق حسن خاں سردی میں ٹھٹھر رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے ان پر اپنا دوشالہ اڑھا دیا۔ گرمی حاصل ہوئی تو صدیق حسن خاں کو نیند لگ گئی۔ جب نیند کھلی تو درس شروع ہو چکا تھا۔ وہ درس میں پہنچے تو مولانا فضل الرحمٰن نے فرمایا: "کہیے نواب صاحب! اب تشریف لا رہے ہیں۔"

یہ بات صدیق حسن خاں کی طبیعت پر گراں گزری اور وہ اپنے حجرے میں آ کر ہچکیوں سے رونے لگے۔ مولوی قدرت اللہ نے جا کر حال معلوم کیا تو انھوں نے مولانا کے الفاظ سنائے اور انھیں طنز قرار دیا۔ لیکن مولوی قدرت اللہ یہ جملہ سن کر محظوظ ہوئے اور بولے: "ارے روتا کیوں ہے۔ دیکھنا حضرت کا کہنا سچ ثابت ہوگا اور تو ایک دن نواب بنے گا۔" پھر مولوی صاحب نے ایک پرچہ ان کو لکھ کر دیا کہ جب صدیق حسن خاں نواب ہوں گے تو قدرت اللہ کو ایک سو چودہ روپے کی نوکری دیں گے۔ صدیق حسن خاں نے اس پرچے پر دستخط کر دیے اور بات ختم ہوگئی۔

حصول تعلیم کے بعد تلاش معاش کے لیے صدیق حسن خاں بھوپال آئے اور مولوی قدرت اللہ میسور چلے گئے۔ جب شاہ جہاں بیگم سے صدیق حسن خاں کی شادی ہوگئی تو قدرت اللہ نے بھوپال کا رخ کیا اور نواب صدیق حسن خاں کے پاس تشریف لائے اور وہ پرچہ انھیں دکھایا۔ نواب صاحب بہت خوش ہوئے اور فوراً ان کو ایک سو چودہ روپے ماہانہ پر مہتمم کوٹھیات کے عہدے پر مقرر فرما دیا۔ ❶

❶ نواب صدیق حسن خاں، صفحہ ۱۷۵، ۱۷۶۔

وفات پر اظہار حزن وملال

نواب صاحب کی وفات پر بہت سے اصحابِ قلم نے نظم ونثر میں اظہارِ حزن وملال کیا۔ ان سب کا تذکرہ تو مشکل ہے البتہ ایک عالم وشاعر منشی جمیل احمد سہوانی کا مرثیہ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن مرثیہ پڑھنے سے پہلے چند الفاظ میں ان کا تعارف ہوجانا چاہیے، نیز ان کے دوچار اشعار بھی پڑھ لیے جائیں جن سے ان کے رنگ غزل گوئی کا پتا چلے گا۔

منشی جمیل احمد سہوانی ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) میں بھوپال آئے۔ یہیں تعلیم پائی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر بھوپال میں ملازمت اختیار کرلی اور کئی عہدوں پر مامور رہے۔ شعروسخن کی صلاحیت رکھتے تھے اور غزل وقصیدہ دونوں میں امتیاز حاصل تھا۔ آخر عمر میں اپنے وطن سہوان چلے گئے تھے۔ وہیں ۱۹۳۵ء میں وفات پائی۔ اب غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں ......

کیا پوچھتے ہو داغ یہ دل میں کہاں کہاں کے ہیں
کچھ آپ کے دیے ہوئے کچھ آسماں کے ہیں

کچھ بلبلوں کو یاد ہیں کچھ قمریوں کو حفظ
عالم میں ٹکڑے ٹکڑے مری داستاں کے ہیں

یاروں سے چھپ کے آپ کہاں جائیں گے جمیل
ہم بھی سمجھ گئے ہیں ارادے جہاں کے ہیں

منشی جمیل احمد سہوانی نے نواب صدیق حسن خان کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا تھا جس کا انداز مولانا حالی کے اس مرثیے کا سا تھا جو انھوں نے غالب کی موت پر لکھا تھا۔ حالی جیسی زبان، وہی جذبہ خلوص، اور وہی سادگی وروانی۔ ملاحظہ فرمایئے:

اب کس کو ہم سخن اپنا سنائیں گے
کس کی زباں سے دادِ سخن پائیں گے

ڈھونڈیں گے گو زمانہ میں شاعر سخن شناس
ایسا نہ پائیں گے کوئی ایسا نہ پائیں گے

رکھتے تھے ہم نصیبوں سے امید بہتیری
اس کی خبر نہ تھی ہمیں یہ دن دکھائیں گے

بے قدریوں کا اپنی قلق ان کے غم کا رنج

کیا کیا ہم ان کے ہجر میں صدمے اٹھائیں گے
اوصاف ان کے یاد کریں گے تمام عمر
روئیں گے اور جلیسوں کو ان کے رلائیں گے
غم خواری کرنے والا تو دنیا سے اٹھ گیا
اب کس کو اپنے غم کی کہانی سنائیں گے
وقعت رہی اپنی نہ آبرو رہی
اے بے مزہ حیات فقط ایک تو رہی ❶

بابورام سکسینہ نواب صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

نواب صاحب موصوف عربی وفارسی کے بڑے عالم وفاضل اور اپنے زمانے کے مشہور مفسر اور محدث سمجھے جاتے تھے۔ مفتی صدر الدین آزردہ کے شاگرد تھے اور تقریباً ڈیڑھ سو ضخیم کتابوں کے مصنف تھے۔ شعرا اور اہل علم کے بڑے قدر دان تھے، اردو میں توفیق اور فارسی میں نواب تخلص کرتے تھے۔ ❷

تاریخ ادب اردو کے مصنف شہیر بابورام سکسینہ کو شاید نواب صاحب کی تمام تصانیف کا علم نہیں ہوسکا، ان کی عربی، فارسی، اردو کی کل تصانیف کی تعداد دو سوتیں کے قریب ہے، جن میں ڈیڑھ سو سے زائد کتابیں بڑی ضخیم اور کئی کئی جلدوں پر محیط ہیں۔ ایک تفسیر قرآن پندرہ جلدوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ لیکن اس کے باوجود نواب صاحب اپنی تصانیف کا ذکر نہایت منکسرانہ انداز میں کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے الفاظ قابل مطالعہ ہیں۔

”میری تالیفات کا غالب حصہ علماے راسخین کے تراجم اور آثارِ سلف کے نقول پر مبنی ہے جو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ یا نقل کیے گئے ہیں۔ جو کچھ میں نے اپنی تالیفات میں لکھا ہے وہ درحقیقت علماے سابقین اور ائمۂ امت کا علم ہے، نہ کہ میرا علم واجتہاد ہے۔ ❸

اصل مقصد زندگی

کتاب وسنت کی اشاعت اور بدعات ومحدثات کی بیخ کنی نواب صدیق حسن خاں کی

---

❶ نواب صدیق حسن خاں (از ڈاکٹر رضیہ حامد)، صفحہ: ۱۸۹ تا ۱۹۱۔
❷ تاریخ ادب اردو (عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور) صفحہ ۳۱۴۔
❸ ابقاء المنن، صفحہ: ۷۵

زندگی کا اصل مقصد تھا۔ چناں چہ ابقاء المنن (صفحہ ۵۴) میں تحریر فرماتے ہیں۔ میرا اگر بس چلتا تو میں یہ نیت رکھتا ہوں کہ نہ کسی کتاب کو جو مخالف کتاب اللہ ہوتی، روے زمین پر باقی رکھتا، نہ کسی بدعت کو جو متصادم سنت ہوتی، باقی چھوڑتا اور نہ کسی فن کو جہاراً اولیلاً ونہاراً عمل میں آنے دیتا ...... اور اگر ایسا وقوع میں آتا تو حدودِ شرع سے اس کا تدارک کرتا۔

چند واردین بھوپال علماے کرام

پہلے بتایا جاچکا ہے کہ نواب صاحب نے اپنے عہد کے بہت سے اہل علم کو بھوپال آنے کی دعوت دی اور وہ وہاں تشریف لائے اور متعدد اصحابِ فضل بھوپال کی علمی فضا کا شہرہ سن کر خود ہی وہاں تشریف لے گئے اور انھوں نے اس ریاست میں بے پناہ خدمات سرانجام دیں۔ ان حضرات کی طویل فہرست میں چند بزرگانِ ذی مکرمت کے اسماے گرامی یہ ہیں: شیخ حسین محسن یمانی، (متوفی ۱۳۲۷ھ) مولانا سید ذوالفقار احمد نقوی (۱۳۴۰ھ) شیخ محمد بن حسین انصاری یمانی (متوفی ۱۳۴۴ھ) مولانا محمد بشیر سہسوانی (متوفی ۱۳۲۳ھ) سید حسین شاہ واصف بخاری (متوفی ۱۲۸۵ھ) مولانا عبدالباری سہسوانی (متوفی ۱۳۰۳ھ) مولوی صابر حسین صبا سہسوانی (متوفی ۱۳۱۳ھ) مولانا یوسف علی لکھنوی (متوفی ۱۳۰۹ھ) مولانا سلامت اللہ جیراج پوری (متوفی ۳۰ ربیع الاوّل ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۵۔ جون ۱۹۰۴ء) ان حضرات میں سے صرف مولانا محمد بشیر سہسوانی نے جمادی الاخریٰ ۱۳۲۳ھ کو دہلی میں وفات پائی۔ باقی تمام حضرات بھوپال میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے حضرات واردِ بھوپال ہوئے اور پھر وہیں سکونت پذیر ہوگئے۔

بھوپال کی موجودہ حالت

ڈاکٹر رضیہ حامد کی کتاب (نواب صدیق حسن خاں) سے پتا چلتا ہے کہ اب بھوپال کو اہل علم کے خوب صورت مرکز کی حیثیت حاصل ہے اور وہاں متعدد لائبریریاں قائم ہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی دینی تعلیم کے لیے مدرسے جاری ہیں اور مسجدیں نمازیوں اور مصلحین و متعلمین سے بارونق ہیں۔

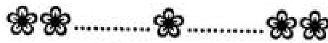
آخری گزارش

نواب صاحب برصغیر کے بہت بڑے مفسر، بہت بڑے محدث، بہت بڑے مصنف، بہت بڑے محقق، بہت بڑے مؤرخ، بہت بڑے ہم دردِ خلائق اور بہت بڑے مبلغ اسلام تھے۔ ان کے متعلق بہت کچھ لکھنا چاہیے اور بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ اس مضمون میں ان کی خدماتِ گوناگوں کے

بعض گوشوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اس کی روشنی میں سلسلۂ تحریر کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے اور ان شاء اللہ کوئی اہل علم آگے بڑھانے کی کوشش کریں گے۔ میں اپنی گزارشات محترمہ ڈاکٹر رضیہ حامد کے ان الفاظ پر ختم کرتا ہوں۔

نواب صدیق حسن خاں کے علمی کارناموں کی داستان اس یقین کے ساتھ ختم کی جاتی ہے کہ ان کے کارناموں کی صدائے بازگشت اس وقت تک سنی جاتی رہے گی جب تک دنیا کے کسی گوشے میں بھی حدیث پاک اور سنت نبویہ کا پیغام باقی ہے۔

نواب صاحب اپنے وقت کے مانے ہوئے انشا پرداز، محدث اور زبردست صاحب قلم اور صاحب نظر تھے۔ ان کی حیات ایک فراخ حوصلہ عالم، جوہر شناس بزرگ، بیدار مغز انسان اور باکمال صاحب قلم کی حیات ہے۔ ان کی شخصیت ایک دانش مند مفکر اور محقق عالم کے ساتھ ساتھ ایک حقیقت شناس اور منتظم حاکم کی شخصیت ہے۔ نواب صاحب کی ذاتِ باصفات میں اصابت فکر، دور اندیشی، دور بینی اور معاملہ فہمی نیز دین میں پختگی بہ درجۂ اتم موجود تھی۔ علومِ دین کے فروغ میں ان کے کارہائے نمایاں علمائے سلف کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ انھوں نے حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے طرزِ فکر کو ہندوستان سے متجاوز کر کے دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہنچایا اور عرب فضلا سے بھرپور داد و تحسین حاصل کی۔



سید ابوالخیر احمد برق حسنی لکھنوی

ہندوستان کے علمائے مشاہیر میں سے ایک بزرگ مولانا سید ابوالخیر احمد برق حسنی لکھنوی تھے، جو خانوادۂ سید احمد شہید رائے بریلوی سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مرحوم کے حقیقی ماموں زاد بھائی تھے۔ نہایت ذہین اور صاحب فضل وکمال شخص تھے۔ حدیث وآ ثار پر گہری نظر رکھتے تھے، اسی لیے انھیں طبقۂ علما میں ''حافظ الاحادیث والآ ثار'' کہا جاتا تھا۔ ہندوستان کے علمائے اہل حدیث میں انھیں عزت کا مقام حاصل تھا۔

دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ سے تعلیم حاصل کی تھی اور لکھنؤ ہی سے تعلق سکونت تھا۔ وہاں ان کی کچھ ذاتی زمین بھی تھی۔ ذہانت کی دولت بارگاہِ خداوندی سے عالم طفولیت ہی میں ودیعت فرمائی گئی تھی۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ صرف سات سال کی عمر کے تھے کہ ندوۃ العلماء کا ایک سالانہ جلسہ ہوا، جس میں متحدہ ہندوستان کے اکابر اہل علم موجود تھے۔ اس جلسے میں سید ابوالخیر احمد نے فصیح وبلیغ عربی میں تقریر کی، جس سے حاضرین جلسہ کے علاوہ علمائے کرام بھی بے حد متاثر اور حیران ہوئے۔ اس جلسے میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (مولانا ابوالکلام آزاد کے ''صدیق مکرم'') بھی موجود تھے۔ مولانا شروانی نے ان کی تقریر سن کر انھیں ایک سو روپیہ انعام دیا اور فرمایا یہ بچہ نادرۃ الدہر ہے۔ اس کا حق انعام ادا نہیں کیا جاسکتا۔ سو روپے کو اس زمانے میں بہت بڑی رقم سمجھا جاتا تھا۔

شاید یہ عربی تقریر کسی عالم نے انھیں لکھ کر دی ہوگی اور اچھی طرح یاد بھی کرائی ہوگی، لیکن اتنے بڑے مجمع عام میں اور علما کے سامنے جرأت سے بولنا اور خاص لہجے میں الفاظ زبان سے نکالنا بڑی ہمت کا کام ہے اور یہ ہمت اس بچے نے کی۔

سید ابوالخیر احمد نے موطا امام مالک حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگردِ رشید مولانا عبدالرحمٰن ڈوکمی بستوی سے پڑھا۔ دارالعلوم ندوہ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد لاہور آ کر اورئینٹل کالج میں داخلہ لیا۔ اس کالج میں اس وقت عربی کے ممتاز عالم مولانا عبدالعزیز میمنی کا سلسلہ فیض رسانی جاری تھا، ان سے کسب علم کیا اور یہیں مولوی فاضل کا امتحان دیا۔ بعد ازاں شام اور حجاز کو روانہ ہوئے۔ شام میں تین سال قیام رہا اور وہاں کے عظیم محدث شیخ بہجۃ البیطار سے درس حدیث لیا۔ شام سے مکہ معظمہ کا عزم فرمایا اور وہاں کے مدرسہ فخریہ عثمانیہ میں تفسیر وحدیث کا درس دینے لگے۔ ان

کے اس درس سے بے شمار اصحابِ علم نے استفادہ کیا۔ وہ لوگ ان کی ذہانت، علوم حدیث میں مہارت اور طریق تدریس سے نہایت متاثر تھے۔ کافی عرصہ مکہ معظمہ کے اس مدرسے میں ان کا سلسلہ تدریس جاری رہا۔ پھر مراجعت فرمائے وطن ہوئے اور اپنے آبائی گھر لکھنؤ آ گئے۔ اس وقت ان کی عمر انتیس برس کی ہوگئی تھی۔

لکھنؤ میں ان کا قیام بہت مختصر رہا۔ وہاں سے جامعہ ملیہ دہلی کا رخ کیا۔ جامعہ ملیہ میں اس زمانے میں مولانا محمد سورتی تفسیر قرآن کے استاذ تھے۔ مولانا سورتی عربی کے جلیل القدر عالم تھے۔ وہ سید ابوالخیر کے علم وفضل کی فراوانی سے انتہائی متاثر ہوئے۔ اسی بنا پر وہ سید ابوالخیر کو "الامام" کے لقب سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ ممتاز عالم ڈاکٹر تقی الدین ہلالی بھی سید ممدوح کو امام کہا کرتے تھے۔ یعنی امام فی العلم

جامعہ ملیہ سے سید ابوالخیر حیدر آباد (دکن) تشریف لے گئے اور کچھ مدت وہاں مقیم رہے۔ پھر لکھنؤ آ گئے اور باقی تمام زندگی لکھنؤ میں بسر کردی۔ لکھنؤ کے محلہ چکمنڈی مولوی گنج میں انھوں نے ہومیوپیتھی دواخانہ قائم کرلیا تھا۔ وہ اس طریق علاج میں مہارت رکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ ان کے علاج سے مریضوں کو شفا بخشتا تھا۔

سید ابوالخیر کا حافظہ مضبوط تھا اور اس میں بہت کچھ محفوظ تھا۔ اس اعتبار سے اسے علم وکمال کا خزانہ کہنا چاہیے۔ تفسیر، حدیث، اسماء الرجال، انساب، تاریخ، لغت، اشعار، مشتقات، زبان وادب، عربی اور اردو کے قواعد وغیرہ بے شمار باتیں انھیں زبانی یاد تھیں اور اس باب میں وہ درجہ امامت پر فائز تھے۔ اس موضوع پر ان کے معاصرین میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا، اسی لیے مولانا محمد سورتی اور ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی انھیں "امام" کہا کرتے تھے یعنی مدارسِ دینیہ کے تمام مروّجہ علوم میں ماہر کامل۔ انھیں ستر ہزار سے زائد حدیثیں مع اسناد وروات کے زبانی یاد تھیں۔ عربی اور اردو کے ہزاروں اشعار ان کی نوکِ زبان تھے۔ انگریزی زبان وادب سے بھی انھیں آشنائی تھی۔ کتبِ شیعہ پر بھی عبور حاصل تھا اور ان کی روایات کا وسیع ذخیرہ مع اسناد کے وہ بے تکلفی سے بیان فرمایا کرتے تھے۔ اپنے دور کے شاعر بھی تھے۔ ابتدا میں شمس تخلص کرتے اور شمس لکھنوی کہلاتے تھے۔ مشہور مناظر بھی تھے۔ بالخصوص شیعہ حضرات سے ان کی ٹکر رہتی تھی۔ گفتگو میں لکھنؤ کے بڑے بڑے شیعہ مجتہدین کا ناطقہ بند کردیتے تھے۔ علمی معلومات کے اعتبار سے چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔

تدریس، شعر وشاعری اور دیگر اوصاف کے علاوہ تصنیف وتالیف کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ بہت کچھ لکھا، لیکن افسوس ہے، ان کی تحریرات کی طباعت کا زیادہ اہتمام نہ ہوا، جس کی وجہ سے بعض مسودے ضائع ہوگئے۔ جو مسودات ان کی وفات تک محفوظ تھے، ان میں سے چند یہ ہیں۔

①...... النوادر۔

②...... گردش روزگار: اس کتاب پر انھیں بہت ناز تھا۔ اس کی زبان کو وہ الہامی قرار دیتے تھے۔

③...... حل مشکلات الحدیث: یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ باریک خط میں دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اپنے موضوع کی بے مثال کتاب ہے۔ کاش حدیث کے سلسلے کی یہ کتاب شائع ہوجائے۔

④...... تاثرات: یہ غالباً چھپ چکی ہے۔

⑤...... روز مرہ: یہ کتاب چھ سو صفحات پر محیط ہے۔ اردو زبان ولغت کی اصلاح سے متعلق ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اردو کے بڑے بڑے ماہرین اور سخن ور حضرات بھی تحریر اور گفتگو میں غلطی کر جاتے ہیں۔ کتاب میں اس ضمن کے اکثر مقامات کی نشان دہی کی گئی ہے۔

⑥...... تاریخ انگلستان۔

⑦...... رسالہ درعلم غیب۔

سید ابوالخیر احمد برق لکھنوی اعلیٰ اخلاق کے مالک اور ولی اللٰہی صفات سے متصف تھے۔ ان کی تاریخ ولادت کا علم نہیں ہوسکا۔ البتہ ان کی وفات ۲۔ جنوری ۱۹۷۰ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔

(یہ سطور ہندوستان کے مولانا عبدالمنان اثری شنکر نگری کے مضمون مطبوعہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' (لاہور) مورخہ ۱۵۔ جنوری ۱۹۷۱ء سے مستفاد ہیں۔)



مولانا عبدالقادر لکھوی

لکھوی خاندان کی تدریسی اور تصنیفی خدمات سے پنجاب کا ہر وہ شخص آگاہ ہے جو دینی علوم سے تھوڑی بہت دلچسپی رکھتا ہے۔ ان کی علمی خدمات کا سلسلہ حضرت حافظ بارک اللہ لکھوی سے شروع ہوا اور یہی علمی اعتبار سے اس خاندان کے رکن اعلیٰ ہیں۔ حافظ بارک اللہ لکھوی کے چار بیٹے تھے جن کے نام علی الترتیب یہ ہیں:

(۱) حافظ محمد لکھوی: بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں تفسیر محمدی، احوال الآخرت، زینت الاسلام، ابواب الصرف، حاشیہ (عربی) ابو داوٗد، حاشیہ (عربی) مشکوٰۃ شریف شامل ہیں۔

(۲) حکیم غلام محمد: اپنے دور اور علاقے کے مشہور حکیم تھے۔

(۳) حافظ محمد سلیم: انھوں نے لکھوکے کے قریب ایک گاؤں کری کالاں میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

(۴) حافظ محمد صالح: یہ لکھوکے سے تھوڑے فاصلے پر ایک گاؤں موضع طور میں قیام پذیر تھے۔

آگے ان چاروں بھائیوں کی اولاد کا سلسلہ چلتا ہے۔ ان میں سے حکیم غلام محمد کے بیٹے مولانا عبدالقادر لکھوی تھے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ مولانا عبدالقادر لکھوی، حضرت حافظ بارک اللہ لکھوی کے پوتے اور حافظ محمد لکھوی کے بھتیجے تھے۔ سلسلۂ نسب یوں ہے۔ عبدالقادر بن غلام محمد بن حافظ بارک اللہ۔

مولانا عبدالقادر لکھوی ۱۸۳۴ (۱۲۴۹ھ) میں بمقام لکھوکے پیدا ہوئے۔ ابتدا سے لے کر انتہا تک پوری مروجہ تعلیم اپنے خاندانی مدرسے لکھوکے میں حافظ محمد لکھوی سے حاصل کی جو ان کے حقیقی تایا تھے۔ بعد ازاں امرتسر کے مدرسہ غزنویہ میں حضرت امام سید عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے دوبارہ حدیث کی بعض کتابیں پڑھیں اور سند حدیث لی۔ اسی سلسلے میں وزیر آباد کا قصد کیا اور حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے حلقہ درس میں شامل ہوئے۔ ان سے بھی سند حدیث حاصل کی۔

مولانا عبدالقادر لکھوی حافظ قرآن بھی تھے۔ اس کے علاوہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، اصول حدیث، عربی ادبیات، صرف و نحو، معانی و بیان اور منطق و فلسفہ وغیرہ علوم کی وہ تمام کتابیں جلیل القدر علما و مدرسین سے پڑھ چکے تھے جو اس زمانے کے مدارس میں پڑھائی جاتی تھیں۔ جب صحیح

معنوں میں فارغ التحصیل ہوگئے تو انھوں نے اپنے خاندانی مدرسے لکھوکے میں تدریسی خدمات سرانجام دینا شروع کردیں۔

اس مدرسے کے پہلے باقاعدہ مدرس حافظ محمد لکھوی، دوسرے ان کے فرزند گرامی مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی اور تیسرے مولانا عبدالقادر لکھوی تھے۔ مولانا عبدالقادر لکھوی نہایت ذہین اور تبحر عالم دین تھے۔ علوم عالیہ و آلیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کے شب و روز قرآن و حدیث اور دیگر علوم کی تدریس میں گزرتے تھے۔

لکھوی خاندان کے اہل علم سے سنا ہے کہ وہ اس مدرسے میں تدریس کے صرف تین روپے ماہانہ وظیفہ وصول فرماتے تھے۔ وہ انتہائی سستا زمانہ تھا، گندم کی قیمت ایک روپیہ من تھی۔ اسی طرح روزانہ کے استعمال کی دوسری چیزیں بے حد سستے داموں ملتی تھیں۔ پھر اس دور کے اہل علم کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ بہت ایثار سے کام لیتے تھے۔ دنیوی حرص اور لالچ سے ان کا دامن صاف تھا۔ درس و تدریس اور خطابت و امامت وغیرہ کا کام وہ خالصۃً لوجہ اللہ کرتے تھے۔

مولانا معین الدین لکھوی کے جد امجد مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی سے لوگ کوئی مسئلہ پوچھتے تو وہ انھیں مولانا عبدالقادر لکھوی کی خدمت میں بھیج دیتے۔ فرماتے وہ علم اور عمر میں مجھ سے بڑے ہیں اور انھیں قرآن و حدیث اور علوم فقہ پر عبور حاصل ہے، وہ مسائل کو مجھ سے زیادہ سمجھتے ہیں، اس لیے ان کے پاس جاؤ اور انہی سے مسائل پوچھو۔ چنانچہ وہ انھیں مسائل بتاتے۔ کوئی زبانی مسئلہ پوچھنے کے لیے آتا، کوئی تحریری صورت میں مسئلے کا جواب طلب کرتا تھا، مولانا عبدالقادر لکھوی ہر سائل کو اس کے سوال کے مطابق جواب دیتے۔

مولانا عبدالقادر لکھوی پچاس سال شائقین علم کو قرآن و حدیث کی تعلیم دیتے رہے۔ اس اثنا میں ان سے بے شمار لوگوں نے تحصیل علم کی۔ ان کے مشہور تلامذۂ کرام میں مولانا عبدالواحد غزنوی، مولانا عبدالاوّل غزنوی، مولانا عبدالغفور غزنوی، مولانا عبدالوہاب دہلوی، مولانا صوفی کمال الدین ڈوگر نو (چھینبیاں والی ضلع فیروزپور) حافظ غلام محمد (شاہ کوٹ ضلع ملتان) مولانا محمد حسین لکھوی، مولانا خدا بخش واعظ، سید محبوب شاہ (ساکن لکھو، ضلع فیروزپور) مولانا نور احمد لکھوی وغیرہ شامل ہیں۔

مولانا عبدالقادر لکھوی کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی بیوی سے سعد اللہ، عبداللہ اور احمد اللہ پیدا ہوئے۔ دوسری شادی لدھیانہ کے لودھی خاندان میں حضرت حافظ محمد لکھوی کی سالی سے ہوئی۔ اس خاتون سے استاذ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی پیدا ہوئے اور دو بیٹیوں کی ولادت ہوئی، جن میں ایک بیٹی کا نام امت اللطیف تھا۔ یہ خاتون حضرت مولانا محمد علی لکھوی مدنی کی زوجہ محترمہ اور مولانا محی الدین لکھوی اور مولانا معین الدین لکھوی کی والدۂ مکرمہ تھیں۔

مولانا عبدالقادر لکھوی نے بلوغ المرام سے لے کر صحیح بخاری تک حدیث کی تمام کتابیں پڑھائیں اور دیگر علوم کی چھوٹی بڑی کتابیں بھی پڑھاتے رہے۔ اس کے علاوہ نہایت متقی، پرہیزگار اور پیکر خلوص تھے۔

نہایت لگن اور شوق سے خدمت تدریس سرانجام دیتے تھے۔ اس قسم کے سراپا خلوص علماے دین اب پیدا نہیں ہوں گے۔ لکھوکے میں مدرسہ محمدیہ (جامعہ محمدیہ) حافظ محمد لکھوی نے جاری کیا اور اس میں قرآن و حدیث کی تدریس کا آغاز فرمایا۔ اس اعتبار سے وہ اس مدرسے کے پہلے شیخ الحدیث ہوئے۔ دوسرے شیخ الحدیث ان کے فرزند گرامی مولانا محی الدین عبدالرحمٰن اور تیسرے مولانا عبدالقادر لکھوی ہیں جن کو یہ اعزاز حاصل ہوا۔ مولوی خدا بخش نے پنجابی اشعار میں ان حضرات کی تدریسی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ ان کے دو اشعار ہمارے دوست مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروزپوری مصنف تذکار لکھویہ نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۸۱ میں درج کیے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

دوجے عبدالرحمٰن تیجے عبدالقادر پیارے
جو رات دن تعلیم قرآن و حدیث دی کرن سہارے
صرف، نحو، تفسیر، حدیث اوتھوں پڑھ پڑھ لوکی جاون
ایہہ فیض وڈیرے عبدالقادر کولوں لوکی پاون

مولانا عبدالقادر لکھوی نے ۱۹۲۴ء (۱۳۴۲ھ) میں سفر آخرت اختیار کیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کی زندگی ہی میں ان کے عالی مرتبت صاحب زادے حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی نے اس مدرسے میں تدریسی خدمات سرانجام دینا شروع کردی تھیں۔ ان کا تذکرہ آئندہ سطور میں ملاحظہ فرمایئے۔



مولانا عطاء اللہ لکھوی

۱۹۳۷ میں پہلی مرتبہ مجھے حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی مرحوم و مغفور کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس وقت میں موضع لکھوکے سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر مرکز الاسلام میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے حلقہ درس میں شامل تھا۔ ایک روز ہم دو تین طالب علموں کو مرکز الاسلام سے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی لکھوکے لے گئے۔ ہمیں اس گاؤں کو دیکھنے کا بے حد شوق تھا جسے علم و علما اور درس و تدریس کے ایک معروف مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور جہاں مختلف اوقات میں بہت سی عظیم شخصیتوں نے تعلیم حاصل کی تھی۔

سردیوں کے دن تھے، ہم وہاں پہنچے تو گاؤں میں داخل ہونے والی گلی کے باہر ایک بہت بڑی چارپائی پڑی تھی بلکہ کہنا چاہیے کہ چار پایا پڑا تھا۔ میرے خیال میں وہ دس گیارہ فٹ لمبائی میں اور اتنا ہی چوڑائی میں ہوگا۔ بہت موٹے پائے، موٹے سیرو، موٹی ''باہئیں'' اور موٹے بان کا بنا ہوا۔ اسے وہ لوگ ''ماچا'' کہا کرتے تھے۔ اس پر دس بارہ آدمی بیٹھے تھے اور سب ایک ہی خاندان یعنی حضرت حافظ بارک اللہ لکھوی مرحوم کی اولاد سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں حضرت حافظ بارک اللہ لکھوی کے پوتے اور حضرت حافظ محمد لکھوی کے بیٹے مولانا محمد حسین لکھوی بھی شامل تھے۔

جو حضرات وہاں تشریف فرما تھے، وہ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کو جانتے تھے۔ اس لیے کہ اس سے کئی سال پہلے مولانا ممدوح وہاں طالب علم کے طور پر حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی سے تحصیل علم کرتے رہے تھے اور وہاں کے لوگ ان کی علمی، عملی اور معاشرتی زندگی سے آگاہ تھے۔ وہ اپنے مدرسے کے اس پرانے طالب عالم کو دیکھ کر بڑے خوش ہوئے اور بہت اچھی طرح ملے۔ انھیں معلوم تھا کہ اب وہ حضرت مولانا محمد علی لکھوی کے قائم کردہ مرکز الاسلام میں فریضہ تدریس سرانجام دے رہے ہیں۔

وہاں سے ہم مسجد میں گئے تو حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کی زیارت سے بہرہ مند ہوئے۔ اس وقت وہ عمر عزیز کی ۵۵ منزلیں طے کر چکے تھے۔ بھرا ہوا گداز جسم، چوڑا چہرہ، کھلی پیشانی، سرخی مائل گورا رنگ، مہندی لگی ہوئی داڑھی، پورا قد، سر پر ململ کا سفید عمامہ، سفید کھدر کی قمیص اور سفید کھدر کا ٹخنوں سے اونچا آدھی پنڈلی تک تہبند۔ ان کے پرانے شاگرد مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے ان کو سلام عرض کیا تو سلام کا جواب دے کر پنجابی میں قدرے بلند مگر مشفقانہ آواز میں مسکراتے

ہوئے فرمایا: مولوی عطاء اللہ آپ مرکز الاسلام آگئے ہیں۔ بہت اچھا ہوا، بہت اچھی جگہ ہے۔

ان چند تمہیدی الفاظ کے بعد مولانا عطاء اللہ لکھوی کے متعلق وہ معلومات جو میرے علم میں آئیں، شروع سے آخر تک ملاحظہ فرمائیے۔ ان کا مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے جو چوتھی پشت میں حضرت حافظ بارک اللہ لکھوی سے ملتا ہے۔ مولانا عطاء اللہ بن مولانا عبدالقادر بن حکیم حافظ محمد شریف بن حافظ بارک اللہ لکھوی۔

مولانا عطاء اللہ لکھوی ۱۸۸۲ء (۱۲۹۹ھ) میں بمقام لکھو کے (ضلع فیروز پور) پیدا ہوئے۔ چار پانچ سال کی عمر کو پہنچے تو ایک بزرگ قاری عبدالعزیز سے قرآن مجید پڑھا۔ پھر علوم دینیہ کی تعلیم کا آغاز کیا۔ ان کے والد مکرم حضرت مولانا عبدالقادر لکھوی کا وہاں کے مدرسہ محمدیہ میں سلسلۂ تدریس جاری تھا، ان سے حدیث و فقہ، صرف و نحو اور دیگر مروجہ علوم کی تحصیل کی۔ اس کے بعد لاہور آکر مدرسہ نعمانیہ کے استاذِ محترم مولانا غلام احمد سے استفادہ کیا۔ پھر امرتسر کے مدرسہ غزنویہ کا عزم کیا، وہاں حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے کتب حدیث پڑھیں۔ ۱۹۰۵ء میں اس عالی مرتبت عالم دین سے سند حدیث لی۔

اب مولانا عطاء اللہ لکھوی مروجہ علوم سے اگرچہ فارغ ہو چکے تھے، مگر وہ منطق و فلسفہ وغیرہ کی تکمیل کے لیے رام پور، بریلی اور سہارن پور وغیرہ کے مدارس میں پہنچے اور وہاں کے اساتذہ سے کئی سال حصول علم میں مشغول رہے۔ لیکن کس عالم سے کیا پڑھا اور کس مدرسے میں کتنا عرصہ رہے؟ اس کا علم نہیں ہوسکا۔

مولانا عطاء اللہ لکھوی، مولانا محی الدین لکھوی (متوفی ۲۷۔ فروری ۱۹۹۸ء) کے حقیقی ماموں تھے۔ میں نے ان کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے مولانا کے حالات معلوم کرنے کے لیے انھیں خط لکھا۔ انھوں نے ۲۸۔ صفر ۱۴۱۸ھ (۲۵۔ جون ۱۹۹۷ء) کو میرے خط کا جواب دیا جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"بخدمت جناب رفیق دیرینہ محترم محمد اسحاق بھٹی کوٹ کپوری

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ اما بعد: فللہ الحمد جمیعا

برادرم میں عرصہ ڈیڑھ سال سے بیمار ہوں۔ جگر کی خرابی ہے۔ بدن سے گوشت رخصت ہوگیا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بقایا ہے۔ کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے آپ کے مکتوب کا جواب جلدی نہیں لکھ سکا۔ آپ نے سوانح عمری کا جو سلسلہ شروع رکھا ہے آپ کے مزاج کے موافق اور دلچسپ ہے۔ بعض لوگوں کے لیے مفید بھی ہے۔ خالِ محترم مولانا عطاء اللہ صاحب کے متعلق عرض ہے کہ ہمارے پہلے بزرگ ایک ایک کرکے دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ کوئی ایسا بزرگ نہیں جن کے ہاں

کچھ معلومات مل سکیں۔ البتہ جو کچھ میرے علم میں ہے، وہ پیش خدمت کرتا ہوں۔

مولانا عطاء اللہ لکھوی استاد پنجاب

سادہ زندگی ...... سادہ لباس ...... سادگی کے پیکر

① ...... تاریخ ولادت نامعلوم۔ اندازاً والد رحمہ اللہ کے لگ بھگ

② ...... بنی بارک اللہ

③ ...... حصولِ علم کے لیے گھر سے نکلے۔ شاہی مسجد لاہور میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اساتذہ کے نام معلوم نہیں۔

پھر یوپی۔ سی پی کی جانب نکل کھڑے ہوئے۔ اس زمانے میں ریل گاڑی نہیں تھی۔ شیر شاہ صوری کی جنرل کچی شاہراہ چلتی تھی۔ جس پر ٹرام چلتی تھی۔ بعض گھوڑوں والی بگھیاں چلتی تھیں۔ لمبا صفر کیا۔ سالہا سال گھر سے دور رہے۔ گھر والے مایوس ہو چکے تھے کہ اچانک گاؤں پہنچ گئے۔ پنجابی بھول چکے تھے۔ لباس اور زبان تبدیل ہو چکے تھے۔ سب خاندان کے لوگوں کے لیے دوبارہ زندہ ہو گئے۔ اردو بولتے اور سب لوگ متعجب ہوتے۔ پانی پتی حفاظ کے لہجہ میں قرآن پڑھتے اور لوگوں کو محظوظ فرماتے۔

تلامذہ علماء

① ...... مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ

② ...... حافظ عبداللہ صاحب بڈھیمالوی غفر اللہ لہ

③ ...... حافظ احمد اللہ چھتوی طال ظلہٗ

④ ...... حافظ عبدالرحمٰن صافوی مرحوم

هذا ما عندي والله اعلم ۔"

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا عطاء اللہ لکھوی کی شادی مفسر قرآن حضرت حافظ محمد لکھوی کی صاحب زادی رقیہ بی بی سے ہوئی۔ اور مولانا ممدوح نے اسی مدرسہ محمدیہ میں پڑھانا شروع کیا جو حضرت حافظ محمد لکھوی نے اپنے گاؤں لکھوکے میں قائم کیا تھا اور جس کی مسند درس پر ان کے والد عالی قدر حضرت مولانا عبدالقادر لکھوی طویل مدت سے متمکن تھے۔ اب یہ دونوں باپ بیٹا (مولانا عبدالقادر لکھوی اور مولانا عطاء اللہ لکھوی) مدرسہ محمدیہ میں طلبا کو تعلیم دینے میں مصروف تھے۔

لکھوی علمائے کرام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خصوصیت ودیعت فرمائی گئی تھی کہ وہ تمام درسی علوم متداولہ میں عبور رکھتے تھے اور ان کی تدریس کی انھیں مہارت حاصل تھی۔ حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی خاص طور پر اس صفت سے متصف تھے۔ بے حد متواضع، نہایت منکسر، حسن اخلاق کا

حسین ترین پیکر، عالی کردار، بلند ہمت، طلبا کے انتہائی خیر خواہ اور کشادہ ذہن کے معلم۔ تکلف اور تصنع سے نفور۔ سادہ زندگی بسر کرتے اور سادہ لباس پہنتے تھے۔

فجر کی نماز پڑھانے کے بعد وہ قرآن کا درس دیتے، جس میں طلبا سے قرآن کے بعض مقامات کی نحوی ترکیبات اور صرفی تعلیلات پوچھتے۔ درس آسان زبان میں دیا جاتا تھا۔

موضع لکھوکے کے بالکل قریب ایک نہر تھی۔ مولانا ممدوح شام کے بعد طلبا کو نہر پر لے جاتے اور ان سے ''ابواب الصرف'' سے باب سنتے اور انھیں صرفی نحوی مسائل بتاتے۔ ایک موٹی لاٹھی ہاتھ میں رکھتے تھے جس کا اوپر کا سرا تھوڑا سا مڑا ہوا تھا، پنجابی میں اسے ''کھونڈا'' کہا جاتا ہے۔ چلتے وقت اسے چوڑائی میں کمر کے اوپر کر کے دونوں بازوؤں سے تھام لیتے۔ پھر نہر کے کنارے چل پھر کر یا کہیں بیٹھ کر طلبا سے مختلف علوم کے بارے میں سوال و جواب کا سلسلہ شروع فرما دیتے۔ جس طالب علم کا نام عبدالرشید ہوتا اسے بے تکلفی سے پنجابی میں فرماتے۔ ''او چھیدے تو بتا یہ کیا صیغہ ہے۔'' سیدھی اور صاف پنجابی میں بات کرتے۔ الفاظ کے استعمال میں تکلف کے بالکل عادی نہ تھے۔

تفسیر، حدیث، فقہ، عربی ادبیات، منطق، فلسفہ، معانی و بیان اور صرف ونحو وغیرہ تمام علوم کی کتابیں شروع سے لے کر آخر تک وہ بے شمار مرتبہ پڑھا چکے تھے اور یہ کتابیں ان کے ذہن میں اچھی طرح محفوظ ہو گئی تھیں۔ صرف ونحو میں بالخصوص وہ مرتبۂ امامت پر فائز تھے اور اس موضوع کے چھوٹے بڑے تمام مسائل پر مجتہدانہ نظر رکھتے تھے۔ بعض مشکل ترین صرفی ونحوی مسائل کے متعلق بذریعہ ڈاک دارالعلوم دیوبند سے ان سے سوالات پوچھے جاتے تھے اور وہ ان کے جواب ارسال فرماتے تھے۔ وہ صاحب تحقیق اور فاضل مدرس تھے۔ ان جیسے لائق مدرس اب پیدا نہیں ہوں گے۔

ان کی مجلس میں کوئی شخص کسی موضوع پر بات کرتا تو نہایت توجہ سے اس کی بات سنتے۔ اس کا انھیں علم بھی ہوتا تو اسے محسوس نہ کراتے اور بات سنتے سنتے فرماتے: ''اچھا جوان پھر کیا ہوا؟''

اہل علم کا بے حد احترام کرتے اور نہایت انکسار کے انداز میں ان کی باتیں سنتے۔ اگر کوئی خود ان کی تعریف کرتا تو ان کے چہرے پر جھجک اور شرم کے آثار نمودار ہو جاتے۔

مولانا سید محمد داؤد غزنوی خاندان لکھویہ کے اہل علم سے بے حد اکرام کا برتاؤ فرماتے تھے۔ حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے صاحب زادے حافظ شفیق الرحمٰن لکھوی نے اپنے والد محترم کی روایت سے ایک مرتبہ بیان کیا کہ تقسیم ملک سے تھوڑا عرصہ بعد جب کہ لوگ سخت پریشانی میں مبتلا تھے، اپنی زمینوں کی الاٹ منٹ کے سلسلے میں مولانا عطاء اللہ لکھوی لاہور تشریف لائے اور مولانا

داؤد غزنوی سے ملے کہ وہ کسی وزیر یا کسی اور سرکاری افسر سے کہہ کر انھیں اپنے گاؤں (لکھوکے) کی زمین کے بدلے میں زمین دلا دیں۔ مولانا غزنوی انھیں زمینوں کی الاٹ منٹ کے محکمے کے کسی بڑے اہل کار کے پاس لے گئے۔ مولانا لکھوی فرماتے ہیں کہ ''میں حسب معمول بالکل سادہ لباس میں تھا اور مجھے حکام سے ملنے اور کسی سلسلے میں ان سے گفتگو کرنے کے ادب آداب کا علم نہ تھا اور میں وہاں خاموش بیٹھا تھا، لیکن مولانا غزنوی نے اس اہل کار کے سامنے میری اتنی تعریف کی اور میرا ایسے الفاظ میں اس سے تعارف کرایا کہ مجھے شرم آنے لگی۔''

حافظ شفیق الرحمٰن لکھوی کسی زمانے میں دارالعلوم تقویۃ الاسلام (لاہور) میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ مولانا غزنوی کا انداز ان سے ہمیشہ شفقت کا رہا۔ مولانا نے کبھی ان کو نام لے کر نہیں پکارا، جب بھی ان سے بات کی انھیں ''حافظ صاحب'' کہہ کر مخاطب فرمایا۔

حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی مدرسہ محمدیہ (یا جامعہ محمدیہ) میں کم و بیش ۴۸ برس خدمت تدریس میں مشغول رہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس درس گاہ کو انھی کے طریقِ تدریس کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی اور بے شمار طلبا و علما نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیے اور انھیں ''استاذ پنجاب'' کا لقب عطا ہوا، جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ انھیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کے شاگردوں کے شاگرد بھی مختلف مدارس کی مساند درس پر متمکن ہیں۔

مولانا ممدوح بے حد قناعت پسند اور ایثار پیشہ عالم دین تھے۔ ان کے تلامذہ کرام کی وسیع فہرست میں چند حضرات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی: موصوف بہت بڑے عالم و محقق اور معلم و مصنف تھے۔

مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی: مشہور مدرس اور شارح سنن نسائی۔

مولانا عبداللہ اوڈ: غرباء اہل حدیث پنجاب کے امیر تھے۔

مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی: ان سے لاتعداد حضرات نے اخذ فیض کیا۔

مولانا عبدالرحمٰن بھوجیانی: مشہور عالم تھے۔ اگست ۱۹۴۷ میں شہادت پائی۔

مولانا عبداللہ بھوجیانی: ممتاز عالم و مدرس۔ اگست ۱۹۴۷ میں شہید ہوئے۔

مولانا عبدالرحیم بھوجیانی: نامور مدرس۔ اگست ۱۹۴۷ کو جام شہادت نوش کیا۔

مولانا عطاء اللہ بڈھیمالوی: بڈھیمال (ضلع فیروز پور مشرقی پنجاب) کے مشہور عالم

سید مولا بخش کوموی: موضع کوم ضلع لدھیانہ مشرقی پنجاب کے صالح ترین بزرگ۔ تقسیم ملک کے بعد ٹوبہ ٹیک سنگھ آگئے تھے، وہیں فوت ہوئے۔

مولانا عبدالقادر زیروی: زیرہ (ضلع فیروز پور) کے رہنے والے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد میاں چنوں میں انتقال ہوا۔

مولانا حافظ محمد اسحاق حسینوی: بہت بڑے مدرس و مصنف اور مترجم۔ مشہور شیخ الحدیث۔

حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی: بے شمار علما وطلبا کے استاذ گرامی قدر۔

مولانا عبدالقادر حصاری: تصنیف وتالیف، مقالہ نگاری اور تدریس میں بڑی شہرت پائی۔

مولانا محی الدین لکھوی: مولانا مرحوم کے حقیقی بھانجے اور داماد۔

مولانا محمد یوسف: دارالحدیث کمالیہ کے بانی اور مہتمم۔

مولانا عبدالرحیم رحمانی: متعدد مدارس میں فریضہ تدریس انجام دیتے رہے۔

حافظ محمد بھٹوی: حافظ عبدالسلام بھٹوی کے والد محترم۔

مولانا عبدالرحمٰن لکھوی: مولانا عطاء اللہ لکھوی کے فرزند کبیر اور ممتاز مدرس۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا ممدوح کے تلانده کو حیطہ شمار میں لانا ممکن نہیں۔

حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی درس و تدریس اور تقویٰ و صالحیت، نیک نفسی، ہم دردی، ایثار، خلوص اور دیانت و امانت میں بے مثال تھے۔ نرم زبان، خوش کلام، عالی کردار اور صاحب عزیمت عالم دین تھے۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لحہ خدمت دین میں گزرا۔ اپنے اسلاف کی پاکیزہ تریں یادگار تھے۔

اس جلیل القدر شخصیت نے ۲۶ فروری ۱۹۵۲ (۷۔ ربیع الاول ۱۳۷۲ھ) کو بدھ کے روز صبح پانچ بجے جامعہ محمدیہ اوکاڑہ میں وفات پائی اور چک نمبر ۱۸ ون ایل (نزد رینالہ خورد) میں دفن کیے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کے فرزندان گرامی اور پوتے ماشاء اللہ سب علماے دین ہیں جن کا تذکرہ ان شاء اللہ مناسب مواقع پر کیا جائے گا۔



مولانا محمد یونس دہلوی

اکتوبر ۱۹۴۵ء میں استاذِ محترم حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف کے ساتھ جمعیت علمائے ہند کی ایک میٹنگ میں یہ فقیر دہلی گیا تو ان کی معیت میں حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسے میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس مدرسے کو دیکھ کر ذہن بے قابو ہو کر ماضی کے اس دور میں پہنچ گیا جب وہاں حضرت میاں صاحب کی بارگاہِ علم میں ہندوستان اور مختلف ممالک کے بڑے بڑے لوگ اکتسابِ فیض کے لیے حاضر ہوتے اور ان سے استفادہ کرتے تھے۔ اس پاک باز جماعت میں حضرت سید عبداللہ غزنوی، حافظ محمد لکھوی، مولانا شمس الحق عظیم آبادی، مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری، مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی، حافظ عبدالمنان وزیر آبادی، شاہ سلیمان پھلواروی، مولانا محمد بشیر سہسوانی، حافظ عبداللہ غازی پوری، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی اور دیگر بہت سے عالی قدر لوگ چشم تصور میں بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ اور پھر حضرت ممدوح کے آخری دور کے شاگردوں میں سے مولانا احمد اللہ پرتاب گڑھی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی کے علاوہ متعدد خوش بخت بزرگوں کی ایک لمبی قطار دکھائی دی۔

اسی موقعے پر یہ فقیر پہلی مرتبہ مدرسہ میاں صاحب میں حضرت مولانا محمد یونس پرتاب گڑھی (دہلوی) کی زیارتِ سے بہرہ مند ہوا۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد یونس صاحب سے متعلق کچھ عرض کرنے سے پہلے مولانا ابویحییٰ امام خاں نوشہروی کی وساطت سے مدرسہ میاں صاحب کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ مولانا ابویحییٰ نوشہروی کو متعدد مرتبہ اس مدرسے میں جانے کے مواقع ملے ہیں اور وہ مولانا محمد یونس مرحوم ومغفور کے حلقہ درس میں بھی شامل ہوتے رہے ہیں۔ انھوں نے دہلی ہی میں اپنی معروف کتاب ”تراجم علمائے حدیث ہند“ لکھی۔ مولانا ابویحییٰ امام خاں صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

> اس مدرسے کی بنیاد شیخ الکل حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب نے اپنے دست مبارک سے رکھی اور تقریباً اسی (۸۰) سال تک وہ اسی مدرسے میں درس قرآن وحدیث وغیرہ دیتے رہے۔ ہندوستان کے جملہ مشاہیر علما وفضلا اسی گلستاں کے پھول ہیں۔ حضرت میاں صاحب کی آخری وصیت فرزندانِ توحید کے نام یہی رہی کہ اس میرے لگائے ہوئے باغ کی آب یاری کرتے رہیں۔ بعد رحلت حضرت میاں صاحب

مختلف دور اس مدرسے پر سے گزرے۔ آخر میں مدرسے کا نظم ونسق پھاٹک حبش خاں کے مخیّر بزرگ حاجی محمد زکریا صاحب مہاجر مکی کے ہاتھ میں آیا۔ آپ نے مبلغ ڈیڑھ سو روپے ماہوار کی رقم مدرسے کے لیے وقف کردی، جس سے مدرسے میں جان پڑگئی۔ حاجی صاحب مکہ معظمہ ہجرت فرماگئے۔ ۱۳۵۴ھ میں انتقال فرمایا اور جنت المعلیٰ میں مدفون ہوئے، غفر اللہ لہ۔ ان کے بعد ان کے فرزند اکبر حاجی حافظ محمد امین صاحب نے مدرسے کا اہتمام اپنے ذمے لے لیا۔ آپ کے حسن انتظام سے مدرسہ روز بروز عروج وکمال پر پہنچ رہا ہے۔ حافظ محمد امین صاحب جماعت اہل حدیث کے پرانے بہی خواہ ہیں۔ آپ نے کلکتہ وبنگال میں اہل حدیث کی بہت سی خدمات انجام دی ہیں۔ اہل حدیث کانفرنس کے لیے علمائے کرام کے ساتھ بنگال میں دورہ کیا۔ جمعیت تبلیغ اہل حدیث کلکتہ کے بانی آپ ہی ہیں۔ آپ کو علما وطلبا سے خاص انس ہے۔ جلالۃ الملک سلطان ابن سعود اور نجدیوں کی حمایت میں ایک کتاب بنام ''القول الفیصل'' تصنیف کرکے مفت شائع کی ہے، جس میں علاوہ فضائل حج کے تاریخ نجد پر خاص روشنی ڈالی ہے۔ الغرض آپ کا وجود جماعت اہل حدیث کے لیے بہت غنیمت ہے۔ ❶

مولانا ابویحییٰ امام خاں نوشہروی کی کتاب ''تراجم علمائے حدیث ہند'' پہلی مرتبہ ۱۳۵۶ھ (۱۹۳۸ء) میں دہلی سے شائع ہوئی تھی، اس وقت حافظ محمد امین بھی زندہ تھے (جن کا ذکر اوپر کی سطور میں ہوا) اور مولانا محمد یونس بھی حیات تھے اور ان کا جوانی کا عالم تھا۔ ڈیڑھ سو روپے کو آج کے زمانے پر قیاس نہ کیجیے۔ آج سے سوا سو سال قبل کے دور کی روشنی میں غور کیجیے، جب کہ سونا پانچ چھ روپے تولے کے حساب سے ملتا تھا۔ اب بیس بائیس ہزار روپے تولے کے حساب سے فروخت ہوتا ہے۔ اس زمانے میں ڈیڑھ سو روپے کو بہت بڑی رقم سے تعبیر کیا جاتا تھا اور یہ رقم ہر مہینے حاجی محمد زکریا (اور ان کی وفات کے بعد) ان کے فرزند گرامی حاجی محمد امین مدرسہ میاں صاحب کو دیتے تھے، جس سے مدرسے کے اساتذہ کی تنخواہوں اور باقی اخراجات کی گاڑی اچھی طرح چلتی تھی۔ مولانا محمد یونس اس مدرسے میں تدریسی خدمات سرانجام دیتے تھے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ حاجی محمد زکریا کی سکونت دہلی میں پھاٹک حبش خاں کے علاقے میں تھی اور میاں صاحب کا مدرسہ بھی وہیں تھا۔

اب مولانا محمد یونس کے حالات سے مطلع ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

---

❶ تراجم علمائے حدیث ہند، حاشیہ صفحہ ۱۷۹، ۱۸۰

مولانا ممدوح ۱۳۱۶ھ (۹۹۔ ۱۸۹۸ء) میں صوبہ یوپی کے ضلع پرتاب گڑھ کے ایک مقام ”کٹھار“ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا اسم گرامی شیخ محمد اسحاق تھا۔ شیخ الحدیث حضرت احمد اللہ پرتاب گڑھی ان کے ماموں تھے۔ مولانا احمد اللہ کا تذکرہ الگ ہوگا جو بہت بڑے فاضل اور استاذ الاساتذہ تھے۔ حضرت میاں صاحب کے عہد آخر کے تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ انھوں نے ۱۹۔ مارچ ۱۹۴۳ء کو دہلی میں وفات پائی۔

مولانا محمد یونس نے علومِ معقول ومنقول کی تحصیل مولانا احمد اللہ صاحب سے کی۔ بعض کتابیں حضرت حافظ عبداللہ غازی پوری سے اس وقت پڑھیں جب حضرت حافظ صاحب دہلی میں قیام فرماتھے۔

۱۳۳۹ (۱۹۲۱ء) میں مولانا محمد یونس نے سند فراغ حاصل کی۔ اس کے بعد دارالحدیث رحمانیہ (دہلی) کی مسند درس پر متمکن ہوئے۔ ایک سال یہاں تدریسی خدمت انجام دی۔ ۱۳۴۱ھ (۱۹۲۲ء) میں مدرسہ میاں صاحب میں تقرر ہوا، جہاں اگست ۱۹۴۷ء تک قیام رہا۔ بہ الفاظِ دیگر بائیس برس کی عمر میں انھیں دارالحدیث رحمانیہ جیسے بہت بڑے تعلیمی ادارے کی مسند تدریس پر فائز کیا گیا۔ پھر ایک سال بعد انھیں حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ کی مسند پر متمکن ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری تھی، جس کو انھوں نے نہایت اہتمام اور دلجمعی کے ساتھ نباہا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بہت لائق عالم اور قابل مدرس تھے، جن کو نوجوانی میں اللہ تعالیٰ نے تدریس وخطابت کی راہ پر لگا دیا تھا۔

حضرت میاں صاحب اپنے قائم کردہ اس مدرسے میں طلبا کو مروّجہ درسی کتابیں پڑھانے کے علاوہ مسجد میں درسِ قرآن بھی دیتے اور خطبہ جمعہ بھی ارشاد فرماتے تھے، مولانا محمد یونس نے بھی یہ سلسلہ باقاعدہ جاری رکھا اور بے شمار علما وطلبا نے ان سے تحصیل علم کی۔ قرآن وحدیث کی کتابیں پڑھیں اور دیگر علومِ متداولہ کے لیے ان کے سامنے دوزانو ہوکر بیٹھے۔

دہلی کو اس زمانے میں علما وفضلا کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور ان کے درس وتدریس کے حلقے قائم تھے، جن سے وسیع تعداد میں تشنگانِ علوم اپنی علمی پیاس بجھاتے تھے۔ مدرسہ میاں صاحب میں مولانا محمد یونس کا حلقہ درس بھی بڑی شہرت رکھتا تھا اور ملک کے دور دراز علاقوں سے طالب علم شد رحال کر کے مولانا ممدوح کی خدمت میں آتے اور ان سے اخذ علم کرتے تھے۔ دہلی کے اصحاب علم میں مولانا کو بے حد احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور اپنی ذاتی علمی حیثیت سے بھی اور حضرت میاں صاحب کے مسند نشین ہونے کی وجہ سے بھی وہ مرجع عوام وخواص قرار پاگئے تھے۔ حضرت میاں صاحب کی وفات کے بعد اس مدرسے کی تدریسی حیثیت بہت متاثر ہوگئی تھی لیکن مولانا محمد

یونس کی محنت رنگ لائی اور مدرسے کی رونقیں بحال ہوگئیں۔ حضرت میاں صاحب کے فیض یافتہ لوگوں اور ان کی پر خیر مجلسوں میں حاضر ہونے والے افراد نے پھر سے اس مدرسے کا رخ کیا اور اس میں از سرِ نو علمی چہل پہل پیدا ہوئی۔ مولانا محمد یونس کے حلقہ درس میں مولانا ابویحییٰ امام خاں نوشہروی بھی شامل ہوتے رہے ہیں، چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

راقم الحروف بھی آپ کے اسباق و درسِ قرآن میں حاضری کے شرف سے مفتخر ہوا۔ بیان قرآن وفقاہت حدیث میں خوب بہرہ ہے۔ حلقہ درس میں طلبا کی کثیر تعداد ہے، جس سے آپ کے کثرتِ تلامذہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ❶

مولانا محمد یونس رحمہ اللہ سے پنجاب، بنگال، بہار، یوپی اور دہلی وغیرہ علاقوں کے اتنے شائقین علم نے استفادہ کیا کہ انھیں شمار میں لانا ممکن نہیں۔ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ

وہ علوم دینیہ پر عبور رکھتے تھے اور ان کے ہر پہلو کی خوب صورت اسلوب میں وضاحت کرتے تھے۔ اسی لیے دہلی کے اصحابِ علم نے ان کو حضرت میاں صاحب کی مسند کا مستحق گردانا اور یہ عظیم منصب ان کے سپرد کیا اور پھر وہ جب تک دہلی رہے اس منصب کا تحفظ فرماتے رہے۔

تقسیم ملک کے بعد مولانا محمد یونس دہلی سے کراچی آ گئے۔ وہاں اہل حدیث کی ایک مسجد میں خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے تھے اور مدرسہ رحمانیہ کے اہتمام کا فریضہ انجام دیتے تھے۔

۲۴۔ جولائی ۱۹۴۸ء کو لاہور میں مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان قائم ہوئی تو مولانا سید محمد داؤد غزنوی کو اس کے صدر مقرر کیا گیا تھا۔ مولانا غزنوی نے اس کی مجلس عاملہ بنائی تو اس میں مولانا محمد یونس دہلوی کو بھی شامل کیا۔ یہ فقیر مرکزی جمعیت کا ناظم دفتر تھا۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث کی دوسری سالانہ کانفرنس ۲،۳،۴۔ اپریل ۱۹۵۴ء (بروز جمعہ، ہفتہ، اتوار) مولانا محمد علی قصوری (ایم اے کینٹب) کے زیر صدارت ملتان میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں مولانا محمد یونس دہلوی بھی کراچی سے تشریف لائے تھے اور پروگرام کے مطابق کانفرنس کے پنڈال میں خطبہ جمعہ انھی نے ارشاد فرمایا تھا۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ مجھے ان کی تقریر سننے کا پہلی دفعہ موقع ملا تھا۔ قلعہ معلّٰی کی زبان میں نہایت شان دار تقریر کی، جو لوگوں نے بڑے شوق اور توجہ سے سنی۔ میں اس زمانے میں اخبار ''الاعتصام'' کا ایڈیٹر اور مرکزی جمعیت اہل حدیث کا ناظم دفتر تھا، جب کہ مولانا داؤد غزنوی اس کے صدر اور مولانا محمد اسماعیل سلفی ناظم اعلیٰ تھے۔

تقریر کے علاوہ مولانا کی مجلس میں بیٹھنے اور ان کی باتیں سننے کا اتفاق بھی ہوا۔ بڑے زندہ دل

❶ تراجم علمائے حدیث ہند، ص: ۱۸۰

اور خوش مزاج بزرگ تھے۔ ایک موقعے پر مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا محی الدین احمد قصوری اور دیگر متعدد حضرات تشریف فرما تھے کہ مولانا محمد علی قصوری نے فرمایا کہ لاہور سے آتے ہوئے میں نے ریل میں کھانا کھایا، اس سے پیٹ میں تکلیف ہوگئی۔ بہتر ہوتا کہ کھانا گھر سے لے آتا۔

مولانا محمد یونس نے فرمایا: آپ کو گھر سی ہے کھانا اپنے ساتھ لے کر چلنا چاہیے تھا، کیوں کہ بچے کا دودھ، جوان کی جورو اور بوڑھے کا کھانا ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اس لطیفے پر حاضرین مجلس بہت محظوظ ہوئے۔

۱۴۔ اپریل ۱۹۵۴ء کو مرحوم شاہ سعود (والی نجد وحجاز) پاکستان آئے اور شام کو پانچ بج کر سولہ منٹ پر ان کا جہاز کراچی کے ہوائی اڈے پر اترا تھا۔ اس سے دو روز بعد ۱۶۔ اپریل کو مولانا داؤد غزنوی کی قیادت میں ان سے کراچی میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ایک وفد نے ملاقات کی تھی جو بارہ ارکان پر مشتمل تھا۔ اس وفد میں مولانا محمد یونس دہلوی شامل تھے۔ ارکانِ وفد کے اسمائے گرامی یہ تھے: ① مولانا سید محمد داؤد غزنوی، ② مولانا محمد اسماعیل ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیت اہل حدیث، ③ مولانا اسماعیل غزنوی، ④ مولانا محمد علی قصوری، ⑤ مولانا محی الدین احمد قصوری، ⑥ مولانا محمد یونس دہلوی، ⑦ علامہ خلیل عرب، ⑧ میاں عبدالمجید، ⑨ حاجی محمد اسحاق حنیف، ⑩ عبدالرؤف قریشی، ⑪ شیخ عبدالوہاب بن شیخ عطاء الرحمٰن دہلوی، ⑫ میاں عبدالعزیز عباز کا اینڈ کمپنی۔

یہ سب حضرات اپنی اپنی باری سے سفر آخرت اختیار کر چکے ہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

مولانا محمد یونس دہلوی آہستہ کلام اور نرم گفتار بزرگ تھے۔ میں نے ملتان کانفرنس کے موقعے پر انھیں اچھی طرح دیکھا۔ وہ پیار کے لہجے میں میٹھی میٹھی باتیں کرتے تھے۔ کشیدہ قامت اور لاغر اندام تھے۔ میں ان سے ہم کلام ہونے کی جرأت نہیں کرسکا۔ البتہ ان کی گفتگو سنتا رہا جو وہ دوسرے حضرات سے کرتے تھے۔ مولانا ممدوح کے علاوہ کراچی سے اور بھی چند علمائے عظام تشریف لائے تھے، جن کا اصل تعلق دہلی سے تھا۔ انہی علمائے دین میں سے ایک جلیل القدر عالم مولانا شرف الدین دہلوی تھے۔

مولانا محمد یونس دہلوی کو درس وتدریس کی تاریخ نے یہ بہت بڑا اعزاز بخشا کہ وہ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کے مسند نشیں ہوئے اور انہی کی مسجد میں اور انہی کے منبر پر انھیں خطابت کا شرف حاصل ہوا۔

تدریسی سرگرمیوں کے علاوہ مولانا محمد یونس دہلوی قلم وقرطاس سے بھی رابطہ رکھتے تھے اور کسی

نہ کسی انداز میں ان کا تحریر ونگارش کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ وہ فتوے بھی لکھتے تھے اور دہلی کے جماعتی رسائل وجرائد میں ان کے مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ ان کے زمانے میں جماعت اہل حدیث کے کئی رسالے دہلی سے شائع ہوتے تھے، جن میں دارالحدیث رحمانیہ کا ماہنامہ محدث، مولانا محمد جوناگڑھی کا اخبار محمدی، مولانا عبدالجنان کا اہل حدیث گزٹ اور غرباء اہل حدیث کا صحیفہ اہل حدیث شامل ہیں۔ پھر امرتسر سے ہفت روزہ ''اہل حدیث'' اور روپڑ سے ''تنظیم اہل حدیث'' باقاعدگی سے چھپتے تھے۔ مولانا ممدوح کا ان ہفت روزوں اور ماہناموں میں لکھنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

مولانا ممدوح کی بعض کتابیں بھی معرضِ اشاعت میں آئیں۔ ان میں سے دو کتابیں مندرجہ ذیل ہیں۔

ایک کتاب ''دستور المتقی'' ہے۔ اس کتاب میں عملی زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل کو سنت رسول (ﷺ) کی روشنی میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اپنے مندرجات کے اعتبار سے یہ ایک اہم کتاب ہے۔

دوسری کتاب ''اربعین نووی'' کا اردو ترجمہ ہے۔ یعنی امام نووی رحمہ اللہ کی جمع فرمودہ چالیس احادیث کو افادۂ عوام کے لیے اردو کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ اس کے صفحہ اوّل پر یہ الفاظ درج ہیں۔

الاربعین النوویہ

فی الاحادیث الصحیحۃ النبویہ

لامام یحیٰ بن شرف الدین النووی المتوفی ٦٧٦ھ

سے ترجمہ اردو

از قلم فیض رقم مولانا مولوی محمد یونس صاحب صدر مدرس

مدرسہ مولانا وسیدنا نذیر حسین صاحب محدث رحمہ اللہ پھاٹک حبش خاں دہلی

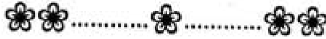
المسمّٰی بہ

چھل حدیث نبوی

یہ کتاب جید برقی پریس دہلی بلیماراں میں چھپی اور مفت تقسیم کی گئی۔ ملنے کا پتا لکھا ہے۔
حاجی ضیاء الدین صاحب دوائی والے محلّہ چڑے والا، پھاٹک حبش خاں۔ دہلی۔

مولانا محمد یونس بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ مدرس بھی تھے، محدث بھی تھے، مفسر بھی تھے اور واعظ وخطیب بھی تھے۔ خوش طبع اور خوش مزاج بھی تھے۔ ان سے بے شمار علما وطلبا نے حصولِ فیض کیا۔ اس عالم وفاضل استاذ الاساتذہ نے کم وبیش ستر سال کی عمر پا کر نومبر ۱۹۶۷ء میں کراچی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ



مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی

۱۹۴۲ء کی گرمیوں کا موسم تھا کہ ایک صاحب ہمارے ہاں (کوٹ کپورہ) تشریف لائے۔ ان کا قیام غالباً حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کے برادرِ کبیر حافظ عبداللہ بھوجیانی کے گھر تھا۔ طویل قامت، بھاری بھرکم جسم، کشادہ پیشانی، چہرے پر مختصر (کھودی) داڑھی، گندمی رنگ، سر پر سفید ہلکا سا عمامہ، چار خانے کی ٹخنوں سے اونچی لنگی، سفید قمیص پہنے ہوئے۔ باوقار شخصیت کے مالک۔ کم گو اور حلیم الطبع۔ یہ تھے حضرت مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی۔ ان کے ساتھ ان کے ایک نوجوان فرزند گرامی تھے جو قدو قامت میں والد کی مانند تھے۔ ان کا نام مجھے یاد پڑتا ہے، عبدالمالک تھا۔ میں نے ایک دن دونوں کو دوپہر کے کھانے کی دعوت دی تو بے حد مسرت کے ساتھ تشریف لائے اور کھانے کے بعد میرے لیے اور تمام افرادِ خانہ کے لیے دعا فرمائی۔ ان کی دعا سے ہم لوگ بہت خوش ہوئے اور خیال کیا کہ اتنے بڑے عالم نے ہمارے گھر آ کر ہم پر انتہائی احسان فرمایا ہے اور ہمارے لیے بہتری کی جو دعا کی، اسے اللہ تعالیٰ ضرور قبول فرمائے گا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کی دعا قبول فرمائی۔

اب آئندہ سطور میں حضرت مرحوم کے ان حالات کا مطالعہ فرمایئے، جن تک اس فقیر کی رسائی ہوسکی ہے۔ یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ حضرت مولانا ممدوح پر پہلا مضمون اس فقیر نے لکھا تھا جو ۲۔ دسمبر ۱۹۴۹ء کے ہفت روزہ الاعتصام میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کا آفس سیکرٹری تھا اور ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے اجرا پر تین مہینے گزرے تھے۔ اس سے قبل حضرت مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی مرحوم پر برصغیر کے کسی رسالے یا اخبار میں مختصر یا مفصل کوئی مضمون شائع نہیں ہوا تھا۔ آج ۱۸۔ جولائی ۲۰۰۵م ہے۔ اس حساب سے مولانا مرحوم سے متعلق میرے مضمون کی اشاعت پر ۵۶ سال کی طویل مدت گزر چکی ہے۔ اس سے تقریباً تیرہ سال بعد ان کی وفات پر اس عاجز نے اسی اخبار کے ۱۰۔ اگست ۱۹۶۲ء کے شمارے میں اداریہ لکھا۔ آج تیسری بات اس فردوس آشیانی عالم جلیل کے بارے میں چند گزارشات پیش کرنے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں۔ یہ گزارشات بہت حد تک گزشتہ تحریروں سے مختلف ہیں۔ یہاں یہ یاد رہے کہ حضرت مرحوم نے خود اپنی مختصر سی سرگزشت لکھی تھی جو ۱۹۔ جنوری ۱۹۲۳ء کے اخبار ''اہل حدیث'' (امرتسر) میں چھپی تھی۔ اس وقت ان کی عمر چھبیس برس کی تھی اور سلسلۂ تدریس کے آغاز پر صرف چھ برس گزرے تھے۔

مولانا ممدوح کے والد کا نام دادا رنجش (یا داور نجش) تھا اور وہ اپنے علاقے کے مشہور طبیب تھے۔ جد امجد کا اسم گرامی جمال الدین خاں تھا۔ خاندانی پیشہ تجارت تھا۔

مولانا مرحوم ہندوستان کے صوبہ راجستان کے ضلع جے پور کے ایک شہر کھیتری میں ۱۸۹۷ء (۱۳۱۴ھ) کے پس وپیش پیدا ہوئے۔ ناظرہ قرآنِ مجید اپنے شہر کے حافظ اللہ بخش سے پڑھا۔ سرکاری سکول میں پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔ اسی اثنا میں والد محترم سے فارسی اور صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ حصولِ علم اور دینی مسائل سے آگاہی کا بے حد شوق تھا اور بارگاہِ الٰہی سے ذہن اخاذ عطا ہوا تھا۔ سبق نہایت غور سے پڑھتے اور جو کچھ پڑھتے، بہ آسانی ذہن میں محفوظ ہوجاتا۔ اِدھر اُدھر گھومنے اور کھیل کود سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

حکیم دادا رنجش اپنے اس بچے کو دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کے متمنی تھے۔ چناں چہ انھوں نے ہونہار بیٹے کو دہلی بھیج دیا، جہاں اس وقت دینی تعلیم کے متعدد مراکز قائم تھے۔ وہاں اس لائق طالب علم نے مولانا عبدالوہاب دہلوی، مولانا احمد اللہ، مولانا عبدالوہاب (نابینا) مولانا حافظ عبدالرحمٰن شاہ پوری (برادر مولانا فقیر اللہ مدراسی) مولانا شرف الدین اور مولانا عبدالرحمٰن ولایتی سے تفسیر وحدیث، فقہ واصول، بیان ومعانی اور مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں۔ پھر پنجاب کا قصد کیا اور ضلع فیروز پور کے مرکز تدریس موضع ''لکھوکے'' آئے۔ وہاں حضرت مولانا عبدالقادر لکھوی اور ان کے فرزند عالی قدر مولانا عطاء اللہ لکھوی سے استفادے کے مواقع حاصل ہوئے۔ بعد ازاں روپڑ گئے جو اس وقت ضلع انبالہ کا تحصیلی مقام تھا، اب ضلعی مقام ہے۔ وہاں مولانا حافظ عبداللہ روپڑی کی مسند تدریس آراستہ تھی، ان سے مستفیض ہوئے۔ حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری کے حلقہ تلامذہ میں شمولیت کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ اس طرح انھوں نے ۱۹۱۷ء (۱۳۳۵ھ) تک مروّجہ علوم دینیہ کی تکمیل کے تمام مراحل طے کرلیے اور جہاں گئے وہاں کے اساتذہ سے بہ درجہ غایت محنت اور انہماک سے پڑھا۔ ان کے تمام اساتذہ کو جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے، متداول علوم وفنون میں مہارت کی بنا پر اُس عہد میں اساطین کی حیثیت حاصل تھی۔ لائق شاگرد نے ان کے طریق تعلیم سے خوب استفادہ کیا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد ضلع جے پور کے شہر کھنڈیلا کو اپنا مسکن بنایا اور درس وتدریس کے لیے زندگی وقف کردینے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے کھنڈیلا میں اشاعۃ القرآن والحدیث کے نام سے مدرسہ قائم کیا اور کچھ عرصہ وہاں فریضہ تدریس سرانجام دیتے رہے۔ لیکن وہاں طلبا کی تعداد بہت محدود تھی اور علاقہ علمی مراکز سے دور تھا۔ دہلی میں حافظ حمید اللہ صاحب مرحوم نے مدرسہ حمیدیہ جاری فرمایا تھا۔ انھوں نے مولانا عبدالجبار صاحب کھنڈیلوی کو اس مدرسے میں خدمت تدریس

انجام دینے کی دعوت دی اور حضرت مرحوم نے اپنی خدمات اس مدرسے کے سپرد فرمادیں۔ دہلی
ے مدرسہ دارالسلام اور وہاں کی مسجد کلاں میں بھی ان کی تدریس کے ہنگامے جاری رہے۔ ان کی
رت تدریس برما تک پہنچی تو اس کے دار الحکومت رنگون کی جامع مسجد اہل حدیث کے اصحاب
ظام انھیں وہاں لے گئے۔ رنگون میں اہل حدیث خاصی تعداد میں آباد تھے اور اہل حدیث کے
د اخبار بھی وہاں جاری تھے۔ متعدد علمائے کرام بھی اس ملک میں سکونت پذیر تھے۔

دہلی اور رنگون میں کافی عرصہ حضرت مولانا کھنڈیلوی کا تدریسی سلسلہ جاری رہا۔ بعد ازاں
زمِ کھنڈیلا ہوئے اور وہاں ''مصباح العلوم'' کے نام سے مدرسے کا اجرا فرمایا۔ کھنڈیلا، پنجاب اور
ی وغیرہ سے بہت دور تھا اور طلبا کا وہاں پہنچنا مشکل تھا، اس لیے رمضان المبارک کے بعد مولانا
د دہلی تشریف لے آتے اور وہاں کے مختلف مدارس کے چکر لگا کر طلبا کو اپنے ساتھ کھنڈیلا لے
تے تھے۔ طلبا پر وہ نہایت شفقت فرماتے۔ ان سے بہت ہی نرمی اور محبت کا سلوک کرتے اور ان
ی ضروریات کا پورا خیال رکھتے۔

تقسیم ملک کے بعد کچھ عرصہ وہ کھنڈیلا میں اقامت گزیں رہے، پھر پاکستان تشریف لے
ئے اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی دعوت پر لاہور چینی والی مسجد میں طلبا کو پڑھانا شروع کیا۔ اس
ت اس مسجد میں دینی مدرسہ قائم تھا، جس کے مہتمم مولانا سید محمد داؤد غزنوی تھے۔

۱۹۴۸ء میں جب امرتسر کے دارالعلوم تقویۃ الاسلام (مدرسہ غزنویہ) کے لیے شیش محل روڈ پر نئی
رنگ الاٹ ہوئی تو چینی والی مسجد کے مدرسے کو بھی وہاں منتقل کردیا گیا اور مولانا کھنڈیلوی مرحوم کا
سلہ تدریس وہاں جاری ہوگیا، لیکن اس دارالعلوم میں مولانا مرحوم کی خدمت تدریس کا عرصہ بہت
م رہا اور حالات ایسے پیدا ہوگئے کہ مولانا واپس ہندوستان تشریف لے گئے اور ان کی خدمات
وبہ بہار کے مدرسہ احمدیہ سلفیہ (دربھنگا) کے اصحابِ اہتمام نے حاصل کرلیں۔ لیکن حضرت مرحوم
ے فرزندانِ گرامی چوں کہ پاکستان آگئے تھے۔ اس لیے وہ بھی مستقل طور سے پاکستان آگئے اور
کاڑہ کے مدرسہ دارالحدیث میں (جو اُس وقت قاضی محمد رمضان کی مسجد میں جاری تھا) ان کی
ریسی مساعی شروع ہوگئیں۔ وہیں اوپر کی منزل میں ان کی رہائش تھی۔

حضرت مرحوم کم وبیش ۴۵ سال کامل انہماک اور دلی لگن سے برصغیر کے مختلف مدارس میں طَلبا
و اپنے فیوضِ علمیہ سے مستفیض فرماتے رہے۔ اس اثنا میں راجستان، دہلی، میوات، یوپی، بہار،
ال، آسام اور پنجاب کے ہزاروں شائقین علم نے ان کے دائرہ شاگردی میں شامل ہونے اور ان
ے استفادہ کرنے کا شرف حاصل کیا۔

ان کا طریق تدریس بے حد دل آویز تھا۔ مطالعہ کرکے نہایت محنت سے پڑھاتے اور اپنی

بات طالب علم کے ذہن میں اتارنے کی پوری کوشش فرماتے اور یہی ذوقِ تدریس طلبا کے ذہنوں میں راسخ کرنے کا جذبہ رکھتے تھے۔

خالص علمی اور تحقیقی ذہن کے مالک تھے۔ علمائے کرام کے باہمی بحث ومباحثے سے کنارہ کش رہتے اور ان کے شب وروز درس وتدریس اور مطالعہ کتب میں گزرتے تھے۔

پینتالیس برس میں پھیلی ہوئی طویل مدت میں جن حضرات نے ان کے حلقہ شاگردی میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ ان سب کی یا ان میں سے آدھی یا آٹھویں دسویں حصے کی تعداد کی بھی نام بہ نام نشان دہی کرنا ممکن نہیں، بلکہ اگر حضرت مرحوم خود بھی زندہ ہوتے تو ان کی یقینی تعداد نہ بتا سکتے۔ البتہ جن حضرات کا ہمیں علم ہوسکا ہے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، شیخ الحدیث مولانا حافظ محمد اسحاق حسینوی، مولانا حافظ محمد بھٹوی، مولانا حافظ عبدالرحمٰن صافوی فیروز پوری، مولانا حافظ محمد اسماعیل ذبیح۔ ان بزرگانِ عالی قدر نے ان سے دہلی میں استفادہ کیا۔ ان کے علاوہ ان کے فرزندانِ گرامی مولانا قاری عبدالخالق رحمانی، مولانا محمد، مولانا عبدالقہار، مولانا عبدالمالک، ان کے بھانجے مولانا عبدالحی اور مولانا محمد اسحاق خائف ان کے شاگردوں میں شامل ہیں۔ جن حضرات نے ان سے کھنڈیلا میں استفادہ کیا، ان میں میرے مرحوم دوست اور ہم وطن حاجی محمد رفیق زبیدی کا نام بھی شامل ہے۔ مولانا کے یہ چہیتے شاگرد تھے، جنھیں وہ پیار سے ''مٹا'' کہہ کر پکارتے تھے۔ حاجی محمد رفیق زبیدی کے بقول دورانِ تعلیم کسی شاگرد کو مولانا کا فرمان سمجھنے میں دقت پیش آتی تو پیار کے لہجے میں اس شاگرد سے فرماتے: ''توتے شاہ کے بھائی نتھو شاہ'' میری بات غور سے سنو۔

مولانا محمد اور عبدالحی نے ان سے کھنڈیلا میں اور عبدالمالک اور عبدالقہار نے اوکاڑہ میں حصولِ علم کیا۔

حضرت مرحوم کے فاضل تلمیذ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی ان کے طریق تدریس کے بارے میں فرماتے ہیں:

''آخری ایام حیات تک یہ طریقہ رہا کہ مطالعہ کے دوران فوائد نادرہ جو سامنے آتے، ان کو اپنی بیاض میں محفوظ کر لیتے تھے اور یہ علمی فوائد ہر قسم کے تھے۔ تفسیری، حدیثی، لغوی، نحوی، صرفی، ادبی، کلامی، تاریخی اور شعر وشاعری (عربی، فارسی، اردو) وغیرہ پر مشتمل۔ اس قسم کے بیاض آٹھ دس کے قریب ہیں۔ درسِ تفسیر وحدیث میں مناسب مقامات پر طلبا کو بھی ان سے مستفید فرماتے تھے۔

''اگر ان بیاضوں کو مرتب کر کے یک جا کر دیا جائے تو بہ یک نظر اندازہ ہوجائے گا کہ کس ذوق وانہماک کے ساتھ کم وبیش چالیس برس تک کہاں کہاں سے یہ تنکے مولانا

نے فراہم کر کے تحقیق وتدقیق اور معلومات کا حامل یہ مرقع طلبا اور اہل علم کے لیے تیار کر دیا ہے۔“ ❶

معلوم نہیں یہ بیش قیمت بیاض اب محفوظ ہیں یا نہیں۔ اگر حضرت کے کسی صاحب زادے یا عزیز اور شاگرد کے پاس موجود ہیں تو اس بہت بڑے علمی ذخیرے کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر یہ کام مشکل ہو تو کسی جماعتی اخبار میں قسط وار ان کی اشاعت کا اہتمام کرنا چاہیے۔ حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب کی یہ تحریر بھی ستائیس برس قبل (مئی ۱۹۷۸ء) کی ہے۔ انھوں نے مکتبہ سلفیہ کی طرف سے حضرت مولانا کی کتاب ”خاتمہ اختلاف“ شائع کی تھی۔ اس کتاب کے شروع میں ”حضرت مؤلف کے مختصر حالات“ کے عنوان سے مولانا سے متعلق چند باتیں تحریر فرمائی تھیں، جن میں ان بیاضوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اب یہ ذخیرۂ علم وتحقیق کہاں ہوگا؟ اس قسم کے بہت سے علمی ذخائر ہیں جو ہمارے علمائے کرام نے چھوڑے اور افسوس ہے کہ ہم نے نہایت بے دردی اور بے رحمی سے ضائع کر دیے۔

حضرت مولانا کھنڈیلوی کے متروکہ علمی ذخیرے کے متعلق مولانا عطاء اللہ حنیف کے مضمون کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو۔

”حضرت کے ذخیرۂ کاغذات میں مشاہیر علما (مثلاً) مولانا حافظ عبداللہ روپڑی، مولانا محمد شرف الدین دہلوی، مولانا احمد اللہ دہلوی، مولانا محمد زکریا حنفی سہارن پوری، مولانا عبدالجلیل سامرودی، مولانا عبید اللہ رحمانی، مولانا محمد اسماعیل (گوجراں والا) مولانا حافظ محمد گوندلوی کے مکاتیب کا ایک ذخیرہ بھی ہے جو صحاح ستہ کے مشکل تدریسی مقامات وغیرہ کے حل پر مشتمل ہے۔“ ❷

کچھ پتا نہیں، مختلف اہل علم کے خطوط کا یہ نادر علمی ذخیرہ کسی نے محفوظ کیا یا نہیں۔ اگر یہ محفوظ ہے تو کسی جماعتی اخبار میں اس کی اشاعت کا اہتمام کرنا چاہیے تاکہ اہل علم اس سے مستفید ہو سکیں۔

حضرت مولانا مرحوم تدریس کے علاوہ تحریر کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ ان کا اصل موضوع حدیث اور اس کے متعلقہ علوم تھا۔ اس سلسلے کے مختلف عنوانات پر جن اخبارات میں ان کے افکارِ عالیہ شائع ہوتے رہے، ان میں ”اہل حدیث“ (امرتسر) ”تنظیم اہل حدیث“ (روپڑ، پھر امرتسر)

❶ خاتمہ اختلاف، حضرت مؤلف کے مختصر حالات، صفحہ: ۱۰۔
❷ ایضاً

''اخبارِ محمدی'' (دہلی) اور ''الاعتصام'' (لاہور) شامل ہیں۔ ان اخباروں کے مضامین جمع کیے جائیں تو ایک ضخیم جلد تیار ہوسکتی ہے۔

ان اخبارات میں سے حضرت مولانا محمد جوناگڑھی دہلوی کے اخبارِ محمدی کا حصول تو شاید ممکن نہ ہو، لیکن دیگر اخبارات تو محنت اور کوشش سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ کاش کوئی صاحب تحقیق اس خدمت کی انجام دہی پر کمربستہ ہوجائیں۔ افسوس ہے جماعت اہل حدیث کے موجودہ نوجوان اہل علم اس قسم کی محنت طلب علمی جستجو کے عادی نہیں ہیں۔ وہ انہی بزرگوں کے بارے میں قلم کو حرکت دیتے ہیں، جن کے متعلق مواد آسانی سے دست یاب ہوجاتا ہے۔ پھر الٹ پلٹ کر مختلف طریقوں سے ان کے کارناموں کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے لیکن جہاں محنت کرنا پڑے وہاں خاموشی اختیار کرلی جاتی ہے۔

اخباری مضامین کے علاوہ حضرت مولانا کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱)...... ازالة الحيرة عن فقاهة ابی هريره (عربی) مطبوع

(۲)...... التبيان فی مسئلة الايمان: (عربی) مطبوع

(۳)...... اظهار حجة الله علىٰ ملا عظمت الله معروف به نسبت محمدی (اردو) مطبوع

(٤)...... مقاصد الامامه: (اردو) مطبوع

(٥)...... اتمام الحجه: (اردو) مطبوع

(٦)...... الانصاف فی رفع الاختلاف: (اردو) مطبوع۔

(۷)...... مقدمه صحيح بخاری: صحیح بخاری کے متعلقہ مباحث پر تفصیلی اور علمی کتاب (عربی) غیر مطبوع

(۸)...... حاشيه صحيح بخاری: اس اہم علمی سلسلے کا آغاز حضرت مولانا نے عربی زبان میں زندگی کے آخری دور میں کیا تھا۔ چند ابواب مکمل ہوسکے تھے۔ نمبر ۷ اور ۸ دونوں غیر مطبوع ہیں اور کچھ پتا نہیں یہ مسودات کہاں ہیں۔

مولانا کھنڈیلوی خاموش طبع، خلوت گزیں، سادہ مزاج، قناعت پسند، فقر و درویشی کا مرقع، دینی معاملات میں غیور اور اربابِ دولت سے نفور تھے۔ طلبا کے بے حد مشفق تھے اور انھیں اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ان کی علمی اور اخلاقی تربیت پر خاص طور سے توجہ دیتے تھے۔ ان کا عربی، اردو کا خط بہت عمدہ تھا۔ مرنجاں مرنج اور اعتدال کا حسین پیکر تھے۔ بہت بڑے معلم اور وسیع المطالعہ عالم ہونے کے باوجود بے حد متواضع اور منکسر تھے۔ تحقیق مسائل کے سلسلے میں، ہر عالم سے

اگرچہ وہ عمر اور مرتبے میں کم تر ہوتا اور کسی مسلک سے انسلاک رکھتا، استفادے میں کسی قسم کی جھجک اور عار محسوس نہ فرماتے۔ فقہ الحدیث میں انھیں درک حاصل تھا اور مختلف مسالک فقہ کے اختلافی مسائل کے تمام پہلوؤں پر عبور رکھتے تھے۔ اخلاق وعادات، شب وروز کے معمولات اور وسعت مطالعہ میں اسلاف کا خوب صورت نمونہ تھے۔ ہر مسلک کے اہل علم کا احترام کرتے تھے۔

ان کی ایک تصنیف ''الانصاف لرفع الاختلاف'' ہے۔ جسے ''خاتمہ اختلاف'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس کتاب میں ان مسائل کا تذکرہ فرمایا گیا ہے، جن میں احناف اور اہل حدیث کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے اور پھر اس اختلاف کو رفع کرنے کی اپیل کی گئی ہے۔ حضرت مصنف اس کتاب میں تحریر فرماتے ہیں کہ ان مسائل میں اظہار رائے میں اعتدال اور توازن کا ثبوت بہم پہنچانا چاہیے۔ انتہا پسندی اور ایک دوسرے پر طعن وتشنیع اور الزامات سے احتراز کرنا چاہیے۔ یہ کتاب مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور نے شائع کی ہے۔ اس کتاب میں حضرت مصنف رحمہ اللہ علمائے احناف کا بے حد احترام سے ذکر فرماتے ہیں اور مختلف فیہ مسائل کے بارے میں باحوالہ ان کے ارشادات نقل کرتے ہیں اور پھر دردمندانہ لہجے میں اہل حدیث اور احناف سے مسلکی اختلاف کو برداشت کرنے کی تلقین فرماتے ہیں۔

اب حضرت مولانا کے آخری مرض اور وفات کے متعلق چند باتیں:

حضرت مرحوم ایک دن اوکاڑہ میں مکان سے نیچے اُتر رہے تھے کہ سیڑھیوں سے گر پڑے اور کافی چوٹیں آئیں۔ تین سال صاحب فراش رہے۔ لیکن اس حالت میں بھی تدریس حدیث کا سلسلہ جاری رکھا۔ پھر ۱۹۶۲ء کے اوائل میں فالج کا شدید حملہ ہوا، جس سے زبان بھی متاثر ہوئی اور بات چیت کرنا مشکل ہوگیا۔ لیکن اب بھی تدریس کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے رنگ دیکھیے کہ جب وہ حدیث پڑھانا شروع کرتے اور اس کے کسی موضوع پر گفتگو فرماتے تو بہت حد تک زبان کھل جاتی۔ اسے نبی ﷺ کی حدیث کی برکت پر محمول کرنا چاہیے۔ آخر وہ وقت آ گیا جو ہر شخص پر آ کر رہتا ہے۔ ۴۔ اگست ۱۹۶۲ء (۲۔ ربیع الاوّل ۱۳۸۲ھ) کو ہفتے کے دن اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کو تشریف لے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

حضرت الاستاذ حافظ محمد صاحب گوندلوی رحمہ اللہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ جنازے میں کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ اوکاڑہ میں دفن کیے گئے۔

اللھم نوّر قبرہ ووسع مدخلہ وادخلہ جنت الفردوس۔



مولانا عبدالحق ہاشمی

برصغیر کے جن علماے عظیم المرتبت نے درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور وعظ وخطابت میں شہرت پائی اور بہ درجہ غایت خدمات سرانجام دیں ان میں ایک جلیل القدر عالم حضرت مولانا ابومحمد عبدالحق ہاشمی فاروقی تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب بیالیس واسطوں سے خلیفہ ثانی امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ یہ سلسلہ نسب ان کے خاندان میں محفوظ ہے اور خود مولانا ممدوح نے ان تمام افراد کے اسماے گرامی اپنی ایک تصنیف عقیدہ الفرقۃ الناجیہ کے صفحہ ۲۷ پر تحریر فرمائے ہیں۔

مولانا عبدالحق ہاشمی کے ابتدائی دور کے اسلاف میں سے ایک بزرگ (جن کا نام علی تھا) اموی خلیفہ عبدلملک بن مروان کے عہد خلافت میں محمد بن قاسم کی قیادت میں ایک فوجی کی حیثیت سے واردِ سندھ ہوئے اور پھر اسی خطۂ ارض میں اقامت گزیں ہوگئے۔

مولانا ممدوح کے والد گرامی کا اسم گرامی مولانا عبدالواحد تھا جو (سابق) ریاست بہاول پور کے ایک گاؤں کوٹلہ شیخاں میں سکونت پذیر تھے۔ اسی گاؤں میں ۱۳۰۲ھ میں مولانا عبدالحق پیدا ہوئے۔ یہ والدین کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان سے پہلے جو بھائی پیدا ہوئے، سب وفات پاگئے تھے۔ والدین نے ان کی بہت اچھی طرح تربیت کی۔ والد نام دار عالم دین تھے، اس لیے انھوں نے بیٹے کو اپنی نگرانی میں گھر میں تعلیم دینے کا سلسلہ شروع کیا اور قرآنِ مجید، اردو، فارسی اور صرف ونحو وغیرہ علوم کی کتابیں خود پڑھائیں۔ کچھ بڑے ہوئے تو والد کے حکم سے ملتان، بٹالہ، امرتسر اور دہلی وغیرہ کے جید علما کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے حصولِ علم کیا۔ ان علما میں مندرجہ ذیل حضرات شامل ہیں۔

① مولانا عبدالتواب ملتانی، ② مولانا ابوالفضل محمد بن عبداللہ ریاستی، ③ مولانا ابواسماعیل ابراہیم بن عبداللہ لاہوری، ④ مولانا ابوعبداللہ عثمان بن حسین عظیم آبادی، ⑤ مولانا ابوالحسن محمد بن حسین دہلوی، ⑥ مولانا محمد حسین بٹالوی، ⑦ مولانا ثناء اللہ امرتسری، ⑧ شیخ ابوالقاسم عیسیٰ بن احمد راعی، ⑨ شیخ ابوالفضل امام الدین بن محمد بن ماجہ قسمری، ⑩ شیخ ابوعبدالرب محمد بن ابومحمد علیطی، ⑪ شیخ ابو یسار محمد بن عبداللہ علیطی، ⑫ شیخ احمد بن عبداللہ بن سالم بغدادی، ⑬ شیخ ابومحمد بن محمود طنافسی، ⑭ شیخ احمد بن حیدر ہاشمی، ⑮ مولانا ابوادریس بن عبدالوہاب سکندر آبادی، ⑯ شیخ ابومحمد ہبۃ اللہ بن محمود الملانی، ⑰ شیخ خلیل بن محمد بن حسین بن محسن انصاری، ⑱ شیخ سعید بن محمد مکی،

⑲ شیخ عمر بن ابو بکر مغربی مکی، ⑳ شیخ ہبۃ اللہ ابو محمد مہدوی۔

ان حضرات کے علاوہ بھی انھوں نے متعدد اصحابِ حدیث وفقہ سے شرف فیض حاصل کیا۔ ان میں سے کسی سے کتب تفسیر پڑھیں، کسی سے علوم حدیث کی مختلف کتابوں کی تکمیل کی، کسی سے عربی ادبیات کا درس لیا، کسی سے اصولِ حدیث اور اصول فقہ کی کتابیں پڑھیں، کسی سے معانی وبیان کی مروّجہ کتابیں پڑھیں۔

مولانا عبدالحق ہاشمی اپنے عہد کے بہت بڑے عالم، جلیل القدر محدث، نہایت ذہین، کثیر المطالعہ، سریع الفہم اور پرتاثیر خطیب تھے۔

تکمیل تعلیم کے بعد مولانا ممدوح نے اپنے مولد ومسکن کوٹلہ شیخاں میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ پھر ایک وقت آیا کہ وہاں سے نقل مکانی کر کے ایک جگہ ''مہند'' چلے گئے۔ وہاں بھی درس وتدریس کی خدمت میں مصروف ہوئے۔ ''مہند'' وہاں کی ایک برادری کا نام ہے۔ وہاں مولانا عبدالحق ہاشمی کے ایک مخلص دوست حاجی عبداللہ رہتے تھے، وہی انھیں وہاں لے کر گئے تھے۔ وہاں وہ دو سال مقیم رہے اور بہت سے شائقین علم نے ان سے حصول علم کیا۔

اسی اثنا میں احمد پور شرقیہ کے لوگ ان کے پاس پہنچے اور انھیں احمد پور شرقیہ جانے کی دعوت دی۔ احمد پور شرقیہ چوں کہ اس علاقے کا مرکزی مقام تھا اور وہاں خدمت دین کے زیادہ مواقع میسر تھے، اس لیے مولانا ممدوح نے وہاں کے لوگوں کی دعوت قبول کی اور وہاں کے محلّہ کٹڑا احمد خاں میں فروکش ہوئے۔ احمد پور شرقیہ جا کر ان کے تبلیغی اثرات بہت پھیلے اور وہاں ایک اچھی خاصی جماعت قائم ہوگئی۔ وہ وہاں کی جامع مسجد کے خطیب تھے اور لوگ ان کے طریق تبلیغ سے نہایت متاثر تھے۔ اس شہر میں انھوں نے پچیس سال فریضہ تبلیغ سرانجام دیا۔ ان کی کوشش سے جماعت اہل حدیث کا ایک بہت بڑا تبلیغی جلسہ بھی وہاں منعقد ہوا۔ یہ اس علاقے میں جماعت اہل حدیث کا پہلا بڑا جلسہ تھا، جس میں مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، مولانا عبدالتواب علی گڑھی، مولانا محمد جونا گڑھی، مولانا ابوالقاسم بنارسی اور دیگر بہت سے مشہور علماے اہل حدیث تشریف لائے۔ اس وقت اس علاقے میں آمد ورفت کی سہولتیں حاصل نہیں تھیں۔ لوگ پیدل یا اونٹوں، گھوڑوں اور بیل گاڑیوں پر سفر کرتے تھے۔ اس کے باوجود دور دراز سے علماے کرام وہاں پہنچے اور ان کی تقریریں ہوئیں۔

اس سے دو چیزوں کا پتا چلتا ہے۔ ایک یہ کہ مولانا عبدالحق ہاشمی کو اس عہد کے معروف علما میں بڑے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا کہ وہ ان کے کہنے سے علی گڑھ، دہلی، بنارس، امرتسر، سیالکوٹ اور دوسرے شہروں سے تکلیف دہ سفر طے کر کے احمد پور شرقیہ گئے۔ دوسرے یہ پتا چلتا ہے کہ اس

دور کے علمائے اہل حدیث اپنے مسلک کی اشاعت وتبلیغ کے لیے ہر وقت تیار رہتے اور بڑے شوق سے تکلیفیں اٹھا کر دور دراز کے غیر معروف مقامات کا عزم کر لیتے تھے۔

مولانا عبدالحق ہاشمی پچیس سال احمد پور شرقیہ کے منصب خطابت پر متمکن رہے۔ ان کی خطابت کی وجہ سے گھر گھر اسلام کا چرچا ہوا اور لوگ کثیر تعداد میں صراطِ مستقیم پر گام زن ہوئے۔ اس اثنا میں ان کی مسند درس نے بھی خوب شہرت پائی اور بہت سے اہل علم نے ان کے حضور زانوئے شاگردی تہ کیے۔ ان کے شاگردوں کی صحیح تعداد کا تو شاید کسی کو بھی علم نہیں ہوگا، لیکن ان کے جن معروف شاگردوں کا پتا چل سکا ہے ان میں شیخ الحدیث مولانا سلطان محمود (جلال پور پیر والا) مولانا سید بدیع الدین شاہ راشدی پیر آف جھنڈا، مولانا عبدالکریم (سابق مدرس جامعہ سلفیہ فیصل آباد) اور خود مولانا ہاشمی کے فرزند کبیر مولانا عبدالرزاق شامل ہیں۔

مولانا ہاشمی کا دائرہ تبلیغ اور حلقہ خطابت بہت وسیع تھا۔ وہ سرائیکی زبان کے بہت بڑے مقرر اور معروف واعظ تھے۔ ملتان، مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خاں، جام پور، جھنگ، شور کوٹ، بہاول پور، بہاول نگر وغیرہ کے علاقوں میں ان کی دعوت وتبلیغ کی دھوم تھی اور لوگ شوق اور غور سے ان کے مواعظ سنتے اور ان کے طرزِ وعظ سے متاثر ہوتے تھے۔

ان علاقوں کے علاوہ متحدہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بھی وہ وعظ وارشاد کے لیے جاتے اور تبلیغی جلسوں میں شرکت فرماتے تھے۔ پنجاب میں امرتسر اور بٹالہ کے علاوہ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں دہلی اور علی گڑھ میں بھی ان کو دعوتِ شرکت دی جاتی تھی اور وہ ان جلسوں میں تقریریں کرتے تھے۔

ریاست بہاول پور میں بہت سے علما پیدا ہوئے اور ان میں سے بعض علما نے بڑی خدمات انجام دیں لیکن مولانا عبدالحق ہاشمی ان میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ وہ کثیر الجہات عالم تھے اور اللہ نے ان کو بہت سی خصوصیات سے نوازا تھا۔ وہ سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور کھلے جنگل میں اونٹ چراتے تھے۔ طلبا کی جماعت ان کے ہم رکاب ہوتی تھی اور وہ اونٹ چرانے کے ساتھ ساتھ انھیں پڑھاتے بھی جاتے تھے۔ کتابوں پر استحضار کا یہ عالم تھا کہ ان کے صفحوں کے صفحے زبانی یاد تھے اور مشکل سے مشکل مسائل چند لمحوں میں آسانی سے حل کر دیتے تھے۔ طلبا ان کے طریق تدریس سے بہت مطمئن تھے۔

تدریس کے علاوہ ان میں دوسری خوبی وعظ کی تھی۔ وہ خالص کتاب وسنت کی روشنی میں تقریر کرتے تھے اور لوگوں کی سمجھ اور ذہن کے مطابق آسان زبان میں انھیں امور خیر کی تلقین فرماتے تھے۔ ان کی زبان میں اتنی مٹھاس تھی اور اتنا اثر تھا کہ ان کے وعظ سن کر بے شمار بے عمل مسلمان

برائی ترک کر کے راہِ مستقیم پر گام فرسا ہوئے اور بہت سے غیر مسلمانوں نے اسلام قبول کیا اور اپنی زندگیاں اشاعت اسلام کے لیے وقف کر دیں۔

وہ اپنے عہد کے مشہور مناظر بھی تھے۔ بہت سے غیر مذاہب کے مناظروں (ہندوؤں اور عیسائیوں) کے ساتھ اسلام کی حقانیت کے موضوع پر مناظرے کیے اور اللہ نے انھیں کامیابی سے نوازا۔ بعض اختلافی مسائل پر احناف اور شیعہ حضرات سے بھی ان کی بحثیں رہیں۔ مرزائیوں سے بھی ان کے مباحثے ہوئے۔

تیسری خوبی اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ عطا فرمائی تھی کہ وہ قلم وقرطاس سے گہرا رابطہ رکھتے تھے اور تحریر ونگارش سے انھیں بے حد تعلق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصنیفات کے دائرے نے بڑی وسعت اختیار کی اور ان کا شمار (جیسا کہ آگے آرہا ہے) پچاس سے اوپر پہنچا۔ تقریر اور تدریس کے ساتھ تصنیف کا یہ عمل ان کی فراوانیٔ معلومات کا عکاس اور کثرتِ مطالعہ کا غماز ہے۔

چوتھی خصوصیت بارگاہِ الٰہی سے انھیں یہ ودیعت فرمائی گئی تھی کہ نیکی اور صالحیت میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ تہجد گزار اور ذکر خداوندی کی دولت سے مال مال۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے جو ان کے حصے میں آئی۔

ان کا پانچواں وصف زبان کی نرمی تھا۔ ہر شخص سے پیار کے لہجے میں مخاطب ہوتے۔ لوگوں کے باہمی نزاع ختم کرانا اور مدت کے روٹے ہوؤں کو گلے ملا دینا ان کا کمال تھا۔ اللہ نے ان کی زبان میں ایسا اثر بھر دیا تھا کہ جس سے بات کی اس نے بے حد توجہ سے سنی اور آپس کے پرانے گلے شکوے دور ہو گئے۔

مولانا ممدوح کی زندگی کے کم وبیش ساٹھ سال تصنیف وتدریس اور وعظ وخطابت میں گزرے۔ انھوں نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں۔

(۱) تفسیر القرآن الکریم: اس تفسیر کی نو جلدیں لکھی گئیں۔ لیکن مکمل نہیں ہوئی، (۲) نصرة الباری فی شرح تراجم البخاری: چار جلدوں میں، (۳)مشارق الانوار فی شرح مافی الموطا والصحیحین من الاخبار: چودہ جلدوں میں، (٤) مفتاح الموطا والصحیحین: سات جلدیں، (٥) کتاب اللباب فی شرح التراجم والابواب: سات جلدیں، (٨) اطراف المسند: دو جلدیں، (٩) تراجم رجال المسند: چار جلدیں، (١٠)شرح مقدمہ صحیح مسلم: ایک جلد، (١١) ثبت المرویات: ایک جلد، (١٢) تراجم رجال الصحیحین: ایک جلد، (١٣) کتاب النحو: ایک جلد، (١٤) رفع اللومه عن واضح الیدین فی القومه، (١٥) کتاب الاربعین علی سید الکونین، (١٦)کتاب

التامین بالجهر: ایک جلد، (۱۷) کتاب رفع الیدین فی الصلوٰۃ: ایک جلد، (۱۸) کتاب القرأۃ خلف الامام: ایک جلد، (۱۹) کتاب الخلافۃ الراشدۃ: ایک جلد، (۲۰) کتاب الجهاد: ایک جز، (۲۱) کتاب احوال الحشر: ایک جلد، (۲۲) کتاب کشف الاقناع فی الدعاء بعد الصلوٰۃ بحالۃ الاجتماع، (۲۳) فتح الودود فی رفع الیدین عند السجود، (۲۴) مصنف الصحیحین: نو جلدیں، (۲۵) کتاب الجمع بین منظومۃ الامیر الیمانی، والفیۃ العراقی والسیوطی، (۲۶) شرح منظومۃ الامیر الیمانی، (۲۷) شرح الفیۃ السیوطی، (۲۸) کتاب المغازی، (۲۹) کتاب السیر: ایک جلد، (۳۰) مقدمه شرح المسند لامام احمد، ایک جلد، (۳۱) قبائح الیهود، (۳۴) دلائل الرسالۃ المحمدیه، (۳۵) کتاب تخریج احادیث المسند، (۳۶) الجمع بین الصحاح الستۃ: نامکمل، (۳۷) خبر الخبر فی شرح حمال الاثر: نامکمل، (۳۸) البلور العارجۃ فی الفصحٰی والدارجۃ، (۳۹) کتاب الفوائد والتعقبات، (۴۰) کشف الغمزہ عن المتردد فی میقات المکی للعمرۃ، (۴۱) اقامۃ الحجۃ بان المتمتع علیه السعیان سعی العمرۃ وسعی الحجۃ، (۴۲) نصب العمود فی تحقیق مسئلۃ تجافی المرأۃ فی الرکوع والسجود، (۴۳) الموازنۃ بین مسندی الامامین احمد بن حنبل وبقی بن مخلد، (۴۴) مسئلۃ الزکوٰۃ فیما زاد علی النصاب، (۴۵) اجازۃ الروایۃ، (۴۶) اثبات ان الحجر والمقام من الجنۃ، (۴۷) تحقیق حدیث صلاۃ موسیٰ علیه السلام فی قبرہ، (۴۸) الرباعیات المنسوبۃ الی البخاری رحمہ اللہ (۴۹) اذان الترجیع سنۃ متروکۃ، (۵۰) قدم اصاب الحدیث، (۵۱) تحقیق مسئلۃ حرم المدینۃ، (۵۲) مسئلۃ اذان الجوق، (۵۳) مناقشۃ امالی محمود الحسن حول صحیح البخاری، (۵۴) اثبات تزویج ام کلثوم من عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔

مولانا عبدالحق ہاشمی نے ان کتابوں کے علاوہ بھی کتابیں لکھیں اور مختلف تحقیقی موضوعات پر مقالے تحریر کیے جو مسودات ومخطوطات کی صورت میں ان کے فرزند گرامی (مولانا عبدالوکیل نزیل مکہ مکرمہ) کے پاس محفوظ ہیں۔ ان کی زیادہ تر کتابیں عربی زبان میں ہیں۔ ان کتابوں کے اسما وعنوانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ممدوح اپنے دور کے عظیم اور زود نویس مصنف تھے۔ اور قرآن، حدیث، فقہ، عربی ادب اور تاریخ پر عمیق نگاہ رکھتے تھے۔

موجودہ سعودی خاندان سے قبل حجاز ونجد پر شریفی حکمران قابض تھے اور مولانا عبدالحق ہاشمی کو ان سے شدید نفرت تھی۔ موجودہ شاہ عبداللہ کے والد سلطان عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن (آلِ سعود) نے حجاز فتح کیا تو مولانا عبدالحق اور ان کے ہم خیال حضرات نے بے حد مسرت کا اظہار کیا اور ایک وفد

کے ساتھ حجاز پہنچے۔ سلطان عبدالعزیز کو فتح کی مبارک باد پیش کی اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس سے کئی سال بعد ۱۳٦۸ھ (۱۹۴۹ء) میں سلطان نے مولانا کو مکہ مکرمہ تشریف لانے اور بیت اللہ شریف میں قرآن وحدیث کا درس دینے کی دعوت دی۔ اس وقت اپنے آبائی وطن احمد پور شرقیہ میں ان کا سلسلہ تدریس جاری تھا۔ سلطان عبدالعزیز (ابن سعود) کی دعوت پر وہ حجاز تشریف لے گئے اور بیت اللہ شریف میں خدمت تدریس سرانجام دینے لگے۔ ان کے یہاں سے جانے سے ان طلبا کو بہت پریشانی ہوئی جو ریاست بہاول پور اور پنجاب وغیرہ کے علاقوں سے تعلق رکھتے اور مولانا کے حلقہ شاگردی میں شامل تھے۔ لیکن نجد وحجاز اور دیگر ممالک اور افریقہ وغیرہ کے طلبا ان کے نہج تدریس اور علم وفضل سے بے حد متاثر اور مستفید ہوئے۔

نبی ﷺ کی ذات ستودہ صفات اور آپ کی احادیث مبارکہ سے مولانا ہاشمی کو انتہائی قلبی محبت تھی۔ نبی ﷺ سے متعلق مولانا ہاشمی کے چند خواب ان کے پوتے پروفیسر محمد اسرائیل (انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور) نے اپنے ایک مضمون میں درج کیے ہیں۔ یہ اس زمانے کے خواب ہیں جب مولانا ممدوح طلب علم حدیث میں مصروف تھے، ملاحظہ فرمائیے۔

① ...... انھوں نے دیکھا کہ نبی ﷺ ان کے آگے سے گزرے۔ نبی ﷺ سفید لباس پہنے ہوئے ہیں اور آپ کا چہرہ مبارک چاند کی طرح چمک رہا ہے۔

② ...... ایک مرتبہ نبی ﷺ کی اس طرح زیارت ہوئی کہ آپ نہایت خوب صورت لباس میں کرسی پر تشریف فرما ہیں اور آسمان سے اترے ہیں۔ (مولانا فرماتے ہیں) نبی ﷺ نے مجھ سے معانقہ فرمایا۔

③ ...... تیسری بار مولانا ممدوح نے نبی ﷺ کو اس حالت میں دیکھا کہ وہ ایک آدمی کے ساتھ مل کر نبی ﷺ کا جنازہ مبارک اٹھائے ہوئے ہیں (مولانا فرماتے ہیں) کیفیت یہ ہے کہ میں نبی ﷺ کو سر مبارک کی طرف سے اور دوسرا آدمی آپ کے پاؤں مبارک کی طرف سے اٹھائے ہوئے ہے۔ میں اسی حالت میں پانی میں داخل ہو جاتا ہوں۔ خواب ہی میں میرے دل میں القا ہوا کہ میں نبی ﷺ کی مردہ سنتوں کو زندہ کروں گا۔

④ ...... چوتھی مرتبہ مولانا نے نبی ﷺ کی زیارت آپ کے حجرہ مبارک میں کی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے ایک بڑا رجسٹر پڑا ہے۔ مولانا ممدوح نے نبی ﷺ سے ایک صحابی کا نام پوچھا۔ آپ نے فرمایا اس رجسٹر میں دیکھو۔ مولانا نے اس رجسٹر میں اس صحابی کا نام لکھا ہوا دیکھا۔

⑤ ...... مولانا فرماتے ہیں کہ میری والدہ نے نبی ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ آپ ہمارے گھر میں تشریف فرما ہیں۔ نبی ﷺ نے مجھے بلایا۔ میرے ہاتھ میں قلم دوات ہے۔ نبی ﷺ مجھے املا

فرماتے ہیں اور میں لکھ رہا ہوں۔ میری والدہ ہمارے قریب آئیں تو نبی ﷺ اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ میں بھی آپ کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر ہم دوسرے کمرے میں گئے اور آپ مجھے لکھوانے لگے۔

(مولانا نے یہ تمام خواب بقول پروفیسر محمد اسرائیل اپنے فرزند مولانا ابوتراب لظاہری کو نوٹ کرائے)

۱۴۔ رمضان المبارک ۱۳۹۲ھ (۲۳۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء) کو مولانا پر فالج کا حملہ ہوا۔ مولانا کو اس سے تکلیف تو بہت ہوئی، لیکن کسی نہ کسی صورت میں تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور طلبا کو صحیح بخاری پڑھاتے رہے۔

مولانا ہاشمی نے ۱۷۔ شوال ۱۳۹۲ھ (۲۲۔ نومبر ۱۹۷۲ء) کو بوقت ظہر مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔ ان کا جنازہ امام کعبہ کی اقتدا میں کعبۃ اللہ میں نماز مغرب کے بعد پڑھا گیا، جس میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ پھر (راتوں رات) ان کی وصیت کے مطابق ان کی میت مدینہ طیبہ پہنچائی گئی اور صبح کو مسجد نبوی میں ان کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔

پھر انھیں پاکستانی وقت کے مطابق صبح آٹھ بجے اور مقامی وقت کے مطابق صبح چھ بجے قبرستان جنت البقیع میں دفن کردیا گیا۔ ان کی قبر امام مالک رحمہ اللہ، مدینہ منورہ کے شیخ القراء امام نافع رحمہ اللہ، نبی ﷺ کے مشہور صحابی حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فرزند عالی مرتب حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی قبروں کے درمیان ہے۔

مولانا مرحوم نے نوے (۹۰) سال عمر پائی۔

مولانا عبدالحق ہاشمی کے کئی بیٹے تھے۔ پھر آگے ان کے بیٹوں کے بیٹوں کی تعداد سنا ہے کہ ماشاء اللہ بہت پھیلی ہوئی ہے۔ سب حضرات اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور اچھے مناصب پر فائز ہیں۔ لیکن میں ذاتی طور پر ان میں سے صرف تین حضرات کو جانتا ہوں۔

اس خاندان کے پہلے بزرگ جنھیں میں جانتا تھا مولانا عبدالحق ہاشمی کے فرزند کبیر مولانا عبدالرزاق تھے، جنھیں وہ مکہ مکرمہ جاتے وقت احمد پور شرقیہ میں اپنا جانشین مقرر کر گئے تھے۔ وہ وہاں کے ہائی سکول میں پڑھاتے تھے اور لائق احترام باپ کی طرح بہت بڑے واعظ اور مقرر تھے۔ میرا ان سے پہلا تعارف جون ۱۹۵۰ء میں ہوا تھا، جب کہ میں ہفت روزہ "الاعتصام" کی توسیع اشاعت کے لیے جنوبی پنجاب کے بعض علاقوں میں گیا تھا۔ احمد پور شرقیہ میں اور مولانا عبدالعزیز سعیدی اکٹھے گئے اور مولانا عبدالرزاق سے ملے۔ اس کے بعد وہ دو یا تین مرتبہ لاہور تشریف لائے تو ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ بلند اخلاق عالم دین تھے اور میٹھے لہجے میں بات کرتے تھے۔ ان کی وفات ۱۱۔ اپریل ۱۹۸۶ء کو ہوئی۔

مولانا عبدالحق ہاشمی کے قابلِ تکریم خاندان کے دوسرے رکن جن سے میرا تعارف ہوا، ان کے صاحب زادے مولانا عبدالوکیل ہیں جو مکہ مکرمہ میں اقامت فرما ہیں۔ وہ کچھ عرصہ عالی قدر والد کی وفات کے بعد ان کی جگہ بیت اللہ شریف میں خدمت تدریس بھی انجام دیتے رہے۔ ان سے میرا تعارف مارچ ۲۰۰۰ء میں بیت اللہ شریف میں ہوا تھا۔ وہ زندہ دل اور خوش ذوق عالم دین ہیں۔ گفتگو میں خود بھی خوش رہتے ہیں اور حاضرینِ مجلس کو بھی خوش رکھتے ہیں۔

ازراہِ کرم ۱۸۔ مارچ ۲۰۰۰ء کو انھوں نے مجھے کھانے کی دعوت دی اور نمازِ عشا کے بعد بیت اللہ شریف سے اپنے دولت کدہ پر لے گئے۔ سات آٹھ اور دوست بھی تھے۔ پرتکلف کھانا کھلایا اور دلچسپ باتیں کیں۔ اس موقعے پر انھوں نے اپنے والد مکرم حضرت مولانا عبدالحق ہاشمی کے مسودات ومخطوطات کی زیارت کرائی۔ تعجب انگیز مسرت ہوئی کہ اس ایک شخص نے اتنا کچھ سپردِ قلم کردیا۔ بے شبہ وہ جلیل القدر عالم ومصنف تھے۔

وہ علمی اور تحقیقی مسودات ہیں۔ کسی زمانے میں سنا تھا کہ سعودی حکومت کی طرف سے ان کی اشاعت کے اشارے ملے ہیں، لیکن میرے خیال میں ایسا ہونا مشکل ہے۔ مولانا مرحوم کے پوتے اور ان کے اخلاف ماشاء اللہ سب آسودہ حال ہیں۔ دوسروں کی طرف دیکھنے کے بجائے انھیں چاہیے کہ اپنے عالم وفاضل بزرگ کے اہم مسودات کی اشاعت کا خود ہی اہتمام کریں۔

حضرت مولانا عبدالحق ہاشمی کے اخلاف میں سے تیسرے ذی اکرام رکن جن سے میرا تعلق ہے، پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد اسرائیل ہیں جو انجینئرنگ یونیورسٹی (لاہور) کے شعبہ علوم اسلامیہ کے صدر ہیں۔ ماشاء اللہ یونیورسٹی کی مسجد کے خطیب بھی ہیں۔ ان کے علم وفضل کا اندازہ ان کی ڈگری اور عہدے سے ہوجاتا ہے۔ مولانا عبدالرزاق مرحوم کے فرزند گرامی اور مولانا عبدالحق ہاشمی کے پوتے ہیں۔ کئی سال سے ان سے میرے مراسم ہیں۔ اگرچہ ان سے ملاقات کا موقع بہت کم ملتا ہے تاہم بے تکلفی کی بنا پر میں ان سے ہر زبان اور ہر لہجے میں بات کرسکتا ہوں۔ انھیں اپنے جد امجد کے علمی ترکے کی بہ صورتِ اشاعت حفاظت کے لیے کوشاں ہونا چاہیے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ اس گھرانے کے مرحومین کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور موجودین کو خیر وعافیت سے رکھے اور انھیں اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق سے نوازے۔ نیز انھیں ہمت عطا فرمائے کہ اپنے والد گرامی اور جد امجد کے ضروری علمی مسودات کی اشاعت کا اہتمام کریں۔ پڑھے لکھے لوگ اس سے استفادہ کریں گے اور آخرت میں یہ عمل ان کے لیے باعث مغفرت ثابت ہوگا۔ میں نے یہ واعظانہ الفاظ لکھ تو دیے ہیں، لیکن ہمارے وعظ پر عمل کوئی نہیں کرے گا۔ صرف یہی بار بار کہا جائے گا کہ ہمارے دادا بہت بڑے واعظ بہت بڑے عالم اور بہت

بڑے مصنف تھے۔ مکہ مکرمہ میں رہتے تھے۔ وہاں انھوں نے بے شمار لوگوں کو قرآن وحدیث کی تعلیم دی۔

مندرجہ ذیل حوالہ جات کی مدد سے یہ چند صفحات ترتیب دے گئے ہیں۔

① ...... جناب عمر عبدالجبار کا مختصر سا عربی مضمون جو ان کو خود مولانا عبدالحق ہاشمی مرحوم نے ۱۰۔ ذیقعدہ ۱۳۷۹ھ (۶۔ مئی ۱۹۶۰ء) کو اپنے متعلق املا کرایا۔

② ...... مضمون شیخ عبدالرشید صدیقی مرحوم۔ شائع شدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' (لاہور) مورخہ ۸۔ دسمبر ۱۹۷۲ء۔

③ ...... پروفیسر محمد اسرائیل صاحب کا مضمون۔ بہ عنوان ''مولانا ابومحمد عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کے حالات''

④ ...... مولانا سلطان محمود محدث جلال پوری۔ تصنیف مولانا محمد رفیق اثری۔ (۲۰۰۶ء) مختلف مقامات۔

اپنے موضوع کی یہ ایک اہم کتاب ہے، جس میں محترم المقام مولانا محمد رفیق اثری شیخ الحدیث جلال پور پیر والا نے ایک خاص انداز میں بہت سے بزرگانِ دین کے حالات جمع فرمادیے ہیں۔ اس عظیم خدمت پر اللہ انھیں جزائے خیر سے نوازے، آمین۔



مولانا عبدالغفار حسن

قطعیت کے ساتھ کسی تاریخ کا تعین کرنا تو مشکل ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ۱۹۴۰ء کے پس وپیش کی بات ہے۔ میں اس وقت فیروز پور میں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف مرحوم ومغفور رحمہ اللہ کے حلقہ درس میں شامل تھا اور عمر چودہ پندرہ سال کی تھی۔ میں نے دیکھا کہ مولانا مرحوم ایک صاحب کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے مسجد میں وضو کرنے والی جگہ پر تشریف لائے اور دونوں نے ایک دوسرے کے قریب بیٹھ کر وضو کیا۔ ان دونوں بزرگوں کو چشم تصور میں اب بھی میں وضو کے لیے آتے اور وضو کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں ...... میانہ قد، لاغر اندام، چمک دار آنکھیں، پتلی سی مختصر مگر پوری سیاہ داڑھی، سفید لٹھے کا کرتا پاجامہ پہنے ہوئے۔ یہ تھے وہ صاحب جو مولانا عطاء اللہ صاحب کے ساتھ وضو کے لیے تشریف لائے۔ معلوم ہوا کہ یہ مولانا عبدالغفار حسن ہیں اور مالیر کوٹلہ میں قیام فرما ہیں۔ جن لوگوں نے کامل احترام کے ساتھ ان سے مصافحہ کیا، ان میں یہ فقیر بھی شامل تھا۔ مولانا عبدالغفار حسن ایک یا دو دن مولانا عطاء اللہ صاحب مرحوم کے ہاں بہ طور مہمان مقیم رہے۔

اس اثنا میں ان دونوں بزرگوں نے آپس میں جو باتیں کیں اور جس موضوع پر کیں، اس کا مجھے علم نہیں۔ نہ ان کی باتیں سنیں اور نہ ان باتوں سے میرا کوئی تعلق تھا۔ اگر کوئی بات سنی بھی ہوگی تو اتنے لمبے عرصے تک کیوں کر ذہن میں محفوظ رہ سکتی ہے۔

ان ابتدائی الفاظ کے بعد آیئے آئندہ سطور میں پہلے مولانا عبدالغفار حسن کا خاندانی پس منظر بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد مولانا کے بارے میں گزارشات پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

مولانا عبدالغفار حسن متحدہ ہندوستان کے بہت بڑے علمی خاندان کے جلیل القدر رکن تھے۔ ان کا مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے: مولانا عبدالغفار حسن بن حافظ عبدالستار بن مولانا عبدالجبار بن منشی بدرالدین عمرپوری رحمہم اللہ۔

کسی زمانے میں ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ضلع مظفر نگر میں ایک گاؤں ”عمر پور“ تھا جس کے متعلق سنا تھا کہ آبادی اور حجم کے اعتبار سے بہت مختصر اور بہت چھوٹا، لیکن علمائے دین کی کثرت اور ان کی علمی سرگرمیوں کی وجہ سے بہت بڑا اور بہت مشہور گاؤں ہے۔ پورے ہندوستان میں

گاؤں کے اہل علم کی علمی جدو جہد کا سلسلہ جاری تھا۔ [1]

یہی وہ گاؤں ہے جہاں مولانا عبدالغفار حسن کے آباو اجداد سکونت پذیر تھے۔ اسی گاؤں میں مولانا عبدالغفار حسن پیدا ہوئے، اسی گاؤں میں ان کے شعور نے کروٹ لی اور یہیں انھوں نے خرد کی دہلیز پر قدم رکھا۔ پھر یہیں سے علم و فضل کی وادیوں کی طرف گام زن ہوئے اور ان حسین وخوشنما وادیوں کے بہت سے طویل سفر طے کیے۔ ہر سفر دلآویز اور ہر سفر کی ہر راہ روح نواز ......!

حضرت مولانا عبدالجبار عمر پوریؒ

یوں تو مولانا عبدالغفار حسن کے آباو اجداد کے سبھی ارکان فضل وکمال کی دولت سے بہرہ یاب تھے، لیکن ان کے جد امجد حضرت مولانا عبدالجبار عمر پوری کو اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے علم وعمل اور ادراک وعرفان کی نعمتِ بے بہا سے نوازا تھا۔ لہٰذا اسی عظیم القدر شخصیت سے اس رفیع الشان خاندان کے اصحابِ کمال کے تذکرے کا آغاز کیا جاتا ہے۔

مولانا ممدوح جمادی الاخریٰ ۱۲۷۷ھ (جنوری ۱۸۶۱ء) کو اپنے آبائی گاؤں موضع عمر پور (ضلع مظفر نگر) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ عمر کی چند منزلیں طے کیں تو گھر سے باہر نکلے اور تحصیل علم کے لیے کوشاں ہوئے، جس کی مختصر الفاظ میں تفصیل یہ ہے:

- ...... امرتسر جا کر علمائے غزنویہ اور وہاں کے بعض دیگر اصحابِ تدریس سے استفادہ کیا۔ علمائے غزنویہ میں اس وقت حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی، مولانا عبدالرحیم غزنوی، مولانا عبدالغفور غزنوی اور مولانا عبد الاوّل غزنوی ایسے اصحابِ فضیلت اساتذہ مساند تدریس پر فائز تھے اور طلبا جہاں ان سے علم حاصل کرتے، وہاں ان کی روحانیت سے بھی فیض یاب ہوتے تھے۔ مولانا عبدالجبار عمر پوری نے بھی ان بزرگانِ عالی قدر سے یہ نعمت حاصل کی۔
- ...... مولانا محمد مظہر نانوتوی سے فقہ، اصولِ فقہ اور حدیث کی چند کتابیں پڑھیں۔
- ...... سہارن پور میں مولانا احمد علی سہارن پوری سے فقہ واصول اور بعض کتب حدیث کا درس لیا۔
- ...... مولانا فیض الحسن سہارن پوری سے عربی ادبیات اور علم بلاغت میں استفادہ کیا۔

---

[1] ...... کچھ عرصہ پیشتر کاندھلہ (ضلع مظفر نگر) سے میرے نام مولانا نور الحق راشد کا خط آیا تھا، جس میں انھوں نے مجھ سے عمر پور کے موجودہ اصحابِ علم کے بارے میں دریافت فرمایا تھا اور لکھا تھا کہ کاندھلہ سے عمر پور تیس کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ کسی زمانے میں یہ بہت بارونق گاؤں تھا، اب اس کی علمی رونقیں بھی ختم ہوگئی ہیں اور آبادی کے لحاظ سے بھی اس کی پرانی حیثیت کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ میں نے ان کو جواب میں مولانا عبدالغفار حسن اور ان کے صاحب زادوں کے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچا دی تھیں۔

○...... حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوکر ان سے بخاری، مسلم، نسائی، ابن ماجہ وغیرہ کتابوں کی تکمیل کی۔ کتب تفسیر بھی حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں اور سند لی۔ یہ ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) کی بات ہے۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال کی تھی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد دہلی تشریف لے آئے اور پھر اسی شہر کو اپنی تدریسی اور تصنیفی سرگرمیوں کا مرکز قرار دے لیا۔

دہلی کے علاقہ کشن گنج میں (جسے اس وقت حسن گنج بھی کہا جاتا تھا) مدرسہ دار الہدیٰ میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ نمازِ فجر کے بعد عام نمازیوں کے لیے بھی روزانہ درس قرآنِ مجید دیتے تھے۔ بہت سے علما وطلبا نے ان سے اکتسابِ علم کیا۔ ان کے شاگردوں کی وسیع فہرست میں مشہور ادیب ومحقق مولانا عبدالعزیز میمنی، معروف عالم حدیث مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی اور مولانا حافظ عبدالستار شامل ہیں۔ حافظ صاحب مولانا عبدالجبار عمر پوری کے فرزند ارجمند تھے۔

صحافتی خدمات

مولانا عبد الجبار عمر پوری رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۰۲ء میں کلکتہ سے ''ضیاء السنۃ'' کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا تھا جو ان کے چھوٹے بھائی مولانا ضیاء الرحمٰن صاحب عمر پوری کے اہتمام میں شائع ہوتا تھا۔ اس رسالے میں مشہور منکر حدیث عبداللہ چکڑالوی کے عقیدۂ انکارِ حدیث کے خلاف نہایت زور دار قسط وار مضامین شائع ہوئے۔ یہ مضامین خود حضرت مولانا عبدالجبار عمر پوری نے تحریر فرمائے تھے۔ انھوں نے مضبوط دلائل سے ثابت کیا کہ نبی ﷺ کی احادیث مبارکہ کو ماننا اور ان پر عمل کرنا انتہائی ضروری ہے۔ احادیث کے بغیر نہ اسلام کو سمجھا جاسکتا ہے اور نہ انسان مسلمان ہوسکتا ہے۔ حدیث احکام اسلام کا بنیادی ماخذ ہے۔ علاوہ ازیں اس رسالے میں نبی ﷺ کی بعثت، آپ کی حیاتِ مبارکہ کے واقعات، خلافت اسلامی، نبوت وخلافت، ردّ قادیانیت، ہندوستان میں عربی کے نامور شعرا، عصمت نبوی، معجزاتِ نبوی، فصاحت وبلاغت، شعر وسخن، عربی زبان کی خصوصیت وفوقیت وغیرہ عنوانات پر اہم مضامین اشاعت پذیر ہوتے تھے۔ عام مسائل کی وضاحت کے لیے ''باب الفتاویٰ'' بھی اس میں شامل تھا۔

اس ماہنامے میں مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری (شارح ترمذی) مولانا عبدالسلام مبارک پوری (مصنف سیرۃ البخاری) مولانا حکیم عبیدالرحمٰن عمر پوری (مدیر ماہنامہ ریاض التوحید) مولانا حافظ حکیم ابویحییٰ شاہ جہان پوری، مولانا ابوالنعمان اعظم گڑھی اور مولانا ضیاء الرحمٰن عمر پوری (برادرِ صغیر مولانا عبدالجبار عمر پوری) ایسے بلند پایہ علماے کرام کے مضامین شائع ہوتے تھے۔

تالیفات

مولانا عبدالجبار عمر پوری متعدد کتابوں کے مصنف تھے جن کے نام یہ ہیں:

(۱)...... صمصام التوحید فی رد التقلید۔

(۲)...... ارشاد السائلین الٰی مسائل الثلا ثین۔

(۳)...... تذکیر الاخوان فی خطبة الجمعة بکل لسان

(٤)...... تبصرة الانام فی فرضیة الجمعة فی کل مقام

(٥)...... ارشاد الانام فی فرضیة الفاتحة خلف الامام

حضرت مولانا عبدالجبار عمر پوری جہاں تفسیر وحدیث اور دوسرے علوم میں مہارت رکھتے تھے، وہاں شعر وشاعری سے بھی انھیں لگاؤ تھا۔ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے اور ماہنامہ ''ضیاء السنہ'' میں ان کا کلام چھپتا تھا۔

اس زمانے میں ندوۃ العلما (لکھنؤ) کے سالانہ جلسے ملک کے مختلف شہروں میں منعقد کیے جاتے تھے، جن میں اس عہد کے بڑے بڑے اصحابِ علم شرکت فرماتے اور تقریریں کرتے تھے۔ عربی، فارسی، اردو وغیرہ زبانوں میں شعرا نظمیں پڑھتے تھے۔ مولانا عبدالجبار عمر پوری بھی ندوہ کے جلسوں میں شامل ہوتے اور تقریر کے علاوہ اپنا شعری کلام سناتے تھے۔

وفات

تقویٰ اور پرہیز گاری میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو امتیاز بخشا تھا۔ اس ذی وقار عالم دین نے شوال ۱۳۳۴ھ (اگست ۱۹۱۶ء) کو دہلی میں وفات پائی اور اپنے استاذِ محترم حضرت میاں سید نذیر حسین کے قریب قبرستان شیدی پورہ میں دفن کیے گئے۔ صرف ۵۷ سال عمر پائی۔ اللھم اغفرلھم وارحمھم وعافھم واعف عنھم [1]

مولانا حافظ عبدالستار عمر پوریؒ

اب آیئے چند لمحے حضرت مولانا عبدالجبار عمر پوری کے فرزند دلبند مولانا حافظ عبدالستار عمر پوری رحمہ اللہ کی خدمت میں گزارتے ہیں۔ مولانا موصوف کا سالِ ولادت ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۴ء) ہے۔

[1] ...... تفصیل کے لیے دیکھیے: (۱) عظمت حدیث، تصنیف مولانا عبدالغفار حسن (بہ عنوان ''تعارف علمائے عمر پور'') (۲) ہفت روزہ ''الاعتصام'' (لاہور) کیم اپریل ۱۹۹۴ء۔ مضمون مولانا عبدالغفار حسن، (۳) تراجم علمائے حدیث ہند (مولانا ابویحییٰ امام خاں نوشہروی) ص: ۱۶۵

جن عالی قدر اساتذہ کے حضور انھوں نے زانوئے شاگردی تہ کیے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

① ...... مولانا عبدالرحمٰن معین الدین رحمہ اللہ عمرپوری۔ (ان کے لائق تکریم نانا تھے۔)

② ...... مولانا عبیدالرحمٰن رحمہ اللہ عمرپوری۔ (ان کے قابل احترام ماموں تھے۔)

③ ...... مولانا عبدالجبار رحمہ اللہ عمرپوری۔ (ان کے جلیل القدر والد تھے۔)

④ ...... مولانا محمد بشیر سہسوانی۔ (بہت بڑے عالم ومناظر اور مفسر ومحدث تھے۔)

حافظ عبدالستار بے حد ذہین تھے۔ قرآنِ مجید صرف تین ماہ میں حفظ کرلیا تھا۔ درسِ نظامی کی تکمیل مدرسہ احمدیہ سلفیہ آرہ (دربھنگا) میں کی۔

علمی خدمات

فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس وتدریس میں مشغول ہوگئے۔ تصنیف وتالیف کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ چناں چہ ایک رسالہ ''اثبات الخبر فی ردمنکری الحدیث والاثر'' کے نام سے لکھا اور ایک رسالہ مرزا قادیانی کے دعوائے نبوت کی تردید میں تحریر فرمایا۔

ان کے شاگردوں کی جماعت میں حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم ومغفور بھی شامل تھے۔ انھوں نے ان سے تفسیر ابن کثیر درساً درساً پڑھی تھی۔

آغاز عمر ہی میں حافظ عبدالستار زہد وپارسائی کا مرقع تھے۔ خلوص واتقا کی دولت اپنے آبا واجداد سے ورثے میں پائی تھی۔

جہاد سے شغف

جس طرح پڑھنے لکھنے میں تیز تھے، اسی طرح احکام اسلام پر عمل کرنے کے لیے بھی ہر وقت مستعد رہتے تھے۔ اسلام کا ایک بہت بڑا عمل اور حکم حالات کے مطابق جہاد ہے۔ مولانا مرحوم کو اس پر عمل کرنے کے لیے ہمیشہ بے تاب پایا گیا اور تمنائے شہادت ان کے دل میں ہر وقت موجزن رہتی تھی۔ اس کے لیے ورزش، تیراکی، گھڑسواری، بنوٹ، لاٹھی چلانا، پہلوانی وغیرہ یعنی اس وقت ورزش کے جو طریقے رائج تھے، ان سب میں انھوں نے مہارت حاصل کرلی تھی۔ اس سے ان کا اصل مقصد ان لوگوں کے ساتھ مل کر انگریزی حکومت کے خلاف عملاً جہاد کرنا تھا جو اس اہم کام میں مصروف تھے اور وہ تھے، مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور سید احمد شہید کے رفقائے کرام جو سرحد پار کے آزاد قبائل میں برصغیر کی انگریزی حکومت سے برسرپیکار تھے۔

حافظ عبدالستار صاحب سرحد پار کے مجاہدین سے مالی تعاون بھی کرتے تھے۔ اور بھی بہت سے

لوگ تھے جو ان کے ساتھ مل کر انگریزی حکومت سے جہاد کرنے والوں کو رقوم جمع کر کے بھجواتے تھے اور ان رقوم سے وہ اسلحہ خرید کر میدانِ عمل میں نکلتے تھے۔ مجاہدین کی مالی مدد کرنے والوں پر انگریزی حکومت پوری نگاہ رکھتی تھی۔ اس ''جرم'' میں جو لوگ پکڑے جاتے تھے، حکومت کی طرف سے انھیں شدید سزائیں دی جاتی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود لوگ ان کی مالی مدد کرتے تھے، پکڑے بھی جاتے تھے اور مستوجب سزا بھی قرار پاتے تھے۔ اس کی تفصیلات اس موضوع کی کتابوں میں مرقوم ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے اپنی تصنیفات جماعت مجاہدین اور سرگزشت مجاہدین میں بالخصوص اس سلسلے کے بہت سے گوشوں کی وضاحت کی ہے۔

مولانا حافظ عبدالستار عمر پوری کا نام بھی انگریزی حکومت کی تیار کردہ اس فہرست میں شامل تھا، جنھوں نے سرحد پار کے مجاہدین کی مالی اعانت کو اپنا فریضۂ حیات قرار دے رکھا تھا اور ان کے وارنٹ گرفتاری بھی جاری ہو چکے تھے۔

وفات

مولانا ممدوح نے یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۳۴ھ (٦۔ مارچ ۱۹۱٦ء) کو صرف ۳۴ سال عمر پا کر عین عالم جوانی میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔

عجیب بات یہ ہے کہ جس دن انھیں دفن کیا گیا اسی دن شام کو انگریزی پولیس والے ان کی گرفتاری کا وارنٹ لے کر ان کے گھر پہنچ گئے۔ انھیں بتایا گیا کہ آج صبح وہ تمھاری بھاگ دوڑ سے آزاد ہو کر جنت الفردوس کو تشریف لے گئے ہیں۔ [1]

خاندانی حالات

مولانا حافظ عبدالستار کی والدہ محترمہ بے حد صابرہ وشاکرہ اور عابدہ وزاہدہ خاتون تھیں۔ حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی رحمہ اللہ سے انھوں نے بیعت ارشاد کی تھی۔ حضرت مولانا غزنوی کو ان کے نیک نام اور عالم ومتقی بیٹے حافظ عبدالستار کی خبر وفات پہنچی تو نہایت حزن وملال کا اظہار کیا اور حسب ذیل آیت تحریر فرمائی:

﴿ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ o الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّـآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَo اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴾

[البقرۃ: ۱۵۵۔ ۱۵۷]

---

[1] یہ باتیں مرحوم کے صاحب زادے مولانا عبدالغفار حسن نے اپنی تصنیف ''عظمت حدیث'' کے آغاز میں تحریر فرمائی ہیں جو انھیں ان کی دادی مرحومہ نے بتائیں جن کی وفات ۱۹۲۸ء میں ہوئی۔

اور نہایت مؤثر انداز میں صبر کی تلقین فرمائی۔

غم کا سال

۱۹۱۶ء کا سال اس خاندان کے لیے خاص طور پر حافظ عبدالستار صاحب کی والدہ (مولانا عبدالغفار حسن کی دادی محترمہ) کے لیے عام حزن تھا۔ اسی سال اس نیک بخت خاتون کے شوہر مولانا عبدالجبار عمر پوری کا انتقال ہوا، اسی سال ان کے نوجوان بیٹے حافظ عبدالستار نے رحلت فرمائی، اسی سال ان کی جوان بہو (مولانا عبدالغفار حسن کی والدہ) نے وفات پائی، اسی سال مولانا عبدالغفار حسن کے چھوٹے بھائی عبدالقہار کو موت کا پیغام آیا۔ جس وقت یہ تمام سانحے پیش آئے، اس وقت مولانا عبدالغفار حسن کی عمر صرف چار سال تھی۔ [1]

اس وقت دنیا میں نہ ان کے دادا رہے تھے، نہ والد تھے، نہ والدہ تھیں اور نہ کوئی بڑا یا چھوٹا بھائی۔ فقط اللہ کا سہارا تھا اور وہی اصل سہارا ہے، باقی سب چیزیں جو ہمیں سطح ارض پر نظر آرہی ہیں، عارضی اور فانی ہیں۔

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ○ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾

[الرحمن: ۲۶،۲۷]

ان گزارشات کے بعد اب مولانا عبدالغفار حسن کے بارے میں چند معروضات پیش کی جاتی ہیں۔

ولادت اور حصولِ علم

مولانا عبدالغفار حسن ۲۰۔ جولائی ۱۹۱۳ء کو اپنے آبائی وطن عمر پور میں پیدا ہوئے۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا دادا، والد اور والدہ یکے بعد دیگرے ایک ہی سال (۱۹۱۶ء) میں وفات پا گئے تھے۔ صرف دادی زندہ تھیں، انہی کی تربیت اور کوشش اور دعاؤں سے حصولِ علم کی مختلف منزلیں طے کیں اور اللہ تعالیٰ نے سعی وعمل کے ہر میدان میں کامیابی عطا فرمائی۔ اس دکھیاری مگر اولو العزم خاتون نے ۱۹۲۸ء میں وفات پائی، اللھم اغفرلہا وارحمہا۔

مولانا عبدالغفار حسن نے حصولِ علم کا آغاز دہلی کی درس گاہ دارالہدیٰ سے کیا جو وہاں کے محلّہ کشن گنج میں واقع تھی، (اسے حسن گنج بھی کہا جاتا تھا) اسی درس گاہ میں ان کے دادا مولانا عبدالجبار عمر پوری، والد مکرم مولانا حافظ عبدالستار عمر پوری اور دیگر متعدد اساتذہ کرام علما وطلبا کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتے رہے تھے۔ اس کے بعد دار الحدیث کلکتہ اور دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں

---

[1] عظمت حدیث، ص:۱۲ تا ۱۶۔ ہفت روزہ الاعتصام، یکم اپریل ۱۹۹۴ء۔

طلب علم میں مشغول رہے۔ سند فراغت دسمبر ۱۹۳۳ء میں دارالحدیث رحمانیہ سے لی۔ اساتذہ کرام میں مولانا فضل الرحمٰن بقا غازی پوری، حضرت مولانا احمد اللہ دہلوی، مولانا عبدالرحمٰن نگرنہسوی، مولانا محمد سورتی اور مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری شامل ہیں۔ حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری (صاحب تحفۃ الاحوذی) سے بھی جزوی طور پر استفادے کے مواقع میسر آئے، رحمہم اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ

اس کے بعد لکھنؤ یونی ورسٹی سے فاضل ادب (عربی) کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔ پھر پنجاب یونی ورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔

عمل وسعی کی مختلف منزلیں

یہ مراحل طے کرنے کے بعد ان کا قافلۂ عمل وسعی جن جن منزلوں سے گزرا، ان سے بھی آگاہ ہونا ضروری ہے۔ اس کا تذکرہ انھوں نے اپنی کتاب ''عظمت حدیث'' میں بھی کیا ہے۔ ۱۹۹۴ء کے ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے بعض شماروں میں بھی کیا ہے اور ماہنامہ ''شہادت'' (اسلام آباد) کے اس انٹرویو میں بھی کیا ہے جو ان سے اس کے چیف ایڈیٹر خالد سیال صاحب نے کیا اور دسمبر ۱۹۹۶ء کے ''شہادت'' میں چھپا...... ملاحظہ فرمائیے۔

○...... ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۲ء تک سات سال مدرسہ رحمانیہ بنارس میں تفسیر وحدیث، ادب عربی اور دیگر علوم عربیہ واسلامیہ کی تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

○...... ۱۹۴۲ء کے اگست میں مشرقی پنجاب کے شہر مالیر کوٹلہ چلے گئے۔ مئی ۱۹۴۸ء تک وہاں کے مدرسہ کوثر العلوم میں چھ سال ان کی تدریسی سرگرمیاں جاری رہیں۔ یہ وہاں کی انجمن اہل حدیث کا مدرسہ تھا، وہاں کی جامع مسجد اہل حدیث کی خطابت بھی ان کے ذمے تھی۔

جماعت اسلامی سے وابستگی

اس زمانے میں مولانا ممدوح جماعت اسلامی سے منسلک تھے۔ جماعت اسلامی کی تاسیس ۲۵، ۲۶۔ اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور میں ہوئی تھی۔ اس کی تاسیس سے قبل وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریریں پڑھتے رہے تھے اور ان تحریروں میں انھوں نے جو اسلام پیش فرمایا تھا، اس سے وہ بہت متاثر ہوئے تھے۔ پھر جماعت اسلامی قائم ہوئی تو اس میں شامل ہونے کے لیے اس کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے درخواست کی، انھوں نے درخواست منظور فرمائی اور وہ اس میں شامل ہوگئے اور جماعت اسلامی کی بہت خدمت کی اور ۱۹۵۷ء تک سولہ سترہ سال خدمت انجام دیتے رہے۔ پھر اصل حقیقت واضح ہوئی تو اسی پرانے اسلام کی طرف لوٹ آئے جو اپنے آبا واجداد اور

اساتذہ سے سمجھا تھا۔

بات یہ ہے کہ ہم پرانے لوگوں کے لیے تھوڑے بہت عمل کے لیے وہی اسلام موزوں رہے گا جو چودہ سو سال سے ہمارے رگ وریشے میں رچا بسا ہے اور جو ہماری ہڈیوں میں پوری طرح بیٹھ گیا ہے۔ نیا اسلام بے شک کتنی ہی محنت اور کوشش کے ساتھ پالش کر کے پیش کیا جائے، اس میں کوئی نہ کوئی گڑ بڑ ضرور رہے گی۔

مولانا عبدالغفار حسن تین دفعہ جماعت اسلامی کے قائم مقام امیر بھی بنائے گئے۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت کے زمانے میں گرفتار ہوئے اور گیارہ مہینے جیل میں رہے۔ کئی سال سیالکوٹ، راولپنڈی، کراچی، ساہیوال اور لائل پور وغیرہ شہروں میں ان کا سلسلہ درس وتدریس جاری رہا۔

مدینہ یونیورسٹی میں

اکتوبر ۱۹۶۴ء میں بغیر کسی درخواست کے اسلامی یونی ورسٹی مدینہ طیبہ سے تدریس کے لیے دعوت آئی۔ ۱۹۸۰ تک سولہ سال وہاں حدیث، علومِ حدیث اور اسلامی عقائد پر محاضرات (لیکچرز) دیتے رہے۔ اس طویل عرصے میں ایشیا، افریقہ، امریکہ، یورپ اور اسلامی ملکوں کے بے شمار علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ شریعت کالج، اصولِ دین کالج، حدیث کالج وغیرہ جو مدینہ یونی ورسٹی کے ماتحت ہیں۔ ان کالجوں میں ان کے محاضرات اور تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کالجوں میں دنیا کے مختلف ممالک کے طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں، وہ سب مولانا کے اندازِ تدریس اور اسلوب تفہیم سے مطمئن تھے۔ انھوں نے ان سے خوب فیض حاصل کیا۔

جامعہ تعلیماتِ اسلامیہ اور اسلامی نظریاتی کونسل میں

۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۵ء تک فیصل آباد کی جامعہ تعلیماتِ اسلامیہ میں طلبا کو صحیح بخاری پڑھاتے رہے۔ اس کے علاوہ علوم اسلامیہ کی بعض دوسری کتابوں کی تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

۱۹۸۱ء ہی میں اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن مقرر کیے گئے۔ کئی سال اس کونسل کے رکن رہے اور اس اثنا میں کتاب وسنت کی روشنی میں بہت سے اہم دینی مسائل کو موضوعِ تحقیق بنایا، جس کی تفصیل کونسل کے ریکارڈ میں موجود ہے۔

تحریری خدمات

مولانا ممدوح ۱۹۹۰ء سے مستقل طور پر اسلام آباد میں اقامت گزیں تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کی حیات مستعار کا زیادہ تر حصہ درس وتدریس میں گزرا، اس لیے تصنیفی کام کے لیے

وقت نہیں نکال سکے۔ چند چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے یا بعض اخباروں میں کچھ مضامین شائع ہوئے۔ ایک طویل مضمون ''ہندوستان کے دینی مدارس'' کے عنوان سے الاعتصام میں شائع ہوا۔ یہ قسط وار مضمون تھا جو الاعتصام کے یکم اپریل ۱۹۹۴ء کے شمارے سے شروع ہوا اور ۲۷۔ جنوری ۱۹۹۵ء تک چھپتا رہا۔ درمیان میں کچھ تعطل بھی رہا۔ مختلف مدارس وشخصیات کے متعلق ان کا یہ تاثراتی اور مشاہداتی مضمون ہے جو بہت سی معلومات پر مشتمل ہے اور بڑا دلچسپ ہے۔

ان کی ایک کتاب ''عظمت حدیث'' ہے جو تقریباً ساڑھے تین سو صفحات پر محیط ہے۔ یہ کتاب حدیث اور علومِ حدیث کے تعارف اور حدیث کی حجیت واستناد کے موضوع پر ہے۔ اتنی ضخیم ان کی صرف یہی کتاب ہے۔ ایک رسالہ ''معیاری خاتون'' کے نام سے موسوم ہے، بعض اور رسائل بھی ہیں۔

بعض عظیم شخصیتوں کے بارے میں مشاہدات

آئندہ سطور میں برصغیر کی بعض عظیم شخصیتوں کے متعلق اختصار کے ساتھ مولانا عبدالغفار حسن کے مشاہدات پیش کیے جاتے ہیں۔

مولانا محمد سورتی مرحوم ومغفور برصغیر کے ممتاز عالم اور عربی ادب کے ماہر تھے۔ نہایت ذہین اور قوی حافظہ تھے۔ زمانۂ جاہلیت اور زمانۂ اسلام کے بے شمار عرب شعرا کے ہزاروں اشعار ان کے گنجینۂ ذہن میں محفوظ تھے۔ کچھ عرصہ جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) میں عربی ادب کے استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ ہندوستان میں عربی کے تین ادیب ہیں اور تینوں وہابی ہیں۔ وہ ہیں مولانا عبدالمجید حریری، مولانا عبدالعزیز میمنی اور مولانا محمد سورتی۔ اس وقت یہ تینوں زندہ تھے۔ اس کے بعد اپنی اپنی باری سے تینوں وفات پاگئے۔ رحمهم الله تعالىٰ

مولانا محمد سورتی دارالحدیث رحمانیہ (دہلی) میں بھی خدمت تدریس سرانجام دیتے رہے ہیں اور اس دور میں ان سے جن حضرات نے استفادہ کیا، ان میں مولانا عبدالغفار حسن بھی شامل ہیں۔ مولانا عبدالغفار حسن اپنے جلیل القدر استاذ کو بڑی فراخ دلی سے نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ان کی فیاضی کے بھی وہ بہت مداح ہیں اور وسعت علم کے بھی۔ بالخصوص جب وہ عربی ادب میں ان کی مہارت کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کے قلم کی پیشانی استاذ محترم کے خالص عربی لہجے کے سامنے جھک جھک جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:

''مولانا (محمد سورتی) مرحوم کی عربی زبان دانی کا ایک واقعہ یہ سننے میں آیا ہے کہ جب وہ حج کے لیے تشریف لے گئے تو انھوں نے حرم شریف میں فصیح وبلیغ انداز میں توحید کے موضوع پر

ریریں کیں۔ لوگ حیران تھے کہ یہ کس ملک کا باشندہ ہے جو اتنی اچھی عربی بول رہا ہے۔ ایک
یہ تقریر کے بعد ایک عرب عالم نے ان سے پوچھ ہی لیا:

اَنْتَ مِنَ الْیَمَنِ اَوْ مِنَ الْحِجَازِ اَوْ مِنْ اَیِّ بَلَدٍ اَنْتَ؟

''یعنی آپ کا مسکن کون سا ملک ہے؟ آپ یمنی ہیں یا حجازی ہیں؟ یا کسی اور علاقے کے باشندے ہیں؟'' ❶

ادب ولغت اور انساب ورجال کے اس امام نے ۷۔ اگست ۱۹۴۲ء کو علی گڑھ میں وفات پائی۔

مولانا عبدالغفار حسن کے زمانۂ طالب علمی میں ایک مرتبہ مولانا ابوالکلام آزاد بھی مدرسہ رحمانیہ
ریف لے گئے تھے اور انھوں نے اساتذہ وطلبا کے مجمعے میں تقریر کی تھی۔ مولانا عبدالغفار حسن نے
پنے مضمون میں اس کا ذکر بھی فرمایا ہے۔ مولانا آزاد کے ارشادات بہ حوالہ مولانا عبدالغفار حسن ذیل
ں نمبروار درج کیے جاتے ہیں۔

(.....) ۱۹۲۷ء میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم مدرسہ رحمانیہ میں تشریف لائے اور مدرسے کے وسیع ہال (دار التذکیر) میں دینی نظامِ تعلیم کے موضوع پر انتہائی معلومات افزا تقریر فرمائی۔ مولانا آزاد کی ساری تقریر تو یاد نہیں رہی، البتہ چند باتیں ذہن میں محفوظ ہیں۔

(.....) مولانا آزاد نے سب سے پہلے دینی تعلیم کی اہمیت بیان کی۔ پھر درس نظامی کی تاریخ بیان فرمائی اور اس کے محاسن ونقائص کا تذکرہ کیا۔ نقائص بیان کرتے ہوئے انھوں نے توجہ دلائی کہ موجودہ حالات میں منطق وفلسفہ کی پرانی کتابیں غیر ضروری ہیں، ان کا پڑھنا ضیاعِ وقت ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے عربی ادب کا جائزہ لیا اور مقاماتِ حریری پر سخت تنقید کی۔ انھوں نے فرمایا اس کتاب میں دو بڑے نقص ہیں۔ ایک ظاہری، دوسرا معنوی۔

(.....) ظاہری نقص یہ ہے کہ حریری صاحب مسجّع اور مقفّٰی عبارت کے شیدائی ہیں۔ ان کی قافیہ بندی میں تکلف پایا جاتا ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد طلبا میں بھی یہی اسلوبِ نگارش رچ بس جاتا ہے اور معنوی حسن کے بجائے ظاہری قافیہ بندی اور فن بدیع کے محاسن کا اہتمام کیا جاتا ہے، حالاں کہ عربی عبارت اس طرح کی نہیں ہونی چاہیے۔ اگر اس میں قافیہ بندی بھی ہو تو بغیر کسی تکلف کے روانی کے ساتھ آئے۔

(۴).....اس کتاب کا معنوی نقص یہ ہے کہ اس سے طلبا کی غلط تربیت ہوتی ہے۔ یہ مقامات کیا ہیں، ایک قسم کے افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں ایک افسانہ یہ ہے کہ ابوزید سروجی قبرستان پہنچا

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے الاعتصام مؤرخہ ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۹۴ء، ص:۱۴ تا ۱۶

ہے اور کاسۂ گدائی لے کر لوگوں سے خیرات مانگتا ہے۔ اس قسم کے افسانوں یا مقامات سے طلبا کے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بہت سے خیراتی مولوی انہی افسانوں کی پیدوار ہوں۔

⑤...... مولانا آزاد نے عربی کی ایک اور کتاب جو ہمارے دینی نصاب میں داخل ہے نفحۃ الیمن پر بھی تبصرہ کیا اور فرمایا اس کتاب میں اخلاقی تعلیم کا درس نہیں ملتا، بلکہ طالب علم کا رجحان پستی اخلاق کی طرف ہوجاتا ہے۔

⑥...... مولانا آزاد کی تقریر تقریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ افسوس کہ قلم بند نہ ہوسکی۔ اس زمانے میں ٹیپ ریکارڈ کا بھی رواج نہ تھا۔

⑦...... تقریر کے بعد مولانا آزاد کی چائے سے ضیافت کی گئی۔ اس موقعے پر مولانا کی ملاقات ایک طالب علم محمد عمر سے ہوئی جو پنجاب کا رہنے والا تھا اور کھدر پوش تھا۔ مولانا نے اس سے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔

⑧...... مولانا عبدالغفار حسن فرماتے ہیں میں نے بھی قریب ہو کر مولانا سے مصافحہ کیا اور کچھ سوال وجواب ہوئے۔ مولانا موصوف نے بڑی محبت سے طلبا سے گفتگو کی اور ان سے حالات دریافت کیے۔ افسوس ہے کہ اس کے بعد پھر مولانا محترم مدرسہ رحمانیہ تشریف نہ لا سکے اور طلبا ان کے علمی خزانے سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔

⑨...... مولانا ابوالکلام آزاد کی تمام تصانیف مثلاً تذکرہ، جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد، ترجمان القرآن جلد اول ودوم اور البلاغ والہلال کے اکثر شمارے میری نظر سے گزرے ہیں۔

⑩...... مولانا موصوف خطابت کے بادشاہ تھے اور ان کی تحریر بھی بہت زوردار تھی۔

⑪...... مولانا آزاد نے مدرسہ رحمانیہ کے رجسٹر پر حسب ذیل الفاظ تحریر فرمائے۔

''عمارت معقول ہے۔ مصارف کا کافی انتظام ہے۔ مدرسے میں طلبا کے قیام کا بھی انتظام ہے۔ تقریباً ۷۵ طلبا ہیں، جن کے تمام مصارف کا متکفل مدرسہ ہے اور ان کی ضروریات کا سیر چشمی کے ساتھ انتظام کیا جاتا ہے۔ مدارس عربیہ کی عام بے سروسامانیاں دیکھتے ہوئے یقیناً یہ صورت حال نہایت مغتنم ہے۔

مدرسہ رحمانیہ دہلی کے بعد اب کلکتے چلیے۔ وہاں بھی مولانا عبدالغفار حسن کو مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر سننے کا موقع ملا۔ اس کی تفصیل بھی بعض مقامات میں کچھ تبدیلیٔ الفاظ کے ساتھ نمبروار مولانا عبدالغفار حسن کے حوالے سے سنیے۔

①...... غالباً ۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے، جب کہ میں کلکتہ میں تھا۔ اس موقعے پر معلوم ہوا کہ مولانا محترم کا

خطبۂ عید پورے ہندوستان میں ریڈیو کے ذریعے سنایا جائے گا۔ کہیں نماز سے پہلے، کہیں نماز کے بعد۔ میں بھی کلکتے کی وسیع وعریض عیدگاہ میں پہنچ گیا۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ مولانا کی تقریر کا ایک فقرہ یا اس کا مفہوم اچھی طرح یاد ہے، جس پر لوگ عش عش کر اٹھے۔ انھوں نے فرمایا مجھے بتایا گیا ہے کہ آج میرا یہ خطبہ پورے ہندوستان کے تمام گلی کوچوں میں سنا جائے گا اور ملک کی تمام عیدگاہوں اور مسجدوں میں میری آواز گونجے گی۔

② ...... اس کے بعد مولانا نے ہندوستان کی جغرافیائی لحاظ سے چاروں حدود بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ شمال سے لے کر جنوب تک اور مغرب سے لے کر مشرق تک میری آواز سنی جائے گی۔ یہ سائنس کا بہت بڑا کمال ہے، اس نے یہ بڑا مفید آلہ ایجاد کیا ہے۔ لیکن کیا یہ جدید سائنس کوئی ایسا آلہ بھی تیار کرسکتی ہے جو میری آواز لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں تک پہنچا دے؟ جس کی بنیاد پر زندگیوں میں انقلاب آجائے، فکر ونظر کا عالم بدل جائے اور اخلاق کی دنیا ایک نئے رنگ اور نئے ڈھنگ سے آشنا ہوجائے۔

③ ...... مولانائے محترم کا خطبہ عید سننے کے بعد دل میں شوق پیدا ہوا کہ ان کا خطبہ جمعہ بھی سنا جائے۔ چناں چہ ایک دو مرتبہ میں شیخ محمد صدیق سیالکوٹی کے ساتھ بالی گنج گیا جو کلکتے کے مضافات میں ہے۔ مولانا کی قیام گاہ کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد تھی جو ویران پڑی تھی۔ ایک دن مولانا کو خیال آیا کہ کتنے افسوس کی بات ہے، میں قریب رہتا ہوں اور یہ مسجد جو اللہ کا گھر ہے ویران پڑی ہے۔ مولانا موصوف نے اس کی صفائی کرائی اور وہاں خطبہ جمعہ شروع کردیا۔ لوگوں کو پتا چلا تو مولانا کا خطبہ سننے کے لیے دور دور سے اس مسجد میں آنے لگے۔

④ ...... ایک مرتبہ مجھے بھی مولانا کا خطبہ سننے کا شرف حاصل ہوا۔ خطبہ دینی وعلمی معلومات سے بھرپور تھا۔ مولانا نے زیادہ تر آیات واحادیث قربانی کے موضوع سے متعلق بیان کیں۔ افسوس ہے اس کے بعد مولانا کی تقریر سننے کا موقع نہ ملا۔

⑤ ...... مولانا عبدالغفار حسن فرماتے ہیں، مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق ایک اور واقعہ وہ ہے، جس کے راوی شیخ محمد صادق سیالکوٹی ہیں جو تقسیم ہند کے وقت کلکتہ میں عینکوں کے بہت بڑے تاجر تھے اور مولانا آزاد سے بے حد ذہنی لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ جمعیت تبلیغ اہل حدیث کلکتہ کا سالانہ جلسہ ہونے والا تھا۔ چنیوٹ کے سوداگر کلکتے میں بہت بڑی تعداد میں موجود تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو اس جلسے میں ضرور بلایا جائے۔ اس جلسے کے صدر مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی تھے۔ اس زمانے میں کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان کش مکش شروع ہوچکی تھی۔

جلسے کے منتظمین میں سے جن لوگوں کا رجحان مسلم لیگ کی طرف تھا، ان کی خواہش تھی کہ مولانا آزاد تقریر نہ کرسکیں لیکن جو لوگ مولانا آزاد کے عقیدت مند تھے، ان کا اصرار تھا کہ مولانا کی تقریر لازماً ہونی چاہیے۔ چناں چہ اعلان کردیا گیا کہ ہفتے کی شام کو چار بجے مولانا آزاد تبلیغ کے موضوع پر تقریر فرمائیں گے۔

⑥......مولانا آزاد بروقت جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ لوگوں کا بہت بڑا ہجوم تھا اور بے پناہ حاضری تھی، کیوں کہ طویل عرصے کے بعد لوگوں کو مولانا آزاد کی تقریر سننے کا موقع مل رہا تھا۔ دوسری طرف یہ ہوا کہ صدر جلسہ مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی کو چاے پلانے کے بہانے راستے میں روک لیا گیا۔ اس طرح جلسہ بروقت شروع نہ ہوسکا اور صدر کے انتظار میں دو گھنٹے گزر گئے۔

⑦......اس دوران کسی شخص نے مولانا آزاد سے پوچھا کہ ''آپ کا مزاج کیسا ہے؟ طبیعت کچھ ناساز معلوم ہوتی ہے۔ مولانا نے جواب دیا: ''ہاں! بھائی کوئی نہ کوئی تکلیف تو انسان کو رہتی ہے۔'' اس پر ایک شخص نے کہا ''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آج آپ تقریر کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔'' اس کے بعد فوراً اعلان کردیا گیا کہ ''مولانا آزاد آج تقریر نہیں فرمائیں گے، اس لیے دوسرے مولانا صاحب تقریر کریں گے۔'' اس اعلان کی وجہ محض سیاسی اختلاف تھا اور اس میں وہ لوگ کامیاب ہوگئے، جو چاہتے تھے کہ مولانا آزاد تقریر نہ کریں۔

⑧......اس اعلان کے فوراً بعد مولانا آزاد کے عقیدت مندوں نے اعلان کردیا کہ ''مولانا آزاد کی تقریر کل اتوار کے روز دو بجے ہوگی۔''

⑨......دوسرے دن اتوار تھا اور عام تعطیل تھی۔ اس لیے پہلے دن سے مجمع کہیں زیادہ تھا اور ہجوم لحہ بہ لحہ بڑھتا جارہا تھا۔ مولانا آزاد اپنی عادت کے مطابق عین وقت پر جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔

⑩......مخالفین نے آج بھی وہی پہلے دن والا کھیل کھیلنا چاہا اور صدرِ جلسہ مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی کو کسی بہانے راستے میں روک لیا گیا۔ جب دس منٹ کی تاخیر ہوگئی تو سید عطاء اللہ بخاری جو وہاں موجود تھے جوش میں آگئے اور انھوں نے سٹیج پر آکر اعلان کیا کہ آج پھر کل والا ڈراما کھیلا جارہا ہے اور صدر جلسہ کو راستے میں کسی بہانے سے روک لیا گیا ہے۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد تشریف لے آئے ہیں۔ شاہ صاحب نے حاضرین سے پوچھا آپ لوگوں کا کیا خیال ہے، کیا میں صدارت کے لیے کسی دوسرے شخص کا نام پیش کروں؟ چاروں طرف سے زور زور کی آوازیں آئیں، ''ضرور پیش کیجیے، ضرور پیش کیجیے۔'' اس کے بعد شاہ صاحب نے فرمایا: ''جلسے کی صدارت کے لیے میں اپنا نام پیش کرتا ہوں۔ آپ کو منظور ہے؟'' لوگوں نے جواب دیا: ''منظور ہے، منظور ہے۔'' اب شاہ صاحب کرسیِ صدارت پر بیٹھ گئے اور کہا ''میں

مولانا ابوالکلام آزاد سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ تشریف لائیں اور تقریر فرمائیں۔"

⑪...... مولانا عبدالغفار حسن فرماتے ہیں کہ سامعین کا بیان ہے کہ مولانا آزاد کی تقریر دو گھنٹے جاری رہی۔ پورے مجمعے میں سناٹا چھایا ہوا تھا اور علم کا سمندر بہہ رہا تھا۔ تقریر میں مولانا نے تبلیغ کا مفہوم بیان کیا، اس کے مقاصد کی وضاحت فرمائی اور بتایا کہ مختلف مذاہب میں تبلیغ کی نوعیت کیا ہے۔ پھر تقریر کے آخری حصے میں قرآن وحدیث کی روشنی میں اسلامی تبلیغ کے آداب وخصائص بیان فرمائے۔ تقریر کیا تھی، معلومات کا سمندر تھا جو دو گھنٹے سیلاب کی صورت میں بہتا رہا۔

⑫...... پروگرام کے مطابق مولانا آزاد کے بعد سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو تقریر کرنا تھی، لیکن شاہ صاحب مرحوم نے فرمایا کہ سمندر کے بعد ندی نالے کی ضرورت نہیں، لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ مولانا کے بعد میری تقریر مناسب نہ ہوگی، یعنی علمی لحاظ سے ان کی تقریر کے بعد میں کوئی نئی بات نہیں کہہ سکوں گا۔ (یہ شاہ جی کا انکسار تھا۔ اندازہ فرمایئے وہ لوگ کس قدر بلند اخلاق تھے۔)

اب حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ کے بارے میں مولانا عبدالغفار حسن کے چند الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انھوں نے حضرت مولانا مبارک پوری سے باقاعدہ استفادہ نہیں کیا اور نہ اس کا موقع مل سکا۔ البتہ مولانا مبارک پوری مدرسہ رحمانیہ میں کبھی تشریف لاتے تو طلبا ان کی قیام گاہ پر جمع ہوجاتے اور اس طرح ایک مجلس مذاکرہ علمیہ منعقد ہوجاتی، جس سے بہت سے علمی فوائد حاصل ہوتے۔ اس اعتبار سے وہ حضرت مولانا مبارک پوری رحمہ اللہ کو اپنا شیخ اور استاذ تصور کرتے ہیں۔

مولانا عبدالغفار حسن کے بقول ۱۹۳۰ء میں حضرت مولانا مبارک پوری مدرسہ رحمانیہ میں تشریف لائے۔ اس وقت طلبا کے ششماہی امتحانات ہونے والے تھے۔ مہتمم صاحب نے ان سے گزارش کی کہ وہ جامع ترمذی کے امتحان کے سوالات مرتب فرمادیں۔ انھوں نے جو سوالات مرتب فرمائے، ان میں سے مولانا عبدالغفار حسن کو صرف ایک سوال یاد ہے۔ وہ یہ کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "**الاقعاء سنة نبيكم**" دوسری میں ہے: "**نهي عن الاقعاء**" دونوں روایتوں میں تطبیق کیسے ہوگی؟

اس زمانے میں مدرسہ رحمانیہ کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھانے کی ذمے داری بالعموم مولانا عبدالغفار حسن کی ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ انھوں نے جمعہ کے روز نماز فجر کی (پہلی رکعت) میں سورۂ سجدہ تو پوری پڑھی لیکن سورۂ دہر آدھی پڑھ کر رکوع میں چلے گئے۔ بعض طلبا نے یہ بات مولانا

مبارک پوری تک پہنچا دی۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ یہ طریقہ خلافِ سنت ہے، سورۂ دہر پوری پڑھنی چاہیے تھی۔ اب وہ حضرت مولانا مبارک پوری کی خدمت میں حاضر ہوئے تو مولانا نے ان کو تاکید کی کہ آپ دونوں سورتیں پوری پڑھا کریں۔ جہاں کہیں حدیث میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے فلاں سورت فلاں دن یا فلاں وقت تلاوت فرمائی تو اس سے مراد پوری سورت ہے، لہٰذا آدھی یا اس سے کم یا چند آیات پڑھ کر رکوع میں جانا خلافِ سنت ہے۔ پوری سورت پڑھنی چاہیے۔ لیکن آج کل ہمارے زیادہ تر خطیب صاحبان اس پر عمل نہیں کرتے۔ عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ نماز جمعہ کی پہلی رکعت میں سورۂ الاعلیٰ تو وہ پوری پڑھتے ہیں، لیکن دوسری رکعت میں سورۂ غاشیہ کی ﴿افلا ینظرون﴾ سے آخری آیات پڑھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

مولانا عبدالغفار حسن بیان فرماتے ہیں کہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ اپنے حال وقال اور چال ڈھال میں ہر لحاظ سے سلف صالحین کا نمونہ تھے۔ بہت ہی نرم مزاج، متواضع اور خوش اخلاق تھے۔ مالی حالت زیادہ اچھی نہ تھی، لیکن اس کے باوجود ان کی شان فیاضانہ تھی۔ ❶

حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ سے متعلق بھی مولانا عبدالغفار حسن نے بعض واقعات تحریر کیے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ دارالحدیث رحمانیہ میں عام طور سے ہر سال عظیم الشان جلسے کا انعقاد عمل میں آتا تھا، جس میں اکابر علمائے توحید وسنت کو دعوت دی جاتی تھی، ان میں مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم سرفہرست ہوتے تھے۔ ذیل میں مولانا عبدالغفار کی روایت سے مولانا امرتسری مرحوم کے چند دلچسپ واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔

① ...... مدرسہ رحمانیہ میں سالانہ جلسے کے موقعے پر طلبا درس گاہ کے ہال میں مختلف رنگوں کی جھنڈیاں لگا دیتے تھے۔ ایک مرتبہ جلسے کی صدارت مولانا ثناء اللہ صاحب فرما رہے تھے۔ ایک صاحب نے بہ صورت سوال کہا: کیا جھنڈیاں لگانا اسراف میں شامل نہیں؟ سجاوٹ کا یہ انداز سنت کے خلاف ہے۔ صدر جلسہ مولانا ثناء اللہ صاحب نے مسکراتے ہوئے اپنی کشمیری شال کی طرف اشارہ کیا جس کے کنارے پر پھول بنے ہوئے تھے، فرمایا اس شال میں جو یہ پھول بنے ہوئے ہیں، جائز ہیں یا ناجائز؟ اور کیا یہ اسراف کی تعریف میں آتے ہیں؟ اس پر وہ صاحب خاموش ہوگئے۔

② ...... ۱۹۳۱ء کا واقعہ ہے کہ دارالحدیث رحمانیہ کا سالانہ جلسہ ہو رہا تھا۔ مشاہیر علمائے اہل حدیث

---

❶ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا مبارک پوری کے بارے میں تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مولانا عبدالغفار حسن کا مضمون ''ہندوستان کے دینی مدارس'' ہفت روزہ ''الاعتصام'' مؤرخہ ۹۔ دسمبر ۱۹۹۴ء

تشریف فرما تھے۔ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری بھی شریک جلسہ تھے۔ انھی دنوں فتح پوری مسجد کے جنوب مشرقی کونے میں جیون ہال میں مسلم لیگ کا جلسہ ہو رہا تھا۔ اس جلسے کی صدارت مشہور قادیانی سر ظفر اللہ کرنے والا تھا، جس کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ دارالحدیث رحمانیہ کے ایک فارغ التحصیل نوجوان حافظ محمد ابراہیم اس وقت دہلی کی مجلس احرار کے سرگرم اور ممتاز رہنما تھے۔ حافظ صاحب کی تحریک سے احرار کارکنوں نے فیصلہ کیا کہ سر ظفر اللہ کی صدارت میں مسلم لیگ کا جلسہ نہیں ہونے دیا جائے گا۔ مسلمانوں کے جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ پوری مسجد فتح پوری اور اس کے آس پاس کے سب بازار لوگوں سے بھرے ہوئے تھے اور لوگ برملا اعلان کر رہے تھے کہ ظفر اللہ کو جیون ہال میں نہیں داخل ہونے دیا جائے گا۔ احرار کارکن اور دوسرے مسلمان نوجوان سیاہ جھنڈیاں لے کر دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر جلسے کے منتظمین نے ظفر اللہ کو نئی دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر اتار لیا اور وہیں کسی کوٹھی میں جلسہ کرنے کی کوشش کی۔ احرار کارکنوں نے اس کوٹھی کا بھی گھیراؤ کر لیا۔

اس موقعے پر حافظ محمد ابراہیم صاحب دارالحدیث رحمانیہ آئے۔ دو بجے کا وقت تھا۔ رحمانیہ میں جلسہ ہو رہا تھا، لیکن مولانا ثناء اللہ صاحب ابھی جلسہ گاہ میں نہیں آئے تھے، وہ اپنی قیام گاہ پر آرام فرما رہے تھے۔ حافظ محمد ابراہیم نے جلسے کے بعض اصحاب انتظام سے بات کی اور انھیں تمام واقعہ سنایا اور کہا کہ اس موقعے پر مولانا امرتسری کا جیون ہال میں پہنچنا بڑا ضروری ہے۔ یہ جلسہ ان کی صدارت میں ہونا چاہیے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اگر حاضرین کے کانوں میں ذرا بھی بھنک پڑ گئی تو لوگ مولانا امرتسری کی تقریر سننے کی غرض سے فتح پوری مسجد کی طرف دوڑیں گے اور رحمانیہ کا جلسہ اکھڑ جائے گا۔ اس خطرے کے پیشِ نظر حافظ محمد ابراہیم صاحب مولانا کو مدرسے کے عقبی دروازے سے باہر لے گئے اور کار میں بٹھا کر مسجد فتح پوری پہنچ گئے۔

مولانا جب مسجد فتح پوری کے شمالی دروازے پر پہنچے تو لوگوں نے ان کو دیکھ کر فاتح قادیان زندہ باد کے نعرے لگانا شروع کر دیے اور انھیں کندھوں پر اٹھا لیا۔ پھولوں کے اتنے ہار ان کے گلے میں ڈالے گئے کہ ان کا چہرہ بڑی مشکل سے نظر آتا تھا۔ مولانا ممدوح اسی طرح ہاروں سے لدے ہوئے، لوگوں کے کندھوں پر سوار فتح پوری کے شمالی دروازے سے جنوبی دروازے میں پہنچے۔ پھر وہاں سے جیون ہال کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے ہال کے اندر داخل ہوئے۔ جو سٹیج سر ظفر اللہ کے لیے تیار کیا گیا تھا اور جو کرسیِ صدارت اس کے لیے سجائی گئی تھی، اس پر فاتح قادیان مولانا ثناء اللہ امرتسری جلوہ افروز ہوئے۔

مولانا نے کھڑے ہو کر تقریر شروع کی جو کافی دیر جاری رہی۔ مرزا قادیانی کے متعلق بہت سے لطیفے سنائے اور جلسہ لوٹ لیا۔ مجمعے کا یہ حال تھا کہ اللہ اکبر کے نعرے گونج رہے تھے اور فاتح قادیان زندہ باد اور شیر پنجاب زندہ باد کی آوازیں آرہی تھیں۔ ساتھ ہی سر ظفر اللہ مردہ باد اور قادیانیت مردہ باد کے نعرے لگ رہے تھے اور چند لمحوں میں عجیب سماں بندھ گیا تھا۔

جیون ہال کا جلسہ حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب کی تشریف آوری اور تقریر سے بہت کامیاب رہا اور ساتھ ہی دوسری طرف دارالحدیث رحمانیہ کا جلسہ بھی ہوتا رہا۔ رحمانیہ میں جیون ہال کے جلسے کا کسی کو علم نہیں تھا۔ بعد میں جب لوگوں کو اس کا پتا چلا تو وہ بہت افسردہ ہوئے کہ انھیں اس کی بالکل خبر نہ ہوئی۔ اگر خبر ہو جاتی تو وہ جیون ہال کا جلسہ ضرور دیکھتے۔

④...... مولانا عبدالغفار حسن کے زمانۂ طالب علمی میں ایک مرتبہ مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی دونوں مدرسہ رحمانیہ تشریف لائے۔ طلبا نے ان کے اعزاز میں استقبالیہ دیا اور جلسے کا اہتمام کیا۔ مولانا عبدالغفار حسن کے ہم سبق ایک طالب علم محمد لقمان بنگالی نے عربی قصیدہ پیش کیا، جس کے ایک شعر کا ترجمہ یہ تھا کہ آج ہماری مادر علمی میں دو شیر آئے ہیں۔
یہ شعر سن کر مولانا ثناء اللہ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا:

هل يجتمع الاسد ان فى عرين واحد؟
(کیا ایک بن میں دو شیر جمع ہو سکتے ہیں؟) [1]

مولانا عبدالغفار حسن نے الاعتصام کی متعدد قسطوں میں پھیلے ہوئے اپنے مضمون میں ان بہت سے علمائے عظام کا تذکرہ فرمایا ہے جو ان کے زمانۂ طالب علمی میں مدرسہ رحمانیہ گئے اور ان سے ان کو ملنے اور سلام کرنے کے مواقع میسر آئے۔ مولانا نے اپنے اساتذہ کرام کا ذکر بھی بے حد احترام سے کیا ہے۔ یہ مضمون اگر کتابی شکل میں چھپ جائے تو میرے خیال میں بہت مفید رہے گا۔ جماعت اہل حدیث کے متعدد اصحابِ علم کی یہ ایک مختصر مگر جامع تاریخ ہے۔ مضمون میں جن علمائے کرام کے نام لیے گئے ہیں، ان کے حالات بھی مختصر الفاظ میں بیان کر دیے جائیں۔

حضرت مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالغفار حسن نے لکھا ہے کہ وہ عام جلسوں میں تقریر کے دوران جب ماضی قریب کے علمائے اہل حدیث کا ذکر فرماتے ہوئے مولانا عبدالجبار غزنوی کے ساتھ مولانا عبدالجبار عمر پوری (مولانا عبدالغفار حسن کے جد امجد) کا تذکرہ

---

[1] ہندوستان کے دینی مدارس، ہفت روزہ الاعتصام، ۲۳۔ دسمبر ۱۹۹۴ء

کرتے تو ان کا اندازِ بیان ایسا رقت آمیز ہوتا کہ لوگوں کی آنکھیں اشک بار ہو جاتیں، بالخصوص جب مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی اور مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کا تذکرہ فرماتے تو ان کی آواز بھرا جاتی۔ [1]

جماعت اسلامی سے وابستگی اور علیحدگی

پہلے بتایا جاچکا ہے کہ مولانا عبدالغفار حسن سولہ سترہ سال جماعت اسلامی سے وابستہ رہے۔ یعنی انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ جس میں تقریباً پوری جوانی شامل ہے، جماعت اسلامی کی نذر کردیا۔ اب آیئے دیکھتے ہیں اس طویل عرصے میں جماعت اسلامی کی انھوں نے کیا خدمات انجام دیں اور اس سے کب الگ ہوئے اور کیوں الگ ہوئے؟

آج سے تیرہ سال پہلے مولانا ممدوح کا ایک انٹرویو اسلام آباد کے ماہنامہ ''شہادت'' (دسمبر ۱۹۹۶ء) میں شائع ہوا تھا جو اس کے چیف ایڈیٹر جناب خالد سیال نے ان سے لیا تھا۔ اس میں مولانا نے جماعت اسلامی میں اپنی شمولیت اور علیحدگی کا تذکرہ خاصی تفصیل سے کیا ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میں اسی انٹرویو کی روشنی میں اختصار کے ساتھ ان کی جماعت اسلامی سے وابستگی، اس کی خدمت اور اس سے علیحدگی کا تذکرہ کیا جاتا ہے، ملاحظہ فرمایئے۔

تکمیل تعلیم کے بعد مولانا نے جماعت اہل حدیث کی ایک درس گاہ مدرسہ رحمانیہ بنارس (یوپی) میں سلسلۂ تدریس کا آغاز کیا۔ سات سال وہاں قرآن وحدیث اور علوم عربیہ کی تعلیم دیتے رہے۔ اسی زمانے میں مولانا سیدابوالاعلیٰ مودودی کے ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' اور ان کی بعض کتابیں پڑھ کر ان کے دینی اور اسلامی افکار سے متاثر ہوئے۔ (اس سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد سے متاثر تھے۔) اگست ۱۹۴۱ء میں لاہور میں جماعت اسلامی کی تاسیس ہوئی، اس کے تاسیسی اجلاس میں وہ شامل نہیں تھے۔ اس کی تاسیس کے بعد انھوں نے مولانا مودودی کو خط لکھا کہ انھیں جماعت میں شامل کرلیا جائے۔ اس طرح وہ اس درخواستی خط کی بنا پر ''جماعت کے تاسیسی اجلاس میں شامل ہوگئے۔''

اگست ۱۹۴۲ء میں مولانا عبدالغفار حسن بنارس سے مالیر کوٹلہ (مشرقی پنجاب) چلے گئے۔ اس وقت وہ جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن تھے اور جماعت کا مرکزی دفتر دار السلام (پٹھان کوٹ ضلع گورداس پور) میں تھا اور اس کی مجلس شوریٰ کے اجلاس وہیں ہوتے تھے، جن میں

---

[1] الاعتصام مؤرخہ ٦۔ جنوری ۱۹۹۵ء

شرکت کے لیے مولانا وہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ مالیر کوٹلہ میں بھی ان کی کوشش سے جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آ گیا تھا اور وہ اس کے امیر تھے۔ اس حیثیت سے مالیر کوٹلہ شہر اور اس کے گرد و نواح میں جماعت کی تبلیغ و ترویج کے لیے انھوں نے بے حد تگ و تاز کی۔

یکم مئی ۱۹۴۸ء کو مولانا عبدالغفار حسن پاکستان آ گئے۔ جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کے تو وہ رکن تھے ہی، اس کے علاوہ مولانا مودودی نے ان پر بعض اور ذمے داریاں ڈال دیں، جن میں ایک ذمے داری تدریس کی تھی۔ اس کی تفصیل مولانا ممدوح یہ بیان فرماتے ہیں کہ اس وقت جماعت اسلامی نے کوہاٹی بازار راولپنڈی میں ایک تین منزلہ عمارت ساٹھ روپے ماہانہ کرائے پر لی اور اس میں تربیت گاہ قائم کی۔ منصوبہ یہ تھا کہ یہاں جدید وقدیم علوم کی ایک مثالی درس گاہ قائم کی جائے۔ جدید علوم کے فارغ التحصیل طلبا کو قدیم علوم پڑھائے جائیں اور قدیم علوم کے حامل افراد کو جدید علوم سے آراستہ کیا جائے۔ عبدالجبار غازی جدید علوم اور مولانا عبدالغفار حسن قدیم علوم پڑھاتے تھے۔ مولانا تین مہینے راولپنڈی کی اس تربیت گاہ میں پڑھاتے رہے، اور اس اثنا میں طالب علم صرف تین آئے۔ چودھری رحمت علی، عرفان غازی اور محمد شریف کیانی۔ طلبا سے زیادہ دوسرا سٹاف تھا جو پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ دو استاد، ایک محاسب، ایک باورچی اور ایک چوکیدار۔ اتنا زیادہ خرچ اور طالب علم صرف تین۔ بقول مولانا عبدالغفار حسن لوگ اس کام کو ''سفید ہاتھی'' قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ سلسلہ کامیاب نہیں ہوگا۔

پھر ۳۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو جب مولانا مودودی نے کشمیر کی جنگ کو غیر اسلامی قرار دیا اور فرمایا کہ یہ جہاد نہیں ہے تو انھیں حکومت پاکستان نے گرفتار کرلیا اور مولانا عبدالغفار حسن کو جماعت اسلامی کا قائم مقام امیر بنادیا گیا۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ امیر جماعت اسلامی کے نزدیک اس وقت کشمیر کی جنگ جہاد نہیں تھی۔ اس کے بعد جماعت نے اسے جہاد قرار دے دیا۔ کچھ عرصہ جہاد رہا، اب اس میں کچھ کمی آ گئی ہے۔ آگے معلوم نہیں ان کا سیاسی اسلام کیا رنگ بدلتا ہے۔ سیاسی اسلام کے مسائل میں اس قسم کا ردّ و بدل ہوتا رہتا ہے۔ اسلام اور سیاست جماعت اسلامی کے نزدیک ایک ہیں، ظاہر ہے جیسے سیاست بدلے گی اسی طرح اسلام بھی بدلے گا۔

مولانا عبدالغفار حسن کو مختلف اوقات میں تین دفعہ جماعت اسلامی کا قائم مقام امیر مقرر کیا گیا۔ مولانا مودودی ان پر بہت اعتماد فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا نے ان کو یہ اعزاز بخشا کہ انھیں حلقہ سیالکوٹ کا امیر بنا کر سیالکوٹ بھیجا، اس وقت پانچ ضلعے ان کے ماتحت کردیے گئے تھے، جن میں سیالکوٹ، گوجراں والا اور گجرات کے اضلاع شامل تھے۔

پھر ایک وقت آیا کہ مولانا مودودی سے جماعت کے بعض سرکردہ ارکان کو اختلاف پیدا ہوگیا،

جن میں مولانا عبدالغفار حسن بھی شامل تھے۔ اختلاف کی وجوہ میں سے مولانا عبدالغفار حسن کے بقول ایک وجہ یہ تھی کہ جماعت کے اندر انصاف نہیں رہا تھا۔ ارکان کے ساتھ بے انصافی ہونے لگی تھی۔ بے انصافی کے کئی واقعات کا مشاہدہ کیا گیا۔ ۱۹۵۴ء یا ۱۹۵۵ء میں ایک جائزہ کمیٹی تشکیل دی گئی، یہ معلوم کرنے کے لیے کہ بعض ارکانِ جماعت میں جو بے یقینی پائی جاتی ہے اس کی کیا وجہ ہے۔ جائزہ کمیٹی کے چار ارکان بنائے گئے تھے، عبدالجبار غازی، سلطان احمد، حکیم عبدالرحیم اشرف اور مولانا عبدالغفار حسن۔ ان حضرات نے پورے پاکستان کا دورہ کرکے تقریباً دو سو ارکان سے انٹرویو لیے اور ان کی تحریری شکایات وصول کیں۔ پھر دسمبر ۱۹۵۶ء کو مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں اس دورے کی روداد پیش کی گئی۔

مجلس شوریٰ کا اجلاس پندرہ دسمبر سے تیس یا اکتیس دسمبر تک پندرہ دن جاری رہا۔ اس میں مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف نے نو گھنٹے تقریر کی اور مولانا عبدالغفار حسن نے دو گھنٹے تقریر فرمائی، اور بھی متعدد حضرات نے تقریریں کیں۔ اجلاس میں ”تفصیل کے ساتھ بتایا گیا کہ جماعت اپنی سابقہ پالیسی سے انحراف کررہی ہے۔ مولانا مودودی اور دیگر ذمے داروں پر شدید تنقید ہوئی۔“

مولانا عبدالغفار حسن فرماتے ہیں کہ ”مولانا مودودی پر زیادہ الزام جماعت کی پالیسی سے انحراف کا تھا، کچھ اور بھی اعتراضات تھے۔“ مقررین نے ”کھل کر اور بے پروا ہوکر تنقید کی۔“ مولانا بالعموم تنقید کو پسند کرتے تھے۔ مولانا عبدالغفار حسن فرماتے ہیں ”لیکن انھوں نے اس تنقید کو محسوس کیا۔ چناں چہ نعیم صدیقی اور جماعت کی ”مرکزی بیوروکریسی“ نے (ناقدین کی) مخالفت شروع کردی اور یہ پراپیگنڈا ہونے لگا کہ ان لوگوں نے مولانا کو زچ کیا ہے، جماعت کے اندر دھڑے بندی کی ہے، اس طرح جائزہ کمیٹی کو بدنام کیا گیا۔“

اس زمانے میں جماعت اسلامی کا اخبار روزنامہ ”تسنیم“ جاری تھا، اس کے مدیر ارشاد احمد حقانی تھے۔ مصطفیٰ صادق کا تعلق بھی اسی اخبار سے تھا۔ یہ لوگ مولانا عبدالغفار حسن اور ان کے ساتھیوں کے حامی تھے۔ چناں چہ اخبار نے ان کی حمایت کی۔ اس کے برعکس جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کے بہت سے ارکان اور بعض دیگر حضرات نے ان کی شدید مخالفت کی اور مولانا مودودی کی حمایت کو اپنا فرض قرار دیا۔ مولانا عبدالغفار حسن مولانا مودودی کے حامیوں کو ”جماعت اسلامی کی بیوروکریسی“ سے تعبیر فرماتے ہیں۔

پھر یہ ہوا کہ جن لوگوں نے مولانا مودودی پر تنقید کی تھی، انھیں مجلس شوریٰ کی رکنیت اور ملازمت سے برطرف کردیا گیا۔ لیکن جن لوگوں نے مولانا مودودی کی حمایت کی تھی اور مولانا عبدالغفار حسن اور ان کے ہم نواؤں کے خلاف بلا جواز پراپیگنڈا کررہے تھے، انھیں کچھ نہیں کہا گیا۔

یہ بہت بڑی ناانصافی تھی۔

بات یہیں ختم نہیں ہوئی، اس سے بھی آگے بڑھی۔ مولانا مودودی نے جائزہ کمیٹی کے چاروں ارکان کو نوٹس بھیجے کہ آپ لوگ ایک مہینے کے اندر اندر مجلس شوریٰ کی رکنیت سے مستعفی ہوجائیں، ورنہ میں آپ لوگوں کو آپ کے حلقے میں لے کر جاؤں گا اور جن لوگوں نے شوریٰ کے لیے آپ کا انتخاب کیا ہے، ان سے جاکر کہوں گا کہ اگر مجھے جماعت کا امیر رکھنا ہے تو ان کو واپس لو اور ان کی انتخابی حیثیت ختم کرو۔

مولانا مودودی کی یہ بہت بڑی دھمکی تھی۔ مولانا عبدالغفار حسن کہتے ہیں ''مولانا مودودی کی دھمکی کون برداشت کرسکتا تھا، وہ تو جماعت کے بانی تھے۔ آخر ہم اس ناانصافی کی بنا پر نہ صرف مجلس شوریٰ بلکہ جماعت ہی سے مستعفی ہوگئے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ جماعت اسلامی بڑی جمہوری جماعت ہے، جمہوریت اس میں کہاں ہے۔ جماعت میں نہ جمہوریت ہے، نہ انصاف ہے''

مولانا عبدالغفار حسن نے اپنے اس انٹرویو میں واضح کیا ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے ناقدین پر چار الزامات عائد کیے۔

① ...... آپ لوگوں نے ان کے خلاف سازش کی۔

② ...... آپ لوگوں نے جماعت کے اندر دھڑے بندی پیدا کی اور انتشار پھیلایا۔

③ ...... آپ لوگ ہوس اقتدار میں مبتلا ہیں۔

④ ...... آپ لوگ انھیں امارت سے الگ کرکے مولانا امین احسن اصلاحی کو جماعت کا امیر بنانا چاہتے ہیں۔

انٹرویو میں اور بھی بہت سی باتیں بیان کی گئی ہیں جو ماہنامہ ''شہادت'' کے قارئین کرام کے مطالعے میں آئیں، جن کا خلاصہ یہ ہے

- ...... مولانا مودودی نے اپنے آپ پر تنقید برداشت نہیں کی۔
- ...... جن مقاصد کے لیے جماعت اسلامی قائم کی گئی تھی، مولانا مودودی نے ان مقاصد سے انحراف کیا۔
- ...... جماعت میں نہ جمہوریت تھی، نہ انصاف۔
- ...... وہ چار رکنی جائزہ کمیٹی جو خود مولانا نے اور جماعت کی مجلس شوریٰ نے بنائی تھی، اس کی رپورٹ سامنے آئی تو مولانا نے اسے سراسر غلط قرار دیا اور کمیٹی کے ارکان پر سخت برہمی کا اظہار فرمایا۔
- ...... مولانا نے اپنے ناقدین کی رکنیت بھی ختم کردی اور انھیں ملازمت سے بھی برطرف کردیا۔

یعنی پوری جماعت پر ہر معاملے میں فردِ واحد (امیر جماعت) کا تسلط تھا، کسی کو ان کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ تھی۔ جنھوں نے تھوڑی بہت جرأت کی انھیں جماعت سے نکال دیا گیا اور ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔

جماعت اسلامی والوں کے بیانات ہر روز ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں، یہ لوگ حکومت میں تو فردِ واحد کی مخالفت کرتے ہیں، ارکانِ حکومت کو سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہیں، اگر کسی وجہ سے کسی کو ملازمت سے برطرف کر دیا جائے تو اس پر شدید احتجاج کرتے ہیں لیکن اس باب میں خود ان کا کیا طرزِ عمل ہے، اس کی وضاحت جماعت اسلامی کے سابق امیر اور سابق رکن مجلس شوریٰ مولانا عبدالغفار حسن کی زبان سے ہم نے سن لی ہے۔ نبی ﷺ کے اشادات اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت کے واقعات صرف لوگوں کو سنانے کے لیے ہیں خود عمل کے لیے نہیں۔

مولانا عبدالغفار حسن کے حوصلے کی داد دینی چاہیے کہ وہ سولہ سترہ سال اس حبس زدہ فضا میں محبوس رہے۔ بے شک وہ بہت بڑے دل گردے کے مالک تھے۔ مولانا منظور نعمانی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا نذیر الحق میرٹھی، مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی اور مستری محمد صدیق وغیرہ مرحومین بھی بالکل ابتدا میں جماعت میں شامل ہوئے تھے، لیکن اس کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر جلد ہی اس سے نکل گئے تھے۔ وہ علمائے کرام کے جس حلقے سے آئے تھے، وہ علمی اور عملی اعتبار سے اور قسم کا تھا، اور یہاں اس سے بالکل الگ کوئی اور ہی معاملہ تھا۔ ان دونوں حلقوں میں کوئی مماثلت نہ تھی۔

ابتدائی اجلاس میں مولانا حکیم عبداللہ روڑی والے بھی شریک تھے اور جماعت کے رکن بنے تھے، لیکن وہ ۱۹۵۰ء میں مستعفی ہوئے تھے۔ تاسیسی اجلاس میں یہ فقیر بھی شامل تھا اور ہم درد بنا تھا، یعنی جو حضرات اس میں شامل ہو رہے تھے، ان کے علم و فضل اور فہم و فراست کی وجہ سے اس گنہگار کو ان سے ہم دردی تھی۔ انھی دنوں مولانا عبدالغفار حسن نے بذریعہ درخواست شمولیت فرمائی، اور ماشاء اللہ وہ بڑے باہمت ثابت ہوئے جنھوں نے مسلسل سولہ سترہ سال اس جماعت کی رکنیت اور امارت کا بوجھ اٹھائے رکھا جو ان کے نزدیک نہ جمہوری تھی، نہ اسلامی۔

میں نے ماہنامہ ''شہادت'' میں آج سے تیرہ سال قبل کا حضرت مولانا عبدالغفار حسن کا پورا انٹرویو پڑھا اور بڑے غور سے پڑھا۔ لیکن یہ فقیر یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ مولانا ممدوح نے اتنا عرصہ جماعت میں رہ کر کیا علمی اور تدریسی خدمات سرانجام دیں؟ ان کا اصلی کام تدریس تھا، جماعت اسلامی میں ان کی تدریسی خدمت وہی ہیں جو ۱۹۴۸ء میں تین یا چار مہینے سیالکوٹ میں انجام دی یعنی دو مدرس تین آدمیوں کو قدیم و جدید تعلیم سے آراستہ فرماتے رہے جس کا نام تربیت گاہ تھا اور مولانا کے بقول لوگ اس کام کو سفید ہاتھی قرار دیتے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا ممدوح نے قرآن وحدیث کی جو خدمت کی اور جو تدریسی کام کیا، وہ یا تو جماعت اسلامی میں شمولیت سے پہلے کیا یا اس سے الگ ہونے کے بعد کیا اور بہت کیا۔

مولانا عبدالغفار حسن علم وفضل میں برصغیر کے مشہور اہل حدیث خانوادے کے مشہور چشم وچراغ تھے اور ان کی پذیرائی اہل حدیث ہی نے کی اور کرنا بھی چاہیے تھی۔ اہل حدیث کے مدارس میں انھوں نے تدریسی ودینی خدمات سرانجام دیں۔ جماعت اسلامی کی تربیت گاہوں میں بدقسمتی سے جماعت کا کوئی شخص ان کے علم وفضل سے استفادہ نہ کرسکا، اس لیے کہ اس جماعت کے لوگوں کا اندازِ فکر کچھ اور قسم کا ہے اور استفادے کا طریقہ بھی کچھ اور ہے۔

جماعت اہل حدیث کے جن تدریسی اداروں میں مولانا ممدوح نے خدمات سرانجام دیں، ان تمام اداروں میں ان کی بے حد تحسین کی گئی اور وہ واقعی قابل تحسین تھے۔ انھوں نے ہر ادارے میں آزادی سے کام کیا۔ ان سے استعفیٰ طلب کرنے، کسی قسم کی دھمکی دینے یا ادارے سے خارج کرنے کا تصور بھی کسی کے ذہن میں نہیں آیا اور نہ یہ گستاخانہ تصور کسی کے ذہن میں آسکتا تھا۔ ذاتی اور خاندانی حیثیت سے انھیں ہر جگہ اونچے مرتبے کے مستحق سمجھا گیا۔ لیکن جماعت اسلامی میں ان کے ساتھ جو بیتی اس کا انھوں نے خود ہی اپنے انٹرویو میں ذکر فرما دیا ہے، جماعت اسلامی کے بڑے چھوٹے کسی بھی فرد کو ان کی خاندانی اور ذاتی حیثیت کا علم نہیں تھا۔

مولانا کوثر نیازی مرحوم ۱۹۔ مارچ ۱۹۹۴ء کو فوت ہوئے۔ اس وقت وہ اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین تھے اور حضرت مولانا عبدالغفار حسن کئی سال سے اس کے رکن چلے آرہے تھے۔ نیازی صاحب سے میرے طویل عرصے سے دوستانہ مراسم تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں انھیں کونسل کی رکنیت کے لیے کسی اہل حدیث عالم کے متعلق مشورہ دوں۔ میں نے ان سے کہا کہ مولانا عبدالغفار حسن کئی سال سے اس کے رکن ہیں، اس وقت علم وتحقیق اور معاملہ فہمی میں کوئی عالم ان کے پایہ کا نہیں ہے۔ وہ کونسل کے مسائل سے اچھی طرح آگاہ ہیں اور اس میں پیش ہونے والے معاملات سے متعلق بحث وتمحیص کا انھیں خوب تجربہ ہے۔ آپ کو ان کے علم وتحقیق اور تجربے سے فائدہ اٹھانا چاہیے .... عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اہل حدیث ہر معاملے میں مولانا سے استفادے کے خواہاں رہے ہیں اور اس حلقے میں انھیں بے حد لائق تکریم گردانا جاتا تھا۔

حضرت مولانا عبدالغفار حسن اور ان کے اسلاف سے متعلق بہت سی ضروری باتیں ہمارے علم میں آچکی ہیں۔ مولانا نے الاعتصام کے ۹۵۔۱۹۹۴ء کے متعدد شماروں میں اپنے آباو اجداد اور خود اپنے متعلق بعض اہم واقعات بیان فرمائے ہیں۔ اپنی کتاب ''عظمت حدیث'' اور ماہنامہ ''شہادت'' میں بھی بہت سے امور کی وضاحت فرمائی ہے۔ جن درس گاہوں میں انھوں نے تدریسی خدمات

سرانجام دیں ان کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ بہرحال پاکستان میں جامعہ تعلیمات، جامعہ سلفیہ اور دارالقرآن والحدیث وغیرہ میں ان کا سلسلۂ درس وتدریس جاری رہا۔ یہ تینوں تدریسی ادارے فیصل آباد کے ہیں۔ ان اداروں میں متعدد حضرات نے ان سے استفادہ کیا۔

مولانا نے ''الاعتصام'' میں جو واقعات تحریر فرمائے ہیں وہ بڑے اہم واقعات ہیں جو تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ حک واضافے کے ساتھ انھیں کتابی صورت میں شائع کردینا چاہیے۔

وفات

مولانا ممدوح کئی سال مستقل طور پر اپنے عالم وفاضل صاحب زادے ڈاکٹر سہیل حسن کے ہاں اسلام آباد میں اقامت فرمارہے۔ اس فقیر کی یہ خوش بختی ہے کہ وہ اس کے کرم فرما تھے۔ ان کی خدمت میں آخری مرتبہ سلام عرض کرنے کی سعادت ۲۱۔ اپریل ۲۰۰۳ء کو حاصل ہوئی۔ ۲۱، ۲۲۔ اپریل ۲۰۰۳ء کو بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی (اسلام آباد) میں ''برصغیر میں علم حدیث'' کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد ہوا تھا۔ اس کے افتتاحی اجلاس میں مولانا تشریف لائے تھے اور انھوں نے افتتاحی تقریر ارشاد فرمائی تھی۔ اس موقعے پر میں نے ان کی خدمت میں شخصیات سے متعلق اپنی کتاب ''قافلہ حدیث'' پیش کی تھی۔

مولانا عبدالغفار حسن کی تاریخ ولادت ۲۰۔ جولائی ۱۹۱۳ء تھی۔ ۲۲۔ مارچ ۲۰۰۷ء کو انھوں نے سفر آخرت اختیار فرمایا۔ اس طرح عیسوی حساب کے مطابق انھوں نے ۹۳ سال آٹھ مہینے دو دن عمر پائی۔

خاندانی اور ذاتی اعتبار سے ان کا مرتبہ بڑا بلند تھا اور ان کی تدریسی خدمات کا دائرہ بہت وسیع تھا جو ہندوستان اور پاکستان سے لے کر مدینہ منورہ تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد شمار سے باہر ہے جو مختلف ممالک میں مختلف زبانوں میں تحریری، تقریری اور تدریسی صورت میں اسلام کی تبلیغ کررہے ہیں۔ یہ مولانا کے لیے بہت بڑا صدقہ جاریہ ہے جو ان شاء اللہ تعالیٰ ان کے لیے باعث مغفرت ہوگا۔

ہم عاجز بندوں کی اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ دعا ہے کہ وہ اپنے دین کے اس مخلص ترین خادم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

یہ فقیر اس موقع پر بھی یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ حضرت مولانا کی وفات پر پاکستان اور ہندوستان کے تمام اہل حدیث رسائل وجرائد میں تعزیتی مضامین شائع ہوئے جو متعدد علمائے کرام نے تحریر فرمائے، لیکن جماعت اسلامی کے کسی اخبار یا رسالے نے ان کے متعلق دو سطریں بھی نہیں لکھیں۔ نہ جماعت کے کسی سرکردہ شخص نے کوئی تعزیتی بیان دیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انھوں

نے مولانا مودودی کے سامنے کلمۂ حق بلند کیا تھا، دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ اہل حدیث تھے۔

مولانا محمد حنیف ندوی کے بارے میں ان کے رائے

مولانا عبدالغفار حسن علمائے دین کے بے حد قدر دان تھے اور ان کا ذکر نہایت احترام کے الفاظ سے فرمایا کرتے تھے۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے ۱۲۔ جولائی ۱۹۸۷ء کو وفات پائی۔ میں نے ان کے بارے میں متعدد مقامات پر لکھا ہے، کہیں تفصیل سے اور کہیں اختصار سے۔ ان کے حالات میں میری ایک مستقل کتاب بھی ہے جس کا نام ''ارمغانِ حنیف'' ہے اور ا۷۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہفت روزہ ''الاعتصام'' کا بھی ''متکلم اسلام مولانا محمد حنیف ندوی رحمۃ اللہ علیہ'' کے عنوان سے دسمبر ۱۹۸۸ء میں خاص نمبر شائع ہوا تھا جو ۲۳۱ صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ اس نمبر میں ''مولانا حنیف ندوی کی یاد میں'' کے عنوان سے مولانا عبدالغفار حسن کا مضمون بھی شامل ہے۔ اس مضمون میں سے چند باتیں یہاں درج کی جاتی ہیں۔ مولانا عبدالغفار حسن تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا محمد حنیف ندوی مرحوم سے میرا تعارف اپریل ۱۹۳۴ء میں ہوا جب کہ راقم الحروف انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے میں بہ طور سامع شرکت کے لیے حاضر ہوا۔ اس جلسے میں مولانا موصوف نے پردے کی حمایت میں زور دار مدلل تقریر کرتے ہوئے فرمایا: کیا مغرب زدہ حضرات مسلمان عورت کو بے پردہ کرکے یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی غربت وافلاس کا مظاہرہ عام ہوجائے۔ آخر برقع اترنے کے بعد پیوند لگے ہوئے کپڑوں کے سوا اور کیا نظر آئے گا۔'' (او کما قال روایت بالمعنی)

''جلسے کے اختتام پر صدارتی تقریر میں جسٹس عبدالقادر مرحوم نے مولانا کی تقریر پر نہایت پر زور الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تعلیم کے اثرات ہیں کہ مولانا موصوف نے حقوق نسواں پر ٹھوس مواد اردو زبان میں پیش کیا ہے۔''

اس سے آگے مولانا عبدالغفار حسن فرماتے ہیں:

''آج سے بیس سال قبل جامعہ تعلیماتِ اسلامیہ فیصل آباد کی تربیت گاہ میں محاضرات دینے کے لیے مولانا ندوی تشریف لائے اور اہل علم ان کی تقاریر سے بے حد محظوظ ہوئے۔ ایک مرتبہ مولانا عبدالرحیم اشرف صاحب کے مکان پر مولانا مرحوم نے سورۃ والتین کا درس دیا جو علمی نکات کے لحاظ سے انتہائی بلند پایہ اور بصیرت افروز تھا۔''

مولانا مزید فرماتے ہیں:

''ترتیب زمانی کے لحاظ سے ایک واقعہ کا تذکرہ رہ گیا۔ وہ یہ کہ مولانا محترم ۱۹۴۴ء کے

لگ بھگ مالیر کوٹلہ تشریف لائے۔ اس وقت راقم الحروف جامع مسجد اہل حدیث مالیر کوٹلہ سے بہ طور خطیب اور مدرس وابستہ تھا۔ مولانا مرحوم نے صبح کی نماز کے بعد درسِ قرآن مجید دیا جو اپنی معنویت اور معلومات کے اعتبار سے بہت عمدہ اور بے مثال تھا۔"

مولانا رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"چند سال ہوئے جامعہ سلفیہ کے عظیم الشان جلسے میں راقم الحروف نے مولانا ندوی کی صدارت میں حجیت حدیث کے موضوع پر تقریر کی۔ تقریر کے آغاز میں مولانا محترم کی علمی خدمات کا اعتراف کیا اور ان کی ستائش کی۔"

مولانا رقم فرماتے ہیں:

"کئی سال ہوئے علما کنونشن کے موقع پر ایوانِ صدر میں ایک پرتکلف دعوت میں مولانا حنیف ندوی مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ انتہائی تپاک اور خندہ پیشانی سے ملے اور کچھ دیر گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔"

ایک اور چھوٹا سا واقعہ سنیے۔ مولانا عبدالغفار حسن فرماتے ہیں:

"جس زمانے میں جماعت اہل حدیث میں امارت وصدارت کے سلسلے میں نزاع برپا تھا، تو مولانا داؤد غزنوی کی صدارت میں مدرسہ تقویۃ الاسلام کے وسیع ہال میں جلسہ منعقد ہوا، جس میں طرفین کے مقررین نے اپنے خیالات ودلائل کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر مولانا حنیف ندوی مرحوم نے نظام صدارت کی تائید میں مدلل تقریر فرمائی۔ اسی سلسلے میں چوک دالگراں مسجد قدس میں ایک مجلس مشاورت منعقد ہوئی، جس میں بہت سے اہل علم موجود تھے۔ اس موقعے پر راقم الحروف کی نشست کچھ فاصلے پر تھی۔ مولانا مرحوم نے اپنے قریب صف اوّل میں بیٹھنے کی دعوت دی۔ اس قسم کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم راقم الحروف سے کس محبت وشفقت سے پیش آتے تھے اور خود راقم الحروف نے بھی ان کے احترام واکرام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔"

اب آخر میں مولانا محمد حنیف ندوی کے متعلق مولانا عبدالغفار حسن کا رقم فرمودہ ایک اور واقعہ ملاحظہ فرمایئے:

چند سال قبل اسلام آباد میں (اس زمانے کے) صدر پاکستان (جنرل ضیاء الحق) کی طلب پر علما کنونشن منعقد ہوا تھا، اور اس کے ماتحت متعدد سب کمیٹیاں تشکیل دی گئی تھیں، جن میں ایک کمیٹی "اجتہاد کمیٹی" کے نام سے تشکیل پائی تھی، جس کے ارکان میں میرا نام بھی تھا اور مولانا محمد حنیف ندوی مرحوم بھی اس میں شامل تھے۔ اس کمیٹی کے اجلاس میں ہر مکتب فکر کے اہل علم نامزد کیے گئے

تھے اور تقریباً سب نے اجتہاد کے موضوع پر خطاب کیا تھا۔ اس اجلاس میں ایک قابل ذکر واقعہ یہ ہوا کہ ایک متعصب قسم کے "صاحب علم" نے اپنے جمود کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بادیہ نشین صحرائی تھے۔ (او کما قال) اور اس قسم کے کچھ ایسے الفاظ کہے جن سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی تنقیص ہوتی تھی۔ اس موقعے پر مولانا حنیف ندوی کی غیرتِ دینی جوش میں آ گئی اور انھوں نے فوراً مقرر کو ٹوکتے ہوئے پورے جوش اور بلند آہنگی سے فرمایا: "یہ الفاظ ناقابل برداشت ہیں، واپس لیجیے، واپس لیجیے۔"

عمر پوری علماے کرام

ہندوستان کے اہل علم عمر پوری علماے کرام کا اب بھی نہایت احترام سے تذکرہ کرتے ہیں اور ان کی علمی خدمات اور ان کے تقویٰ وتدین کے معترف ہیں۔ چند مہینے پیشتر کی بات ہے کہ مجھے کاندھلہ (ضلع مظفر نگر) سے ایک ممتاز دیوبندی عالم مولانا نورالحسن راشد کا خط آیا کہ کسی زمانے میں عمر پور اچھا خاصہ بارونق قصبہ (یا قریہ) تھا، اب اس کی وہ حالت نہیں رہی۔ کاندھلہ سے یہ قصبہ تیس کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور یہاں کے اہل حدیث اصحابِ علم کو اس نواح میں بے حد اکرام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اب بھی پرانے لوگ بڑی تکریم سے ان کا ذکر کرتے ہیں۔

مولانا نورالحسن راشد نے مجھ سے پوچھا تھا کہ مولانا عبدالغفار حسن اور ان کے صاحب زادوں کے متعلق آپ کو کچھ پتا ہو تو مجھے اطلاع دیں۔ چناں چہ میں نے ان کو جواب میں مولانا عبدالغفار حسن اور ان کے صاحب زادوں کے متعلق تفصیل سے بتایا اور ان کی علمی سرگرمیوں سے انھیں مطلع کیا۔ لیکن اس کے بعد ان کا کوئی خط نہیں آیا۔

تحریک تحفظ ختم نبوت میں قید

پہلے بتایا گیا ہے کہ مولانا عبدالغفار حسن ۱۹۵۳ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت میں گیارہ مہینے قید رہے۔ اس سلسلے میں ہفت روزہ "الاعتصام" کے منیجر عزیزی محمد سلیم چنیوٹی کے ایک خط کے جواب میں انھوں نے ۱۲۔ جون ۲۰۰۱ء کو مندرجہ ذیل خط تحریر فرمایا تھا جو ۳۔ اگست ۲۰۰۱ء کے "الاعتصام" میں شائع ہوا۔

"تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کے سلسلے میں گیارہ ماہ جیل میں رہا ہوں (یعنی ایک ماہ سیالکوٹ جیل میں اور دس ماہ ملتان جیل میں بسر ہوئے) میرے ساتھ جیل میں مولانا محمد علی مظفری (ڈسکہ ضلع سیالکوٹ) بھی تھے۔ جیل میں عام حالات یہ تھے: کھانے کے لیے چوبیں گھنٹوں میں ایک دفعہ دلیا ملتا تھا، جس میں کنکر، روڑ سب شامل تھے۔ اور دوپہر کو روٹی سالن ملتا۔ اس میں بھی ملاوٹ ہوتی

تھی۔ سالن میں گوبھی کے ڈنٹھل بھی ہوتے تھے۔ ملتان جیل میں اور بھی کئی اہل علم محبوس تھے۔ یعنی مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ (گوجراں والا) مولانا ابوالحسن محمد یحییٰ حافظ آبادی اور ایک مولانا فقر صاحب تھے۔ [1] ملتان جیل میں ماہِ رمضان المبارک گزرا۔ ملتان جیل میں طعام وقیام کا انتظام سیالکوٹ جیل سے بہتر تھا۔"

اولاد

مولانا عبدالغفار حسن کے ماشاء اللہ چھ بیٹے ہیں اور ایک بیٹی۔ تفصیل یہ ہے:

① ...... جناب شعیب حسن: سعودی ایئر لائن میں انجینئر تھے۔ ملازمت سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔

② ...... ڈاکٹر صہیب حسن: لندن میں اسلام کی تبلیغ وتعلیم میں مصروف ہیں۔ عالی قدر باپ کی وفات کی اطلاع پہنچی تو اہلیہ سمیت اسلام آباد پہنچے۔ جنازہ انہی نے پڑھایا۔

③ ...... ڈاکٹر سہیل حسن: ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد میں تصنیفی وتحقیقی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

④ ...... ڈاکٹر خبیب حسن: (ایم بی بی ایس) الشفا انٹرنیشنل میں ڈاکٹر ہیں۔

⑤ ...... ڈاکٹر راغب حسن: رابطہ عالم اسلامی، اسلام آباد۔

⑥ ...... احمد حسن: اسلام آباد میں بعض عرب دفاتر سے منسلک ہیں۔

⑦ ...... حامد حسن: سب سے چھوٹے۔ پروفیسر انٹرنیشنل اسلامک یونی ورسٹی، اسلام آباد۔

مولانا مرحوم کے داماد کا نام عبدالرب ہے۔ وہ پی آئی اے میں ملازم تھے، ریٹائر ہو چکے ہیں۔

اپنی گزارشات کے اختتام پر یہ فقیر ڈاکٹر صہیب حسن اور ڈاکٹر سہیل حسن سے خاص طور پر یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ میرے خیال میں وہ اپنے خاندان کے علمائے کرام اور والد مکرم کا تذکرۂ حیات بہ ایں طور مرتب کریں۔

○ ...... ضلع مظفر نگر کے علمائے کرام کا بلا امتیازِ مسلک فقہی مختصر تذکرہ۔

○ ...... عمر پوری علما کا ذکر اور اپنے خاندان کے اصحاب علم کے تفصیلی حالات، ان کی تصانیف اور تلامذہ۔

○ ...... ان اصحاب علم کے اساتذہ کرام کے مفصل حالات۔

○ ...... مولانا عبدالغفار حسن کے اساتذہ کا مفصل تذکرہ۔

---

[1] مولانا کے مکتوبِ گرامی میں "مولانا فقر صاحب" ہی مرقوم ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کون بزرگ ہیں۔ اور ان کا صحیح تسمیہ کیا ہے۔

○...... مولانا عبدالغفار حسن کے سوانح حیات، ان کی تربیت کرنے والی لائق احترام دادی کے حالات (جو میسر آسکیں) ان کی تصانیف اور تصانیف میں سے اہم اقتباسات، ان کی تدریسی سرگرمیاں، ان کے تلامذہ کی جو فہرست مہیا ہو سکے۔ بعض ممتاز تلامذہ کے مختصر حالات۔

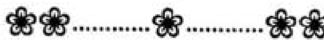
○...... مولانا عبدالغفار حسن کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد ان کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا، اس کی تفصیل۔ اگر اس باب میں کسی مضمون نگار یا مقالہ نویس سے کسی غلطی کا ارتکاب ہو گیا ہے تو اس کی نشان دہی کی جائے۔

○...... مولانا عبدالغفار حسن کے صاحب زادوں کے حالات تفصیل سے لکھے جائیں اور انھوں نے اپنی اولاد کی جس انداز سے تربیت کی اور انھیں تعلیم دلائی، اس کا خاص طور سے ذکر کیا جائے تاکہ پڑھنے والے اسے اپنے لیے مشعل راہ قرار دے سکیں۔

○...... مجھے معلوم نہیں کہ مولانا مرحوم کے صاحب زادوں کا کیا نقطہ نظر ہے، لیکن جہاں تک یہ فقیر جانتا ہے جماعت اسلامی کے لوگ نہ مولانا کی علمی صلاحیتوں کو سمجھ سکے اور نہ ان سے کوئی کام لے سکے اور نہ ان لوگوں کا یہ مزاج تھا۔ مولانا نے جو علمی کام کیا وہ یا تو جماعت اسلامی میں شمولیت سے پہلے کیا یا اس سے علیحدگی کے بعد کیا۔ اس کا ذکر میرے خیال میں ضرور ہونا چاہیے۔ کسی شخصیت کا تذکرہ کرتے وقت کسی قسم کی مصلحت کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔

میں نے مولانا کے متعلق جو گزارشات پیش کی ہیں، وہ اپنے علم ومطالعہ کی روشنی میں کی ہیں۔ اگر ان کے کسی حصے سے کسی ادارے یا کسی شخصیت کو کوئی تکلیف پہنچی ہو تو مجھے اپنے علم ومطالعہ کی تغلیط کر کے اس سے معذرت خواہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

ہم عاجز بندوں کی اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ دعا ہے کہ وہ اپنے دین کے مخلص ترین خادم عبدالغفار حسن کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ان کی اولاد واحفاد کو کتاب وسنت کی تبلیغ واشاعت کی خدمت کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم فرمائے، آمین یا رب العالمین۔



مولانا سلطان محمود

حضرت مولانا سلطان محمود (دارالحدیث محمدیہ جلال پور پیر والا، ضلع ملتان) نے ۴۔نومبر ۱۹۹۵ء کو وفات پائی۔ مندرجہ ذیل سطور میں حدیث رسول (ﷺ) کے متعلق ان کی خدمات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ان کی تدریسی جدوجہد ۱۹۳۴ء سے

لے کر ۱۹۹۵ء تک ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ جاری رہی۔ اس اثنا میں بے شمار علما وطلبا نے ان سے حصول فیض کیا اور آگے لاتعداد حضرات کو مستفید فرمایا۔ مولانا مرحوم استاذ الاساتذہ تھے۔ [1]

حضرت کے سوانح حیات سے متعلق ان کے شاگرد رشید شیخ الحدیث مولانا محمد رفیق اثری نے "مولانا سلطان محمود محدث جلال پوری" کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے جو ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل ہے اور مارچ ۲۰۰۶ء میں ادارہ نشر واشاعت جلال پور پیروالا نے شائع کی ہے۔ نہایت معلومات افزا کتاب ہے۔

حدیث کے سلسلے میں حضرت کی تحریری خدمات مندرجہ ذیل ہیں۔

①...... فتح الحمید الباری شرح کتاب التوحید للامام البخاری ؒ (غیر مطبوع)

صحیح بخاری کی آخری "کتاب الرد علی الجھمیہ وغیرھم التوحید" کی یہ مختصر شرح ہے۔ کتاب بڑے سائز کے ۲۵۸ صفحات پر مشتمل ہے اور ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔

الحمد للّٰہ وحدہ والصلوۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ ورضوان اللہ علی الذین لم ینسوا عھدہ. اما بعد فھذہ فوائد بھیة لکشف ما وضعه البخاری من رموز خفیة فی صحیحه للرد علی الجھمیة وسمیتھا فتح الحمید الباری فی شرح کتاب التوحید من صحیح البخاری.

کتاب کا اختتام درج ذیل الفاظ پر ہوتا ہے۔

لیکن ھذا آخر ما اردت ان اذکرہ واسأل اللّٰہ حسن العاقبة فی الدنیا والآخرة وان یصلی ویسلم علی سید الاوّلین والآخرین. وعلی اتباعه الاتقیاء المکرمین والحمد للہ رب العالمین. (ابو یحیی سلطان محمود. دار الحدیث

---

[1] مولانا کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب "کاروانِ سلف" از صفحہ ۴۱۱ تا ۴۴۱۔ شائع کردہ مکتبہ اسلامیہ۔ اردو بازار۔ لاہور (مطبوعہ ۲۰۰۳ء)

محمدیہ جلال پور پیر والا ملتان. ۱۳ رمضان ۱۳۹۶ھ)

کتاب غیر مطبوع ہے، اور اصل نسخہ جو مولانا سلطان محمود نے املا کرایا اور جسے مولانا عمر فاروق بن عبدالعزیز سعیدی نے لکھا، دار الحدیث محمدیہ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ مولانا عمر فاروق سعیدی لکھتے ہیں:

کمل هذه الرسالة المفيدة وهي من الفوائد التي املى على صاحب الفضيلة والسعادة المحدث الفقيه شيخنا سلطان محمود المحترم المكرم مدظله العالي وحصل الفراغ على يد ابن السبيل عمر فاروق بن عبدالعزيز السعيدي بن دين محمد في ١٣ رمضان ١٣٩٦ه. الموافق ٩ ستمبر ١٩٧٦ء

②...... ترجمہ وافادات بلوغ المرام۔ (غیر مطبوع)

زندگی کے آخری کئی سال مولانا مکرم بلوغ المرام خود پڑھاتے رہے۔ حافظ عبدالرشید صاحب نے مولانا کے الفاظ ریکارڈ کیے اور انھیں تحریر کیا۔ یہ ذخیرہ ان کے پاس موجود ہے اور وہ اسے شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

بلوغ المرام کی تدریس میں مولانا مکرم کا اندازِ تدریس یہ تھا: لفظی اردو ترجمہ، صیغوں کی رہنمائی، نحوی ترکیب کی طرف توجہ، نفس متن کی توضیح۔ اس کتاب میں اختلاف ائمہ، دلائل اور دیگر طویل مضامین کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔

③...... افادات صحیح البخاری: صحیح بخاری پر مولانا سلطان محمود صاحب کے افادات ریکارڈ شدہ موجودہ ہیں، جنھیں مولانا محمد افضل اثری (کراچی) صحیح بخاری کے مختلف اجزا کے ساتھ طبع کرا رہے ہیں۔ کتاب الاضاحی، الدعوات اور دیگر کئی حصص چھپ چکے ہیں۔

④...... افادات جامع ترمذی: جامع ترمذی کی تدریس میں مولانا کا انداز یہ تھا کہ نفس کتاب کے حل کے ساتھ ساتھ اختلاف مسالک ائمہ، دلائل کا استقصا اور راجح مسلک کی تشیید مدلل انداز میں بیان کرتے تھے۔ رواتِ سند پر مکمل بحث اور مسئلے کی مناسبت سے پیش آمدہ مسائلِ اصول فقہ اور اصولِ حدیث کا تذکرہ فرماتے تھے۔

یہ افادات متعدد تلامذہ نے تحریر کیے تھے جنھیں مولانا عبدالرحمٰن صاحب چیمہ مرتب کر رہے ہیں۔

⑤...... اصولِ حدیث پر ایک اہم رسالہ اصطلاحات المحدثین مطبوع ہے اور وفاق المدارس السلفیہ کے نصاب میں داخل ہے۔

⑥...... سنن ابی داؤد کی ایک حدیث میں "لیلۃ" کے بجائے احناف ناشرین نے "رکعۃ" چھاپ دیا۔ اس پر مولانا مرحوم نے رسالہ "تحریف الغالین فی سنن ابی داؤد" پر سیر حاصل بحث کی

ہے۔ یہ رسالہ اردو اور عربی دونوں زبانوں میں متعدد بار طبع ہو چکا ہے۔

⑦...... مولانا مکرم کے فتاویٰ بنام ''فتاویٰ دارالحدیث محمدیہ'' مولانا محمد رفیق اثری (شیخ الحدیث جلال پور پیر والا) نے بہ صورتِ تبویب کیے ہیں۔ فتاوے کے اس مجموعے کو مولانا محمد افضل اثری (کراچی) طبع کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

بے شبہ مولانا سلطان محمود کا شمار جلیل القدر علما میں ہوتا تھا۔ انھوں نے ۴۔ نومبر ۱۹۹۵ء کو وفات پائی۔

اللھم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه وادخله جنت الفردوس.



مولانا عبدالحق شہید

تقسیم ملک سے قبل ضلع فیروز پور کی تحصیل موگا میں ایک قصبہ ”سنگھاں والا“ کے نام سے موسوم تھا۔ اس قصبے میں سکھوں کی اکثریت تھی۔ تاہم مسلمانوں کے بعض خاندان بھی علاقے میں کافی اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ مسلمانوں میں چند گھر اہل حدیث مسلک کے حامل بھی تھے۔ ایک اہل حدیث خاندان میں تو چار علماے کرام بھی تھے، جن کے وعظ و خطابت اور درس و تدریس کے سلسلے جاری تھے اور علاقے میں ان کی بڑی شہرت تھی۔

یہ چار علماے کرام تھے مولانا عبدالحق، مولانا عبدالجبار، مولانا عبدالمجید اور مولانا عبدالقادر۔ ان میں سے مولانا عبدالحق معروف مدرس اور مشہور خطیب تھے۔ مولانا عبدالجبار وعظ و تقریر میں شہرت رکھتے تھے۔ مولانا عبدالمجید واعظ بھی تھے اور پنجابی کے شاعر بھی۔ مولانا عبدالقادر کا تعلق خطابت سے بھی تھا اور تدریس سے بھی۔! یعنی چاروں علماے کرام ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور چاروں اپنے اپنے انداز سے دین کی نشر و اشاعت میں مصروف رہتے تھے۔ یہ چاروں بزرگ ہمارے ہاں کوٹ کپورہ کی انجمن اصلاح المسلمین کے سالانہ جلسوں میں شرکت فرماتے تھے اور میں نے ان کو پہلی دفعہ وہیں دیکھا تھا۔ پھر ان سے تھوڑے بہت مراسم بھی ہوگئے تھے۔ ان سطور میں اپنے علم کے مطابق چند باتیں مولانا عبدالحق کے بارے میں عرض کرنا مقصود ہے۔

مولانا عبدالحق نے زیادہ تر لکھوی اور غزنوی اصحابِ علم سے تعلیم حاصل کی۔ ان کے علاوہ بعض دیگر مدارس کے مدرسین سے بھی استفادہ کیا اور نصابی کتابیں محنت اور دلچسپی سے پڑھیں۔ وہ بے حد فہیم اور نہایت ذہین تھے۔ تفسیر و حدیث، فقہ و اصول، صرف و نحو اور دیگر علوم پر عبور رکھتے تھے۔ انھوں نے تین مقامات پر خدمت تدریس سر انجام دی۔ ان کا زیادہ تر عرصۂ تدریس موضع میر محمد (ضلع قصور) میں گزرا۔ حافظ محمد یحییٰ میر محمدی کے والد مکرم حافظ محمد مرحوم سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ وہاں طویل مدت تک وہ خدمت تدریس بھی سرانجام دیتے رہے اور خدمت خطابت بھی ان کے سپرد رہی۔ اُن حالات کے مطابق میر محمد میں اچھا خاصا مدرسہ تھا جو حافظ محمد مرحوم و مغفور کی کوشش سے ”مدرسہ محمدیہ“ کے نام سے جاری کیا گیا تھا۔ مولانا عبدالحق سے اس مدرسے میں بے شمار علما و طلبا نے تعلیم حاصل کی۔ ہمارے مرحوم دوست مولانا عبدالعزیز سعیدی (متوفی ۱۵۔ مئی

۱۹۸۱ء) بھی کچھ عرصہ وہاں تحصیل علم کرتے رہے تھے۔ ❶

بعد ازاں کئی سال موضع بھینی سندھواں (ضلع امرتسر) میں ان کا سلسلۂ تدریس و خطابت جاری رہا۔ بھینی سندھواں ایک گاؤں تھا، جسے اس نواح میں اہل حدیث کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ وہاں ایک زور دار عالم دین مولانا عطاء اللہ صاحب سکونت پذیر تھے، جنھیں اگست ۱۹۴۷ میں سکھوں نے شہید کردیا تھا۔ ❷

تقریباً تین سال مولانا عبدالحق قصبہ ''پٹی'' میں اقامت گزیں رہے۔ اس شہر نما قصبے میں اہل حدیث بڑی تعداد میں آباد تھے۔ ان کی کئی مسجدیں تھیں اور ایک مدرسہ تھا۔ وہاں کی کھجور والی مسجد میں مولانا عبدالحق خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے تھے اور مدرسے میں ان کی تدریسی سرگرمیاں جاری تھیں۔ وہاں ان سے مولانا محمد یحیٰی مرحوم حافظ آبادی، حکیم عبدالرحمٰن آزاد (گوجراں والا) حافظ عبدالرحمٰن پٹوی اور دیگر متعدد حضرات نے اکتسابِ علم کیا۔ پھر حالات ایسے پیدا ہوئے کہ مولانا ممدوح پٹی کی تدریسی اور خطابتی خدمات سے دست بردار ہو کر اپنے وطن (سنگھاں والا) چلے گئے۔ وہ نہایت خوش اخلاق، عالی کردار، مہمان نواز، تہجد گزار اور متحمل مزاج عالم دین تھے۔ تعلیم و تدریس ان کی زندگی کا شب و روز کا مشغلہ تھا۔ طلبا ان کے طریق تدریس سے بہت متاثر تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا اور وہ اہل علم کے قدردان تھے۔

اگست ۱۹۴۷ء کے خون آشام زمانے میں سکھوں نے ان کو شہید کردیا تھا۔ ان کے سامنے پہلے ان کے بیٹے حافظ محمد یونس اور گھر کے دیگر افراد کو شہید کیا۔ پھر خود ان پر تلوار سے حملہ کیا اور وہ جام شہادت نوش کرگئے۔ اسی حملے کے دوران میں کسی طرح ان کی اہلیہ محترمہ اپنے بچوں قاری محمد عزیر وغیرہ کو لے کر وہاں سے نکلیں اور کسی قافلے کے ساتھ چلتے چلتے پاکستان کی سرحد میں داخل ہوئیں۔ سرحد سے چند میل کے فاصلے پر موضع میر محمد تھا، جہاں کئی سال مولانا عبدالحق کا ہنگامہ درس و تدریس برپا رہا تھا اور ان کی اہلیہ بھی اس وقت وہیں رہتی تھیں۔ یہ لٹے پٹے لوگ وہاں پہنچ گئے اور کچھ عرصہ حافظ محمد یحیٰی میر محمدی کے والد حافظ محمد مرحوم کے مہمان رہے۔ اس کے بعد لاہور آگئے۔

اسی وقت سے مولانا عبدالحق شہید کے فرزند گرامی قاری محمد عزیر لاہور میں اقامت گزیں ہیں۔ انھوں نے لاہور کی آبادی گلشن راوی کے ایف بلاک میں ''جامعۃ العلوم الاسلامیہ'' کے نام سے ایک ادارہ قائم

---

❶ مولانا عبدالعزیز سعیدی کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب ''کاروان سلف'' (شائع کردہ مکتبہ اسلامیہ، اردو بازار، لاہور) صفحہ ۱۹۱ تا ۲۳۳۔

❷ مولانا عطاء اللہ کے تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے ''کاروان سلف'' صفحہ ۶۵ تا ۸۷۔

کر رکھا ہے۔ قرأت و تجوید کے ماہر اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے دینیات کی مکمل تعلیم حاصل کی ہے اور وہ جماعت اہل حدیث کے ممتاز خطیب اور بہترین مدرس ہیں اور ان کے شاگرد اچھی خاصی تعداد میں مختلف مقامات پر قرأت و تجوید اور درس و تدریس میں مصروف ہیں۔

حافظ محمد یحیٰ میر محمدی اور قاری محمد عزیر صاحب کے باہمی تعلقات بڑے مضبوط ہیں جن کی بنیاد محض رضائے الٰہی ہے۔ حافظ صاحب لاہور تشریف لائیں تو ان کا قیام قاری صاحب کے گھر پر ہوتا ہے۔

اگست ۱۹۴۷ء ہی میں مولانا عبدالحق صاحب کے تینوں رشتے دار علما کو (جن کا ذکر ابتدائی سطور میں کیا گیا ہے) شہید کر دیا گیا تھا۔ وہ ہیں مولانا عبدالجبار، مولانا عبدالمجید اور مولانا عبدالقادر رحمہم اللہ تعالیٰ۔

مولانا عبدالجبار کے بیٹے کا نام مقداد ہے۔ وہ عالم دین ہیں۔

مولانا عبدالمجید کے فرزند گرامی کا نام مولانا عبدالرشید ہے۔ انھوں نے اوڈاں والا چک نمبر ۴۹۳ گ ب (ضلع فیصل آباد) میں تعلیم حاصل کی۔ آج کل چیچہ وطنی (ضلع خانیوال) میں خطیب ہیں۔

تقسیم ملک کے وقت مولانا عبدالقادر کی دو چھوٹی چھوٹی بیٹیاں تھیں، جن کے ننھیال پہلے کوٹ کپورہ میں رہتے تھے، تقسیم ملک کے زمانے میں وہاں سے جڑاں والا آگئے تھے اور یہ بچیاں انھی کے پاس تھیں۔ ان میں سے ایک کی شادی مولانا عبدالجبار کے بیٹے مقداد سے ہوئی اور ایک کی مولانا عبدالمجید کے فرزند عبدالرشید سے۔!

ان لڑکوں کے نانا کا نام شیر محمد تھا، وہ بھی وفات پا گئے ہیں اور ان کی نانی بھی اللہ کو پیاری ہو گئی ہیں۔

تین ماموں تھے عبدالحق، عبدالجبار اور حافظ محمد بشیر۔ یہ بھی اپنی اپنی باری سے سفر آخرت اختیار کر چکے ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ ان سب کی مغفرت فرمائے۔



مولانا ابوالفضل عبدالحنان علوی

برصغیر کے ایک ممتاز اہل حدیث عالم دین مولانا ابوالفضل عبدالحنان علوی تھے جو موضع کوس ضلع گیا (صوبہ بہار، ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ موجودہ جغرافیائی اعتبار سے موضع کوس صوبہ بہار کے ضلع نوادہ میں شامل ہے۔ مولانا عبدالحنان کی تاریخ پیدائش میں کچھ اختلاف ہے۔ پندرہ روزہ ''الارشاد جدید'' (کراچی) کے ۱۵۔ جولائی ۱۹۹۶ء کے شمارے میں نسیم احمد بانچتی نے ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۹۷ء لکھی ہے، لیکن ان کے نواسے جناب مظہر الحق صاحب فرماتے ہیں کہ وہ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔

مولانا عبدالحنان صوبہ بہار کے ''ملک'' خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا نسب نامہ سید ابراہیم عرب ملک بیا سے ملتا ہے اور یہ سلسلہ ساتویں پشت میں حضرت پیر سید عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ تک پہنچتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت سید عبدالقادر جیلا کے جد امجد تھے اور مولانا ابوالفضل عبدالحنان اپنی نسبت ان کی طرف کر کے علوی کہلاتے تھے۔

مولانا ممدوح کے والد گرامی کا نام عبداللہ تھا، انھوں نے فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ اس کے بعد انھیں بہار شریف کے مدرسہ عزیزیہ میں داخل کرا دیا گیا۔ اسی مدرسے سے انھوں نے فراغت حاصل کی۔ صوبہ بہار میں اہل حدیث کی معروف درس گاہ اس زمانے میں ''مدرسہ احمدیہ آرہ'' تھی۔ مولانا عبدالحنان علوی نے اس مدرسے میں بھی حصولِ علم کیا اور سند فراغ لی۔ تفسیر وحدیث اور درسِ نظامی کا مروّجہ نصاب مکمل کرنے کے بعد وہ دیوبند گئے اور وہاں کے دارالعلوم سے منطق وفلسفہ وغیرہ علوم کی کتابیں پڑھیں۔ پھر عازمِ دہلی ہوئے اور وہاں اہل حدیث کی مسجد کلاں میں خطیب مقرر کیے گئے اور پھر تقسیم ملک تک دہلی ہی میں رہے۔

مولانا عبدالحنان علوی دہلی آنے کے بعد جمعیت علمائے ہند سے وابستہ ہوگئے تھے اور ایک عرصے تک اس کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔ جمعیت علمائے ہند کے پلیٹ فارم پر انھوں نے تحریک آزادیٔ برصغیر کے لیے بڑی جدوجہد کی اور اس راہ میں بہت سی تکلیفیں برداشت کیں۔

جماعت اہل حدیث کی خدمت کے سلسلے میں وہ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس سے منسلک اور اس کے سرگرم رکن تھے۔ انھوں نے آل انڈیا مؤتمر اہل حدیث کے نام سے بھی اہل حدیث کی تنظیم

قائم کی۔ اس تنظیم کی طرف سے ایک پندرہ روزہ پرچہ ''المؤتمر'' جاری کیا۔ دہلی سے انھوں نے ایک ہفت روزہ اخبار ''اہل حدیث گزٹ'' کا اجرا کیا تھا۔ یہ ہفت روزہ آزادیٔ ملک تک جاری رہا۔ وہ صاف بیان مقرر، بلند آہنگ خطیب، بہت اچھے مدرس اور منجھے ہوئے اخبار نویس تھے۔ عالمانہ تحریر اور صاف ستھرا اسلوب نگارش۔ دہلی کے علمی، تدریسی اور اخباری حلقوں میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔

تقسیم ہند کے بعد کراچی آ گئے تھے اور پھر اسی شہر کو اپنا مسکن قرار دے لیا تھا۔ یہاں کی بہار کالونی میں ان کی سکونت تھی۔ اپنے گھر کے قریب ایک مسجد تعمیر کرائی، جس کا نام ''مسجد سبل السلام'' رکھا، مسجد کے ساتھ ہی ایک دینی مدرسہ قائم کیا۔ مولانا محمد یوسف کلکتوی اور محمد صالح رنگونی کے اشتراک وتعاون سے کراچی میں ''کل پاکستان مؤتمر اہل حدیث'' قائم کی۔ اس جماعتی تنظیم کی طرف سے نیو کراچی سیکٹر میں ایک ہسپتال کا قیام عمل میں لایا گیا۔ کراچی سے ''اہل حدیث گزٹ'' کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا جو کئی سال شائع ہوتا رہا۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا، دہلی سے ''اہل حدیث گزٹ'' ہفت روزہ شائع کیا جاتا تھا۔

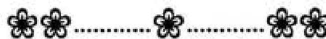
کراچی میں مولانا ممدوح نے جمعیت اہل حدیث (رجسٹرڈ) کی بنیاد رکھی اور اس کے اہتمام میں پندرہ روزہ ''الارشاد'' جاری کیا، جس کے وہ کچھ عرصہ مدیر اعلیٰ رہے۔ ''دارالحدیث رحمانیہ'' کے نام سے ایک دارالعلوم بھی جاری فرمایا۔ لیکن ان اداروں میں سے کوئی ادارہ بھی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔

تدریس وخطابت اور ادارت کے علاوہ مولانا ممدوح تصنیفی میدان میں بھی سرگرم رہے۔ انھوں نے متعدد موضوعات پر لکھا۔ ان کی ایک کتاب کا نام ''اسلام اور سوشلزم'' ہے، اس کتاب نے بعض حلقوں میں بڑی شہرت پائی اور بہت پڑھی گئی۔

مفتی کی حیثیت سے بھی کراچی میں مولانا عبدالحنان کا بڑا نام تھا۔ لوگ ان سے مختلف مسائل پوچھتے تھے اور وہ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیتے تھے۔

وہ مقرر تھے، خطیب تھے، مدرس تھے، مدیر تھے، مصنف تھے، مفتی تھے، لیکن ان کا حلقہ اثر کراچی تک محدود تھا۔ پنجاب اور ملک کے دوسرے علاقوں تک نہ وہ گئے اور نہ ان کا حلقہ قائم ہوا۔

انھوں نے ۳۔ جولائی ۱۹۸۷ء کو اپنی قیام گاہ بہار کالونی کراچی میں وفات پائی۔ ان کی نماز جنازہ جامع مسجد اہل حدیث سبل السلام میں پڑھی گئی اور پنجابیانِ دہلی برادری کے قبرستان ''شفیق پورہ'' میں انھیں دفن کیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون [1]



---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے پندرہ روزہ ''الارشاد جدید'' کیم جولائی ۱۹۹۶ء۔ نیز ملاحظہ ہو ارضِ بہار اور مسلمان، ص: ۳۸۶۔ ۳۸۸

مولانا ابو الحسنات علی محمد سعیدی

۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد جن اصحاب علم سے تعارف ہوا اور تعلقات استوار ہوئے ان میں مولانا علی محمد سعیدی کی ذات گرامی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ درمیانہ قد، گندمی رنگ، دبلے پتلے، کم گو، خوش مزاج اور بلند اخلاق۔ علمی اور تحقیقی ذوق کے مالک، تدریس اور تحریر کے دلدادہ۔ ان کی کنیت ابوالحسنات تھی۔

مولانا ممدوح مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور کی تحصیل زیرہ کے ایک گاؤں "صدر والا" میں ۱۹۱۲ء کے پس و پیش پیدا ہوئے۔ تحصیل زیرہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور مسلمانوں میں بھی اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھنے والے لوگ زیادہ تعداد میں تھے۔ برادریوں کے لحاظ سے میرے خیال میں ارائیں برادری اس تحصیل میں سب سے زیادہ تعداد میں تھی۔ جہاں تک میں جانتا ہوں دین داری اور تقویٰ شعاری میں بھی یہ لوگ اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ ان میں علمائے دین بھی تھے، لیکن مولانا علی محمد سعیدی کے گھرانے میں کوئی عالم دین نہ تھا۔ تعلیم و تعلم سے اس خاندان کو کوئی دلچسپی بھی نہ تھی۔ لیکن مولانا علی محمد کو کیوں کر دلچسپی پیدا ہوئی اور انھوں نے کس طرح علم حاصل کیا؟

بات یہ ہے کہ اس گاؤں (صدر والا) میں ایک نیک سرشت اور صالح بزرگ رہتے تھے، جن کا نام صوفی ولی محمد تھا۔ وہ خود تو کوئی بڑے عالم نہ تھے مگر اصحابِ علم سے تعلق رکھتے تھے اور انھیں دینیات کی ان کتابوں کے مطالعہ کا شوق تھا جو اس وقت اردو زبان میں حاصل ہو سکتی تھیں۔ وہ پیر محبوب شاہ لکھوی مرحوم کے عقیدت مند اور ان سے فیض یافتہ تھے۔ مولانا علی محمد سعیدی کو حصول علم کا شوق تھا، انھوں نے ابتدائی تعلیم انہی صوفی ولی محمد سے حاصل کی۔ بعد ازاں انہی کے کہنے سے موضع لکھو پہنچے اور پیر محبوب شاہ مرحوم کے بیٹے سید عبدالرحیم شاہ سے چند کتابیں پڑھیں۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ موضع لکھو اس زمانے میں ضلع فیروز پور کی تحصیل موگا کا ایک مشہور گاؤں تھا۔ اسی گاؤں میں سید عبدالرحیم شاہ سکونت پذیر تھے جو اس نواح میں اپنے عہد کے معروف عالم اور مشہور واعظ و مناظر تھے۔ حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تربیت سے جن علما نے فن مناظرہ میں شہرت پائی، ان میں سید عبدالرحیم شاہ کا نام بہت نمایاں تھا۔ صالحیت میں بھی وہ اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ گاؤں میں ان کا دینی مدرسہ بھی قائم تھا۔ انھوں نے ۱۹۳۲ء میں وفات پائی۔ مولانا علی محمد سعیدی نے تحصیل علم کے ابتدائی عہد میں ان سے استفادہ کیا۔

اس زمانے میں تحصیل موگا کے ایک قصبے "سنگھاں والا" کے چند علمائے کرام اور واعظین کا بڑا شہرہ تھا جو آپس میں قریبی رشتے دار تھے، ان میں ایک بزرگ مولانا عبدالحق تھے جو ہمارے دوست قاری محمد عزیر (گلشن راوی لاہور) کے والد محترم تھے اور حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدی کے گاؤں موضع میر محمد (ضلع قصور) میں ان کا سلسلۂ تدریس جاری تھا۔ لکھو میں شاہ عبدالرحیم سے چند کتابیں پڑھنے کے بعد علی محمد سعیدی مولانا عبدالحق کی خدمت میں موضع میر محمد آگئے۔ ان سے انھوں نے تفسیر، حدیث، فقہ، صرف ونحو اور منطق و فلسفہ کی وہ کتابیں پڑھیں جو اس وقت دینی مدارس میں پڑھائی جاتی تھیں (افسوس ہے مولانا عبدالحق اور ان کے رشتے دار علمائے کرام اگست ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں سکھوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کر گئے)۔

موضع میر محمد سے علی محمد سعیدی نے امرتسر کا رخ کیا۔ وہاں مدرسہ غزنویہ میں حضرت مولانا نیک محمد، مولانا عبدالغفور غزنوی، مولانا محمد حسین ہزاروی اور بعض دیگر اساتذہ کی مسانِدِ تدریس آراستہ تھیں، ہمارے ممدوح مولانا علی محمد سعیدی نے ان اساتذہ گرامی کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیے۔ امرتسر میں حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری سے بھی ان کو حصولِ فیض کا موقع ملا۔

اب ان کے لیے تحصیل علم کی راہیں کشادہ ہوگئی تھیں۔ چنانچہ امرتسر کے مدرسہ غزنویہ سے نکلے اور دہلی پہنچے۔ وہاں حضرت مولانا احمد اللہ پرتاپ گڑھی، مولانا سید تقریظ احمد سہسوانی اور مولانا بشیر احمد دہلوی سے استفادہ کرنے لگے۔ لیکن دہلی میں انھوں نے سب سے زیادہ حضرت مولانا ابوسعید شرف الدین صاحب سے اخذ فیض کیا۔ حضرت مولانا شرف الدین کا مدرسہ اس فقیر نے ۱۹۴۱ء میں دیکھا تھا جو انھوں نے مدرسہ سعیدیہ کے نام سے دہلی کے علاقہ پل بنگش میں قائم کیا تھا۔ مولانا علی محمد نے اس مدرسے میں داخلہ لیا اور کافی عرصہ حضرت مولانا کی خدمت میں رہے۔ ان سے خوب استفادہ کیا، انہی سے ۱۹۳۹ء میں سندِ حدیث لی اور اسی مدرسے کی طرف اپنے آپ کو منسوب کیا اور مولانا علی محمد سعیدی کے نام سے شہرت پائی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۹۳۹ء میں وہ اپنے وطن واپس آگئے۔ اب اٹھائیس برس کی عمر میں ان کی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے اولین استاد صوفی ولی محمد اور ایک اور بزرگ مولوی کمال الدین کے مشورے سے اپنے گاؤں میں دینی مدرسہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ پیر محبوب شاہ لکھوی اور سنگھاں والا کے مولانا عبدالحق کو گاؤں تشریف لانے کی دعوت دی اور ۱۹۴۰ء میں مدرسہ فیض الاسلام کے نام سے مدرسے کا اجرا کر دیا گیا۔ مولانا علی محمد سعیدی نے مسند تدریس بچھائی اور چند روز میں مقامی و بیرونی طلبا اچھی خاصی تعداد میں جمع ہوگئے۔ مولانا علی محمد سعیدی ہر مروجہ مضمون کی چھوٹی بڑی کتابیں پڑھاتے تھے۔ ۱۹۴۷ء تک سات سال اس گاؤں میں

ان کا تعلیم و تدریس کا سلسلہ کامیابی سے جاری رہا۔ اس اثنا میں طلبا کو پتا چلا کہ مولانا علی محمد سعیدی کامیاب مدرس ہیں جو متداول نصاب کے ہر موضوع کی کتابیں پڑھانے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ اگر مدرس اس قابلیت کا حامل ہو تو وہ طلبا کا مرکز توجہ قرار پا جاتا ہے اور وہ اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ ان سات سالوں میں متعدد طلبا نے ان سے حصول علم کیا جو آگے چل کر درس و تدریس کی مسندوں پر فائز ہوئے۔

۱۹۴۰ میں مولانا علی محمد سعیدی کی شادی ان کے پہلے استاد صوفی ولی محمد کی بڑی صاحب زادی سے ہوئی۔ مولانا ممدوح اس وقت بالکل بے سروسامانی کی زندگی بسر کر رہے تھے جب کہ صوفی صاحب موصوف گاؤں کے نمبردار اور آسودہ حال تھے۔ انھوں نے مولانا کی صرف نیکی اور علمیت کو پیش نگاہ رکھا اور اپنی بیٹی ان کے عقد میں دے دی۔

آزادئ برصغیر کے بعد مولانا علی محمد سعیدی اور صوفی ولی محمد پاکستان آئے اور میاں چنوں (ضلع خانیوال) سے چھ میل کے فاصلے پر چک نمبر ۷۔۸ اے آر کرملی والا میں سکونت اختیار کی۔ گھر کا سامان اور مدرسہ فیض الاسلام کا کتب خانہ وغیرہ انقلاب کی زد میں آ گیا تھا۔ معاونین و متعلقین میں سے کچھ لوگ شہید ہو گئے اور کچھ بکھر گئے۔ لیکن مولانا علی محمد سعیدی یہاں آکر پھر مدرسے کے قیام کے لیے کوشاں ہوئے۔ اب انھوں نے بیوی کا تھوڑا بہت بچا کھچا زیور فروخت کیا اور کچھ جگہ کا انتظام کیا اور ۱۹۴۷ء ہی میں جامعہ سعیدیہ کے نام سے تدریس کا آغاز کر دیا۔ پھر آہستہ آہستہ دو چار کچے کمروں اور کچی مسجد کی تعمیر کی اور تھوڑے عرصے میں مدرسہ بہت اچھے پیمانے پر جاری ہو گیا۔ بعض قابل اساتذہ کی خدمات حاصل کر لی گئیں اور طلبا کی تعداد سو تک پہنچ گئی۔ یہ بہت بڑا کام تھا جو مولانا ممدوح کی شب و روز کی بھاگ دوڑ اور مخلصانہ مساعی سے شروع ہوا اور پہلے کی طرح صوفی ولی محمد اس کی نگرانی کا فریضہ سرانجام دینے لگے۔

تعلیم و تعلم، درس و تدریس اور طلبا کی تعداد کے اعتبار سے مدرسے کا معاملہ بالکل ٹھیک تھا۔ جماعت کے مشاہیر و کبار علمائے کرام کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ سالانہ امتحان کے لیے بھی مختلف مقامات کے ممتاز علما کو دعوت دی جاتی تھی اور وہ ازراہ کرم تشریف لاتے تھے۔ مولانا علی محمد سعیدی کے استاد محترم حضرت مولانا ابو سعید شرف الدین صاحب (جن کے نام سے مدرسہ موسوم تھا) خاص طور سے تشریف لاتے تھے اور کئی کئی مہینے وہاں قیام فرماتے تھے۔ صحیح بخاری کا درس بھی دیتے تھے اور اسی مدرسے میں قیام کے دوران وہ دیگر مدارس کے ارباب اہتمام کی دعوت پر امتحانات کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔ مولانا علی محمد سعیدی اپنے عالی قدر استاذ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ حضرت استاذ بھی ان پر انتہائی شفقت فرماتے تھے۔ مولانا محمد یوسف کلکتوی بھی مولانا

علی محمد سعیدی سے گہرے مراسم رکھتے اور مدرسے کے بنیادی دینی کام میں ان سے تعاون کرتے تھے۔ اور بھی متعدد علما و زعما ان سے محبت کا برتاؤ فرماتے تھے۔ ان حضرات کی شفقتوں، دعاؤں اور مخلصانہ تعاون کا نتیجہ تھا کہ ایک دور دراز اور غیر معروف گاؤں کا یہ مدرسہ بہت جلد ترقی کی منزلیں طے کر گیا اور متعدد علما اس سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے جو مختلف مقامات میں درس و تدریس اور دعوتِ دین کے فرائض سرانجام دینے لگے۔

مولانا علی محمد سعیدی کی خواہش تھی کہ مدرسہ کسی طرح خانیوال (شہر) میں منتقل کیا جائے۔ حسن اتفاق سے وہاں کی جماعت نے مدرسے کے لیے ایک عمارت بنائی تھی جس میں ابھی تک تدریس کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ یہ جگہ مولانا عبدالقادر زیروی (خطیب جامع مسجد اہل حدیث میاں چنوں) کی وساطت سے مولانا علی محمد کو دے دی گئی اور ۱۹۶۱ء میں وہ چک ۷ سے خانیوال منتقل ہو گئے اور وہاں انھوں نے بڑے پیمانے پر مدرسہ جاری کر دیا۔ لیکن حفظ قرآن کا شعبہ چک نمبر ۷ ہی میں رہا۔ حفظ قرآن کا بہت بڑا سلسلہ ہے جو مولانا علی محمد سعیدی کی کوشش سے طویل مدت سے وہاں قائم ہے اور مقامی اور اردگرد کے بے شمار لڑکے اس مدرسے میں قرآن حفظ کرنے کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔

اس کے بعد بھاگ دوڑ کر کے مولانا علی محمد سعیدی نے (شہر) خانیوال میں دو ایکڑ زمین اور حاصل کر لی اور وہاں ایک مدرسہ قائم کر لیا۔ اس کے ساتھ بہت بڑی مسجد بھی تعمیر ہو گئی۔ اب مولانا ممدوح وہاں درس و تدریس کی خدمت بھی سرانجام دینے لگے۔ مدرسے کا انتظام بھی انھی کے سپرد ہوا، خطبہ جمعہ بھی وہی ارشاد فرماتے تھے اور اس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی باقاعدگی سے جاری کر دیا گیا۔ یہ تمام کام جو بے حد اہمیت کے حامل ہیں، وہ بڑی محنت اور کوشش سے سرانجام دیتے تھے۔

نشر و اشاعت اور تصنیف و تالیف کا شوق انھیں تقسیم ملک سے پہلے سے تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے استاذِ محترم حضرت مولانا شرف الدین صاحب مرحوم و مغفور کے کہنے پر مشہور حنفی مصنف ملا علی قاری کا عربی رسالہ ''تزئین العبارہ بتحسین الاشارہ'' حواشی و تعلیقات لکھ کر پہلی مرتبہ مدرسہ فیض الاسلام صدر والا کی طرف سے شائع کیا تھا جسے وہ دوبارہ شائع کرنا چاہتے تھے، لیکن نہ کر سکے۔

ایک رسالے میں انھوں نے ماہ محرم کے اصل مسائل کی نشان دہی کی ہے اور بعض حضرات کی طرف سے اس مہینے میں جن بدعات کا ارتکاب کیا جاتا ہے، مختصر الفاظ میں انھیں ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔

حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے کہنے پر انھوں نے مرحومہ نواب شاہ جہان بیگم والیہ بھوپال کی مشہور تصنیف ''تہذیب النسواں و تربیۃ الانسان'' شائع کی۔ خواتین کے سلسلے کی یہ بہترین کتاب ہے۔ زبان، انداز اور حسن بیان کے لحاظ سے اس سے بہتر کتاب شاید آسانی سے میسر نہ

آسکے۔ اس اہم موضوع سے متعلق مولانا علی محمد سعیدی کی یہ قابل تحسین کوشش تھی۔

مولانا محمد بشیر سہسوانی کی عربی کتاب ''البرہان العجاب علیٰ فرضیۃ ام الکتاب'' شائع کی جو بہت عرصہ پیشتر حضرت مولانا احمد اللہ پرتاپ گڑھی نے شائع کی تھی۔

قربانی کے جانوروں کی عمر کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا۔

مولانا ابوالقاسم بنارسی کی کتاب ''مسلک اہل حدیث پر ایک نظر'' کے عنوان سے شائع کی۔

علاوہ ازیں حسب ذیل رسائل تحریر کیے۔

مسائل النصیحہ المعروف تحفہ سعیدیہ۔

قربانی کے مسائل۔

احکام صدقۃ الفطر من احادیث سید البشر۔

اور بھی بعض رسائل ہیں جو خود بھی لکھے اور اپنی مالی استطاعت کے مطابق بعض دیگر مصنفین کی کتابیں بھی شائع کیں۔

''المعلم'' کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ کچھ عرصہ شائع کرتے رہے۔

ان کی بہت بڑی علمی خدمت فتاویٰ علمائے اہل حدیث ہے جو انھوں نے چودہ حصوں میں ترتیب دیا۔ اس کی نو جلدیں ہیں۔ لیکن افسوس ہے مکمل نہ ہوسکا۔ تاہم جتنا مرتب اور شائع ہوا، وہ بھی بہت بڑا کام ہے۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے۔

جلد اوّل: دو حصوں میں۔ حصہ اوّل: کتاب الطہارۃ۔ طبع ۱۹۷۲ء۔

حصہ دوم: کتاب الصلوٰۃ۔ طبع مارچ ۱۹۷۳ء

جلد ۲۔ حصہ سوم: کتاب الصلوٰۃ۔ طبع ۱۹۷۴ء

حصہ چہارم: کتاب الصلوٰۃ۔ طبع ۱۹۷۴ء

(کتاب الصلوٰۃ تین حصوں پر مشتمل ہے)

جلد ۳۔ حصہ پنجم: کتاب الجنائز مکمل۔ طبع ۱۹۷۶ء

جلد ۴۔ حصہ ششم: کتاب الصوم۔ طبع ۱۹۷۷ء

جلد ۵۔ حصہ ہفتم: کتاب الزکوٰۃ۔ طبع ۱۹۷۸ء

حصہ ہشتم: کتاب الحج۔ طبع ۱۹۷۸ء

جلد ۶: کتاب الایمان۔ حصہ دہم (۱) طبع ۱۹۷۹ء

کتاب الایمان حصہ دہم (۲) طبع ۱۹۸۰ء

(کتاب الایمان جو فتاویٰ علمائے اہل حدیث کی چھٹی جلد ہے، دو حصوں پر محیط ہے)

جلد ۷: کتاب الاعتصام بالسنہ والا جتناب عن البدعہ۔ حصہ ۱۱۔ طبع ۱۹۸۱ء

جلد ۸: کتاب العلم (حصہ بارہ) طبع ۱۹۸۵ء

جلد ۹: کتاب الضحایا والعقیقہ (حصہ ۱۳)۔ طبع ۱۹۸۶ء
کتاب البیوع (حصہ ۱۴) طبع ۱۹۸۷ء

یہ مختلف جلیل القدر علمائے کرام کے فتوے ہیں جو مولانا علی محمد سعیدی نے بہت سی کتابوں اور اخبارات و رسائل سے جمع کیے۔ یہ بے حد محنت طلب کام تھا جس کو انجام دینے کا انھوں نے عزم کیا۔ دیگر بہت سی مصروفیات کی وجہ سے وہ اسے مکمل تو نہ کر پائے لیکن جتنا کام ہوگیا، اسے بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مولانا ممدوح کے عزیز حافظ ڈاکٹر عبدالرشید اظہر یا کسی اور صاحب علم کو اسے مکمل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن اس کی مجھے توقع نہیں اس لیے کہ ہمارے ہاں اہل حدیث میں اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہوں گی۔ کسی اور کی نہیں خود اپنی بات کرتا ہوں۔ مولانا محمد حنیف ندوی سے میں عقیدت مندانہ تعلق رکھتا تھا، اب بھی وہی حال ہے۔ انھوں نے قرآن مجید کا لغت توضیحی انداز میں ''لسان القرآن'' کے نام سے حروف تہجی کی ترتیب سے لکھنا شروع کیا تھا۔ حرفِ دال (دین۔ د، ی، ن) مکمل ہوا تھا کہ مولانا وفات پاگئے۔ الف سے دال تک آٹھ حروف پر مشتمل مطبوعہ کتاب آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے اور دو جلدوں پر محیط ہے۔ مولانا محمد حنیف ندوی بہت بڑے عالم تھے اور ان کا قرآن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کی وفات کے بعد بعض حضرات نے اس فقیر پر زور دیا اور اصرار کیا کہ میں مولانا کے اس ادھورے کام کو مکمل کروں، لیکن میں اپنے علم سے آگاہ ہوں کہ وہ کتنے پانی میں ہے، اس لیے اسے شروع کرنے سے ڈر رہا تھا۔ پھر بعض حضرات کے بہت زیادہ اصرار پر شروع کردیا۔ تین حروف (ذال، را، زا) مطبوعہ شکل میں ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ مولانا ندوی کی دو جلدیں پہلے ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے چھپی تھیں۔ پھر اس فقیر کی تیسری جلد سمیت کتاب کی پہلی، دوسری، تیسری تینوں جلدیں علم و عرفان پبلشرز اردو بازار، لاہور نے شائع کیں۔ مولانا کی تصنیف شدہ دو جلدوں کو تو ظاہر ہے قرآن سے دلچسپی رکھنے والے اہل علم میں قبولیت کا درجہ حاصل تھا ہی، اس فقیر کی تیسری جلد کے بارے میں بھی بحمد اللہ قارئین کرام کی طرف سے حوصلہ افزا جواب آئے۔ اس حوصلہ افزائی کی بنا پر میں نے کام حرف ''س'' سے شروع کردیا یعنی چوتھی جلد کا آغاز کردیا گیا، مگر افسوس ہے کہ کام رک گیا۔ اب کوشش کر رہا ہوں کہ دوبارہ شروع کیا جائے۔

اسی طرح مولانا ندوی نے ''الاعتصام'' کے ابتدائی دور میں ''قرآن کی منتخب آیات کی تفسیر'' کے عنوان سے تفسیر شروع کی تھی جو کئی شماروں میں پھیلی ہوئی ہے۔ مجھے پاکستان، ہندوستان اور سعودی عرب کے متعدد حضرات نے خطوط لکھے کہ میں ان تفسیری مضامین کو جمع کر کے کتابی شکل میں چھپوانے کا اہتمام کروں۔ بعض ناشروں نے بھی اس کام کے لیے اصرار کیا۔ لیکن میں ابھی تک یہ کام نہیں کرسکا حالاں کہ یہ کوئی بہت زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ایک کام مکمل ہوگیا۔ مولانا نے ''چہرۂ نبوت قرآن کے آئینے میں'' کے عنوان سے قرآن کی روشنی میں نبی ﷺ کی سیرت لکھنا شروع کی تھی۔ میں اس وقت ''الاعتصام'' کا ایڈیٹر تھا۔ اس کی پہلی قسط ۲۔ دسمبر ۱۹۶۰ء کے شمارے میں اور آخری قسط ۷۔ ستمبر ۱۹۶۲ء کے شمارے میں چھپی تھی۔ یہ کل ۶۲ قسطیں تھیں۔ لیکن مضمون نامکمل رہا تھا۔ مولانا ندوی اسے مکمل کرنا چاہتے تھے۔ بارہا میں نے اس کی تکمیل کے لیے ان سے عرض کیا۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر ایس ایم اکرام کو اس کا علم تھا۔ انھوں نے بھی کئی دفعہ کہا۔ وہ اسے کتابی صورت میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے شائع کرنا چاہتے تھے۔ بہرحال ان کی وفات کے بعد اس فقیر نے کسی نہ کسی طرح اس کی تکمیل کی کوشش کی ہے۔ سوا تین صفحات کی یہ کتاب علم و عرفان پبلشرز اردو بازار، لاہور نے شائع کی ہے۔ کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ فقیر جب خود کچھ نہیں کرسکا تو دوسروں سے کہنے کا کیا حق رکھتا ہے کہ وہ فلاں ادھورا کام مکمل کردیں۔

مولانا علی محمد سعیدی بلند اخلاق اور عالی کردار عالم دین تھے۔ بے حد منکسر و متواضع، حلیم الطبع اور نرم مزاج، دھیمے انداز سے بات کرتے اور خندہ روئی سے پیش آتے۔

میں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۵ء تک مرکزی جمعیت اہل حدیث کی نظامت اور الاعتصام کی ادارت کے سلسلے میں خدمت انجام دیتا رہا۔ اس وقت یہ دفاتر شیش محل روڈ پر تھے۔ مولانا ممدوح کسی کام سے لاہور تشریف لاتے تو مجھے ضرور یاد فرماتے۔ یہ ان کی مہربانی تھی۔

۱۹۶۵ء کے اکتوبر میں یہ فقیر ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہوگیا تو بارہا ایسا ہوا کہ وہ لاہور آئے اور کلب روڈ پر ادارہ ثقافت اسلامیہ کے دفتر پہنچ گئے۔ وہاں مجھے بھی ملے اور مولانا محمد حنیف ندوی سے بھی گفتگو کی۔ وہ مولانا ندوی کی علمیت اور ان کے اسلوب کلام سے بہت متاثر تھے۔ مولانا ندوی پر بھی ان کے کام، ان کے انکسار، ان کی محنت اور ان کی دینی خدمات کا بڑا اثر تھا۔ انھوں نے بارہا مجھے خانیوال حاضری کی دعوت دی، لیکن افسوس ہے میں اپنی مصروفیات یا کاہلی کی بنا پر ان کے ارشاد کی تعمیل نہ کرسکا۔ انھوں نے مجھے فتاویٰ علمائے اہل حدیث کے مختلف حصے عنایت

فرمائے اور میں نے ان پر اپنے زمانہ ادارت میں ''الاعتصام'' میں بھی تبصرے کیے اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ترجمان ''المعارف'' میں بھی کئی حصوں پر تبصرے کیے۔ اس ماہنامے کی ادارت میرے سپرد تھی۔

مولانا علی محمد سعیدی نے ۶۔ جولائی ۱۹۸۷۔ (۹ ذیقعدہ ۱۴۰۷ء) کو وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا ممدوح کی اولاد نرینہ چھ بیٹے ہیں۔ مختصر الفاظ میں ان کا تعارف یہ ہے:

(۱) قاری محمد اویس: ناظم جامعہ سعیدیہ للبنات مرضی پورہ خانیوال۔ خطیب جامع مسجد اہل حدیث۔

(۲) قاری محمد انس: کاروبار کرتے ہیں۔

(۳) حافظ خبیب احمد: ناظم جامعہ سعیدیہ خانیوال۔

(۴) حافظ محمد زید: کاروبار کرتے ہیں۔

(۵) حافظ ظہیر احمد: مدرس مدرسہ عمار بن یاسر۔ ڈیرہ غازی خان۔

(۶) قاری صہیب احمد: مدرس جامعہ صدیقیہ۔ عارف والا۔

مولانا علی محمد سعیدی کے داماد اور بھتیجے حافظ ڈاکٹر عبدالرشید اظہر ہیں جو مشہور عالم اور معروف خطیب ہیں۔ اللہ نے ان کو بہت سی خوبیوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ ان کی دعوت پر چند دوستوں کے ساتھ ۹۔۱۰ مارچ ۲۰۰۷ء کو مجھے جامعہ سعیدیہ (خانیوال) میں حاضری کا موقع ملا۔ ڈاکٹر صاحب خود تو اسلام آباد رہتے ہیں، لیکن جامعہ کے معاملات پر پوری نگاہ رکھتے ہیں۔

مجھے یہ ادارہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور یہ اندازہ بھی ہوا کہ اس کے زیادہ تر معاملات کا تعلق ڈاکٹر صاحب ممدوح سے ہے۔ اور یہ لائق تحسین بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے بزرگوں کے قائم کردہ اس تدریسی ادارے کی بہ طریق احسن نگرانی کر رہے ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا علی محمد سعیدی اور صوفی ولی محمد کو جنت الفردوس میں داخل فرمائے اور جو حضرات اس وقت جامعہ سعیدیہ کے متعلق کسی طرح بھی خدمات سرانجام دے رہے ہیں، ان کی خدمات قبول فرمائے اور انھیں صحت و عافیت کی طویل زندگی سے نوازے۔ آمین



حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی

ضلع فیروز پور کی تحصیل مکتسر میں ایک گاؤں "بڈھیمال" تھا جو حجم اور آبادی کے لحاظ سے بہت مختصر تھا، مگر اہل علم کا مسکن تھا۔ حافظ احمد اللہ کا آبائی مسکن یہی گاؤں تھا اور میری ان سے پہلی ملاقات اسی گاؤں میں ہوئی تھی۔ وہ ان کی بھرپور جوانی کا زمانہ تھا۔ میانہ قد، گداز جسم، گورا سرخ رنگ، تیکھے نقوش، موٹی چمک دار آنکھیں، گھنی سیاہ داڑھی، سفید تہبند اور سفید قمیص میں ملبوس، سر پر سفید عمامہ، گرج دار آواز اور اچھے خطیب۔ اپنے گاؤں کی خطابت و امامت کے منصب پر فائز۔ پھر اس خوب صورت اور جرأت مند عالم دین سے ملاقاتوں کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ آخری ملاقات ۲۸۔ فروری ۱۹۹۸ء کو مولانا محی الدین لکھوی کے جنازے میں دیپال پور کے قریب موضع الہ آباد میں ہوئی۔ اس گاؤں کا پہلا نام تارا سنگھ تھا۔ اس وقت گردشِ لیل و نہار سے حافظ احمد اللہ کی جوانی بڑھاپے کا روپ دھار چکی تھی۔ داڑھی سفید ہوگئی تھی اور تہبند کی جگہ شلوار نے لے لی تھی۔ پھر اس سے کچھ عرصہ بعد ان کے جنازے میں (ان کے گاؤں چک نمبر ۳۶ گ ب) میں شامل ہوا اور انھیں اپنے سامنے سپرد خاک ہوتے دیکھا۔ انقلاب دوراں دیکھیے کہ جو ہاتھ نہایت شوق سے مصافحہ کے لیے ان کی طرف بڑھتے تھے، انھی ہاتھوں سے ان کی قبر پر مٹی ڈالی گئی۔

حافظ احمد اللہ کا سلسلۂ نسب یہ ہے: احمد اللہ بن قادر بخش بن علی محمد بن حمید بن شمس دین بن خالد بن محمد شریف بن محمد امین بن حافظ حبیب الرحمٰن۔ سلسلۂ نسب کے یہ بہت خوب صورت نام ہیں۔ اس سلسلے کے آخری بزرگ حافظ حبیب الرحمٰن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت پیر پیراں شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے خالہ زاد بھائی عون بن عبدالاعلیٰ عرف قطب شاہ کی اولاد میں سے تھے جن کا نسب نامہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے حضرت عباس سے جا ملتا ہے۔

میں نے حافظ احمد اللہ کے والد میاں قادر بخش کو بھی دیکھا ہے اور ان کے دادا حاجی علی محمد کی زیارت بھی کی ہے جو بڑی عمر کو پہنچ کر فوت ہوئے تھے۔ اچھی ڈیل ڈول کے بارعب بزرگ تھے۔ نابینا ہوگئے تھے لیکن کسی کے ساتھ آکر نماز مسجد میں باجماعت پڑھتے تھے۔ گاؤں میں دور تک پھیلی ہوئی زمینوں کے مالک تھے۔ ان کے ایک ہی بیٹے تھے، جن کا نام قادر بخش تھا۔ وہ پنجابی کے شاعر تھے۔ انھوں نے اپنے گاؤں کے ایک بڑے عالم اور اپنے عزیز مولانا عبدالرحمٰن کے حالات پنجابی نظم میں لکھے تھے جو کتابی شکل میں شائع ہوئے تھے۔ اب وہ کتاب بالکل نایاب ہے۔

عبدالرحمٰن اپنے گاؤں بڈھیمال کے نمبردار تھے اور انھوں نے اس گاؤں میں مدرسہ رحمانیہ کے نام سے ایک درس گاہ جاری کی تھی، جس میں متعدد حضرات نے تحصیل علم کی۔ ان کی وفات عین عالم جوانی میں غالباً ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ ہوئی تھی۔

بڈھیمال کے لوگ اگست ۱۹۴۷ء کے زمانے میں ضلع فیصل آباد کی تحصیل جڑاں والا کے ایک گاؤں چک نمبر ۳۶ گ ب میں آبسے تھے۔ یہ صاحب حیثیت لوگ تھے۔ میرا خیال ہے انھیں سرکاری محکموں سے کبھی واسطہ نہیں پڑا ہوگا۔ ۱۹۵۲ کے پس و پیش کی بات ہے۔ میں اس وقت اخبار ''الاعتصام'' میں خدمت ادارت پر مامور تھا اور اس اخبار کا دفتر شیش محل روڈ پر دارالعلوم تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ میں تھا۔ سردیوں کا موسم تھا کہ ایک روز صبح نو بجے کے قریب میاں قادر بخش تشریف لائے۔ ان کی حالت دیکھ کر ان کا ماضی میرے سامنے آ کھڑا ہوا اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے ان کو نہایت احترام سے بٹھایا اور کوئلے کی انگیٹھی ان کے قریب کی۔ ان دنوں عام طور پر دفتروں میں سردی کے موسم میں کوئلے کی انگیٹھی چلتی تھی۔ گرم گرم چائے پلائی اور آنے کی وجہ پوچھی تو بتایا کہ وہ زمین کی الاٹ منٹ کے سلسلے میں متعلقہ محکمے میں جانا چاہتے تھے۔ لیکن انھیں اس محکمے کے دفتر کا پتا نہیں کہ کہاں ہے۔

اس معاملے کا تعلق سینٹر ریکارڈ سے تھا جہاں پناہ گزینوں (یا مہاجرین) کی متروکہ زمینوں کا ریکارڈ ہندوستان سے آتا تھا۔ یہ دفتر دیوسماج روڈ پر ہندوؤں کے ایک متروکہ گرلز ہائی سکول میں تھا۔ اتفاق سے اس دفتر کا افسرِ اعلیٰ مجھے جانتا تھا جو شیعہ مسلک سے تعلق رکھتا تھا۔ میں اسی وقت میاں قادر بخش کو وہاں لے گیا اور اسے بتایا کہ ہندوستان میں یہ کس حیثیت کے مالک تھے۔ اس نے ہماری بات غور سے سنی اور متعلقہ پٹواری کو ان کا کام فوری طور پر کرنے کی ہدایت کی۔

ہمارے ممدوح حافظ احمد اللہ اسی میاں قادر بخش کے فرزند گرامی قدر تھے جو فروری ۱۹۱۹ میں موضع بڈھیمال (تحصیل مکتسر ضلع فیروز پور مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ پیدائش سے دو سال بعد ان کی والدہ وفات پا گئی تھیں۔ بچے کی پرورش نانی اور بڑے ماموں کی بیوی نے نہایت پیار سے کی۔ بچپن میں ان کے دادا حاجی علی محمد انھیں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اس طرح لاڈ پیار میں سات آٹھ سال گزر گئے اور یہ کوئی تعلیم نہ حاصل کر سکے۔ پھر ان کے سب سے بڑے بھائی مولانا قدرت اللہ کے توجہ دلانے پر تعلیم کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ کچھ دن مولانا عبدالغنی کی خدمت میں حاضری دی جو اس وقت گاؤں کی مسجد کے خطیب اور امام تھے اور بچوں کو مسجد میں پڑھاتے بھی تھے۔ پھر احمد اللہ کے جد امجد حاجی علی محمد نے اپنے اس پوتے کو خود پڑھانا شروع کیا۔ پہلے ناظرہ قرآن مجید پڑھایا اور پھر اس زمانے کے دیہاتی رواج کے مطابق حافظ محمد لکھوی کی پنجابی نظم کی کتابیں احوال

الآخرت، انواعِ محمدی اور زینت الاسلام وغیرہ پڑھائیں۔ بعد ازاں مولوی رحیم بخش کی تصنیف ”اسلام کی کتاب“ کے چار پانچ حصے پڑھائے۔

اب احمد اللہ کے دل میں حصول علم کا جذبہ ابھر آیا تھا اور وہ اس جذبے کی تکمیل کے لیے کوشاں ہوگئے تھے۔ اس وقت مدرسہ محمدیہ لکھوکے کی بڑی شہرت تھی جسے بعد میں جامعہ محمدیہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ وہاں استاذ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کی مسند تدریس آراستہ تھی۔ بالخصوص صرف ونحو میں مولانا لکھوی درجۂ امامت پر فائز تھے۔ حافظ احمد اللہ نے حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کی خدمت میں حاضر ہوکر صرف ونحو کی کتابیں پڑھیں۔ مولانا ممدوح کے صاحب زادے مولانا عبدالرحمٰن لکھوی بھی وہیں پڑھاتے تھے اور منطق و فلسفہ پر عبور رکھتے تھے۔ ان سے حافظ صاحب نے منطق اور فلسفے کی کتابیں پڑھیں۔

لکھوکے سے علوم وفنون کی متداول کتابیں پڑھنے کے بعد حافظ احمد اللہ نے گوجراں والا کا عزم کیا اور وہاں حضرت حافظ محمد گوندلوی اور مولانا محمد اسماعیل سلفی کی خدمت میں حاضری دی۔ حضرت حافظ محمد صاحب سے صحیح بخاری اور مروجہ نصاب کی بعض انتہائی کتابیں پڑھیں۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی سے صحیح مسلم، مختصر المعانی اور عربی ادبیات وغیرہ کی تکمیل کی۔ مولانا سلفی اپنے اس شاگرد کی طبعی شرافت، کم گوئی، صالحیت اور سادگی کی بنا پر انھیں ”فرشتہ“ کے نام سے پکارتے تھے۔

گوجراں والا سے فراغت کے بعد حضرت حافظ عبداللہ روپڑی کے حلقۂ درس کی شہرت سنی تو روپڑ چلے گئے۔ حضرت حافظ عبداللہ صاحب سے انھوں نے صحیح بخاری دوبارہ پڑھی، ہدایہ اوّلین کا درس لیا اور علوم نقلیہ وعقلیہ کی بعض کتابیں پڑھیں۔

اس زمانے میں حضرت مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی شعبان اور رمضان میں فارغ التحصیل طلبا کو دورۂ تفسیر کرایا کرتے تھے۔ اس دورے کی حلقۂ علما میں بڑی شہرت تھی اور مولانا سیالکوٹی بے شبہ پیکر علم وعمل، وسیع المطالعہ اور بہت بڑے محقق تھے۔ ۱۹۳۹ء میں حافظ احمد اللہ صاحب ان کی خدمت میں گئے اور دورۂ تفسیر کیا۔ مولانا سیالکوٹی چھوٹی بڑی ۸۴ کتابوں کے مصنف تھے۔ انھیں قرآن پر جو عبور حاصل تھا، اس کا اندازہ ان کتابوں سے ہوتا ہے جو انھوں نے قرآن سے متعلق لکھیں۔

۱۹۳۹ء میں حافظ احمد اللہ صاحب نے مروجہ علوم سے فراغت کے بعد اپنے گاؤں بڈھیمال کے اس مدرسے میں جو مولانا عبدالرحمٰن مرحوم نے مدرسہ رحمانیہ کے نام سے جاری فرمایا تھا، درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور مسجد کی خطابت و امامت بھی انھی کے سپرد ہوئی۔ رمضان المبارک میں نماز تراویح بھی یہی پڑھاتے تھے۔

حافظ احمد اللہ صاحب نے قرآن مجید بغیر کسی استاد کے اس وقت اپنے گاؤں بڈھیمال میں یاد

کیا تھا جب وہ اپنے کھیتوں میں مویشی چرایا کرتے تھے۔ پھر قرآن کی تجوید کا شوق ہوا تو ضلع حصار کے کسی مقام پر ایک استاذ کی خدمت میں گئے۔ اس گاؤں میں فیصل آباد کے مشہور واعظ، قاری عبدالحفیظ کے والد بھی قرآن پڑھتے تھے جو نابینا تھے۔ حافظ احمد اللہ ان کو قرآن یاد کراتے تھے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد حافظ احمد اللہ کی شادی بڈھیمال میں اپنی پھوپھی کی بیٹی سے ہوئی۔ اس نیک بخت خاتون کے والد کا نام صوفی عنایت اللہ تھا جو کسی عالم کا وعظ سن کر دنیوی معاملات سے بالکل دست کش ہوگئے تھے۔ میں نے ان کو دیکھا ہے۔ وہ ایک ولی اللہ بزرگ کی حیثیت سے مشہور تھے۔ صاف ستھرا سفید لباس پہنتے تھے اور فرید کوٹ میں تانگوں کے اڈے کے پاس کہیں رہتے تھے۔ ان کے بیٹے کا نام مولانا عطاء اللہ تھا جو باعمل عالم تھے اور کچھ عرصہ بڈھیمال کے مدرسہ رحمانیہ میں طلبا کو پڑھاتے بھی رہے تھے۔ جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن کے لائبریرین عبدالقیوم ضیا انہی کے اخلاف میں سے ہیں۔

حافظ احمد اللہ کے دو بیٹوں حافظ عبدالعزیز علوی اور حافظ عبدالکبیر کی ولادت بڈھیمال ہی میں ہوئی تھی۔

تعلیم و تعلم کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ بڈھیمال میں کبڈی، مگدر وغیرہ ورزشوں کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے جس میں شیخ الحدیث مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی (متوفی ۹۔ مئی ۱۹۸۷) اور صاحب ترجمہ حافظ احمد اللہ بھی حصہ لیتے تھے، وہ ان حضرات کی جوانی کا زمانہ تھا۔

اگست ۱۹۴۷ میں برصغیر آزاد ہوا اور پاکستان معرض قیام میں آیا تو حالات بالکل بدل گئے۔ ان لوگوں نے پاکستان آکر ایک گاؤں (چک نمبر ۳۶ گ ب) میں سکونت اختیار کرلی۔ اس اجنبی فضا اور غیر مانوس علاقے میں شروع شروع میں ان حضرات کو ایسے پریشان کن حالات کا سامنا کرنا پڑا جن کا انھیں کبھی تصور بھی نہیں ہوا تھا۔

چک نمبر ۳۶ گ ب میں حافظ احمد اللہ کھیتی باڑی کرنے لگے۔ محدود پیمانے پر گاؤں میں درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کردیا تھا۔ لیکن اس کے بعد حالات میں کچھ تبدیلی آئی اور لوگوں کو ان کے علم و قابلیت کا پتا چلا تو انھیں گاؤں سے باہر نکلنے کا موقع ملا۔ اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے (ممکن ہے اس تفصیل کے بیان میں ترتیب زمانی قائم نہ رہ سکے۔)

① ...... اس زمانے میں تاندلیاں والا کے قریب چک نمبر ۴۰۵ گ ب کمیانہ میں ایک نوجوان حافظ عبدالحق فروکش تھے۔ اس گاؤں میں اہل حدیث کے صرف دو تین گھر تھے، باقی سب لوگ حنفی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ حافظ عبدالحق اچھے خاصے زمیندار تھے۔ اپنے گاؤں میں وہ ایک دینی مدرسہ قائم کرنا چاہتے تھے اور مدرس کے علاوہ انھیں مسجد میں کسی حق گو خطیب کی بھی ضرورت تھی۔

چنانچہ ۱۹۵۰ میں وہ حافظ احمد اللہ صاحب کو اپنے گاؤں لے گئے۔ حافظ صاحب تقریباً دو سال وہاں رہے۔ ۱۹۵۲ کے آخر میں وہاں سے آگئے۔

۲...... مولانا حافظ اسماعیل ذبیح جماعت اہل حدیث کے معروف خطیب تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ لاہور آئے اور مغل پورہ میں قیام پذیر ہوئے۔ وہیں مسجد توحید میں خطبہ جمعہ ارشاد فرمانے لگے۔ پھر راولپنڈی کی جماعت اہل حدیث کی درخواست پر بہ حیثیت خطیب وہاں چلے گئے تھے۔ وہاں انھوں نے جامع مسجد اہل حدیث میں تدریس القرآن والحدیث کے نام سے مدرسہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا تو حافظ احمد اللہ صاحب کو بہ طور مدرس وہاں لے گئے۔ راولپنڈی حافظ صاحب کے گاؤں چک نمبر ۳۶ گ ب سے بہت دور ہے۔ وہ دو یا تین سال وہاں رہے۔ پھر واپس آگئے۔

۳...... راولپنڈی سے واپسی کے بعد ان کی خدمات مشہور بزرگ اور نہایت صالح عالم دین میاں محمد باقر نے حاصل کرلیں اور وہ انھیں اپنے گاؤں چک نمبر ۴۲۷ گ ب (تحصیل تاندلیاں والا) لے آئے۔ ان کے مدرسے کا نام مدرسہ خادم القرآن والحدیث تھا۔ یہاں بھی ان کا قیام دو یا تین سال رہا۔

۴...... بعد ازاں حافظ احمد اللہ صاحب سے مولانا عبداللہ ویرووالوی نے رابطہ قائم کیا تو ان سے اپنے مدرسے دارالقرآن والحدیث (جناح کالونی، فیصل آباد) میں تشریف لانے کی درخواست کی۔ چنانچہ وہ اس مدرسے میں خدمت تدریس انجام دینے لگے۔ یہاں کئی سال ان کا قیام رہا۔

۵...... کسی زمانے میں ایک اچھے خاصے زمیندار حاجی قطب الدین نے ڈھلیانہ (ضلع اوکاڑہ) میں ایک مدرسہ جاری کیا تھا۔ اس کے اخراجات کے ذمہ دار خود حاجی صاحب تھے۔ لیکن اس کا انتظام حافظ عبدالرزاق کے سپرد تھا جو نابینا تھے اور ڈھلیانہ کے قریب چک نمبر ۴ جی ڈی غلام رسول والا میں رہتے تھے۔ حافظ احمد اللہ اس مدرسے میں تقریباً ڈیڑھ سال طلبا کو پڑھاتے رہے۔

۶...... اوکاڑہ میں ایک مدرسہ دارالحدیث کے نام سے وہاں کے ایک بزرگ قاضی محمد رمضان نے قائم کیا تھا۔ اس مدرسے میں حضرت مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی بھی طلبا کو مستفید فرماتے رہے ہیں۔ قاضی محمد رمضان کی وفات کے بعد اس کے ناظم مولانا حبیب الرحمٰن لکھوی کو بنا لیا گیا تھا۔ ان کی درخواست پر حافظ احمد اللہ بھی وہاں تشریف لے گئے تھے۔ پھر اس کے منتظم ایک بزرگ مولانا عبدالعزیز کو مقرر کیا گیا تھا۔ ان کے دور انتظام میں بھی کچھ عرصہ اس مدرسے میں حافظ احمد اللہ فریضۂ تدریس سرانجام دیتے رہے۔

۷...... جڑاں والا کی جماعت اہل حدیث نے مدرسۃ البنات جاری کیا تھا۔ حافظ صاحب کچھ عرصہ اس مدرسے میں بچیوں کو صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث پڑھاتے رہے۔ اس اثنا میں وہاں کی

جامع مسجد اہل حدیث (واقع غلہ منڈی) میں ان کا درس قرآن کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

⑧...... غالباً ایک سال دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور میں بھی حافظ صاحب نے خدمات سرانجام دیں۔

⑨...... جامعہ تعلیمات اسلامیہ (فیصل آباد) میں بھی کچھ مدت ان کا سلسلۂ تدریس جاری رہا۔

⑩...... صوفی عبداللہ مرحوم و مغفور کے فرمان کے مطابق دو سال جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن کے منصب تدریس پر مامور رہے۔

⑪...... ماموں کانجن سے واپس آئے تو مولانا محمد صدیق اور میاں محمد باقر کے صاحب زادے مولانا عتیق اللہ مرحوم کے اصرار پر دوبارہ مدرسہ خادم القرآن والحدیث میں تدریس کے لیے چک نمبر ۴۲۷ گ ب جھوک دادو چلے گئے۔ وہاں کے مدرسۃ البنات میں بچیوں کو کتب حدیث پڑھانے کی ذمہ داری بھی ان کے سپرد تھی۔ کئی سال وہاں ان کا قیام رہا۔

⑫...... جھوک دادو سے حافظ صاحب جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) چلے گئے۔ وہاں انھوں نے آٹھ نو سال تدریسی فرائض انجام دیے۔

⑬...... وقت نے پھر پلٹا کھایا اور جامعہ سلفیہ سے مولانا عبداللہ ڈیروالوی کے اصرار پر دوبارہ دارالقرآن والحدیث (فیصل آباد) میں خدمات انجام دینے لگے۔ پھر وفات تک وہیں رہے۔

حافظ صاحب منجھے ہوئے مدرس اور صاف کلام خطیب تھے۔ کلمہ حق کہنے میں نہایت جری تھے۔ اس باب میں کبھی کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوئے۔ جس بات کو قرآن و حدیث کے موافق سمجھا اس کا برملا اظہار کیا۔ اگر اپنے گاؤں میں ہوتے یا کسی ایسی جگہ خدمت تدریس انجام دیتے جہاں سے گاؤں پہنچنا آسان ہوتا تو خطبہ جمعہ گاؤں جا کر ارشاد فرماتے۔ عیدین کی نماز بھی گاؤں میں پڑھاتے۔ درس قرآن کا التزام کرتے۔ نماز تراویح میں جتنا قرآن پڑھتے، تراویح ختم ہونے کے بعد اس کا خلاصہ بیان کرتے۔ قرآن سے بے حد لگاؤ تھا۔ نماز میں نہایت خوش الحانی کے ساتھ قرآن پڑھتے۔ عام تلاوت قرآن بھی ٹھہر ٹھہر کر کرتے۔ ہر چھوٹی بڑی سنت پر عمل پیرا ہوتے۔ فرمانِ رسول (ﷺ) کو ہر معاملے میں پیش نگاہ رکھتے۔ زیادہ گفتگو سے پرہیز فرماتے۔ وہی بات کرتے جو ان کے نزدیک ضروری ہوتی۔ طلبا کے سبق میں ناغہ نہ کرتے۔ محنت سے مطالعہ کر کے پڑھاتے۔ بعض اوقات کسی معاملے میں بہت جلد غصے میں آجاتے۔ پھر غصہ جلد ہی ختم بھی ہو جاتا۔

ایک عجیب واقعہ سنیے۔ بڈھیمال کے زمانۂ تدریس میں ایک جن حافظ صاحب سے تعلیم حاصل کرتا تھا۔ ایک مرتبہ انھیں آشوب چشم کا عارضہ ہوگیا۔ ان کے جن شاگرد نے ان کی آنکھوں میں کوئی دوا ڈالی جس سے تکلیف ختم ہوگئی۔ پھر زندگی میں کبھی آنکھ کی تکلیف نہیں ہوئی۔

جوانی میں بڑے طاقت ور تھے اور جسمانی حالت بہت مضبوط تھی۔ جس زمانے میں چک نمبر ۴۲۷ گ ب جھوک دادو میں خدمت تدریس انجام دیتے تھے، ان کی جسمانی طاقت کے بارے میں وہاں کے ایک شخص نے کہا تھا کہ یہ حافظ اگر ریل کے انجن کو کھینچنا چاہے تو کھینچ سکتا ہے۔

عابد و زاہد عالم دین تھے اور اس کے ساتھ خوش مزاج بھی تھے۔ ان سے متعلق ایک دلچسپ لطیفہ سنیے جو واقعہ بھی ہے۔ ۱۹۸۸ کی بات ہے کہ میں کسی سلسلے میں ان کے گاؤں چک نمبر ۳۶ گیا۔ یہ انتخابات کا زمانہ تھا اور مختلف سیاسی جماعتوں کی انتخابی مہم زوروں پر تھی۔ پیپلز پارٹی کے لوگ بھی اپنے اپنے حلقے میں تقریریں کر رہے اور ووٹروں سے مل رہے تھے۔ جمعے کا دن تھا۔ میں وضو کر رہا تھا کہ حافظ صاحب منبر پر کھڑے ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک اخبار تھا۔ انھوں نے خطبہ مسنونہ پڑھا۔ پھر قرآن کی کوئی آیت تلاوت کی۔ پنجابی میں اس کا ترجمہ بیان فرمایا۔ پھر تقریر کرتے ہوئے اس کا رخ پیپلز پارٹی کی طرف موڑ دیا اور اس کی مخالفت کرنے لگے۔ جو اخبار ان کے ہاتھ میں تھا اسے کھولا اور اس کا ایک مضمون پڑھنا شروع کیا جو پیپلز پارٹی کے خلاف کسی نے لکھا تھا۔ لیکن وقت کم تھا اس لیے مضمون پورا نہیں پڑھا گیا۔ اب خطبہ ثانی کے بعد دو رکعت نماز پڑھی تو اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص حسن سعید سے کہا تم یہاں سے لے کر یہاں تک حاضرین کو مضمون پڑھ کر سناؤ تاکہ انھیں پتا چلے کہ پیپلز پارٹی غلط پارٹی ہے۔ اسے ووٹ نہیں دینا چاہیے۔ حسن سعید نے تعمیل ارشاد کی اور باقی ماندہ مضمون پڑھ کر لوگوں کو سنایا۔ حافظ صاحب منبر پر جب وہ اخبار پڑھ رہے تھے۔ مجھے دور سے شبہ ہوا کہ وہ کراچی کا ہفت روزہ اخبار ''تکبیر'' تھا۔

جمعہ پڑھ کر میں نے اپنے گاؤں آنا تھا۔ سلام کے لیے حافظ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جی میں آیا کہ از راہِ مزاح آہستہ سے ان کے کان میں کہوں کہ اگر خطبہ جمعہ اسی کا نام ہے جو آپ نے ارشاد فرمایا ہے تو میں صبح سے لے کر شام تک اس قسم کے کم از کم بیس خطبے دے سکتا ہوں۔ لیکن ان کے احترام میں یہ الفاظ نہیں کہہ سکتا تھا اور نہیں کہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ اس قسم کے مزاح کو سننے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا حوصلہ رکھتے ہیں تو یہ الفاظ ضرور کہتا۔ مولانا معین الدین لکھوی یا مولانا ارشاد الحق اثری یا رانا شفیق پسروری یا عبدالقادر ندوی کی زبان سے اس قسم کے الفاظ سننے کا موقع ملتا تو انھیں یہ بات کہنے میں مجھے کوئی تامل نہ ہوتا۔ لیکن حافظ احمد اللہ کا احترام مانع رہا۔ حالاں کہ ایسے مواقع پر میں دل کی بات کہنے میں کبھی جھجک محسوس نہیں کرتا۔

حافظ احمد اللہ صاحب سیاست نہیں کرتے تھے۔ لیکن غالباً ان کا رجحان مسلم لیگ کی طرف تھا اور پیپلز پارٹی کے سخت مخالف تھے۔ سیاسی جماعتوں کے بارے میں مختلف لوگوں کے مختلف خیالات ہیں۔ یہ کوئی اسلامی مسئلہ نہیں ہے۔ اپنے علم اور مطالعے کی بنا پر ہر شخص کو ہر جماعت کے متعلق

اظہار رائے کا حق حاصل ہے۔ اس سلسلے میں میری بھی ایک رائے ہے اور میں اس رائے پر قائم رہنے اور اس کے اظہار میں اپنے آپ کو حق بجانب قرار دیتا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے نہ میں کبھی مسلم لیگی تھا، نہ اب ہوں اور نہ پندرہ سولہ مسلم لیگوں میں سے آئندہ کسی مسلم لیگ سے ان شاء اللہ کبھی تعلق پیدا ہوگا۔

حافظ احمد اللہ کے اسلاف میں سے (جیسا کہ ابتداے مضمون میں عرض کیا گیا) ایک بزرگ قطب شاہ تھے۔ وہ خوش کردار بزرگ تھے۔ ان سے متعلق بعض عجیب وغریب واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ وہ اپنے مریدوں میں بیٹھے تھے کہ ایک بھنگی اور چرسی آیا۔ اس نے ان سے چار آنے مانگے۔ انھوں نے چار آنے دے دیے اور وہ چار آنے لے کر خوشی کا اظہار کرتا ہوا چلا گیا۔ لوگوں نے قطب شاہ سے کہا آپ نے اسے چار آنے دے دیے، یہ چار آنے کی بھنگ اور چرس پیے گا۔ آپ کو اسے پیسے نہیں دینا چاہیے تھے۔ انھوں نے فرمایا میں نے تو اسے آج پہلی دفعہ چار آنے دیے ہیں (آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا) اس سے پوچھو جو اسے روزانہ دیتا ہے۔

حافظ صاحب جلیل القدر عالم، تجربہ کار معلم، بہت اچھے خطیب اور زوردار مبلغ دین تھے۔ جفا کش، پاک دامن، انتہائی غیور، تہجد گزار، صادق القول اور پختہ فکر بزرگ تھے۔ برادری کے تمام افراد ان کی بات مانتے تھے۔ کسی شرعی مسئلے کے متعلق کوئی شخص فتویٰ پوچھتا تو قرآن و حدیث کی روشنی میں پوری صراحت سے فتویٰ دیتے۔ ان کا معمول تھا کہ عشا کی نماز کے فوراً بعد سو جاتے، اِدھر اُدھر کی دنیوی باتیں نہ کرتے۔

اسلامی احکام پر عمل اور اس کی تبلیغ کے بارے میں نہایت تیز تھے اور اس باب میں بے حد باحمیت تھے، کوئی بات اس کے خلاف برداشت نہ کرتے۔ ان کے موجودہ گاؤں (چک نمبر ۳۶) میں مرزائیوں کے چند گھر آباد تھے جو زمیندار تھے اور وہاں کی جماعت اہل حدیث کے شدید مخالف تھے۔ کہا کرتے تھے کہ ان مولویوں کو ہم جب جی چاہے ختم کر دیں گے۔ ۱۹۵۳ میں مرزائیوں کے خلاف تحریک چلی تو اس گاؤں کے مرزائی، مسلمانوں کے خلاف لڑائی پر آمادہ ہوگئے۔ ان کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر حافظ احمد اللہ نے اپنی برادری کے لوگوں کو ان کے مقابلے کے لیے پکارا۔ آناً فاناً انھوں نے مرزائیوں کی گلیوں کا محاصرہ کرلیا۔ اتنے میں گاؤں کے اور مسلمان بھی گھروں سے نکل آئے۔ باقاعدہ لڑائی ہوئی اور مرزائی میدان چھوڑ گئے۔

اس کے بعد معاملہ تھانے کچہری تک پہنچا اور حافظ احمد اللہ سمیت حکومت نے بہت سے لوگوں کو گرفتار کرلیا۔ کئی مہینے یہ لوگ لائل پور جیل میں رہے۔ ایک دفعہ میں نے بھی جیل کے اندر ان کی بیرکوں میں جا کر ان سے ملاقات کی۔ بالآخر مرزائیوں کی درخواست پر صلح ہوئی اور حافظ احمد اللہ

اور ان کے ساتھی جیل سے باہر آئے۔ جیل میں بھی حافظ صاحب نے باقاعدہ سلسلۂ وعظ و درس جاری رکھا۔

انھوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۹۳۹ میں اپنے گاؤں (بڈھیمال) میں تدریسی سلسلے کا آغاز کیا تھا، جو پاکستان آنے کے بعد مختلف مدارس میں ان کی وفات تک جاری رہا۔ یعنی تقریباً ساٹھ سال فریضہ تدریس انجام دیا۔ یہ بہت بڑی مدت ہے جو اس کارِ خیر میں صرف ہوئی۔ تفسیر و حدیث اور دیگر علوم کی درسی کتابیں پڑھاتے پڑھاتے انھیں ازبر ہوگئی تھیں۔

ان کا انتقال اس طرح ہوا کہ وہ جھوک دادو چک نمبر ۴۴۷ گ ب کے مدرسے میں امتحان کے لیے گئے۔ وہیں ۲۸۔ نومبر ۱۹۹۸ کو ہفتے کے روز صبح نو بجے اچانک وفات پاگئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ان کی میت ان کے گاؤں چک نمبر ۳۶ لائی گئی اور نماز مغرب کے بعد ان کے بڑے صاحب زادے حافظ عبدالعزیز علوی (شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ فیصل آباد) نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور عشا کے قریب انھیں دفن کردیا گیا۔ ان سطور کا راقم عاجز ان کے جنازے میں شامل تھا۔

اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ

اب آئندہ سطور میں حافظ احمد اللہ مرحوم ومغفور کی اولاد کے بارے میں چند سطور کا مطالعہ فرمایئے۔

حافظ صاحب کی اولاد ماشاء اللہ چھ بیٹے اور چھ بیٹیاں ہیں۔ یہ بارہ بیٹے بیٹیاں ان کی دو بیویوں کے بطن سے ہیں۔ ان کی پہلی شادی جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا تقسیم ملک سے قبل ان کے آبائی گاؤں بڈھیمال میں ہوئی تھی۔ یہ بیوی پاکستان آنے کے چند سال بعد وفات پاگئیں تو دوسری شادی کی۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ دوسری بیوی کا بھی ان کی زندگی میں انتقال ہوگیا۔

① ...... حافظ صاحب کے بڑے بیٹے حافظ عبدالعزیز علوی ہیں جو تقسیم ملک سے قبل پیدا ہوئے۔ میٹرک پاس اور دینیات کے فاضل ہیں۔ اپنے عہد کے متعدد نامور اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ کامیاب مدرس ہیں۔ تصنیف و تالیف اور ترجمے کا بھی ذوق رکھتے ہیں۔ بعض رسائل و جرائد میں ان کے مقالات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ سلسلہ تدریس کا آغاز ۱۹۶۸ میں جامعہ تعلیمات اسلامیہ (فیصل آباد) سے کیا تھا۔ یہ سطور ۱۸۔ اگست ۲۰۰۷ کو لکھی جارہی ہیں۔ تقریباً اٹھارہ سال سے جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) کی مسند شیخ الحدیث پر متمکن ہیں۔ اس اثنا میں بے شمار طلبا و علما نے ان سے استفادہ کیا۔ ان سے متعلق ان شاء اللہ مستقل مضمون لکھا جائے گا جس میں ان کی تدریسی اور تحریری مساعی کو اجاگر کرنے کی سعی کی جائے گی۔

② ...... حافظ احمد اللہ مرحوم کے دوسرے بیٹے حافظ عبدالکبیر علوی ہیں جن کی ولادت ۱۹۴۶

میں بڈھیمال میں ہوئی۔ سندِ فراغت کلیہ دارالقرآن والحدیث (فیصل آباد) سے حاصل کی۔ ۱۹۶۶ میں گوجراں والا میں قاری محمد اسلم سے قرآن مجید حفظ کیا۔ اس اثنا میں جامعہ اسلامیہ میں حضرت حافظ محمد گوندلوی سے صحیح بخاری پڑھی۔ بعض کتابیں مولانا ابو البرکات احمد سے پڑھیں۔ تدریس کا آغاز مولانا محمد حسین شیخوپوری کی جاری کردہ جامعہ محمدیہ (شیخوپورہ) سے کیا۔ بعد ازاں جامعہ سلفیہ (اسلام آباد) مدرسہ دارالحدیث حافظ آباد اور مدرسہ خیریہ باغ (آزاد کشمیر) میں تدریس کی۔ کئی سال دارالحدیث محمدیہ عام خاص باغ ملتان میں بہ طور شیخ الحدیث خدمات سرانجام دیں۔ اب جامعہ تعلیماتِ اسلامیہ (فیصل آباد) میں مصروفِ درس وتدریس ہیں۔ مدرس کے علاوہ خوش کلام خطیب بھی ہیں۔

③...... حافظ صاحب مرحوم کے تیسرے بیٹے حافظ عبدالعلیم علوی ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۹۴۹ میں چک نمبر ۳۶ گ ب میں ہوئی۔ حصول علم کا آغاز دارالقرآن والحدیث (فیصل آباد) سے کیا اور تکمیل جامعہ محمدیہ (گوجراں والا) میں ہوئی۔ تدریس کی ابتدا جامعہ محمدیہ (شیخوپورہ) سے کی۔ بعد ازاں مدرسہ تدریس القرآن والحدیث (راولپنڈی) دارالحدیث (عام خاص باغ ملتان) اور مدرسہ اشاعۃ العلوم چک نمبر ۱۴۹ (عارف والا) میں پڑھاتے رہے۔ اب تقریباً اٹھارہ سال سے جامعہ اسلامیہ (گوجراں والا) میں علم حدیث کی انتہائی کتابیں پڑھا رہے ہیں۔

④...... چوتھے بیٹے عبدالحلیم علوی ۱۹۷۳ میں پیدا ہوئے۔ تمام مروجہ علوم کی تحصیل کلیہ دارالقرآن والحدیث فیصل آباد میں کی۔ ۱۹۹۴ میں بیس برس کی عمر میں سندِ فراغت لی۔ اس وقت سے وہیں فریضہ تدریس انجام دے رہے ہیں۔

⑤...... حافظ احمد اللہ مرحوم کے پانچویں بیٹے حافظ عبدالرحیم ہیں۔ کچھ عرصہ پیشتر وہ تحصیل علم میں مصروف تھے۔

⑥...... چھٹے بیٹے حافظ عبدالحفیظ ۱۹۹۰ میں پیدا ہوئے۔ والد مکرم کی وفات کے وقت ان کی عمر صرف آٹھ سال تھی۔ آج ۱۸۔ اگست ۲۰۰۷ ہے۔ دو سال قبل کلیہ دارالقرآن والحدیث (فیصل آباد) میں پڑھتے تھے جب کہ ان کے بڑے بھائی عبدالحلیم وہاں طلبا کو پڑھاتے ہیں۔

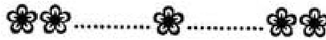
ایک بیٹے (عبدالحلیم) کے سوا حافظ احمد اللہ مرحوم ومغفور کے تمام بیٹے قرآن کے حافظ ہیں۔ دو ڈیڑھ سال قبل پتا چلا تھا کہ انھوں نے دس پارے یاد کیے تھے، ممکن ہے اب پورا قرآن یاد کرلیا ہو۔

ایک (بڑی بیٹی) کے سوا حافظ احمد اللہ کی بیٹیاں بھی قرآن کی حافظہ ہیں۔ اس نے بھی بائیس تیئس پارے حفظ کر لیے تھے لیکن والدہ کی وفات کی وجہ سے گھریلو کاموں میں مصروف ہوگئی اور پورا

قرآن حفظ نہ کرسکی۔

حافظ صاحب کے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں میں سے متعدد افراد قرآن مجید حفظ کر چکے ہیں، اور ان میں سے بعض نے علوم دینیہ کی تحصیل کر لی ہے اور بعض کر رہے ہیں۔ حافظ صاحب نے اپنی اولاد کی تربیت نہایت اچھے طریقے سے کی اور سب اولاد باپ کی فرماں بردار رہی۔

تقریباً ساٹھ برس مختلف مدارس و جامعات میں حافظ احمد اللہ صاحب کا سلسلۂ تدریس جاری رہا۔ اس اثنا میں بے شمار لوگ ان کے حلقہ شاگردی میں شامل ہوئے جن کو شمار میں لانا ممکن نہیں۔



مولانا عبداللہ (گوجراں والا)

تفسیر و حدیث، صرف ونحو، معانی و بیان، اصول حدیث، اصول فقہ، عربی ادبیات اور منطق و فلسفہ کی تدریس میں پاکستان کے جن علماے کرام نے خدمات سرانجام دیں، ان میں مولانا عبداللہ صاحب کا اسم گرامی قابل ذکر ہے۔ مولانا کا تعلق گجر برادری سے تھا اور ان کے خاندان کے بزرگ احناف کے بریلوی نقطہ نظر کے حامل تھے۔ سب سے پہلے ان کے دادا حافظ علم الدین بریلویت ترک کر کے مسلک اہل حدیث سے وابستہ ہوئے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حافظ علم الدین گولڑہ کے پیر مہر علی شاہ صاحب کے حلقۂ بیعت میں شامل تھے۔ حافظ صاحب نے ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ ایک میدان میں بے شمار لوگ کھڑے ہیں، میں بھی اس ہجوم کے ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ میرے پیر مہر علی شاہ صاحب بھی اس ہجوم میں شامل ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اچانک ایک عجیب وغریب چیز آسمان سے اترنا شروع ہوئی۔ تمام لوگ اس کی طرف دیکھنے لگے۔ جیسے جیسے وہ چیز قریب آرہی تھی لوگوں کی توجہ اس کی طرف زیادہ مبذول ہو رہی تھی۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ دوڑ کر اسے اپنے قبضے میں کرلے۔ جب وہ چیز زمین پر آگئی تو میں اور پیر مہر علی شاہ صاحب دونوں اس کو پکڑنے کے لیے دوڑے۔ لیکن وہ عجیب وغریب چیز پیر صاحب کے ہاتھ میں آنے کے بجائے میرے ہاتھ میں آگئی اور اسی خوشی میں میری آنکھ کھل گئی۔

حافظ علم الدین نے اس خواب کی تعبیر بعض لوگوں سے پوچھی تو ایک بزرگ نے ان سے سوال کیا کہ آپ نے کچھ دینی علم پڑھا ہے؟ انھوں نے جواب دیا میں قرآن مجید کا حافظ ہوں اور فقہ کی ایک کتاب ''قدوری'' میں نے پڑھی ہے۔

بزرگ نے فرمایا یہ اللہ کا نور قرآن و حدیث ہے جو آسمان سے اترا ہے اور آپ نے اسے اپنے قبضے میں کیا ہے، اسے حاصل کر کے اس پر عمل کرو۔ اس کے بعد حافظ علم الدین نے مسلک اہل حدیث اختیار کرلیا۔

مولانا عبداللہ اسی حافظ علم الدین کے پوتے ہیں جو ۱۸ مارچ ۱۹۲۰ء کو چک نمبر ۱۶ جنوبی، تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبدالرحمٰن تھا۔

کچھ بڑے ہوئے تو انھیں سرکاری سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اس اثنا میں مقامی مسجد کے امام سے قرآن مجید ناظرہ پڑھا۔ ۱۹۳۳ء میں مڈل کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔ ۱۹۳۴ میں ان کے

والد بیٹے کو تعلیم دلانے کے لیے گوجراں والا لے آئے۔ ضلع گوجراں والا کے قصبہ قاضی کوٹ میں عبداللہ کی پھوپھی سکونت پذیر تھیں۔ انھوں نے اپنے اس بھتیجے کی تربیت کی اور وہ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کی جاری کردہ درس گاہ ''مدرسہ محمدیہ'' میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ حضرت حافظ محمد گوندلوی اور مولانا محمد اسماعیل سلفی سے تحصیل علم کی۔

میں نے پہلی دفعہ مولانا عبداللہ کو ۱۹۴۰ میں دیکھا تھا۔ میں علوم دینیہ کے مروجہ نصاب کی انتہائی کتابوں کی تکمیل کے لیے حضرت الاستاذ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے حکم کے مطابق گوجراں والا میں حضرت حافظ محمد گوندلوی اور مولانا محمد اسماعیل سلفی کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہاں جن حضرات سے تعارف ہوا، ان میں مرحوم مولانا عبداللہ بھی شامل تھے۔ وہ ان کی چوبیس پچیس سال کی بھرپور جوانی کا زمانہ تھا اور فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔ دال بازار کی مسجد اہل حدیث کی خطابت و امامت ان کے سپرد تھی۔ وہیں ان کا قیام تھا۔ اس زمانے میں اس مسجد کی انتظامیہ جن معزز ارکان پر مشتمل تھی، ان میں ایک موثر رکن میاں عبداللہ اہل حدیث تھے اور وہ مولانا عبداللہ پر نگاہِ شفقت رکھتے تھے۔ مسجد اہل حدیث دال بازار سے مولانا عبداللہ روزانہ چوک نیائیں مولانا محمد اسماعیل سلفی کی مسجد میں آتے اور تمام نصابی کتابوں کے درس میں شامل ہونے کی کوشش کرتے۔ دوسرے لفظوں میں کہنا چاہیے کہ ہر درسی کتاب پڑھنے اور سننے کا انھیں کئی کئی دفعہ موقع ملا۔ اس طرح بہت سی کتابوں پر انھیں عبور حاصل ہوگیا تھا۔

وہ بات چیت اور میل جول میں بے تکلف تھے۔ چھوٹے بڑے تمام طلبا سے ہم کلامی میں ان کا ایک ہی انداز تھا۔ اس سلسلے میں وہ تکلف کے عادی نہ تھے۔ صاف پنجابی میں سیدھی بات کرتے تھے۔ میں دو سال وہاں رہا۔ عمر میں ان سے کئی سال چھوٹا تھا، لیکن مجھ سے ان کا طرز تخاطب وہی تھا جو اپنے ہم عمر طلبا سے تھا۔ وہ اپنے بارے میں کسی کے ذہن میں احساس اجنبیت نہیں پیدا ہونے دیتے تھے۔ بالعموم صبح سے نمازِ ظہر تک وہ جامع مسجد اہل حدیث میں رہتے تھے۔ عصر کے وقت اپنی مسجد (دال بازار) میں چلے جاتے تھے، جس کے وہ خطیب بھی تھے اور امام بھی۔

۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۱ میں ان سے جمعے کی چھٹی کے علاوہ تقریباً روزانہ ملاقات ہوتی تھی اور بات چیت کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ پھر ۱۹۴۹ میں گوجراں والا سے مولانا محمد حنیف ندوی کی ادارت میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' جاری ہوا تو مولانا ندوی کے ارشاد کے مطابق فروری ۱۹۵۰ میں مرکزی جمعیت کے اصحاب اختیار نے مجھے نائب مدیر کی حیثیت سے گوجراں والا بھیج دیا۔ وہاں تقریباً تین سال میرا قیام رہا۔ اس اثنا میں بھی مولانا عبداللہ صاحب سے میل جول کا سلسلہ جاری رہا۔ اس وقت وہ فریضہ تدریس بھی انجام دیتے تھے۔

مولانا عبداللہ کا آبائی وطن تو (جیسا کہ پہلے بتایا گیا) ضلع سرگودھا کا ایک گاؤں چک نمبر ۱۶ جنوبی تھا، لیکن ان کا تعلق ضلع گجرات کے کسی گاؤں سے بھی تھا اور وہ مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد وہاں جاتے اور دو تین روز کے بعد واپس آجاتے تھے۔ ضلع گجرات سے تعلق کی بنا پر حلقہ طلبا میں ان کو مولانا عبداللہ گجراتی کہا جاتا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے ابتدا ہی سے گوجراں والا کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ پھر یہی شہر ان کی دینی و تدریسی سرگرمیوں کا مرکز بنا اور یہی ان کا مدفن ہوا۔ نور اللہ مرقدہٗ۔

گوجراں والا پہلوانوں کا شہر تھا۔ یہ کلچر اب بھی کسی حد تک وہاں موجود ہے۔ چنانچہ جس میدان میں مولانا عبداللہ کی نماز جنازہ پڑھی جارہی تھی، اس کے ایک گوشے میں پہلوانوں کا اکھاڑا ہے جس میں جنازے کے وقت اپنے معمول کے مطابق گوجراں والا کے پہلوان "زور" کررہے تھے۔

آج سے ۶۷، ۶۸ سال قبل میرا مولانا عبداللہ صاحب سے تعارف ہوا تھا۔ اس وقت گوجراں والا کے بعض کشمیری پہلوانوں سے ان کے اچھے مراسم تھے اور ان سے وہ پہلوانی کا فن سیکھا کرتے تھے اور وہاں کے جماعتی حلقے میں انھیں "مولوی عبداللہ پہلوان" کہا جاتا تھا۔ وہ پہلوانوں کی طرح اکھاڑے میں جاتے، زور کرتے اور "ڈنڈ بیٹھکیں" لگایا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ طویل عرصے تک ان کی صحت بہت اچھی رہی، قرآن کی زبان میں کہنا چاہیے کہ وہ **بسطة فی العلم والجسم** تھے اور چوں کہ ان کی علمی تربیت گوجراں والا میں ہوئی تھی اور یہیں سے انھوں نے خطابت و امامت اور پھر تدریس کا آغاز کیا، اس لیے انھوں نے اسی شہر کے خطیب و عالم کی حیثیت سے شہرت پائی۔

اس شہر میں مولانا ممدوح کی خطابتی اور تدریسی خدمات کا دائرہ ساٹھ سال سے زیادہ مدت میں پھیلا ہوا ہے۔ جی ٹی روڈ پر انھوں نے جامعہ محمدیہ کے نام سے ایک دارالعلوم قائم کیا، وہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس سے اب تک ہزاروں علما و طلبا استفادہ کرچکے ہیں اور ان شاء اللہ کرتے رہیں گے۔ یہ ان کا ایسا صدقۂ جاریہ ہے، جس کا اجر بارگاہِ الٰہی سے انھیں ہمیشہ ملتا رہے گا۔ اس دارالعلوم میں انھوں نے خود بھی طویل عرصے تک طلبا کو قرآن و حدیث اور دیگر علوم متداولہ کی تعلیم دی اور متعدد فاضل اساتذہ بھی اس باب میں سرگرم عمل رہے۔ یہ سطور ۳۰ ستمبر ۲۰۰۷ء کو لکھی جارہی ہیں۔ اس وقت وہاں مولانا عبدالحمید ہزاروی شیخ الحدیث کی مسند پر فائز ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا حافظ عبدالمنان نورپوری، مولانا محمد رفیق سلفی، مولانا محمد مالک بھنڈر، حافظ محمد عمران عریف، حافظ محمد عبداللہ شرق پوری، قاری منظور احمد صاحب اور بعض دوسرے اساتذہ کرام وہاں فریضہ تدریس سر انجام دے رہے ہیں۔

۲۰۔ فروری ۱۹۶۸ کو حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کا سانحہ ارتحال پیش آیا تو ان کی جگہ جامع مسجد اہل حدیث میں خطیب کے تقرر کے لیے گوجراں والا کی انجمن اہل حدیث کا اجلاس ہوا۔

بعض ارکان انجمن نے رائے دی کہ کسی باہر کے خطیب کی خدمات حاصل کی جائیں اور بعض نے مولانا عبداللہ صاحب کے تقرر کا مشورہ دیا۔ ہمارے مرحوم دوست اسماعیل ضیا (سابق ایم پی اے) کا اصرار تھا کہ مولانا عبداللہ صاحب ہی خطابت کے لیے موزوں ہیں۔ وہ اس شہر کے باشندے ہیں اور یہاں کے ماحول سے آگاہ ہیں۔ کوئی دوسرا خطیب جو باہر سے آئے گا، معلوم نہیں اس کے کیا مطالبات ہوں اور ہمارے ساتھ اس کا نباہ ہوسکے یا نہ ہوسکے۔ اسماعیل ضیا مرحوم کی تجویز کے بعد انجمن کے ارکان نے انہی کو اپنے نمائندے کے طور پر مولانا عبداللہ مرحوم کی خدمت میں بھیجا۔ انھوں نے مولانا کو انجمن کے فیصلے سے مطلع کیا تو وہ فوراً یہ خدمت انجام دینے پر رضا مند ہوگئے اور حضرت مولانا محمد اسماعیل کا منبر ان کے حوالے کردیا گیا۔

مولانا عبداللہ مرحوم جماعت اہل حدیث کی بزمِ علم کے اہم رکن تھے۔ ان کی تدریسی سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع تھا، کم و بیش ساٹھ سال پر محیط۔ وہ انتہائی خوش بخت تھے جو اتنی طویل مدت تک خاص انداز اور تسلسل کے ساتھ ایک ہی شہر میں قال اللہ وقال الرسول کی دلنواز صدائیں بلند کرتے رہے اور جنھوں نے اپنی حیاتِ مستعار کا اتنا بڑا حصہ لتکون کلمة الله هي العليا کی جدوجہد میں صرف کردیا۔

تدریس کے ساتھ ساتھ وہ بہت اچھے خطیب بھی تھے۔ خطابت میں انھوں نے پنجابی زبان کو ذریعہ اظہار بنایا اور وہ اس میں کامیاب تھے۔ صاف بیان مقرر تھے اور جرأت مندانہ لہجے میں بیانِ مدعا فرماتے تھے۔ اپنے علم و مطالعہ کی روشنی میں جو بات صحیح سمجھتے اسے زبان پر لانے میں کسی قسم کا باک محسوس نہ کرتے تھے۔

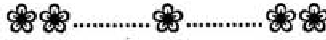
۱۹۹۹ء میں ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا، جس کی وجہ سے اس ممتاز خطیب اور نامور مدرس کی علمی اور دینی سرگرمیاں معطل ہوگئی تھیں۔ اب نہ ان میں گفتگو کا یارا رہا تھا، نہ چلنے پھرنے کی طاقت تھی۔ اس متحرک و مستعد شخصیت کی تمام سرگرمیاں ختم ہوگئی تھیں۔ جسمانی طاقت انتہائی کمزوری میں بدل گئی تھی اور سر سے پاؤں تک یہ حالت ہوگئی تھی کہ وہ مولانا عبداللہ کے بجائے ان کا نہایت مختصر خلاصہ معلوم ہوتے تھے۔ آخر ۲۸۔ اپریل ۲۰۰۱ء (۲۳۔ صفر ۱۴۲۲ھ) کی صبح کو ہفتے کے روز یہ خلاصہ بھی اس جہانِ آب و گل سے کوچ کرگیا۔

انا الله وانا اليه راجعون.

اسی روز نمازِ عصر کے بعد گوجراں والا کے شیراں والا باغ میں ان کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔ یہ فقیر نمازِ جنازہ میں شریک تھا۔

انھوں نے اپنے پیچھے سیکڑوں کی تعداد میں شاگرد چھوڑے جنھوں نے ان سے قرآن و حدیث کا درس لیا اور وہ اب مختلف مقامات میں یا تو درس و تدریس میں مصروف ہیں یا وعظ و تذکیر کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ ہم عاجز بندوں کے نزدیک مرحوم کے لیے یہ مستقل صدقہ جاریہ ہے۔

اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ.



مولانا ابوالبرکات احمد

۱۹۵۰ء میں مجھے مرکزی جمعیت اہل حدیث کی طرف سے ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں خدمات سرانجام دینے کے لیے گوجراں والا بھیجا گیا تو وہاں میں چند روز ٹاہلی والی مسجد کے ایک کمرے میں رہا۔ اس مسجد میں حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ مغرب کی نماز کے بعد چار پانچ طلبا کو صحیح بخاری کا درس دیا کرتے تھے۔ وہیں ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ گول چوڑا چہرہ، سرخی مائل گورا رنگ، کشادہ پیشانی، ابھری ہوئی ذرہ سی موٹی ناک، چمکتی ہوئی آنکھیں، باریک سے خوب صورت دانت، میانہ قد، کتر بیونت سے پاک چھوٹی کالی داڑھی، معصوم سی سنجیدہ شکل، کم گو مگر خوش گفتار، سادہ لیکن صاف ستھرا لباس۔ یہ تھے اس زمانے کے مولانا ابوالبرکات احمد، جن سے آگے چل کر اچھے خاصے مراسم پیدا ہوئے اور تعلقات کا سلسلہ بڑھا۔

''الاعتصام'' کا دفتر چوک نیائیں میں حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کی (جامع مسجد اہل حدیث) کے متصل تھا اور میں چند روز کے بعد ٹاہلی والی مسجد کی سکونت ترک کرکے چوک بیری والا کی ایک بلڈنگ میں چلا گیا تھا، لیکن مولانا ابوالبرکات احمد سے میل ملاقات کا سلسلہ بہ دستور جاری رہا۔ وہ چاہ شاہاں والا کے قریب حضرت حافظ محمد گوندلوی کے ساتھ جامعہ اسلامیہ میں فریضہ تدریس سرانجام دینے لگے تھے اور علم کی دنیا میں مصروف زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر وہ تعلقات قائم رکھنے کو عملاً ضروری قرار دیتے تھے۔ چناں چہ ہفتے میں دو چار مرتبہ وہ ضرور دفتر ''الاعتصام'' تشریف لاتے اور ہم دونوں ایک چائے خانے میں چائے پینے جاتے۔ وہ وضع دار اور رکھ رکھاؤ کے عالم دین تھے۔ بہترین مدرس، صالح ترین نوجوان اور خوش مزاج انسان۔ ان کی زندگی کا ہر پہلو اجلا ہوا اور ہر گوشہ لائق اعتنا تھا۔ جوانی ہی میں بڑھاپے کی متانت نے ان پر اپنا سایہ ڈال دیا تھا۔

اب آیئے شروع سے لے کر آخر تک مولانا ابوالبرکات احمد کی حیاتِ طیبہ کی مختلف منزلوں کو تلاش کرتے ہیں اور انھوں نے جہاں جہاں جو نقوش چھوڑے، اپنی معلومات کے مطابق ان کی نشان دہی کے لیے کوشاں ہوتے ہیں۔

یہاں یہ عرض کردیں کہ مولانا ممدوح کے حالات سے متعلق اپنی ذاتی یادداشتوں کے علاوہ بعض تحریری مآخذ ہمارے سامنے ہیں۔ ایک پروفیسر محمد یوسف سجاد کی تصنیف ''تذکرہ علمائے اہل حدیث پاکستان'' (جلد دوم۔ طبع ۱۹۸۹ء) دوسرا ماہنامہ رسالہ والضحیٰ (گوجراں والا) کا شیخ الحدیث

مولانا ابوالبرکات احمد نمبر (بابت ستمبر ۱۹۹۱۔ ربیع الاوّل ۱۴۱۲ھ) پروفیسر محمد یوسف سجاد کا مضمون مولانا ممدوح کی زندگی (جنوری ۱۹۸۹ء) میں شائع ہوا تھا جو بہت سی ضروری معلومات کا احاطہ کیے ہوئے ہے، ''والضحیٰ'' کے خاص نمبر میں بھی شامل ہے۔ ان کے علاوہ مولانا ممدوح کی وفات پر شائع شدہ بعض جماعتی جرائد ورسائل کے مضامین بھی پیش نگاہ ہیں۔

مولانا ابوالبرکات احمد کا پیدائشی اور سکونتی تعلق ہمارے اس علاقے سے سیکڑوں میل دور جنوبی ہند سے تھا۔ وہاں کے علاقہ مدراس میں ایک شہر کا نام ''چمناڈ'' ہے۔ چمناڈ کے نواح میں ایک قصبہ ''کاسرگوڈ'' کے نام سے موسوم ہے۔ کاسرگوڈ میں ایک اہل حدیث خاندان آباد تھا۔ اس خاندان کے ایک بزرگ کا اسم گرامی مولانا محمد تھا جو اس علاقے میں علم وعمل کے لحاظ سے اچھی شہرت رکھتے تھے۔ مولانا محمد کے ایک فرزند مولانا محمد اسماعیل تھے۔ یہ بھی باپ کی طرح عالم اور پاکیزہ اطوار شخص تھے۔ ۱۹۲۶ء میں مولانا محمد اسماعیل کے گھر ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام ابوالبرکات احمد رکھا گیا۔

یہاں یہ یاد رہے کہ اس علاقے میں اکثریت شافعی مسلک سے تعلق رکھنے والوں کی تھی۔ اہل حدیث بہت کم تھے، البتہ ابوالبرکات احمد کے دادا اور والد کے علاوہ ان کے دونوں تایا اور ماموں اہل حدیث تھے۔ یعنی ان کے ددھیال اور ننھیال دونوں خاندان مسلک اہل حدیث سے وابستہ تھے اور علمائے دین تھے۔ ان کی والدہ بھی صالحہ خاتون تھیں اور قرآن کی حافظہ وقاریہ تھیں۔

وہ صلح وآشتی کا زمانہ تھا، تمام لوگ اتحاد واتفاق سے زندگی بسر کرتے تھے۔ نہ شوافع، اہل حدیث سے جھگڑتے تھے، نہ اہل حدیث، شوافع سے پنجہ آزمائی کرتے تھے۔ مسلک ومذہب کی بنیاد پر کسی کو ہدفِ تنقید یا نشانۂ تنقیص نہیں بنایا جاتا تھا۔

ابوالبرکات احمد نے ابتدائی تعلیم اپنی والدۂ مکرمہ سے حاصل کی۔ معمول یہ تھا کہ وہ گھر میں والدہ سے قرآنِ مجید پڑھتے اور سکول میں سرکاری نصاب کے مطابق حصولِ علم کرتے۔ شروع ہی سے بے حد محنتی اور تحصیل علم کے شائق تھے۔ ذہن بھی تیز تھا۔

اس کے بعد کرشناڈ کے ایک عالم دین مولانا محمد عباس کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور ان سے صرف ونحو کی کتابیں پڑھیں۔ دو سال ان کی خدمت میں رہے اور جو کتابیں ان سے پڑھیں، وہ ذہن میں محفوظ ہوگئیں۔ اس زمانے میں عربی کے قدیم شعرا کے بہت سے اشعار بھی یاد کرلیے اور قرآنِ مجید کے بھی چند پارے حفظ کرلیے۔ عربی لغت سے بھی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ مولانا محمد عباس شافعی المسلک تھے اور فقہ شافعی پر عبور رکھتے تھے، لیکن مولانا ابوالبرکات احمد نے فقہ شافعی کی کوئی کتاب ان سے نہیں پڑھی۔

مولانا محمد عباس سے دو سال استفادہ کرنے کے بعد انھوں نے علامہ محمد کاتنگاڈی کے درس

میں داخلہ لیا۔ وہ بھی مسلکی اعتبار سے شافعی تھے، مگر تقلید کے خلاف تھے۔ کتب حدیث اور شروحِ حدیث سے وہ بے حد دلچسپی رکھتے تھے۔ چناں چہ نیل الاوطار، تحفۃ الاحوذی شرح جامع ترمذی اور عون المعبود شرح ابوداؤد وغیرہ کتابوں کا علامہ محمد کاتنگاڈی نہایت شوق سے مطالعہ کرتے تھے اور ان کتابوں پر انھیں عبور حاصل تھا۔ وہ تحقیق کے عادی تھے اور اپنے شاگرد ابوالبرکات احمد کو بھی انھوں نے تحقیق کی راہ پر لگا دیا۔ وہاں کے دورِ قیام میں ابوالبرکات احمد نے جہاں علم نحو وغیرہ کی انتہائی کتابیں پڑھیں وہاں فقہ شافعی کی مختلف کتابوں کا بھی درس لیا۔ علاوہ ازیں تفاسیر میں سے جلالین، تفسیر خازن، کشاف، ابن کثیر، معالم التنزیل، المنار اور تفسیر فتح البیان وغیرہ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔

علامہ محمد کاتنگاڈی سے اخذ علم کے بعد علامہ الجاویری کے بابِ علم پر دستک دی۔ وہ بھی شافعی مسلک سے تعلق رکھتے تھے اور اس عہد کے ممتاز عالم ومدرس تھے۔ منطق، فلسفہ، فقہ اور اصولِ فقہ کے ممتاز اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مولانا ابوالبرکات احمد نے ان سے منطق وفلسفہ کی نصابی کتابیں بھی پڑھیں اور فقہ کی بعض کتابوں کا بھی ان سے درس لیا۔

اس کے بعد مدراس کے مدرسۃ العالیہ میں داخل ہوئے۔ اس مدرسے کے اساتذہ سے معانی، بیان، بدیع، منطق، فلسفہ اور ریاضی وغیرہ فنون کی تکمیل کی جو اس مدرسے کے نصاب میں شامل تھے۔ یہاں انگریزی بھی پڑھی۔ کتب احادیث کا درس بھی لیا۔ عربی زبان میں تقریر وتحریر کی مشق کا بھی یہاں خوب موقع ملا اور اس موقعے سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ یہاں علامہ محمد الصلاح بہت سی تفسیروں کا مطالعہ کر کے ''خلاصۃ التفسیر'' کے عنوان سے طلبا کو لیکچر دیتے تھے۔ طلبا بھی ان تفسیروں کا مطالعہ کرتے تھے۔ اس مدرسے کی بہت بڑی لائبریری تھی، جس سے علما وطلبا استفادہ کرتے تھے۔ مولانا ابوالبرکات احمد نے بھی استفادہ کیا۔

اسی دوران مولانا ابوالبرکات نے ایک حنفی عالم سے فقہ حنفی اور اصولِ فقہ کی چند کتابیں پڑھیں۔ اس طرح انھوں نے اہل حدیث، شافعی اور حنفی یعنی اپنے عہد کے تین علمی سرچشموں سے سیراب ہونے کا شرف حاصل کیا۔ مروّجہ علوم کی تحصیل کے علاوہ عربی میں تحریر وتقریر میں بھی مہارت پیدا کرلی۔

اب انھوں نے مزید تعلیم کے لیے مصر جانے کا منصوبہ بنایا اور قاہرہ کی جامعہ ازہر میں داخلے کا عزم کیا۔ ان کے گیارہ بہن بھائی تھے، جن میں چار زندہ تھے، باقی وفات پاچکے تھے۔ اس لیے بیٹے کو اتنے دور کے سفر کی اجازت دینا ماں باپ کے لیے بہت مشکل تھا، تاہم انھوں نے بیٹے کے علمی شوق کو دیکھتے ہوئے اجازت دے دی اور وہ ویزا وغیرہ کے حصول کی غرض سے بمبئی میں مصری سفارت خانے پہنچے۔ مگر سفارت خانے سے مصر جانے کی اجازت نہ ملی۔ اس لیے کہ جامعہ ازہر کے

طلبا اس زمانے میں مصر کے شاہ فاروق کے خلاف اس بنا پر مظاہرے کر رہے تھے کہ اس نے برطانوی فوج کی ایک خاص تعداد کو مصر میں رہنے کی اجازت دے رکھی تھی، جب کہ وہاں کے عوام اس کی مخالفت کر رہے تھے اور جامعہ ازہر اور دیگر تعلیمی اداروں کے طلبا اس سلسلے میں مصری عوام کے حامی تھے اور مظاہرین میں شامل تھے۔

مصر نہ جانے کا انھیں بہت افسوس ہوا، لیکن افسوس سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس وقت ان کے پاس اچھی خاصی رقم تھی جو مصر کے سفر کے لیے والدین نے دی تھی۔ بمبئی میں ان کو مدرسۃ العالیہ کے ایک طالب علم محمد موسیٰ مل گئے۔ دونوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں اور شہروں کا مطالعاتی سفر شروع کر دیا۔ چناں چہ حیدر آباد (دکن) بنگال، یوپی، بہار اور سی پی وغیرہ صوبوں کے بہت سے شہروں کی سیر کی اور چلتے پھرتے دہلی آ گئے۔ مولانا ابوالبرکات احمد کی مادری زبان اردو نہ تھی، اس لیے اردو میں زیادہ گفتگو کرنا اور اسے اچھی طرح سمجھنا ان کے لیے مشکل تھا۔ لیکن اردو سیکھنے اور اس میں روانی سے بات کرنے کا انھیں بے حد شوق تھا۔

دہلی آ کر انھوں نے مولانا حافظ عبدالستار دہلوی کے (مدرسہ) دارالکتاب والسنہ میں داخلہ لے لیا۔ وہاں حضرت حافظ صاحب ممدوح اس وقت طلبا کو صحیح بخاری اور صحیح مسلم پڑھا رہے تھے۔ مولانا ابوالبرکات احمد بھی اجازت لے کر ان کتابوں کے درس میں شامل ہوگئے۔ اس مدرسے میں چوں کہ ہر وقت اردو بولی جاتی تھی اور اساتذہ وطلبا اسی زبان میں گفتگو کرتے تھے، اس لیے ان کو وہاں اردو زبان سمجھنے میں بہت مدد ملی۔ علاوہ ازیں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبلی اور دیگر مصنفین کی اردو کتابوں کا خوب مطالعہ کیا۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ اور ندوۃ المصنفین دہلی کی مطبوعات بھی وہاں پڑھیں اور اردو زبان میں اچھی خاصی مہارت حاصل ہوگئی۔

مولانا ابوالبرکات احمد دہلی کے اسی مدرسے میں تھے کہ ملک تقسیم ہوگیا اور پھر کسی نہ کسی طرح وہ دہلی سے لاہور پہنچ گئے۔ لاہور آ کر ان کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اور آگے چل کر وہ بارگاہِ الٰہی سے بہت بڑے اعزاز کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

لاہور ان کے لیے ایک اجنبی شہر تھا اور وہ اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ قدرتی طور پر انھیں یہاں آ کر اپنے ہم مسلک وہم مشرب لوگوں کی ضرورت پڑی اور انھوں نے ان کی تلاش شروع کی۔ پتا چلا کہ یہاں چینی والی مسجد اہل حدیث کا ایک بڑا مرکز ہے، جس میں مدرسہ بھی جاری ہے۔ وہ وہاں پہنچے تو دو چار طالب علم بیٹھے تھے۔ وہ افراتفری کا زمانہ تھا اور کوئی کسی کا پرسانِ حال نہ تھا۔ بڑے بڑے عالم، بڑے بڑے قومی رہنما اور بڑے بڑے امیر لوگ تنہائی کا شکار تھے اور کوئی کسی کو پوچھنے والا اور کوئی کسی کا غم گسار نہ تھا۔ پاکستان آنے والوں کی بہت بڑی اکثریت مظلوم اور

قابل رحم حالت میں تھی۔ مولانا ابوالبرکات احمد مسجد چینی والی میں آئے اور جو طالب علم وہاں بیٹھے تھے، انھیں سلام کیا۔ وہ طالب علم بھی معلوم نہیں کس ذہنی کیفیت سے دو چار تھے جو ان کی صحیح طور سے پذیرائی نہ کرسکے۔ مولانا کو اپنے متعلق ان کے رویے سے دل شکنی ہوئی اور وہ جلد ہی مسجد سے باہر نکلے اور انارکلی کے ایک ہوٹل میں جا مقیم ہوئے۔ ان کے پاس ابھی تک وہ رقم موجود تھی جو وہ ہندوستان سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ یہ رقم قریب الاختتام ہے تو داخلے کے لیے کسی مدرسے کی تلاش شروع ہوئی۔ ایک شخص نے اچھرے کے ایک مدرسے کے متعلق بتایا تو اس میں داخل ہوگئے۔ وہاں سے والدین کو خط لکھا اور کچھ رقم منگوائی جو مدرسے کے پتے پر انھیں پہنچ گئی۔

یہ احناف کا مدرسہ تھا لیکن مولانا ابوالبرکات نماز میں رفع الیدین بھی کرتے تھے اور قدرے جہری آواز سے آمین بھی پکارتے تھے۔ بعض طلبا کے پوچھنے پر بتایا کہ وہ ہندوستان میں شافعیوں کے مدرسے میں پڑھتے رہے ہیں اور شافعی مسلک کے لوگ نماز میں رفع الیدین بھی کرتے ہیں اور آمین بھی پکارتے ہیں۔ نیز حدیث کی کتابوں میں مرقوم ہے کہ نبی ﷺ بھی یہ عمل کرتے تھے، اس لیے میں بھی کرتا ہوں۔

ایک طالب علم نے کہا آپ وہابی معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے استاذ نے اگر آپ کو رفع الیدین کرتے دیکھ لیا تو مدرسے سے نکال دیں گے۔

اسی اثنا میں انھیں اوڈاں والا کے مدرسے کا پتا چلا اور صوفی عبداللہ مرحوم اور مولانا عبدالقادر ندوی کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہوئیں تو عربی میں مولانا عبدالقادر ندوی کو خط لکھا۔ انھوں نے فوراً جواب دیا اور وہ اوڈاں والا پہنچ گئے۔ وہاں جا کر ان کی نظریں مولانا عبدالقادر ندوی کو ڈھونڈنے لگیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ لکھنؤ کی تہذیب کے چلتے پھرتے پیکر شیروانی اور پاجامے میں ملبوس ہوں گے اور سر پر ٹوپی ہوگی۔ لیکن وہاں ان کے اس تصوراتی لباس میں کوئی شخص بھی ملبوس نہ تھا۔ عبدالقادر تہبند باندھے اور معمولی قمیص پہنے ہوئے تھے۔ یعنی وہ سرتاپا عبدالقادر تھے، ندویت کا کوئی شائبہ ان میں پایا نہیں جاتا تھا۔

مولانا عبدالقادر ندوی، صوفی عبداللہ اور مدرسے کے اساتذہ وطلبا مولانا ابوالبرکات احمد سے بے حد محبت سے پیش آئے اور مولانا ابوالبرکات ان حضرات سے بہت متاثر ہوئے۔ ندوی صاحب کے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ حدیث کی انتہائی کتابیں صحیح بخاری اور صحیح مسلم ایک مرتبہ تو وہ باقاعدہ پڑھ چکے ہیں اور دو مرتبہ ان کا سماع کیا ہے۔ حدیث کی سند بھی لے چکے ہیں۔

اصل بات یہ تھی کہ وہ دینی مدارس کے مروّجہ نصاب کی تمام کتابیں مکمل کر چکے تھے یعنی مدارس

کی اصطلاح میں فارغ التحصیل تھے۔ ان کا اصل مسئلہ کسی بہتر علمی مقام پر قیام وسکونت کا تھا اور یہ مسئلہ مدرسے میں داخلے ہی سے حل ہوسکتا تھا، چناں چہ انھیں داخلہ مل گیا اور بعض کتابیں پڑھنے لگے۔ حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، مولانا محمد اسحاق چیمہ اور مولانا محمد یعقوب ملہوی اس وقت وہاں فریضہ تدریس انجام دیتے تھے۔ ان حضرات سے انھوں نے کچھ استفادہ کیا اور سند لی۔

صوفی عبداللہ صاحب ان پر خاص طور سے شفقت فرماتے تھے اور چاہتے تھے کہ یہ عربی مدارس کے علوم وفنون میں مہارت پیدا کرلیں۔ چناں چہ انھوں نے ان کو گوجراں والا میں حضرت حافظ محمد صاحب گوندلوی کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ دیا۔ حضرت حافظ صاحب اس وقت جامعہ اسلامیہ (گوجراں والا) کی مسند تدریس پر متمکن تھے۔ مولانا ابوالبرکات نے بذریعہ خط حضرت حافظ صاحب سے رابطہ قائم کیا تو حضرت حافظ صاحب نے جواب میں ان کو صورتِ حال سے مطلع فرمایا اور وہ چند روز بعد حافظ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ حافظ صاحب سے انھوں نے صحیح بخاری کا درس لیا اور بعض فنون کی چند انتہائی کتابیں پڑھیں۔ متواتر دو سال وہ حضرت حافظ صاحب سے مستفید ہوتے رہے۔

اس وقت ان کا بذریعہ خط وکتابت والدین سے باقاعدہ رابطہ قائم تھا اور والدین چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا واپس اپنے آبائی وطن آجائے۔ خود مولانا بھی مروّجہ علوم کی تحصیل کے بعد والدین کے پاس جانا چاہتے تھے۔ مدراس اسمبلی کے مسلمان ارکان نے بھی ان کی واطن واپسی کے لیے کوشش کی، لیکن واپسی کی کوئی صورت پیدا نہ ہوسکی۔ اس اثنا میں ان کے والدین بھی وفات پاگئے تو انھوں نے پاکستان ہی کو مستقل طور سے اپنا وطن قرار دے لیا۔

حضرت حافظ صاحب سے علوم کی تکمیل کے بعد مولانا ابوالبرکات شعبان اور رمضان کی تعطیلات کے زمانے میں لاہور آگئے۔ اس وقت پاکستان میں جناح ٹوپیوں کا رواج تھا اور لوگ بڑے شوق سے یہ ٹوپیاں خریدتے اور پہنتے تھے، چناں چہ مولانا ابوالبرکات لاہور آئے اور یہاں ایک دکان کے تھڑے پر بیٹھ کر ٹوپیاں بیچنا شروع کردیں۔ اس کاروبار سے انھیں مالی فائدہ تو ضرور ہوتا تھا، لیکن ایک عالم دین ہونے کی حیثیت سے وہ اس پر مطمئن نہ تھے، چناں چہ انھوں نے اوڈاں والا میں صوفی عبداللہ صاحب کو خط لکھا اور تمام صورتِ حال سے مطلع کیا تو صوفی صاحب نے ان کو جواب دیا کہ فوراً اوڈاں والا آیئے اور اس مدرسے میں خدمت تدریس انجام دیجیے۔ لیکن اِدھر حضرت حافظ محمد گوندلوی کو پورے واقعہ کا علم ہوا تو انھوں نے ارشاد فرمایا کہ جامعہ اسلامیہ میں طلبا کو پڑھاؤ۔ مولانا نے فرمایا: میں نے صوفی صاحب کی دعوت پر ان سے وعدہ کرلیا ہے، اب مجھے وعدے کے مطابق وہیں جانا چاہیے۔ لیکن حضرت حافظ صاحب نے صوفی صاحب سے اجازت لے

لی اور انھوں نے حضرت حافظ صاحب کے حکم سے جامعہ اسلامیہ میں باقاعدہ طور سے ۱۹۵۱ء میں سلسلۂ تدریس شروع کردیا۔ اس وقت جن درسی کتابوں کی تدریس ان کے ذمے ہوئی، وہ تھیں تفسیر بیضاوی، تفسیر جامع البیان، تفسیر الاتقان، حجۃ اللہ البالغہ، توضیح تلویح، سلّم العلوم، نور الانوار، تاریخ الادب العربی، متنبی، حماسہ اور کامل للمبرد۔ کم و بیش پانچ سال وہ طلبا کو یہ کتابیں پڑھاتے رہے اور بے حد محنت اور دلچسپی سے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ ان کے پڑھانے کا انداز ایسا تھا کہ ہر بات آسانی سے ہر طالب علم کے ذہن میں اتر جاتی تھی۔ دن کو بھی تدریس اور مغرب کے بعد اگر ضروری سمجھا تو پھر بھی یہ سلسلہ جاری رکھا۔ جامعہ اسلامیہ کو انھوں نے عملاً اپنا ذاتی دارالعلوم قرار دے لیا تھا اور یہی ان کی شب و روز کی سرگرمیوں کا محور قرار پا گیا تھا۔

پانچ سال کے بعد ایک آٹھ سالہ نصابِ تعلیم مرتب کیا گیا تاکہ پہلی جماعت سے آٹھویں جماعت تک ایک خاص انداز سے طلبا کو تعلیم دی جائے۔ مولانا ابوالبرکات نے تقریباً چالیس سال جامعہ اسلامیہ میں خدمت تدریس سرانجام دی اور طلبا نے ان سے خوب استفادہ کیا۔ تدریس کے علاوہ ان کا کوئی مشغلہ نہ تھا اور کسی معاملے میں انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

مولانا ممدوح چوں کہ منجھے ہوئے مدرس تھے اور نہایت محنت اور توجہ سے پڑھاتے تھے، اس لیے متعدد مدارس کے اربابِ اہتمام نے زیادہ تنخواہ پر ان کی تدریسی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر انھوں نے جامعہ اسلامیہ سے علیحدگی اختیار نہیں کی۔ اس کے لیے اپنی زندگی وقف کیے رکھی۔ وہ نہایت قناعت پسند تھے اور گفتار میں، کردار میں سلف صالحین کا صحیح نمونہ۔ اب وہ مستقل طور سے گوجراں والا کے باشندے تھے اور یہیں کے ایک بزرگ مولانا نور الدین نے ان کے اخلاص واخلاق اور پاکیزگیٔ اطوار سے متاثر ہو کر ۱۹۵۳ء میں اپنی دختر نیک اختر ان کے عقد میں دے دی۔ اس وقت ان کی عمر ستائیس برس کی تھی۔ یہ ان کی بھری جوانی کا زمانہ تھا جسے صالحیت کے خوب صورت مرقع سے تعبیر کرنا چاہیے۔

مولانا ابوالبرکات احمد جہاں دارالعلوم کی چار دیواری میں طلبا کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتے اور انھیں نصائح سے نوازتے تھے، وہاں تعطیلات کے زمانے میں اپنے گھروں میں جانے والے طلبا کو نصیحتیں بھی فرماتے تھے کہ وہ اپنے گھر، اپنے محلے اور گاؤں کے لوگوں میں وقار سے رہیں، ان کو اپنے علم اور نیکی سے متاثر کرنے کی کوشش کریں، باجماعت نماز پڑھیں، ننگے سر گلیوں میں نہ گھومیں، کسی سے لڑائی جھگڑا نہ کریں، ہر شخص سے خوش اسلوبی سے پیش آئیں، چھوٹے بڑے سے ہم کلام ہوتے وقت اخلاق کی دولت اور شیرینیٔ زبان کی پونجی آپ کے پاس ہونی چاہیے۔

وہ تہجد گزار اور عابد و زاہد عالم دین تھے۔ انتہائی غیرت مند اور باحمیت تھے۔ کسی کے احسان

مند نہیں ہوتے تھے۔ کسی کے سامنے اپنی کسی گھریلو اور ذاتی ضرورت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ کسی سرمایہ دار کے دروازے پر نہیں جاتے تھے۔ کسی مسئلے سے متعلق کوئی شخص فتویٰ لیتا تو اس سے نہ کوئی تحفہ قبول کرتے تھے، نہ کوئی پیسا لیتے تھے۔ کسی جلسے یا کسی میٹنگ میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ کسی سیاسی مجلس میں شرکت نہ کرتے تھے۔ سیاست کو دھوکا، فریب، جھوٹ اور مکاری قرار دیتے تھے اور وقت کا ضیاع سمجھتے تھے۔ سیاست کے بارے میں ان کا یہ نقطہ نظر بالکل صحیح تھا۔ اردو لغت کی کتابوں میں لفظ ''سیاست'' کے جو معنے لکھے گئے ہیں، ان میں یہ معنے بھی شامل ہیں: تنبیہ، رعب وداب، دھمکی، مکاری، فریب۔

بعض نادار اور مستحقین کی وہ مالی امداد کرتے تھے، لیکن بے حد خفیہ طریقے سے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی کو اس کا پتا چلے اور لینے والے کی عزت نفس مجروح ہو۔ وہ رسائل وجرائد میں مضامین لکھنے کے بھی عادی نہ تھے۔ ان کا اصل مشغلہ صرف تدریس اور طلبا کی تربیت تھا۔ وہ علما کا بہت احترام کرتے تھے اور علما ان سے بے حد احترام کا برتاؤ کرتے تھے۔

ان کی خودداریٔ نفس، بے نیازی اور صالحیت کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

① ...... ان کا کھانا کسی کے گھر سے آتا تھا لیکن جب ان کا تقرر مدرس کی حیثیت سے جامعہ اسلامیہ (گوجراں والا) میں کردیا گیا اور کچھ تنخواہ بھی مقرر ہوگئی تو جس گھر سے کھانا آتا تھا، انھیں کہلا بھیجا کہ اب میری آمدنی کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے اور میں نے کھانے کا خود انتظام کرلیا ہے، آئندہ مجھے کھانا نہ بھیجا جائے۔ کھانا بھجوانے والوں نے ہر چند کہا کہ آپ کو کھانا تیار کرنے میں تکلیف ہوگی، ہم بھجوا دیا کریں گے لیکن وہ نہیں مانے۔

② ...... ایک مرتبہ جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) کی انتظامیہ کمیٹی نے جامعہ کے لیے ان کی تدریسی خدمات حاصل کرنا چاہیں اور فیصلہ کیا کہ انھیں چار سو پچاس روپے ماہانہ تنخواہ دی جائے گی، جب کہ جامعہ اسلامیہ (گوجراں والا) کی طرف سے انھیں دو سو پچاس روپے ملتے تھے۔ جامعہ سلفیہ کے ایک معزز رکن نے اس سلسلے میں ان سے بات کی تو فرمایا مجھے چار سو پچاس روپے کی ضرورت نہیں، مجھے یہی تنخواہ کافی ہے جو جامعہ اسلامیہ کی طرف سے مل رہی ہے۔ میں یہیں رہوں گا، اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔

③ ...... ایک شخص نے مولانا سے کہا کہ میری بہن بیمار ہے، بہت علاج کرائے لیکن بیماری رفع نہیں ہوتی۔ آپ کوئی تعویذ عنایت فرما دیجیے۔ فرمایا تعویذ تو میں نے کبھی نہیں کیا، البتہ اللہ سے دعا کروں گا کہ بیماری ختم ہوجائے۔ کچھ روز کے بعد وہ خاتون صحت یاب ہوگئیں اور امریکہ چلی گئیں۔ امریکہ سے انھوں نے اپنے بھائی کے ہاتھ مولانا کے لیے ایک بہت بڑھیا قلم بھیجا۔ انھیں

مند نہیں ہوتے تھے۔ کسی کے سامنے اپنی کسی گھریلو اور ذاتی ضرورت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ کسی سرمایہ دار کے دروازے پر نہیں جاتے تھے۔ کسی مسئلے سے متعلق کوئی شخص فتویٰ لیتا تو اس سے نہ کوئی تحفہ قبول کرتے تھے، نہ کوئی پیسا لیتے تھے۔ کسی جلسے یا کسی میٹنگ میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ کسی سیاسی مجلس میں شرکت نہ کرتے تھے۔ سیاست کو دھوکا، فریب، جھوٹ اور مکاری قرار دیتے تھے اور وقت کا ضیاع سمجھتے تھے۔ سیاست کے بارے میں ان کا یہ نقطہ نظر بالکل صحیح تھا۔ اردو لغت کی کتابوں میں لفظ ''سیاست'' کے جو معنے لکھے گئے ہیں، ان میں یہ معنے بھی شامل ہیں: تنبیہ، رعب وداب، دھمکی، مکاری، فریب۔

بعض نادار اور مستحقین کی وہ مالی امداد کرتے تھے، لیکن بے حد خفیہ طریقے سے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی کو اس کا پتا چلے اور لینے والے کی عزت نفس مجروح ہو۔ وہ رسائل وجرائد میں مضامین لکھنے کے بھی عادی نہ تھے۔ ان کا اصل مشغلہ صرف تدریس اور طلبا کی تربیت تھا۔ وہ علما کا بہت احترام کرتے تھے اور علما ان سے بے حد احترام کا برتاؤ کرتے تھے۔

ان کی خود داریٔ نفس، بے نیازی اور صالحیت کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

① ...... ان کا کھانا کسی کے گھر سے آتا تھا لیکن جب ان کا تقرر مدرس کی حیثیت سے جامعہ اسلامیہ (گوجراں والا) میں کردیا گیا اور کچھ تنخواہ بھی مقرر ہوگئی تو جس گھر سے کھانا آتا تھا، انھیں کہلا بھیجا کہ اب میری آمدنی کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے اور میں نے کھانے کا خود انتظام کرلیا ہے، آئندہ مجھے کھانا نہ بھیجا جائے۔ کھانا بھجوانے والوں نے ہر چند کہا کہ آپ کو کھانا تیار کرنے میں تکلیف ہوگی، ہم بھجوا دیا کریں گے لیکن وہ نہیں مانے۔

② ...... ایک مرتبہ جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) کی انتظامیہ کمیٹی نے جامعہ کے لیے ان کی تدریسی خدمات حاصل کرنا چاہیں اور فیصلہ کیا کہ انھیں چار سو پچاس روپے ماہانہ تنخواہ دی جائے گی، جب کہ جامعہ اسلامیہ (گوجراں والا) کی طرف سے انھیں دو سو پچاس روپے ملتے تھے۔ جامعہ سلفیہ کے ایک معزز رکن نے اس سلسلے میں ان سے بات کی تو فرمایا مجھے چار سو پچاس روپے کی ضرورت نہیں، مجھے یہی تنخواہ کافی ہے جو جامعہ اسلامیہ کی طرف سے مل رہی ہے۔ میں یہیں رہوں گا، اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔

③ ...... ایک شخص نے مولانا سے کہا کہ میری بہن بیمار ہے، بہت علاج کرائے لیکن بیماری رفع نہیں ہوتی۔ آپ کوئی تعویذ عنایت فرما دیجیے۔ فرمایا تعویذ تو میں نے کبھی نہیں کیا، البتہ اللہ سے دعا کروں گا کہ بیماری ختم ہوجائے۔ کچھ روز کے بعد وہ خاتون صحت یاب ہوگئیں اور امریکہ چلی گئیں۔ امریکہ سے انھوں نے اپنے بھائی کے ہاتھ مولانا کے لیے ایک بہت بڑھیا قلم بھیجا۔ انھیں

یہ قلم پیش کیا گیا تو فرمایا مجھے قلم کی ضرورت نہیں، میرے پاس قلم ہے۔ بھائی نے بہت اصرار کیا۔ لیکن مولانا نے قلم نہیں لیا۔

وہ مغرور نہیں تھے، خود پسند بھی نہیں تھے، کسی کا دل بھی توڑنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن کسی کا احسان مند ہونا اور بلا ضرورت کسی سے کوئی چیز لینا انھیں منظور نہ تھا۔ وہ قانع اور صابر وشاکر بزرگ تھے۔

④...... میں نے اپنی ایک تصنیف (برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن) میں ان کے ایک فاضل شاگرد قاری محمد ادریس عاصم پر تفصیلی مضمون لکھا ہے۔ قاری صاحب نے بتایا کہ وہ جامعہ اسلامیہ (گوجراں والا) میں مولانا ابوالبرکات احمد کے حلقہ درس میں شامل تھے کہ بیمار ہوگئے اور بیماری نے اتنی شدت اختیار کرلی کہ ڈاکٹر نے میری زندگی سے مایوسی کا اظہار کیا اور تعلیم کا سلسلہ ترک کرنے کا مشورہ دیا۔ مولانا ممدوح کو بتایا گیا تو فرمایا کوئی علاج نہ کرو۔ اول آخر درود شریف پڑھ کر روزانہ اکتالیس مرتبہ سورہ فاتحہ پڑھا کرو۔ چناں چہ یہ عمل کیا گیا تو چند روز میں اللہ تعالیٰ نے صحت عطا فرمادی۔

مولانا ابوالبرکات احمد کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع ہے، جن میں حسب ذیل حضرات شامل ہیں۔ پہلے مرحومین بہ ترتیب تاریخ وفات۔

①...... علامہ احسان الٰہی ظہیر: جماعت اہل حدیث کے مشہور خطیب۔ متعدد کتابوں کے مصنف۔ شہادت ۲۳ مارچ ۱۹۸۷ء۔

②...... مولانا محمود احمد میر پوری: معروف عالم ومصنف (سابق) ایڈیٹر ماہنامہ "صراطِ مستقیم" برمنگھم (انگلستان) وفات ۱۰۔ اکتوبر ۱۹۸۸ء۔

③...... مولانا محمد بشیر نعمانی: بانی مکتبہ نعمانیہ، گوجراں والا، لاہور۔ وفات ۱۸۔ جولائی ۱۹۹۵ء۔

④...... قاری نعیم الحق (گوجراں والا): (سابق) ایڈیٹر "الاعتصام" اور مدرس ومعلم۔ وفات ۳۰۔ جنوری ۱۹۹۹ء۔

اب چند موجودین تلامذہ کرام کے اسمائے گرامی ملاحظہ فرمائیے۔ بہ ترتیب نمبر شمار۔

⑤...... مولانا محمد علی جانباز: شیخ الحدیث جامعہ ابراہیمیہ سیالکوٹ، شارح ابن ماجہ اور متعدد کتابوں کے مصنف۔

⑥...... حافظ عبدالسلام بھٹوی: شیخ الحدیث جامعۃ الدعوۃ الاسلامیہ (مرید کے) مترجم قرآنِ مجید ومترجم بلوغ المرام۔

⑦...... مولانا محمد اعظم: شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ، گوجراں والا۔

⑧...... قاری محمد ادریس عاصم: قرأت وتجوید کی بہت سی کتابوں کے مصنف ومترجم، قرأت سبعہ کے ماہر، مدرسہ تجوید القرآن (مسجد لسوڑے والی لاہور) کے ناظم۔ بے شمار قراء کرام کے استاذ۔

⑨...... حافظ احمد شاکر: حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف کے فرزند گرامی، اخبار الاعتصام کے مدیر۔

⑩...... مولانا حافظ عبدالوہاب روپڑی: خانوادۂ روپڑ کے ممتاز رکن۔ جامعہ اہل حدیث قدس (لاہور) کے ناظم اور صاحب تصنیف۔

⑪...... حافظ اسد محمود: حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کے پوتے، جامع مسجد مکرم (گوجراں والا) کے خطیب۔

⑫...... حافظ محمد اسلم شاہدروی: خطیب جامع مسجد اہل حدیث (شاہدرہ، لاہور) کئی عربی کتابوں کے مترجم اور مضمون نگار۔

⑬...... مولانا عبدالصمد ریالوی: ہفت روزہ ''الاعتصام'' (لاہور) کے مدیر۔

⑭...... حافظ عبدالشکور مدنی: معلم جامعہ اہل حدیث قدس (لاہور)

⑮...... مولانا محمد بشیر سیالکوٹی: عربی، اردو، انگریزی کے مشہور سکالر۔ کئی کتابوں کے مصنف۔ اسلام آباد میں مقیم ہیں۔

⑯...... حافظ محمد الیاس اثری: مدرس جامعہ اسلامیہ (گوجراں والا)

⑰...... مولانا محمد شمشاد سلفی: خطیب جامع مسجد اہل حدیث نارنگ منڈی۔

⑱...... مولانا حفیظ الرحمٰن لکھوی: بانی وناظم جامعہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ۔ لاہور

⑲...... مولانا ثناء اللہ سیالکوٹی: خطیب جامع مسجد سپکٹن (انگلستان)

⑳...... مولانا ارشاد الحق اثری: بہت سی عربی اور اردو کتابوں کے مصنف۔ ادارہ علوم اثریہ فیصل آباد۔

مولانا ابوالبرکات احمد صاحب سے متعلق اس فقیر کی نظر میں متعدد حضرات کے مضامین گزرے ہیں لیکن ان کے تلامذہ کا ذکر کسی صاحب نے نہیں کیا۔ بس جس نے لکھا یہی لکھا کہ ان کے شاگرد سیکڑوں کی تعداد میں ہیں، لیکن کسی نے نام دس شاگردوں کے بھی نہیں لکھے۔ استاذ کی علمی اور تدریسی قابلیت کا اندازہ شاگردوں کی قابلیت، تعداد اور ان کی علمی سرگرمیوں سے ہوتا ہے۔ مولانا ممدوح کے شاگردوں کی تفصیل بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ میں نے ان کے صرف بیس شاگردوں کے اسمائے گرامی لکھے ہیں۔ یہ حضرات میرے نزدیک علم وعمل کے اعتبار سے خاص شہرت کے مالک ہیں۔ امید ہے مولانا کے دیگر شاگردانِ عالی قدر بھی مختلف مقامات میں مصروف عمل ہوں گے۔ کوئی صاحب تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہوں گے اور کوئی خطابتی اور تصنیفی امور میں سرگرم ہوں گے۔

ہماری جماعت کے اہل علم کے متعلق بعض اصحابِ قلم کا اندازِ تحریر یہ ہوتا ہے کہ وہ جید عالم تھے، بہت بڑے فاضل تھے، بہت بڑے خطیب تھے، بہت بڑے مدرس تھے۔ ان سے بے شمار لوگوں نے فیض حاصل کیا اور انھوں نے سیکڑوں شاگرد اپنے پیچھے چھوڑے۔ بتائیے ان تعریفی الفاظ سے کیا حاصل ہوا؟ نہ کسی شاگرد کا نام لیا، نہ اس کی تدریسی مساعی کی تفصیل بیان کی، نہ ان کی تصانیف کا ذکر کیا، نہ ان کے علمی مرتبے کی کوئی مثال دی۔ یہ کام ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں اور ان سے استفادہ کرنے والوں کا ہے۔ انھیں چاہیے کہ اپنے اساتذہ کی زندگی کے تمام ضروری پہلوؤں کی وضاحت کریں تاکہ آئندہ ان پر کوئی لکھنا چاہے تو اسے آسانی سے مواد دست یاب ہوجائے اور علمی تاریخ کا سفر بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہے۔

مولانا ابوالبرکات احمد کے صاحب زادے عبدالحمید آثم صاحب کا ایک مضمون ''والدی'' کے عنوان سے ''والضحیٰ'' کے شیخ الحدیث مولانا ابوالبرکات احمد نمبر (ستمبر ۱۹۹۱ء) میں شائع ہوا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ان کے علاوہ مولانا کے ایک اور صاحب زادے عبدالمجید ہیں، لیکن یہ بات واضح نہیں ہوئی کہ مولانا کے یہ دونوں صاحب زادے کیا کرتے ہیں اور ان کی علمی و عملی تگ ودو کے دائرے کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔

بہرحال مولانا ابوالبرکات احمد نے پورے چالیس برس تدریسی خدمات سرانجام دیں اور جامعہ اسلامیہ (گوجراں والا) سے باہر قدم نہیں رکھا۔ وہ اونچے مرتبے کے استاذ تھے۔ اپنے شاگردوں سے اپنا کوئی ذاتی کام نہیں کراتے تھے۔ انھیں پڑھنے لکھنے میں مصروف رکھتے تھے۔

مولانا ممدوح کو شوگر کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا۔ اس مرض نے ان کے دل کو بھی متاثر کیا۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے سلسلہ تدریس باقاعدہ جاری رکھا۔ اس عالی مرتبت عالم ومدرس نے ۱۶۔ محرم ۱۴۱۲ھ (۲۹۔ جولائی ۱۹۹۱ء) کو وفات پائی اور بے شمار لوگ ان کے جنازے میں شامل ہوئے اور نہایت اعزاز کے ساتھ انھیں دنیاے فانی سے عالم جاودانی کی طرف رخصت کیا گیا۔

اللھم اکرم نزلہ ووسع مدخلہ وادخلہ جنت الفردوس

مولانا ابوالبرکات احمد کی اولاد ماشاء اللہ پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔

① ...... بڑے بیٹے کا نام عبدالحمید ہے۔ دینیات کے عالم ہیں اور کمپوزنگ کا کام کرتے ہیں۔

② ...... دوسرے بیٹے عبدالمجید ہیں۔ یہ بھی عالم دین ہیں اور تاجر کتب ہیں۔

③ ...... تیسرے بیٹے عبدالعزیز ہیں۔ یہ جدہ (سعودی عرب) میں ملازمت کرتے ہیں۔

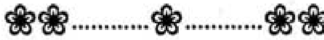
④ ...... چوتھے عبدالسمیع عاصم ہیں۔ یہ گوجراں والا میں درس وتدریس اور خطابت وطبابت میں مشغول ہیں۔

⑤...... پانچویں بیٹے کا نام عبدالبصیر ہے۔ یہ کاروبار کرتے ہیں۔

چار بیٹیوں میں دو کی شادی لاہور میں ہوئی اور دو کی گوجراں والا میں۔ چاروں اللہ کے فضل سے اپنے اپنے گھروں میں خوش وخرم ہیں۔

یہ سطور ۱۰۔فروری ۲۰۰۷ء کو لکھی گئی ہیں۔ اس تاریخ تک بفضل خدا مولانا ابوالبرکات احمد کی کل اولاد واحفاد کا سلسلہ اس طرح ہے۔ پانچ بیٹے، چار بیٹیاں، بارہ پوتے، گیارہ پوتیاں۔ پندرہ نواسے اور تیرہ نواسیاں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ ان سب چھوٹے بڑوں کو خیر وعافیت سے رکھے اور علم وعمل اور کردار وسیرت میں مولانا ممدوح کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔



حافظ عبدالغفور جہلمی

حافظ عبدالغفور سے ملاقات کے اوّلیں نقوش افسوس ہے لوحِ ذہن پر محفوظ نہیں رہے۔ پہلے پہل ان سے کب ہاتھ جڑا اور کس وقت اور کہاں ان سے ہم کلام وہم سلام ہونے کا آغاز ہوا، اس کی کوئی تصویر بار بار سوچنے اور دور تک نظر دوڑانے کے باوجود آنکھوں کے سامنے نہیں آرہی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اگر اسے ذہن محفوظ نہیں رکھ سکا تو کیا مضائقہ ہے۔ بعض دفعہ انسان کو خود اپنا بھی پتا نہیں ہوتا کہ وہ کہاں ہے اور کن مشاغل میں گھرا ہوا ہے۔

حلیہ

بہرحال طویل عرصہ پیشتر جس حافظ عبدالغفور سے مجھے پہلی مرتبہ ہم کلامی کا موقع ملا ان کا اس وقت کا حلیہ کچھ اس قسم کا تھا۔ میانہ قد، صحت مند گداز جسم، سرخی مائل گندمی رنگ، کھلی پیشانی، جاذب نظر چہرہ، کشادہ سینہ، موٹی آنکھیں، چوڑے چہرے پر پھیلی ہوئی سیاہ شرعی داڑھی، لبوں پر مسکراہٹ کا غلبہ، بے تکلفانہ طرزِ گفتگو میں اپنایت کا مخلصانہ جذبہ، قمیص اور تہبند پہنے ہوئے۔ یہ ان کا بھری جوانی کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد میل ملاپ اور باہمی بات چیت کا جو سلسلہ چلا اسے گنتی شمار میں لانا ممکن نہیں۔

پھر آہستہ آہستہ زمانے کے رنگ بدلتے گئے اور وقت کی گاڑی اپنی فطری رفتار سے چلتی رہی تاآں کہ ان کی نوجوانی، جوانی میں بدلی، جوانی نے کہولت کا رخ کیا اور کہولت بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہوئی اور جسمانی صحت پر کم زوری نے قبضہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی بالوں کی سیاہی نے سفیدی کا لبادہ اوڑھا اور داڑھی کی طوالت سینے تک پہنچی۔ سماعت نے ثقل سماعت کا آلہ آویزۂ گوش بنایا۔ جسم میں کسی حد تک موٹاپے کے آثار ابھرے اور تہبند کی جگہ شلوار نے لی۔ قد کاٹھ تو وہی رہنا تھا اور وہی رہا۔ طبعی خوش خلقی نے بھی ہمیشہ ان کا ساتھ دیا اور آرام وتکلیف کے ہر موڑ پر ان کی رفاقت اختیار کیے رکھی اور ہر موقعے پر اپنے وجود کا ثبوت دیتی رہی۔

ولادت

اس ”خطبہ افتتاحیہ“ کے بعد اب آیئے حافظ عبدالغفور کے متعلق مختلف مقامات میں پھیلے ہوئے شروع سے آخر تک علمی وعملی واقعات خاص ترتیب کے ساتھ اپنے دائرۂ معلومات میں لانے کی

کوشش کرتے ہیں۔

حافظ صاحب کے آبا واجداد دراصل بستی اٹھوال جاگیر کے رہنے والے تھے۔ موجودہ جغرافیائی حساب سے یہ بستی ضلع اوکاڑہ کے ایک مشہور قصبے ''فتح پور'' کے قریب فیصل آباد اوکاڑہ روڈ پر واقع ہے۔ حافظ صاحب اسی بستی میں ۱۰۔ اپریل ۱۹۲۴ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا اسم گرامی محمد اسماعیل تھا جو اپنی نیک نامی کی وجہ سے گاؤں میں اچھی شہرت کے مالک تھے۔

تعلیم اور اساتذہ

چھ سال کی عمر میں حافظ عبدالغفور نے گھر میں قرآنِ مجید پڑھا اور پھر انھیں پرائمری سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ پرائمری اس زمانے میں چار جماعتیں پاس کرنے کا نام تھا۔ ۱۹۳۵ء میں انھوں نے چوتھی جماعت کا وظیفے کا امتحان دیا۔ امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئے اور محکمہ تعلیم کی طرف سے وظیفے کے مستحق قرار پائے۔ لیکن پرائمری پاس کرنے کے بعد حافظ عبدالغفور نے سرکاری سکول کی تعلیم ترک کردی اور دینی تعلیم کے حصول کو اپنا شعار بنالیا۔ ان کے والد بھی یہی چاہتے تھے۔ دینی تعلیم کا آغاز ۱۹۳۸ء کے قریب ضلع لائل پور کے ایک گاؤں ٹھٹھہ مینے کے چک نمبر ۱۵ میں میاں محمد کھرل سے کیا۔ وہاں قرآنِ مجید کا ترجمہ پڑھنا شروع کیا اور چند چھوٹی چھوٹی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ وہاں سے ضلع لائل پور ہی کے ایک اور گاؤں موضع ''نعیو آنہ ساوے کا'' آئے۔ وہاں ایک چھوٹے سے مدرسے میں ایک بزرگ مولوی عبدالرحمٰن بچوں کو تعلیم دیتے تھے۔ ان سے پورے قرآنِ مجید کا ترجمہ پڑھا اور صرف ونحو کی چند کتابیں پڑھیں۔ اب اس طرزِ تعلیم سے وہ کافی حد تک مانوس ہوگئے تھے اور اس کے آئندہ کے نشاناتِ راہ ان کے سامنے کچھ واضح ہونے لگے تھے۔

اس کے بعد وہ چک نمبر ۴۲۷ گ ب جھوک دادو (تحصیل تاندلیاں والا) چلے گئے۔ وہاں میاں محمد باقر مرحوم کے قائم کردہ مدرسہ خادم القرآن والحدیث میں داخلہ لیا۔ کچھ عرصہ اس مدرسے میں میاں صاحب ممدوح کی شاگردی میں گزارا۔ پھر ضلع شیخوپورہ کے ایک گاؤں ''دھیر دا ڈوگراں'' کا عزم کیا۔ وہاں مولانا عمر الدین مرحوم سے استفادہ کیا۔ دھیر دا ڈوگراں سے مدرسہ تعلیم الاسلام (اوڈاں والا ضلع فیصل آباد) کی راہ لی۔ پھر لکھو کے (ضلع فیروز پور) میں حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے مختلف علوم کی کتابیں پڑھیں۔ لکھو کے اس زمانے کے پنجاب میں تدریس کا مشہور اور بڑا مرکز تھا، جہاں دور دراز سے شائقین علم آکر تحصیل علم کرتے تھے اور وہاں کے فارغ علما کو مدارس دینیہ میں خاص اہمیت دی جاتی تھی۔

تقسیم ملک سے پہلے میاں محمد باقر مرحوم نے اپنے مدرسے کے لیے مولانا حافظ عبداللہ

بڈھیمالوی کی خدمات حاصل کرلی تھیں اور ان کا شہرۂ تدریس مختلف دینی درس گاہوں میں پہنچ گیا تھا۔ حافظ عبدالغفور نے جھوک دادو جا کر میاں محمد باقر کے علاوہ حافظ عبداللہ بڈھیمالوی سے بھی اخذ علم کیا۔ پھر حافظ عبداللہ صاحب وہاں سے اپنے وطن بڈھیمال گئے تو عبدالغفور استاذ کے پیچھے بڈھیمال پہنچ گئے اور کچھ عرصہ وہاں ان کے حلقہ درس میں رہے۔

حصولِ علومِ دینیہ کے لیے حافظ عبدالغفور انتہائی سرگرم تھے۔ جہاں کسی لائق استاذ کے بارے میں تھوڑا بہت پتا چلا وہاں جا پہنچے۔ اس ضمن میں وہ دیہات میں بھی گئے اور قصبات وبلاد کے چکر بھی لگائے، جس سے جو کچھ ملا، لے لیا۔ گوجراں والا میں مولانا محمد چراغ مرحوم کی خدمت میں گئے اور ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیے۔

دارالعلوم تعلیم الاسلام (اوڈاں والا) میں جن حضرات سے اکتسابِ فیض کیا وہ ہیں حضرت حافظ محمد گوندلوی، مولانا حافظ محمد اسحاق حسینوی، مولانا عبدالرحمٰن لکھوی اور بعض دیگر اساتذۂ گرامی۔ سند فراغت اوڈاں والا سے لی۔ ان کے تمام عالی قدر اساتذہ سفر آخرت پر روانہ ہو چکے ہیں۔

ہم درس طلبا

اساتذہ کے بعد اب حافظ عبدالغفور کے ہم درس طلبا کی طرف آیئے۔ یہ بڑی وسیع فہرست ہے، جس میں مولانا محمد اسحاق چیمہ، مولانا محمد صادق خلیل، مولانا محمد یعقوب ملہوی، پیر محمد یعقوب قریشی، مولانا محمد صدیق لائل پوری، مولانا عبدالصمد رؤف، مولانا حبیب الرحمٰن لکھوی اور حافظ محمد زکریا (ساکن جھوک دادو چک نمبر ۴۲۷ گ ب) شامل ہیں۔

فراغت کے بعد ان کے ہم درس حضرات نے بھی مختلف مقامات میں خدماتِ تدریس سرانجام دیں اور بعض نے خطابت میں نام پایا۔ بالآخر اپنی اپنی مدتِ حیات پوری کرکے یہ بھی دربارِ الٰہی میں جا پہنچے۔ یہ فقیر حافظ عبدالغفور کے اکثر اساتذہ کا بھی نیاز مند تھا اور ان کے مندرجہ بالا ہم جماعت حضرات سے بھی دوستانہ علائق رکھتا تھا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان سب کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

حافظ صاحب ممدوح کے ایک ہم جماعت ہمارے دوست مولانا عبدالقادر ندوی تھے۔ وہ ایک مدت سے جامعہ تعلیم الاسلام (ماموں کانجن) کے منصب صدارت پر فائز ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ دعا ہے کہ وہ انھیں صحت وعافیت سے رکھے اور وہ ہمیشہ اس کے دین کی خدمت میں مصروف رہیں۔

مختلف مقامات میں درس وتدریس

تحصیل علوم کے مختلف مراحل طے کرنے کے بعد حافظ عبدالغفور نے نئی عملی زندگی کا آغاز ایک

کاروبار سے کیا۔ لیکن کاروبار کا سلسلہ ان کے ساتھ زیادہ دیر نباہ نہ کرسکا۔ ۱۹۵۰ء میں میاں محمد باقر ان کو مدرس کی حیثیت سے اپنے گاؤں (جھوک دادو چک نمبر ۴۲۷ گ ب) کے مدرسہ خادم القرآن والحدیث میں لے گئے۔ ۱۹۵۳ء تک تقریباً تین سال وہ اس مدرسے میں مصروفِ تدریس رہے۔ اب انھوں نے تدریس کی خوش نما وادی میں داخل ہو کر خود کو مدرسین کی معزز برادری میں شامل کرلیا تھا اور محنت کر کے جلد ہی اس برادری کے معروف رکن کی حیثیت اختیار کرلی تھی، جس کے نتیجے میں مدارس کے اربابِ اہتمام بھی ان پر خوش تھے اور طلبا بھی ان کے طریق تدریس سے مطمئن تھے، وہ نہایت ذمہ داری سے زیر درس کتابوں کا مطالعہ کر کے یہ بنیادی فریضہ ادا کرتے تھے۔

عبدالغفور اسی مدرسہ خادم القرآن والحدیث میں مصروف تدریس تھے کہ ۱۹۵۳ء میں قادیانیوں کے خلاف تحریک شروع ہوگئی۔ لاہور میں پاکستان کی ''اسلامی حکومت'' نے مارشل لا نافذ کردیا اور مرزائیت کی مخالفت کرنے اور نبی ﷺ کو خاتم النبیین قرار دینے والوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں بند کرنا شروع کردیا۔ عبدالغفور کو بھی گرفتار کرلیا گیا اور ان کے بعض شاگردوں کو بھی ان کے ساتھ ہی دھر لیا گیا۔ اب یہ لوگ منٹگمری (حال ساہی وال) جیل میں قید تھے۔ اسی جیل میں ان کے ایک شاگرد حافظ محمد سلیم قید تھے۔ ان کا جرم بھی یہی تھا کہ وہ مرزا قادیانی کو جھوٹا اور نبی ﷺ کو آخری نبی قرار دیتے تھے۔ مولانا عبدالغفور نے اس قید کو غنیمت جانا اور قرآنِ مجید یاد کرنے کا فیصلہ کیا۔ روزانہ جتنا قرآنِ مجید یاد کرتے تھے، اپنے شاگرد حافظ محمد سلیم کو سنا دیتے تھے۔ اس طرح ان کے یہ شاگرد ان کے استاد بھی تھے۔ صرف ۳۹ روز میں پورا قرآنِ مجید حفظ کرلیا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کتنے ذہین تھے اور امور خیر میں کس قدر مستعد رہتے تھے۔

۱۹۵۴ء میں جامع مسجد اہل حدیث راولپنڈی کے خطیب مولانا حافظ اسماعیل ذبیح مرحوم نے اپنی مسجد میں دینی مدرسہ جاری کرنے کا عزم کیا تو وہ میاں محمد باقر مرحوم سے اجازت لے کر حافظ عبدالغفور کو اپنے اس نئے مدرسے میں لے گئے۔ مولانا حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی کی خدمات بھی انھوں نے حاصل کرلی تھیں۔ حافظ اسماعیل ذبیح نے اس مدرسے کا نام مدرسہ تدریس القرآن والحدیث رکھا تھا۔ حافظ عبدالغفور اس مدرسے میں دو برس مدرس رہے۔ وہ مدرس کے علاوہ بہت اچھے خطیب بھی تھے، چناں چہ اس اثنا میں وہ راولپنڈی کی مسجد اہل حدیث (چک بازار صدر) میں فریضۂ خطابت بھی انجام دیتے رہے۔

۱۹۵۶ء میں میاں محمد باقر انھیں راولپنڈی سے تاندلیاں والا لے آئے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ میاں صاحب نے اپنے گاؤں کے مدرسے کا کچھ حصہ منڈی تاندلیاں والا میں منتقل کردیا تھا اور اس سلسلے میں حافظ عبدالغفور کی خدمات حاصل کرنا ان کے نزدیک ضروری تھا۔ چناں چہ اب حافظ

احب تاندلیاں والا کے مدرسے کی مسند درس پر متمکن ہوئے۔ لیکن یہاں وہ صرف دو سال ۱۹۵ء تک) رہے۔

تاندلیاں والا سے حافظ عبدالغفور کو پھر نقل مکانی کرنا پڑی۔ چند لفظی شرح اس متن کی یہ ہے ۔ کئی سال سے جہلم میں اُس دور کے مشہور عالم مولانا عبدالمجید دینا نگری خطابتی خدمات انجام ے رہے تھے۔ چھوٹا سا مدرسہ بھی انھوں نے مسجد میں جاری کر رکھا تھا جس میں محدود تعداد میں طلبا یم حاصل کرتے تھے لیکن جب وہ کبر سنی کو پہنچ گئے اور جسمانی کمزوری کا شکار ہو گئے تو انھوں نے لم کی جماعت اہل حدیث کے مشورے سے حافظ عبدالغور سے رابطہ قائم کیا اور میاں محمد باقر مرحوم ے ملاقات کی اور جہلم کی جامع مسجد اہل حدیث کی خطابت وامامت اور درسِ قرآن کے لیے حافظ دالغفور کی خدمات حاصل کر لیں۔ یہ ۱۹۵۸ء کی بات ہے۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصہ نہیں چل سکا، ں لیے کہ حافظ صاحب ممدوح بہ طور مدرس کام کرنا چاہتے تھے اور طلبا کو پڑھانا انھوں نے اپنا صد زندگی قرار دے لیا تھا، جب کہ جہلم میں اس وقت یہ صورت حال نہ تھی، وہاں صرف خطابت امت اور صبح کا درس قرآن تھا، لہٰذا جہلم کی جماعت سے معذرت کر کے حافظ صاحب فیصل آباد گئے اور ۱۹۵۹ء میں جامعہ سلفیہ کی مجلس انتظامیہ نے بہ طور مدرس ان کی تقرری جامعہ سلفیہ میں ردی۔ اس وقت جامعہ سلفیہ کی زمامِ اہتمام مولانا محمد اسحاق چیمہ کے ہاتھ میں تھی اور حضرت مولانا فظ محمد گوندلوی، مولانا شریف اللہ خاں سواتی اور مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی جامعہ کی مسند درس پر ز تھے۔ حافظ عبدالغفور تین برس (۱۹۶۱ء تک) جامعہ سلفیہ میں خدمت تدریس پر مامور رہے۔

میاب مدرس

حافظ عبدالغفور کے مختلف اوقات میں مختلف مقامات میں نقل وحرکت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہیں جم کر بیٹھ نہیں سکے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تدریس کے دورِ ابتدا ہی سے انھیں محنت اور ن سے پڑھانے کی عادت پڑ گئی تھی، جس سے مدارس کے اصحابِ انتظام بھی متاثر تھے اور طلبا بھی کے اندازِ تدریس سے خوش تھے، چناں چہ جھوک دادو کے مدرسے سے لے کر فیصل آباد کی جامعہ فیہ اور راول پنڈی کے مدرسہ تدریس القرآن والحدیث تک کے منتظمین اور طلبا پر ان کا اثر تھا اور چھوٹے بڑے، تدریسی ادارے میں ان کی مانگ تھی اور وہ چاہتے تھے کہ حافظ صاحب ان کے ہاں مت تدریس انجام دیں۔ یہ کسی مدرس کا بہت بڑا اعزاز ہے جو تدریس کے ابتدائی دور میں اسے ل ہو جائے۔ اور حافظ عبدالغفور کو یہ اعزاز حاصل ہو گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدارس میں ان طلب بڑھ گئی۔

جہلم کی جماعتی تاریخ ایک نظر میں

ابھی بتایا گیا ہے کہ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۱ء تک حافظ عبدالغفور جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں قیام فرما رہے۔ اب ۱۹۶۲ء شروع ہوجاتا ہے اور ان کا مختلف مدارس میں آنے جانے کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوجاتا ہے۔ جہلم کی جماعت کے معزز ارکان کا ایک وفد جامعہ سلفیہ کے اصحابِ انتظام سے گفتگو کرکے انھیں جہلم لے آتا ہے اور وہ مستقل طور سے اس شہر کو اپنا مسکن بنالیتے ہیں اور اپنی خدمات یہاں کے مکینوں کے سپرد کردیتے ہیں اور جہلمیوں کے ساتھ خود بھی جہلمی ہوجاتے ہیں۔ لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ جہلم کی جماعت اپنی ایک تاریخ رکھتی ہے اور اس کے دورِ ماضی نے بہت سی اہم شخصیات کو یہاں احترام کا مقام دیا ہے، جس کا ذیل میں مختصر الفاظ میں ذکر کیا جاتا ہے۔

بہت عرصہ پیشتر یہاں ایک بزرگ میاں نعمان فروکش تھے، جو مسجد اہل حدیث میں امامت وخطابت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ انھوں نے اس شہر میں حالات کے مطابق توحید وسنت کی خوب تبلیغ کی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے چھوٹے بھائی مولوی سلطان محمود نے ان کی مسند سنبھالی اور اشاعت توحید کے لیے کوشاں ہوئے۔ انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا تو کوٹلہ ائمہ (جہلم) کے ایک اہل حدیث بزرگ مولوی احمد علی ان کی جگہ پر آئے اور مسجد کا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس وقت امامت کا فریضہ میاں نعمان کے بیٹے میاں عبدالعزیز انجام دیتے تھے۔

دسمبر ۱۹۰۶ء میں (آرہ صوبہ بہار میں) آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا قیام عمل میں آیا تو اس سے کچھ عرصہ بعد حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری نے پنجاب میں اہل حدیث انجمنوں کے قیام کا سلسلہ شروع کیا۔ انہی دنوں انجمن اہل حدیث جہلم قائم کی گئی اور کسی پیمانے پر ایک باقاعدہ نظم کی صورت پیدا ہوگئی۔ اس انجمن کے پہلے صدر ایک بزرگ میاں عبدالرحمٰن کو اور سیکرٹری بابو عبدالرشید کو بنایا گیا تھا۔ انجمن کے عہدے داروں کا دوسری دفعہ انتخاب ہوا تو صدر صوفی محمد حسین صراف کو اور سیکرٹری منشی کرم داد کو منتخب کیا گیا۔ اب جہلم میں اس انجمن کے تحت سالانہ تبلیغی جلسوں کا انعقاد شروع ہوگیا۔ ان جلسوں میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کے علاوہ مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی، مولانا عبدالواحد غزنوی اور دیگر بہت سے علمائے کرام شرکت فرماتے تھے۔

انجمن اہل حدیث جہلم کا ایک سالانہ جلسہ دسمبر ۱۹۲۸ء میں قاضی محمد سلیمان منصور پوری کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ قاضی صاحب نے اس جلسے میں ''فرائض اہل حدیث'' کے عنوان سے تحریری خطبہ پڑھا تھا جو ''خطبات سلمان'' میں چھپ چکا ہے۔ انجمن اہل حدیث جہلم کا یہ دسواں سالانہ

جلسہ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے اس انجمن کے نو سالانہ جلسے منعقد ہو چکے تھے۔ اگر انجمن کا سالانہ جلسہ ہر سال منعقد ہوتا رہا ہو تو جلسوں کے انعقاد کا سلسلہ ۱۹۱۸ء سے شروع ہوا تھا اور اس زمانے میں جہلم اور اس کے گرد ونواح میں اہل حدیث اچھی خاصی تعداد میں آباد تھے اور شہر اور علاقے میں اپنا اثر رکھتے تھے۔

پھر ایک وقت آیا کہ جہلم کی مسجد اہل حدیث کا انتظام ایک بزرگ حاجی نورالدین کے سپرد ہوا۔ ان کے بعد یہ ذمہ داری ایک اور شخصیت حاجی امام الدین نے سنبھالی۔ انجمن کے فیصلے سے مسجد کے خطیب مولانا کبیر احمد دہلوی کو مقرر کیا گیا۔ مولانا کبیر احمد دہلوی کے بعد بہ طور خطیب مولانا عبدالحق امرتسری کا تقرر ہوا۔ مولانا عبدالحق امرتسری کا تعلق سرحد پار کی جماعت مجاہدین سے تھا اور انگریزی حکومت جماعت مجاہدین سے شدید عداوت رکھتی تھی، جس کے نتیجے میں حکومت نے مولانا عبدالحق امرتسری کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا اور وہ جیل ہی میں وفات پا گئے۔

ان کی وفات کے بعد منصب خطابت پر مولانا عبدالغفور (ساکن خورد ضلع جہلم) کو فائز کیا گیا۔ ان کے بعد مولانا عبدالجبار جہلمی کو خطیب بنایا گیا۔ انھوں نے بے حد تبلیغی خدمات سرانجام دیں۔ کچھ عرصے بعد وہ کراچی چلے گئے۔ اس کے بعد پونچھ کے مولانا عبدالحق کو ان کی جگہ لایا گیا۔ مولانا عبدالحق کے بعد مولانا عبدالرحمٰن دینا نگری آئے اور ان کے بعد مولانا عبدالمجید دینا نگری نے مسجد کی خطابت وامامت کا فریضہ بھی انجام دیا اور چھوٹے سے پیمانے پر دینی مدرسہ بھی قائم کیا، جس میں ان کے علاوہ بعض دیگر اہل علم بھی تدریسی کام کرتے رہے۔ مولانا عبدالمجید دینا نگری نہایت نرم مزاج، مہمان نواز اور عالی کردار بزرگ تھے۔ وہ طویل عرصے تک اس شہر میں اقامت گزیں رہے اور انھوں نے بہت خدمات سرانجام دیں۔

انجمن اہل حدیث کے اصرار پر ۱۹۶۲ء میں مستقل طور سے حافظ عبدالغفور جہلم آ گئے اور اس کے بعد جہلمی کی نسبت ان کے نام کا جزو لاینفک قرار پا گئی اور یہی نسبت قبر میں ان کے ساتھ گئی۔

یہاں یہ بتانا بھی شاید ضروری ہے کہ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کے شاگردوں کی وسیع فہرست میں جہلم کے دو علمائے دین کے اسمائے گرامی درج ہیں، وہ ہیں مولانا حافظ قطب الدین اور مولانا عظیم اللہ۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان دونوں حضرات کا تعلق سکونت شہر جہلم سے تھا یا ضلع جہلم کے کسی گاؤں یا قصبے سے۔ یہ بھی پتا نہ چل سکا کہ انھوں نے حضرت میاں صاحب سے کس دور میں تعلیم حاصل کی، کب ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور ان سے کون کون سی کتابیں پڑھیں۔ یعنی کوشش کے باوجود ان کے کسی قسم کے حالات کا علم نہ ہو سکا۔

جہلم میں مستقل قیام

بات حافظ عبدالغفور کے بارے میں ہورہی تھی اور یہاں تک پہنچی تھی کہ انجمن اہل حدیث جہلم کے اصرار پر ۱۹۶۲ء میں وہ مستقل طور سے جہلم آگئے اور اس کے بعد جہلمی کی نسبت ان کے نام کا جزوِ لاینفک قرار پاگئی۔ اب آئندہ سطور میں ان کا ذکر حافظ عبدالغفور جہلمی کے نام سے کیا جائے گا کہ ان کی اصل شناخت یہی ہے۔ دوسری شناختیں اپنی مدت پوری کرکے ختم ہوگئیں۔

خدمت دین کے پانچ حصے

جہلم میں مستقل قیام کے بعد حافظ عبدالغفور نے فوری طور پر جن دینی خدمات کا آغاز کیا انھیں ہم پانچ حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

① ...... خطابت

② ...... روزانہ کا درسِ قرآن

③ ...... تدریس

④ ...... وعظ و تبلیغ

⑤ ...... نشر واشاعت کتب

خدمت دین کے یہ پانچوں حصے نہایت اہمیت کے حامل ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خدمت دین انہی پانچ حصوں کا نام ہے۔ ان کے علاوہ ایک عالم دین کے لیے خدمت دین کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے بزرگانِ دین نے بے حد اہتمام سے یہ پانچوں کام کیے ہیں۔ بلکہ صاف لفظوں میں کہنا چاہیے کہ انھوں نے ہمیشہ انہی اقسامِ خمسہ کے دائرے میں اپنے آپ کو محصور رکھا ہے۔

خطابت

خطابت کو یہاں صرف خطبہ جمعہ میں محدود کرلیجیے تو یہ بہت بڑی خدمت ہے جو خطیب ہر جمعے بالالتزام سرانجام دیتا ہے۔ سردی ہو یا گرمی، بارش ہو یا دھوپ، آندھی ہو یا صاف موسم، اس نے بہرصورت جمعہ پڑھانا اور خطبہ دینا ہے۔ اگر یہ خدمت نیک نیتی سے انجام دی جارہی ہے تو دنیا وآخرت دونوں جہانوں میں اس کے بہترین نتائج برآمد ہوں گے۔ خطبہ جمعہ خطیب کی مستقل سٹیج ہے۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ بعض لوگ پانچ وقت کی نماز ادا کرنے میں تساہل کا مظاہرہ کردیتے ہیں، لیکن نمازِ جمعہ کے لیے مسجد میں اوّل وقت آنے کی کوشش کرتے اور خطیب کا خطبہ پورے غور سے سنتے ہیں۔ اس کا اثر بے شک فوری طور پر نہ ہوتا ہو لیکن اس کے فوائد کسی نہ کسی انداز میں ضرور

ر ہوتے ہیں۔ بے عمل لوگ بھی بسا اوقات خطیب کی باتوں کے حوالے دیتے اور گھروں میں ر بتاتے ہیں کہ آج مولوی صاحب نے یہ یہ باتیں بیان کیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ انسانی ر زندہ ہے اور وہ فطری طور پر قبولِ حق کے لیے آمادہ رہتا ہے۔ بے شک کسی وجہ سے وہ فوری ر پر آمادۂ عمل نہ ہوسکے، لیکن اس کے اندر ایک طاقت ضرور ہے جو اسے برائی سے روکتی اور امورِ پر عمل کی ترغیب دیتی ہے۔ پھر ایسا بھی بارہا ہوا کہ وہی شخص عامل بھی ہوا اور لوگوں کو عمل روف کی ترغیب دینے والا بھی ہوا۔

ہمارے ممدوح حافظ عبدالغفور جہلمی بہت اچھے خطیب تھے اور ان کے خطبہ جمعہ میں مرد بھی ی تعداد میں آتے تھے اور عورتیں بھی۔ یقیناً ان کے خطبات سن کر بہت سے لوگوں کی زندگیاں ں ہوں گی اور وہ برائی سے تائب ہو کر نیکی کی طرف راغب ہوئے ہوں گے۔ کسی نے ماپ تول کمی بیشی سے توبہ کی ہوگی، کسی نے جھوٹ بولنے اور لوگوں کو دھوکا دینے سے اپنے آپ کو بچایا ، کسی نے ان کے خطبے سن کر نماز روزے کی پابندی کو اپنا معمول بنایا ہوگا، کسی نے پڑوسیوں کو ف کرنے کا سلسلہ ترک کیا ہوگا اور کسی نے صلہ رحمی اور رشتے داروں سے حسن سلوک کا عزم کیا ۔ اعمال خیر کی ایک طویل فہرست ہے۔ اس فہرست کے کسی حصے پر تو کسی نے عمل کیا ہوگا اور اس اجر جہاں عمل کرنے والے کو ملا، وہاں منبر پر کھڑے ہو کر اس کی ترغیب دینے والے کے نامۂ ال میں بھی درج ہوا۔ یہ بہت بڑی دینی خدمت ہے جو خطابت کی صورت میں وہ کرتے رہے اسلامی معاشرے کا ایک طبقہ اس سے اثر پذیر ہوا۔

زانہ درسِ قرآن

قرآنِ مجید وہ صحیفۂ نور ہے جو بارگاہِ الٰہی سے جبریل امین کی وساطت سے قلبِ پیغمبر (ﷺ) ربی زبان میں نازل ہوا۔ یہ دنیاے مذاہب کی واحد الہامی اور منزل من اللہ کتاب ہے جو اپنے ر نزول (چودہ سو سال) سے پوری طرح محفوظ ہے، اس کے کسی حرف اور کسی لفظ میں کوئی تحریف کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اب تک دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے بے شمار ترجمے ہو چکے اور نداد شرحیں لکھی جاچکی ہیں۔ اس کتابِ ہدیٰ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ مسلمان اصحابِ علم کے وہ غیر مسلم اہل علم نے بھی اسے لائق اعتنا گردانا اور اس کے معانی ومطالب کی وضاحت کی۔ چہ قرآن کے بارے میں بہت سے غیر مسلمانوں کی نیتوں میں فتور ہے اور وہ اس سے مخالفانہ و تلاش کرنے کی سعی کرتے ہیں تاہم وہ قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے کوشاں تو ہوتے ہیں۔ مختلف مذاہب کی جن کتابوں کو الہامی قرار دیا جاتا ہے، ان میں سے کوئی مکمل کتاب شروع

سے آخر تک کسی کو لفظ بہ لفظ یاد نہیں ہے اور یاد ہو بھی نہیں سکتی۔ اس کے برعکس قرآن لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کے سینوں میں محفوظ ہے اور بڑے سے لے کر چھوٹے تک ہر مسلمان اسے یاد کرسکتا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی حفاظِ قرآن موجود ہیں۔ اور ہر جگہ بے حد شوق اور انتہائی دلجمعی کے ساتھ قرآن کو سنا اور پڑھا جاتا ہے۔

نمازِ فجر کے بعد مساجد میں قرآنِ مجید کے درس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ دور نہ جائیے، ماضی قریب کے صرف پنجابی اہل حدیث علمائے کرام کو لیجیے، ان میں متعدد حضرات باقاعدہ درس قرآن دیتے اور لوگ ان کے دروس میں حاضر ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض حضرات کے شروع سے آخر تک درس قرآن کے کئی کئی دور ہوئے۔ ان میں قاضی محمد سلیمان منصور پوری، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا محمد حنیف ندوی، حکیم عبداللہ (روڑی والے) اور دیگر متعدد حضرات نے روزانہ کے درسِ قرآن کو اپنا معمول قرار دیے رکھا۔ حافظ عبدالغفور جہلمی مرحوم کا بھی یہ معمول رہا کہ انھوں نے جہلم کو اپنا مستقل مسکن قرار دیتے ہی جامع مسجد اہل حدیث میں درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اہل حدیث اور غیر اہل حدیث ان کے درس میں آتے اور قرآنِ مجید کے احکام واوامر کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔

قرآن کا پڑھنا، پڑھانا، سننا نہایت برکت کا باعث ہے۔ اگر قرآن کے معانی کو سمجھ کر اس کی تلاوت کی جائے تو بہت سی نئی سے نئی چیزیں سامنے آتی ہیں اور معلومات کے دائرے میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

تدریس

جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا حافظ عبدالغفور جہلمی تجربہ کار مدرس تھے اور متعدد مقامات پر خدمت تدریس سرانجام دے چکے تھے۔ آئندہ بھی ان کے یہی عزائم تھے اور یہی کام ان کا اصل مرکز فکر تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ جہلم میں ایک مثالی دینی درس گاہ قائم کی جائے۔ لیکن اس کے لیے وسائل کو بروئے کار لانا ضروری تھا۔ جس قدر ارادہ نیک اور اہم تھا، اسی قدر اس کی تکمیل کے لیے سرمایہ کی ضرورت تھی۔ اس قسم کا بڑا کام صرف ارادے سے تکمیل کی منزل طے نہیں کرسکتا۔ ارادے کے ساتھ عزم وہمت اور سرمایہ کی فراہمی بنیادی عنصر ہے۔ اسی دوران میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے اس وقت کے استاذ شیخ عبدالقادر حبیب اللہ سندھی رحمہ اللہ جہلم تشریف لائے۔ یہ رمضان المبارک کا مہینا تھا۔ شیخ ممدوح اصلاً صوبہ سندھ کے رہنے والے تھے۔

متعدد کتابوں کے مصنف اور مشہور عالم دین تھے۔ سعودی عرب کے شیوخ وعلما سے ان کے

گہرے مراسم تھے اور ان کی علمی قابلیت کی وجہ سے سب حضرات ان کو تکریم کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ حافظ عبدالغفور جہلمی نے ان سے اپنے ارادے کا اظہار کیا اور ساتھ ہی اس منصوبے کی تفصیل بیان کی۔ نیز بتایا کہ اس علاقے میں اس قسم کے دارالعلوم کی سخت ضرورت ہے جو مسلک سلف کی ترویج اور اہل حدیث کے اصول وضوابط کی اشاعت کا ذریعہ ثابت ہو۔

شیخ عبدالقادر حبیب اللہ سندھی نے منصوبے کی تفصیل اور اس کی ضرورت واہمیت سے مطلع ہو کر حافظ صاحب سے نہ صرف اتفاق کیا بلکہ اس کی تکمیل کے لیے وسائل کی فراہمی کا بھی وعدہ فرمایا اور جامعہ اثریہ اس کا نام تجویز ہوا۔ شیخ ممدوح نے عید الفطر جہلم میں پڑھائی اور خطبے میں جامعہ اثریہ سے متعلق پوری وضاحت سے اظہارِ خیال فرمایا اور اس باب میں مکمل تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ چناں چہ شہر میں نہایت مناسب موقعے پر دو ایکڑ زمین خریدی گئی اور جامعہ اثریہ کی تعمیر وتاسیس کے لیے جدوجہد کا آغاز کر دیا گیا۔

شیخ عبدالقادر حبیب اللہ سندھی نے طویل علالت کے بعد ۲۵۔ مارچ ۱۹۹۹ء، ۸۔ ذوالحجہ ۱۴۱۹ھ کو مدینہ منورہ میں جمعرات کے روز اذانِ عصر کے وقت وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ۶۳ برس تھی۔

سنگ بنیاد

یہ بہت بڑا منصوبہ تھا اور بہت بڑی ہمت کا طالب......! فیصلہ کیا گیا کہ جامعہ اثریہ کا سنگ بنیاد بیت اللہ شریف کے لائق احترام امام شیخ محمد بن عبداللہ بن سبیّل سے رکھوایا جائے۔ شیخ عبدالقادر حبیب اللہ سندھی نے یہ اہم ذمہ داری قبول فرمائی کہ وہ حضرت امام صاحب سے عرض کریں گے کہ وہ جہلم تشریف لائیں اور جامعہ اثریہ کا سنگ بنیاد رکھیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی تشریف آوری کا معاملہ بہت اہم تھا اور اس کے لیے وقت درکار تھا۔ سکیورٹی کے انتظامات کا بھی مسئلہ تھا۔ بہرحال امام صاحب نے ۲۷۔ ستمبر ۱۹۷۹ء کو پاکستان تشریف لانے کا وعدہ فرمایا۔ حافظ عبدالغفور نے شیخ عبدالقادر حبیب اللہ سندھی اور اپنے دیگر رفقائے کرام کے مشورے سے ۲۸، ۲۹ ستمبر کو جہلم میں ایک عظیم الشان کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔ پروگرام یہ طے پایا کہ ۲۷۔ ستمبر کو حضرت امام کعبہ اپنے رفقائے عالی مقام کے ساتھ راولپنڈی ائیر پورٹ پر اتریں گے تو اسی دن شام کو انھیں جہلم لایا جائے گا۔ ۲۸۔ ستمبر کو وہ جہلم میں جمعہ پڑھائیں گے۔ چناں چہ اس پروگرام پر عمل کیا گیا۔ اس موقعے پر پاکستان کے جو علمائے کرام جہلم تشریف لائے، ان میں حضرت حافظ محمد گوندلوی، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، حافظ عبدالقادر روپڑی، مولانا محمد صدیق،

علامہ احسان الٰہی ظہیر اور دیگر بہت سے حضرات شامل تھے۔

سنگ بنیاد اس طرح رکھا گیا کہ حافظ عبدالغفور صاحب نے اسے شیخ عبدالقادر حبیب اللہ سندھی کو پکڑایا اور شیخ عبدالقادر حبیب اللہ سندھی نے اسے امام کعبہ شیخ محمد بن عبداللہ سبیّل کے بابرکت ہاتھوں سے متعلقہ مقام پر نصب کرایا۔ یہ نہایت مسرت انگیز موقع تھا۔ امام صاحب نے اس موقع پر تقریر بھی ارشاد فرمائی۔

جہلم کی تاریخ کا یہ بہت بڑا اجتماع تھا۔ اس میں جہلم شہر کے لوگوں کے علاوہ جہلم سے باہر کے بھی بے شمار لوگوں نے شرکت کی۔ مقامی انتظامیہ نے اس دن سکولوں اور سرکاری دفاتر میں چھٹی کا اعلان کر دیا تھا۔

اس کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں مرحوم قاضی محمد اسلم سیف نے بہت محنت کی، لوگوں سے رابطہ کرنے، ان کو کانفرنس میں شرکت کی دعوت دینے اور اشتہار وغیرہ شائع کرانے میں انھوں نے بڑی بھاگ دوڑ کی۔ اس قسم کے مواقع پر وہ بے حد ہمت سے کام لیتے تھے اور بڑی جدوجہد کا مظاہرہ کرتے تھے۔ نہ خود آرام کرتے تھے، نہ اپنے ساتھیوں کو آرام کرنے دیتے تھے۔ ہر وقت کام میں جتے رہتے تھے، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

جامعہ اثریہ جہلم میں درس وتدریس کے سلسلے کی ضروری تفصیلات آئندہ سطور میں بیان کی جائیں گی۔

وعظ وتبلیغ

حافظ عبدالغفور نے جہلم کو اپنا مقام سکونت قرار دینے کے بعد یہاں جو چوتھا کام شروع کیا، وہ تھا وعظ وتبلیغ کا کام۔ وعظ وتبلیغ کا مطلب صرف یہی نہیں کہ کسی شہر یا دیہات میں سٹیج لگا کر وعظ کیا جائے۔ اس کے علاوہ وعظ وتبلیغ کا مطلب یہ بھی ہے کہ انفرادی طور پر لوگوں سے مل کر ان کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جائے۔ ان کے سامنے حق کی صراحت کی جائے اور باطل سے روکنے کی سعی کی جائے۔ اگر یہ ہو گیا تو کوئی مانے یا نہ مانے واعظ اور مبلغ نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ حافظ عبدالغفور نے اس شہر کے لوگوں میں ہر پہلو سے تبلیغ کی اور ہر اسلوب سے ان پر حق واضح کیا، اور نہایت نرمی اور میٹھے طریقے سے ان پر اللہ کے دین کی صداقت اور حقانیت ثابت کرنے کا اہتمام کیا۔ وہ چلتے پھرتے مبلغ اور واعظ تھے اور ان کے اخلاقِ حسنہ اور اوصافِ حمیدہ کی بنا پر لوگ ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اس قسم کے نرم خو اور خوش کلام مبلغ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔

نشر و اشاعت کتب

حافظ عبدالغفور کا پانچواں منصوبہ نشر و اشاعت کتب کا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ روزمرہ پیش آنے والے ضروری مسائل اور سیرت پیغمبر (ﷺ) کے سلسلے کی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔ بے شک یہ نہایت اہم کام ہے اور ہر دور میں اس کی اہمیت کو مانا گیا اور اس پر عمل کیا گیا ہے۔ تفسیر وحدیث کے بنیادی موضوع کی کتابیں صدیوں پیشتر عربی میں لکھی گئیں۔ رجالِ حدیث و رواۃ سے متعلق کتابیں بھی عربی میں معرضِ تصنیف میں لائی گئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان موضوعات کے علما و ماہرین کی زبان عربی تھی اور عربی ہی میں انھوں نے وہ عظیم الشان ذخیرہ تیار کیا جس کی کوئی مثال دنیا میں پیش نہیں کی جاسکتی۔

عربی کے علاوہ برصغیر کے علما و مصنفین نے فارسی کو مرکز التفاف قرار دیا، اس لیے کہ اس خطۂ ارض میں فارسی کا چلن تھا۔ انھوں نے فیصلہ کیا اور بالکل صحیح فیصلہ کیا جو حالات کے عین مطابق تھا کہ اسلامی لٹریچر کو فارسی میں منتقل کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے مستفید ہوسکیں۔

پھر زمانے نے کروٹ لی اور برصغیر کی سرزمین اردو سے آشنا ہوئی اور یہ آشنائی یہاں تک بڑھی کہ اردو زبان ارتقا کی بہت سی منزلیں طے کرگئی اور اس کا شمار دنیا کی بڑی زبانوں میں ہونے لگا۔ اردو بولنے والے بھی دنیا کے کونے کونے میں پہنچ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی تبلیغ کا شوق رکھنے والوں نے اردو کو اظہارِ مدعا کا ذریعہ قرار دے لیا۔ اس زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع کردیا گیا اور عربی کتابوں کے ترجمے کے لیے بھی اس کا انتخاب کیا گیا۔

ہمارے ممدوح حافظ عبدالغفور جہلمی نے بھی اس طرف عنانِ توجہ مبذول فرمائی اور عربی کی ان کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کا عزم کیا جو عوام کے لیے بھی فائدہ مند ہوں اور خواص کے لیے بھی۔ چناں چہ اس کے لیے ان کی پہلی نگاہ انتخاب مختصر سیرۃ الرسول ﷺ پر پڑی جو شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کے فرزند گرامی شیخ عبداللہ رحمہ اللہ کی نہایت عمدہ عربی تصنیف ہے۔ یہ کتاب بہت سی خصوصیات کی حامل ہے۔ یہ نبی ﷺ کی سیرت طیبہ بھی ہے، اس میں بعض صحابہ کرام کے واقعات بھی ہیں اور اس میں ضروری مسائل بھی ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں۔

اپنے موضوع کی اس عظیم الشان کتاب کی طباعت وغیرہ کے تمام مصارف شیخ ابراہیم بن علی ناصر نے برداشت کیے۔ شیخ ممدوح کے لیے اس کی حیثیت صدقہ جاریہ کی ہے۔ ان شاء اللہ یہ کتاب ان کے لیے ذریعہ نجات ثابت ہوگی۔

اس وقت اس کا اردو ترجمہ ہمارے پیش نگاہ ہے جو اہل حدیث کے ممتاز عالم شیخ الحدیث

حضرت مولانا محمد اسحاق حسینوی نے کیا۔ ترجمے کی زبان نہایت صاف ہے۔ حضرت حافظ صاحب مرحوم جہاں بہت بڑے مدرس تھے، وہاں ترجمہ وتصنیف کا بھی وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ ترجمے کے بعد اس کی تصحیح اور پروف خوانی کا فریضہ مولانا اکرام اللہ ساجد کیلانی نے انجام دیا۔ کتاب آٹھ سو سے زائدہ صفحات میں پھیلی ہوئی ہے جو متعدد مرتبہ ہزاروں کی تعداد میں چھپ چکی ہے۔ افسوس ہے مطبوعہ شکل میں یہ کتاب حافظ عبدالغفور صاحب نہ دیکھ سکے۔

اسی طرح ایک اور قابل ذکر کتاب ''غاية الامانی'' ہے جو دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد کا اردو ترجمہ ۷۶۰ صفحات میں پھیلا ہوا ہے اور دوسری کا ۶۴۶ صفحات میں۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ''انوارِ رحمانی'' کے نام سے حافظ عبدالغفور صاحب جہلمی نے کرایا۔ عربی کتاب کے مصنف علامہ ابوالمعالی محمود شکراوی ہیں اور مترجم ہیں مولانا ابوبکر صدیق سلفی۔ اس کی کتابت حافظ صاحب کی زندگی میں ہوگئی تھی۔ لیکن طباعت حافظ صاحب کی وفات کے بعد ہوئی۔

یہ دونوں اہم کتابیں جامعہ علومِ اثریہ جہلم کی طرف سے شائع کی گئیں اور ان کتابوں کو قبولیت عامہ کا درجہ ملا۔ گزارش کا مطلب یہ ہے کہ حافظ صاحب ممدوح وقت کے تیوروں اور حالات کی رفتار سے خوب آگاہ تھے۔ انھیں اس بات کا اچھی طرح احساس تھا کہ جہاں یہ دور درس وتدریس میں سرگرم رہنے کا تقاضا کرتا ہے، وہاں یہ تحریر ونگارش کا بھی متقاضی ہے اور قلم وقرطاس سے کام لینے کا مطالبہ بھی کرتا ہے۔ چناں چہ انھوں نے اس طرف توجہ دی اور اپنی زندگی میں ان کتابوں کی نشر واشاعت اور ان کے تراجم کے لیے کوشاں ہوئے جو ان کے نزدیک اسلاف کی روایات کو اجاگر کرنے اور قرآن وحدیث کے احکام کو لوگوں تک پہنچانے کا باعث بن سکتی تھیں۔ انھوں نے ذاتی طور پر اس بنیادی کام کا آغاز کیا جو اللہ کے فضل سے اب تک جاری ہے اور ان شاء اللہ جاری رہے گا۔ یہ ان کے حسنِ نیت کی علامت اور ان کے خلوصِ قلب کا بین ثبوت ہے۔

حاکم شارجہ کا تعاون

جو شخص اللہ کی رضا کے لیے اللہ کے دین کی نشر واشاعت پر کمر بستہ ہوجاتا ہے اللہ اس کی مدد کرتا ہے اور ایسے حالات پیدا ہوجاتے ہیں کہ لوگ خود بخود اس کی طرف دست تعاون بڑھانے لگتے ہیں۔ حافظ عبدالغفور ایک مدرس اور خطیب کی حیثیت سے جہلم گئے تھے۔ جہلم اور اس کے قرب وجوار میں کوئی ان کا رشتے دار نہ تھا۔ وہاں ان کا اپنا گھر تھا نہ کوئی زمین جائداد تھی۔ نہ اس علاقے کی کسی مال دار شخص سے ان کے تعلقات تھے۔ لیکن چوں کہ ان کے دل میں نیک مقاصد پرورش پا رہے تھے اور اللہ اور رسول (ﷺ) کے دین کی خدمت کا جذبہ ان کے ذہن میں موجزن تھا، اس لیے انھیں ایسے ذرائع سے تعاون کی پیش کشیں ہوئیں، جن کا کچھ عرصہ پیشتر انھیں تصور بھی نہیں

ہوسکتا تھا۔ انھیں شارجہ کے حکمران سلطان بن محمد القاسمی سے ملاقات کا موقع ملا تو دورانِ گفتگو ان سے اپنے تدریسی منصوبے کا ذکر کیا۔ یوں سمجھیے کہ اس حکمران کے سلفی الذہن پر یہ ایک دستک تھی، جس نے ان کو فوراً اس منصوبے کی تکمیل پر آمادہ کیا اور انھوں نے اس منصوبے پر اخراجات کا تخمینہ لگانے کے لیے کہا۔ دو ایکڑ زمین پر دارالعلوم، دار الاقامہ، مہمان خانہ، لائبریری اور مسجد وغیرہ کا نقشہ بنایا گیا تو اندازہ ہوا کہ اس پر ڈیڑھ کروڑ پاکستانی روپے خرچ ہوں گے۔ حاکم موصوف نے یہ رقم ادا کرنے کی ہامی بھرلی۔ تعمیر کے دوران میں کئی نشیب وفراز آئے۔ بالآخر دو کروڑ پانچ لاکھ پاکستانی روپے میں پوری عمارت تکمیل کے مراحل طے کرگئی۔

جامعہ کی عمارات ایک نظر میں

عرب امارات کے ایک ملک کے حکمران سلطان بن محمد القاسمی کے مالی تعاون سے جہلم شہر کے وسط میں دین الٰہی کی تدریس وتعلیم کے لیے جو عمارات تعمیر ہوئیں، اب ان پر ایک نظر ڈالیے۔ جدید کنکریٹ کی یہ ایک خوب صورت عمارت ہے۔

① ...... نہایت شان دار بہت بڑی جامع مسجد، جس کا نام مسجد سلطانی ہے۔

② ...... جامعہ علوم اثریہ کا دار التدریس چودہ کمروں پر مشتمل ہے۔

③ ...... اساتذہ کے لیے خوب صورت فیملی کوارٹرز تعمیر کیے گئے ہیں۔

④ ...... دومنزلہ عمارت ۵۴ کمروں پر محیط ہے۔

⑤ ...... دارالاقامہ میں چار سو طلبا کے قیام کا انتظام ہے۔

⑥ ...... مختلف دفاتر کے لیے پانچ کمرے تعمیر کیے گئے ہیں۔

⑦ ...... لائبریری کے لیے وسیع ہال تعمیر کیا گیا ہے۔

⑧ ...... خوب صورت مہمان خانہ بنایا گیا ہے، جس میں تمام ضروریات کا خیال رکھا گیا ہے۔

جامعہ علوم اثریہ کے مختلف شعبے

جامعہ علوم اثریہ طلبا کی تعلیم کا مرکز ہے اور اس کے مختلف شعبے قائم کیے گئے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

① ...... **جامعہ اثریہ للبنات:** یہ وسط شہر میں ایک تین منزلہ عمارت ہے جو طالبات کی تعلیم کے لیے مختص ہے۔ اس میں جہلم شہر اور بیرونِ شہر کی سیکڑوں طالبات تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ ان کی تعلیم کے لیے لائق استانیوں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ طالبات کی رہائش، خوراک، ضروریات اور علاج معالجے کا انتظام جامعہ علوم اثریہ کی طرف سے کیا جاتا ہے۔

②...... **مجلس التحقیق الاثری**: جامعہ علوم اثریہ کی طرف سے یہ ایک ایسا ادارہ قائم کیا گیا ہے، جس کا مقصد علمائے کرام کے علمی رجحان کے مطابق مختلف موضوعات پر ان سے تحقیقی کام کرانا ہے۔

③...... **مرکز التدریب العلمی**: یعنی دینی مدارس کے فارغ التحصیل حضرات کی کسی اہم موضوع پر درجۂ تخصص کے لیے تربیت کرنا۔

④...... **مکتبہ الجامعہ**: یہ جامعہ علوم اثریہ کا کتب خانہ ہے، جس میں اساتذہ وطلبا کے لیے مختلف موضوعات پر کتابیں جمع کی گئی ہیں۔

⑤...... **قسم المخطوطات**: جامعہ کے اس شعبے کے تحت ملک اور بیرونِ ملک سے اہم اور نادر مخطوطات حاصل کرنے اور ان کے ذریعے سے کسی موضوع پر تحقیقی کام کرنا ہے۔

⑥...... **دار الافتاء**: جو حضرات تحریری صورت میں دینی مسائل سے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہیں، وہ اس شعبے سے رجوع کریں۔

⑦...... **اثریہ کیسٹ ہاؤس**: قرآن وحدیث کے کسی موضوع پر مشہور علما کی تقریروں، متعدد مشاہیر قرائے کرام کی تلاوت اور بعض شعرا کی نظموں کی کیسٹیں۔

⑧...... **جامع مسجد اہل حدیث توحید چوک**: یہ ایک عظیم الشان اور خوب صورت مسجد ہے جو ایک مخیر شخص کے تعاون سے لاہور موڑ جی ٹی روڈ پر لب سڑک تعمیر کی گئی ہے۔ اس مسجد میں جمعہ وجماعت کے علاوہ بچوں کے حفظ قرآن اور ناظرہ قرآن کی تعلیم کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔

⑨...... **اثریہ ٹرسٹ ہسپتال**: جی ٹی روڈ سے دائیں جانب تقریباً ڈیڑھ کلو میٹر کے فاصلے پر بہت وسیع جگہ میں یہ ہسپتال بنایا گیا ہے۔ اس میں نادار اور مستحق مریضوں کو مفت طبی سہولتیں حاصل ہیں۔

⑩...... **اثریہ فری ڈسپنسری**: یہ ڈسپنسری جامعہ علومِ اثریہ کے بالکل قریب ہے۔ اس سے روزانہ سیکڑوں نادار مریض دوا حاصل کرتے ہیں۔ اس میں ایک کلینیکل لیبارٹری بھی قائم کی گئی ہے۔ کچھ عرصہ پیشتر اس ڈسپنسری میں ایک فری آئی کیمپ بھی لگایا گیا تھا، جس میں تقریباً پانچ ہزار مریضوں کو چیک اپ کیا گیا۔ ان میں سے ڈھائی سو مریضوں کے آپریشن ہوئے۔ باقی مریضوں کو ادویات اور مفت عینکیں دی گئیں۔

⑪...... **اثریہ مڈل سکول**: یہ دو مڈل سکول ہیں ایک طلبا کے لیے اور ایک طالبات کے لیے۔ دونوں میں تعلیم کا بہترین انتظام ہے۔

⑫...... **ماہنامہ حرمین**: اپریل ۱۹۹۱ء میں جامعہ علوم اثریہ کی طرف سے ''حرمین'' کے نام سے ایک ماہنامہ رسالہ جاری کیا گیا تھا جو اپنے مندرجات ومضامین کے اعتبار سے نہایت اہم رسالہ

ہے۔ اس رسالے کا اجرا حافظ عبدالغفور جہلمی کی وفات سے اگرچہ کئی سال بعد ہوا۔ لیکن اس کا اصل مقصد انہی کے تبلیغی مشن کو آگے بڑھانا ہے اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے یہ رسالہ برابر کوشاں ہے۔ اس کے اجرا پر سولہ سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور یہ بغیر کسی رکاوٹ کے کتاب وسنت کی اشاعت میں سرگرم عمل ہے۔ ایک خالص علمی رسالہ جاری رکھنا اور ہر مہینے اس کے لیے ایک خاص نقطۂ نظر کے مضامین جمع کرنا اور رسالے کا پیٹ بھرنا بہت مشکل کام ہے۔ اللہ کا شکر ہے یہ رسالہ (حرمین) کامیابی سے اپنی اصل منزل کی طرف رواں دواں ہے۔

حافظ صاحب مصنف کی حیثیت سے

حافظ عبدالغفور جہلمی نے اپنی زندگی میں جامعہ علومِ اثریہ کے قیام وتاسیس کے لیے جدوجہد کی اور اللہ نے اس جدوجہد میں انھیں کامیابی سے نوازا۔ اوپر کی سطور میں جامعہ کے جن شعبوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے بعض رفاہی قسم کے شعبے ان کے بعد قائم کیے گئے اور یہ نہایت ضروری شعبے ہیں جن سے عام لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور عام لوگوں کو فائدہ پہنچانا اسلام کی رو سے نہایت ضروری ہے۔

یہاں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حافظ صاحب ممدوح جہاں خطابت وتدریس میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے، وہاں تصنیف وتالیف سے بھی انھیں قلبی لگاؤ تھا۔ اگرچہ اپنی بوقلموں مصروفیات کی وجہ سے وہ قلم وقرطاس سے باقاعدہ رابطہ نہیں رکھ سکے، (اور ایک مدرس اور بہت بڑے تدریسی ادارے کے ناظم کے لیے قلم وقرطاس سے باقاعدہ رابطہ رکھنا ممکن بھی نہیں) تاہم انھوں نے وقت نکال کر بعض تحریری منزلیں بھی طے کی ہیں، جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

① ...... **مسنون نماز مع مسنون دعائیں:** اسلام کے پانچ ارکان میں سے دوسرا رکن نماز ہے اور مسلم اور کافر کے درمیان نماز کو حد فاصل قرار دیا گیا ہے۔ اگر جان بوجھ کر نماز ترک کردی جائے تو انسان دائرۂ اسلام سے باہر نکل کر کفر کی سرحد میں داخل ہوجاتا ہے۔ پھر نماز پڑھنے کے بھی کچھ آداب ہیں جن کا قرآن وحدیث میں تفصیل سے ذکر فرمایا گیا ہے۔ نماز کے سلسلے کی کچھ دعائیں بھی ہیں جو نبی ﷺ سے منقول ہیں۔ حافظ صاحب نے اس کتاب میں ضروری تفصیل کے ساتھ تحریر فرمایا ہے کہ نبی ﷺ کس طرح نماز پڑھا کرتے تھے اور نماز میں کون سی دعائیں پڑھنا چاہئیں۔ یہ کتاب نماز کے موضوع کی ایک اہم کتاب ہے۔

② ...... **فاتحہ خلف الامام:** احناف اور اہل حدیث کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھی جائے یا نہ پڑھی جائے۔ نبی ﷺ نے واضح الفاظ میں

فرمایا ہے کہ سورہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ حافظ عبدالغفور جہلمی نے اس کتاب میں دلائل کے ساتھ اس کی وضاحت کی ہے۔

③...... **احکام رمضان المبارک:** روزہ اسلام کا چوتھا رکن ہے، جس پر عمل کرنا مسلمان پر فرض ہے۔ روزہ قمری مہینوں میں سے رمضان کے مہینے میں رکھا جاتا ہے۔ حافظ صاحب نے اس کتاب میں روزے کی فرضیت اور اس کی اہمیت کو صراحت سے بیان کیا ہے۔

④...... **امام حرمین کی آمد اور پاکستان میں نعرۂ توحید:** گزشتہ صفحات میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ ستمبر ۱۹۷۹ء میں امام کعبۃ اللہ شیخ محمد بن عبداللہ بن سبیل جہلم تشریف لائے اور جامعہ علوم اثریہ کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس موقعے پر بے شمار لوگوں نے ان کے ارشادات سننے کی سعادت حاصل کی۔ ان کی جہلم تشریف آوری پر کثیر تعداد میں لوگوں نے ان کی اقتدا میں نماز پڑھی۔ یہ ضیاء الحق کا دورِ حکومت تھا اور وزیر مذہبی امور جھنگ کے افتخار احمد انصاری تھے۔ امام صاحب ان کی درخواست پر جھنگ تشریف لے گئے۔ اسی اثنا میں مولانا شاہ احمد نورانی، عبدالمصطفیٰ ازہری اور بعض دیگر بریلوی حضرات نے فتویٰ لگا دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ جو شخص امام کعبہ کی اقتدا میں نماز پڑھے گا، اس کا نکاح ٹوٹ جائے گا، اس لیے کہ وہ وہابی ہے اور وہابیوں کی اقتدا میں نماز پڑھنے والے کی یہی سزا ہے۔ اب حافظ عبدالغفور جہلمی کا قلم حرکت میں آیا اور انھوں نے اس کے جواب میں یہ کتاب لکھی۔

حافظ صاحب کے تلامذہ

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں عرض کیا گیا، حافظ عبدالغفور جہلمی نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد مختلف اوقات میں مختلف مدارس میں کئی سال خدمت تدریس انجام دی اور درحقیقت تدریس ہی ان کا اصل شعبہ تھا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد کا صحیح طور سے تعین کرنا تو مشکل ہے تاہم ان کے جن مشہور اور نامور شاگردوں کا علم ہوسکا ہے، ان میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

①...... مولانا عبداللہ ہزاروی: مشہور عالم دین اور ہری پوری کی جامع مسجد اہل حدیث کے خطیب۔

②...... مولانا محمود احمد غضنفر: بہت سی کتابوں کے مصنف اور مترجم۔

③...... مولانا حفیظ الرحمٰن لکھوی: استاذ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے پوتے اور مولانا حبیب الرحمٰن لکھوی کے فرزند گرامی۔ جلیل القدر عالم اور معروف مدرس۔ جامعہ ابن تیمیہ کے بانی و مہتمم۔

④...... مولانا عبدالخالق قدوسی شہید: ممتاز عالم دین اور محقق۔ ۲۳۔ مارچ ۱۹۸۷ء کو لاہور کی

جماعت اہل حدیث کے ایک جلسے میں بم دھماکے سے جامِ شہادت نوش کیا۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر بھی اسی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے مرتبۂ شہادت کو پہنچے۔

⑤......مولانا محمد زکریا ظفر: کئی درسی کتابوں کے مصنف۔ فروری ۱۹۹۲ء میں وفات پائی۔

⑥......مولانا محمد اکرم رحمانی: مدرس جامعہ سلفیہ۔ فیصل آباد

⑦......مولانا محمد علی حامد: مدرس جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن (ضلع فیصل آباد)

⑧......مولانا عبدالخالق: کھڈیاں خاص (ضلع قصور)

⑨......مولانا محمد ابراہیم: میر پور آزاد کشمیر

⑩......مولانا عبدالسلام ہزاروی: پشاور

⑪......مولانا عبدالواحد ہزاروی: پشاور

⑫......مولانا عبدالرحمٰن حنیف:

⑬......مولانا محمد مدنی: حافظ صاحب کے بڑے صاحب زادے (ان کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔)

⑭......مولانا حافظ محمد اسلم: فتح پور (ضلع اوکاڑہ)

⑮......مولانا حافظ عبداللہ: منڈی واربرٹن (ضلع شیخوپورہ)

⑯......مولانا نصیر الدین: کھنڈا موڑ۔ (ضلع ننکانہ)

معاصرین

لفظ معاصر کے لغوی معنے تو ہم زمانہ اور ہم عہد کے ہیں یعنی جو لوگ ایک ہی زمانے اور ایک ہی دور میں اکٹھے زندگی بسر کررہے ہیں انھیں لغوی اعتبار سے معاصر کہا جاتا ہے، لیکن اصطلاح میں ان لوگوں پر معاصر کا لفظ بولا جائے گا جو علم، عمل، مرتبے اور درجے میں باہم برابر ہوں۔ حافظ عبدالغفور جہلمی کے ہم عمر اور ہم زمانہ تو بے شمار لوگ ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ علم وعمل، فکر وفہم، درس وتدریس اور وعظ وخطابت وغیرہ اوصاف میں ان کے ہم پایہ اور ہم سر لوگ کون ہیں۔ بے شک بہت سے علما ان کے ہم جماعت ہوں گے اور متعدد مدرسین نے ان کی رفاقت میں تدریس کے فرائض سرانجام دیے ہوں گے اور کتنے ہی واعظین ومقررین نے ان کے ہم سفر ہو کر مختلف مقامات میں خطابت وتقریر کے جوہر دکھائے ہوں گے۔ لیکن ان سب کا احصا نہ میں کرسکتا ہوں، نہ کوئی اور کرسکتا ہے اور نہ کبھی کسی نے کسی اہم شخصیت کے تمام معاصرین کا نام بہ نام ذکر کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔

یہاں ہم ان کے چند معاصرین کے نام درج کریں گے۔ ان میں سے ممکن ہے زمانۂ طالب

علمی میں بعض ان کے ہم جماعت یا ہم مکتب بھی رہے ہوں۔ دو چار سال کے تفاوت سے یہ حضرات تقریباً ہم عمر ہی ہوں گے ......

①...... مولانا ابوالبرکات احمد: مدراس (جنوبی ہند) کے ایک گاؤں میں ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے۔ بہت بڑے مدرس تھے۔ تدریس کا تمام زمانہ جامعہ اسلامیہ گوجراں والا میں گزرا۔ بے شمار علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ خود دار اور صاحب تقویٰ عالم دین تھے۔ ۲۹۔ جولائی 1991ء کو گوجراں والا میں فوت ہوئے۔

②...... مولانا محمد صادق خلیل: ان کی ولادت مارچ ۹۲۵ء میں اوڈاں والا (ضلع فیصل آباد) میں ہوئی، وہیں تعلیم حاصل کی۔ متعدد کتابوں کے مصنف اور مترجم تھے۔ معروف مدرس تھے، جن سے بے شمار طلبا نے کسب علم کیا۔ ۶۔ فروری ۲۰۰۴ء کو فیصل آباد میں وفات پائی۔

③...... مولانا حبیب اللہ لکھوی: پنجاب کے لکھوی خاندان کے عظیم رکن حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے فرزند گرامی قدر تھے۔ درس وتدریس میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ ۲۰۔ مئی ۱۹۷۳ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔

④...... مولانا محمد یعقوب ملہوی: مقام ولادت چک نمبر ۲۰ الف (رینالا خورد) اور تاریخ ولادت ۱۹۲۱ء ہے۔ زیادہ تعلیم اوڈاں والا (ضلع لائل پور) کے دارالعلوم میں حاصل کی۔

کچھ عرصہ گوجراں والا کے بعض اساتذہ سے بھی اکتسابِ فیض کا موقع ملا۔ تدریس کا فریضہ عمر بھر اوڈاں والا میں انجام دیتے رہے۔ نہایت پرہیز گار عالم اور بے حد فرض شناس مدرس تھے۔ ۱۳، ۱۴ نومبر ۱۹۸۱ء کی درمیانی رات کو اوڈاں والا میں راہیٔ ملک بقا ہوئے۔ تلامذہ کی بہت بڑی تعداد اپنے پیچھے چھوڑی جو مختلف مقامات میں مصروف درس وتدریس ہیں۔

⑤...... مولانا محمد صدیق لائل پوری: جماعت اہل حدیث کے مشہور خطیب اور مناظر تھے۔ شیعیت کے متعلق ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ بعض شیعی اہل علم سے مناظرے بھی کیے۔ تدریس میں بھی نام پیدا کیا۔ ۴۔ فروری ۱۹۲۱ء کو موضع کرپالا (تحصیل تاندلیاں والا، ضلع فیصل آباد) میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۔ ستمبر ۱۹۸۹ء کو انتقال ہوا۔

⑥...... مولانا محمد اسحاق چیمہ: ہمارے حلقہ اہل علم کی ایک مشہور شخصیت مولانا محمد اسحاق چیمہ کی ہے۔ مولانا ممدوح نے تدریس بھی کی اور تجارت بھی کرتے رہے۔ ان کی تاریخ پیدائش ۱۵۔ مئی ۱۹۲۱ء ہے۔ وہ ہمارے مخلص تریں دوست تھے۔ ۲۳۔ مارچ ۱۹۹۳ء کو انھوں نے اس دنیائے دوں سے منھ موڑا اور عالم جاودانی کی راہ لی۔

⑦...... مولانا فیض الرحمٰن ثوری: پاکستان کے ممتاز محقق اور جماعت اہل حدیث کے نامور عالم

مولانا فیض الرحمٰن ثوری ۱۹۲۰ء کے پس وپیش پیدا ہوئے۔ نہایت زیرک اور صاحب تحقیق بزرگ تھے۔ ان کے علمی کارناموں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ۵۔ دسمبر ۱۹۹۶ء کو ان کا انتقال ہوا۔

حافظ عبدالغفور صاحب کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا، جن میں علمائے کرام اور مدرسین عظام کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ظاہر ہے وہ حضرات یا ان کے ہم عمر ہوں گے یا عمر میں دو چار سال کی کمی بیشی ہوگی۔ ہم انھیں ان کے معاصرین ہی قرار دیں گے، کیوں کہ ان کی حیثیت بھی حافظ صاحب کی طرح اصحاب تدریس وخطابت کی ہے۔

یہاں ان کے صرف سات معاصرین کا ذکر کیا گیا ہے جو علمائے دین کے زمرے میں شامل تھے۔ اس سے زیادہ کی نہ ضرورت ہے اور نہ ان صفحات میں گنجائش ہے۔ باقی معاصرین کو انھی پر قیاس کر لینا چاہیے۔

عادات وخصائل

ہر شخص کو بارگاہِ الٰہی سے کچھ عادات وخصائل ودیعت کی جاتی ہیں اور ان عادات وخصائل کا اس کے عمل وکردار سے اظہار بھی ہوتا رہتا ہے۔ حافظ عبدالغفور جہلمی بھی بعض عادات وخصائل کے حامل تھے۔ ان کا روزانہ بہت سے الگ الگ ذہن وفکر کے حامل لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ علما سے بھی تعلق تھا، طلبا سے بھی روابط تھے، شہر کے لوگوں سے بھی ان کے مراسم تھے، دیہاتیوں کی بھی ان کے ہاں آمد ورفت رہتی تھی، شرعی مسائل پوچھنے والے بھی ان کی خدمت میں آتے تھے، مدرسین سے بھی انھیں گفتگو کرنا ہوتی تھی، جامعہ کے ہر روز کے اخراجات کا بھی انھیں انتظام کرنا ہوتا تھا۔ اس طرح معاملات کا ایک ہجوم تھا جس سے ہر وقت ان کا واسطہ رہتا تھا۔ جو شخص ہمیشہ اس قسم کی ذمہ داریوں میں گھرا رہتا ہو، عام طور پر اس میں چڑچڑا پن آجاتا ہے اور اس پر گھبراہٹ کا سایہ لہرانے لگتا ہے۔ لیکن حافظ عبدالغفور کو اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسی خصوصیات سے نوازا تھا کہ وہ حالات کا نہایت خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے تھے اور ان کے چہرے پر ہر آن اطمینان کے آثار جھلکتے رہتے تھے۔

جہاں تک ہم جانتے ہیں وہ باعمل عالم تھے۔ اللہ کے دین کے مخلص ترین خادم، تہجد گزار اور عابد وزاہد شخص تھے۔ اپنے مسلک کے لوگوں کے علاوہ دوسرے مسالک کے علما وعوام سے بھی وہ مخلصانہ روابط رکھتے تھے اور بعض مشترکہ معاملات میں ان سے ان کا میل ملاقات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ وہ بھی ان کے پاس آتے اور یہ بھی ان کے ہاں جاتے تھے۔ معتدل مزاج اور نرم خو تھے۔ ہر ایک کی بات کھلے دل سے سنتے تھے اور اپنی بات صفائی سے ان کو سناتے تھے۔

چھوٹے پر شفقت کا اظہار کرتے اور بڑے کے احترام کو اپنے لیے ضروری قرار دیتے تھے۔

اہل علم اگرچہ کسی مسلک سے تعلق رکھتے ہوں، ان کی تکریم بجالاتے تھے۔

قرآنِ مجید سے انھیں قلبی لگاؤ تھا اور اس کی روزانہ تلاوت کرتے تھے۔ زبان ذکر الٰہی میں مصروف رہتی تھی۔ لوگوں کو بھی ان کے ذہن کے مطابق اس کی ترغیب دیتے تھے۔ غریب کی امداد اور مستحق کی اعانت ان کا لازمۂ حیات تھا۔ مہمان نواز تھے اور مہمان کو دیکھ کر اور اس کی خدمت کر کے خوش ہوتے تھے۔

بسا اوقات اپنی ضرورت پر دوسرے کی ضرورت کو ترجیح دیتے تھے اور یہ بہت بڑا وصف تھا جس سے اللہ نے ان کو نوازا تھا۔ یہ ان کے اخلاص کا کرشمہ اور اُخلاق کا نتیجہ تھا کہ اپنی جماعت کے اصحابِ علم کے علاوہ دوسری جماعتوں کے اصحابِ علم بھی ان سے مل کر خوش ہوتے تھے اور یہ بھی ان سے اکرام کا برتاؤ کرتے تھے۔

ان کی تبلیغ کا اثر اور کوششوں کا ثمر ہے کہ ان کے جہلم آنے کے بعد وہاں اہل حدیث کی کئی مسجدیں تعمیر ہوئیں، لوگوں کے دلوں میں دینی تعلیم کے حصول کا جذبہ ابھرا اور توحید وسنت کی اشاعت کے دائروں میں وسعت آئی۔ جہلم کے اردگرد میں بھی کلمۂ حق بلند ہوا اور لوگ اس سے بے حد متاثر ہوئے۔

روزانہ کے معمولات

ان کے روزانہ کے جن معمولات کا مجھے علم ہوسکا ہے، وہ یہ ہیں۔

① ...... تہجد کے بعد قرآنِ مجید کے تقریباً چار پاروں کی تلاوت۔

② ...... نمازِ فجر کے بعد مسنون وظائف واوراد۔

③ ...... دن رات میں بہ کثرت درود شریف پڑھتے۔

④ ...... نماز اشراق مسجد میں پڑھ کر گھر تشریف لاتے۔ ناشتہ کرتے اور گھر کے معاملات کے بارے میں ضروری مشورے کرتے۔ اس اثنا میں چھوٹے بچوں یعنی پوتے پوتیوں سے پیار محبت کی باتیں کی جاتیں اور ان کے ذہن کے مطابق انھیں کچھ سکھانے پڑھانے کی کوشش کی جاتی۔

⑤ ...... پھر اپنے کتب خانے میں تشریف لے جاتے جو ان کا دفتر بھی تھا۔ وہاں اساتذہ، طلبا اور میل ملاقات سے آنے والوں سے گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا۔ میل ملاقات والے جماعت کے لوگ بھی ہوتے تھے اور عام شہری بھی۔ بعض لوگ گھریلو مشوروں کے لیے بھی آتے۔

⑥ ...... لکھنے پڑھنے اور مطالعہ کا کمرہ بھی یہی تھا۔

⑦ ...... گرمیوں میں دوپہر کا کھانا نمازِ ظہر کے بعد کھاتے اور پھر کچھ دیر قیلولہ کرتے۔

⑧......اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھتے۔ وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔

وسیع الظرف اور فراخ حوصلہ عالم دین تھے۔ ہر شخص سے اس کی قابلیت اور قوت فہم کے مطابق گفتگو کرتے۔ کسی سے بے مقصد بات کرنا اور لڑنا جھگڑنا ان کی عادت نہ تھی۔ دین کے عالم تو وہ تھے ہی، دنیوی معاملات کو بھی خوب سمجھتے تھے۔

دوسروں کے مسلکی نقطہ نظر کا احترام کرتے اور اپنے مسلک میں بے لچک ہونے کا مظاہرہ کرتے۔

ایک شیعہ اہل علم کا واقعہ

قاضی محمد اسلم سیف مرحوم نے ''تذکار حافظ عبدالغفور جہلمی'' میں حافظ صاحب سے متعلق ایک شیعہ اہل علم کا واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

''اُن کی مجلس میں اہل حدیث اور غیر اہل حدیث کا کوئی امتیاز نہ تھا، جو اُن سے ملتا وہ ان سے خندہ پیشانی اور کشادہ قلبی سے پیش آتے۔ اسی لیے غیر اہل حدیث آج بھی ان کے حسن اخلاق کے مداح ہیں۔ اس کے ثبوت کے لیے ہمارے فاضل دوست سید بشیر حسین شاہ بخاری، صدر مرکز تحقیقاتِ اسلامیہ سرگودھا، مدیر اعلیٰ ماہنامہ ''احقاقِ حق'' (سرگودھا) جو مسلکاً شیعہ ہیں، حافظ صاحب کے بارے میں راقم کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''جامعۃ العلوم الاثریہ جہلم کے بانی اور مہتمم جناب حافظ عبدالغفور صاحب اپنے مسلک کے لحاظ سے تو پکے اہل حدیث تھے، مگر دوسرے مکاتب فکر حضرات سے نہایت کشادہ دلی سے پیش آنا ان کا ایک خاص مزاج تھا۔ بندہ ان دنوں محکمہ اوقاف پنجاب میں بحیثیت آفیسر سپیشل ڈیوٹی تعینات تھا۔ ان کی مسجد اہل حدیث جہلم کی تعمیر و مرمت کا ایک بل اکاؤنٹس برانچ لاہور سنٹرل زون میں زیر تصفیہ چلا آ رہا تھا، جس کے لیے وہ بذاتِ خود لاہور دفتر میں تشریف لائے۔ کام تو دراصل اکاؤنٹس برانچ کا تھا چوں کہ میرے دل میں حضرات علمائے کرام کا قدرتی طور پر احترام کا جذبہ تھا، اس لیے میں نے انھیں دیکھتے ہی اپنے کلرک محمد امین کے ذریعے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ مزاج پرسی کے بعد تشریف آوری کا مقصد دریافت کیا، تو جب آپ نے مسجد اہل حدیث جہلم کے بارے میں اپنے معاملے کی وضاحت فرمائی تو مجھے اپنے قابل صد احترام دوست ہی نہیں بلکہ مہربان جناب مولانا حافظ محمد اسمٰعیل روپڑی مرحوم اور جناب حضرت مفتی محمد صدیق مرحوم جو سرگودھا میں میرے مکان کے بالمقابل مرکزی جامع مسجد اہل حدیث بلاک ۱۹ میں خطیب رہ چکے تھے، ان کی محبت اور کرم فرمائی نے میرے دل و دماغ میں کروٹیں لینا شروع کر دیں۔ میں نے آناً فاناً ان کا بل پاس کرا دیا۔ پھر چائے پی رہے تھے کہ حافظ صاحب نے بڑے عجیب انداز سے استفسار فرمایا کہ آپ اہل حدیث

ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ کون مسلمان ہے جو حدیث کا منکر ہے۔ حافظ صاحب مسکرا دیے مگر ان کی مسکراہٹ میں حیرانی بھی نظر آ رہی تھی۔ فرمانے لگے میرا مقصد یہ ہے کہ کس مکتب فکر سے آپ تعلق رکھتے ہیں؟

''میں نے عرض کیا کہ بفضل باری تعالیٰ میں شیعہ مکتب فکر سے متعلق ہوں۔ حافظ صاحب نے فرمایا کہ پھر تو آپ نے میرا کیس حل کرنے میں کمال کردکھایا۔ میں نے عرض کیا کہ جناب یہ کمال نہیں، اسے میں نے اپنا فرض سمجھ کر انجام دیا ہے۔ حافظ عبدالغفور صاحب نے فرمایا کہ اگر آپ نہ کرتے تو آپ سے کوئی گلہ بھی نہ تھا۔ کیوں کہ اصل ذمہ داری تو اکاؤنٹس برانچ کی تھی جس میں یہ معاملہ ڈیڑھ سال سے پڑا ہوا تھا۔ یہ واقعہ ۱۹۶۳ء کا ہے۔

''خدا کی قدرت ۱۹۶۵ء میں مجھے ضلع گجرات اور ضلع جہلم کی وقف املاک کا چارج ملا۔ گجرات ہیڈ کوارٹر تھا۔ حافظ صاحب سے ملاقات کے شوق میں پہلا دورہ میں نے جہلم کا رکھا اور سیدھا حافظ صاحب کی مسجد میں پہنچا۔ حافظ صاحب مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ انہی کے پاس قیام کیا۔ مسجد کے ایک گوشے میں ان کا کتب خانہ تھا۔ غالبًا اسی سے ملحق ان کی رہائش گاہ تھی، جس کا ایک دروازہ کتب خانے میں کھلتا تھا۔ کیوں کہ اسی دروازے سے کھانا آتا تھا۔ رات میں نے کتب خانے پر نظر ڈالی تو مجھے تمام کتب بلا ترتیب نظر آئیں۔ صبح حافظ صاحب نے جب میرے لیے ناشتہ ترتیب دیا تو میں نے کہا حافظ صاحب ابوداؤد طیالسی ہے تو ذرا لائیے۔ حافظ صاحب میرے ذہنی شوق سے واقف نہ تھے، حیران ہوگئے۔ دائیں بائیں تلاش کرنے لگے۔ بالآخر میں نے اشارہ کیا کہ طبقات ابن سعد کے ساتھ پڑی ہے۔ حافظ صاحب سے میں نے عرض کیا کہ چار طلبا بلائیے تاکہ کتب خانہ فن وار کردیا جائے۔ چناں چہ یہ مرحلہ ہم نے نمازِ ظہر تک مکمل کرلیا۔ نماز میں نے اپنے شیعہ طریقے پر حافظ صاحب کے خلف میں ہی ادا کی۔

''ربیع الاوّل کا مہینا تھا، مسجد اہل حدیث کے چوک میں بریلوی برادران نے جلسہ رکھا ہوا تھا۔ ہم نے مسجد کی گیلری سے جلسے میں مقررین کی تقاریر سنیں۔ ایک مقرر 'نور بشر' کے موضوع پر اپنے مخصوص انداز میں تقریر فرما رہے تھے۔ میں نے کہا حافظ صاحب اب فرمائیے کیا خیال ہے؟ حافظ صاحب نے ہنستے ہوئے فرمایا کہ بخاری صاحب! بات کوئی ایسی نہیں، حضور (ﷺ) نورِ ہدایت بھی ہیں اور بشر تو ہیں ہی۔ اگر ہم کہہ دیں کہ حضور (ﷺ) نورِ ہدایت ہیں تو بریلوی شور مچادیں گے کہ وہابی ''من گئے، من گئے۔'' اور اگر بریلوی کہہ دیں کہ بشر ہیں تو اہل حدیث شور مچادیں گے کہ بدعتی ''من گئے، من گئے۔''

''حافظ صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے، مگر ان کا یہ فقرہ مجھے خوب یاد ہے ''من گئے، من گئے۔''

جس انداز سے فرمایا۔ جب وہ الفاظ یاد آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حافظ صاحب میرے پاس بیٹھے ہوئے فرما رہے ہیں۔ اب ان کا دارالعلوم ان کی یاد تازہ کیے ہوئے ہے۔

"بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ کھلا ذہن، غیر متعصب اور مہمان نوازی ان پر ختم تھی۔"

شکوہ اور دعوت

حافظ عبدالغفور جہلمی سے میری آخری ملاقات مال روڈ پر ٹولنٹن مارکیٹ میں ہوئی۔ میں صبح نو بجے کے قریب اپنے اس زمانے کے دفتر (ادارہ ثقافت اسلامیہ) جارہا تھا کہ ٹولنٹن مارکیٹ میں عربی کے دو تین رسالے لینے کے لیے اخبار فروش کی دکان پر رکا۔ اخبار خرید کر چند قدم آگے بڑھا تو دیکھا کہ مجھے دیکھ کر حافظ عبدالغفور کار سے اتر رہے ہیں۔ حسب عادت اور حسب معمول نہایت تپاک سے ملے۔ وہی خندہ روئی، وہی آنکھوں کی چمک اور وہی لہجہ، جس سے ہم برسوں سے آشنا تھے۔ ان کے ساتھ ایک اور نوجوان تھے۔ لیکن اب اس نوجوان کا ناک نقشہ ذہن میں نہیں رہا۔ دوست کو دیکھ کر خوش ہونا اور ایک خاص انداز سے ہنسنا ان کی فطرت میں داخل تھا، جسے ہم ان کے خلوص اور دلی محبت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

خیر وعافیت اور تصنیف وتالیف سے متعلق پوچھ کر، ہنستے ہوئے شکوے کے انداز میں کہا کہ آپ سے اتنا پرانا تعلق ہے کہ اس کے ماہ وسال کا حساب لگانا مشکل ہے، لیکن آپ نے میرے پاس جہلم آنے اور میرا قائم کردہ تعلیمی ادارہ جامعہ علومِ اثریہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ کیا آپ مجھے بھول گئے ہیں یا مجھ سے کچھ ناراضی ہے؟

میں نے کہا: نہ میں آپ کو بھولا ہوں، نہ آپ سے کسی معاملے میں ناراض ہوں۔ میں آپ سے بہت خوش ہوں، دوستوں سے آپ کے تعلیمی ادارے کے بارے میں بھی بہت کچھ معلوم ہوا ہے اور آپ کی تدریسی سرگرمیوں سے متعلق بھی بہت کچھ سننے میں آیا ہے۔ لیکن یہ میری سستی ہے کہ میں حاضر نہیں ہو سکا۔

اس سے چند روز پیشتر مجھے ایک دوست نے بتایا تھا کہ وہ کسی سلسلے میں حافظ صاحب کے پاس گئے تھے اور انھوں نے ان کی بہت خدمت کی تھی، کسی معاملے میں کچھ مالی تعاون بھی کیا تھا۔ میں نے حافظ صاحب سے ہنستے ہوئے عرض کیا کہ مجھے معلوم ہوا ہے آپ اپنے پاس آنے والوں سے اتنا اچھا سلوک کرتے ہیں کہ اس کے ذہن وفکر میں بھی نہیں ہوتا۔ میں بھی آپ کے پاس آؤں گا اور دیکھوں گا کہ آپ مجھ سے کیا برتاؤ کرتے ہیں۔ میں نے اس دوست کا نام نہیں لیا تھا، لیکن وہ فوراً سمجھ گئے اور فرمایا تم آؤ تو سہی تمھارے ساتھ اس سے زیادہ اچھا سلوک ہوگا۔

اس کے بعد وہ ایک دم خاموش ہوگئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو تیرنے لگے۔ فرمایا: اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ بہت اچھا ادارہ بن گیا ہے۔ کئی استاد سیکڑوں طلبا کو تعلیم دیتے ہیں اور میں ان کا خدمت گزار ہوں۔ تم ایک مرتبہ ضرور آ کر دیکھو۔ لیکن افسوس ہے میں خواہش کے باوجود ان کی زندگی میں حاضر نہ ہوسکا۔

لاہور کے رہنے والے میرے ایک دوست جہلم میں سیشن جج تھے۔ انھوں نے اور ان کی بیگم نے بھی مجھے کئی دفعہ بتایا کہ وہاں اہل حدیث کا بہت بڑا تدریسی ادارہ ہے اور شان دار مسجد ہے، ہم لوگ نماز جمعہ وہیں پڑھتے ہیں۔ تم وہاں آؤ، ہمارے پاس رہو اور وہ ادارہ دیکھو۔ لیکن اسے سوئے اتفاق کہیے کہ میں جہلم نہ جاسکا۔

حافظ صاحب کے وہاں جانے سے قبل مولانا عبدالمجید دینا نگری کے زمانے میں تو کئی بار وہاں گیا۔ ایک مرتبہ میں اور مولانا محمد حنیف ندوی دونوں گئے۔ لیکن افسوس ہے حافظ عبدالغفور کی تشریف روی کے بعد جہلم جانے کا موقع میسر نہ آیا۔ انھوں نے مجھے حاضری کی دعوت بھی دی اور دوستانہ شکوہ بھی کیا۔ مگر میری سستی آڑے آئی اور جہلم جا کر ان سے ملنا نصیب نہ ہوا۔

وفات

دن رات کی سخت محنت اور بھاگ دوڑ نے ان کی صحت پر اثر ڈالا اور وہ بیمار ہوگئے اور پھر ایک بیماری نے کئی بیماریوں کو جنم دیا۔ کچھ عرصہ تو انھوں نے بیماری کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ بالآخر بیماریوں کا ہجوم غالب آیا اور وہ نڈھال ہو کر چارپائی پر گر گئے۔ بہت علاج کرائے لیکن ”مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی“ والی کیفیت ہوگئی۔ ملٹری ہسپتال راولپنڈی میں داخلے تک نوبت پہنچی۔ وہ ضیاء الحق کا زمانۂ حکمرانی تھا۔ ضیاء الحق سے براہِ راست امام کعبۃ اللہ شیخ محمد بن عبداللہ سبیّل نے رابطہ کرکے تاکید کی کہ حافظ عبدالغفور کا علاج ماہر ڈاکٹروں سے کرایا جائے۔ چناں چہ ضیاء الحق نے ڈاکٹروں سے کہا لیکن وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔

۱۵۔ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو ڈاکٹروں نے ان کے وارثوں کو انھیں واپس جہلم لے جانے کا مشورہ دیا۔ یہ ڈاکٹروں کی طرف سے علاج کے سلسلے میں مایوسی کا اظہار تھا۔ اسی دن انھیں جہلم لایا گیا۔ رات کو قدرے سکون رہا۔ لیکن یہ سکون عارضی تھا۔ بالآخر وقت مقرر آ پہنچا۔ ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۸۶ء (۳۔صفر ۱۴۰۷ھ) کو جمعرات کے دن شام کے وقت ان کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون دوسرے دن ۱۷۔ اکتوبر کو جمعۃ المبارک کے بعد ان کا جنازہ اٹھایا گیا۔ ہر مکتب فکر کے بے

شمار عوام وخواص اور علما وزعما نے جنازے میں شرکت کی۔ اسلام آباد سے سعودی عرب، عراق، کویت اور متحدہ عرب امارات کے سفارتی نمائندے جہلم آئے اور جنازے میں شریک ہوئے۔ امام کعبہ اور دیگر حضرات نے تعزیت کے پیغامات ارسال کیے۔ ضیاء الحق کا تعزیتی خط حافظ صاحب کے بڑے صاحب زادے مولانا محمد مدنی کے نام آیا۔

حافظ عبدالغفور ۱۹۶۲ء میں جہلم گئے تھے۔ انھوں نے اکتوبر ۱۹۸۶ء تک چوبیس برس وہاں خدمات سرانجام دیں اور اس شہر میں بہت بڑا تدریسی ادارہ اور متعدد چھوٹے تعلیمی ادارے قائم کرکے وہ اس دنیاے فانی سے رخصت ہوگئے۔

اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه .

اولاد

وفات کے وقت حافظ صاحب مرحوم کی اولاد پانچ بیٹے تھے اور ایک بیٹی۔ تمام بچے علم کی نعمت سے آراستہ، ماں باپ کے فرماں بردار، فرض شناس اور دینی ودنیوی ذمہ داریوں کو خوب سمجھنے والے اور ان پر عامل۔ مندرجہ ذیل سطور میں اس کی کچھ تفصیل ملاحظہ ہو۔

① ...... **مولانا محمد مدنی:** یہ حافظ صاحب کے سب سے بڑے بیٹے تھے جو ۵۔ جنوری ۱۹۴۶ء کو اپنے آبائی مسکن بستی اٹھوال جاگیر نزد فتح پور (ضلع اوکاڑہ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی۔ اس کے بعد جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن، جامعہ سلفیہ فیصل آباد، ادارہ علومِ اثریہ فیصل آباد، جامعہ شرعیہ (مدینۃ العلم) گوجراں والا اور دیگر مدارس سے تعلیم حاصل کی۔ جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) سے سند فراغت لی۔ ''مدنی'' کی نسبت سے انھیں اس لیے یاد کیا جاتا ہے کہ وہ گوجراں والا کے ایک تدریسی ادارے مدینۃ العلم میں تحصیل علم کرتے رہے تھے۔

مولانا محمد مدنی تیز فہم اور ذہین طالب علم تھے۔ ان کے پاکستانی اساتذہ کی فہرست میں ان کے والد کے علاوہ حضرت حافظ محمد گوندلوی، مولانا عبداللہ لائل پوری، مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی اور دیگر بہت سے ممتاز علماے کرام شامل ہیں۔ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں بھی انھوں نے مختلف اسلامی ملکوں کے اصحابِ علم سے حصولِ فیض کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (عربی) کی ڈگری حاصل کی۔

قیام مدینہ منورہ کے زمانے میں وہ مسجد نبوی میں وعظ ونصیحت کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ حج کے مواقع پر بھی مختلف مقامات پر ان کا سلسلہ تقریر جاری رہتا تھا۔ وہ ہمہ وقتی مبلغ تھے۔ انھیں تبلیغ

کا شوق بھی تھا اور کلمہ حق بلند کرنے اور لوگوں کو احکامِ خداوندی سے آشنا کرنے کا جذبہ بھی ان کے اندر پایا جاتا تھا۔

وہ عربی اور اردو کے بہت اچھے خطیب، بہت اچھے مناظر اور بہت اچھے مدرس تھے۔ علاوہ ازیں بہت اچھے منتظم بھی تھے۔ اپنے والد ذی قدر کی وفات کے بعد انھیں جامعہ علوم اثریہ کے مہتمم وناظم مقرر کیا گیا تھا۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری کا کام تھا جو ان کے سپرد کیا گیا۔ انھوں نے نہایت محنت سے اس کی رفتار کو آگے بڑھایا اور کئی نئے شعبے قائم کیے۔ پھر افادۂ عوام کے لیے رفاہی سلسلے کو بھی ترقی دینے کی سعی کی۔ مختلف مقامات میں مسجدیں تعمیر کرائیں۔ تصنیف وتالیف اور مقالہ نگاری کے میدان میں قلم کے جوہر دکھائے۔ رسالہ ''حرمین'' جاری کیا، جسے علمی، تحقیقی اور سیاسی مباحث کا مجموعہ قرار دینا چاہیے۔

انھوں نے متعدد اسلامی اور غیر اسلامی ملکوں کے تبلیغی دورے کیے اور بہت سے اجتماعات میں مؤثر تقریریں کیں۔

انتظام وانصرام اور تبلیغ دین اور ترویج کتاب وسنت میں وہ والد محترم کے نقش قدم پر چلے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جو کام والدِ محترم اپنی بیماری یا کسی اور وجہ سے مکمل نہیں کر پائے تھے، مولانا محمد مدنی نے ان کاموں کی تکمیل کا عزم کیا اور اس میں اللہ نے ان کو کامیابی عطا فرمائی۔

افسوس ہے موت نے ان کو مہلت نہ دی، ورنہ ان کے ارادے بہت بلند تھے۔ وہ بڑے عزم وہمت کے عالم دین تھے۔ عمر کی زیادہ منزلیں طے نہیں کی تھیں کہ بعض خطرناک بیماریاں ان پر حملہ آور ہوگئیں۔

وہ لاہور کے جناح ہسپتال میں داخل تھے۔ میں اور حافظ احمد شاکر ۱۸۔ فروری ۲۰۰۲ء کو تین بجے کے قریب ان کی عیادت کے لیے ہسپتال پہنچے تو ان کی میت ہسپتال کے صحن میں ایمبولینس میں رکھی جارہی تھی۔ دوسرے دن ۱۹۔ فروری کو جنازہ تھا۔ میں اور حافظ احمد شاکر جہلم جا کر جنازے میں شامل ہوئے۔ جہلم شہر اور اس علاقے کے علاوہ مختلف مقامات کے بے شمار لوگ جنازے میں شریک تھے۔ مرحوم نے صرف ۵۶ برس عمر پائی۔

مولانا مرحوم جامعہ علوم اثریہ میں سعودی عرب کی طرف سے بہ طور مبعوث خدمات انجام دیتے تھے۔

اللھم اکرم نزلہ ووسع مدخلہ وادخلہ جنت الفردوس.

②...... **قاری عبدالرشید**: حافظ عبدالغفور جہلمی کے دوسرے بیٹے کا نام قاری عبدالرشید ہے۔ انھوں نے جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن اور جامعہ اسلامیہ گوجراں والا میں تحصیل علم کی۔ جامعہ

علوم اثریہ (جہلم) کے انتظامی معاملات سے خاص طور پر دلچسپی رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے اور انھیں کتاب وسنت کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

③...... **حافظ عبدالحمید عامر:** حافظ عبدالغفور جہلمی مرحوم ومغفور کے تیسرے فرزند گرامی حافظ عبدالحمید عامر ہیں۔ مدینہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں۔ بڑے بھائی کی وفات کے بعد جامعہ علوم اثریہ کے تمام شعبوں کے انتظامی امور کی نگرانی کا بوجھ ان کے کندھوں پر ہے۔ یہ جامعہ کے مدیر اور مہتمم ہیں۔ اساتذہ کے ساتھ معاملات، طلبا کی دیکھ بھال، تعلیمی امور، امتحانات کا سلسلہ، مختلف مواقع پر اجتماعات کا انعقاد، ماہنامہ ''حرمین'' کی ادارت، خرچ اخراجات کے انتظامات، کتب خانے کا انصرام وغیرہ تمام امور بہ حیثیت مدیر جامعہ حافظ عبدالحمید عامر کے سپرد ہیں۔ مجھے پہلی مرتبہ جامعہ کی عمارت میں جانے اور اس کے مختلف شعبوں سے باخبر ہونے کا موقع انھی کے زمانۂ اہتمام میں ملا۔ نہ اس کے بانی حافظ عبدالغفور کے عہد میں حاضر ہوسکا اور نہ مولانا محمد مدنی کے دور میں وہاں جانا نصیب ہوا۔ حافظ عبدالحمید عامر نے بذریعہ ٹیلی فون دعوت دی تو کوئی عذر یا بہانا ذہن میں نہ آیا اور حاضر ہوگیا۔ اس موقعے پر اثریہ ہسپتال بھی دیکھا، کتب خانہ بھی دیکھا، طلبا کا دار الاقامہ بھی دیکھا، لڑکیوں کا مدرسہ بھی دیکھا، مہمان خانہ بھی دیکھا، مسجد بھی دیکھی۔ پرانی مسجد میں بھی گیا۔ ماشاء اللہ بہت اچھا انتظام ہے، بہت بڑا دارالعلوم ہے۔ اساتذہ، طلبا اور دیگر حضرات سے مل کر نہایت مسرت ہوئی۔ اتنے بڑے ادارے کا انتظام اور اس کی دیکھ بھال بڑی ہمت کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ حافظ عبدالحمید عامر اور ان کے رفقائے کار کو صحت وعافیت سے رکھے، وہ نہایت مستعدی سے یہ خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ سعودی عرب کی طرف سے حافظ عبدالحمید عامر کی حیثیت مبعوث کی ہے۔ وہ عربی اور اردو میں مہارت رکھتے ہیں اور دونوں زبانوں میں تحریر وخطابت کی صورت میں اپنے نقطہ نظر کا آسانی سے اظہار کرسکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ان پر بہت بڑا احسان ہے وہ قرآن کا درس بھی دیتے ہیں، جمعہ بھی پڑھاتے ہیں اور اپنے مرحوم والد کی طرح لوگوں سے میل جول بھی رکھتے ہیں۔

④...... **حافظ احمد:** یہ حافظ عبدالغفور کے چوتھے فرزند دلبند ہیں۔ جامعہ اسلامیہ گوجراں والا میں تعلیم پائی اور وہیں سے سند فراغت لی۔ جامعہ علوم اثریہ میں خدمت تدریس پر مامور ہیں اور حسن وخوبی کے ساتھ یہ اہم فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

⑤...... **حافظ عبدالرؤف:** صالح باپ کے صالح بیٹے حافظ عبدالرؤف جامعہ اثریہ للبنات کے دفتری امور انجام دیتے ہیں۔ ان کی اہلیہ درس نظامیہ کی سند یافتہ ہیں اور وہ جامعہ کی طالبات کی نگران ہیں۔

⑥...... حافظ عبدالغفور صاحب کی ایک ہی بیٹی ہیں جو درس نظامیہ کی تکمیل کر چکی ہیں اور جامعہ اثریہ للبنات میں تدریسی خدمت سرانجام دیتی ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ حافظ عبدالغفور جہلمی اور مولانا محمد مدنی کی مغفرت فرمائے اور ان کے پسماندگان کو کتاب وسنت کی خدمت کے زیادہ سے زیادہ مواقع عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔



مولانا عبدالغفار ضامرانی

ضامران کا علاقہ کم وبیش تین سو کلگوں پر مشتمل ایک پہاڑی علاقہ ہے۔ اس کے شمال اور مغرب میں ایرانی بلوچستان واقع ہے جسے بم پشت، صلامی کوہ، ہنگ، مورتان، سرباز وغیرہ کہا جاتا ہے۔ مشرق کی طرف پروم اور پنجگور ہیں۔ جنوب کی طرف بلیدہ اور عاصمۂ مکران کا علاقہ ہے۔ اور ساحل مکران گوادر، پسنی اور ماڑہ ہے۔ یہ علاقہ نہ زیادہ سرد ہے اور نہ زیادہ گرم۔ معتدل آب وہوا کا علاقہ ہے۔ اسی لیے اس علاقے میں سردی اور گرمی دونوں قسم کی کاشت ہوتی ہے۔ مثلاً چاول، کھجور، آم، انگور، انار، سیب وغیرہ میوہ جات۔ اس کا پانی ندیوں اور چشموں کا ہے۔

مولانا عبدالغفار کا تعلق اسی ضامران سے ہے اور وہ ضامرانی کہلاتے تھے۔ بلوچوں کے بعض قبائل یعنی رند، آسکانی اور ہوت وغیرہ اسی نواح سے تعلق رکھتے ہیں۔ بلوچستان کے علاقہ ضامران کے لوگ بھائی چارگی، باہمی تعاون، امانت داری، حق گوئی میں بے مثال سمجھے جاتے ہیں۔ زبان کے اتنے پکے جو بات کہہ دی اس پر پورا اترتے ہیں۔ خود داری، جفاکشی، مہمان نوازی، بہادری اور دوسروں کی عزت واحترام کی حفاظت میں مشہور ہیں۔

مولانا عبدالغفار ضامرانی کی ولادت کے زمانے میں اس علاقے میں بچے کی تاریخ پیدائش کے اندراج کا زیادہ رواج نہیں تھا۔ ولادت کا انتساب علاقے میں رونما ہونے والے کسی بڑے واقعہ یا حادثے کی طرف کیا جاتا تھا۔ مثلاً فلاں شخص اس وقت پیدا ہوا تھا جب غمی یا خوشی کا فلاں واقعہ پیش آیا تھا۔ علاقے میں فلاں بیماری پھیلی تھی یا فلاں حادثہ ہوا تھا۔ کچھ اسی قسم کی تاریخ تھی اور اسی قسم کا کیلنڈر۔ اب بھی اس نواح کے بعض علاقوں میں یہی سلسلہ چلتا ہے۔ اسی لیے مولانا عبدالغفار ضامرانی کی تاریخ ولادت کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ البتہ ان کی اسناد پر تاریخ پیدائش ۱۳۵۲ھ لکھی ہے۔ جو (۳۲۔۱۹۳۳ء بنتی ہے) وہ ضامران کے مشہور علاقے ''شومزار'' میں پیدا ہوئے۔

عبدالغفار ضامرانی کا خاندان

مولانا عبدالغفار ضامرانی کے حالات بیان کرنے سے پہلے چند الفاظ میں ان کا خاندانی پس منظر بیان کرنا ضروری ہے۔ مولانا عبدالغفار کے والد کا نام کہدا دمحمد اور دادا کا کہدا گمانی تھا۔ مولانا

عبدالغفار والد کی طرف سے آسکانی ڈگارانی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ عالی ڈگار کی اولاد ہیں جو کہ رند قبیلے کی ایک شاخ ہے۔

یہ قبیلہ زیادہ تر زیارت، کوچی، صلاحی کوہ، سرباز، ہنگ اور مورتان کے پہاڑی علاقوں میں آباد ہے۔ ان میں سے بعض علاقے ایرانی بلوچستان میں اور بعض ایرانی حدود سے متصل ضامران میں واقع ہیں۔

ضامران میں سورگ، بگان، سیاہ گیسی کے کچھ حصے میں یہ قبیلہ آباد ہے۔ مولانا ممدوح کے نانا بھی آسکانی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ نانی کا تعلق شنبے زئی خاندان سے تھا، جن کی بابت علامہ نور محمد ضامرانی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ یہ بزنجو قبیلے کی ایک شاخ ہے۔ بعض لوگ ان کا تعلق بروہی قبائل سے جوڑتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

مولانا عبدالغفار کے دادا ''کہدا گمانی'' ضامران کے معروف شخص تھے۔ پورے بلوچستان بالخصوص مکران میں ان کا شہرہ تھا۔ وہ بہت سی خوبیوں کے حامل اور ہر دلعزیز شخصیت کے مالک تھے۔ مہمان نواز اور نہایت دلیر۔ ان کی بہادری کے کئی قصے پورے مکران میں مشہور ہیں۔ بہادری کے علاوہ متحمل مزاج اور شریف الطبع تھے۔

ایک مرتبہ اپنے کھیت کو جارہے تھے، جب قریب پہنچے تو دیکھا کہ ایک چور وہاں چوری کررہا ہے۔ اسے دیکھتے ہی چھپ گئے تاکہ چور انھیں دیکھ کر شرمندہ نہ ہو۔ اس وقت تک وہاں چھپے رہے جب تک چور اپنا کام کر کے چلا نہیں گیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ وہ نہایت پرہیز گار اور موحد تھے۔ عالم نہ ہونے کے باوجود صورت وسیرت سے عالم معلوم ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ علما سے انھیں والہانہ محبت تھی۔ ایک بزرگ مولانا نور محمد ضامرانی تھے۔ وہ تقریباً بیس سال اپنے علاقے سے باہر ہندوستان میں رہے۔ جب واپس آئے تو کہدا گمانی نے اپنے علاقے سورگ میں ایک مسجد تعمیر کرائی جس کا انھیں امام مقرر کیا۔ تین سال وہ یہاں امامت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب مولانا نور محمد ضامرانی کی والدہ وفات پا گئیں تو ان کے والد نے اپنی زرعی زمین کہدا گمانی اور میر مراد خان کو فروخت کردی تھی لیکن جب مولانا نور محمد کے ضامران واپس آنے کے بعد ان کی شادی کی بات چلی تو وہ زمین جو ان لوگوں نے مولانا کے والد سے خریدی تھی ان کو دے دی تاکہ ان کی شادی کا بندوبست ہو سکے۔

مولانا عبدالغفار کے دادا کہدا گمانی کی وفات کے بعد ان کے قبیلے کا سردار مولانا کے والد کہدا داد محمد کو بنایا گیا۔ وہ بھی باپ کی طرح حلیم الطبع، لوگوں کے خیر خواہ، غریبوں کے معاون اور ہم

درد تھے۔ علاوہ ازیں نہایت نیک، تہجد گزار اور نماز باجماعت کے پابند تھے۔ جس رات ان کی وفات ہوئی اس رات بھی تہجد کی نماز پڑھی۔ مولانا کی والدہ بھی بے حد صالحہ اور مہمان نواز خاتون تھیں۔ اس کی دو مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

① ...... ایک مرتبہ وہ گھر میں اکیلی تھیں، صرف ایک ملازمہ ان کے پاس تھیں۔ گھر میں کوئی مرد نہ تھا۔ اتنے میں ایران کے کسی مقام سے اچھی خاصی تعداد میں مہمان آگئے۔ مہمانوں کو جب پتا چلا کہ گھر میں کوئی مرد نہیں ہے تو وہ گھر سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گئے۔ مہمانوں کی آمد اور ان کے قیام کا علم مولانا کی والدہ کو ہوا تو انھوں نے ملازمہ کو اپنے چرواہے کے پاس بھیجا کہ اسے کہو وہ مہمانوں کی تعداد کے مطابق دو یا چار بکریاں ذبح کرکے لائے۔ چناں چہ تھوڑی دیر میں گوشت آگیا اور ملازمہ کی مدد سے کھانا تیار کرکے مہمانوں کو بھیجا گیا۔ شام کو جب مولانا کے والد کہدا داد محمد گھر آئے تو انھیں اس واقعہ کا علم ہوا اور مہمانوں نے مہمان نوازی پر ان کا بے حد شکر ادا کیا اور متعجب ہوئے کہ تنہا ایک عورت نے اتنے مہمانوں کی مہمان نوازی کی۔

② ...... ایک مرتبہ ان کے علاقے میں قحط پڑ گیا اور کھانے پینے کی چیزوں کا حصول بہت مشکل ہوگیا۔ اسی اثنا میں ایک دفعہ رات کے وقت مہمان آگئے۔ بچوں کے لیے جو تھوڑی بہت روٹی پکائی گئی تھی، مولانا کی والدہ نے وہ روٹی مہمانوں کو پیش کی اور بچوں کو کھانے کے لیے ایک خشک سبزی دی جسے مکران کے علاقے میں ''دمش'' کہا جاتا ہے۔ بچوں سے کہا کہ تم یہ سبزی اس طرح منھ ہلا کر اور چبا کر کھاؤ جیسے روٹی کھائی جاتی ہے تاکہ مہمان یہ سمجھیں کہ تم روٹی کھا رہے ہو۔ رات کا اندھیرا تھا، بچے ماں کی ہدایت کے مطابق اسی طرح منھ ہلاتے رہے۔

تعلیم وتربیت

اسی زمانے میں علامہ نور محمد ضامرانی ہندوستان سے علم حاصل کرنے کے بعد ضامران واپس آئے اور عبدالغفار ضامرانی کے گھر ان کی آمد ورفت ہونے لگی۔ وہ کئی کئی دن یہاں ٹھہرتے تھے۔ یہیں سے اس گھرانے کا علم سے تعلق پیدا ہوا اور عبدالغفار ضامرانی ان کے حلقۂ شاگردی میں آئے۔ ان کی والدہ بتاتی ہیں کہ جب میرے بیٹے نے علامہ نور محمد سے پڑھنا شروع کیا، اس وقت اس کی عمر پانچ سال کی تھی۔ گویا انھوں نے پڑھائی کی ابتدا پانچ سال کی عمر میں کی۔ چوں کہ علامہ نور محمد کی رہائش ان کے سسرال کے ہاں تھی، اس لیے وہ مسلسل ان سے تعلیم حاصل نہ کرسکے۔ جب وہ آتے تو ان سے استفادہ کرتے۔ باقاعدہ قرآنِ مجید ناظرہ اپنی خالہ سے پڑھا۔ ان کی خالہ نے قرآن کا اکثر حصہ علامہ نور محمد سے پڑھا تھا۔

مولانا عبدالغفار ضامرانی بچپن کی پڑھائی کے زمانے میں اپنے گھر کی بھیڑ بکریاں چراتے تھے۔ صبح سویرے خالہ سے قرآنِ مجید ناظرہ کا درس لے کر دن کو یاد کرتے، پھر رات کو عشا کے بعد لکڑیاں جلا کر ان کی روشنی میں درس لیتے۔ اس طرح قرآنِ مجید ناظرہ مکمل ہوا۔ نو یا دس سال کی عمر میں انھیں علم دین حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس زمانے میں ان کے ہاں بلیدہ کے ایک مولوی عبدالغفور کہدانی آکر وعظ کہا کرتے تھے۔ وہ ان کا وعظ بڑے شوق سے سنتے تھے۔ اس شوق کا یہ اثر ہوا کہ ایک بار انھوں نے اور مولوی عبدالمجید اور عبدالجبار نے جو ان کے ساتھ بکریاں چرایا کرتے تھے، آپس میں مشورہ کیا کہ ہمیں پڑھائی کے لیے علاقہ سندھ میں جانا چاہیے۔ چناں چہ ایک دن بغیر بتائے تینوں گھر سے بھاگ نکلے اور پروم کے علاقے تک آئے۔ لیکن ان کا ایک ساتھی عبدالجبار وہاں سخت بیمار پڑ گیا، جس کی وجہ سے انھیں واپس گھر آنا پڑا۔ کچھ دنوں کے بعد عبدالغفار پھر گھر سے بھاگ کر تربت جا پہنچے۔ اس وقت علامہ نور محمد ضامرانی تربت کے منصب قضا پر فائز تھے۔ عبدالغفار اُن کے پاس آئے اور عرض کیا کہ میں پڑھنے کے لیے آیا ہوں۔ چوں کہ وہ قاضی تھے اس لیے باقاعدہ پڑھانے کا انھیں وقت نہیں ملتا تھا۔ انھوں نے عبدالغفار کو ملا سعید نامی ایک عالم کے پاس بھیجا اور انھیں حکم دیا کہ وہ اس لڑکے کو باقاعدہ پڑھائیں۔

چناں چہ ملا سعید سے انھوں نے چند کتابیں پڑھیں۔ اسی دوران ان کے والد صاحب ان کی تلاش میں تربت آئے اور مولانا محمد حیات اور نور محمد ضامرانی سے ان کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ وہ ملا سعید شاہی تمپ والے کے پاس پڑھ رہے ہیں۔ وہ یہاں تشریف لائے اور بیٹے سے فرمانے لگے کہ کیا سچ مچ تمھارا پڑھنے کا ارادہ ہے؟ انھوں نے عرض کیا ہاں یہی ارادہ ہے۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور واپس ضامران چلے گئے۔ چند مہینے انھوں نے ملا سعید کے ہاں گزارے، پھر دوبارہ علامہ نور محمد کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مجھے اپنے پاس ہی رکھیں۔ یاد رہے کہ تربت میں ایک اور مولانا نور محمد رہا کرتے تھے۔ موجودہ جامع مسجد کے مشرقی جانب ان کا ایک مدرسہ تھا۔ وہاں اسکول کے نصاب کے مطابق پڑھایا جاتا تھا۔ مولانا نور محمد نے عبدالغفار کو اس مدرسے میں داخل کرا دیا۔

تقریباً دو سال کا عرصہ عبدالغفار نے وہاں گزارا اور ساتھ ساتھ علامہ نور محمد ضامرانی سے بھی استفادہ کرتے رہے۔ پھر چھٹیوں میں ضامران چلے گئے اور چھٹیوں کے بعد اپنے قریبی عزیز خداداد صاحب کے ساتھ دوبارہ تربت کو روانہ ہوئے۔ راستے میں ان کے ساتھی نے مشورہ دیا کہ عربستان جا کر پڑھنا چاہیے۔ وہاں پڑھائی بھی یہاں کی نسبت بہتر ہے اور ان کے چچا رستم بھی وہیں ہیں۔ انھوں نے عبدالغفار کا کرایہ بھی اپنی جیب سے ادا کرنے کی پیش کش کی۔ یہ وہاں جانے کے لیے

تیار ہوگئے۔

عربستان کا پہلا سفر

۱۹۵۱ء میں یہ لوگ عربستان کو روانہ ہوئے۔ مسقط جانے کے لیے گوادر سے کشتی پر سوار ہوئے۔ وہ گرمیوں کا موسم تھا۔ سفر کا آغاز کیے چند لمحے ہوئے تھے کہ سمندر کی موجوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا اور ان کی طرف بڑھنے لگیں۔ موجیں اتنی بلند تھیں کہ ان کی کشتی ڈولنے لگی۔ کشتی کے سواروں میں چند پنجابی اور سندھی لوگ بھی تھے جو حج کے ارادے سے عربستان جا رہے تھے۔ یہ لوگ مصیبت کی اس گھڑی میں قلندروں اور بزرگوں کو پکارنے لگے۔ عبدالغفار کے ساتھی کہنے لگے کہ ان لوگوں کا ایسے لمحات میں غیر اللہ کو مدد کے لیے پکارنا ہمارے غرق ہونے کے لیے کافی ہے۔ نام کے یہ مسلمان تو مکے کے ان مشرکوں کو بھی مات کر چکے ہیں جو مصیبت کے وقت اللہ وحدہٗ لاشریک کو پکارا کرتے تھے۔ ان لوگوں کا حج بھی ہماری سمجھ سے بالا تھا۔

تمام دن یہ لوگ سمندری موجوں کے تھپیڑوں کی زد میں رہے اور اپنے مالک حقیقی کا نام پکارتے رہے۔ پھر اللہ کے فضل وکرم سے مسقط کے ساحل کو جا لگے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے سربہ سجود ہوگئے۔

عبدالغفار اور ان کے ساتھی یہاں فوج میں بھرتی ہوگئے۔ اس وقت عبدالغفار کی عمر سولہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ تین چار مہینے فوج میں رہے۔ پھر ایک فوجی افسر سے چپقلش ہوگئی تو فوج سے نکال دیے گئے۔ فوج سے نکل جانا ان کے لیے بہتر ثابت ہوا۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان سے دین کا کام لینا چاہتا تھا۔ مسقط سے واپس گوادر آگئے۔

پاکستان واپسی: مسلک محدثین سے محبت

گوادر سے اپنے گھر جانے کے بجائے عبدالغفار لسبیلہ چلے گئے۔ یہاں ایک بلوچ قاضی تھے، جن کا نام بشیر احمد تھا۔ عبدالغفار نے ان سے بوستانِ سعدی اور کچھ اور کتابیں پڑھیں۔ پھر کراچی آگئے اور وہاں مدرسہ احرار الاسلام میں پڑھنا شروع کیا۔ اس مدرسے کے مہتمم کراچی کے معروف بلوچ عالم دین مولوی محمد عمر تھے۔ دو سال یہاں پڑھنے کے بعد جام صادق آباد گئے۔ وہاں ایک مدرسے میں داخل ہوگئے۔ پھر ٹنڈو اللہ یار کے ایک مدرسے میں کچھ مدت پڑھا۔ اس دوران ان مدارس میں مولانا عبدالغفار نے مندرجہ ذیل درسی کتابیں پڑھیں۔

قدوری، نور الایضاح، ارشاد الصرف، مفید الطالبین، کنز الدقائق، کافیہ، اصولِ شاشی، شرح تہذیب وغیرہ۔ کافیہ تو اتنا ازبر ہوگیا کہ استاد صاحب نے طلبا کو کافیہ پڑھانے کی ذمہ داری انہی

کے سپر کردی۔ چناں چہ یہ کافیہ پڑھانے لگے۔ چھٹیاں ہوئیں تو حیدر آباد آ گئے۔ یہاں آسکانی خاندان کے ایک فرد محمد موسیٰ ایرانی امام مسجد تھے۔ اتفاقاً وہ بیمار ہوگئے تو مولانا عبدالغفار کو ان کی جگہ امام مقرر کردیا گیا۔ اس دوران ایک نمازی نے ان کو ایک کتاب ''جاء الحق وزہق الباطل'' (تصنیف مفتی احمد یار خان گجراتی بریلوی) پڑھنے کو دی۔ یہ اس وقت حنفی تھے اور صرف نمازیں پڑھاتے تھے۔ باقی تمام دن اس کتاب کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ مطالعے کے دوران یہ بات بخوبی سمجھ میں آ گئی کہ اس کتاب میں قرآن وحدیث کی من مانی تاویلیں کی گئی ہیں۔ چناں چہ یہ ان باتوں پر گہرائی سے غور کرنے لگے۔ آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سب تقلید شخصی کے کارنامے ہیں۔ اس کے بعد مسلک محدثین کے قریب ہونے کا موقع ملا۔ جب مسلک محدثین کے متعلق تحقیق کی تو پتا یہ چلا کہ یہ وہ مسلک ہے جو پاکستان میں اہل حدیث، خلیج کے عرب ممالک میں سلفی اور مصر اور سوڈان میں انصار السنہ کے نام سے موسوم ہے۔

یوں یہ کتاب اپنے نام کی نسبت سے مولانا عبدالغفار کے لیے ''جاء الحق وزہق الباطل'' ثابت ہوئی اور وہ اہل حدیث ہوگئے۔

مسلک اہل حدیث قبول کرنے کے بعد اپنے والد صاحب کے نام خط لکھا تو اس میں اپنا نام اس طرح تحریر کیا ''عبدالغفار ضامرانی اہل حدیث۔''

والد صاحب اس خط سے پریشان ہوگئے اور فکر مند ہوئے کہ پتا نہیں اہل حدیث کیا ہوتا ہے۔ کہیں میرا بیٹا گم راہ تو نہیں ہوگیا ہے؟ چناں چہ وہ یہ خط لے کر علامہ نور محمد ضامرانی کے پاس گئے اور انھیں ''اہل حدیث'' لفظ کے متعلق پوچھا تو علامہ نور محمد صاحب نے کہا خوش ہوجاؤ تمھارے بیٹے نے جو مسلک اختیار کیا ہے وہ تمام مسالک سے بہتر ہے۔

اہل حدیث مسلک اختیار کرنے کے بعد مولانا عبدالغفار ضامرانی نے کراچی کے کسی اہل حدیث مدرسے میں پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن مشکل یہ بنی کہ انھیں کراچی میں کسی اہل حدیث مدرسے کا پتا نہ تھا۔ وہ حیدرآباد میں بعض اہل حدیث احباب سے ملے تو ان لوگوں نے انھیں مدرسہ دارالسلام برنس روڈ کا پتا دیا، چناں چہ مولانا ضامرانی کراچی چلے گئے اور اس مدرسے میں پڑھنے لگے۔

مولانا ضامرانی کو یہاں مولانا عبدالستار دہلوی اور کچھ دیگر علمائے کرام سے کسب فیض کا موقع ملا۔ پھر کچھ مدت بعد یہاں سے اپنے گاؤں منتقل ہوگئے۔ مولانا ضامرانی جب گھر سے نکلے تھے تو اُس وقت ان کے چہرے پر داڑھی نہ تھی اور چھوٹی عمر کے تھے یعنی سولہ سترہ برس کی عمر تھی۔ لیکن جب علومِ دینیہ حاصل کرکے اپنے گھر لوٹے تو ان کے چہرے پر سنت رسول (ریش مبارک) نمایاں تھی۔

مولانا ضامرانی کے گھر والوں نے جب انھیں گھر میں دیکھا تو انھیں پہچاننے میں دقت محسوس ہوئی۔ مولانا ضامرانی ایک چٹائی پر اپنے گھر سے باہر ہی بیٹھ گئے۔ ان کے والد صاحب نے مولانا ضامرانی کو مہمان سمجھ کر ان سے سلام لیا اور سوچنے لگے کہ یہ کون شخص ہے جو اتنا شریف بن کر ہمارے گھر کے باہر آبیٹھا ہے۔ آخر ان کی بڑی بہن نے بھائی کو پہچان لیا اور والدہ کو کہنے لگیں کہ مجھے لگتا ہے جیسے یہ محمد جان ہے (شیخ ضامرانی کا پہلا اور گھریلو نام یہی تھا۔) ماں نے بھی تصدیق کر دی اور ان کو پہچان لیا۔ پھر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اسی برس مولانا کی شادی ہوگئی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد وہ کراچی کے مدرسہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں پڑھنے کے لیے روانہ ہوگئے۔ چند ماہ بعد مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ میں داخلہ لے کر یہاں پڑھنا شروع کر دیا۔ اس مدرسے میں ہر جمعرات کو طلبا کی تقریری تربیت کی جاتی تھی۔

ایک دفعہ مولانا ضامرانی کا ایک دوست محمد امین اس تربیتی تقریر میں تصوف پر تقریر کر رہا تھا۔ تقریر کرتے ہوئے اس نے ایک بزرگ بشر حافی کے متعلق واقعہ سنایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی زمین کا بڑا احترام کرتے تھے اور کبھی اس پر جوتے پہن کر نہیں چلتے تھے۔

دورانِ تقریر مولانا ضامرانی کھڑے ہوگئے اور اپنے استاد صاحب سے اجازت مانگی کہ میں ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں۔ استاد نے اجازت دے دی۔ مولانا ضامرانی نے فرمایا۔ عزیز بھائیو! محمد امین نے جو یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ بشر حافی زمین کے احترام میں جوتے پہن کر نہیں چلتے تھے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ قضائے حاجت کے لیے کدھر کا رُخ کرتے تھے؟ پوری زندگی انھوں نے قضائے حاجت کس طرح کی؟

اس پر سب طلبا ہنسنے لگے۔ مقرر نے کہا کہ یہ وہابی ایسے ہی نکتے اٹھاتے رہتے ہیں اور بزرگوں کا یہ لوگ احترام نہیں کرتے۔ یہ بات استاد صاحب نے سنی تو فرمانے لگے عبدالغفار صحیح کہتا ہے۔ صوفیا سے متعلق ایسی باتیں بیان کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

مولانا عبدالغفار ضامرانی نے دورۂ حدیث کے لیے بنوری ٹاؤن میں مولانا محمد یوسف بنوری اور مفتی ولی حسن صاحب کی خدمت میں حاضری دی اور ۱۹۵۷ء میں عالیہ کی سند ممتاز نمبروں میں حاصل کی۔

اہل حدیث مسلک اختیار کرنے کے بعد حنفیوں کے ہاں تعلیم حاصل کرنے کی انھوں نے یہ وضاحت بیان فرمائی کہ میں حنفی مذہب سے مکمل آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ اس دوران میں اپنے اساتذہ سے کھل کر بحث بھی کر لیتا تھا۔

سفرِ حج

۱۹۶۵ء میں مولانا عبدالغفار ضامرانی نے حج کا ارادہ کیا۔ لیکن ان کے پاس زادِ سفر نہ تھا۔ زادِ سفر کے لیے مولانا نے ایک گدھا بیچا۔ اس سے انھیں سات سو روپے کی رقم ملی۔ انھوں نے ایک وفد کے ساتھ براستہ ایران سفر اختیار کیا اور بندر عباس تک پہنچ گئے۔ اسی سال ایرانی حکومت نے اعلان کیا کہ کوئی حاجی اس مرتبہ حج کے لیے نہیں جاسکتا۔ چناں چہ مولانا ضامرانی کے ساتھی تو ضامران واپس چلے گئے لیکن مولانا ضامرانی نے ایران میں ہی ٹھہرنے کا فیصلہ کیا اور وہ ایک مسجد میں مقیم ہوگئے۔ وہاں دو ماہ قیام کیا اور گاہے گاہے وعظ وتقریر کے فرائض بھی ادا کرتے رہے۔ اس بنا پر وہاں کے لوگ مولانا ضامرانی سے محبت کرنے لگے۔ ایک دفعہ ایرانی تاجروں میں سے کچھ لوگ بغرضِ تجارت دوبئی جانا چاہتے تھے۔ یہ لوگ بکریوں کی تجارت کرتے تھے۔ انھوں نے مولانا سے بھی کہا کہ آپ بھی ہمارے ساتھ دوبئی چلیں اور وہاں سے آپ آسانی سے سعودی عرب چلے جائیں گے اور حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرلیں گے۔ چناں چہ مولانا ان کے ساتھ دوبئی پہنچے اور کچھ عرصہ وہاں ٹھہرے۔ پھر قطر گئے۔ قطر میں ان کو ان کا ایک رشتے دار ملاّ رحمت اللہ مل گیا۔ ملا رحمت اللہ نے مولانا عبدالغفار ضامرانی کا تعارف قطر کے قاضی اور معروف سلفی عالم دین احمد بن حجر آل بوطامی سے کرایا۔ جناب احمد بن حجر نے مولانا ضامرانی کی عزت افزائی کی اور انھیں اپنا مہمان ٹھہرالیا۔ پھر ان سے گہری دوستی ہوگئی۔ مولانا ضامرانیؒ خاصا عرصہ وہاں مقیم رہنے کے بعد دمام چلے گئے۔ دمام میں ایک عالم دین شیخ موسیٰ کے ہاں ان کا قیام رہا۔ پھر مکہ مکرمہ کو روانہ ہوگئے۔ یوں اللہ تعالیٰ نے مولانا ضامرانی کی دیرینہ خواہش پوری کردی اور انھیں حج بیت اللہ کی سعادت سے بہرہ ور فرمایا۔ حج کے بعد اپنے وطن واپس تشریف لے آئے۔

مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ

اس سے تقریباً ایک سال بعد جناب شیخ سالم المطر رحمہ اللہ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ شیخ سالم المطر شیخ ابن باز رحمہ اللہ کے سیکرٹری رہ چکے تھے اور بلوچستان کے ممتاز عالم دین تھے۔ انہی کی کوششوں سے بلوچ طلبا کے لیے مدینہ یونی ورسٹی میں داخلے کے مواقع میسر آئے تھے۔ شیخ ضامرانی نے شیخ سالم المطر کے ساتھ مل کر ۱۴۰۲ھ میں جمعیت انصار السنۃ المحمدیہ بلوچستان کی بنیاد رکھی۔ شیخ سالم المطر نے مولانا ضامرانی کو مدینہ یونی ورسٹی میں تعلیم کے حصول کی خاطر انھیں ویزا لگا کر دیا۔ مگر مولانا ضامرانی کے والد صاحب سخت بیمار ہوگئے تو مولانا ضامرانی بغرضِ تعلیم مدینہ یونی ورسٹی نہ جاسکے۔ کچھ مدت بعد دوبارہ شیخ موصوف نے ویزا لگوایا مگر والد کی علالت کے باعث پھر بھی نہ

جا سکے۔ اب شیخ سالم المطر نے تیسری بار پھر ان کے لیے ویزا لگوایا تو مولانا ضامرانی کے والد صاحب نے کہا کہ تم مدینہ یونی ورسٹی چلے جاؤ، لہٰذا مولانا ضامرانی نے مدینہ یونی ورسٹی کے لیے رخت سفر باندھا۔ ابھی وہ ضامران کی حدود ہی میں تھے کہ ان کے والد صاحب داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا ضامرانی نے والد صاحب کی وفات کی خبر سنی تو واپس گھر آ کر ان کی تجہیز و تکفین کا سامان کیا اور اس فرض کی ادائیگی کے بعد مدینہ یونی ورسٹی جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ اس وقت مولانا ضامرانی ۳۶ برس کو پہنچ گئے تھے۔ مولانا ضامرانی جب مدینہ پہنچے اس وقت جامعہ اسلامیہ میں داخلے کے لیے ہر طالب علم کو اپنا ڈاکٹری چیک اپ تقریباً سارا لباس اتار کر کرانا پڑتا تھا۔ شرعی اعتبار سے یہ نہایت غلط فعل تھا اس لیے مولانا ضامرانی نے یہ چیک اپ کرانے سے انکار کردیا۔ بات زیادہ بڑھی تو اس کے حل کے لیے مسئلہ شیخ ابن باز رحمہ اللہ کے پاس چلا گیا۔ شیخ موصوف نے یونی ورسٹی کے اس قانون سے لاعلمی کا اظہار کیا اور اسے سخت ناپسندیدہ قرار دیا۔ جب ابن باز رحمہ اللہ کو پتا چلا کہ بلوچستان کے ایک طالب علم عبدالغفار ضامرانی نے اس قانون کو نہیں مانا اور جامعہ اسلامیہ میں پڑھنے سے انکار کردیا ہے تو انھوں نے اس قانون کو نہ صرف ختم کرادیا بلکہ مولانا ضامرانی کو ان کی دینی حمیت کے باعث بے حد مستحق احترام گردانا۔

مولانا ضامرانی نے مدینہ یونی ورسٹی میں داخلے کے لیے جب درخواست جمع کروائی تو اس درخواست کے ساتھ دارالعلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کی سند بھی لگائی۔ اس سند میں درج تھا کہ اس طالب علم نے ایک سال میں حدیث کی نو عدد کتابیں پڑھی ہیں۔ شیخ ابن باز رحمہ اللہ نو کتب والی عبارت پڑھ کر ششدر رہ گئے اور اس سند کو انھوں نے غلط قرار دے دیا۔ اب مولانا ضامرانی نے اسے صحیح قرار دینے کے لیے شیخ سالم المطر اور شیخ مولانا عبدالکریم البلوشی کی گواہیاں پیش کیں۔ گواہی کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ برصغیر کے حنفی مدارس ایک سال میں حدیث مبارک کی نو کتابیں بطور دورہ پڑھا دیتے ہیں۔ اس پر شیخ ابن باز رحمہ اللہ نے فرمایا:

"واللہ ظلموا علیٰ حدیث رسول اللہ."

(واللہ! یہ تو حدیث رسول اللہ پر ظلم ہے۔)

چناں چہ مولانا ضامرانی کو دوسری کلاس میں داخلہ مل گیا۔ مولانا ضامرانی نے تقریباً نو برس جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تعلیم حاصل کی اور کلیۃ الشریعہ سے ۱۳۹۶ھ (۱۹۷۶ء) میں فارغ التحصیل ہوئے۔

جامعہ اسلامیہ کی طرف سے قانون منظورا ہوا تھا کہ تمام ممالک کے طلبا اپنے میں سے ایک

امیر منتخب کرلیں اور اپنے اپنے ممالک کے علما سے بذریعہ خط وکتابت رابطہ رکھیں اور ہر جمعرات کو مجلس علمی منعقد کر کے مکالمہ کیا کریں۔

اس پر ایرانی بلوچستان اور پنجابی طلبا نے مولانا ضامرانی کے حق میں فیصلہ دیا اور مولانا ضامرانی ان سب طلبا کے امیر منتخب ہوگئے۔ یہ ذمے داری انھوں نے جامعہ سے فارغ ہونے تک انجام دی۔ جب مولانا ضامرانی فارغ التحصیل ہوگئے تو شیخ ابن باز نے ان سے پوچھا کہ کیا تم دعوت وتبلیغ کے لیے کسی ملک اور علاقے کا انتخاب کرو گے؟

متحدہ عرب امارات میں تقرر

شیخ ابن باز رحمہ اللہ کے اس سوال پر مولانا ضامرانی نے اپنے ملک جانے کا عندیہ دیا اور بلوچستان میں رہنے کو ترجیح دی۔ شیخ ابن باز رحمہ اللہ نے کہا کہ ابھی بلوچستان کے لیے ہمارا کوٹہ منظور نہیں ہوا۔ آپ بجائے بلوچستان کے، متحدہ عرب امارات میں قیام کریں، اور وہاں دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیں۔

چناں چہ مولانا ضامرانی متحدہ عرب امارات میں دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دینے لگے۔ متحدہ عرب امارات میں انھوں نے ایک مسجد میں خطبۂ جمعہ بھی دینا شروع کردیا تھا اور ایک خوش بیان خطیب کی حیثیت سے مشہور ہوگئے تھے۔

حکومت سعودی عرب انھیں ماہوار چار ہزار ریال تنخواہ اور گھر کے کرائے کے لیے سالانہ پندرہ ہزار ریال عنایت کرنے لگی۔ سفری خرچ کے لیے علیحدہ وظیفہ مقرر کردیا۔ اس طرح مسجد میں خطابت کے بھی آٹھ سو درہم ملتے تھے۔ مولانا ضامرانی نے چار سال متحدہ عرب امارات میں نہایت محنت سے دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیا۔ یہاں وہ بلدیہ میں کام کرنے والے اپنے بلوچ ہم وطنوں کو رات کے وقت درسِ قرآن وحدیث بھی دیتے تھے۔ ان کی تقریروں سے سیکڑوں بلوچوں اور پنجابی بھائیوں کے عقائد درست ہوئے۔ ان کی تربیت ہی کا نتیجہ تھا کہ ان لوگوں میں سے بعض کو وزارتِ اوقاف کی مساجد میں پیش امام مقرر کیا گیا۔

وطن واپسی

اپنے وطن سے دور انھیں وطن کی یاد بھی تڑپاتی رہی اور ایک لمبا عرصہ متحدہ عرب امارات میں قیام کے دوران جامعہ اسلامیہ کی انتظامیہ سے تقاضا کرتے رہے کہ مجھے جلد از جلد اپنے وطن بھیج دیا جائے۔ آخر ایک دن انھیں جامعہ اسلامیہ کی طرف سے اجازت نامہ اس شرط پر ملا کہ اگر آپ اپنے

وطن جائیں گے تو آپ سے مراعات واپس لے لی جائیں گے اور صرف بارہ سو سعودی ریال آپ کو تنخواہ دی جائے گی۔

مولانا عبدالغفار ضامرانی نے بخوشی مراعات واپس کرنا منظور کیا اور اپنے وطن ضامران کے خشک و بے آب وگیاہ پہاڑوں میں رہنے کو ترجیح دی۔

یہ مراعات چھوڑنے کا مقصد صرف دین کی خدمت کے پیش نظر تھا۔ مولانا عبدالغفار ضامرانی کی سوچ یہ تھی کہ یہ کہاں کی دانش مندی ہے کہ میں اتنی دولت جمع کرتا رہوں اور اپنی زندگی کی فکر میں لگا رہوں اور میرے علاقے کے لوگ یوں ہی شرک وبدعات اور جہالت وگمراہی کی زندگی بسر کرتے رہیں۔ لہٰذا انھوں نے فیصلہ کرلیا کہ اپنے علاقے میں جا کر تبلیغ دین کا فریضہ انجام دیں۔ کہا کرتے تھے کہ تنخواہیں تو غیر مسلم بھی لیتے ہیں۔ لیکن ایک مسلمان اور عالم دین ہونے کی وجہ سے ان پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اس لیے اپنے وطن لوٹ آئے۔

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی طرف سے مولانا عبدالغفار ضامرانی کو حکم ملا کہ آپ پہلے جامعہ الاسلامیہ (جامعہ رحمانیہ) لاہور میں کچھ عرصہ تدریسی خدمات انجام دیں، اس کے بعد اپنے علاقے ضامران جائیں۔ چناں چہ مولانا نے اسی طرح کیا۔

بلوچستان میں تحریک اہل حدیث

مولانا عبدالغفار ضامرانی جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ جانے سے قبل بھی فریضہ تبلیغ ادا کرتے رہے تھے۔ اس دوران میں ان کے بعض علمائے احناف سے مناظرے اور مباحثے بھی ہوئے، جن میں اللہ تعالیٰ نے انھیں کامیابی سے ہم کنار کیا۔ لیکن جب مولانا عبدالغفار جامعہ اسلامیہ مدینہ منور سے فراغت حاصل کرکے اپنے علاقے میں تشریف لائے تو ان مناظروں اور مباحثوں میں شدت آ گئی۔ اس وقت ضامران میں ان کو بڑے چیلنج نظر آ رہے تھے اور کئی محاذوں پر انھیں مقابلہ کرنا تھا۔ پہلے تو انھیں ذکری فرقہ والوں سے سامنا کرنا تھا۔ پھر تقلیدی جمود کا محاذ تھا۔ علاوہ ازیں اس علاقے میں کمیونزم کا زور تھا۔

کمیونزم ضامران کے اردگرد میں بڑی تیزی سے ابھر رہا تھا اور نوجوانوں کی اکثریت کمیونزم کی لپیٹ میں آ گئی تھی اور اس کے فروغ میں یہ نوجوان سرگرم ہونے لگے تھے۔

مولانا عبدالغفار ضامرانی ان فتنوں کا مقابلہ کرنے اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے میدان میں کود پڑے اور تحریک اہل حدیث کے نام سے ایک جماعت کی داغ بیل ڈال دی۔ لیکن اس وقت وہاں ایک بھی اہل حدیث نہ تھا۔

مولانا عبدالغفار ضامرانی کے لیے یہ بڑا کٹھن وقت تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک کافر کو مسلمان کرلینا آسان ہے مگر ایک مسلمان کی اصلاح کرنا بہت مشکل کام ہے۔

مولانا ممدوح نے تحریک اہل حدیث کی بنیاد رکھتے ہی جوش وجذبے سے دعوتِ دین دینا شروع کی اور مخالفوں کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہوگئے اور اللہ تعالیٰ کی نصرت سے لوگوں کو ان فتنوں کی شر انگیزیوں سے آگاہ کرتے رہے۔ شرک اور پیر پرستی عام تھی۔ پورا معاشرہ ان خرافات میں جکڑا ہوا تھا۔ لیکن ایک تن تنہا شخص اس معاشرے کی اصلاح کا بیڑا اٹھا رہا ہے اور سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے اس کے ساتھ کوئی بھی نہیں ہے۔

وعظ وتبلیغ

جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ عبدالغفار نامی شخص اپنے آپ کو اہل حدیث کہلاتا ہے تو وہ اس معاملے میں دلچسپی لینے لگے اور انھیں اہل حدیث لفظ کے بارے میں پتا چلا کہ یہ بھی ایک مسلک ہے۔ اور معلوم کرنے لگے کہ اس کے پیروکار کون لوگ ہیں، کیا کہتے ہیں، ان کا منشور اور ان کی دعوت کیا ہے؟ اس قسم کے حالات میں جب لوگ کسی کی دعوت وتبلیغ کی نوعیت سمجھنا چاہتے ہوں تو پھر داعی کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ صبر وتحمل سے ان کی باتیں سنے۔ ان کے سوالوں کے جواب دے اور حوصلے اور عقل مندی سے اپنی دعوت پیش کرے۔ جب دور دور تک جہالت وبے دینی، رسوم ورواج کا دور دورہ ہو تو داعی کے لیے حکمت ودانائی، صبر وضبط اور اخلاقِ حسنہ کا مظاہرہ کرنا ضروری ہوجاتا ہے نیز دلائل وبراہین اور خالصتاً علمی اصولوں کے مطابق اپنی دعوت کو پیش کرنا لازمی قرار پاتا ہے۔ مولانا عبدالغفار ضامرانی چوں کہ اپنے علم میں راسخ تھے اور انھوں نے قرآن وحدیث اور فقہ میں دسترس حاصل کرلی تھی۔ اس لیے داعی کے لیے جو خوبیاں ہونی چاہئیں وہ خوبیاں ان میں بہ درجہ اتم موجود تھیں۔ مولانا کے مخالف بھی ان کے علمی مقام ومرتبے کے قائل تھے۔

ان کے وعظ اصلاحی قسم کے ہوتے تھے۔ شرک وبدعت کی مخالفت اس انداز سے کرتے کہ قرآن وحدیث، حضراتِ صحابہ وائمہ عظام کے اقوال کے انبار لگا دیتے اور واضح دلیلوں سے خلافِ شرع رسوم کا رد کرتے۔ ان کا طریقہ پُر حکمت اور اندازِ تخاطب میٹھا ہوتا تھا۔ کبھی ترش زبان سے وعظ نہ کیا بلکہ پیارے انداز سے مخاطب ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ ان کا وعظ بڑے شوق سے سنتے تھے۔ ان کی باتوں کو جھٹلانا لوگوں کے لیے انتہائی مشکل ہوتا تھا۔ جہاں لوگ ان کے وعظ سے متاثر تھے وہاں دوسرے مسالک کے علما ان کی مخالفت میں بھی پیش پیش تھے۔ مولانا ضامرانی کو اس سلسلے میں بڑی اذیتوں سے گزرنا پڑا اور ان اذیتوں کو انھوں نے بڑے حوصلے سے برداشت کیا، اور

کبھی ناگواری کا اظہار نہ فرمایا۔

حکیمانہ انداز

مولانا عبدالغفار ضامرانی تنگ نظر اہل حدیث نہیں تھے بلکہ پرحکمت شخصیت کے مالک تھے۔ اور ان کا اندازِ تبلیغ حکیمانہ تھا۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے یہ مثال ہی کافی ہے کہ مولانا نے جو مدرسہ قائم فرمایا تھا اس میں اکثریت حنفی اساتذہ کی تھی اور یہ اساتذہ بڑا متشددانہ ذہن رکھتے تھے۔ مسلک کے بارے میں وہ مولانا ضامرانی کے خلاف باتیں کرتے رہتے تھے اور کسی نہ کسی ذریعے سے ان باتوں کا علم مولانا کو ہوجاتا تھا۔ مگر مولانا ان اساتذہ کو احساس تک نہ دلاتے اور نہ انھیں مدرسے سے نکالنے کا کبھی سوچا۔

ان اساتذہ میں سے ایک مولانا عبدالرزاق خارانی تھے۔ جو جامعہ اشرفیہ لاہور کے فارغ التحصیل تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ میں ایک متعصب حنفی تھا۔ اپنے آپ کو ایک بڑا عالم سمجھتا تھا۔ لیکن جب میں نے مولانا ضامرانی کی مجالس میں بیٹھنا شروع کیا تو مختلف مسائل ومباحث کے دوران مجھے اپنی علمی سطحیت کا اندازہ ہوا اور پتا چلا کہ مجھ میں اور مولانا ضامرانی میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ میں ان کے ساتھ بات کرتے ہوئے ان کی علمی فوقیت سے ہمیشہ مرعوب رہا۔ ان کے اخلاقِ حسنہ اور انکسار وعجز کے آگے میری ایک نہ چلی، بالآخر میں نے مسلک اہل حدیث اختیار کرکے تقلید شخصی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔ مولانا عبدالرزاق خارانی اس وقت اپنے علاقے خاران میں خالص توحید وسنت کی دعوت کو پھیلا رہے ہیں۔

اسی طرح کے ایک عالم مولانا عبدالمالک تھے جو بحث ومباحثہ میں شکست کے بعد اہل حدیث ہوگئے تھے۔

مولانا عبدالغفار ضامرانی نے بڑی تگ ودو اور محنت سے دین حق کو پھیلایا۔ ان کا دائرہ کار صرف مکران تک محدود نہ تھا بلکہ دور دراز کے علاقوں میں شمع توحید کو فروزاں کرنے کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔ کراچی بھی تشریف لے جاتے تھے۔ ان کا قیام المکہ ہوٹل میں ہوتا تھا۔ اس ہوٹل کے منیجر حاجی عبدالحکیم تھے۔ مولانا ضامرانی جب بھی ان کے ہاں ٹھہرتے تو انھیں کوئی نہ کوئی کتاب پڑھنے کے لیے ضرور دیتے۔ حاجی صاحب بڑے ہم درد اور شریف النفس تھے اور حنفی مسلک پر کار بند تھے۔ مطالعہ کرکے اہل حدیث کی طرف مائل ہوئے۔ پھر نہ صرف خود اہل حدیث ہوئے بلکہ اپنے اہل خانہ کو بھی اہل حدیث بنایا۔ انھوں نے جس کتاب سے زیادہ اثر لیا اس کتاب کا نام ''النجخبه فی ترجمة الخطبة'' تھا۔

مولانا ضامرانی تربت میں سالانہ اہل حدیث کانفرنس کا انعقاد فرمایا کرتے تھے۔ اس میں سلفی جماعتوں کے تمام قائدین ان کی دعوت پر تربت تشریف لے جاتے تھے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ بلوچستان میں اگر تحریک اہل حدیث کا کسی کو بانی کہا جائے تو وہ مولانا عبدالغفار ضامرانی ہیں۔

ایک تاریخی واقعہ

یہ اُس دور کی بات ہے جب بلوچستان میں دینی مرکز کوئی نہ تھا اور جہالت کا دور دورہ تھا۔ اس دور میں ایک شخص محمد اٹکی نامی ایران سے مکران وارد ہوا اور لوگوں کی جہالت کی وجہ سے اپنے آپ کو اس نے نبی کہلانا شروع کیا۔ لوگ اس دجال کی باتوں سے متاثر ہونے لگے۔ یہ ذکری فرقے کا بانی بنا۔ اس کے متعلق مولانا عبدالحق بلوچ نے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

”(محمد اٹکی مکران آئے) اس وقت ایران کے سرباز علاقے پر بلیدی خاندان کے لوگ حکومت کررہے تھے۔ کیچ تربت کے علاقے پر ملکوں کی حکومت تھی۔ پنج گور پر ملک اور گچکی براجمان تھے۔ یہ نئے نئے ہندوستان سے یہاں آئے تھے اور ہندوؤں کی نسل سے تھے۔ یہ لوگ آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ بلیدی اور ملک ایک دوسرے کے معاون تھے۔ یہ سب لوگ ذکری مذہب کے پیروکار ہوگئے تھے۔ اس طرح ذکری بہت معروف ہوگئے۔ ان تمام قبیلوں میں اقتدار کی جنگ شروع ہوگئی تھی۔ گچکی پورے مکران پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ بلیدی ان کے سب سے بڑے حریف تھے اور مکران پر حکمران تھے۔ ان کو جب گچکیوں کی ریشہ دوانیوں سے خطرہ ہوا تو انھوں نے آس پاس کے مسلم حکمرانوں سے تعلقات بڑھائے اور دوبارہ اسلام قبول کرنا چاہا۔

انھوں نے نادر شاہ افشار سے راہ ورسم بڑھائے۔ چوں کہ علاقے کے سارے لوگ ذکری ہوگئے تھے اس لیے ملک دینار ولد ملا مراد گچکی کو موقع مل گیا، اس نے عوام کو ساتھ ملا کر بلیدیوں کے آخری نومسلم فرماں روا شیخ بلال کے خلاف علم بغاوت بلند کرکے اس کے مرتد ہونے کا اعلان کردیا۔ اس اعلان سے عوام مشتعل ہوگئے۔

انھوں نے تمپ کے قلعے کا محاصرہ کرکے ۱۷۲۳ء میں اسے قتل کردیا۔ یوں مکران پر گچکی خاندان کی حکومت قائم ہوگئی۔ یہاں سے تشدد کا ایک نیا باب شروع ہوگیا، کچھ مسلمان نادر شاہ کی پناہ میں چلے گئے اور کچھ خوانین قلات کے قلمرو کی طرف ہجرت کرگئے۔

نادر شاہ نے اسی سال ۱۷۲۳ء میں تقی خان کی زیر کمان ایک لشکر تیار کرکے کیچ پر حملہ کرادیا۔ نادر شاہی فوج سے نو سو اور ملک دینار کے لشکر سے سات سو آدمی اس جنگ

میں مارے گئے۔
نصیر خان نوری کے ذکریوں کے خلاف حملے کے مختلف محرکات تھے۔ خان احمد یار خاں نے تاریخ خوانین بلوچ میں اس حملے کی وجہ درج ذیل الفاظ میں لکھی ہے۔
''جب میر خان نصیر اعظم کو عالم خواب میں رسول اللہ ﷺ کا شرف دیدار نصیب ہوا اور آقائے نام دار ﷺ نے اس کو مکران پر حملہ آور ہو کر دین اسلام کی تبلیغ واشاعت اور ذکریوں کی بیخ کنی کا حکم فرمایا تو خانِ اعظم نے اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی ﷺ کے خواب میں دیکھنے پر آپ کے حکم کی تعمیل کی اور مکران کے ذکریوں پر حملہ کردیا اور انھیں دین اسلام کی تبلیغ کی۔ اس طرح خانِ اعظم نے ذکریوں کا صفایا کرکے کفر والحاد کے اس پودے کو جڑ سے اکھاڑ دیا اور ملت اسلام کو اس فتنے سے نجات دلادی۔ اسی تاریخی کارنامے سے متاثر ہو کر حکومت ترکی نے خان بلوچ کو غازیٔ دین اور ناصر ملت محمدیہ کے سرمایہ فخر خطابات سے نوازا۔'' [تاریخ خوانین بلوچ،ص:۴۷]

ذکری فرقے کے خلاف جدوجہد

مولانا نور محمد ضامرانی ۱۹۴۸ء میں ہندوستان سے ہجرت کرکے ضامران آئے تو یہاں جہالت عام تھی۔ ذکری اور مسلمان کی کوئی شناخت نہ رہ گئی تھی حتی کہ ذکری اور مسلمان آپس میں رشتے ناتے بھی کرلیتے تھے۔ خود علامہ نور محمد ضامرانی کی والدہ مسلمان اور والد ملا مولا داد ذکری پیشوا تھا۔ مولانا نور محمد پہلے عالم دین تھے جنھوں نے مسلمانوں کو اس فتنے سے آگاہ کیا۔ ان کے بعد مولانا محمد حیات اور تربت کے قاضی مولانا عبدالرب نے بھی اس باب میں اہم کردار ادا کیا۔
مولانا عبدالغفار ضامرانی جب درسِ نظامی مکمل کرکے ضامران تشریف لائے تو انھوں نے ذکری فرقے کے خلاف بھرپور جدوجہد کا اعلان کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایرانی بلوچستان کے ایک عالم مولانا شہداد سے بھی ملاقات کی اور ان سے ایرانی علما کی مدد کے لیے کہا تاکہ مل جل کر اس فتنے کی سرکوبی کی جائے۔ انھوں نے کہا کہ یہ بڑا کٹھن کام ہوگا۔ حکومت سے ٹکر لینا پڑے گی۔
ذکری فرقے کے لوگ کوہِ مراد پر حج کیا کرتے تھے۔ چناں چہ اس جعلی حج کو کچلنے کے لیے تدبیریں شروع ہوئیں تو مولانا عبدالخالق، مولانا رحمت اللہ، مولانا محمد حیات اور مولانا احتشام الحق نے اس تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔
۱۹۷۸ء میں اس تحریک میں اتنی شدت آگئی تھی کہ فساد کا سخت خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ اسی سال جنرل محمد ضیاء الحق تربت آئے۔ یہاں مسلمانوں کے مختلف وفود نے ان سے ملاقات کے دوران

ذکری فتنے سے تفصیل کے ساتھ آگاہ کیا۔ علما کے وفد سے ملاقات کے بعد ضیاء الحق نے تربت کی جامع مسجد میں کھڑے ہو کر ان علما سے کہا کہ میں دو ہفتے کے اندر اندر کسی عدالت کے ذریعے اس مسئلے کا حل نکال لوں گا۔ مگر ضیاء الحق یہ وعدہ پورا نہ کر سکے۔ اس طرح علما نے دوبارہ اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔

مجلس تحفظ ختم نبوت

۱۹۸۱ء میں مولانا عبدالخالق عرب امارات کے لیے روانہ ہو گئے تو شیخ ضامرانی عرب امارات سے واپس ضامران تشریف لے آئے۔ انھوں نے یہاں تشریف لاتے ہی مولانا رحمت اللہ پنج گوری کے مدرسے میں تحفظ ختم نبوت کے لیے ایک اجلاس منعقد کیا۔

مولانا عبدالغفار ضامرانی میں قائدانہ صلاحیت، بردباری، اخلاص وللّٰہیت دیکھ کر تمام علمائے احناف نے ان کو مجلس تحفظ ختم نبوت کا امیر منتخب کر لیا۔ یہاں کسی کو حنفی اور اہل حدیث کے طور پر نہیں دیکھا جاتا تھا۔ ان کے سامنے صرف ذکری فرقے کا استیصال تھا اور بس!

مولانا ضامرانی نے اس تحریک کا منصب امارت سنبھالا تو تحریک کو سرگرم کر دیا۔ تربت شہر اور اس کے علاقے تحریک کا مرکز تھے۔ ہر طرف جلسے جلوس، تقریریں اور مظاہرے ہونے لگے۔

اس تحریک سے بوکھلا کر ذکریوں نے خطیب مکران مولانا محمد الیاس کے مدرسہ پر حملہ کر دیا۔ اس حملے نے مسلمانوں کو جہادی ماحول فراہم کر دیا اور ان کے کئی گروپ بن گئے اور عسکری تربیت لینے لگے۔

مولانا الیاس کے مدرسے پر حملے کے ردّعمل میں لوگوں نے ذکریوں کے مرکز کلگ پر مسلح حملہ کیا۔ اس طرح جعلی حج کا مرکز کوہِ مراد بھی حملوں کی زد میں آ گیا۔

ہر سال ذکری فرقہ رمضان المبارک میں کوہِ مراد پر رسوم حج منعقد کرتا تھا۔ مکران ڈویژن میں دفعہ ۱۴۴ لگا دی جاتی تھی۔ حکومت مکمل طور پر ذکریوں کی پشت پناہی کرتی تھی۔ دفعہ ۱۴۴ کا اطلاق صرف اسلحے پر ہی نہ تھا بلکہ ہر داڑھی والے پر بھی تھا۔ کوئی داڑھی والا، جبہ ودستار پہنے اور عالمانہ وضع قطع بنائے ان کے علاقوں کی طرف نہیں جا سکتا تھا۔ ان ایام میں ختم نبوت کے جیالے اک سیل رواں کی طرح تربت پہنچتے اور خود مولانا عبدالغفار ضامرانی کسی سواری پر یا پیدل چل کر تربت جاتے۔ ایک دفعہ مولانا عبدالغفار ضامرانی پر قاتلانہ حملہ بھی ہوا۔ مولانا جامع مسجد تربت سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر نکل رہے تھے کہ ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ مولانا ضامرانی تو محفوظ رہے مگر ان کا ایک ساتھی گولی لگنے سے زخمی ہو گیا۔

آہستہ آہستہ ذکری ٹولے نے مسلمانوں کے دینی جوش وجذبے کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور ذکری نوجوان سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ ہمارا دین جعلی تو نہیں ہے؟ اس سوچ کے پیدا ہوتے ہی ہزاروں ذکری نوجوان اسلام کی آغوش میں آگئے۔ بہرحال اب ذکری اختلافات کا شکار ہوکر رہ گئے ہیں اور بعض شیعہ حضرات میں ضم ہوگئے ہیں اور بعض نے مہدویت جیسا عقیدہ اپنا لیا ہے۔

مولانا ضامرانی بحیثیت داعیٔ دین

مولانا عبدالغفار ضامرانی کی ساری زندگی دعوت وجہاد میں گزری۔ تبلیغ دین ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ دورانِ تعلیم مدرسے سے جب انھیں چھٹیاں ملتیں تو ان چھٹیوں کو غنیمت جانتے اور دعوتی کام میں مشغول ہوجاتے۔ لوگوں کی دینی تربیت اور اصلاحِ عقائد کی طرف متوجہ ہوتے۔ گدھے پر سوار ہوکر ضامران کے سارے علاقے میں پھرتے اور جہاں بھی کچھ لوگ کھڑے ملتے یا کھیتی باڑی کررہے ہوتے انھیں اللہ کے دین کی باتیں سناتے۔ اس طرح ان کا شہرہ بطور ایک داعیٔ دین پورے بلوچستان میں پھیل گیا تھا۔

متحمل مزاج مبلغ

ضامرانی متحمل مزاج تھے اور اپنے مخالفین سے کبھی قطع تعلق نہ کرتے تھے۔ بلکہ ان کے اندر رہتے ہوئے اصلاح وتربیت کا کام کرتے۔ کبھی مصلحت کے تحت حق بات سے گریز نہ کرتے۔ جب بھی حق بات کہنے کی ضرورت محسوس ہوئی ببانگ دہل اور بلا خوف وخطر اس کا اظہار فرمایا۔

تربت میں جب تحریک تحفظ ختم نبوت جاری تھی، اُن دنوں مولانا عبدالغفار ضامرانی نے ذکری مذہب کے بارے میں نہایت مؤثر تقریر فرمائی اور ذکری مذہب والوں کو بڑے پیارے انداز سے حقیقت حال سے آگاہ فرمایا۔ اس تقریر کا ہر ذکری مذہب والے نے اچھا اثر لیا۔

اوصافِ حمیدہ

مولانا عبدالغفار ضامرانی متواضع اور معاملہ فہم عالم تھے۔ جن لوگوں کو مولانا ضامرانی سے ملنے کا موقع ملا ہے وہی ان کی معاملہ فہمی سے باخبر ہوسکتے ہیں۔

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں جب طلبا نے اپنی تنظیم کی بنیاد رکھی تو اس تنظیم کے زیر اہتمام نئے طلبا کو استقبالیہ دیا جاتا تھا اور فارغ التحصیل ہونے والوں کو الوداعی تقریب میں خراجِ تحسین پیش کیا جاتا تھا۔

ایک دفعہ اس تقریب میں مہمانِ خصوصی مصری عالم دین ڈاکٹر عاصم القریوتی تھے۔ اب یہ استاذ

جامعہ میں سنت نبوی اور سیرت نبوی کے شعبے میں خدمات انجام دیتے ہیں۔

مہمان خصوصی سے تقریب میں شریک طلبا کا انفرادی تعارف کرایا گیا۔ ایک طالب علم محمد حسن ضامرانی کے بیٹے محمد عبداللہ ضامرانی تھے۔ مہمان خصوصی نے اس طالب علم سے پوچھا کہ تم مولانا عبدالغفار ضامرانی کو جانتے ہو؟ محمد عبداللہ نے کہا وہ تو میرے چچا جان ہیں۔ شیخ قریوتی نے سنا تو وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا میں پاکستان میں کئی مقامات پر گیا ہوں لیکن تمھارے چچا جیسا عالم دین نہیں دیکھا۔ کہنے لگے میں اور مولانا ضامرانی افغانستان میں بھی ہم سفر رہے ہیں۔ میں نے ان جیسا صابر، حلیم الطبع اور متواضع اور علمی صلاحیت والا کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔ پھر وہ طلبا کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ اس زمانے میں سلف صالحین کی سیرت جیسا انسان ہم دیکھیں تو آپ مولانا عبدالغفار کو دیکھ لیں۔ وہ اسلاف کی سی خصلتوں والے عالم ہیں۔ مولانا عبدالغفار ضامرانی کے دو گھر تھے، ایک کراچی میں اور دوسرا ضامران میں۔ دونوں گھر نہایت سادہ تھے۔ ان کا دروازہ ہمیشہ ہر خاص وعام کے لیے کھلا رہتا تھا۔ بلاتکلف سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے اور کھانے کے دوران خوش کلامی بھی کرتے رہتے۔ سفر کے دوران بڑے بڑے ہوٹلوں میں رہنے کی بجائے مساجد میں ٹھہرنے کو ترجیح دیتے۔ تبلیغی فرائض بھی ساتھ ساتھ انجام دیتے رہتے۔

شفقت ورحم دلی

مولانا عبدالغفار ضامرانی اپنے مدرسے کے طلبا پر بڑے مہربان اور شفیق تھے۔ زیادہ تر مدرسے میں رہتے تھے۔ طلبا کے کھانے کا خاص طور سے خیال رکھتے۔ ایسا تو نہیں کہ میرے گھر میں اچھا کھانا پکے اور طلبا میرے گھر سے کم معیار کا کھانا کھا رہے ہوں۔ طلبا کے ساتھ ہی اکثر وقت گزارتے اور ان کی ضروریات کا خیال رکھتے۔

رمضان المبارک میں سب سے پہلے طلبا کے لیے افطاری کا اہتمام کرتے، پھر اپنے گھر والوں کی طرف متوجہ ہوتے۔

آخری دنوں میں مولانا عبدالغفار ضامرانی کی بینائی اس حد تک کم ہوگئی تھی کہ انھیں اپنی ضروریات کے لیے ایک خادم کی حاجت پیش آ گئی تھی۔ لیکن جو کام خادم کے بغیر ہوسکتا، وہ خود ہی کر لیتے۔

زہد وتقویٰ

مولانا ضامرانی زاہد وعابد اور قائم اللیل تھے۔ اشراق کی نماز کے پابند تھے۔ پیر اور جمعرات کا

روزہ ہمیشہ رکھتے۔ قرآنِ کریم کی تلاوت پابندی سے روزانہ کرتے۔ تلاوت میں تدبر و تفکر نمایاں ہوتا تھا۔ آخری دنوں میں ان کی بینائی جاتی رہی تو قرآنِ کریم کثرت سے پڑھنے لگے اور اکثر رویا کرتے تھے۔ باجماعت نماز پڑھتے۔ شوگر کے شدید مرض میں بھی جب کہ ان کی صحت جواب دیتی جارہی تھی نماز باجماعت ادا کرتے رہے۔ رمضان المبارک میں پیرانہ سالی کے باوجود نماز تراویح ادا فرماتے۔ دورانِ نماز بوجہ شوگر پیشاب کی حاجت ہوجاتی تو فوراً دوبارہ وضو کرکے نماز میں شامل ہوجاتے۔

مولانا ضامرانی کے اساتذہ

مولانا عبدالغفار ضامرانی کے اساتذہ کی فہرست بہت وسیع ہے۔ ان میں حنفی بھی شامل ہیں اور اہل حدیث بھی۔ پاکستانی بھی ہیں اور عرب بھی۔ ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں: مولانا نور محمد، مولانا محمد یوسف بنوری، مفتی ولی حسن ٹونکی، مولانا عبدالغنی جاجروی، مولانا حافظ عبدالستار دہلوی، شیخ عبدالعزیز بن باز، علامہ ناصر الدین البانی، شیخ صالح العطیمین، شیخ عبدالمحسن العباد، شیخ محمد امین شنقیطی، پیر سید بدیع الدین شاہ راشدی، شیخ عطیہ سالم مصری، شیخ ابوبکر الجزائری، شیخ عبدالکریم مراد بلوچی، ڈاکٹر ربیع بن ہادی۔

تلامذہ

مولانا عبدالغفار ضامرانی کے تلامذہ کرام کی تعداد کا اندازہ کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ ان کے علاقے میں بھی بے شمار حضرات نے ان سے حصولِ علم کیا اور متحدہ عرب امارات میں بھی بہت سے تشنگانِ علوم نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیے۔ ان میں سے چند حضرات کے نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

مولانا سلیم اسحاق فاضل مدینہ یونی ورسٹی، مولانا عزیز الرحمٰن ضامرانی، مولانا عبدالتواب فاضل مدینہ یونی ورسٹی، شیخ الحدیث مفتی حافظ ثناء اللہ مدنی، مولانا عبدالغنی ضامرانی فاضل مدینہ یونی ورسٹی، مولانا عبید اللہ مدنی۔

تصانیف

مولانا عبدالغفار ضامرانی جہاں مشہور مدرس اور مقرر وواعظ تھے، وہاں بہت اچھے مصنف بھی تھے۔ انھوں نے بلوچی، اردو، عربی تینوں زبانوں میں لکھا اور بہت لکھا۔ ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

①...... تفسیر القرآن الکریم (مکمل، بلوچی زبان میں)

مولانا عبدالغفار ضامرانی کی یہ ایک اہم تفسیر ہے۔ بلوچی زبان میں ایسی کوئی جامع تفسیر ابھی تک نہیں لکھی گئی۔ عنقریب شائع ہونے والی ہے۔

②...... بیائے نمازِ رسول وامین (بلوچی): اس کتاب میں نماز نبوی کا تفصیلی بیان ہے۔

③...... ذکریاں گوں قرآن ءَ دلگوشے (بلوچی):

یہ کتاب سوال وجواب کی صورت میں ہے۔ ذکری مذہب کے متعلق پہلے سوالات کیے گئے ہیں اور پھر اس کے مدلل جوابات دیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے بہت لوگوں نے اس مذہب کو ترک کیا اور راہِ راست اختیار کی۔

④...... الرحوب لمن یصلی الرکعتین بعد الغروب (اردو): اس کتاب میں مغرب کے فرضوں سے پہلے دو رکعت پڑھنے کے ثبوت میں دلائل دیے گئے ہیں۔

⑤...... کشف الکسوف فی مسائل الصفوف (اردو): اس کتاب میں نماز کے لیے صفیں درست کرنے کے احکام بیان کیے گئے ہیں۔

⑥...... القربۃ بالسترۃ فی المساجد والغرفۃ (عربی، اردو): یہ کتاب نمازی کے آگے سترہ کے بیان سے متعلق ہے۔

⑦...... التحبۃ فی ترجمۃ الخطبۃ (اردو): اس کتاب میں خطبہ جمعہ کے غیر عربی میں جواز کا بیان ہے۔

⑧...... کیا ذکری مسلمان ہیں؟ اس کتاب میں قرآن وحدیث کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے کہ ذکری مذہب کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس کے علاوہ بھی کئی کتب کے مسودے موجود ہیں۔ ان میں سے بعض زیر طبع ہیں۔ بے شک وہ اپنے عہد اور علاقے کے بہت بڑے عالم، بہت بڑے مدرس، بہت بڑے مصنف اور مبلغ قرآن وحدیث تھے۔

ازواج واولاد

مولانا عبدالغفار ضامرانی نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی مولانا کی چچا زاد تھی۔ اس کے بطن سے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ اب صرف ایک بیٹی زندہ ہے۔ باقی بچپن میں وفات پا گئے تھے۔ اس بیٹی کی ماشاء اللہ اولاد موجود ہے۔

دوسری بیوی کا تعلق کراچی سے ہے۔ اس بیوی سے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ بڑا بیٹا حافظ

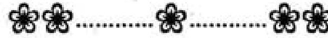
عطاء الرحمٰن ہے اور وہ جامعہ ابی بکر الاسلامیہ کراچی میں زیر تعلیم ہے۔ بڑا لائق اور محنتی ہے۔

وفات

مولانا عبدالغفار ضامرانی نے بھرپور زندگی گزاری۔ ساری زندگی متحرک اور خدمتِ اسلام میں مصروف ہے۔ تعلیم وتعلم، بحث ومباحثہ، افکارِ باطلہ کا ردّ اور تصنیف وتالیف ان کا اصل مشغلہ تھا۔

آخری دنوں میں علیل ہوگئے تھے اور بینائی جاتی رہی تھی۔ شوگر نے جسم کو کھوکھلا کردیا تھا۔ آخر ۳۱۔ مئی ۲۰۰۴ء کو سوموار کے دن حب چوکی میں ان کی حرکت قلب بند ہوگئی اور وہ اپنے خالق حقیقی کی بارگاہ میں جا پہنچے۔

اللھم اغفر له وارحمهٗ وعافه واعف عنهٗ .



مولانا محمود احمد میر پوری

بعض حضرات سے نہایت مخلصانہ مراسم کے باوجود بالکل یاد نہیں رہتا کہ ان سے پہلی ملاقات کب ہوئی اور کہاں ہوئی اور ان سے تعلقات کی صورت کیسے پیدا ہوئی۔ مولانا محمود احمد میر پوری اس فقیر کا بے حد احترام کرتے تھے اور جب پاکستان تشریف لاتے تو مجھ سے ان کی ضرور ملاقات ہوتی تھی۔ مولانا محمد حنیف ندوی اور اس فقیر سے ملنے کے لیے وہ کئی دفعہ ہمارے اس دور کے دفتر ادارہ ثقافت اسلامیہ بھی تشریف لے گئے اور انگلستان میں ان کی علمی سرگرمیوں اور اس ماحول میں ان کی عملی جدوجہد کے بارے میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ مگر یہ یاد نہیں پڑتا کہ ان سے پہلا تعارف کب ہوا؟ کہاں ہوا اور پھر اس تعارف نے باہمی تعلقات کی شکل کیسے اختیار کی؟

وہ خوب رو، خوش لباس، خوش اندام، شیریں گفتار اور مجسمہ خلوص نوجوان عالم تھے۔ چہرے کے نقوش ان کی ذہانت کی نشان دہی کرتے تھے اور زبان کی مٹھاس ان کے صحیح تریں مبلغ اسلام ہونے کی غماز تھی۔ وہ مناسب ڈیل ڈول اور میانہ قد کی دلآویز شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ارضِ کشمیر کی حسین سرزمین کے حسین فرزند تھے جو کشمیر کے موجودہ جغرافیائی حساب سے ضلع میر پور کے موضع نگیال (آزاد کشمیر) میں ۶۔ مارچ ۱۹۴۵ء کو پیدا ہوئے۔ یعنی آزادیٔ وطن سے ڈیڑھ سال قبل اس عالم آب وگل میں انھوں نے پہلا سانس لیا۔

ولادت سے چند ماہ بعد ان کی والدہ وفات پا گئی تھیں۔ ان کی تربیت کا آغاز اپنے ننھیال میں مرحوم نانا حاجی محمد حسن کی نگرانی میں ہوا جو اس نواح کے صالحیت شعار بزرگ تھے۔ والد کا اسم گرامی مولوی نور محمد تھا۔ آٹھویں جماعت موضع جمال کے ہائی سکول میں پاس کی۔ ابتدا ہی سے مذہبی رجحان رکھتے تھے، چناں چہ سکول میں اکثر قرآنِ مجید کی تلاوت کرتے رہتے۔ چھوٹی عمر میں والد بھی انتقال کر گئے تو تربیت کا بار چچا پر آ پڑا۔

والد کی تمنا بیٹے کو دینی تعلیم دلانے کی تھی۔ چناں چہ مڈل پاس کرنے کے بعد انھیں گوجراں والا کی درس گاہ جامعہ اسلامیہ میں داخل کرا دیا گیا۔ اس وقت وہاں اساتذہ کرام تھے حضرت حافظ محمد گوندلوی اور مولانا ابوالبرکات احمد۔ ان عالی مرتبت اساتذہ کے حلقہ شاگردی میں جو تلامذہ ان دنوں شامل تھے، وہ تھے مولانا محمد اعظم، مولانا حفیظ الرحمٰن لکھوی، علامہ احسان الٰہی ظہیر، مولانا ثناء اللہ سیالکوٹی (مدیر ماہنامہ صراطِ مستقیم برمنگھم اور خطیب سکٹن۔ برطانیہ) مولانا محمد حیات ڈسکوی اور بعض

دیگر حضرات جنھوں نے آگے چل کر درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے حلقوں میں بڑا نام پایا اور جن کی علمی شہرت دور دراز علاقوں تک پہنچی۔

مولانا محمود احمد میر پوری کا آغازِ طالب علمی ہی سے نقطہ نظر یہ تھا کہ علما کو کسی کا محتاج نہیں ہونا چاہیے اور آزادی کے ساتھ دین کی خدمت کرنا چاہیے، چناں چہ اس خیال سے انھوں نے گوجراں والا میں طالب علمی کے زمانے میں پاور لومیں لگا کر شنیل کا کپڑا بنانے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور اس کاروبار پر وہ بہت خوش اور مطمئن تھے۔

گوجراں والا کے زمانہ طالب علمی میں عربی عالم کا امتحان دیا اور اس کے بعد میٹرک پاس کیا۔ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد بہاول پور کا عزم کیا اور وہاں کی اسلامیہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ اس یونیورسٹی میں ان کی صلاحیتیں خوب اجاگر ہوئیں۔ انھیں سٹوڈنٹ یونین کے وائس پریذیڈنٹ منتخب کیا گیا۔ یونیورسٹی کے تقریری مقابلے میں اوّل انعام کے مستحق قرار پائے۔ یہیں بی اے پاس کیا اور پھر پنجاب یونیورسٹی (لاہور) میں ایم اے عربی کا امتحان دیا اور فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ کچھ عرصہ ہفتہ روزہ اخبار ''اہل حدیث'' (لاہور) کے ایڈیٹر رہے اور بیگم کوٹ کی جامع مسجد اہل حدیث کا منصب خطابت بھی ان کے سپرد رہا۔

دورِ طالب علمی میں ان کی قسمت کا ستارہ مزید چمکا اور وقت نے ان کے حق میں ایسی کروٹ لی کہ وہ پاکستان سے نکل کر مدینہ منورہ پہنچے اور وہاں کی یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ان پر خاص کرم تھا۔ مدینہ یونیورسٹی کا نصاب مکمل کر چکے تو سعودی حکومت کی طرف سے انھیں دینی خدمات سرانجام دینے کے لیے برطانیہ بھیج دیا گیا۔ اب ان کی عملی زندگی ایک بالکل نئے ماحول میں داخل ہوتی ہے اور وہ ایسی فضا سے شناسائی پیدا کرتے ہیں جہاں ان کی قابلیت کے جوہر کھلتے اور ان کی صلاحیتیں نکھرتی ہیں، جن سے بے شمار لوگ فیض حاصل کرتے ہیں اور ان کے پند ونصائح اس نواح کی مخلوقِ خدا کے لیے اصلاحِ احوال کا باعث بنتے ہیں۔ اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

○...... ان کے برطانیہ جانے سے پہلے مولانا فضل کریم عاصم، مولانا عبدالکریم ثاقب اور بعض دیگر حضرات وہاں پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے وہاں اپنی جماعتی تنظیم ''مرکزی جمعیت اہل حدیث برطانیہ'' کے نام سے قائم کر لی تھی اور مختلف مقامات میں جمعیت کی شاخوں کا قیام عمل میں آچکا تھا، جن کے ماتحت ارکانِ جمعیت دعوت وارشاد کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ارکانِ جمعیت میں سرگرمیٔ کار کا جذبہ انھی (مولانا محمود احمد میر پوری) کے جانے کے بعد ابھرا۔ انھوں نے جماعت کے تمام لوگوں کو جمع کیا اور دعوت وتبلیغ کی نئی اور مؤثر جہتوں کی نشان دہی کی۔ پھر جمعیت کی نظامت علیا پر انھی کو فائز کیا گیا، جب کہ اس کی زمام امارت مولانا فضل کریم

عاصم کے ہاتھ میں تھی۔

○...... مولانا محمود احمد میر پوری اب برطانیہ کی جماعت اہل حدیث کے روح رواں تھے۔ انھوں نے اس جماعت کو فعال بنانے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ وہ شہر شہر گھومے اور جماعت کے ہر فرد سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک کے تقریباً تمام شہروں میں جمعیت کی شاخیں قائم ہوگئیں اور ان جمعیتوں کی نگرانی میں دینی مدارس جاری ہوئے اور بچے ان مدارس میں حصولِ علم کرنے لگے۔ آج برطانیہ اور دوسرے یورپی ممالک میں عمل وحرکت اور تنظیم کے سلسلے میں جمعیت اہل حدیث تمام اسلامی تنظیموں سے مضبوط اور بااثر ہے۔

○...... مدارس کے علاوہ مساجد کا انتظام کیا گیا اور ان مساجد میں خطیبوں کا تقرر عمل میں آیا اور خطیبوں کے ذریعے دین کی اشاعت کا اہتمام ہوا۔ یہ تمام خطیب اپنی اپنی جگہ بہترین طریقے سے خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کی آواز ہر حلقے میں سنی جاتی ہے اور انھیں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ خطابت کے علاوہ یہ حضرات اردو اور انگریزی میں تحریری صورت میں بھی اسلام کی خدمت کر رہے ہیں۔

○...... مولانا محمود احمد میر پوری کے برطانیہ جانے سے پہلے مولانا فضل کریم عاصم اور مولانا عبدالکریم ثاقب نے اردو زبان میں ماہانہ رسالہ ''صراطِ مستقیم'' جاری کیا تھا۔ یہ رسالہ اردو جاننے اور بولنے والوں میں دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ مولانا محمود احمد میر پوری نے اس رسالے کو خاص طور سے مرکز توجہ ٹھہرایا۔ زبان، انداز اور مضامین کے تنوع، کاغذ، طباعت اور کتابت وغیرہ کے اعتبار سے اس کو یورپ کے ماحول کے مطابق ایک معیاری رسالہ بنا دیا اور ظاہری ومعنوی طور پر اسے ایک حسین مرقع قرار دیا جانے لگا۔ اب یہ رسالہ اپنا ایک مقام رکھتا ہے اور اس کا نہایت شوق سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس کے اداریے، تبصرے، تجزیے، سوال وجواب کے کالم، مسائل، فتوے، مضامین ومقالات اور اس میں مندرج مختلف حضرات کے سفر نامے قاری کے معلومات میں بے حد اضافے کا موجب ہیں اور ان میں ایک کشش اور جاذبیت پائی جاتی ہے۔

○...... مولانا محمود احمد میر پوری نے ایک اہم کام یہ کیا کہ یورپ کی فضاؤں میں پروان چڑھنے والی مسلمانوں کی نئی نسل کی تعلیم وتربیت اور غیر مسلموں کو راہِ ہدایت پر لانے کی غرض سے ایک انگریزی ماہنامہ ''دی اسٹریٹ پاتھ'' جاری کیا، جس کی ادارت تو مولانا عبدالکریم ثاقب اور ان کی اہلیہ اعجاز بیگم کے سپرد تھی لیکن اس کے مدیر مسئول خود مولانا محمود احمد میر پوری تھے۔ اس انگریزی رسالے نے بڑی شہرت پائی اور اپنے قارئین کو بہت متاثر کیا۔

○...... اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے مولانا محمود احمد میر پوری نے مختلف اسلامی اور یورپی ملکوں کے سفر کیے اور نہایت اخلاص و ہمت کے ساتھ لوگوں تک اپنی آواز پہنچائی۔ مثلاً اسلامی ملکوں سے سعودی عرب، مصر، شام، انڈونیشیا اور متحدہ عرب امارات میں وہ متعدد مرتبہ گئے اور وہاں کی اہم شخصیات سے ملاقات کے علاوہ بہت سے اجتماعات میں تقریریں کیں۔ یورپ کے ممالک میں سے جرمنی، ہالینڈ، بلجیئم، ڈنمارک کے سفر کیے اور وہاں کے لوگوں کو کلمہ حق سنایا اور اسلام کی صاف ستھری تعلیمات سے آگاہ کیا۔ وہ اجلے ذہن اور پاکیزہ فطرت کے عالم دین تھے اور لوگوں کو اچھائی کی تلقین کرتے تھے۔

○...... مولانا محمود احمد میر پوری کا نقطہ نظر یہ تھا کہ انگلستان میں رہنے والے تمام مسلمانوں کو ایک تو انگریزوں کے ساتھ صلح و صفائی کے ساتھ رہنا چاہیے۔ ان کی دعوتوں میں شریک ہونا چاہیے اور ان کو اپنی دعوتوں میں بلانا چاہیے۔ لڑائی جھگڑے سے بچنا چاہیے۔ دوسرا کام یہ کرنا چاہیے کہ ہر مذہب و مسلک کے مسلمانوں کو باہم اتحاد و اتفاق کی زندگی بسر کرنا چاہیے۔ آپس کے مسلکی نزاع سے دامن کشاں رہنا چاہیے۔ بہت سے مسائل میں ائمہ کرام میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، قدیم سے یہ سلسلہ چلا آرہا ہے۔ یہ مسائل کی تعبیر کا اختلاف ہے۔ اسے بہرحال برداشت کرنا چاہیے۔ ہمیں مسلکی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر مشترکہ مسائل میں متحد رہنا چاہیے۔ مولانا ممدوح کے اسی قسم کے خیالات کی وجہ سے مشترکہ شریعت کونسل کا قیام عمل میں آیا، جس میں تمام فرقوں اور تمام ملکوں کے علمائے کرام شریک ہوئے۔ شریعت کونسل کی وساطت سے نہایت اچھے انداز میں عائلی مسائل کے حل و کشود کی صورت پیدا ہوئی اور لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ خود مولانا محمود احمد کو اس کونسل کے سیکرٹری مقرر کیا گیا تھا۔ وہ اپنے اثر و رسوخ، خوش کلامی اور حسن بیان سے متعلقہ فریقوں کو مطمئن کردیتے اور صحیح راہ پر لگا دیتے تھے۔ ان کی بات مان لی جاتی تھی اور معاملے کی پیچیدہ گرہیں آسانی سے کھل جاتی تھیں۔ وہ اخلاص پیشہ عالم تھے اور اخلاص کو ہمیشہ پذیرائی حاصل ہوتی ہے۔

○...... مولانا محمود احمد میر پوری کے قریبی رفقا میں سے مولانا ثناء اللہ سیالکوٹی کا نام بڑا نمایاں ہے، جنھوں نے ”فتاویٰ صراط مستقیم“ کتابی شکل میں مرتب کیا۔ وہ اس کے آغاز میں لکھتے ہیں: ”مولانا مرحوم کو برطانیہ کے سیاسی، مذہبی اور صحافتی حلقوں میں جو اعزاز حاصل ہوا، وہ اور کسی کو حاصل نہیں ہوا۔ انھیں اس ظلمت کدۂ یورپ میں نورِ توحید کی شمع جلانے والوں میں السابقون الاولون کا مقام حاصل تھا۔ انھوں نے ساکت و جامد اور خوابیدہ فکر معاشرے میں اسلامی بیداری پیدا کی۔ وہ

حقیقت میں مسلمانانِ برطانیہ کے لیے چراغِ راہ اور حق کی گونجتی صدا تھے۔ وہ کتاب وسنت کے داعی، جماعت اہل حدیث برطانیہ کی پہچان، اس کی شان اور آن تھے۔ وہ شمع رسالت کے ہزاروں نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن اور بڑوں کی امیدوں کا مرکز تھے۔ وہ برطانیہ میں روشنی کا مینار اور علم کا چمکتا ہوا ستارہ تھے جو اس سرزمین کے افق پر ہمیشہ تابندہ رہے گا۔ وہ کفر والحاد کی سرزمین میں امنڈتی ہوئی آندھیوں اور بادصرصر کے طوفانوں میں اسلامی اقدار کی وہ شمعیں روشن کر گئے جو کبھی نہیں بجھیں گی۔"

○......مولانا محمود احمد میر پوری وسیع النظر عالم تھے اور حالاتِ حاضرہ پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ یورپ کے حالات، وہاں کی تہذیب وثقافت اور ضروریات سے خوب آگاہ تھے۔ انھوں نے اپنے مجلّے ماہنامہ "صراطِ مستقیم" میں سوال وجواب کے انداز میں روزانہ پیش آنے والے فقہی مسائل کے لیے بھی صفحات مخصوص کیے تھے۔ لوگ ان سے حالات کے مطابق جو مسائل پوچھتے تھے، ان کا وہ کتاب وسنت کی روشنی میں ضروری تفصیل سے جواب دیتے تھے۔ ان کے گوجراں والا کے دورِ طالب علمی کے رفیق مولانا ثناء اللہ سیالکوٹی کا ذکر پہلے آچکا ہے، انھوں نے مولانا محمود احمد سے ایک مرتبہ کہا کہ یہ فتوے جواب تک "صراطِ مستقیم" میں چھپ چکے ہیں، نہایت اہمیت کے حامل ہیں، انھیں ترتیب دے کر کتابی صورت میں شائع کر دینا چاہیے، تاکہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگ ان سے استفادہ کر سکیں۔ مولانا ممدوح نے اپنے دوست مولانا ثناء اللہ سیالکوٹی کی اس تجویز پر پسندیدگی کا اظہار کیا، لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے ان کے لیے یہ خدمت سرانجام دینا مشکل ہے، آپ خود ہی انھیں مرتب کر لیں۔ مولانا ممدوح تو اس سے کچھ عرصہ بعد وفات پاگئے، لیکن مولانا ثناء اللہ صاحب کے ذہن میں اپنے مرحوم دوست کا یہ فرمان موجود رہا، چناں چہ ہمت کر کے انھوں نے یہ خدمت سرانجام دے دی۔ یہ بہت محنت طلب کام تھا جو دو جلدوں پر مشتمل ہے، لیکن میرے سامنے اس کی صرف ایک جلد ہے، جس کے آغاز میں مولانا میر پوری کے مختصر حالات بھی مرقوم ہیں۔ یہ جلد ۵۷۰ صفحات پر مشتمل ہے اور فردوس پبلی کیشنز دہلی (انڈیا) سے ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی ہے۔

○...... اس جلد کے بڑے بڑے عنوانات اٹھائیس ہیں اور ان میں سے ہر بڑے عنوان کے نیچے بہت سے ذیلی عنوانات درج ہیں۔ اٹھائیس عنوانات یہ ہیں: (۱) عمل، ایمان اور عقائد، (۲) قبولیت عمل کی شرط، (۳) دعا میں واسطے یا وسیلے کی شرعی حیثیت، (۴) رسالت، (۵) مسائل وضو، (۶) جرابوں پر مسح، (۷) تیمم، (۸) احکامِ مسجد، (۹) نماز کے مسائل، (۱۰) جمعہ کے مسائل، (۱۱) صلوٰۃ جنازہ، (۱۲) ایصالِ ثواب کی بدعات، (۱۳) احکامِ رمضان، (۱۴) مسائل عیدین،

(۱۵)مسائل زکوٰۃ، (۱۶) قرآن کے متعلق مسائل، (۱۷) مسائل حج، (۱۸) جہاد، (۱۹)احکام طلاق، (۲۰) مسنون کام، (۲۱) بدعت کے مختلف روپ، (۲۲) عورتوں کے متفرق مسائل، (۲۳) گانا بجانا، (۲۴) حرام اشیاء، (۲۵) سود کی حرمت، (۲۶) مختلف فرقے، (۲۷) جدید مسائل، (۲۸) متفرق مسائل۔

○...... جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا ''فتاویٰ صراطِ مستقیم'' کتابی صورت میں مولانا محمود احمد میر پوری کے دوست مولانا ثناء اللہ سیالکوٹی نے مرتب کیا ہے اور مختلف شماروں سے فتوے تلاش کر کے بے حد محنت سے یہ خدمت سرانجام دی ہے۔ لیکن انھوں نے ٹائٹل پر مصنف کے نام کے ساتھ مرتب کے طور پر اپنا نام نہیں لکھا، آگے چل کر ''عرضِ مرتب'' میں اس خدمت کا تذکرہ کیا گیا ہے، ورنہ ہم موجودہ دور کے بعض ناشروں کو دیکھتے ہیں کہ وہ کسی مرحوم مصنف کی کتاب پر چند سطریں بھی لکھیں یا اسے ترتیب دیں تو مصنف کے ساتھ اپنا اسم گرامی تحریر فرمانا ان کے نزدیک ضروری قرار پاتا ہے۔ بلکہ بعض حضرات کی تو یہ کوشش ہوتی ہے کہ مصنف کا نام بے شک نہ لکھا جائے، ان کا نامِ نامی بہرحال ٹائٹل پر رقم ہوجائے۔ اب تو نظر ثانی اور نظر ثالث کی ریت بھی پڑ گئی ہے۔

○...... مولانا محمود احمد میر پوری نے مختلف مقامات میں حسب ذیل حضرات سے تحصیل علم کی۔

① ...... حضرت العلام حافظ محمد گوندلوی: جامعہ اسلامیہ گوجراں والا۔
② ...... مولانا ابوالبرکات احمد: جامعہ اسلامیہ گوجراں والا۔
③ ...... مولانا نذیر احمد کھوکھر کی: جامعہ اسلامیہ گوجراں والا۔
④ ...... مولانا شمس الحق افغانی: جامعہ اسلامیہ بہاول پور۔
⑤ ...... مولانا عبدالرشید نعمانی: جامعہ اسلامیہ بہاول پور۔
⑥ ...... مولانا احمد سعید کاظمی: جامعہ اسلامیہ بہاول پور۔
⑦ ...... مولانا عبدالغفار حسن: مدینہ یونیورسٹی۔ مدینہ منورہ۔
⑧ ...... شیخ حماد انصاری: مدینہ یونیورسٹی۔ مدینہ منورہ۔
⑨ ...... شیخ عبدالمحسن: مدینہ یونیورسٹی۔ مدینہ منورہ۔
⑩ ...... شیخ محمد امان: مدینہ یونیورسٹی۔ مدینہ منورہ۔
⑪ ...... شیخ احمد المجذوب: مدینہ یونیورسٹی۔ مدینہ منورہ۔

ان حضرات کے علاوہ مدینہ یونیورسٹی میں بعض مصری اور دیگر ملکوں کے اساتذہ سے بھی استفادہ کیا اور لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسروں سے بھی تحصیل علم کی۔

○...... مولانا محمود احمد میر پوری کتاب وسنت کے داعی اور ارشادات پیغمبر (ﷺ) کے بہت

بڑے مبلغ تھے۔ اس سلسلے میں ان کی جدوجہد کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اب ان کی وفات کے بارے سنیے......!

۹ اور ۱۰۔ اکتوبر ۱۹۸۸ء کی درمیانی شب کو اپنے اہل خانہ کے ساتھ وہ نیوکاسل سے بذریعہ کار برمنگھم آ رہے تھے۔ رات ڈیڑھ بجے کے قریب کار کا بریک ڈاؤن ہوگیا۔ عقب سے آنے والا ایک ٹرک کار سے ٹکرا گیا، جس سے یکے بعد دیگرے پانچ کاریں متصادم ہوگئیں۔ مولانا میر پوری، ان کا بیٹا فیصل اور ان کی خوش دامن موقع پر ہی جاں بحق ہوگئے۔ مولانا کی اہلیہ اور چھوٹا بیٹا عقیل شدید زخمی ہوگئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے زندگی عطا فرمادی۔

مولانا مرحوم کے جنازے میں بے شمار لوگوں نے شرکت کی اور انھیں برمنگھم کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

اللھم اکرم نزلہ ووسع مدخلہ وادخلہ جنت الفردوس.

انھوں نے صرف ۴۸ سال عمر پائی۔ اپنے پیچھے بیوہ اور دو بچے سوگ وار چھوڑے۔



مولانا عبدالرشید لداخی ندوی

ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے اجرا سے کچھ عرصہ بعد کی بات ہے کہ دہلی سے ایک خط موصول ہوا۔ لکھائی نہایت عمدہ۔ خط کا مضمون بہت اچھا۔ از راہِ کرم اس خط میں اخبار ''الاعتصام'' کے مضامین اور زبان کی تحسین کی گئی تھی۔ لکھنے والے اخبار کے خریدار تھے اور ان کا نام تھا عبدالرشید لداخی۔ مجھ پر ان کے طرزِ تحریر نے بھی اثر ڈالا اور خوش خطی نے بھی خوش کیا۔ میں اس وقت الاعتصام کا نائب مدیر تھا اور اخبار کا دفتر گوجراں والا میں تھا۔ میں نے یہ خط اخبار کے ایڈیٹر مولانا محمد حنیف ندوی کو بھی دکھایا اور مولانا محمد اسماعیل سلفی کی خدمت میں بھی پیش کیا۔ ان بزرگوں کی ہدایت کے مطابق میں نے عبدالرشید لداخی کو خط کا جواب دیا اور اخبار کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا تھا، اس کا شکریہ ادا کیا۔ پھر ان سے باقاعدہ خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

اس سے کچھ عرصہ بعد وہ لاہور آئے اور دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں ان سے ملاقات ہوئی۔ ان کا اس وقت کا حلیہ اور سراپا اب بھی میرے سامنے ہے۔ میانہ قد، گورا سرخ رنگ، تیکھی ناک، چھوٹے قد کی سیاہ داڑھی۔ سر پر ٹوپی۔ شلوار قمیض پہنے ہوئے۔ کم گو اور چہرے پر مسکراہٹ۔ گفتگو میں احترام کا پہلو نمایاں۔

مولانا عبدالرشید ندوی کا تعلق علاقہ بلتستان کے ایک گاؤں بلغار سے تھا، لیکن وہ اپنے نام کے ساتھ ''لداخی'' کی نسبت لگاتے تھے۔ لدّاخ مقبوضہ کشمیر کے مشرق میں تبت کی سرحد پر کوہستانی ضلع ہے، جہاں سے سیاچن گلیشیئر کو راستہ جاتا ہے، یہ خطہ پاکستان کے علاقہ بلتستان کا حصہ تھا۔

مولانا عبدالرشید لداخی ندوی کے دادا کا اسم گرامی اخوند سلطان علی تھا، جنھیں اپنی دین داری اور علمیت وصالحیت کی وجہ سے علاقے میں نہایت معزز گردانا جاتا تھا۔ وہ عربی اور فارسی کے شاعر بھی تھے۔ بدعات کی سخت الفاظ میں تردید کرتے اور توحید کے بہت بڑے مبلغ تھے۔ تبلیغ توحید اور تردید بدعات کے سلسلے میں انھیں بہت سی تکلیفوں میں مبتلا کیا گیا۔ پینتالیس سال کی عمر میں انھیں کسی نے زہر کھلا دیا تھا جو ان کی موت کا باعث بنا۔ عبدالرشید لداخی کے والد کا نام نامی مولانا عبدالملک تھا۔ اخوند سلطان علی اور مولانا عبدالمالک دونوں باپ بیٹا دینی اور دنیوی اعتبار سے اپنے علاقے میں مرجع خلائق تھے۔

اس نواح کے ایک عالم دین مولانا عبدالصمد تھے، جنھوں نے مفتی کریم بخش اور حضرت میاں

سید نذیر حسین دہلوی کے شاگردِ رشید مولانا محمد موسیٰ سے حصولِ علم کیا تھا۔ مولانا عبدالصمد نے بلتستان کے بہت بڑے مفتی اور کتاب وسنت کے جرأت مند داعی کی حیثیت سے شہرت پائی۔

عبدالرشید ۱۹۲۵ء میں بمقام بلغار پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے خاندان کے لوگوں کا مرکز محبت تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں مولانا عبدالصمد اور والد مکرم مولانا عبدالملک سے حاصل کی۔ گیارہ سال کی عمر کو پہنچے تھے کہ والدہ وفات پاگئیں۔ یہ ان کے لیے ایک عظیم صدمہ تھا جو عمر کے ابتدائی دور میں پیش آیا۔ لیکن انھوں نے سلسلۂ تعلیم جاری رکھا۔ کچھ مدت کے بعد انھیں غواڑی کے دارالعلوم میں داخل کرا دیا گیا۔ غواڑی ان کے گاؤں بلغار سے صرف بیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا، لیکن اس وقت اس علاقے میں آمد ورفت بہت مشکل تھی۔ دریائے شیوک پر پل نہیں تھا، اس لیے وہاں پہنچنے کے لیے کم وبیش ۸۰ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ بہرکیف عبدالرشید غواڑی آئے اور وہاں کے دارالعلوم میں مولانا محمد موسیٰ اور شیخ الحدیث مفتی کریم بخش کے حلقۂ شاگردی میں شامل ہوئے۔ وہاں انھوں نے دارالعلوم کے نصاب کے مطابق تفسیر جلالین، تفسیر جامع البیان، مشکوٰۃ، نسائی، ابن ماجہ، کافیہ، شافیہ اور منطق کی چند کتابیں پڑھیں۔

۱۹۴۵ء میں ان کے والد محترم مولانا عبدالملک وفات پاگئے تو اس سے کچھ عرصہ بعد عبدالرشید اپنے اساتذہ سے اجازت لے کر امرتسر پہنچے اور مدرسہ غزنویہ میں داخلہ لیا۔ وہاں مولانا نیک محمد اور بعض دیگر اساتذہ سے کسب فیض کرنے لگے۔ امرتسر میں حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کی خدمت میں بھی حاضری دینے اور ان سے مستفید ہونے کی سعادت حاصل کی۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ امرتسر کے مدرسہ غزنویہ میں وہ کتنا عرصہ رہے اور کس استاذ سے کون سی کتابیں پڑھیں۔

امرتسر سے دہلی کا قصد کیا اور پھاٹک حبش خاں میں حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے مدرسے میں داخل ہوئے۔ یہ ان کی پرانی آرزو تھی جو پوری ہوئی۔ حضرت میاں صاحب تو اس سے بہت پہلے وفات پاچکے تھے لیکن وہ مدرسہ موجود تھا۔ اب اس کی مسندِ تدریس پر مولانا محمد یونس دہلوی متمکن تھے۔ مولانا عبدالرشید لداخی نے ان سے اخذ علم کا سلسلہ شروع کیا۔ کئی سال وہ وہاں کے اساتذہ سے استفادہ کرتے رہے۔ لیکن امرتسر کے مدرسہ غزنویہ کی طرح اس مدرسے میں بھی پتا نہیں چلتا کہ انھوں نے کون کون سی کتابیں کس کس استاذ سے پڑھیں۔ اس میں البتہ کوئی شبہ نہیں کہ زمانۂ طالب علمی ہی میں انھوں نے عربی، فارسی اور اردو کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کرلیا تھا، جس کی وجہ سے ان کی معلومات کا دائرہ وسیع ہوگیا تھا اور ادبیات سے بھی انھیں خاصی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔

مدرسہ میاں صاحب ہی میں انھیں ہندوستان کے ممتاز عالم دین مولانا سید تقریظ احمد سہوانی مرحوم سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ پہلی ملاقات ہی میں مولانا تقریظ احمد سہوانی ان کی وسعتِ

معلومات اور ذوقِ مطالعہ سے آگاہ ہوگئے تھے۔ اس وقت مولانا سہوانی نے دہلی سے (غالباً) اخبار ''اہل حدیث'' جاری کر رکھا تھا۔ فارغ وقت میں عبدالرشید لداخی روزانہ ان کی خدمت میں جاتے اور مختلف موضوعات پر دونوں کا باہم سلسلۂ گفتگو جاری رہتا۔ ان ملاقاتوں کی وجہ سے بالخصوص سہوانی علمائے کرام کے بارے میں عبدالرشید لداخی کو بہت معلومات حاصل ہوئیں۔

مولانا سید تقریظ احمد کی زیارت کا شرف اکتوبر ۱۹۴۵ء میں ان سطور کے راقم کو بھی حضرت مولانا محمد جوناگڑھی دہلوی کے مکان پر حاصل ہوا تھا۔ ضروری معلومات حاصل کرکے ان شاء اللہ ان کے متعلق مضمون لکھا جائے گا۔

دہلی کے مدرسہ میاں صاحب کے اساتذہ سے استفادے کے بعد عبدالرشید لداخی لکھنؤ کو روانہ ہوئے اور دارالعلوم ندوۃ العلما میں داخلہ لیا۔ وہاں انھوں نے سید ابوالحسن علی ندوی، شاہ حلیم عطا، مولانا محمد ادریس نگرامی، مولانا عبدالحفیظ بلیاوی، مولانا ابوالعرفان ندوی، مولانا عبداللہ عباس ندوی اور سید محمد رابع ندوی سے تحصیل علم کی۔ ان حضرات سے انھوں نے علم نحو، بلاغت، فلسفہ، منطق، فقہ، تفسیر، حدیث، تاریخ، انگریزی، سیاسیات، عربی ادب اور اقتصادیات کے موضوع سے متعلق وہ کتابیں پڑھیں جو دارالعلوم ندوۃ العلما کے نصابِ تعلیم میں شامل تھیں۔

۱۹۵۵ء میں وہ ندوہ کی نصابی تعلیم سے فارغ ہوئے اور سندلی۔ یعنی تیس سال کی عمر میں انھوں نے مختلف مدارس کی تعلیم سے فراغت پائی۔ اس سلسلے کی آخری درس گاہ ندوۃ العلما (لکھنؤ) تھی۔ اس کے بعد انھوں نے مندرجہ ذیل مدارس میں فریضۂ تدریس سرانجام دیا۔

① ...... ندوہ کا نصاب مکمل کرنے کے بعد وہ دہلی آئے اور مدرسہ میاں صاحب میں خدمت تدریس پر مامور ہوئے۔ لیکن کتنا عرصہ وہ اس مدرسے کی مسندِ تدریس پر فائز رہے، اور کن لوگوں کو پڑھایا اس کا علم نہیں ہوسکا۔

② ...... مدرسہ میاں صاحب کی تدریس کے زمانے میں ان کی ملاقات ندوے کے استاذ مولانا ابوالعرفان ندوی سے ہوئی۔ ان کے اصرار پر وہ مدرسہ عالیہ (مئو ناتھ بھنجن) تشریف لے گئے۔ وہاں وہ تین سال اس مدرسے کے طلبا کو علم نحو اور علم بلاغت کی کتابیں پڑھاتے رہے۔ لیکن اس کا سراغ نہیں مل سکا کہ وہاں انھوں نے علم نحو اور علم بلاغت کی کون کون سی کتابیں پڑھائیں، نہ یہ معلوم ہوسکا ہے کہ کن حضرات نے وہاں ان سے استفادہ کیا۔ یہ بھی پتا نہیں کہ ان کے علاوہ اس مدرسے میں اس وقت اور کون کون استاذ مشغولِ تدریس تھے۔

③ ...... مدرسہ عالیہ مئو ناتھ بھنجن سے مولانا عبدالرشید لداخی ندوی دہلی آگئے اور دہلی کے مدرسہ ریاض العلوم سے منسلک ہوئے۔ اس مدرسے میں وہ علم نحو، علم بلاغت اور تفسیر وحدیث کے

استاذ کی حیثیت سے فریضۂ تدریس سرانجام دیتے تھے۔ یہ چار علوم ہیں، لیکن یہاں بھی یہ واضح نہیں ہوسکا کہ ان علوم کی کون کون سی کتابیں وہ مدرسہ ریاض العلوم میں پڑھاتے تھے اور پڑھنے والے کون لوگ تھے۔ صرف مولانا ابوالاشبال شاغف کا پتا چلتا ہے کہ اس مدرسے میں وہ ان سے تعلیم حاصل کرتے تھے اور ان کا پڑھانے کا طریقہ بہت اچھا تھا۔ وہ نہایت محنت سے پڑھاتے تھے اور طلبا ان کے اسلوبِ درس سے بہت مطمئن تھے۔ ان کی تدریس کے بارے میں مولانا ابوالاشبال ان کے بے حد مداح ہیں۔

مولانا ابوالاشبال برصغیر کے مشہور عالم ومصنف ہیں اور مکہ مکرمہ میں اقامت گزیں ہیں۔ اس کتاب (دبستانِ حدیث) میں ان کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

④...... ۱۹۶۱ء میں مولانا عبدالرشید لداخی ندوی نے ہندوستان سے تعلق توڑ کر تا زندگی پاکستان آنے کا منصوبہ بنایا۔ وہ دہلی سے کراچی آئے، پھر واپس دہلی چلے گئے۔ پھر آئے، پھر چلے گئے۔ اس طرح انھوں نے دہلی اور کراچی کے کئی چکر لگائے۔ بالآخر انھیں پاکستان کی شہریت مل گئی اور وہ ۱۹۶۲ء میں مستقل طور پر پاکستان تشریف لے آئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ اس وقت کراچی میں شیخ عبدالوہاب دہلوی نے اپنے اہتمام میں مدرسہ رحمانیہ جاری کیا تھا اور یہ وہی مدرسہ رحمانیہ تھا جو تقسیم ملک سے قبل دہلی میں جاری تھا۔ اس وقت مولانا محمد یونس دہلوی بھی کراچی سکونت پذیر تھے۔ انھوں نے اپنے پرانے شاگرد مولانا عبدالرشید لداخی ندوی کو مدرسہ رحمانیہ میں خدمت تدریس انجام دینے کا مشورہ دیا اور سعادت مند شاگرد نے استاد کے فرمان کے مطابق اپنی خدمات کراچی کے مدرسہ رحمانیہ کے سپرد کردیں۔ ان دنوں کراچی کے اس مدرسہ میں بلتستانی طلبا بھی خاصی تعداد میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ مولانا عبدالرشید یوں تو سب طلبا کا خیال رکھتے تھے، لیکن وطنی تعلق کی بنا پر بلتستانی طلبا کا وہ خاص طور سے زیادہ خیال رکھتے تھے۔ ان کی مالی مدد بھی کرتے تھے۔ طلبا کی ہفتہ وار تقریروں کے لیے انھوں نے ''انجمن اصلاح البیان'' کے نام سے ایک تنظیم بھی قائم کی تھی تاکہ یہ اچھے مبلغ اور مقرر بنیں اور بہتر طریق سے اللہ کے دین کی خدمت کرسکیں۔ یہ معلوم نہیں کہ مولانا عبدالرشید لداخی کراچی کے مدرسہ رحمانیہ میں کتنا عرصہ خدمت تدریس میں مصروف رہے اور وہاں انھوں نے کن طلبا کو پڑھایا اور کون کون سی کتابیں پڑھائیں۔

⑤...... کراچی سے حکیم عبدالرحیم اشرف انھیں فیصل آباد لے گئے اور انھوں نے حکیم صاحب کے قائم کردہ تعلیمی ادارے ''جامعہ تعلیماتِ اسلامیہ'' میں سلسلۂ تدریس کا آغاز کردیا۔ ۱۹۷۵ء میں انھوں نے شادی کی، جب کہ وہ پچاس برس کی عمر کو پہنچ گئے تھے۔ اہلیہ کو فیصل آباد ہی لے آئے تھے۔ ہر سال تعطیلات کے زمانے میں وہ اپنے وطن بلتستان تشریف لے جاتے تھے اور اس وقت ان

کا زیادہ تر قیام دارالعلوم غواڑی میں رہتا تھا۔

جامعہ تعلیماتِ اسلامیہ میں وہ طلبا کو عربی ادب کی کتابیں پڑھاتے تھے۔ یہاں ان کا قیام پانچ سال رہا اور اس طویل مدت میں متعدد علما وطلبا نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیے۔ لیکن کس نے کیا کچھ پڑھا، اس کا علم نہیں ہوسکا۔ بس یہی سننے میں آیا کہ بہت لوگوں نے بہت کچھ پڑھا۔ وہ ''بہت لوگ'' کون ہیں اور کتنی تعداد میں ہیں؟ اور ''بہت کچھ'' کیا ہے؟ اس کا کوئی اطمینان بخش جواب کہیں سے نہیں ملتا۔

⑥...... ۱۹۷۹ء میں وہ جامعہ تعلیمات اسلامی سے اپنے آبائی وطن بلتستان تشریف لے گئے اور دارالعلوم غواڑی میں ڈیرے ڈال دیے۔ یہاں آتے ہی انھوں نے تدریس کا آغاز کردیا اور یہی ان کا اصل مشغلہ تھا۔ اب وہ تھے، ان کا کتب خانہ تھا، دارالعلوم تھا اور سلسلۂ تدریس تھا۔ یہ ان کی زندگی کی آخری قیام گاہ اور آخری درس گاہ تھی، جس میں وہ مشغول تدریس ہوئے۔ اس دارالعلوم میں وہ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۳ء تک تفسیر قرآن، عربی ادب اور علم نحو کی کتابیں پڑھاتے رہے۔ نائب شیخ الحدیث کا منصب بھی ان کے سپرد تھا۔ اس وقت مفتی عبدالقادر وہاں شیخ الحدیث تھے۔ ۱۹۸۳ء میں مفتی صاحب نے وفات پائی تو مولانا عبدالرشید ندوی کو شیخ الحدیث کی مسند پر فائز کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ وہ تفسیر، حدیث، فقہ، صرف ونحو، منطق وفلسفہ، ادبیات وغیرہ علومِ متداولہ میں مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے پینتالیس برس تدریس کی۔ اکیس برس صرف دارالعلوم غواڑی میں پڑھاتے رہے۔ وہ قرآن وحدیث کے مدرس تھے اور کامیاب مدرس تھے۔ لیکن نہایت افسوس ہے ان کے شاگردوں کے متعلق معلومات فراہم نہ ہوسکیں۔

حلم وتواضع، انکسار وعجز، عمل واخلاق اور رہن سہن میں سلف صالحین کا نمونہ تھے۔ سادہ زندگی، سادہ معاشرت، طلبا کے خیر خواہ اور لوگوں سے میل جول ان کا شیوہ تھا۔ وقت کا زیادہ حصہ مطالعۂ کتب میں گزرتا تھا۔ اہل علم کا بہ درجہ غایت احترام کرتے تھے۔ اپنے اساتذہ کا نہایت اچھے الفاظ میں ذکر کرتے۔ ان کی تکریم ان کے نزدیک فرائض میں شامل تھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی اور مولانا محمد حنیف ندوی سے بہت متاثر تھے اور ان حضرات سے مختلف اوقات میں کئی کئی دفعہ ملاقات کرچکے تھے۔

جن حضرات سے ان کے خاص مراسم وروابط رہے اور جن سے ان کی خط وکتابت رہی، ان کے ناموں کی جو مطبوعہ فہرست دارالعلوم غواڑی کے مجلّہ ''التراث'' (بابت جولائی تا دسمبر ۲۰۰۱ء) کی وساطت سے مجھے ملی ہے، اس میں اس فقیر کا نام بھی درج ہے۔ دیگر حضرات کے اسمائے گرامی یہ

ہیں: مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا مختار احمد ندوی، مولانا مختار احمد کشمیری، حکیم عبدالرحیم اشرف، حاجی محمد سعید دہلوی، ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری اور حافظ صلاح الدین یوسف۔

۱۹۸۵ء میں انھوں نے حج بیت اللہ کیا۔ واپسی میں کچھ روز راولپنڈی میں بھی قیام رہا۔ اس وقت دارالعلوم غواڑی کے ناظم مولانا عبدالرحمٰن خلیق بھی وہیں تھے۔ انہی دنوں سابق صدر پاکستان ضیاء الحق سے ان کی ملاقات ہوئی۔

مولانا عبدالرشید لداخی ندوی کثیر المطالعہ عالم اور کثیر الافادہ مدرس تھے۔ انھوں نے ہندوستان اور پاکستان کے جن مدارس میں مسئلہ تدریس جاری رکھا، وہ چھ ہیں۔ ان کی تفصیل گزشتہ صفحات میں بیان کردی گئی ہے۔ ان چھ مدارس میں ان سے لازماً بے شمار شائقین علم نے استفادہ کیا ہوگا، لیکن ان میں سے ہمیں صرف تین حضرات کے اسماے گرامی کا پتا چل سکا ہے، اور وہ ہیں: مولانا ابوالاشبال صغیر احمد شاغف، مولانا عبداللہ ناصر اور پروفیسر عطاء الرحمٰن ثاقب۔ ان میں سے عطاء الرحمٰن ثاقب تو ۱۹۔ مارچ ۲۰۰۲ء کو جامِ شہادت نوش کر گئے۔ لیکن مولانا ابوالاشبال اور مولانا عبداللہ ناصر اس دنیا میں موجود ہس اور اللہ کی مہربانی سے اپنے اپنے انداز میں خدمت دین میں مصروف ہیں۔ اگر کوئی صاحب ہمت کرکے ان کے شاگردوں کی چھوٹی موٹی فہرست مختصر تعارف کے ساتھ تیار کردیں تو یہ بھی ایک خدمت ہوگی اور ہمیں پتا چل سکے گا کہ ان میں سے کون صاحب کہاں کوئی تصنیفی یا تدریسی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔

مولانا عبدالرشید لداخی جس طرح خود مطالعہ کے شائق تھے اور مختلف موضوع کی کتابیں پڑھتے رہتے تھے، اپنے شاگردوں کے بارے میں بھی وہ یہی چاہتے تھے کہ وقت کو غنیمت جانیں اور مطالعۂ کتب میں مصروف رہیں۔ چناں چہ وہ انھیں کسی نہ کسی طرح کتابیں مہیا کرتے رہتے تھے اور جس طالب علم کی جس موضوع سے دلچسپی کا اندازہ کرتے، اس کے مطابق اسے مطالعہ کی تلقین فرماتے۔ انھوں نے دارالعلوم غواڑی میں مکتبہ رشیدیہ کے نام سے چھوٹا سا مکتبہ قائم کررکھا تھا۔ اس مکتبے میں وہ ملک اور بیرونِ ملک سے کتابیں منگواتے اور سستے داموں وہ کتابیں طلبا کو دیتے تھے۔ اس طرح طلبا کو کتاب سے ایک تعلق رہتا۔

عمر کے آخری دور میں انھیں بعض عوارض نے گھیر لیا تھا اور وہ جسمانی طور پر بہت کم زور ہوگئے تھے۔ ۱۹۹۵ء میں بینائی متاثر ہوئی اور راولپنڈی میں آنکھوں کا آپریشن کرایا گیا۔ اس کے بعد مطالعے کا تسلسل ٹوٹ گیا جو ان کے ذہن وفکر کے لیے تقویت کا باعث تھا۔ آہستہ آہستہ وہ چارپائی پر لیٹ گئے۔ نہ چلنے پھرنے کی ہمت رہی نہ لکھنے پڑھنے کی طاقت۔

۹۔ مارچ ۲۰۰۰ء کو انھیں علاج کے لیے دسٹرکٹ ہسپتال سکردو میں داخل کرایا گیا۔ ڈاکٹروں

نے بڑی توجہ سے علاج کیا لیکن افاقہ نہ ہوا۔ ان کی تشخیص کے مطابق وہ معدے کی خرابی اور خون کی کمی کا شکار ہوگئے تھے۔ اس کا علاج ان کے نزدیک راولپنڈی کے فوجی ہسپتال (سی ایم ایچ) میں ہوسکتا تھا۔ چناں چہ سکردو کے ڈسٹرکٹ ہسپتال سے نکال کر انھیں راولپنڈی کے فوجی ہسپتال میں لایا گیا۔ ایک مہینا اس ہسپتال میں داخل رہے اور باقاعدگی سے علاج ہوتا رہا لیکن روز بروز مرض بڑھتا گیا۔

پھر غواڑی لائے گئے۔ معالجوں نے تو پوری توجہ سے علاج کرنا ہی تھا اور کیا بھی، لیکن علما وطلبا اور دیگر حضرات نے بھی بیماری کے دنوں میں ان کی بے حد خدمت کی۔

آخر وقتِ موعود آگیا جو ہر شخص پر آتا ہے۔ ۳۱۔ دسمبر ۲۰۰۰ء کو شب کے ساڑھے آٹھ بجے کلمۂ طیبہ پڑھتے ہوئے اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون .

سخت سردی کے باوجود کثیر تعداد میں لوگوں نے نمازِ جنازہ میں شرکت کی۔ نمازِ جنازہ نمازِ ظہر کے بعد بلتستان کے مشہور عالم مولانا ثناء اللہ سالک نے پڑھائی۔

یکم جنوری ۲۰۰۱ء کو ان کی وصیت کے مطابق انھیں موضع غواڑی کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

اللھم اکرم نزلہ ووسع مدخلہ وادخلہ جنت الفردوس .

انھوں نے پچاس برس کی عمر میں ۱۹۷۵ء میں شادی کی تھی۔ شادی کے پچیس برس بعد ان کی وفات ہوئی۔ لیکن وہ اولاد سے محروم رہے۔

وہ نہایت پاکیزہ فطرت عالم دین تھے۔ اسی لیے دم دعا کرانے والے لوگ اچھی خاصی تعداد میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے نمازِ عصر کے بعد کا وقت مقرر کر رکھا تھا۔

غالباً وہ علاقہ بلتستان کے واحد ندوی تھے۔



حافظ عبدالقہار سلفی دہلوی

مولانا عبدالوہاب دہلوی برصغیر کے ایک باہمت عالم دین تھے جو حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگردوں کی جماعت کے اہم رکن تھے۔ ❶ مولانا ممدوح کے فرزندگانِ گرامی میں سے ایک فرزند حافظ عبدالقہار سلفی دہلوی تھے، جنھوں نے تدریسی خدمات بھی سرانجام دیں اور تصنیفی بھی۔ ان کی تصنیفی خدمات کا تعلق قرآنِ مجید سے بھی ہے اور نبی ﷺ کی احادیث مبارکہ سے بھی۔ قرآنِ مجید کے سلسلے میں انھوں نے جو کارنامے انجام دیے، ان کا تذکرہ میں اپنی کتاب ''برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن'' میں کرچکا ہوں۔ ❷ ان سطور میں ان کی ان مساعی کے بارے میں اپنی معروضات پیش کرنا مقصود ہے جو انھوں نے حدیث مبارکہ کے سلسلے میں سرانجام دیں۔

حافظ عبدالقہار ۱۹۲۲ء (۱۳۴۰ھ) کے پس و پیش دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں اپنے والد مکرم کے قائم کردہ مدرسے دارالکتاب والسنہ میں قرآن بھی حفظ کیا اور مروّجہ علوم دینیہ کی تحصیل بھی کی۔ جن اساتذہ کرام سے انھوں نے اخذِ علم کیا وہ ہیں ان کے برادر کبیر حافظ عبدالستار دہلوی، مولانا عبدالجلیل خان جھنگوی، مولانا ظل الرحمٰن، شاہ عبدالحکیم، میاں نذیر احمد اور حافظ عبدالغفور۔ ان میں سے حافظ عبدالستار دہلوی اور مولانا عبدالجلیل خان جھنگوی سے انھوں نے علوم تفسیر اور حدیث میں استفادہ کیا اور دیگر اساتذہ سے صرف ونحو اور منطق وفلسفہ وغیرہ کی نصابی کتابیں پڑھیں۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنی معہد علمی دارالکتاب والسنہ میں فریضۂ تدریس سرانجام دینے لگے، نیز ان کے والد گرامی کے جاری کردہ مجلّے ''صحیفہ اہل حدیث'' کے انتظامی امور کی نگرانی ان کے سپرد ہوئی۔ آزادیٔ برصغیر (۱۹۴۷ء) تک وہ دہلی میں اس خدمت میں مصروف رہے۔

۱۹۴۷ء میں اپنے خاندان کے ساتھ دہلی سے کراچی آ گئے۔ یہاں ان حضرات نے برنس روڈ کی ایک مسجد میں مدرسہ عربیہ اسلامیہ جاری کیا۔ اس میں حافظ عبدالقہار سلفی دہلی کی طرح تدریس میں مصروف ہوئے اور کتب حدیث میں سے بلوغ المرام، مشکوۃ، سنن ابن ماجہ، جامع ترمذی اور بعض دیگر کتابیں کئی کئی دفعہ پڑھائیں۔ نصاب کی دوسری کتابوں کی تدریس بھی کرتے رہے۔ آخری دور میں صرف ترجمہ قرآن اور مشکوٰۃ شریف کی تدریس تک اپنے آپ کو محدود کرلیا تھا۔ ان

---

❶ ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب ''کاروانِ سلف'' (صفحہ ۱۳ تا ۳۲) مکتبہ اسلامیہ اردو بازار لاہور

❷ دیکھیے صفحہ ۳۶۲ و ۳۶۳

کے شاگردوں کی فہرست میں مندرجہ ذیل حضرات شامل ہیں:

مولانا محمد سلیمان جوناگڑھی بن مولانا محمد جوناگڑھی دہلوی، مولانا عبدالعزیز نورستانی، مولانا محمد سرور شفیق، مولانا محمد سلفی ناظم جامعہ ستاریہ کراچی، مولانا حافظ محمد انس مدنی، مولانا محمود احمد حسن شیخ الحدیث جامعہ ستاریہ کراچی، مولانا منیر احمد شاکر، مولانا محمد اسحاق شاہد، مولانا محمد حنیف سلفی فیصل آباد، مفتی محمد ادریس سلفی، حافظ محمد الیاس سلفی، رانا شفیق پسروری، مولانا محمد عیسیٰ پشاوری اور دیگر بہت سے علمائے کرام۔

حافظ عبدالقہار سلفی کا وعظ وخطابت کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ وہ جماعت غرباء اہل حدیث پاکستان کے شعبۂ افتا کے صدر تھے اور نہایت تحقیق سے فتوئی دیتے تھے۔ اس کے علاوہ تصنیف وتالیف سے بھی انھیں دلچسپی تھی۔ قرآن سے متعلق انھوں نے جو تصنیفی کام کیا اس کا تذکرہ ’’برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن‘‘ میں کیا گیا ہے۔ حدیث کے موضوع سے متعلق ان کی تحریری خدمات یہ ہیں۔

① ...... ترغیب وترہیب: یہ علامہ زکی الدین عبدالعظیم بن عبدالقوی منذری کی تصنیف ہے جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں اعمالِ خیر کی طرف رغبت دلانے اور اعمالِ بد سے ڈرانے والی احادیث جمع کی گئی ہیں۔ حافظ عبدالقہار سلفی نے اس کی چھ جلدوں کا اردو ترجمہ کیا ہے۔

② ...... چہل حدیث بابت قربانی: اس کتاب میں قربانی سے متعلق چالیس احادیث جمع کی گئی ہیں۔

③ ...... مسائل جنازہ: اس رسالے میں احادیث کی روشنی میں نمازِ جنازہ اور اس کے متعلقہ مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

④ ...... مسنون دعائیں: یہ رسالہ ان دعاؤں پر مشتمل ہے جو نبی ﷺ نے ارشاد فرمائی ہیں اور کتب احادیث میں مذکور ہیں۔

⑤ ...... مکمل نماز: یہ کتاب نماز سے متعلق ہے اور حافظ عبدالقہار سلفی کے والد گرامی مولانا عبدالوہاب دہلوی کی تصنیف ہے۔ حافظ صاحب نے اس میں مفید اضافے کر کے شائع کیا ہے۔

⑥ ...... وسیلہ: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کتاب میں وسیلے کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

⑦ ...... واقفیت اسلام: یہ کتاب تین حصوں میں ہے اور اس میں آسان زبان میں بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے ضروری مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

حافظ عبدالقہار سلفی دہلوی کا حلیہ اور لباس یہ تھا: چھوٹا قد، دبلے پتلے، گندمی رنگ، سفید

داڑھی۔ چھوٹی آنکھیں۔ سفید کرتہ اور شلوار قمیص میں ملبوس۔ سر پر سفید کپڑے کی ٹوپی۔

وہ متقی اور تہجد گزار بزرگ تھے۔ خوش مزاج، صابر و شاکر، بلند اخلاق اور ملنسار۔ دم درود اور دعا کرانے والے لوگ بھی ان کے پاس آتے تھے اور وہ ان کے لیے دعا کرتے تھے۔

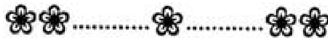
حافظ عبدالقہار سلفی نے بدھ کے روز ۳۱۔ مئی ۲۰۰۶ء کو کراچی میں وفات پائی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون .

دوسرے دن (جمعرات کو) شام کے پانچ بجے مولانا عبدالرحمٰن سلفی نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے اور کراچی میں وفات پائی اور اسی شہر کے قبرستان میں انھیں دفن کیا گیا۔

اللھم نور قبرہ وادخلہ جنت الفردوس .

حافظ صاحب مرحوم کی اولاد نرینہ تین بیٹے تھے۔ حافظ محمد ادریس، حافظ محمد الیاس اور حافظ عبدالسلام۔ حافظ محمد الیاس نے ان کی زندگی میں ۱۵۔ فروری ۲۰۰۶ء کو وفات پائی۔ حافظ محمد ادریس درس و تدریس میں مصروف ہیں اور حافظ عبدالسلام جامعہ ستاریہ کراچی کے لائبریرین ہیں۔



حافظ محمد الیاس سلفی

حافظ محمد الیاس سلفی کے والد حافظ عبدالقہار دہلوی، دادا مولانا عبدالوہاب دہلوی اور تایا مولانا حافظ عبدالستار دہلوی تھے۔ حافظ محمد الیاس ۱۹۵۵ء میں کراچی میں پیدا ہوئے۔ عمر کی چند منزلیں طے کیں تو مدرسہ عربیہ اسلامیہ میں حصول علم کا آغاز کیا۔ کراچی کے جامعہ بنوریہ بنوری ٹاؤن میں بھی کچھ عرصہ پڑھتے رہے۔ ان مدارس میں درسِ نظامی کی تکمیل کی، قرآنِ مجید حفظ کیا اور پھر میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ کراچی میں جن اساتذہ سے اکتسابِ علم کیا، ان میں ان کے والد حافظ عبدالقہار سلفی، حافظ عبدالرحمٰن سلفی، مولانا عبدالعزیز (ساکن جھوک دادو، ضلع فیصل آباد) شیخ الحدیث قاری عبدالحکیم کرم الجلیلی، مولانا عبدالعزیز نورستانی، مولانا محمد اسحاق شاہد، مولانا محمد سلیمان جونا گڑھی، مفتی ولی حسن ٹونکی، مفتی احمد الدین، مولانا عبدالقیوم شامل ہیں۔

اس کے بعد ۱۹۷۴ء میں حافظ محمد الیاس مدینہ یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور چار سال وہاں تعلیم حاصل کی۔ مدینہ یونیورسٹی میں انھوں نے جن اساتذہ سے حصولِ فیض کیا ان میں شیخ عبدالعزیز بن باز، مولانا عبدالغفار حسن، شیخ محمد امان جامی، ابوبکر الجزائری، شیخ محسن العباد اور دیگر حضرات شامل ہیں۔

مدینہ یونیورسٹی کے نصاب کی تکمیل کے بعد ۱۹۸۱ء میں سعودی حکومت کی طرف سے بہ طور مبعوث انھیں فجیرہ (عرب امارات) بھیج دیا گیا۔ چوبیس سال وہ وہاں درس وتدریس اور تبلیغ دین کے ساتھ تصنیف وتالیف اور ترجمے کی خدمت سرانجام دیتے رہے۔ ان کی ترجمہ شدہ کتابوں میں سے چند کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:

① ...... جامع ترمذی کا اردو ترجمہ۔ مشتمل بر تین جلد

② ...... صحیح ابن خزیمہ کی اس جلد چہارم کا اردو ترجمہ جو علامہ ناصر الدین البانی کی تحقیق سے چھپی۔ اس کی تین جلدوں (پہلی، دوسری اور تیسری) کا ترجمہ حافظ محمد الیاس سلفی کے بڑے بھائی مولانا محمد ادریس سلفی نے کیا۔ یہ چاروں جلدیں مکتبہ اشاعت الکتاب والسنہ محمدی مسجد بن قاسم روڈ کراچی کی طرف سے شائع ہوئیں۔

③ ...... عمل الیوم واللیلہ: ابوبکر ابن سنی کی عربی کتاب ہے جس میں دن رات کے وظائف واوراد تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ حافظ محمد الیاس نے اس کا اردو ترجمہ کیا۔ بعض مقامات پر حواشی بھی سپردِ قلم کیے۔

④...... احادیث قدسیہ: یہ کتاب صحاح ستہ کی چار سو احادیث قدسیہ کا مجموعہ ہے۔ حافظ صاحب ممدوح نے اس کتاب کو اردو میں منتقل کیا۔ احادیث پر حواشی بھی دیے گئے ہیں۔

⑤...... مختصر عمل الیوم واللیلہ: مصنف ابوبکر ابن سنی۔ اردو ترجمہ حافظ محمد الیاس سلفی۔

⑥...... الکلم الطیب: امام ابن تیمیہ کی دعاؤں پر مشتمل کتاب۔ حافظ محمد الیاس نے ''پاکیزہ دعائیں'' کے نام سے اس کا ترجمہ کیا۔

⑦...... حرمین شریفین کی دعائیں: شیخ عبدالرحمٰن السدیس کی دعائیں۔ حافظ محمد الیاس کے بیٹے حافظ حسن الیاس نے مرتب کی تھیں۔ حافظ الیاس مرحوم نے اس کا ترجمہ کیا۔

⑧...... ۲۰۰ احکامِ رمضان وصیام: تالیف محمد صالح المنجد، اردو ترجمہ حافظ محمد الیاس۔

⑨...... احکامِ زکوٰۃ: سید سابق کی کتاب فقہ السنہ کے اس حصے کا ترجمہ جس میں زکوٰۃ سے متعلق احکام بیان کیے گئے ہیں۔

⑩...... شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کی دینی خدمات: شیخ عبدالعزیز بن باز کے عربی رسالے کا ترجمہ۔

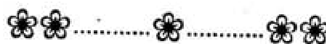
⑪...... اپنا گھر اچھا بنایے: شیخ صالح المنجد کے ایک رسالے کا ترجمہ۔ اس رسالے میں بتایا گیا ہے کہ اپنے گھر کی فضا کو پرسکون کس طرح بنایا جاسکتا ہے۔

حافظ صاحب فجیرہ (عرب امارات) میں اپنے دعوتی کاموں میں مصروف تھے کہ انھیں گردوں کی تکلیف ہوئی۔ وہ کراچی آگئے اور یہاں گردوں کا علاج کرانے لگے۔ لیکن تکلیف میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ گردے بالکل ختم ہوگئے اور وہ ۱۵۔ فروری ۲۰۰۶ء کو وفات پاگئے۔ اگلے روز ان کی نمازِ جنازہ مولانا عبدالرحمٰن سلفی نے پڑھائی۔ اس سے ٹھیک ڈھائی مہینے بعد ۳۱۔ مئی ۲۰۰۶ء کو ان کے والد حافظ عبدالقہار سلفی کا انتقال ہوا۔ یعنی باپ کے سامنے بیٹے نے سفر آخرت اختیار کیا۔

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

اس سے قبل یکم دسمبر ۱۹۹۷ء کو حافظ الیاس کے ایک لائق جوان بیٹے حافظ حسن الیاس فجیرہ میں بیس سال کی عمر میں فوت ہوگئے تھے۔

حافظ الیاس کے تین بیٹے تھے: ایک حافظ حسن الیاس جو وفات پاگئے۔ دوسرے حافظ محسن الیاس ہیں۔ یہ فجیرہ میں دعوت وتبلیغ کا کام کرتے ہیں۔ تیسرے حافظ احمد الیاس ہیں۔ یہ جامعہ ستاریہ (کراچی) کے فارغ التحصیل ہیں۔



مولانا عبدالصمد رؤف

۱۹۴۹ء میں پنجاب کے اہل حدیث مدارس کے طلبا کی تنظیم کے لیے حافظ محمد یحیٰ عزیز میر محمدی، مولانا ابوبکر سلفی، خلیل اثری اور ان سطور کا راقم اوڈاں والا (چک نمبر ۴۹۳ گ ب) گئے تو پہلی دفعہ وہاں جن حضرات سے ملاقات ہوئی، ان میں مولانا عبدالصمد رؤف بھی شامل تھے۔ یہ ان کی نوجوانی کا زمانہ تھا۔ ان کا اس وقت کا حلیہ اب تک لوحِ قلب پر مرتسم ہے۔ گول چہرہ، سرخی مائل رنگ، روشن آنکھیں، کشادہ پیشانی، ابھری ہوئی ذرا سی موٹی ناک، میانہ قد، تہبند اور قمیص میں ملبوس۔ سر پر پٹکا۔ لباس خالص دیہاتی اور لہجہ ابنالوی۔ وہ تدریس کا فریضہ تو وہاں کے مدرسہ تعلیم الاسلام میں انجام دیتے ہی تھے، لیکن مجھے یہ معلوم کرکے خاص طور سے خوشی ہوئی کہ وہ ادبی ذوق بھی رکھتے ہیں، انھوں نے گفتگو میں جن لوگوں کا تذکرہ کیا، وہ اپنے دور کے صاحب طرزِ ادیب تھے اور جن کتابوں کے نام لیے وہ خالص ادبی کتابیں تھیں۔ بعض ادبی رسالوں کے مضامین کا بھی انھوں نے تذکرہ فرمایا۔ ان کی اس قسم کی گفتگو سے میرے ذہن پر ان کا جو تاثر ابھرا وہ ہمیشہ قائم رہا، اب بھی قائم ہے۔

اس گاؤں کے لوگوں کو آباد کار کہا جاتا ہے اور ان کا قدیم وطن ضلع انبالا کی تحصیل روپڑ تھا۔ یہ لوگ اس وقت اپنے قدیم وطن سے یہاں آئے تھے، جب انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے علاقے کی چک بندی ہوئی اور پنجاب کے مختلف علاقوں سے آنے والوں کو یہاں زمینیں الاٹ کی جانے لگیں۔ اس وقت روپڑ کا قصبہ ضلع انبالا کی ایک تحصیل تھا اور صوبہ پنجاب میں شامل تھا، اب روپڑ کو ایک مستقل ضلع کی حیثیت حاصل ہے اور یہ ضلع صوبہ ہریانہ (یا ہماچل پردیش) میں شامل ہے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ تقسیم ملک کے بعد مشرقی پنجاب کو حکومت ہند نے تین صوبوں میں تقسیم کردیا تھا۔ ایک صوبے کا نام پنجاب ہی رہا، دوسرے کو ہریانہ اور تیسرے کو ہماچل پردیش کہا جانے لگا۔ پنجاب کا دارالحکومت پٹیالہ اور ہریانہ اور ہماچل پردیش کا دارالحکومت چنڈی گڑھ ہے۔

مولانا عبدالصمد رؤف کے والد کا اسم گرامی صوفی محمد ابراہیم تھا، جو ۱۸۸۰ء میں موضع روپ نگر تحصیل روپڑ ضلع انبالا میں پیدا ہوئے۔ روپ نگر بڑا خوب صورت نام ہے اور ''روپ'' کے معنے پنجابی اور ہندی میں خوب صورتی کے ہیں اور جوانی کی خوب صورتی جسم پر لہرا رہی ہو تو سبحان اللہ۔ ؏

حسینوں کے جو بن پہ چھایا ہے روپ

اور نگر کا اطلاق پنجابی اور ہندی میں گاؤں، بستی اور قصبے پر ہوتا ہے۔ ع

اجڑی جاتی ہے یہ بستی ، یہ نگر بستا ہے

چھوٹی بستی کو "نگری" کہا جاتا ہے۔ ممکن ہے مولانا عبدالصمد رؤف کے روپ نگر میں خوب رو لوگ بستے ہوں اور یہی اس گاؤں کی وجہ تسمیہ ہو۔ جس گاؤں میں یہاں آ کر یہ لوگ آباد ہوئے اس کا نام "اوڈاں والا" ہے اور اس کی بھی وجہ تسمیہ ہے اور وہ یہ کہ ان کی آمد سے پہلے یہاں اوڈ قوم کے لوگوں کی جھونپڑیاں تھیں، جن میں وہ رہتے تھے، ان کے آنے پر اوڈ تو یہاں سے چلے گئے لیکن مستقل طور سے انھیں اپنا نام دے گئے۔ انگریزوں نے ان کے مسکن کو چک نمبر ۴۹۳ گ ب کا نام دیا اور اوڈ اپنی قدیم سکونت کی بنا پر ان کو "اوڈاں والا" کا نام عنایت کر گئے جو انگریزوں کے دیے ہوئے نام چک نمبر ۴۹۳ گ ب پر غالب آ گیا۔

صوفی محمد ابراہیم اپنے بہت سے ہم وطنوں کے ساتھ ۱۹۰۰ء کے پس وپیش آباد کار کی حیثیت سے اوڈاں والا آئے تھے۔ یہ ان کی جوانی کا زمانہ تھا۔ شاید بیس بائیس برس کی عمر ہوگی۔ میں نے ان کو دیکھا ہے، لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب ان کی جوانی کا سایہ ڈھل چکا تھا اور وہ کہولت کے دور سے بھی آگے نکل کر عالم پیری کی سرحد میں داخل ہو گئے تھے۔ نہایت تقویٰ شعار بزرگ تھے۔ اوڈاں والا کے بے شمار بچوں کو انھوں نے ناظرہ قرآنِ مجید پڑھایا اور بعض لوگوں کو قرآن کا ترجمہ بھی پڑھایا۔ صوفی عبداللہ صاحب ۱۹۲۳ کے پس وپیش اس گاؤں میں آئے تو ایک روایت کے مطابق انھوں نے بھی صوفی محمد ابراہیم صاحب سے قرآنِ مجید کا ترجمہ پڑھا، حالاں کہ وہ یہاں آنے سے پہلے بھی ترجمہ قرآن پڑھ چکے تھے۔

مولانا عبدالصمد رؤف اسی نیک بخت شخص صوفی محمد ابراہیم کے بیٹے تھے جو ۱۹۲۶ء میں اوڈاں والا (تحصیل سمندری، ضلع فیصل آباد) میں پیدا ہوئے۔ کچھ ہوش سنبھالا تو ناظرہ قرآنِ مجید پڑھا۔ پھر قریب کے ایک گاؤں کے سرکاری سکول میں داخلہ لیا اور لوئر مڈل یعنی چھ جماعتوں تک اس سکول میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے ساتھ ساتھ گھر میں دینیات سے متعلق اردو کتابیں پڑھتے رہے۔

چھ جماعتیں پڑھنے کے بعد والد صاحب نے بچے کو صوفی عبداللہ مرحوم ومغفور کے جاری کردہ دارالعلوم تعلیم الاسلام میں داخل کرادیا۔ یہ دارالعلوم ان کے گاؤں اوڈاں والا ہی میں قائم تھا۔ اس دینی مدرسے میں عبدالصمد رؤف نے بڑی محنت اور شوق سے تعلیم حاصل کی اور تمام مروّجہ درسی کتابیں پڑھیں۔ ان کے ہم سبق اور ہم جماعت لوگوں میں سے مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

① ...... مولانا محمد یعقوب ملہوی: وفات ۴۔ نومبر ۱۹۸۱ء

②...... مولانا حافظ عبدالغفور جہلمی: وفات ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۸۶ء

③...... پیر محمد یعقوب قریشی: وفات ۲۱۔ جولائی ۲۰۰۳ء

④...... مولانا محمد صادق خلیل: وفات ۶۔ فروری ۲۰۰۴ء

⑤...... مولانا عبدالقادر ندوی: مدظلہ العالی

ان کے تمام ساتھیوں نے اپنے اپنے دائرۂ عمل میں بڑا نام پایا۔ بڑی تدریسی خدمات سرانجام دیں اور بہت لوگوں کو فائدہ پہنچایا۔

۱۹۴۵ء میں عبدالصمد رؤف مدرسہ تعلیم الاسلام (اوڈاں والا) سے فارغ التحصیل ہوئے اور سند فراغ لی۔ پھر صوفی عبداللہ صاحب اور اپنے والد محترم کے حکم سے اسی مدرسے میں خدمت تدریس انجام دینے لگے۔ ۱۹۴۶ء میں اسی مدرسے کی طرف سے انھوں نے پنجاب یونیورسٹی میں مولوی فاضل کا امتحان دیا اور نمایاں پوزیشن حاصل کی۔ اس سے کچھ عرصہ بعد میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پڑھنے میں بہت تیز تھے اور ذہنِ رسا پایا تھا۔

تمام درسی تعلیم اپنے گاؤں کے دارالعلوم تعلیم الاسلام سے حاصل کی۔ ان کے اساتذہ کی لائق تکریم جماعت میں مندرجہ ذیل حضرات شامل ہیں۔ بہ ترتیب وفات نام ملاحظہ ہوں:

①...... مولانا حافظ محمد گوندلوی: وفات ۴۔ جون ۱۹۸۵ء

②...... مولانا محمد اسحاق چیمہ: وفات ۲۳۔ مارچ ۱۹۹۳ء

③...... مولانا محمد داؤد بھوجیانی رحمانی: وفات ۵۔ نومبر ۱۹۹۵ء

④...... مولانا حافظ محمد اسحاق حسینوی: وفات ۴۔ جولائی ۲۰۰۲ء

ان بزرگانِ عالی قدر میں سے دارالعلوم کے لیے سب سے زیادہ خدمات حافظ محمد اسحاق حسینوی کی ہیں۔ وہ کئی سال یہاں رہے اور بہت لوگ ان سے فیض یاب ہوئے۔

مولانا عبدالصمد رؤف منجھے ہوئے مدرس تھے۔ درسی کتابوں پر عبور حاصل تھا۔ ذمہ داری اور محنت سے پڑھاتے تھے۔ مطالعہ وسیع تھا۔ طلبا ان کے طریق تدریس سے مطمئن تھے۔ کہیں جانے آنے کی عادت نہ تھی۔ تقریر وخطابت اور جلسے جلوس سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ نہ کسی مذہبی اجتماع میں جاتے تھے، نہ سیاسی اجتماع میں۔ درس وتدریس کے علاوہ کسی معاملے سے کوئی تعلق نہ تھا۔

۱۹۶۳ء میں حضرت صوفی عبداللہ صاحب نے ماموں کانجن ریلوے اسٹیشن کے قریب دارالعلوم کے لیے جگہ خرید لی تھی۔ اسی سال ۱۳۔ ستمبر کو نئی عمارت کی بنیاد رکھ دی تھی۔ اسی سال کچھ عمارت تیار ہوگئی تو ایک جماعت اوڈاں والا سے ماموں کانجن آ گئی تھی اور محدود سے پیمانے پر تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۶۴ء میں مزید کمرے تعمیر ہوگئے تو دوسری، تیسری، چوتھی (تین) جماعتیں

ماموں کانجن منتقل کردی گئی تھیں۔ پھر ۱۹٦۹ء میں مروّجہ نصاب کی تمام جماعتوں کی تعلیم کا انتظام ماموں کانجن کی نئی عمارت میں ہوگیا تھا۔ اوڈاں والا (گاؤں) میں جو مدرسہ باقی رہا، اس کا انتظام مولانا محمد یعقوب ملہوی نے سنبھال لیا تھا اور اس کا نام دارالعلوم تقویۃ الاسلام رکھ دیا گیا تھا۔ مولانا عبدالصمد رؤف گاؤں ہی میں رہے اور دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں ان کا تدریسی سلسلہ جاری رہا۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ بہت لائق مدرس تھے اور نہایت محنت سے فریضہ تدریس سرانجام دیتے تھے، اگر وہ کسی اور مدرسے میں جانا چاہتے تو مالی اعتبار سے بہت فائدے میں رہتے۔ لیکن انھوں نے اپنے گاؤں کے دارالعلوم کو نہیں چھوڑا۔ تمام عمر اسی میں گزار دی۔ وہ قناعت پیشہ مدرس تھے اور انکسار ان کا لازمۂ حیات تھا۔

۱۹۴۹ء سے میرے ان سے تعلقات تھے، لیکن اس طویل مدت میں ملاقات کے مواقع بہت کم میسر آئے۔ میں ہی کبھی وہاں گیا تو ان سے ملاقات ہوئی۔ آخری ملاقات وفات سے سات آٹھ مہینے پہلے ہوئی۔ مولانا عبدالقادر ندوی نے بتایا کہ وہ بہت بیمار ہیں۔ چناں چہ میں اوڈاں والے گیا اور مولانا عبدالقادر ندوی کے ساتھ ان کے مکان پر ان کی خدمت میں حاضری دی۔ چہرے کے آثار تو وہی تھے، لیکن کم زوری غالب آچکی تھی۔ لیٹے ہوئے تھے، اٹھنے کی کوشش کی، لیکن میں جلدی سے ان کی چارپائی پر بیٹھ گیا اور انھیں اٹھنے نہیں دیا۔ چند منٹ باتیں کیں اور میں اجازت لے کر آگیا۔ حالت مستقبل کی نشان دہی کررہی تھی۔

بعد میں پتا چلا کہ کچھ افاقہ ہوگیا تھا۔ بیماری کی حالت میں باقاعدہ طلبا کو پڑھاتے رہے۔ وہ عربی ادب، صرف ونحو، تفسیر وحدیث اور دیگر علوم درسی کی تمام کتابیں بے حد انہماک سے پڑھاتے تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہوگی۔ انھوں نے مسلسل ساٹھ برس علوم دینیہ کی تدریس کی اور نہایت شوق سے کی۔ بلاشبہ وہ استاذ الاساتذہ تھے۔ ان کے شاگرد بھی استاذ الاساتذہ ہیں۔

ان سے باقاعدہ استفادہ کرنے والوں کی وسعت پذیر فہرست میں مولانا عبداللہ امجد چھتوی شیخ الحدیث مرکز الدعوۃ السّلفیہ ستیانہ بنگلہ، مولانا عبدالرشید ہزاروی شیخ الحدیث دارالحدیث اوکاڑہ، مولانا عبدالرشید اثاروی، مولانا عبدالحمید ہزاروی، مولانا قدرت اللہ فوق (مرحوم) مولانا محمد رمضان سلفی، پروفیسر ڈاکٹر اسماعیل عقیل گورایہ، پروفیسر غلام نبی عارف، مولانا عبدالباقی بلتستانی، پروفیسر ڈاکٹر محمد شریف شاکر، مولانا عبدالعزیز راشد، پروفیسر ظفر اللہ چودھری (مرحوم) میاں ابوبکر (اسلام آباد) اور دیگر بے شمار حضرات شامل ہیں۔

انھوں نے تمام عمر تدریس میں گزار دی۔ وفات سے دو دن پہلے تک پڑھاتے رہے۔ سنا ہے کہ مقدمہ صحیح مسلم کا اردو ترجمہ کیا ہے اور اس کا مسودہ محفوظ ہے۔ مولانا ممدوح نے ۲۷۔ نومبر

۲۰۰۵ء (۲۵۔شوال ۱۴۲۶ھ) کو اوڈاں والا چک نمبر ۴۹۳ گ ب میں وفات پائی۔ ان کی نماز جنازہ دو مرتبہ پڑھی گئی۔ پہلی مرتبہ مولانا حافظ محمد امین (شیخ الحدیث دار العلوم تقویۃ الاسلام اوڈاں والا) نے پڑھائی۔ دوسری مرتبہ مولانا حافظ عبدالسلام بھٹوی نے پڑھائی۔ نمازِ جنازہ میں علما وطلبا اور عوام وخواص کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه

مولانا مرحوم کی اولاد چار لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔

چار لڑکوں کے نام اور کام کا معاملہ اس طرح ہے:

① ......عبدالباقی: کلرک محکمہ تعلیم

② ......عبدالکبیر: کلرک محکمہ تعلیم

③ ......عبدالقدیر: کاشت کاری میں مصروف ہیں۔

④ ......عبدالرقیب: دار العلوم تقویۃ الاسلام (اوڈاں والا) کے سند یافتہ ہیں۔ کچھ عرصہ جامعہ الدعوۃ الاسلامیہ (مرید کے) میں مدرس رہے۔ آج کل ایک مقامی سرکاری سکول میں پڑھاتے ہیں اور کاشت کاری میں اپنے بھائی عبدالقدیر کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے بیٹوں میں سے تعلیم کے سلسلے میں باپ کے مقام کو کوئی بھی نہیں پہنچ سکا۔ ہر شخص کے اپنے حالات ہوتے ہیں جو اسے ایک خاص دائرے میں جکڑے رکھتے ہیں۔ بسا اوقات کوشش کے باوجود وہ حالات کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔



حافظ عبدالرحمٰن گوہڑوی

برصغیر کی آزادی (اگست ۱۹۴۷ء) کے بعد کا زمانہ ان لوگوں کے لیے بے حد افراتفری اور انتہائی بے چینی کا زمانہ تھا جو مشرقی پنجاب یا ہندوستان کے کسی علاقے سے گرتے پڑتے پاکستان پہنچے تھے لیکن جو لوگ پہلے سے پاکستانی علاقوں کے رہنے والے تھے، ان کے لیے یہ انتہائی مسرت کا دور تھا، ان میں سے زیادہ تر لوگ ماشاء اللہ غیر مسلموں کے چھوڑ ہوئے اثاثے یعنی مالِ غنیمت اکٹھا کرنے کے کارِ خیر میں مصروف تھے۔ یہ اللہ کا ان پر خاص کرم تھا جس کی بہ دولت وہ بہ درجہ غایت محنت اور بھاگ دوڑ سے یہ فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔ جو کسی کے ہاتھ آیا، اس پر قبضہ کرنا اور زیادہ کے لیے کوشاں ہونا ان کے نزدیک وجوب کا درجہ رکھتا تھا۔

ہم لوگ جس گاؤں میں آ کر سکونت پذیر ہوئے یا اس دور کی اصطلاح میں ''بیٹھے''، اس میں اگرچہ ہم سبھی مشرقی پنجاب کے ایک ہی مقام کے رہنے والے تھے، جدی پشتی ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے اور آپس میں دکھ سکھ کے سانجھی تھے، تاہم سب بے چین اور بے قرار تھے۔ اس وقت کا زمانۂ حال نہایت تکلیف سے گزر رہا تھا اور مستقبل کا کچھ پتا نہ تھا کہ کس صورت میں جلوہ گر ہوگا اور کس کے ساتھ کیا بیتے گی۔

21۔ اگست 1947 کو ہم قصور پہنچے تھے اور اس سے تیسرے دن حضرت مولانا عطا اللہ حنیف بھوجیانی سے وہاں ملاقات ہوئی تو انھوں نے فرمایا تھا کہ وہ گوندلاں والے چلے گئے ہیں اور ان کے بعض قریبی رشتے دار بھی اپنے گاؤں بھوجیاں (ضلع امرتسر) سے وہاں پہنچ گئے ہیں' اس لیے مجھے معلوم تھا کہ انھوں نے گوندلاں والا میں سکونت اختیار کر لی ہے، چنانچہ ان سے اور ان کے رشتے داروں سے (جو پہلے سے مجھے جانتے تھے) ملنے کے لیے میں گوندلاں والے پہنچا۔ خیال یہ تھا کہ دو چار دن وہاں رہوں گا، ان سے ادھر ادھر کی باتیں ہوں گی اور دل کو تھوڑا بہت اطمینان حاصل ہوگا۔ مجھے یاد پڑتا ہے یہ نومبر کا وسط تھا یا چند روز اس سے آگے پیچھے کی بات ہوگی۔ قطعی طور سے کچھ کہنا مشکل ہے۔

وہاں پہنچا تو پتا چلا کہ حضرت مولانا نے وہاں تدریس کا سلسلہ شروع فرما دیا ہے۔ لیکن یہ سلسلہ ابھی تک محدود ہے، صرف چند طلبا پر مشتمل......! ان میں سے دو طلبا کو میں نے دیکھا۔ دونوں نوجوان تھے۔ ایک کچھ بڑے، دوسرے ان سے چھوٹے۔ بڑے کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی اور تہبند

قمیص میں ملبوس ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ نیلے رنگ کا تہبند باندھے ہوئے تھے۔ اب بھی لباس سمیت ان کا حلیہ میرے سامنے ہے۔ نکھرا ہوا گندمی رنگ اور خوش مزاج ، ہنس مکھ، معلوم ہوا کہ ان کا نام محی الدین ہے اور یہ محی الدین کوثری کہلاتے ہیں۔ مالیر کوٹلہ (مشرقی پنجاب) میں مولانا عبد الغفار حسن مرحوم ومغفور کے قائم کردہ مدرسے کوثر العلوم میں پڑھتے رہے ہیں، میٹرک پاس ہیں اور پتوکی کے قریب کے ایک گاؤں موضع گوہڑ کے رہنے والے ہیں، مولانا مسعود عالم ندوی(مرحوم) نے ان کو سفارشی رقعہ دے کر یہاں مولانا عطاء اللہ صاحب کی خدمت میں بھیجا تھا۔

اب آیئے دوسرے طالب علم کی طرف جو محی الدین سے دو تین سال چھوٹے ہوں گے۔ کچھ سانولا سا رنگ ، تیکھے نقوش، میانہ قد، چہرہ بالوں سے خالی، تہبند قمیص میں ملبوس، پتا چلا کہ یہ حافظ قرآن ہیں، عبد الرحمٰن ان کا نام ہے اور محی الدین کے عزیز ہیں' اسی گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں ، جس گاؤں سے محی الدین کا تعلق ہے۔ رہن سہن اور معاشرت دونوں کی خالص دیہاتی۔ دونوں مولانا عطا اللہ صاحب حنیف کے ہاں رہتے تھے اور انہی کے گھر میں ان کے کھانے کا انتظام تھا۔

حضرت مولانا ممدوح بعض خصوصیات کی بنا پر دوسرے علمائے کرام سے بالکل منفرد تھے۔ ایک یہ کہ قرآن و حدیث پڑھنے والا طالب علم جس وقت جی چاہے ان کے پاس آئے اور تعلیم حاصل کرے۔ دوسری خصوصیت ان میں یہ تھی کہ جس طالب علم کے کھانے پینے کا کوئی انتظام نہ ہوسکتا ہو وہ اس کی ذمے داری خود قبول فرماتے اور اپنے گھر سے اسے وہی کھانا کھلاتے جو ان کے گھر کے افراد کھاتے۔

یہ دونوں طالب علم مولانا سے جو کتابیں پڑھتے تھے' اس وقت تو مجھے یاد تھیں ، اب ذہن میں نہیں رہیں۔ یہ کم و بیش ساٹھ برس پہلے کی بات ہے۔ اتنی مدت کی کوئی بات یاد رہی ، کوئی بھول گئی۔

اب ہم محی الدین کوثری کو یہیں چھوڑتے ہیں۔ ان کے متعلق ان شاء اللہ تعالیٰ کسی دوسرے موقعے پر گفتگو ہوگی۔ آج صرف حافظ عبد الرحمٰن گوہڑوی کے بارے میں چند باتیں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

حافظ عبدالرحمٰن ضلع قصور کی تحصیل چونیاں کے ایک گاؤں ''گوہڑ'' کے رہنے والے تھے جو پتوکی سے دو ڈھائی میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ چند گھروں کے علاوہ اس گاؤں کی آبادی ارائیں برادری پر مشتمل ہے اور یہ سب لوگ معاشرتی اعتبار سے بھی اچھی حیثیت کے مالک ہیں اور تعلیمی اعتبار سے بھی انھیں خاص اہمیت حاصل ہے۔ ذیل میں ان میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی درج کیے جاتے ہیں۔

① ...... مولانا محمد اسحاق رحمانی: یہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی کے فارغ التحصیل تھے۔ طویل عرصے

تک مرکزی جمعیت اہل حدیث کی مجلس عاملہ کے رکن رہے۔ چند مہینے ایک خاص وجہ سے، جس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، مرکزی جمعیت کی نظامت علیا پر بھی فائز رہے۔ مسجد چینی والی (لاہور) کی خطابت کے منصب پر بھی متمکن رہے۔ 4 ستمبر 1967ء کو وفات پائی۔

②...... مولانا محی الدین سلفی: انہی مولانا محمد اسحاق رحمانی کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان پر ان شاء اللہ کسی وقت تفصیل سے لکھا جائے گا۔ 16 جنوری 1976ء کو جدہ (سعودی عرب) میں فوت ہوئے۔

③...... حافظ عبد الرشید گوہڑوی: درس نظامی کے تمام علوم متداولہ پر عبور رکھتے ہیں۔ کم و بیش پچاس سال دار العلوم تقویۃ الاسلام (لاہور) کی مسند تدریس پر متمکن رہے۔ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ ان پر خاص شفقت فرماتے تھے۔ کئی سال سے دار العلوم تقویۃ الاسلام کی تدریسی ذمے داریوں سے فارغ ہیں۔ ان پر ان شاء اللہ کتاب "عارفانِ حدیث" میں مضمون لکھا جائے گا۔

④...... حافظ محمد ایوب: قدیم و جدید علوم پر دسترس رکھتے ہیں۔ طویل عرصے تک انجینئرنگ یونیورسٹی (لاہور) میں پروفیسر اور اس کے صدر شعبہ اسلامیات رہے۔ وہاں سے ریٹائرمنٹ کے بعد ڈاکٹر محمد راشد رندھاوا کے قائم کردہ قرآن انسٹی ٹیوٹ میں فریضہ تدریس انجام دے رہے ہیں۔

⑤...... پروفیسر ڈاکٹر محمد یحییٰ: درس نظامی بھی پڑھا اور جدید علوم سے بھی گہرا تعلق رکھا۔ انجینئرنگ یونیورسٹی (لاہور) کے شعبہ اسلامیات کے پروفیسر اور صدرِ شعبہ رہے۔

⑥...... میاں محمد جمیل ایم اے: کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ کافی عرصہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کی نظامت علیا کا منصب ان کے سپرد رہا۔

⑦...... مولوی محمد امین: یہ بھی دار العلوم تقویۃ الاسلام ہی سے فارغ ہوئے، دور طالب علمی میں بڑے محنتی تھے اور مطالعہ کا شوق رکھتے تھے، لیکن زبان میں لکنت کے باعث کوئی علمی مشغلہ جاری نہ رکھ سکے۔ آج کل منڈی عثمان والا کے قریب موضع رنگے والا میں سکونت پذیر ہیں۔

⑧...... مولوی محمد بشیر: یہ بھی دار العلوم تقویۃ الاسلام میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ پھر مدینہ یونیورسٹی میں چلے گئے۔ بڑے ذہین اور فہیم عالم ہیں، مدرس بھی بہت اچھے ہیں۔ آج کل اپنے گاؤں گوہڑ میں اقامت گزیں ہیں۔

یہ گوہڑ کے ان چند حضرات کے اسمائے گرامی ہیں، جنھوں نے علمی سرگرمیوں کو اپنا مقصد حیات قرار دیا۔ ان کے علاوہ اس گاؤں کے متعدد حضرات مختلف مدارس میں تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحومین کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور موجودین کو خدمتِ دین کی زیادہ سے زیادہ توفیق سے نوازے۔ آمین

موضع گوہڑ اور اس کے قرب و جوار کے دیہات کے لوگ لکھوی خاندان کے بزرگوں سے تعلق

ارادت رکھتے ہیں اور ان میں سے زیادہ حضرات نے تقسیم ملک سے پہلے لکھوکے سے حصول علم کیا اور تقسیم ملک کے بعد لکھوکے کا دارالعلوم جامعہ محمدیہ کے نام سے اوکاڑہ میں منتقل ہوا تو وہاں کے اساتذہ کرام سے استفادہ کیا۔ گوہڑ کے بعض شائقینِ علم مدرسہ غزنویہ (یعنی دار العلوم تقویۃ الاسلام لاہور) میں بھی وہاں کے عالی مقام معلمین سے فیض یاب ہوئے۔

اسی گاؤں کے ایک بزرگ حاجی باماں تھے، جنھیں صالحیت اور ذاتی شرافت کی وجہ سے پورے گاؤں اور وہاں کی ارائیں برادری میں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ حافظ عبدالرحمٰن انہی حاجی باماں کے اکلوتے بیٹے تھے، جو 1930ء کے پس و پیش پیدا ہوئے۔ تھوڑی بہت ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کی۔ پھر ضلع قصور کے ایک قریے ''چک مروکے'' میں ایک حافظ صاحب سے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کیا، لیکن ابھی حفظ قرآن کے ابتدائی مراحل میں تھے کہ لاہور آ گئے اور رنگ محل میں مشن سکول کے قریب قاری مقبول الٰہی مرحوم کی ایک چھوٹی سی مسجد میں قیام کیا اور قاری فضل کریم کی خدمت میں حاضری دی اور حفظ قرآن کی نعمت سے متمتع ہوئے۔ یہ تقسیم ملک سے پہلے کی بات ہے۔

تقسیم ملک کے وقت اگست 1947ء میں یہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچ گئے تھے۔ اس زمانے میں حضرت مولانا عطا اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ اپنے مسکن فیروز پور کی سکونت ترک کر کے ضلع گوجراں والا کے مشہور قصبے گونداں والا میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔ تدریس اور مطالعہ کتب مولانا مرحوم کی حیات مبارکہ کے لازمی اجزا تھے۔ انھوں نے گونداں والا میں بھی اس دور کے حالات کے مطابق سلسلہ تدریس شروع کر دیا تھا۔

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم اس وقت گوجراں والا میں مقیم تھے، وہاں انھوں نے دار العروبہ کے نام سے عربی تعلیم اور تراجم کا ایک ادارہ قائم کر رکھا تھا۔ مولانا عطاء اللہ حنیف کے متعلق انھیں معلوم تھا کہ وہ گونداں والا میں اقامت فرما ہیں، چنانچہ انھوں نے رقعہ دے کر محی الدین اور عبدالرحمٰن گوہڑوی کو مولانا عطاء اللہ مرحوم کی خدمت میں بھیج دیا اور یہ دونوں ان سے تعلیم حاصل کرنے لگے، جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، میرا ان دونوں سے وہیں تعارف ہوا تھا جو آگے چل کر دوستی میں بدل گیا اور پھر ان کی زندگی کے آخری دم تک قائم رہا۔

صحیح تاریخ کا تو مجھے پتا نہیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ 1948ء کی پہلی ششماہی میں حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے مولانا عطا اللہ حنیف کو اپنے دار العلوم تقویۃ الاسلام (لاہور) میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے تشریف لانے کی دعوت دی اور مولانا نے یہ دعوت قبول فرمالی اور لاہور تشریف لے آئے۔ محی الدین اور عبدالرحمٰن بھی ان کے ساتھ لاہور آ گئے۔ پھر انھوں نے درس نظامی کا مروّجہ نصاب یہیں مکمل کیا۔ اس کے بعد محی الدین تو بعض دوسرے امور میں مشغول ہو گئے، لیکن عبدالرحمٰن نے مولانا عطاء اللہ مرحوم سے وابستگی اختیار کیے رکھی۔

1948ء میں مَیں بھی مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے ناظم دفتر کی حیثیت سے لاہور آ گیا تھا اور جمعیت کا دفتر دار العلوم تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ میں تھا' حافظ عبد الرحمٰن گوہڑوی بھی یہیں تھے اور تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس زمانے میں میرے ان سے تعلقات بہت بڑھ گئے تھے اور بسا اوقات سلسلہ گفتگو کافی دیر جاری رہتا تھا۔

1951ء میں مرکزی جمعیت کی رکن سازی کا کام شروع ہوا تو حافظ عبد الرحمٰن گوہڑوی نے میری بہت مدد کی' دوسرے طلبا نے بھی کی، لیکن ان سطور میں صرف حافظ عبدالرحمٰن کا ذکر مقصود ہے۔

طویل مدت سے مولانا عطاء اللہ صاحب کے دل میں یہ جذبہ کارفرما تھا کہ اپنا مکتبہ قائم کرکے اپنے ذوق کے مطابق کتابوں کی نشرو اشاعت کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ چناں چہ انھوں نے ۱۹۵۴ء میں مکتبہ سلفیہ کے نام سے لاہور کے شیش محل روڈ پر مکتبہ قائم کرلیا اور حافظ عبد الرحمٰن کو اپنے ساتھ رکھا۔ مولانا مرحوم کو ان کی صلاحیتوں سے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کام میں وہ ان کا ساتھ دیں گے اور کام ان کی تمنا کے مطابق صحیح طریقے سے چلتا رہے گا۔ آگے چل کرنشرو اشاعت کے سلسلے نے جو رخ اختیار کیا اور آہستہ آہستہ کام کی رفتار آگے بڑھی تو حافظ صاحب کی صلاحیتوں کے بارے میں انھوں نے جو اندازہ لگایا تھا وہ صحیح ثابت ہوا۔ مولانا کے نزدیک وہ امین بھی تھے، ذہین بھی تھے، فہیم بھی تھے، اور مکتبے کی طرف سے وہ جس قسم کی کتابیں شائع کرنا چاہتے تھے، اس میں ان کے مخلص معاون بھی تھے۔ چناں چہ تھوڑے عرصے میں مکتبہ سلفیہ کی طرف سے جو کتابیں اشاعت پذیر ہوئیں، ان میں حسب ذیل کتابیں خاص اہمیت کی حامل ہیں جو بے حد مقبول ہوئیں۔

① ...... **حیات امام احمد بن حنبل** رحمہ اللہ مشہور مصری مصنف ابو زہرہ کی ضخیم کتاب کا ترجمہ جو رئیس احمد جعفری مرحوم نے کیا۔

② ...... **حیات امام ابو حنیفہ** رحمہ اللہ یہ بھی اسی مصنف کی اردو کتاب کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ پروفیسر غلام احمد حریری نے کیا۔

③ ...... **دیوان حماسہ:** ترجمہ مع شرح (از مولانا محمد اسحاق حسین خاں والا)

④ ...... **التعلیقات السلفیہ علی النسائی:** از حضرت مولانا عطا اللہ حنیف رحمہ اللہ

⑤ ...... **احسن التفاسیر:** از سید ڈپٹی احمد حسن دہلوی رحمہ اللہ۔ یہ تفسیر سات ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور ہزاروں صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ حافظ عبدالرحمٰن گوہڑوی نے بڑی محنت اور تن دہی سے اس کی پانچ جلدوں کی تخریج کی۔

⑥ ...... **التعلیقات النسائی** کی انھوں نے بے حد محنت سے دو دفعہ پروف ریڈنگ کی۔ حافظ صاحب ممدوح نہ مدرس تھے نہ مصنف، لیکن تخریج کرتے کرتے کتب حدیث سے انھیں اس قدر تعلق

پیدا ہوگیا تھا کہ وہ آسانی سے بتا دیتے تھے کہ کون سی حدیث کس کتاب میں ہے اور کہاں ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔

حافظ صاحب مضمون نگاری کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ حضرت مولانا کے مجلّہ ''رحیق'' میں ان کے چند مضامین شائع ہوئے تھے۔

حضرت مولانا مرحوم کے صاحب زادۂ گرامی حافظ احمد شاکر انھیں احترام سے ''بھائی جان'' کہا کرتے تھے۔ اب بھی وہ اکرام سے ان کا نام لیتے ہیں۔ بہت سال حافظ عبدالرحمٰن اہل وعیال سمیت مولانا مرحوم کے مکان میں رہے۔

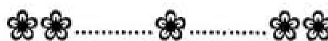
حافظ عبدالرحمٰن مدت مدید تک حضرت مولانا مرحوم کے ساتھ مکتبہ سلفیہ سے منسلک رہے اور انھوں نے بڑا کام کیا۔ پھر جب مکتبہ سلفیہ سے علیحدگی اختیار کی تو حضرت شاہ عبد الحق محدث دہلوی ﷫ کی لمعات شرح مشکوۃ شائع کی۔ حافظ صاحب ممدوح اس شرح کی صرف دو چار جلدیں شائع کر سکے باقی ابھی تک غیر مطبوع ہے۔

پرنٹنگ کے سلسلے میں وہ چند سال مدینہ منورہ میں رہے اور کچھ عرصہ لندن میں گزارا۔ قیام لندن کے زمانے میں لندن کے ایک اردو اخبار میں کسی موضوع پر انھوں نے میرا مضمون پڑھا، جس میں میری تصویر بھی تھی تو مجھے طویل خط لکھا اور وہ اخبار بذریعہ ڈاک مجھے بھیجا۔ مدینہ منورہ اور لندن کے چکر لگا کر وہ لاہور آگئے تھے اور شیش محل روڈ پر جلد سازی کا کام شروع کردیا تھا۔ ان کا ذہن کاروباری ہوگیا تھا اور اس میں وہ کامیاب تھے۔

ایک وقت آیا کہ ان پر فالج کا حملہ ہوگیا' نہ چلنے پھرنے کی سکت رہی تھی، نہ بول سکتے تھے، لیکن ذہن صحیح تھا اور عیادت کے لیے آنے والے کو پہچانتے اور مسکراتے ہوئے اشارے سے اس کا حال پوچھتے تھے۔ پانچ سال اس مرض میں مبتلا رہے۔ ان کے بڑے داماد میاں محمد جمیل انھیں اپنے گھر لے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے انھوں نے اپنے اس عالم فاضل سسر کی بہت خدمت کی۔ پانچ سال کی طویل اور اذیت رساں بیماری کی گرفت میں رہنے کے بعد حافظ عبدالرحمٰن گوہڑوی نے 19 جنوری 1998 (۲۰ رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ) کو وفات پائی اور نماز تراویح کے بعد ان کا جنازہ پڑھا گیا۔ اقبال ٹاؤن کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ۔



موجودین

۱	مولانا محمد رفیق اثری
۲	مولانا محمد علی جانباز
۳	مولانا عبدالرشید مجاہد آبادی
۴	مولانا عبداللہ امجد چھتوی
۵	مفتی عبید اللہ خاں عفیف
۶	حافظ عبدالمنان نور پوری
۷	حافظ عبدالستار حماد
۸	حافظ صلاح الدین یوسف
۹	مولانا ابوالاشبال احمد شاغف
۱۰	مولانا اللہ یار خاں
۱۱	مولانا عبدالسلام رحمانی
۱۲	ڈاکٹر صہیب حسن
۱۳	ڈاکٹر سہیل حسن
۱۴	ڈاکٹر عبدالعلیم بستوی
۱۵	مولانا صلاح الدین مقبول احمد
۱۶	پروفیسر محمد اقبال کیلانی
۱۷	پروفیسر سعید مجتبیٰ سعیدی
۱۸	حافظ محمد بنیامین طور
۱۹	حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی
۲۰	ڈاکٹر حافظ محمد اسحاق زاہد
۲۱	مولانا محمود احمد غضنفر
۲۲	مولانا عبدالرشید اثاروی
۲۳	مولانا عبدالرشید ضیا
۲۴	پروفیسر محمد اکرم نسیم ججہ

مولانا محمد رفیق اثری

مولانا محمد رفیق اثری ۱۹۳۷ء میں سنگرور (مشرقی پنجاب) کے ایک قصبے ''رشیداں والا'' میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی میاں قائم الدین تھا جو عامل بالحدیث تھے۔ تقسیم ملک کے زمانے میں یہ لوگ براستہ ہیڈ سلیمان کی پاکستان میں داخل ہوئے۔ مولانا اثری کا پورا خاندان اہل حدیث تھا۔ ان کے قصبے اور علاقے میں کوم کلاں (ضلع لدھیانہ) کے مولانا سید مولا بخش کے مواعظ حسنہ کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور یہ لوگ ان سے بہت متاثر تھے۔ ان کے قصبے کے خطیب وامام مولانا عبید اللہ تھے جو کسی زمانے میں غالباً دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں پڑھتے رہے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ سرگودھا چلے گئے تھے۔

نومبر ۱۹۴۷ء میں محمد رفیق اثری جلال پور پیر والا آئے تو دارالحدیث محمدیہ جلال پور پیر والا کی ابتدائی شاخ مدرسہ سبل السلام براتی والا میں انھوں نے پرائمری پاس کی۔ اس سے دو سال بعد ۱۹۴۹ء میں دارالحدیث محمدیہ میں داخل ہوئے اور ۱۹۵۶ء میں وہاں سے سند فراغت حاصل کی۔ دارالحدیث محمدیہ میں انھوں نے حضرت مولانا سلطان محمود، مولانا عبدالرحیم عارف، مولانا عبدالحمید، مولانا عبداللہ مظفر گڑھی، مولانا عبدالقادر مہند، مولانا محمد قاسم شاہ اور حافظ خوشی محمد سے حصولِ علم کیا۔

بعد ازاں دارالعلوم تقویۃ الاسلام (لاہور) کا رخ کیا۔ یہاں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف، مولانا حافظ محمد اسحاق اور مولانا شریف اللہ خاں سے فیض یاب ہوئے۔ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے ارشادات سے بھی استفادے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' کا دفتر دارالعلوم کی بلڈنگ میں تھا اور ان سطور کا راقم اس کے فرائض ادارت سرانجام دیتا تھا، اثری صاحب کی ملاقاتیں مجھ سے بھی رہیں۔

۱۹۵۹ء میں مولانا محمد رفیق اثری دارالحدیث محمدیہ جلال پور پیر والا چلے گئے اور وہاں تدریس کا سلسلہ شروع کردیا جو بحمد اللہ اب تک جاری ہے۔ اللہ کے فضل سے بے شمار حضرات ان سے تعلیم حاصل کرچکے ہیں جو مختلف مقامات پر درس وتدریس کی خدمات میں مصروف ہیں۔

مولانا اثری کی تدریسی خدمات کا سلسلہ تقریباً پچاس سال سے جاری ہے اور طلبا ان کے طریق تدریس سے نہایت متاثر ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ وہ بے حد محنت اور انہماک سے یہ بنیادی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔

اب آئندہ سطور میں حدیث کے متعلق ان کی تصنیفی خدمات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

① ...... **ضوء المسالك على موطا امام مالك**: موطا امام مالک پر یہ مولانا محمد رفیق اثری کا مختصر حاشیہ ہے۔ اس میں فاضل محشی نے طلبا کی ضرورت کے پیش نظر مرفوع احادیث کی تخریج کی ہے۔ منقطع اور بلاغاتِ مالک کی اسانید کا تعین کیا ہے۔ مشکل الفاظ کو لغوی نقطہ نظر سے حل فرمایا ہے۔ فقہی مسائل کی وضاحت کی ہے اور اختلافی مسائل میں مسلک محدثین کی دلائل کے ساتھ تائید فرمائی ہے۔

یہ کتاب فاروقی کتب خانہ ملتان کی طرف سے متعدد مرتبہ شائع ہوچکی ہے۔ بڑے سائز کے ۶۶۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

② ...... **التعليق النجيح على مشكوٰة المصابيح**: اس میں مولانا اثری نے احادیث مشکوٰۃ کی تخریج بحوالہ متعلقہ کتاب، باب، جلد اور صفحہ کی ہے۔ فصل ثانی اور فصل ثالث کی احادیث کی استنادی حیثیت کا تعین کیا ہے۔ مشکل الفاظ کا لغوی حل پیش فرمایا ہے۔ فقہی اختلافی مسائل میں بہ دلائل مسلک محدثین کو ترجیح دی ہے۔ یہ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی۔

مولانا محمد رفیق اثری نے مذکورہ بالا دونوں کتابوں کے حواشی حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف کی تجویز وترغیب سے تحریر فرمائے ہیں۔ مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب مرحوم اہل علم کی قابلیت کے مطابق انھیں اس قسم کے علمی کاموں کی ترغیب دیتے اور ان سے تحقیقی کام کراتے رہتے تھے۔

③ ...... **ترجمه وافادات مشكوٰة المصابيح**: چند سال پیشتر مولانا محمد رفیق اثری نے مشکوٰۃ شریف کے ترجمہ وافادات کا آغاز کیا تھا اور حدیث نمبر ۴۲۳ تک کام ہوا تھا کہ ۴۔ نومبر ۱۹۹۵ء کو حضرت مولانا سلطان محمود (جلال پور پیر والا) وفات پاگئے اور دارالحدیث محمدیہ کی تدریسی اور انتظامی ذمے داریوں کا بوجھ مولانا اثری پر آپڑا، جس کی وجہ سے ترجمہ وافادات کا یہ اہم سلسلہ موقوف ہوگیا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ مولانا ممدوح یہ ضروری کام مکمل فرمائیں گے۔

④ ...... اصولِ حدیث کی معروف کتاب "**الفقية الحديث للعراقي**" پر تعلیقات: یہ کتاب طبع ہوچکی ہے۔ بہترین صورت میں مکتبہ امام بخاری کراچی نے شائع کی ہے۔ ۱۰۶ صفحات ہیں۔

⑤ ...... اصولِ حدیث کی ایک اور کتاب "**اسبال المطر شرح نخبة الفكر**" پر تعلیقات: یہ بھی شائع ہوچکی ہے۔ ۳۱۸ صفحات کی یہ تحقیقی کتاب دارالسلام لاہور کی طرف سے چھپی ہے۔

⑥ ...... منہاج المسلم (اردو ترجمہ): منہاج المسلم ابوبکر الجزائری کی کتاب ہے۔ مولانا محمد رفیق اثری نے اس کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے اور بعض فقہی مسائل پر حواشی میں مدلل انداز میں نقد بھی کیا ہے۔ ۷۸۸ صفحات کی یہ کتاب دارالسلام نزد سول سیکرٹریٹ لاہور کی طرف سے خوب

صورت انداز میں شائع کی گئی ہے۔

⑦...... **تبیان الادلہ فی رؤیۃ الاھلہ:** اس کا اردو ترجمہ کیا۔

⑧...... **ھدایۃ الناسك:** اردو ترجمہ

⑨...... **شرح خطب حجۃ الوداع:** مولانا محمد رفیق اثری کی یہ نہایت علمی کوشش ہے جو تقریباً ایک سو صفحات پر مشتمل ہے۔

⑩......مختلف مسائل پر چند رسائل۔

مولانا محمد رفیق اثری ماشاء اللہ باہمت اہل علم ہیں جنھوں نے تدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف اور ترجمے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ یہ دونوں الگ الگ مستقل کام ہیں اور دونوں کو بہ یک وقت سرانجام دینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بڑی قابلیت عطا فرمائی ہے اور خالص علمی ذوق سے نوازا ہے۔

⑪...... مولانا سلطان محمود جلال پوری: یہ کتاب ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ مولانا اثری کی یہ ضخیم کتاب ان کے استاذِ محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا سلطان محمود جلال پوری کے حالات پر محیط ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے مولانا ممدوح کی حیات، خدمات اور آثار کا تفصیل سے تذکرہ فرمایا ہے۔ زبان، انداز اور مندرجات کے اعتبار سے یہ کتاب اپنی مثال آپ ہے۔ مولانا سلطان محمود کی زندگی کے تمام پہلو خوب صورت اسلوب میں اس کتاب میں بیان کردیے گئے ہیں۔ ان کا خاندان، ان کی تعلیم وتربیت، ان کے اساتذہ، ان کا طریق مطالعہ، ان کا نہج تبلیغ، ان کا اندازِ تدریس، ان کے تلامذہ غرض ان کی حیاتِ مبارکہ کے تمام گوشے اس کتاب کے اوراق میں منضبط کردیے گئے ہیں اور فاضل مصنف نے حق شاگردی نہایت حسن وخوبی سے ادا کردیا ہے۔ یہ کتاب مارچ ۲۰۰۶ء میں ''اثری ادارہ نشر وتالیف، چوک اہل حدیث، جلال پور پیر والا، ضلع ملتان'' کی طرف سے شائع کی گئی ہے اور لاہور، ملتان، گوجراں والا اور کراچی کے مکتبوں سے مل سکتی ہے۔ مدارس کے اساتذہ وتلامذہ کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

مولانا محمد رفیق اثری نے اس کتاب میں مشہور منکر حدیث عبداللہ چکڑالوی اور اس کے فرزندِ گرامی مولانا محمد ابراہیم چکڑالوی کا ذکر بھی کیا ہے۔ لکھا ہے کہ مولانا محمد ابراہیم موضع چکڑالا (ضلع جہلم) میں پیدا ہوئے۔ وہ حدیث کے سلسلے میں اپنے باپ کے نظریات کے سخت مخالف تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم علاقہ ہزارہ کے مدارس ومساجد میں حاصل کی۔ پھر دہلی جا کر حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ سے کتب حدیث پڑھیں اور ان سے سند حدیث لی۔ فارغ التحصیل ہو کر خان گڑھ (ضلع مظفر گڑھ) آگئے تھے۔ آخر میں جلال پور پیر والا میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

ان کے والد عبداللہ چکڑالوی نے اپنا مخالف ہونے کی بنا پر انھیں عاق قرار دے کر جائداد سے محروم کردیا تھا۔ وہ لاہور میں مقیم تھا۔ مولانا محمد ابراہیم ایک دفعہ لاہور گئے تو وہ مکان میں تخت پر تکیہ لگائے لیٹا ہوا تھا۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ میرے حصے کی جائداد مجھے دیں، مجھے اس سے محروم نہ کریں۔ ساتھ ہی یہ حدیث سنائی کہ من قطع میراث وارثہ قطع اللہ میراثہ من الجنۃ یوم القیامۃ (یعنی جو شخص اپنے وارث کو وراثت سے محروم کرتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اسے جنت کے حصے سے محروم کردے گا۔)

عبداللہ چکڑالوی نے جواب دیا، میں حدیث کونہیں مانتا۔ اگر قرآنِ مجید میں یہ بات کہیں ہے تو مجھے دکھاؤ۔

مولانا محمد ابراہیم فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی مجھے خیال گزرتا تھا کہ شاید میرا والد حق پر ہو، لیکن آج جب اسے تخت پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا اور حدیث کا انکار کرتے ہوئے دیکھا تو فوراً نبی ﷺ کی پیش گوئی میرے ذہن میں آ گئی اور مجھے یقین ہوگیا کہ یہ شخص جھوٹا ہے اور منکر حدیث ہے۔ پھر یہ دو حدیثیں سنائیں۔

عن ابی رافع رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا الفین احدکم متکئًا علٰی اریکتہٖ یاتیہ الامر مِن امری مما امرت او نہیت عنہ فیقول لا ادری، ما وجدنا فی کتاب اللہ اتبعناہ۔

[مسند امام احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ]

”حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں کوئی ایسا نہ ہو کہ میرے حکم کردہ امر و نہی میں سے کوئی بات اسے پہنچے اور وہ اپنے تخت پر تکیہ لگائے ہوئے کہے کہ میں اسے نہیں جانتا۔ ہم تو اس بات کو مانیں گے جو اللہ کی کتاب میں ہے۔“

دوسری حدیث یہ ہے:

عن المقدام رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا انی اوتیت القران ومثلہ الا یوشک رجل شبعانٌ علی اریکتہ یقول علیکم بھٰذا القرآن فما وجدتم فیہ من حلال فاحلوہ وما وجدتم فیہ من حرام فحرموہ وان ما حرم رسول اللہ کما حرم اللہ۔ الحدیث [رواہ ابوداؤد والدارمی]

”حضرت مقدام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے قرآن اور اس کی مثل دیا گیا ہے، سنو! قریب ہے کہ ایک آدمی پیٹ بھرا تخت پر بیٹھا ہوگا، کہے گا اس

قرآن ہی کو اپناؤ، جو اس میں حلال ہے اسے حلال جانو اور جو اس میں حرام ہے اسے حرام سمجھو، حالاں کہ رسول اللہ ﷺ نے جن چیزوں کو حرام (وحلال) قرار دیا ہے اسی طرح ہے گویا اللہ نے حرام وحلال قرار دیا ہے۔"

مولانا محمد ابراہیم یہ منظر دیکھ کر اور احادیث سنا کر، باپ کے مال سے لاتعلق ہو کر واپس چلے آئے۔

مولانا ابراہیم قرآن کے حافظ تھے۔ نیز اپنے دور کے ماہر طبیب تھے اور طبابت ہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ تعلیم وتدریس، امامت وخطابت اور وعظ وتبلیغ کے فرائض فی سبیل اللہ انجام دیتے تھے۔ انھوں نے ۲۰۔ ذیقعدہ ۱۳۳۷ھ (۱۷۔ اگست ۱۹۱۹ء) کو جلال پور پیر والا میں وفات پائی۔

ان کی تبلیغ سے بہت لوگ متاثر ہوئے اور بے شمار لوگوں نے علم دین حاصل کیا اور عامل حدیث ہوئے۔ ان کے شاگردوں نے بھی اشاعت دین کے لیے بہت تگ ودو کی۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

مولانا محمد ابراہیم چکڑالوی کے بیٹے مولانا محمد اسماعیل تھے۔ یہ بھی عالم وفاضل تھے اور دعوت وارشاد میں مشغول رہتے تھے۔ انجمن اہل حدیث جلال پور پیر والا کے خزانچی تھے۔ انھوں نے ۲۳۔ مارچ ۱۹۴۴ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔

مولانا محمد اسماعیل کے تین بیٹے تھے۔ ان کا شمار بھی علمائے دین میں ہوتا تھا۔ [1]

مولانا محمد رفیق اثری کی تصانیف میں مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ متعدد رسائل بھی شامل ہیں جو کئی دفعہ چھپ چکے ہیں۔ ① جہاد اور ہمارے فرائض، ② اہل حدیث کون؟ ③ فضائل ومسائل رمضان المبارک، ④ مسائل قربانی، ⑤ نماز پڑھنے کا مسنون طریقہ، ⑥ جنازہ پڑھنے کا طریقہ، ⑦ فقاہت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، ⑧ مقام معاویہ رضی اللہ عنہ۔

مولانا اثری نے السیف المسلول کا اردو ترجمہ بھی کیا۔

آخر میں یہ عرض ہے کہ میں نے اپنی کتاب "کاروانِ سلف" میں حضرت مولانا سلطان محمود مرحوم ومغفور پر طویل مضمون لکھا ہے۔ اس میں ان کے چند معروف تلامذہ کا مختصر الفاظ میں تعارف کرایا ہے، جن میں سب سے پہلے مولانا محمد رفیق اثری کا اسم گرامی آتا ہے۔ میں نے لکھا تھا کہ "مولانا اثری کچھ عرصہ اوکاڑہ کی جامعہ محمدیہ میں بھی فریضہ تدریس انجام دیتے رہے ہیں۔" [2] لیکن مولانا اثری نے بذریعہ خط مجھے اطلاع دی کہ وہ کبھی بھی جامعہ محمدیہ سے بہ طور مدرس منسلک نہیں رہے۔ میں اپنی اس غلطی پر معذرت خواہ ہوں۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ ان کے انکار کے باوجود

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے کتاب "مولانا سلطان محمود جلال پوری۔" صفحہ ۹۶ تا ۷۲

[2] کاروانِ سلف، ص: ۴۱۸

میرے ذہن میں اب بھی یہی آ رہا ہے کہ وہ جامعہ محمدیہ میں پڑھاتے رہے ہیں اور میری ان سے وہاں ملاقات ہوئی ہے۔

ہمارے ہاں دو متضاد اقوال کے درمیان تطبیق دینے کا سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ میں بھی یہاں تطبیق کی کوئی صورت پیدا کرلوں تو کیا حرج ہے۔

ان کے انکار اور میرے ذہن کے مطابق ان کی وہاں تدریس کے درمیان میرے خیال میں ''تطبیق'' کی یہ صورت ہے کہ کسی وقت میری اور ان کی جامعہ محمدیہ میں اتفاقاً ملاقات ہوئی ہوگی، جس سے میں نے یہ سمجھا کہ وہ یہاں فریضہ تدریس انجام دینے پر مامور ہیں۔ میرے خیال میں اس تطبیق سے مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔

بہرحال میں اپنی اس غلطی (یا غلط فہمی) کا اعتراف کرتا ہوں۔ کاروانِ سلف دو یا تین مرتبہ چھپ چکی ہے۔ اب ناشر سے رابطہ کرکے یہ الفاظ ان شاء اللہ کتاب سے نکلوا دوں گا۔

مولانا محمد رفیق اثری تقریباً ڈیڑھ برس قبل ازراہِ کرم غریب خانے پر تشریف لائے تھے۔ ان کے ساتھ دارالحدیث پیروالا کے قابل احترام اور عالی قدر استاذ مولانا اللہ یار خاں کے نوجوان صاحب زادے مولانا عمران بھی تھے جو دارالحدیث میں خدمت تدریس پر مامور ہیں۔ مولانا اثری ستر سال کو پہنچ گئے ہیں۔ عمر کے لحاظ سے صحت ما شاء اللہ بہت اچھی ہے۔ پورا قد، مناسب جسم، گندم گوں، سفید داڑھی، بارعب شخصیت کے مالک۔ نقش و نگار جاذبِ نظر۔ خوش مزاج، خوش کلام، اور حلیم الطبع۔ آیۃ من آیات اللہ۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ صحت و عافیت کے ساتھ انھیں عمر دراز عطا فرمائے اور وہ اللہ کے دین کی خدمت میں مشغول رہیں۔ تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھیں۔ آمین یاربّ العالمین!



مولانا محمد علی جانباز

مشرقی پنجاب کا ضلع فیروزپور علم و علما کے اعتبار سے پُر ثروت ضلع تھا۔ اس کے مختلف دیہات و قصبات میں بے شمار اہل علم پیدا ہوئے، جن کی تدریسی، خطابتی اور تصنیفی تگ و تاز سے لاتعداد لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب آیا اور وہ کتاب و سنت کی صراط مستقیم پر قدم فرسا ہوئے۔ قدیم دور کے فیروز پوری اصحاب علم سفرِ آخرت اختیار کر چکے ہیں، لیکن ایسے بہت سے لوگ اب بھی موجود ہیں، جنھوں نے اس علاقے میں جنم لیا۔ آزادیٔ برصغیر کے بعد پاکستان آئے، یہاں آکر دینی علوم کی تحصیل کی اور پھر تصنیفی اور تدریسی صورت میں کتاب و سنت کی خوب اشاعت فرمائی۔ مولانا محمد علی جانباز کا شمار انہی خوش بخت حضرات میں ہوتا ہے، جن کا مولد تو ضلع فیروز ہے لیکن تعلیم پاکستان آکر حاصل کی اور پھر تصنیف و تدریس کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔

مولانا موصوف کا تعلق راجپوت وٹو برادری سے ہے۔ وہ ۱۹۳۴ میں ایک گاؤں "چک بدھوکے" میں پیدا ہوئے جو (ریاست ممدوٹ) ضلع فیروز پور میں واقع ہے۔ ضلع فیروز پور میں نواب ممدوٹ کے ۸۴ گاؤں تھے اور وہ متحدہ پنجاب کے سب سے بڑے زمیندار تھے۔ اس خاندان کے آخری نواب کا نام افتخار حسین خاں تھا جو تقسیم ملک سے قبل پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے۔ قیام پاکستان کے بعد کچھ عرصہ مغربی پنجاب (یعنی موجودہ پنجاب) کے وزیر اعلیٰ بھی رہے۔

مولانا محمد علی جانباز کے بزرگ لکھوی علمائے کرام کے عقیدت مند تھے اور مسئلے مسائل کے لیے انہی سے رجوع کرتے تھے۔ انہی حضرات کے اثرِ تبلیغ سے اس خاندان کے لوگ مسلکِ اہل حدث سے وابستہ ہوئے۔ مولانا محمد علی لکھوی کی خدمت میں بالخصوص ان لوگوں کی حاضری کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

محمد علی جانباز کی عمر بارہ تیرہ سال کے لگ بھگ تھی کہ ایک عالم دین جن کا نام مولانا محمد تھا، ان کے گاؤں (چک بدھوکے) تشریف لائے۔ وہ جامعہ رحمانیہ دہلی کے فارغ التحصیل تھے۔ گاؤں کے لوگوں کی درخواست پر مولانا محمد وہیں مقیم ہوگئے اور تقسیم ملک تک وہیں خطابت و تدریس میں مصروف رہے۔ محمد علی جانباز کی تعلیم کا آغاز انہی مولانا محمد رحمانی سے ہوا۔

تقسیم ملک کے بعد مولانا محمد علی جانباز کا خاندان ضلع فیصل آباد کے چک نمبر ۸۸ میں آباد ہوا۔ اس گاؤں میں ایک عالم دین حافظ برکت اللہ رہتے تھے جو دارالعلوم دیوبند کے سند یافتہ تھے۔ محمد علی

کے والد نے ان سے کہا کہ وہ محمد علی کو اہل حدیث کے کسی مدرسے میں داخل کرادیں۔ چنانچہ وہ انھیں چک نمبر ۴۹۳ گ ب اوڈاں والا لے گئے اور وہاں کے مدرسہ تعلیم الاسلام میں داخل کرا دیا جو حضرت صوفی عبداللہ مرحوم و مغفور نے جاری کیا تھا۔ یہ ۱۹۵۱ کی بات ہے۔ اس وقت مدرسہ تعلیم الاسلام میں چھ اساتذہ کرام طلبا کو تعلیم دینے پر مامور تھے اور وہ تھے (۱) پیر محمد یعقوب قریشی (۲) مولانا محمد یعقوب ملہوی (۳) مولانا محمد صادق خلیل (۴) مولانا عبدالصمد رؤف (۵) مولانا عبدالحمید ہزاروی اور (۶) مولانا محمد صدیق۔ اس مدرسے میں محمد علی جانباز کو پہلی جماعت میں داخلہ ملا اور انھوں نے مولانا محمد یعقوب ملہوی کے سوا تمام اساتذہ سے کسب فیض کیا۔ دو سال وہاں رہے۔

۱۹۵۳ کے شروع میں محمد علی جانباز سے ان کے ایک ساتھی نے کہا کہ وزیر آباد میں مدرسہ منانیہ کے نام سے ایک مدرسہ جاری کیا گیا ہے، وہاں کے خطیب بہت اچھے مدرس ہیں۔ وہاں داخلہ لینا چاہیے۔ چنانچہ یہ وزیر آباد آگئے۔ پڑھائی شروع ہوئی تو پتا چلا کہ اس مدرسے کے مدرس، خطیب تو واقعی اچھے ہیں لیکن تدریس میں ان کو وہ ملکہ حاصل نہیں جو مدرس کو ہونا چاہیے۔ اب محمد علی نے فارغ اوقات میں وزیر آباد کے ایک دیو بندی عالم مولانا محمد رمضان سے پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ بہت اچھے مدرس تھے اور انتہائی نصابی کتابیں پڑھانے کی کامل صلاحیت رکھتے تھے۔

اس اثنا میں مارچ ۱۹۵۳ میں تحریک تحفظ ختم نبوت شروع ہوگئی اور علما گرفتار ہونے لگے۔ وزیر آباد کی غلہ منڈی میں روزانہ جلسے ہوتے تھے اور لوگ گرفتاریاں پیش کرتے تھے۔ ایک روز مدرسہ منانیہ کے طلبا نے بھی گرفتاری پیش کی۔ پولیس نے ان کو گرفتار کر کے گاڑی میں بٹھایا اور ''راہوالی'' چھوڑ آئے۔ وہاں سے یہ وزیر آباد آگئے۔ پولیس والے لوگوں کو گرفتار کر کے وہاں چھوڑ آتے تھے اور لوگ اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے۔ اب راہوالی کو فوجی چھاؤنی بنا دیا گیا ہے۔

وزیر آباد میں محمد علی جانباز تھوڑا عرصہ ہی رہے۔ اس کے بعد گوجراں والا آکر جامعہ اسلامیہ میں داخلہ لے لیا۔ اس وقت جامعہ اسلامیہ گوجراں والا میں محدث عصر حضرت حافظ محمد گوندلوی اور مولانا ابوالبرکات احمد کا سلسلۂ تدریس جاری تھا اور طلبا کی تعداد چالیس کے پس و پیش تھی۔ دونوں بلند پایہ استاذ تھے۔ طلبا کی تعداد بڑھی تو اور اساتذہ کی خدمات حاصل کرلی گئی تھیں۔ مولانا محمد علی جانباز نے زیادہ تر درسی کتابیں مولانا ابوالبرکات احمد سے پڑھیں۔ ۱۹۵۳ کے نصف آخر میں وہاں گئے تھے، ۱۹۵۷ کے آخر تک وہاں زیر تعلیم رہے۔ اس اثنا میں انھوں نے جامعہ اسلامیہ کے عظیم القدر اساتذہ سے خوب اکتسابِ فیض کیا۔ وہ جامعہ اسلامیہ کے اساتذہ اور ان کے طریق تعلیم و تدریس کے علاوہ اس کی انتظامیہ کے حسن انتظام کے بھی معترف ہیں اور طلبا کے ساتھ ان کی سلوک کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔

جامعہ اسلامیہ میں مولانا محمد علی جانباز کے زمانۂ طالب علمی میں جو تقریباً چار سال کے عرصے پر محیط ہے، جامعہ کے طلبا کا امتحان لینے کے لیے تین علمائے کرام تشریف لائے۔

پہلے سال مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی۔

دوسرے سال مولانا حافظ محمد اسحاق حسینوی۔

تیسرے سال حضرت مولانا شرف الدین محدث دہلوی۔

۱۹۵۶ کے سالانہ امتحانات قریب تھے اور تعلیمی سال ختم ہونے والا تھا کہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی جامعہ اسلامیہ تشریف لائے۔ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اور بعض دیگر اصحاب علم بھی ان کے ساتھ تھے۔ مولانا غزنوی نے حاجی محمد ابراہیم انصاری سے ملاقات کی اور فرمایا کہ میں اس لیے آیا ہوں کہ آپ حضرت حافظ محمد گوندلوی کو جامعہ اسلامیہ سے فارغ کردیں، ہمیں جامعہ سلفیہ کے لیے ان کی سخت ضرورت ہے۔ ہم انھیں جامعہ سلفیہ میں شیخ الحدیث کی مسند علیا پر متمکن کرنا چاہتے ہیں۔ اس منصب کے لیے اس وقت ان کے سوا دوسرا کوئی عالم ہمارے ذہن میں نہیں آرہا ہے۔

مولانا غزنوی کا یہ فرمان سن کر حاجی محمد ابراہیم انصاری سوچ میں پڑ گئے۔ ان کے لیے مولانا کے فرمان کو نہ ماننا بھی مشکل تھا اور جامعہ اسلامیہ سے حضرت حافظ صاحب کو رخصت کرنا بھی بہت مشکل تھا۔ بالآخر حاجی صاحب نے مولانا کے ارشاد پر اپنی رضا مندی ظاہر کردی اور حضرت حافظ صاحب لائل پور (فیصل آباد) جامعہ سلفیہ تشریف لے گئے۔ یہ ۱۹۵۷ کی بات ہے۔ اس وقت جامعہ سلفیہ کا سلسلۂ تدریس جامع مسجد اہل حدیث امین بازار میں جاری تھا۔ اس سے ایک سال بعد ۱۹۵۸ میں جامعہ سلفیہ اپنی موجودہ جگہ شیخوپورہ روڈ میں منتقل کیا گیا۔ اس وقت تک وہاں تین چار کمرے تعمیر ہوگئے تھے جن میں طلبا کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہوا۔

مولانا محمد علی جانباز ۱۹۵۷ میں جامعہ اسلامیہ (گوجراں والا) سے فارغ ہوئے اور ۱۹۵۸ میں حضرت حافظ صاحب سے دوبارہ بخاری شریف پڑھنے کے لیے جامعہ سلفیہ چلے گئے۔ اس وقت مولانا شریف اللہ خاں سواتی بھی وہیں تھے۔ حضرت حافظ صاحب تو تمام علوم پر حاوی تھے لیکن مولانا شریف اللہ صاحب علوم آلیہ میں امام کا درجہ رکھتے تھے۔ مولانا محمد علی جانباز نے ان دونوں حضرات سے استفادہ کیا اور ۱۹۵۸ میں جامعہ سلفیہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔

اس وقت مولانا محمد اسحاق چیمہ جامعہ سلفیہ کے مہتمم تھے اور جامعہ سلفیہ کمیٹی کے صدر مولانا سید محمد داؤد غزنوی تھے۔ مولانا محمد اسحاق چیمہ کی کوشش سے مولانا محمد علی جانباز کو جامعہ سلفیہ میں بہ طور استاذ مقرر کرلیا گیا۔ وہاں وہ تین سال رہے۔ ان کے ذمے طلبا کو درمیانے درجے کی نصابی کتابیں پڑھانا تھا۔ تین سال یہ جامعہ سلفیہ میں خدمت تدریس انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد حالات ایسے

پیدا ہوئے کہ ان کا وہاں رہنا اور خدمت تدریس انجام دینا ممکن نہ رہا۔

اس کا علم حافظ محمد شریف سیالکوٹی مرحوم کو ہوا تو انھوں نے ان کو سیالکوٹ آنے کی دعوت دی اور یہ سیالکوٹ تشریف لے گئے۔ یہ ۱۹۶۲ کی بات ہے۔ حافظ محمد شریف صاحب نے سیالکوٹ کے محلّہ باغ ڈپٹی میں دارالحدیث کے نام سے ایک مدرسہ جاری کیا تھا۔ مولانا محمد علی جانباز اس مدرسے میں مصروفِ تدریس ہوگئے۔ یہ سلسلہ دو سال جاری رہا۔ اس کے بعد حالات ایسے بدلے کہ ان کا وہاں رہنا مشکل ہوگیا۔

۱۹۶۴ میں سیالکوٹ کے ایک نیک دل کاروباری شخص حاجی خدا بخش مرحوم نے مولانا محمد علی جانباز سے رابطہ پیدا کیا۔ حاجی صاحب کی رہائش حضرت مولانا محمد ابراہیم میر کی مسجد کے قریب تھی۔ حاجی صاحب نے اور پروفیسر ساجد میر اور مولانا محمد ابراہیم میر کی مسجد کے خطیب مولانا محمد ابراہیم ریاستی نے مولانا محمد علی جانباز سے کہا کہ وہ اس مسجد میں مدرسہ جاری کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اس میں مدرس کی حیثیت سے آجایئے۔ چنانچہ ان کے کہنے پر مولانا محمد علی جانباز نے اس مدرسے میں تدریس کی ذمہ داری سنبھالی۔ ۱۹۶۵ میں اس مدرسے کے لیے ایک اور مدرس مولانا عطاء الرحمٰن اشرف کی خدمات بھی حاصل کرلی گئیں۔ ۱۹۶۸ میں اس مدرسے میں اختتام بخاری شریف کی تقریب ہوئی، جس میں حضرت حافظ محمد گوندلوی تشریف لائے۔ یہ مدرسہ حاجی خدا بخش اپنے خرچ پر چلا رہے تھے۔ ۱۹۷۰ میں حاجی صاحب مرحوم نے اسے بند کردیا۔ یہ مدرسہ چھ سال جاری رہا۔

اس وقت مولانا محمد علی جانباز محلّہ لاہوری شاہ ناصر روڈ کی مسجد اہل حدیث میں خطیب تھے۔ انھوں نے مدرسے کے لیے مسجد کے نمازیوں سے مشورہ کیا تو وہ اس پر آمادہ ہوگئے کہ مدرسہ اس مسجد میں منتقل کردیا جائے۔ چنانچہ یہ مدرسہ ناصر روڈ کی مسجد میں جاری کردیا گیا۔ مسجد کے متولی شیخ حاجی محمد اکرم تھے۔ ان کی والدہ نہایت صالحہ خاتون تھیں۔ نیک بخت خاتون نے اس مدرسے کے ساتھ بہت تعاون کیا۔ وہ اپنے خاندان کے لوگوں سے رقم اکٹھی کرکے مدرسے کی مدد کرتی رہیں۔ اس اثنا میں حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کی مسجد کے خطیب مولانا محمد ابراہیم ریاستی مرحوم نے بھی مدرسے کے سلسلے میں مولانا محمد علی جانباز کی بے حد مدد کی۔ انھوں نے شہر کے لوگوں سے ان کا تعارف کرایا اور اپنے ہر جاننے والے سے مدرسے کے لیے تعاون کی اپیل کی اور اللہ کے فضل سے مدرسہ بخیر وخوبی چلتا رہا۔

اسی اثنا (۱۹۷۹) میں مدرسے کے لیے دس مرلے کا ایک پلاٹ خریدا گیا اور اصحاب ثروت کے تعاون سے وہاں ضرورت کے مطابق کمرے بھی تعمیر ہوگئے۔

چنانچہ ۱۹۸۰ میں مدرسہ مسجد سے اس نئی عمارت میں منتقل کردیا گیا۔ بعد ازاں مدرسے میں مسجد

بھی بنالی گئی۔ اب مدرسہ ماشاء اللہ بہت اچھی طرح جاری ہے۔ مسجد بھی آباد ہے اور اہل محلہ بڑے شوق اور اہتمام سے مسجد میں آتے اور جمعہ و جماعت میں شامل ہوتے ہیں۔ اس مدرسے سے درس نظامی کے مروجہ نصاب کی تکمیل کرنے والوں کی تعداد تین سو کے پس و پیش اور شعبہ حفظ قرآن سے فارغ ہونے والے طلبا کی تعداد سات سو کے قریب ہے۔ یہ بہت بڑی تدریسی خدمت ہے جو مولانا محمد علی جانباز نے ۱۹۶۲ سے لے کر ۲۰۰۷ تک سیالکوٹ میں سر انجام دی۔ اس دوران صحیح بخاری کی آخری حدیث پر درس دینے کے لیے جو حضرات مدرسے میں تشریف لائے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

① ...... حضرت العلام حافظ محمد گوندلوی

② ...... مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی

③ ...... مولانا حافظ محمد اسحاق حسینوی

④ ...... مولانا محمد عبداللہ لائل پوری جھال خانو آنا (فیصل آباد)

⑤ ...... پیر محمد یعقوب قریشی (جامعہ اثریہ جہلم)

⑥ ...... مولانا محمد اسحاق چیمہ (فیصل آباد)

⑦ ...... پروفیسر غلام احمد حریری (فیصل آباد)

⑧ ...... مولانا ارشاد الحق اثری۔ جامعہ اثریہ، (فیصل آباد)

⑨ ...... مولانا حافظ ثناء اللہ مدنی۔ جامعہ رحمانیہ (لاہور)

⑩ ...... مولانا معین الدین لکھوی۔ جامعہ محمدیہ، (اوکاڑہ)

⑪ ...... مولانا فاروق احمد صاحب راشدی۔

مولانا محمد علی جانباز کی دعوت پر ایک مرتبہ مولانا محمد حنیف ندوی اور ان سطور کا راقم بھی سیالکوٹ ان کے مدرسے میں گئے تھے اور مولانا ندوی نے وہاں تقریر فرمائی تھی۔ ہم نے دیکھا کہ مولانا کو سیالکوٹ میں بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کے سلسلے میں بھی مولانا محمد علی جانباز کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

① ...... انجاز الحاجہ شرح ابن ماجہ: یہ مولانا ممدوح کی عربی تصنیف ہے جو صحاح ستہ میں شامل مشہور کتاب سنن ابن ماجہ کی شرح ہے۔ حدیث شریف کی یہ نہایت اہم خدمت ہے جو مولانا ممدوح بڑی محنت سے سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ سطور ۲۴۔ ستمبر ۲۰۰۷ء کو لکھی جارہی ہیں۔ اب تک انجاز الحاجہ کی سات جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔ مولانا کے اندازے کے مطابق یہ شرح تیرہ چودہ جلدوں

میں مکمل ہوگی۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا کو صحت و عافیت کی نعمت سے نوازے رکھے اور وہ جلد اس عظیم الشان کام سے فارغ ہوں۔

اس کے علاوہ ان کی اردو تصانیف یہ ہیں۔

۲...... صلوٰۃ المصطفیٰ: نماز کے بارے میں یہ ایک مفصل کتاب ہے۔

۳...... حرمت متعہ: اس میں شیعہ حضرات کے مسئلہ متعہ کی تردید کی گئی ہے۔

۴...... توہین رسالت کی شرعی سزا: اس کا مطلب نام سے ظاہر ہے۔

۵...... آل مصطفیٰ: اس کتاب میں نبی ﷺ کی آل کے بارے میں محققانہ بحث کی گئی ہے۔

۶...... ارکانِ اسلام: اس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کے ارکان کون کون سے ہیں۔

۷...... اہمیت نماز: یہ نماز کے فضائل اور ترک نماز کی وعید سے متعلق ہے۔

۸...... خطبہ جمعہ کے دوران دو رکعت پڑھنے کا حکم: کسی زمانے میں دیوبند سے ایک ماہانہ رسالہ ''تجلی'' کے نام سے نکلتا تھا۔ اس کے مدیر عامر عثمانی نے ایک پورا شمارہ اس موضوع پر شائع کیا تھا کہ خطبہ جمعہ کے دوران دو رکعت نہیں پڑھنی چاہئیں۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی کے ارشاد پر مولانا محمد علی جانباز نے ایک طویل مضمون میں جو ہفت روزہ ''الاعتصام'' کی تیرہ قسطوں میں شائع ہوا تھا، مدیر تجلی کے موقف کی تردید کی تھی۔ لیکن مدیر تجلی نے اس کا جواب نہیں دیا تھا۔ یہ مضمون ''خطبہ جمعہ کے دوران دو رکعت پڑھنے کا حکم'' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔

۹...... نفحات الفطر فی تحقیق مسائل عید الفطر: یہ کتاب عید الفطر کے مسائل پر مشتمل ہے۔

۱۰...... احکام سفر: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کتاب میں سفر کے متعلق احکام بیان کیے گئے ہیں۔

۱۱...... احکام طلاق: طلاق سے متعلق مسائل پر مشتمل ہے۔

۱۲...... احکام نکاح

۱۳...... احکام وقف و ہبہ

۱۴...... اسلام میں صلہ رحمی کی اہمیت

۱۵...... صفاتِ مومن

۱۶...... احکام قسم و نذر

انجاز الحاجۃ سمیت (جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے) مولانا محمد علی جانباز کی یہ سولہ کتابیں ہیں۔ ان میں بعض چھوٹی ہیں اور بعض بڑی۔

مولانا محمد علی جانباز مشہور مدرس اور معروف مصنف ہیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا، تحقیق سے لکھا اور قارئین نے اس سے استفادہ کیا۔ مولانا ممدوح عمر کی ۷۵ منزلیں طے کر چکے ہیں۔ وہ ایک خاص مزاج اور خاص ذہن کے اہل علم ہیں۔ اور ہماری رائے میں تقویٰ شعار بزرگ ہیں۔ ان کی زندگی کے بعض ماہ و سال بڑی تلخ فضا میں گزرے ہیں جن کے اثرات اب تک ان کے ذہن میں موجود ہیں۔ جن لوگوں کے طرزِ عمل سے وہ خوش گوار حالات سے گزرے، وہ بھی انھیں یاد ہیں اور جن کی وجہ سے انھیں ذہنی تکلیف پہنچی، وہ بھی انھیں اچھی طرح یاد ہیں۔

مولانا ممدوح کا حلیہ یہ ہے: کشیدہ قامت، کتابی چہرہ، تیکھے نقوش۔ آنکھوں پر نظر کی عینک۔ شلوار قمیص میں ملبوس۔ سر پر ٹوپی۔ ملنسار، خوش کلام اور بلند اخلاق۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ اس خادم حدیث کو صحت و عافیت کے ساتھ طویل زندگی عطا فرمائے تاکہ وہ کتاب و سنت کی زیادہ سے زیادہ خدمت کریں۔



مولانا عبدالرشید مجاہد آبادی

۱۹۴۹ء کے موسم سرما کے ابتدا میں پہلی دفعہ میں نے عبدالرشید کو دیکھا، جب حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدی، خلیل اثری، ابوبکر صدیق سلفی اور اس فقیر کو پنجاب کے اہل حدیث مدارس کے طلبا کی تنظیم کے لیے مختلف مقامات میں جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے یاد پڑتا ہے لاہور سے روانہ ہو کر پہلا (یا دوسرا) پڑاؤ ہم نے موضع ڈھلیانہ میں کیا تھا۔ وہاں ایک دینی مدرسہ قائم تھا جو کسی زمانے میں ایک نیک دل بزرگ مولوی محمد الدین نے جاری کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد اس کے مہتمم حاجی قطب الدین کھرل کو مقرر کیا گیا تھا جو اس علاقے کی معروف شخصیت تھے۔ ڈھلیانہ اس زمانے میں ضلع منٹگمری (حال ضلع ساہی وال) میں تھا۔ اب ضلع اوکاڑہ کی تحصیل رینالہ خورد میں ہے اور رینالہ سے بجانب جنوب باماں بالا روڈ پر دس کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

ہم ڈھلیانہ کے اس مدرسے میں ایک رات رہے تھے۔ وہاں پندرہ سولہ سال کے ایک لڑکے کے متعلق بتایا گیا کہ یہ لڑکا پہلے ہندو تھا اور اس کا نام کرشن لال تھا، اب مسلمان ہوگیا ہے اور اس کا نام عبدالرشید ہے۔ یہ لڑکا اس مدرسے کا طالب علم تھا اور وہاں دینیات کی درسی کتابیں پڑھتا تھا۔ نکھرا ہوا گندمی رنگ، کھلی پیشانی، روشن آنکھیں، ناک نقشہ مناسب، چہرہ بالوں سے خالی۔

اب آئندہ سطور میں دیکھتے ہیں کہ چڑھتی جوانی کا یہ خوب رو لڑکا کرشن لال سے عبدالرشید کیسے بنا......؟ لیکن اس سے پہلے اس کے مسکن اور اس کے خاندان کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔

ضلع اوکاڑہ کی تحصیل رینالہ خورد میں ایک گاؤں اسلام پور کے نام سے موسوم ہے۔ قیام پاکستان سے قبل اس گاؤں میں مسلمان بھی آباد تھے اور غیر مسلم بھی۔ ہندوؤں کے اس گاؤں میں بیس گھر تھے جو سیاسی اصطلاح میں اقلیت میں تھے۔ لیکن یہ لوگ سرمایہ دار تھے اور سرمایہ دار ہونے کی وجہ سے گاؤں کے لوگوں پر ان کا اثر رعب کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ اس گاؤں کا ایک ہندو خاندان اروڑہ برادری سے تعلق رکھتا تھا۔ ان میں ایک شخص کا نام گوراں دتہ مل تھا جو اس علاقے کا مشہور ساہو کار، معروف سیٹھ اور بااثر کاروباری شخص تھا۔ پتوکی پرانی منڈی میں اس کا روئی کا کارخانہ تھا۔ اس کا سودی کاروبار بھی عروج پر تھا۔ اس کے گھر میں ملکہ وکٹوریہ کی تصویر والے چاندی کے روپے تھیلیوں میں پڑے رہتے تھے جو وہ ضرورت مند قرض خواہوں کو سود پر دیتا تھا۔ جس مکان میں وہ

اپنے اہل وعیال سمیت سکونت پذیر تھا، وہ بھی اس نے سودی سلسلے میں کسی مقروض سے حاصل کیا تھا۔

گوراں دتہ مل کے بڑے بھائی کا نام جیدیال مل تھا۔ جیدیال مل جب گرمیوں کے دنوں میں گھر سے باہر نکلتا تو جان محمد نامی ایک مسلمان اس پر چھتری کا سایہ کر کے اس کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔

گوراں دتہ مل نے پہلے ایک شادی کی، جس سے ایک بیٹے اور ایک بیٹی نے جنم لیا۔ بیٹے کا نام ہلسراج اور بیٹی کا مالا دیوی تھا۔ اس کے بعد اس کی یہ بیوی فوت ہوگئی۔ اب اس نے دوسری شادی کی۔ اس خاتون کا نام ریشم دیوی تھا۔ اس سے تین بیٹے پیدا ہوئے جن کے علی الترتیب نام یہ تھے: برج لال، کرشن لال اور حاکم چند...... اس سے کچھ عرصے بعد عین عالم جوانی میں گوراں دتہ مل وفات پا گیا۔ اس وقت کرشن لال تیسرے سال میں تھا اور حاکم چند سب سے چھوٹا تھا جو باپ کی وفات کے چند روز بعد پیدا ہوا تھا۔ برج لال زیادہ سے زیادہ پانچ سال کا ہوگا۔

ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق جب کوئی شخص مرنے کے قریب ہو تو اسے چارپائی سے اتار کر زمین پر لٹا دیا جاتا ہے۔ چارپائی پر موت کو ان کے نزدیک نحوست اور بدنصیبی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ چناں چہ گوراں دتہ مل کو زمین پر لٹا دیا گیا اور وہیں اس کی موت واقع ہوئی۔ موت کے بعد ہندوؤں کے مذہب کی رو سے مرنے والے کو پنڈت غسل دیتا ہے۔ پھر اس کی ارتھی یعنی میت کو مرگھٹ میں لایا جاتا ہے۔ وہاں لکڑیوں کے ڈھیر پر اسے رکھ دیا جاتا ہے، اس کے اوپر مزید لکڑیاں رکھ دی جاتی ہیں۔ اگر وہ امیر آدمی ہو تو اس پر دیسی گھی ڈالا جاتا ہے۔ اگر غریب ہو تو مٹی کے تیل کی دو تین بوتلیں ڈال دی جاتی ہیں اور پھر اس کا بڑا بیٹا اسے آگ لگاتا ہے۔ گوراں دتہ مل کے ساتھ بھی یہی کیا گیا۔ اس کے بڑے بیٹے ہنسراج نے (جو اس کی پہلی بیوی کے بطن سے تھا) باپ کی ارتھی کو آگ لگائی اور ساتھ ہی یہ الفاظ زبان سے کہے: ”ہائے سری پٹاخا ماریا، لے رام کا نام۔“

سکھوں اور ہندوؤں میں یہ رواج چلا آرہا ہے (یا ممکن ہے یہ ان کا مذہبی شعار ہو) کہ مرگھٹ سے واپسی پر یعنی مردے کو جلانے کے بعد وہ تقریباً چالیس قدم پر مرگھٹ کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہاں کچھ پڑھ کر پھونکیں مارتے ہیں، جس کا مقصد ان کے نزدیک یہ ہوتا ہے کہ بدروح ان کی طرف نہ آئے، مرگھٹ ہی میں رہے۔ (میں نے بعض مسلمانوں کو بھی میت کو دفن کر کے چالیس قدم پر قبرستان کی طرف منھ کر کے دعا کرتے دیکھا ہے۔ معلوم نہیں یہ مسئلہ انھیں کہاں سے ملا ہے۔)

مردے کو جلانے کے لیے بھی ہندوؤں کے ہاں غریب اور امیر کا فرق ہے۔ امیر آدمی کو صندل یا پیپل کی لکڑی سے جلایا جاتا ہے کہ ان درختوں کی لکڑی ان کے نزدیک پوتر اور پاک ہوتی ہے اور

غریب آدمی کو جو لکڑی میسر آجائے اس سے جلا دیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں بعض اوقات آگ لگنے سے کچھ دیر بعد مردے کے جسم میں کھنچاؤ سا پیدا ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اکڑ کر اوپر کو ہو جاتا ہے یا ہلنے لگتا ہے۔ یہ ان کے نزدیک نحوست کی علامت ہے۔ اس کا مطلب وہ یہ لیتے ہیں کہ یہ اپنے ساتھ گھر کے کسی اور شخص کو بھی بلاتا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو وہ لوگ مردے کے سر اور جسم پر زور سے لکڑیاں مار کر اسے نیچے کر دیتے ہیں۔

مردے کو وہ جلاتے اس لیے ہیں کہ دنیا میں اس نے جو پاپ اور گناہ کیے ہیں، وہ اس آگ سے ختم ہو جائیں اور وہ پاک صاف ہو کر اللہ کے دربار میں پہنچے اور سیدھا سُرگ (بہشت) میں جائے۔

مردے کو جلانے کے تیسرے دن اس کے قریبی رشتے دار مرگھٹ میں جاتے ہیں اور اس کی راکھ میں سے اس کے پاؤں اور ہاتھوں کے بیس ناخن تلاش کرتے ہیں۔ پھر انھیں ایک صاف برتن یا کپڑے میں ڈال کر (اگر وہ امیر لوگ ہوں تو) اچھی خاصی تعداد میں دریائے گنگا میں جا کر ڈال دیتے ہیں، اس لیے کہ دریائے گنگا ان کے نزدیک پوتر دریا ہے اور اس کا پانی بابرکت ہے۔ اس سے مردے کو امن اور شانتی ملے گی۔ اگر مردے کے وارث غریب لوگ ہوں تو پھول (یعنی ناخن) کسی کپڑے میں باندھ کر تالاب یا نہر میں پھینک دیتے ہیں۔ تیسرے دن راکھ سے مردے کے ناخن تلاش کرنے کے عمل کو ان کے مذہب میں ''پھول چننا'' کہا جاتا ہے۔ اس دن مردے کے لیے ایصالِ ثواب کی نیت سے خیرات بھی کی جاتی ہے۔ یہ ان کے تیسرے دن کا عمل ہے۔ اس کے بعد موت کے ساتویں اور دسویں دن حلوا یا گائے کے دودھ کی کھیر پکا کر خیرات کرتے ہیں، جسے وہ ''پن دان'' کہتے ہیں۔ زیادہ تر کھیر وہ اپنے پنڈت کو دیتے ہیں۔ جو چیزیں تیسرے، ساتویں اور دسویں دن خیرات میں دی جاتی ہیں، ان پر پنڈت کچھ پڑھتا بھی ہے۔ موت پر چالیس دن گزر جائیں تو زیادہ تعداد میں لوگوں کی دعوت کی جاتی ہے اور دھوم دھام سے ان کو کھلایا پلایا جاتا ہے۔ چالیسویں پر ان کی مذہبی رسوم ختم ہو جاتی ہیں۔

غمی شادی کی رسوم اور خاص دنوں کے تعین کے ساتھ ان پر عمل کے سلسلے کی بہت سی باتیں ہمارے ہاں ہندوؤں سے آئی ہیں اور افسوس ہے ہم انھیں اسلامی احکام سمجھ رہے ہیں۔ شادی بیاہ کے موقعے پر تیل، مہندی، سہرا بندی وغیرہ رسوم ہم نے ہندوؤں سے لی ہیں۔ سیاست میں تو ہم ان کے شدید مخالف ہیں، لیکن ان معاملات میں ہمارا رویہ ان سے بہت حد تک ملتا جلتا ہے۔

تیسرے دن ''پھول'' کی رسم پر ہندو لوگ اپنے پنڈت کو نقد روپے بھی دیتے ہیں اور گھر لے جانے کے لیے پھل فروٹ بھی اسے دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح ساتویں، دسویں اور چالیسویں پر بھی اس کی سیوا کی جاتی ہے۔ ہم بھی قل اور ختم وغیرہ کے مواقع پر اپنی حیثیت کے مطابق مولوی

صاحب کی خدمت کرتے ہیں۔

کرشن لال کی سوتیلی بہن مالا دیوی شادی شدہ اور بچوں والی تھی، اس کی وفات کے بعد اس کے ساتھ بھی وہی ہوا جو اس کے باپ کے ساتھ ہوا تھا۔ بلکہ اس میں ایک اضافہ یہ کیا گیا کہ اس کی آنکھوں میں نیل ڈالا گیا، پاؤں کے تلووں میں لوہے کی میخیں گاڑی گئیں اور زیورات پہنا کر اسے نذرِ آتش کیا گیا۔

سنا ہے کہ ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ بچوں والی عورت مرنے کے بعد جون بدل کر یعنی شکل اور ہیئت تبدیل کر کے کسی دوسرے روپ میں دوبارہ اپنے گھر آجاتی ہے اور گھر والوں کو پریشان کرتی ہے۔ ممکن ہے مالا دیوی کی آنکھوں میں اس لیے نیل ڈالا گیا ہو کہ وہ اندھی ہو جائے اور اس دنیا کا پرانا گھر جسے وہ چھوڑ کر گئی ہے، اسے دکھائی نہ دے۔ تلوؤں میں میخیں اس لیے گاڑی گئی ہوں کہ وہ پاؤں سے چل نہ سکے اور زیورات اس لیے پہنائے گئے ہوں کہ عورتوں کو زیور سے پیار ہوتا ہے، مرنے کے بعد وہ اسے پہن کر خوش رہے اور ہماری طرف اس کا دھیان نہ جائے۔ ہندو مذہب عجیب قسم کے توہمات کا گورکھ دھندا ہے اور اس کی مختلف رسوم مختلف اسباب کی پیداوار ہیں، جن کو سمجھنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ ان کی باتیں وہی جانیں۔

بات کرشن لال کی ہو رہی تھی۔ وہ مال دار گھرانے کا لڑکا تھا۔ اس کے آبا واجداد نے اپنے خرچ سے گاؤں میں ایک مندر یعنی بت خانہ بنایا تھا، جس میں دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں رکھی گئی تھیں، جن کی وہ پوجا کرتے تھے۔ مندر کی دیواروں پر متعدد تصویریں آویزاں کی گئی تھیں۔ ایک تصویر آدم اور حوا کی تھی۔ آدم کو وہ شیو جی مہاراج اور اماں حوا کو پاربتی جی کہتے ہیں۔

یہاں یہ یاد رہے کہ اپنے خرچ سے تعمیر کردہ مندر کے علاوہ اس خاندان نے سکھوں کے گوردوارے کی تعمیر کے لیے بھی مالی امداد فراہم کی تھی اور اس گوردوارے میں سکھوں کی مذہبی کتاب گرنتھ صاحب کو نہایت احترام سے اونچی جگہ پر رکھا گیا تھا۔ گاؤں میں دھرم شالہ بھی ان کی امداد سے تعمیر کیا گیا تھا، جس میں بہت سے بت رکھے گئے تھے۔

ہندوؤں کے کئی فرقے ہیں۔ ایک فرقے کا نام سناتن دھرم ہے۔ اس فرقے سے تعلق رکھنے والے مورتی پوجتے ہیں، یعنی بت پرست ہیں۔ خود ہی مورتی بناتے ہیں، جسے وہ اپنا خدا مانتے ہیں، پھر اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے بت کی پوجا کرتے ہیں۔ کرشن لال کا خاندان سناتن دھرمی تھا اور یہ لوگ مٹی کی بنائی ہوئی مورتی کی پوجا کرتے تھے، اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھتے اور اسے سجدہ کرتے تھے۔ خود کرشن لال بچپن میں اپنے مذہب کے مطابق مورتی پوجتا، اس کے سامنے شبد اور بھجن پڑھتا اور آرتی کرتا تھا۔ اس کا طریقہ کچھ اس قسم کا تھا کہ دائیں ہاتھ میں کرشن دھوپ رکھ کر

(جو ایک طرح کی گوکل تھی) اسے جلاتا، جس سے دھواں نکلتا اور بائیں ہاتھ میں گھنٹی (ٹلی) پکڑتا۔ اس دھوپ کے دھوئیں اور گھنٹی کی آواز کے ساتھ ایک گانا گایا جاتا۔ اس گانے کے الفاظ لکھے تو جاسکتے ہیں اور میں اگلی سطروں میں لکھ بھی رہا ہوں، پڑھے بھی جاسکتے ہیں لیکن انھیں سمجھنے کے لیے کسی پنڈت کی مدد درکار ہوگی جس کا حصول میرے لیے نہایت مشکل ہے۔

جے جگدیش ہرے سوامی جے رادھا شام ہرے
بھگت جھنوں کے سینکٹ چھن میں دور کرے سوامی جے رادھا شام ہرے
ساریاں گوپیاں آکھ سنایا تیرا گھن گھنیا آیا
اس نے چوری مکھن کھایا ، کھاں دا ہٹ ہٹ کے
تیری بینسری نے من موہیا کرشنا ہس ہس کے

پتی یعنی شوہر کی وفات کے بعد کرشن لال کی والدہ نے فیصلہ کرلیا کہ اس کی جوانی اب اپنے تینوں بیٹوں کی تربیت اور نگہداشت میں صرف ہوگی۔ وہ دوسری شادی نہیں کرسکتی تھیں، کیوں کہ ہندو معاشرے اور ہندو دھرم میں کسی بیوہ عورت کا دوسری شادی کرنا بے حد معیوب سمجھا جاتا ہے اور ایسی عورت کو نفرت اور کراہت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ چناں چہ اس شریف خاتون نے بچوں کی تربیت کے لیے اپنے آپ کو وقف کیے رکھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے نہ صرف ہندوؤں میں عزت کا مقام حاصل ہوا۔ بلکہ پورے گاؤں میں اسے احترام کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔

کرشن لال کا بڑا سوتیلا بھائی ہنسراج میٹرک پاس تھا اور گاؤں میں دکان کرتا تھا۔ یہ تینوں بھائی بھی کچھ بڑے ہوئے تو ان کی تعلیم کا مسئلہ سامنے آیا۔ ان کے گاؤں میں پرائمری سکول تھا اور اس زمانے میں چار جماعتیں پاس کرنے والے کو پرائمری پاس کہا جاتا تھا۔ کرشن لال نے اسی سکول میں داخلہ لیا اور پرائمری پاس کی۔ ان کے گاؤں سے ایک میل کے فاصلے پر موضع کماں میں ورنیکلر مڈل سکول تھا، پرائمری پاس کرنے کے بعد کرشن لال کو اس سکول میں پانچویں جماعت میں داخل کرا دیا گیا۔ وہ اپنے ہم جماعت لڑکوں کے ساتھ صبح جاتا اور چھٹی کے بعد گھر آجاتا۔

کرشن لال چوں کہ سمجھ دار اور ہوشیار لڑکا تھا، اس لیے سکول کی تعلیم کے علاوہ اس کے ذمے دو کام اور لگائے گئے تھے جو خالص مذہبی نوعیت کے تھے۔

ان کے گاؤں کے ہندوؤں نے مندر میں پوجا پاٹھ کے لیے دیسی مہینے کی پہلی تاریخ مقرر کررکھی تھی۔ یہ کرشن لال کی ذمے داری تھی کہ اس تاریخ کو وہ تمام ہندوؤں کے گھر میں جائے اور پوجا کے لیے انھیں مندر میں لائے۔ پوجا پاٹھ کا طریقہ یہ تھا کہ مندر میں ایک ''متبرک'' کتاب رکھی گئی تھی۔ ہر آنے والا ہندو اس کے سامنے زمین پر سر رکھ دیتا اور پھر نقدی یا غلے یا آٹے کی صورت

میں جو چیز بھی میسر ہوتی، بہ طور نذرانہ اسے پیش کرتا۔ کرشن لال اس کتاب کا کچھ حصہ ان لوگوں کو پڑھ کر سناتا۔ ان لوگوں کے مندر میں آنے سے پہلے حلوا پکا کر رکھا جاتا تھا۔ پوجا کے بعد جب کتاب سنانے سے کرشن لال فارغ ہوجاتا تو ہنسراج حاضرین میں حلوا تقسیم کرتا۔ سب سے پہلے تھوڑا سا حلوا کرشن لال کے ہاتھ پر رکھا جاتا اور اسے کہاجاتا کہ یہ حلوا اپنے گھر کی ''کھوہی'' میں ڈال دے۔ حلوا کھوہی میں کیوں ڈالا جاتا تھا؟ اس لیے کہ پانی کا دیوتا (یعنی جل دیوتا) خوش رہے اور لوگ پانی کی صورت میں آنے والی تکلیفوں سیلاب وغیرہ سے یا دریا میں ڈوبنے سے محفوظ رہیں۔

اس قسم کا کام بعض مسلمان بھی کرتے ہیں جو دریا پار کرنے کے لیے کشتی پر سوار ہوتے ہیں، وہ کچھ نقد روپے یا کوئی اور چیز حضرت خضر علیہ السلام کی نذر کے طور پر دریا میں ڈال دیتے ہیں کہ پانی پر حضرت خضر کی حکومت ہے اور وہ سلامتی کے ساتھ ہماری کشتی کنارے لگا دیں گے۔

کرشن لال کے ذمے دوسرا کام تھا صبح آ کر دکان کھولنا، اس کی صفائی کرنا اور دکان کی دیوار پر جو بت چسپاں تھا، اس کی پوجا کرنا، اس پر سرسوں کا تیل ملنا۔ اس کے بعد اسے سندھور لگانا۔ یہ ڈیوٹی انجام دینے کے بعد کرشن لال دھوپ کو دیا سلائی سے آگ لگاتا جو دھوئیں کی شکل اختیار کرلیتی تھی۔ پھر اسے اس بت کے سامنے گھمایا جاتا جو دکان کی دیوار پر چسپاں تھا۔ بعد ازاں برتن میں پانی ڈال کر اس میں سے تھوڑا سا پانی سورج کے سامنے چھنکا جاتا۔ اس عمل کے ساتھ زبان سے یہ الفاظ کہنا ضروری تھا:

''اے سورج بھگوان تیری جے ہو۔'' یہ ہر روز کا معمول تھا۔

سورج سے بہت سی امیدیں وابستہ کی جاتی تھیں۔ سورج یا چاند کو گرہن لگ جاتا تو ہندوؤں پر گھبراہٹ طاری ہوجاتی اور انھیں خیال گزرتا کہ معلوم نہیں اس کا کتنا برا نتیجہ نکلے گا۔ اس موقعے پر وہ پن دان (صدقہ خیرات) کرتے۔

ایک دن دس گیارہ سالہ کرشن لال حسب معمول شیو جی مہاراج اور پاربتی کی تصویروں کی پوجا کررہا تھا۔ یہ دونوں تصویریں شیشے کے فریم میں اکٹھی تھیں۔ پوجا کے دوران میں کسی طرح وہ شیشہ ٹوٹ گیا۔ یعنی جن سے مرادیں مانگی جارہی تھیں، وہ خود ایک شیشے میں بند تھے اور وہ اپنے شیشے کو ٹوٹنے سے بچا نہ سکے اور خود بھی سنبھل نہ سکے، نیچے گر گئے۔

یہ بالکل ایک صحابی والا واقعہ ہوا۔ صحابی نبی ﷺ سے اپنے اسلام قبول کرنے کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے بکری کے دودھ سے مٹی کو گوندھ کر ایک معبود بنایا۔ میں اس کی باقاعدہ پوجا کیا کرتا تھا۔ ایک دن اس کی پوجا کے لیے گیا تو دیکھا کہ لومڑی اس پر پیشاب کررہی ہے۔ میرے دل میں اس سے سخت کراہت پیدا ہوئی اور میں نے سوچا کہ یہ کیا معبود ہے، جس پر لومڑی پیشاب

کررہی ہے اور یہ اسے روک نہیں سکتا۔ اس سلسلے میں وہ اپنی دلی کیفیت اور کراہت کا اظہار ان شعروں میں کرتے ہیں۔

رب یبول الثعلبان براسه
لقد ذل من بالت علیه الثعالب
برئت من الاصنام والشرک کله
وایقنت ان اللّٰہ لا شک غالب

(یہ کیسا معبود ہے، جس کے سر پر لومڑ پیشاب کررہا ہے، یقیناً یہ ذلیل معبود ہے، جس کو لومڑ نے پیشاب کے لیے چنا ہے۔
اب میں بتوں سے اور ہر قسم کے شرک سے بے زار ہوں، مجھے یقین ہوگیا ہے کہ صرف اللہ ہی ہر شے پر غالب ہے۔)

قارئین کرام شاید سوچ رہے ہوں گے کہ ہم یہاں تک پہنچ گئے ہیں لیکن ابھی تک کرشن لال کے ساتھ ہی چل رہے ہیں، وہ عبدالرشید کہاں ہے جس کے نام سے عنوان قائم کیا گیا اور آغازِ تحریر میں جس کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ تھوڑی دیر صبر کیجیے۔ اب کرشن لال موضع کماں کے ورینکلر مڈل سکول میں داخل ہوگیا ہے اور یہ اس کی عبدالرشید کا روپ دھارنے یا اس کے مذہب کے مطابق اپنی ''جون'' بدلنے کی پہلی منزل ہے اور وہ تھوڑی دیر کے بعد نہ صرف عبدالرشید ہوجائے گا بلکہ آپ دیکھیں گے کہ مولانا عبدالرشید کی شکل میں آپ کے سامنے ہوگا۔

کرشن لال نے پانچویں جماعت میں داخلہ لے لیا ہے اور پڑھائی شروع ہوگئی ہے۔ حسن اتفاق سے اس کے تمام اساتذہ مسلمان ہیں۔ ان میں ایک ماسٹر محمد زکریا ہیں، دوسرے ماسٹر احمد دین ہیں اور تیسرے ہیں ماسٹر معراج الدین۔ یہ تینوں استاد طلبا کے بے حد خیر خواہ ہیں اور نہایت محنت سے پڑھاتے ہیں۔ لیکن اس کے ہم جماعت لڑکے ہندو بھی ہیں، مسلمان بھی ہیں، سکھ بھی ہیں اور عیسائی بھی۔ چاروں مذاہب سے تعلق رکھنے والے یہ لڑکے گاؤں سے اکٹھے سکول جاتے ہیں اور اکٹھے واپس آتے ہیں۔ آپس میں ان کی مذہبی چھیڑ چھاڑ بھی رہتی ہے اور ساتھ ہی باہمی محبت بھی ہے۔

کرشن لال اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے کہ کرشن جی مہاراج کا مرتبہ بہت بلند ہے اور وہی اصل بھگوان ہیں۔ اس کی دلیل کیا ہے؟ اس کا صحیح جواب وہ نہیں دے سکتا۔ بس وہی کچھ کہتا ہے جو اس نے گھر میں اپنے بڑوں سے سنا ہے۔ سوہن سنگھ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ گورونانک جی کا مقام سب سے اونچا ہے۔ آرتھر مسیح اور سلامت مسیح اپنی گفتگو میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان سب سے بڑھا چڑھا کر

بیان کرتے ہیں۔ اللہ دتہ اور عطا محمد کے خیال میں حضرت محمد ﷺ کی عظمت و رفعت کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ ان کے فرامین واحکام نہایت واضح ہیں اور ان پر عمل کرنا ضروری ہے۔ یہ بحث و مباحثہ ان ہم جماعت لڑکوں کا ہر روز کا معمول بھی ہے اور مشغلہ بھی ہے۔

اسی طرح چلتے چلتے ایک دن آیا کہ اللہ دتہ اور عطا محمد نے کرشن لال کو کلمہ توحید **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** پڑھا دیا اور کرشن لال نے بغیر کسی جبر کے بہ درجہ غایت مسرت کے ساتھ یہ کلمہ پڑھ لیا۔ لیکن اسی اعتبار سے وہ کرشن لال ہی ہے اور جسمانی لحاظ سے نابالغ۔ ذہنی اعتبار سے اسے کچھ معلوم نہیں کہ اسلام میں کون سی خوبی اور کون سی صداقت ہے، جس نے اسے کلمہ پڑھنے اور اسلام قبول کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ بس اس کے دل کی آواز ہے جو اسے اسلام کی طرف لے آئی ہے اور ناقابل بیان سوچ ہے جس نے اسے اس راہ پر لگا دیا ہے۔ اب ہندو مذہب سے وہ کلیۃً دور ہوگیا ہے بلکہ اس سے نفرت کرنے لگا ہے۔ آٹھویں جماعت میں اس نے اپنے دونوں ساتھیوں سے نماز بھی سیکھ لی ہے اور اس کے طریق ادا کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرلی ہیں اور پھر لوگوں سے چھپ چھپا کر نماز پڑھنے بھی لگا ہے۔

ایک دن عجیب معاملہ ہوا۔ چھٹی کے بعد حسب معمول کرشن لال، اللہ دتہ اور عطا محمد تینوں اپنے گاؤں کی طرف آرہے تھے کہ عطا محمد نے اس کی چوٹی کاٹ دی، یعنی وہ بال جو لٹ یا ''بودی'' کی صورت میں ہندو اپنے سر پر رکھتے ہیں، عطا محمد نے قینچی سے ان کا خاتمہ کردیا۔ چوٹی ان کا مذہبی شعار ہے، جس پر عمل کرنا اور اس کی حفاظت کرنا ان کے نزدیک ضروری ہے۔ یہ خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی کہ گوراں دتا مل کے بیٹے کرشن لال کی چوٹی مسلمانوں نے کاٹ دی ہے۔ اس نے ایک ہنگامے کی صورت اختیار کرلی اور ہندو مسلم تصادم کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ لیکن بعض لوگ درمیان میں پڑے اور تلخی کے آثار ختم ہوگئے۔ اسی اثنا میں مڈل کا امتحان ہوا اور کرشن لال کو اچھے نمبروں میں کامیابی حاصل ہوئی۔

اب وہ ذہنی طور سے مسلمان تھا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوا کہ نماز پڑھنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ یہ بات وہ کسی سے پوچھ نہیں سکتا تھا۔ اس کے راز دان دو ہی لڑکے تھے عطا محمد اور اللہ دتہ۔ وہ بھی شاید اس قسم کے مسائل نہیں جانتے ہوں گے۔ اس سلسلے میں اس نے ''اجتہاد'' سے کام لینا شروع کیا۔ وہ کسی طرح اپنے گھر کی کھوہی کے پانی سے وضو کرتا اور مندر میں چلا جاتا، وہاں آلتی پالتی مار کر مغرب کی طرف رخ کرکے بیٹھ جاتا اور اشارے سے نماز ادا کرلیتا۔ کبھی دکان میں کوئی کتاب سامنے رکھ لیتا اور تھوڑی بہت اوپر نیچے حرکت کرکے اس فریضے سے سبک دوش ہوجاتا۔ کبھی چلتے پھرتے اشاروں میں پڑھ لیتا۔ ایک دن چند ساتھی پیلو کھانے کے لیے گئے۔ وہ نماز ظہر کا وقت

تھا۔ کرشن لال پیلو کے درخت پر چڑھا۔ درخت کی ایک مضبوط لکڑی کے دونوں طرف پاؤں لٹکائے اور نماز ادا کرلی۔ اسے آپ اجتہاد سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں اور القا بھی کہہ سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ایسے مسلمان لڑکے کے دل میں ڈال دیا جو ایک غیر مسلم معاشرے سے تعلق رکھتا ہے۔ نہ وہ اپنے اسلام کا اظہار کرسکتا ہے اور نہ اپنے دل کی بات کسی کو بتا سکتا ہے۔ اللہ نے ادائے نماز کا ایک انداز اسے سجھا دیا اور وہ اس پر بیٹھے، لیٹے، چلتے پھرتے، کسی نہ کسی صورت میں عمل کرتا رہا۔ اس انداز میں اس کے لیے بڑی چاشنی تھی، بڑی لذت تھی، بڑا سرور تھا۔

ایک دن کرشن لال اپنے بھائی ہنسراج کے کہنے پر بھٹیارن سے چنے بھنوا کر لایا اور بھائی کو دیے۔ عصر کا وقت تھا۔ بھائی دانے چبا رہا تھا، لیکن کرشن لال کو اپنی نماز کی فکر ہے کہ اس کا وقت نہ نکل جائے۔ اب بر وقت نماز ادا کرنے کے لیے اسے یہ تدبیر سوجھی کہ دانوں پر سے چھلکا اتارنے لگا اور ساتھ ہی اشارے سے جو ایسی حالت میں سوجھ سکتا تھا، نماز شروع کردی۔ ابھی اشاراتی نماز ختم نہیں ہوئی تھی کہ بھائی نے کہا حقہ تیار کرکے لاؤ۔ کرشن لال کو اس پر بے حد غصہ آیا۔ لیکن کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ بھائی کے حکم کی تعمیل کی۔ پھر گھر جا کر اپنی کتابیں دیکھنا شروع کردیں اور ساتھ ساتھ نماز بھی پڑھتا رہا۔ والدہ وہیں بیٹھی تھیں، لیکن انھیں کیا پتا کہ بیٹا کیا کر رہا ہے۔ نماز پڑھی تو چین آیا۔

کبھی چھپ چھپا کر مسجد میں جا کر نماز پڑھ لیتا۔ ایک دن مسجد میں وضو کر رہا تھا کہ اتفاق سے ہنسراج کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نے اسے دیکھ لیا۔ بعض اور رشتے داروں کو بھی پتا چل گیا۔ اسے پکڑ لیا گیا اور خوب پٹائی کی گئی۔ ان کا کہنا ہے کہ ''اس پٹائی میں جو سرور تھا، زبان اس کے بیان سے قاصر ہے۔''

اب والدہ کو بھی معلوم ہوگیا تھا کہ میرے کرشن لال کے تیور اچھے نہیں، یہ مسلمانوں میں قدم رکھنے لگا ہے۔ بولی بیٹا! میرے پاس سونے کے زیورات ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔ جو تمھارا جی چاہے لے لو، لیکن مسلمان نہ ہوجانا۔ اس اللہ کی بندی کو کیا پتا تھا کہ اسلام قبول کیے بغیر تو خود وہ بھی نہیں رہ سکے گی۔

مڈل پاس کرنے کے بعد کرشن لال کی تعلیم کا سلسلہ گھر والوں نے محض اس لیے بند کردیا کہ اسے کسی ہائی سکول میں داخل کرانا پڑے گا اور ہائی سکول رینالہ خورد میں تھا جو ان کے گاؤں سے دس کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ وہاں گیا تو ہم سے بھی دور ہوجائے گا اور ہندو مذہب سے بھی دور ہوجائے گا۔ پھر ہمارے کام کا نہیں رہے گا۔

کرشن لال کو عبدالرشید تک پہنچنے کے لیے بہت سے خطرناک مراحل طے کرنا اور اذیت ناک

موڑ کا شا پڑے۔ لیکن ان کا تذکرہ کرنے سے پہلے اللہ دتہ اور عطا محمد کے بارے میں چند باتیں سنتے جایے جو کرشن لال کے لیے عبدالرشید بننے کا باعث ہوئے۔ یہ دونوں بریلوی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ مڈل پاس کرنے کے بعد اللہ دتہ نے کوئی کورس پاس کیا اور محکمہ نہر میں اورسیر کے منصب پر فائز ہوا۔ عین جوانی میں وفات پا گیا۔

عطا محمد سکول ٹیچر ہو گیا تھا اور اپنے گاؤں اسلام پور کی سکونت ترک کر کے تاندلیاں والا کے قریب ایک گاؤں موضع کمیانہ چک چلا گیا تھا۔ کسی سے اپنی گاؤں والی زمین کا تبادلہ بھی کر لیا تھا۔ کمیانہ چک کے حاجی عبدالحق کی کوشش سے شیخ الحدیث مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی بھی وہاں تشریف لے گئے تھے۔ حضرت حافظ صاحب کے خطبات و دروس سے اس نواح میں بے شمار لوگوں نے مسلک اہل حدیث اختیار کیا، جن میں عطا محمد بھی شامل ہیں۔ ان کے کہنے پر (سابق کرشن لال) مولانا عبدالرشید مجاہد آبادی بھی ایک مرتبہ وہاں گئے تھے اور خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا تھا۔ خطبہ جمعہ میں انھوں نے اپنے محسن عطا محمد کا ذکر بھی کیا۔ اس سے چند روز بعد عطا محمد کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ باعمل موحد اور مبلغ اسلام بزرگ تھے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ

مڈل پاس کرنے کے بعد کسی نہ کسی طرح اشارے کنائے سے کرشن لال نماز تو پڑھتا رہا، لیکن اس نے سوچا کہ کہیں ملازمت کی صورت پیدا ہو جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ چناں چہ کسی کی وساطت سے وہ اوکاڑہ پہنچا اور وہاں کی میونسپل کمیٹی کے پریذیڈنٹ سے ملا، جن کا نام اسفندر یار خاں تھا۔ وہ دراصل باماں بالا کے رہنے والے تھے جو اچھے خاصے زمیندار تھے اور علاقے میں ان کا کافی اثر تھا۔ انھیں کسی طریقے سے یہ بات پہنچا دی گئی تھی کہ یہ لڑکا ہندو گھرانے سے تعلق رکھتا ہے مگر اس کے دل میں اسلام کی محبت ہے۔ اسے ہر صورت میں کسی چونگی پر بہ طور محرر ملازمت ملنی چاہیے۔ چناں چہ اسی وقت اس کی ملازمت کے آرڈر ہو گئے اور اوکاڑہ ریلوے اسٹیشن کے پل کی چونگی پر اس کی تقرری کر دی گئی۔ اسے چونگی نمبر ۵ کہا جاتا تھا۔ اس چونگی پر کرشن لال نے کام شروع کر دیا۔ اوکاڑہ شہر میں اس کے بعض رشتے دار رہتے تھے، جن کے ہاں کبھی کبھار وہ چلا جاتا تھا۔

اب کرشن لال کا اشہب حیات ایک بالکل نئی منزل میں داخل ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے ایک بہت بڑا خونی مرحلہ پیش آتا ہے جو اسے کرشن لال سے عبدالرشید کا گراں مایہ خلعت پہناتا ہے اور اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ مولانا عبدالرشید کے نام سے متعارف ہوتے ہیں۔ لیکن ابھی چند روز ہمیں کرشن لال ہی کے ساتھ رہنا چاہیے۔

اوکاڑہ کی محصول چونگیوں پر جو محرر ملازمت کرتے تھے ان میں ایک شخص مولوی نور محمد تھے جو خوش اخلاق اور عالی کردار شخص تھے۔ فاتح قادیان حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کے عقیدت مند

تھے۔ قادیانیت کے خلاف اچھا خاصا لٹریچر ان کے گھر میں موجود تھا۔ وہ ضلع اوکاڑہ کے ایک قصبے بنگلہ گوگیرہ کے رہنے والے تھے۔ بارہ ایکڑ زمین کے مالک تھے۔ گاؤں میں اپنے خرچ سے مسجد تعمیر کرائی تھی۔ انھوں نے ایک دو دفعہ کرشن لال کو مسجد میں نماز پڑھتے دیکھ لیا تھا، اس لیے انھیں پتا چل گیا تھا کہ یہ ہندو لڑکا اندر سے مسلمان ہے۔ چناں چہ وہ اس سے بے حد ہم دردی کا اظہار کرنے لگے اور سوچنے لگے کہ اسے ہندوؤں کی گرفت سے چھٹکارا دلانے کی کیا صورت اختیار کی جائے۔ کچھ غور وفکر کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ چند روز کی رخصت لے کر اپنے گاؤں بنگلہ گوگیرہ چلے جانا چاہیے۔ چناں چہ انھوں نے رخصت کی درخواست کیش کے ڈبے میں ڈالی اور درخواست منظور کرائے بغیر گاؤں چلے گئے۔ کرشن لال بھی ان کے ساتھ تھا۔ مولوی صاحب کی عمر اس وقت چالیس برس کے قریب ہوگی۔ داڑھی اور سر کے بال بالکل سیاہ۔ صحت مند اور مستعد۔ دل کے غنی اور ہاتھ کے کھلے۔ اسی گاؤں میں کرشن لال کے تایا کی پوتی رکمن بی بی کی شادی ہوئی تھی۔ تین چار مرتبہ رکمن بی بی کے سسر کے پیغام مولوی نور محمد کو آئے کہ وہ ہمارے لڑکے کرشن لال کو ہمارے پاس بھیج دیں، اگر نہیں بھیجیں گے تو ان کے لیے مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں۔

رخصت کے دن گزارنے کے بعد مولوی نور محمد اور کرشن لال واپس اوکاڑہ آگئے۔ مولوی صاحب نے کرشن لال سے کہا کہ تم اپنی ڈیوٹی پر جاؤ اور میں فی الحال یہاں ایک ضلعدار کے گھر ٹھہروں گا اور مسلمان چونگی محرروں سے تمھارے متعلق معلومات حاصل کرتا رہوں گا۔ چناں چہ مولوی نور محمد کی ہدایت کے مطابق کرشن لال اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہوا تو وہاں اس کا خالہ زاد بھائی چونگی محرر بھی موجود تھا۔ اس نے کرشن لال سے پوچھا تم اتنے دن کہاں رہے۔ تمھاری والدہ تمھارے گاؤں سے یہاں آئی ہیں اور ہمارے گھر میں ٹھہری ہوئی ہیں۔ بہت پریشان ہیں۔ تم گھر جاؤ اور ان سے ملو تاکہ انھیں تسلی ہو کہ تم ٹھیک ٹھاک ہو۔ کرشن لال والدہ سے ملنے خالہ کے گھر گیا تو وہ بیٹے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں نے سنا ہے تم مسلمان ہوگئے ہو۔ بیٹا یہ کام نہ کرنا۔ میرا تیرے بغیر کوئی نہیں ہے۔

کرشن لال نے والدہ سے کہا میرے مسلمان ہونے کی آپ کو جو اطلاع ملی ہے، وہ غلط ہے۔ آپ مطمئن رہیں، میں مسلمان نہیں ہوں، کرشن لال ہی ہوں۔ والدہ کو اس سے تسلی ہوگئی لیکن کرشن لال کے دل پر اسلام قبضہ کرچکا تھا جو کسی صورت میں بھی اپنا قبضہ چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔

کرشن لال کی والدہ کے ساتھ اس کے دونوں بھائی ہنسراج اور برج لال بھی آئے تھے۔ گاؤں میں چوں کہ یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ گوراں دتہ مل کا بیٹا کرشن لال مسلمان ہوگیا ہے، اس لیے ان دونوں بھائیوں کا والدہ کے ساتھ آنا اور اصل صورتِ حال کی تحقیق کرنا ضروری ہوگیا تھا۔

پہلے بتایا جاچکا ہے کہ اوکاڑہ کی میونسپل کمپنی کے پریذیڈنٹ اسفندر یار خاں تھے۔ لیکن اب وہ پریذیڈنٹ نہیں رہے تھے، اب نیا پریذیڈنٹ آ گیا تھا جو سکھ تھا اور اس کا نام سوبھا سنگھ تھا۔ کرشن لال کا خالہ زاد بھائی اور بعض دیگر رشتے دار اسے سوبھا سنگھ کے پاس لے گئے۔ اسے دیکھتے ہیں سوبھا سنگھ نے اس کو ڈانٹنا شروع کر دیا اور کہا تم مولوی کے ساتھ گاے کے ہڈ کھا کر آئے ہو۔ میں تمھیں تھانے لے جاؤں گا۔ تمھیں وہاں یہ بیان دینا ہوگا کہ مولوی نور محمد مجھے اغوا کر کے لے گیا تھا اور اتنے دن اس نے مجھے اپنے قبضے میں رکھا۔ اس کے خلاف اغوا کا مقدمہ دائر کیا جائے گا۔ تھانے میں جو کچھ ہم کہیں گے، تم نے اس کی تصدیق کرنا ہوگی اور ہماری بات کو صحیح کہنا ہوگا۔ یہ باتیں سوبھا سنگھ نے کرشن لال سے نہایت سخت لہجے میں کہیں اور کرشن لال نے نہایت ٹھنڈے دل سے سنیں۔

اس وقت دو مسلمان چونگی محرر (محمد منشا اور محمد شفیع) بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے یہ واقعہ مولوی نور محمد کو بتایا جو اس وقت ضلعدار کے مکان میں قیام پذیر تھے۔ انھوں نے مولوی صاحب ممدوح کو یہ بھی بتایا کہ اس لڑکے کے چہرے پر سوبھا سنگھ کی ان باتوں کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ بہر حال سوبھا سنگھ اور بعض لوگ کرشن لال کو تھانے لے گئے، لیکن بغیر کوئی مقدمہ درج کرائے واپس آ گئے۔

بعد ازاں کرشن لال کو اس کے رشتے داروں کے گھر لایا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ اسے واپس اپنے گاؤں اسلام پور لے جانا چاہیے۔ یہاں اس کا رہنا مناسب نہیں۔ اس فیصلے کے بعد کرشن لال نے اپنی والدہ اور رشتے داروں سے کہا کہ مجھے اجازت دیجیے میں تھوڑی دیر اس شہر میں گھوم لوں۔ پھر واپس آ جاؤں گا۔ انھوں نے اجازت دے دی لیکن اس کے ساتھ اس کے بھائی برج لال کو بھیج دیا کہ یہ کہیں بھاگ نہ جائے۔ باہر آ کر اس نے برج لال کو جلیبیاں کھلائیں اور کہا کہ گنگارام کی دکان پر میں نے کپڑے رکھے ہیں، وہ لے کر تھوڑی دیر کو آ جاؤں گا، تم گھر جانا چاہو تو چلے جاؤ۔ چناں چہ وہ واپس گھر چلا گیا اور کرشن لال وہاں سے سیدھا مولوی نور محمد کے پاس ضلعدار کے مکان پر پہنچ گیا۔ مولوی صاحب نے اسے دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا اور سجدے میں گر گئے۔ فرمایا اللہ نے تمھیں کامیاب فرما دیا ہے۔ اس سے قبل وہ محمد منشا اور محمد شفیع سے وہ باتیں سن چکے تھے جو اس سے سوبھا سنگھ نے کی تھیں اور اس پر ان باتوں کا کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔

اب طے پایا کہ بچے کو اللہ کے سپرد کر کے اپنے اسلام کا کھل کر اظہار کر دینا چاہیے، جو ہونا ہے ہو جائے۔ اس وقت ان کا گاؤں اسلام پور ضلع منٹگمری (حال ساہی وال) میں تھا۔ مولوی نور محمد، کرشن لال کو منٹگمری لے گئے اور ایک وکیل سے مل کر حقیقت حال بیان کی۔ وکیل نے پوری بات سن کر اے ڈی ایم رانا عبدالحمید خاں کی عدالت میں کرشن لال کی طرف سے ایک درخواست پیش

کی کہ میں ہندو مذہب سے تعلق رکھتا تھا، اب بغیر کسی قسم کے جبر واکراہ کے اپنی مرضی سے مسلمان ہونا چاہتا ہوں، میری عمر سولہ سال کی ہے اور میں اپنے نفع ونقصان کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ یہاں یہ عرض کردیں کہ اس کی عمر اس وقت پندرہ سال تھی، لیکن وہ انگریزی حکومت کا زمانہ تھا اور انگریزی حکومت میں پندرہ سال کے لڑکے کو نابالغ اور سولہ سال کے کو بالغ قرار دیا جاتا تھا اور ادھر اس کی یہ حالت تھی کہ وہ اپنے قبولِ اسلام کے اعلان کے لیے اس قدر بے تاب اور بے چین تھا کہ مزید ایک سال انتظار کرنا اس کے لیے ناممکن ہوگیا تھا۔ یہ درخواست کرشن لال نے ۱۹۔ جون ۱۹۴۵ء کو دی تھی۔ یعنی قیامِ پاکستان سے ایک سال دس مہینے قبل۔ اس کی نقل اس کو چار دن بعد ۲۳۔ جون ۱۹۴۵ء کو ملی۔ عدالت نے اس کی قبولِ اسلام کی درخواست منظور کرتے ہوئے سوال کیا کہ

تم مسلمان کیوں ہونا چاہتے ہو اور ہندو مذہب ترک کرنے کی کیا وجہ ہے؟

اس نے جواب دیا: ہندو یہاں بھی مر کر آگ میں جلتے ہیں اور آخرت کو بھی انھوں نے آگ ہی میں جلنا ہے۔ ایسے مذہب میں رہنے سے کیا فائدہ......؟

قبولِ اسلام کے بعد یہ عبدالرشید ہوگئے ہیں۔ یہاں تک ہمارا تحریری سفر کرشن لال کی رفاقت میں طے ہوا ہے۔ اس منزل پر پہنچنے کے بعد کرشن لال سے ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔ اب آئندہ سفر کے تمام مراحل عبدالرشید کے ہم قدم ہوکر طے کیے جائیں گے۔

قبولِ اسلام کی نقل لینے کے بعد عبدالرشید کو اپنے ساتھ لے کر مولوی نور محمد اپنے گاؤں بنگلہ گوگیرہ آگئے۔ وہاں اوکاڑہ میونسپل کمیٹی کے پریذیڈنٹ سوبھا سنگھ کی طرف سے انھیں دھمکیاں آنی شروع ہوگئیں۔ اب فیصلہ کیا گیا کہ عبدالرشید کو میاں محمد باقر (مرحوم) کے پاس جھوک دادو بھیج دیا جائے۔ وہاں کے دینی مدرسے میں یہ تعلیم بھی حاصل کریں گے اور میاں صاحب کی نگرانی میں ان کی بہتر تربیت بھی ہوگی۔ چناں چہ مولوی نور محمد انھیں جھوک دادو لے گئے اور میاں صاحب سے ملاقات ہوئی، لیکن عبدالرشید کا وہاں جی نہیں لگا۔ اس کے بعد وہ انھیں کنجوانی لے گئے۔ وہ مولوی نور محمد کے سسرال کا گاؤں تھا، وہاں بھی عبدالرشید کا رہنا اللہ کو منظور نہ تھا۔ گھوم پھر کر وہ پھر بنگلہ گوگیرہ آگئے۔ ایک دن مولوی نور محمد اپنے کسی کام کے لیے بازار گے اور شام کے قریب واپس آئے۔ ان کے چہرے پر پریشانی کے اثرات نمایاں تھے۔ عبدالرشید کے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ اس کی رشتے دار بہن رکمن بی بی کے سسر نے انھیں بہت ڈرایا دھمکایا ہے اور کہا ہے کہ ہمارا لڑکا ہمیں دے دو ورنہ اس کا آپ کو ایسا خمیازہ بھگتنا پڑے گا کہ اس دنیا میں رہنا نصیب نہ ہوگا۔ ان کی پریشانی سے قدرتی طور پر عبدالرشید کو بھی بہت پریشانی ہوئی۔

اس کے بعد مولوی نور محمد صاحب بازار سے سبزی لائے۔ مسجد میں جاکر مغرب کی اذان دی

اور نماز پڑھائی۔ کھانا کھانے کے بعد عشا کی نماز کا وقت ہوگیا۔ مولوی صاحب نے حسب معمول عشا کی اذان دی اور جماعت کرائی۔ پھر عبدالرشید کے پاس آئے جو باہر چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ انھیں نصیحتیں کرنے لگے اور کہا کہ یہاں مرزائی کافی تعداد میں ہیں، ان کے ہتھے نہ چڑھ جانا۔ یہ بہت چالباز لوگ ہیں۔ تقریباً ایک گھنٹا وہ عبدالرشید کے پاس رہے اور بہت سی نصیحتیں کیں اور دینی مسائل بتائے۔ اس کے بعد وہ اپنے گھر چلے گئے اور عبدالرشید اور ان کا مزارع ان کی حویلی میں اپنی اپنی چارپائیوں پر سوگئے۔

صبح سویرے اندر سے چیخ پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ لوگ گھبرا کر اٹھے تو مولوی صاحب کی بیوی نے روتے ہوئے بتایا کہ مولوی صاحب کو شہید کردیا گیا ہے۔ اندر گئے تو دیکھا کہ ان کی شاہ رگ کسی تیز دھار آلے سے کاٹ دی گئی ہے، داڑھی کا بھی کافی حصہ کٹ گیا ہے۔ سینے پر مضبوط رسی باندھی ہوئی ہے۔ وہ صبح کی نماز کا وقت تھا۔ عبدالرشید نے لوگوں کو ان کی شہادت کے متعلق بتایا تو مرزائیوں نے ان سے کہا آپ فکر نہ کریں۔ آپ کو ہم نہایت حفاظت سے قادیان لے جائیں گے۔ وہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ رات والی مولوی صاحب کی بات ان کے ذہن میں تھی۔ انھوں نے مرزائیوں سے کہا آپ مجھ سے اس قسم کی کوئی توقع نہ رکھیں۔ میں آپ لوگوں کی چال میں نہیں آؤں گا۔

قتل کی اطلاع دینے اور رپورٹ درج کرانے کے لیے تھانے گئے تو ایس ایچ او ہندو تھا اور اے ایس آئی سکھ۔ وہ پولیس کی نفری کے ساتھ جائے وقوعہ پر آئے اور جو جی چاہا لکھا، یعنی ایف آئی آر ہی کم زور تھی جسے مقدمے کی جان کہا جاتا ہے۔ پھر لاش پوسٹ مارٹم کے لیے ساہی وال لے گئے۔ پوسٹ مارٹم کے بعد لاش بنگلہ گوگیرہ لائی گئی اور جنازے کے بعد شام کو انھیں دفن کردیا گیا۔

اب انکوائری شروع ہوئی۔ پولیس کپتان عیسائی تھا جو جائے وقوعہ پر آیا۔ تھانہ بنگلہ گوگیرہ کی تمام پولیس وہاں موجود تھی۔ پولیس کپتان عبدالرشید کو الگ لے گیا اور ان سے چند سوالات کیے، جن کے انھوں نے اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیے۔ وہ دراصل انھیں عیسائی بنانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ اس کے جھانسے میں نہیں آئے۔ یہ تو سب کو معلوم تھا کہ مولوی نور محمد کی شہادت کا اصل باعث عبدالرشید کا قبولِ اسلام ہے۔ اس لیے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی کثیر تعداد میں وہاں موجود تھے اور سب کو اس مقدمے میں اپنے اپنے انداز میں دلچسپی تھی۔ وہاں عبدالرشید کے رشتے دار اور گاؤں کے لوگ بھی موجود تھے۔ پولیس کپتان نے ان لوگوں کے سامنے کھڑے ہوکر عبدالرشید سے پوچھا: لڑکے تم بتاؤ کیا چاہتے ہو؟

عبدالرشید نے اس مجمعے میں کھڑے ہو کر بڑی جرأت کے ساتھ کہا کہ یہ ہندو، بنیے، کراڑ جو میرے سامنے بیٹھے ہیں، اسلام قبول کرنے کی وجہ سے مجھے مارتے پیٹتے ہیں اور کئی قسم کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ میرا اب ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں مسلمان ہوں اور میرا تعلق مسلمانوں ہی سے ہے۔

عبدالرشید کا یہ اعلان سن کر مسلمان بہت خوش ہوئے اور بہ آواز بلند کہا کہ ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے مولوی نور محمد شہید کی جگہ پُر کردی اور اس کے بدلے میں ہمیں عبدالرشید مل گیا جو اسلام کا جرأت مند مبلغ ہوگا۔ اس وقت جھوک دادو کا ایک شخص محمد حسین بھی موجود تھا۔ اس نے خوش ہوکر عبدالرشید کو پانچ روپے کا نوٹ بہ طور انعام دیا۔ اوکاڑہ کے علاقے کے میاں عبدالحق ایم ایل اے بھی اس اجتماع میں شریک تھے (جو ایک گاؤں برج جیوے خاں کے رہنے والے تھے) وہ عبدالرشید کو اپنے ساتھ ساہی وال لے گئے اور اپنی کوٹھی میں ان کے قیام کا انتظام کیا۔ اس سے چند روز بعد رمضان کا مہینا آ گیا۔ عبدالرشید کی اسلامی زندگی کا یہ پہلا رمضان تھا۔ انھوں نے میاں عبدالحق ایم ایل اے کے کوٹھی میں روزے رکھنے کا آغاز کیا۔ وہاں سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر اس شہر کے مشہور اہل حدیث عالم مولانا عبدالجلیل کی مسجد تھی۔ عبدالرشید نہایت ذوق وشوق سے ہر روز اس مسجد میں نماز تراویح پڑھنے جاتے تھے۔

مولوی نور محمد کے قتل کا مقدمہ تقریباً دو سال چلتا رہا لیکن کچھ نہ بنا۔ کہا جاتا ہے کہ اس قتل میں ایک مسلمان بھی شامل تھا جسے بعد میں کسی وجہ سے کسی نے قتل کردیا تھا۔ سنا ہے کہ جب وہ قتل ہو رہا تھا تو اس نے کہا تھا کہ میں نے ناحق مولانا نور محمد کو قتل کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے مجھ سے دنیا ہی میں اس کا انتقام لے لیا۔

رمضان کا مہینا گزرا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ عبدالرشید کو دینی تعلیم کہاں دلائی جائے؟ میاں عبدالحق کا خیال تھا کہ اس لڑکے کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے پاس پٹھان کوٹ بھیج دیا جائے۔ لیکن ان کے والد مکرم میاں نور محمد نے اس سے اختلاف کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ اسے میاں محمد باقر کے پاس جھوک دادو بھیجا جائے۔ میاں صاحب متقی بزرگ ہیں اور وہاں ان کا دینی مدرسہ بھی ہے۔ یہ لڑکا وہاں تعلیم بھی حاصل کرے گا اور میاں صاحب کی صحبت سے اس کے دل میں تقوے کے آثار بھی پرورش پائیں گے۔ چناں چہ میاں نور محمد کی رائے پر عمل کیا گیا اور میاں عبدالحق نے اپنے ایک ملازم کے ساتھ عبدالرشید کو جھوک دادو بھیج دیا جو منڈی تاندلیاں والا کے قریب (ضلع فیصل آباد) میں ایک گاؤں ہے۔ دو چار گھرانوں کے علاوہ اس گاؤں کے سب لوگ طور برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس نواح میں طور برادری کے چار گاؤں ہیں۔ ایک یہی جھوک دادو، دوسرا موضع کٹو، تیسرا لکڑ والا اور چوتھا گاؤں ہے عیو والا۔ ان چاروں مواضع میں اہل حدیث مسلک کے لوگ آباد ہیں اور یہ

سب میاں محمد باقر سے متاثر ہیں۔ میاں محمد باقر نے حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی سے تعلیم حاصل کی تھی اور حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی کے دست حق پرست پر شرف بیعت حاصل کیا تھا۔ رحمهم الله تعالى

اُس زمانے میں منڈی تاندلیاں والا میں میاں عبدالحق ایم ایل اے کی آڑھت کی دکان تھی۔ میاں صاحب نے اپنی دکان سے عبدالرشید کا دس روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کردیا جو ہر مہینے باقاعدگی سے انھیں مل جاتا تھا۔ دس روپے کو اس زمانے میں خاصی رقم کی حیثیت حاصل تھی، جب کہ ایک من گندم ڈیڑھ روپے میں ملتی تھی اور چینی ایک روپے کی پانچ سیر تھی۔

اب عبدالرشید کی پڑھائی کا آغاز ہوتا ہے۔ قاعدہ یسرنا القرآن ان کے ہاتھ میں پکڑا دیا جاتا ہے اور وہ اسے پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ میاں محمد باقر اس لڑکے کے استاد بھی ہیں، مرشد بھی ہیں اور مربی بھی ہیں۔ وہاں انھوں نے بڑا فیض پایا۔ میاں صاحب کو دیکھ کر، ان کی باتیں سن کر اور ان کی مجلس میں بیٹھ کر دل کی دنیا بالکل بدل گئی۔ رات کو جاگنے اور تہجد پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ قلب میں اللہ کی یاد کا جذبہ ابھرا، طبیعت مختلف اوقات کے وظائف کی طرف راغب ہوئی۔ اللہ سے رشتۂ تعلق مضبوط ہوا، نماز میں حضور وسرور کی کیفیت پیدا ہوئی۔ نماز مغرب کے بعد چھ نفل پڑھنے کی عادت پڑی۔ پھر معاملہ یہاں تک پہنچا کہ دل اللہ کی یاد سے تڑپنے لگا اور آنکھوں سے آنسو ابلنے لگے۔ ایک دفعہ اسی قسم کی کیفیت طاری تھی، ہچکی بندھی ہوئی تھی اور اس کی آواز حلق سے باہر آرہی تھی کہ ایک شخص قائم دین نے اس حالت میں انھیں دیکھ لیا اور اپنی علاقائی پنجابی زبان میں کہا: ”ایہ چھوہر جیہڑا ساڈے درس وچ آیا ہے، ایہ تاں مڑ اپنیاں پچھلیاں نوں روندا رہندا اے۔“ (یعنی یہ لڑکا جو ہمارے مدرسے میں داخل ہوا ہے یہ تو اپنے عزیز واقارب کی یاد میں روتا رہتا ہے، یہاں یہ کس طرح رہ سکے گا۔)

یہ بات عبدالرشید نے سنی اور میاں صاحب کو بتائی تو انھوں نے فرمایا کہ اب قائم دین اس قسم کی کوئی بات کرے تو اسے کہنا کہ مجھے تو پیدا ہی اللہ سے ڈرنے اور اس کی یاد میں رونے کے لیے کیا گیا ہے۔ انسان جتنا اس سے ڈرے گا اور جس قدر اس کی یاد میں آنسو بہائے گا، اللہ تعالیٰ اتنا ہی اس سے خوش ہوگا اور دنیا وآخرت میں اسے کامیابی عطا فرمائے گا۔ نیکی میں اضافے اور گناہوں کے ختم ہونے کا اصل ذریعہ یہی ہے کہ انسان پر ہر وقت اللہ کا خوف طارے رہے اور وہ اپنا سر اس کے سامنے جھکائے رکھے۔ اس کی آنکھوں سے بھی اس کے آثار ظاہر ہوں اور اس کا دل بھی اس سے لرزتا رہے۔ چناں چہ آئندہ سطور سے ہمیں پتا چلے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اُس عمر میں اپنی یاد میں گریہ وآزاری کی وجہ سے عبدالرشید کو کس قدر اعزاز وتکریم سے نوازا اور انھیں کتنی ان گنت اور عظیم

نعمتیں مرحمت فرمائیں۔

عبدالرشید مڈل پاس تھے، اردو اچھی طرح پڑھتے تھے اور عربی زبان سے انھیں دلی محبت تھی، اس لیے قاعدہ یسرنا القرآن چند روز میں ختم کرلیا اور پھر قرآنِ مجید پڑھنے لگے۔ قرآنِ مجید ختم کیا تو انھیں درسی کتاب ''ابواب الصرف'' دے دی گئی کہ اس کے باب یاد کرو۔ لاہور سے شور کوٹ جانے والی ریلوے لائن جھوک دادو کے قریب سے گزرتی ہے۔ عبدالرشید ریلوے لائن پر آجاتے اور چلتے پھرتے باب یاد کرتے۔ پہلا باب ضرب یضرب ہے جو عبدالرشید نے پانچ دن میں یاد کیا۔ یہ بابِ اوّل ہے اور کچھ مشکل بھی ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مشکلات حل فرمادیں۔ ابھی تمام باب یاد نہیں ہوئے تھے کہ میاں محمد باقر نے مشکوٰۃ شریف پڑھانا شروع کردی۔ اس کے ساتھ دوسری درسی کتابیں بھی پڑھانے لگے۔

اس طرح پہلا سال گزر گیا اور اللہ نے ان کے لیے حصولِ علم کا راستہ صاف کردیا، جس پر وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کے مطابق تیزی سے چلنے لگے۔

دوسرا سال شروع تھا کہ عبدالرشید کا حقیقی بڑا بھائی برج لال ان کے پاس جھوک دادو پہنچ گیا۔ پوچھا بھائی صاحب یہاں کیسے آئے؟ کہا مسلمان ہونے کے لیے۔ یہ عبدالرشید کے لیے بہت بڑی خوشی کی بات تھی۔ اس وقت ضلع اوکاڑہ کے ایک گاؤں موضع مردانی میں سالانہ تبلیغی جلسہ ہورہا تھا۔ یہ دونوں بھائی اس جلسے میں علمائے کرام کی تقریریں سننے کے لیے چلے گئے۔ حافظ اسماعیل روپڑی (مرحوم) سٹیج پر بیٹھے تھے۔ ان کو بتایا گیا تو انھوں نے برج لال کو سٹیج پر بلا کر کلمۂ شہادت پڑھایا اور دائرہ اسلام میں داخل کیا۔ اس کا نام عبدالمجید رکھا گیا۔ عبدالرشید کو بڑے بھائی کے قبولِ اسلام سے بہت حوصلہ ہوا اور اس کی طاقت بڑھ گئی۔ کہنا چاہیے کہ اسلام نے اس گھر کا رخ کرلیا تھا۔

عبدالرشید اب درسِ نظامی کے نصاب کی رو سے دوسری جماعت میں داخل ہوچکے تھے اور پڑھنے میں تیز تھے۔ اس وقت اس مدرسے میں مولانا محمد صدیق کرپالوی (جنھیں بعد میں مولانا محمد صدیق لائل پوری کہا جانے لگا) مولانا محمد رفیق، مولانا حمزہ، مولانا عتیق اللہ، مولانا محمد داؤد بھوجیانی اور مولانا حافظ محمد بھٹوی پڑھاتے تھے۔ عبدالرشید کے اسباق مولانا محمد داؤد بھوجیانی اور مولانا حافظ محمد بھٹوی کے ذمے تھے۔

عبدالرشید کو جھوک دادو میں پڑھتے ہوئے دو سال ہوگئے تھے۔ اس اثنا میں والدہ کو ملنے کے لیے وہ کئی دفعہ اپنے گاؤں اسلام پور گئے۔ ہندو انھیں دیکھتے تھے لیکن کسی نے کبھی کچھ نہیں کہا۔ نہ کسی سے کوئی خاص بات ہوئی۔ البتہ ہندو عورتیں کہا کرتی تھیں کہ تم نے ماں کو چھوڑ دیا ہے اور اپنا مذہب ترک کرکے مسلمان ہوگئے ہو، یہ تمھیں بہت یاد کرتی ہے، تم اس کے پاس آجاؤ۔

اب وقت کے قدم بڑھتے بڑھتے ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء تک پہنچ گئے اور برصغیر آزاد ہوگیا۔ حالات بالکل بدل گئے۔ عبدالرشید کے گاؤں اسلام پور میں (جیسا کہ پہلے بتایا گیا) ہندوؤں کے بیس گھر تھے۔ یہ سب لوگ مسلمان ہوگئے اور مسجد میں جاکر نماز پڑھنا شروع کردی۔ گاے ذبح کرکے اس کا گوشت بھی کھانے لگے۔ کچھ دن یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد ہندوؤں کی ڈوگرہ فوج ٹرک لے کر آئی تو یہ سب لوگ جو ظاہری طور پر مسلمان ہوگئے تھے، ہندوستان جانے کے لیے فوج کے ٹرکوں میں سوار ہوگئے۔ البتہ عبدالرشید کی والدہ اور چھوٹا بھائی حاکم چند ہندوستان نہیں گئے۔ عبدالرشید کی والدہ کو ان کے تایا جیدیال مل نے یہ راے دی کہ تمھارے دو بیٹے مسلمان ہوگئے ہیں۔ تم ماں بیٹا بھی مسلمان ہوجاؤ اور یہیں رہو۔ ہمارے ساتھ ہندوستان نہ جاؤ، معلوم نہیں یہاں سے جاکر کتنی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑے۔ اسی اثنا میں ان کی پھوپھی نے بھی اسلام قبول کرلیا، جن کا نام جنت بی بی رکھا گیا۔ چناں چہ اسلام قبول کرنے والے افراد اپنے گاؤں میں رہے اور مسلمان ہوگئے۔ باقی خاندان کے تمام لوگ یہاں سے نکل گئے۔ جھوک دادو میں عبدالرشید اور ان کے بھائی کو والدہ اور بھائی کے قبولِ اسلام کا پتا چلا تو بے حد خوش ہوئے اور فوراً گاؤں پہنچے۔ والدہ اور بھائی سے ملے۔ والدہ کا پہلا نام ریشم دیوی تھا، اب ان کا نام فاطمہ بی بی رکھا گیا۔ سب سے چھوٹے بھائی کا نام حاکم چند تھا، اب اس کا اسلامی نام عبدالحمید رکھا گیا۔

پہلے ان تینوں حقیقی بھائیوں کے ہندووانہ ناموں کی ترتیب یہ تھی: برج لال، کرشن لال اور حاکم چند۔

اب اسلامی ناموں کی ترتیب یہ ہوئی: عبدالمجید، عبدالرشید اور عبدالحمید۔

قیامِ پاکستان کے بعد نوجوان عبدالرشید اپنے آبائی پیشہ (دکان داری) کی طرف آتے ہیں۔

اس وقت اوکاڑہ میں ہندوؤں کی متروکہ الاٹ منٹ کی ذمہ داری حکومت کی طرف سے میاں عبدالحق ایم ایل اے کے سپرد کی گئی تھی۔ اس سلسلے میں عبدالرشید نے میاں عبدالحق سے بات کی تو انھوں نے ان کو ایک دکان الاٹ کردی اور الاٹ منٹ چٹ بھی دے دی۔ انھوں نے اس دکان میں اپنی حیثیت کے مطابق سودا سلف ڈالا اور اس کی فروخت شروع کردی۔ یعنی دکان دار ہوگئے۔ لیکن الاٹ منٹ چٹ ان سے کہیں گم ہوگئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصے کے بعد متعلقہ سرکاری محکمے نے ان کو دکان سے بے دخل کرکے اس پر قبضہ کرلیا۔

اس کے بعد پھر حالات بدلتے ہیں اور الاٹ منٹ چٹ کی گم شدگی عبدالرشید کے لیے بہت بڑی نعمت ثابت ہوتی ہے۔ انھوں نے ڈھلیانہ کے اسلامی مدرسے میں حصولِ علم کا سلسلہ شروع کردیا۔ یہ وہی ڈھلیانہ گاؤں اور ڈھلیانہ مدرسہ ہے، جس میں ہم نے پہلی مرتبہ ۱۹۴۹ء میں

عبدالرشید کو دیکھا تھا، جب وہ پندرہ سولہ سال کی عمر کے تھے۔ اگر الاٹ منٹ چٹ گم نہ ہوتی تو یہ پکے کاروباری ہوتے اور دکان داری کرتے۔ لیکن اللہ کو ان کا آبائی پیشے کی طرف آنا منظور نہ تھا، اس کی مشیت یہ تھی کہ مستقبل میں یہ اس کے دین کی خدمت کریں۔ چناں چہ اس نے ان کو اس راہ پر لگا دیا۔

ڈھلیانہ کے دینی مدرسے میں اس وقت حضرت مولانا حافظ محمد اسحاق (ساکن حسین خاں والا) مولانا حافظ عبداللہ (آف جھنڈا بگا) مولانا حافظ محمد بھٹوی اور مولانا حبیب الرحمٰن لکھوی (بن حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی) فرائض تدریس سرانجام دیتے تھے۔ رحمہم اللہ تعالٰی

اسی دوران عبدالرشید بیمار ہوگئے اور ٹائی فائڈ بخار کی گرفت میں آگئے۔ بیماری کی وجہ سے انھیں گاؤں لایا گیا۔ انیس روز ان پر اس بخار کا زور رہا اور یہ بالکل بے ہوش رہے۔ ان کے معالج ڈاکٹر نصر اللہ تھے جو ان کے گاؤں کے رہنے والے تھے۔ آخر کار انھوں نے ان کی والدہ سے کہا کہ اس کا علاج میرے بس سے باہر ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس لڑکے کا آخری وقت آ گیا ہے۔ چناں والدہ نے ڈاکٹر کے اظہار مایوسی کے بعد دل کڑا کر کے بیٹے کے لیے کفن کا کپڑا خرید لیا اور اس کے سرہانے رکھ دیا۔ پھر چاول پکائے اور غریبوں اور مسکینوں کو تقسیم کیے اور ان سے بیٹے کی صحت کے لیے دعا کی درخواست کی۔ چاولوں کی تقسیم کا سلسلہ جاری تھا کہ ڈاکٹر آیا اور اس نے کہا کہ میرے پاس آخری چارۂ کار کے لیے ایک دوا ہے، وہ کھلا کر دیکھتے ہیں، ممکن ہے اللہ شفا بخش دے۔ چناں چہ ڈاکٹر نے ایک گولی عبدالرشید کے منہ میں ڈالی۔ گولی منہ میں جاتے ہی عبدالرشید کو قے آئی اور ان کے اندر سے خون کا ایک لوتھڑا نکلا، اس کے ساتھ ہی ان کی آنکھ کھل گئی اور زندگی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ یہ باتیں صحت یابی کے بعد عبدالرشید کی والدہ نے بیٹے کو بتائیں۔ اپنے سرہانے پڑا ہوا کفن کا کپڑا بھی انھوں نے دیکھا۔ اس وقت ان کی عمر بیس برس کی تھی۔ اب ماشاء اللہ وہ اپنی زندگی کی ۷۷ویں منزل سے آگے نکل چکے ہیں۔ یہ اللہ کا ان پر خاص کرم ہے کہ ان کی ہر منزل پُر بہار رہی اور ہر منزل کا ہر قدم جادۂ مستقیم پر رہا۔

ان کا سالِ ولادت ۱۹۳۰ء ہے اور اس فقیر کا ۱۹۲۵ء ہے۔ اس حساب سے میں ان سے عمر میں پانچ سال بڑا ہوں اور عمل میں بہت سال پیچھے ہوں۔ نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے **اعمار امتی ما بین الستین الی السبعین وقل ما یجوز** (کہ میری امت کے لوگوں کی عمریں ساٹھ سے ستر برس کے درمیان ہوں گی، ستر سے زیادہ عمر پانے والے کم تعداد میں ہوں گے۔)

اب تک تو کسی نہ کسی طرح گزر گئی۔ برائی کے ساتھ تھوڑی بہت اچھائی بھی چلتی رہی۔ ہر شخص کو برائی کا بھی پتا چل جاتا ہے اور نیکی کا بھی کسی نہ کسی طرح احساس ہوجاتا ہے۔

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ○ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ

آئندہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ تمام معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ انسان کچھ سوچتا ہے، اللہ کو کچھ اور منظور ہوتا ہے۔ **فعال لما یرید**

بہر حال اللہ تعالیٰ نے عبدالرشید کو صحت عطا فرمائی اور موضع ڈھلیانہ کے مدرسے میں دوبارہ حصولِ علم کا سلسلہ شروع کر دیا اور پھر اسی مدرسے سے انھیں سند فراغت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد لاہور آ کر دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں داخلہ لیا۔ اس کا نصاب مکمل کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے فاضل عربی کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ اب وہ ہماری عام اصطلاح میں مولانا عبدالرشید تھے اور باعمل عالم۔ ساتھ ہی میرے خیال کے مطابق نہایت مخلص اور بلند اخلاق۔ مجھے یاد پڑتا ہے، انھیں مولانا عبدالرشید اسلام پوری کہا جاتا تھا۔ اس نسبت کی وجہ یہ تھی کہ ان کا آبائی گاؤں اسلام پور تھا اور یہ بہت اچھی نسبت تھی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان کی شادی کا مسئلہ پیش آیا۔ ان کے خاندان کے تمام لوگ ہندو تھے اور قیام پاکستان کے بعد ہندوستان چلے گئے تھے۔ ان سے مذہبی، معاشرتی اور وطنی سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ اب مولانا محمد اسحاق گوہڑوی رحمانی مرحوم اور حافظ عبدالرشید گوہڑوی نے کوشش کر کے اپنے گاؤں (گوہڑ نزد چتوکی، ضلع قصور) میں ان کے لیے رشتے کا انتظام کر دیا۔ وہاں کی ارائیں برادری کے ایک بزرگ حاجی عبداللہ صاحب تھے جو پرہیز گاری اور صالحیت میں بڑی شہرت رکھتے تھے، ان سے مولانا محمد اسحاق رحمانی اور حافظ عبدالرشید گوہڑوی نے بات کی اور مولانا عبدالرشید ممدوح کی علمی اور عملی صلاحیتوں سے آگاہ کیا۔ وہ اپنے چند عزیزوں کے ساتھ ان کے گاؤں اسلام پور گئے۔ مولانا عبدالرشید کو دیکھا اور ان کی والدہ سے بات ہوئی اور نیک کردار حاجی عبداللہ نے ان کو اپنی بیٹی کا رشتہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ بہت سے رشتے داروں نے حاجی صاحب مرحوم کو رشتہ دینے سے روکنے کی کوشش کی اور کہا کہ آپ ارائیں ہیں اور یہ لڑکا ہندو سے مسلمان ہوا ہے، یعنی نو مسلم ہے، آپ اسے رشتہ نہ دیں، لیکن حاجی صاحب اپنی بات پر پکے رہے اور شادی ہو گئی۔ بیوی سلیقہ شعار، احکامِ اسلام کی پابند، فرماں بردار اور معاملہ فہم تھی۔ اللہ تعالیٰ نے نیک اولاد عطا فرمائی۔ شادی کے ۵۲ برس بعد اس نیک بخت خاتون نے ۱۶۔ مارچ ۲۰۰۵ء کو وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

تحصیلِ علم اور شادی کے بعد قدرتی طور پر مولانا عبدالرشید کو ذریعہ معاش کی فکر لاحق ہوئی۔ چناں چہ یہ پھر اپنے پرانے محسن میاں عبدالحق ایم ایل اے کے پاس گئے جو اس زمانے میں منٹگمری (ساہی وال) میں سکونت پذیر تھے، ان سے کسی آبرومندانہ ملازمت کے لیے کہا۔ انھوں نے ساہی

وال کے ایک ہائی سکول میں بہ طور عربی ٹیچر ان کی تقرری کرادی۔ اس وقت ان کا قیام اپنے سسرال کے گھر موضع گوہڑ میں تھا۔ ساہی وال سے گوہڑ آئے اور اپنے سسرال والوں کو ملازمت کی خوش خبری سنائی۔ ظاہر ہے انھیں اس سے بہت مسرت ہوئی ہوگی۔ دوسرے دن انھوں نے وقت مقررہ پر سکول میں حاضر ہونا اور تدریس کا آغاز کرنا تھا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق صبح کے وقت گھر سے نکلے اور سائیکل پر سوار ہو کر ''واں رادھا رام'' پہنچے۔ وہاں کسی جگہ سائیکل رکھ کر بس کے ذریعے ساہی وال جانا چاہتے تھے۔ لیکن وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ اللہ کی مشیت کے بغیر انسان کچھ نہیں کرسکتا۔ اس کے تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اللہ کا فیصلہ تمام منصوبوں پر غالب آجاتا ہے۔ ان اللہ علی کل شیء قدیر

واں رادھا رام پہنچ کر سڑک پر کھڑے ہوئے تو دیکھا کہ حضرت میاں محمد باقر صاحب بیٹھے ہیں۔ میاں صاحب نے ان کو نہیں دیکھا۔ ان کی نظریں نیچی تھیں۔ ان کو دیکھ کر دل میں خیال آیا کہ یہ مجھے سکول کی ملازمت سے روکنے کے لیے آئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ مجھے دیکھ لیں، اس لیے جلدی سے ادھر ادھر ہو جانا چاہیے۔ لیکن فوراً ذہن نے فیصلہ کیا کہ یہ تو بہت بری بات ہے۔ میں دو سال ان کے پاس رہا ہوں اور ان سے استفادہ کرتا رہا ہوں۔ انھوں نے مجھے دین کی سیدھی راہ پر لگایا اور بہترین انداز سے میری تربیت کی۔ یہ میرے مربی ہیں، میرے مرشد ہیں، میرے ہادی ہیں، میرے بہت بڑے محسن ہیں۔ انھوں نے میرے دل کی بنجر زمین کو صالحیت کی نعمت عظمیٰ سے آشنا کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ ان سے نہ ملنا بہت بڑی احسان فراموشی ہوگی۔ چناں چہ یہ میاں صاحب کی طرف بڑھے اور انھیں سلام عرض کیا۔

انھوں نے اوپر نظر اٹھا کر ان کو دیکھا تو اپنے اندازِ خاص سے فرمایا:

بھرا تو کدے جاؤں ایں (بھائی تم کہاں جارہے ہو؟)

جواب دیا: میں ساہی وال کے ایک ہائی سکول میں عربی ٹیچر مقرر ہوگیا ہوں، وہاں جارہا ہوں۔ شادی ہوگئی ہے۔ غریب آدمی ہوں۔ کوئی کام تو کرنا چاہیے۔ یہ اچھا کام ہے جو آسانی سے مل گیا ہے۔

میاں صاحب کے چہرے پر عام طور سے مسکراہٹ چھائی رہتی تھی۔ مسکراتے ہوئے فرمایا: تم مسجد کے لیے پیدا ہوئے ہو اور تمھیں مسجد ہی میں رہنا چاہیے۔ کسی مسجد میں بیٹھ جاؤ۔ کوئی بڑی کتابیں پڑھانے والا نہیں ملتا تو چھوٹے بچوں کو قاعدہ یسرنا القرآن پڑھانا شروع کردو۔ اللہ تعالیٰ برکت دے گا۔ دنیا اور آخرت کے لیے یہی کام فائدہ مند ہے۔ اس قسم کی باتیں انھوں نے تفصیل سے کیں اور خدمت دین کے سلسلے کی کئی حدیثیں سنائیں۔ اس وقت مولانا عبدالرشید کی بیوی اسلام

پور میں تھیں۔ دونوں وہاں پہنچ گئے۔ میاں صاحب نے ان کو بھی وعظ کیا، وہ بھی ان کی بات ماننے پر مجبور ہو گئیں۔

میاں صاحب وعظ کر کے اپنے گاؤں جھوک دادو چلے گئے اور مولانا عبدالرشید ڈھلیانہ کے اس مدرسے میں پہنچ گئے جہاں سے حصولِ علم کیا تھا اور سند فراغت لی تھی۔ مدرسے کے مہتمم حاجی قطب الدین سے بات کی تو انھوں نے ان کو مدرسے کا مدرس مقرر کرلیا۔ یعنی جس مدرسے میں یہ طالب علم کے طور پر رہے تھے، اب وہاں مدرس کی حیثیت سے خدمات سرانجام دینے لگے۔ تین سال سے اس مدرسے میں مولانا عبدالرشید کا سلسلۂ تدریس جاری تھا کہ اخبار الاعتصام میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کی طرف سے دارالعلوم تقویۃ الاسلام (واقع شیش محل روڈ۔ لاہور) کی بلڈنگ میں جامعہ سلفیہ کے درجہ تخصص کے اجرا کا اعلان پڑھا۔ یہ دو سال کا کورس تھا، مولانا عبدالرشید اسلام پوری درجہ تخصص میں شمولیت کے لیے لاہور پہنچ گئے۔ یہ درجہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل حضرات کے لیے جاری کیا گیا تھا اور داخلے کے لیے باقاعدہ امتحان لیا گیا تھا۔ صرف تین امیدوار اس امتحان میں کامیاب ہوئے اور درجۂ تخصص کے دوسالہ کورس میں شمولیت کے اہل قرار دیے گئے، وہ تھے ہمارے ممدوح مولانا عبدالرشید اسلام پوری، حافظ عبدالرشید گوہڑوی اور حافظ عزیز الرحمٰن لکھوی (بن حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی)۔

دوسرے درجے میں پانچ طلبا تھے، جن کا کورس تین سال کا تھا۔

اساتذہ مندرجہ ذیل پانچ حضرات تھے:

(۱)......حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی: مضمون: تفسیر الاتقان

(۲)......مولانا محمد اسماعیل سلفی: مضمون: مقدمہ ابن الصلاح (اصول حدیث)

(۳)......مولانا محمد حنیف ندوی: مضمون: البلاغۃ الواضحہ (علم معانی)

(۴)......مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی: عقائد کے سلسلے کی کوئی کتاب

(۵)......مولانا شریف اللہ خاں: ہدایہ اخیرین، توضیح وتلویح، مسلم الثبوت، سلم العلوم

جامعہ سلفیہ کا یہ سلسلہ تعلیم ایک سال دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں جاری رہا۔ اس کے بعد اسے لائل پور (فیصل آباد) منتقل کردیا گیا تھا۔ لیکن مولانا عبدالرشید اسلام پوری اور حافظ عبدالرشید گوہڑوی وہاں نہیں گئے۔

ان دونوں کو مزید تعلیم کے لیے مولانا سید محمد داوٗد غزنوی نے لاہور میں جامعہ اشرفیہ میں داخل کرادیا تھا۔ جامعہ اشرفیہ کے مہتمم اس زمانے میں مفتی محمد حسن صاحب مرحوم تھے جو مولانا غزنوی کے والد محترم حضرت امام سید عبدالجبار غزنوی کے شاگرد تھے اور مولانا کا اپنے استاذِ عالی قدر کے فرزند گرامی ہونے کی وجہ سے بے حد احترام کرتے تھے، مولانا بھی ان سے بہت اکرام سے پیش آتے تھے۔ چناں چہ مولانا نے مفتی صاحب سے ان دونوں کے داخلے کے لیے فرمایا تو انھوں نے فوراً داخل کرلیا اور ایک سال وہاں تعلیم حاصل کی۔

مولانا عبدالرشید اور حافظ عبدالرشید کو تعلیم و تعلم سے دلی لگاؤ تھا اور درسی کتابیں انھوں نے بڑے شوق اور محنت سے پڑھی تھیں۔ جامعہ سلفیہ اور جامعہ اشرفیہ میں یہ ایک ایک سال معروف اساتذہ سے تعلیم حاصل کر چکے تھے، نیز خود حضرت مولانا سید محمد داوٗد غزنوی کے حلقۂ شاگردی میں رہ چکے تھے، اس لیے مولانا ان کی قابلیت اور محنت سے آگاہ تھے۔ وہ ان دونوں کو رشیدین کے لقب سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ انھوں نے دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں ان کی تقرری فرما دی۔ ان دونوں کی خوش قسمتی تھی کہ جوانی کے دور میں ان کو حضرت مولانا غزنوی نے یہ اعزاز بخشا اور ایسے دارالعلوم کے استاذ مقرر کیا جو تدریسی، علمی اور عملی اعتبار سے ایک عظیم الشان تاریخ رکھتا تھا۔

مولانا نے ان سے فرمایا کہ آپ دونوں (رشیدین) مجھ غزنوی سے وعدہ کریں کہ ہم غزنوی کو نہیں چھوڑیں گے اور میں غزنوی آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔

اس قول و قرار کے بعد مولانا نے ان کو دارالعلوم کے اساتذہ کی جماعت میں شامل فرمالیا۔

اس وقت حضرت حافظ محمد اسحاق صاحب دارالعلوم کی مسند شیخ الحدیث پر متمکن تھے اور انھوں نے انہی کی نگرانی میں خدمت تدریس سرانجام دینا تھی۔ حضرت حافظ صاحب مرحوم جلیل القدر عالم، رفیع المرتبت مدرس، بہت بڑے مصنف اور بہت اچھے مترجم تھے۔ خوش کلام اور سب کے ہم درد۔ طلبا ان کے طریق تدریس سے بہت متاثر تھے۔ حضرت مولانا سید محمد داوٗد غزنوی ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ مولانا غزنوی کی وفات کے بعد دارالعلوم کی مسند اہتمام ان کے صاحب زادۂ گرامی قدر سید ابوبکر غزنوی کے سپرد ہوئی تو انھوں نے بھی ان سے انتہائی تکریم کا برتاؤ کیا۔ لیکن سید ابوبکر غزنوی کی وفات کے بعد دارالعلوم کے معاملات میں کچھ تبدیلی پیدا ہوئی تو حضرت حافظ صاحب کو مسند تدریس سے علیحدہ کردیا گیا اور پھر ان کی خدمات حضرت حافظ عبداللہ روپڑی کی قائم کردہ جامعہ قدس اہل حدیث لاہور نے حاصل کرلیں۔ انھوں نے وہیں ۴۔ جولائی ۲۰۰۲ء کو وفات پائی۔ اس عالم جلیل نے اپنے پیچھے ہزاروں شاگرد چھوڑے جو مختلف مقامات پر تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

بہرکیف حافظ عبدالرشید گوہڑوی اور مولانا عبدالرشید اسلام پوری نے شیخ الحدیث حضرت حافظ محمد اسحاق صاحب کی نگرانی میں دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں سلسلہ تدریس کا آغاز کردیا۔ مولانا داؤد غزنوی ان دونوں پر خوش تھے اور حضرت شیخ الحدیث صاحب بھی ان کے طریق تدریس سے مطمئن تھے۔ ہر ایک کا ایک سو پندرہ روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا گیا جو اس زمانے کے حالات کے مطابق بہت مناسب تھا۔

مولانا عبدالرشید اسلام پوری مدرس کے علاوہ خطیب بھی تھے۔ مولانا کو اس کا علم تھا۔ اس وقت مصری شاہ میں سلطان پورہ کے قریب بی بی احاطہ میں اہل حدیث کی ایک مسجد تھی جو ایک بزرگ وزیر علی شاہ نے مرکزی جمعیت اہل حدیث کے نام وقف کی تھی، یہ کل رقبہ دو کنال پانچ مرلے کا تھا، مولانا غزنوی نے مولانا عبدالرشید اسلام پوری کو اس مسجد میں خِطابت کا فریضہ انجام دینے کا حکم دیا۔ انھوں نے مولانا کے ارشاد کے مطابق خطابت کا سلسلہ شروع کردیا، لیکن اس رقبے کو وقف کرنے والے اس کی واپسی کے لیے سرگرم ہوگئے اور معاملہ عدالت میں چلا گیا، جس میں وہ ناکام ہوگئے۔ آخر مولانا نے باہمی صلاح مشورے سے وہ رقبہ انھیں واپس کردیا۔

اس سے کچھ عرصہ پیشتر مسجد توحید گنج (مغل پورہ) کے منصب خطابت پر مولانا حافظ اسماعیل ذبیح فائز تھے، وہ راولپنڈی تشریف لے گئے تو وہاں کی مجلس انتظامیہ نے خطابت وامامت کے لیے مولانا عبدالرشید اسلام پوری سے رابطہ پیدا کیا۔ بات مولانا غزنوی تک پہنچی تو انھوں نے فرمایا کہ آپ ان سے یہ طے کرلیں کہ خطبہ جمعہ کے علاوہ صرف جہری نمازیں (مغرب، عشا اور فجر) اس مسجد میں پڑھایا کریں گے۔ چناں چہ مولانا کے فرمان کے مطابق معاملہ طے ہوگیا۔ مسجد کی انتظامیہ نے رہائش کے لیے مکان بھی دے دیا اور ساٹھ روپے ماہانہ وظیفہ بھی دینے لگے۔ مسجد توحید گنج میں وہ تین وقت (مغرب، عشا اور فجر) کی نمازیں پڑھاتے تھے۔ نماز فجر کے بعد قرآن مجید کا درس دیتے اور خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے تھے۔ دارالعلوم تقویۃ الاسلام سے مغل پورہ نو دس کیلومیٹر کے فاصلے پر ہوگا۔ مولانا عبدالرشید روزانہ صبح کو سائیکل پر گھر سے چلتے اور عین وقت پر دارالعلوم پہنچ جاتے۔ پھر عصر کے بعد دارالعلوم سے روانہ ہوتے اور شام سے پہلے گھر چلے جاتے۔ یہ ان کا ہر روز کا معمول تھا، جس پر وہ گرمی، سردی، بارش، آندھی، ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے کئی سال عمل کرتے رہے۔

مولانا عبدالرشید اسلام پوری کے پہلے بچے کی پیدائش مغل پورہ ہی میں ہوئی تھی۔ ساتویں دن اس بچے کا عقیقہ کیا گیا تھا۔ مجھے بھی عقیقے کی دعوت دی گئی تھی اور میں اس میں شامل ہوا تھا۔ مولانا عبدالرشید نے مجھے بتایا کہ اس وقت ان کے پاس دو بکرے خریدنے کے لیے پیسے نہیں تھے۔

ساتویں روز عقیقے کی سنت پر عمل کرنے کے لیے ان کی بیوی نے کانوں کی طلائی بالیاں انھیں دیں کہ انھیں بیچ کر بکرے خریدے جائیں اور عقیقہ کیا جائے۔

مولانا عبدالرشید کے پہلونٹھی کے اس بچے کا نام حافظ عبدالرؤف ہے اور اب یہ بچے نہیں ہیں، ماشاء اللہ خود بچوں والے ہیں، عالم فاضل ہیں، حافظ قرآن ہیں، باپ کے قائم کردہ جامعہ الدراسات الاسلامیہ کے ناظم اور ماہنامہ ''ام الہدیٰ'' کے نگرانِ اعلیٰ ہیں۔ ملنسار اور معاملہ فہم ہیں۔ مختلف ذمہ داریوں کے ہجوم میں سب سے حسب مراتب پیش آنا اور موقع ومحل کی مناسبت سے لوگوں سے برتاؤ کرنا بہت مشکل کام ہے، لیکن حافظ عبدالرؤف کو اللہ تعالیٰ نے اس وصف سے نوازا ہے کہ ان کا رویہ سب ملنے والوں سے حسن سلوک کا آئینہ دار ہے۔

حافظ عبدالرؤف ماشاء اللہ بہت اچھے مقرر اور خطیب بھی ہیں۔ اپنے والد مکرم مولانا عبدالرشید کی غیر حاضری میں خطبہ جمعہ ان کی جگہ وہی دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت سے اوصاف سے نوازا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی زندگی اور امورِ خیر میں برکت عطا فرمائے، آمین۔

گزشتہ سطور میں دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں مولانا عبدالرشید کی تدریس کے متعلق چند باتیں بیان کی گئی ہیں۔ اب آئندہ سطور میں حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی حیات طیبہ کے بعض پہلوؤں کے بارے میں مولانا عبدالرشید صاحب کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے۔ مولانا سے متعلق میں بھی اپنی کتاب ''نقوشِ عظمت رفتہ'' میں شائع شدہ طویل مضمون میں بہت سی باتیں لکھ چکا ہوں، تاہم اضافی شہادت کے لیے قارئین کرام مولانا عبدالرشید کی زبانی بھی چند باتیں ملاحظہ فرمالیں۔

> دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے ناظم ومہتمم حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی نہایت زیرک، انتہائی فہیم، دور اندیش، فصاحت وبلاغت کے امام اور اللہ کا بہ کثرت ذکر کرنے والے تھے۔ قعدہ کی شکل اختیار کرکے ذکر الٰہی میں مشغول ہوجاتے تھے۔ دارالعلوم کی بالائی منزل میں سکونت پذیر تھے۔ تہجد کے وقت خوف خدا سے ان کے رونے کی آواز نیچے اقامتی طلبا کو سنائی دیتی تھی۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث کے منتخب امیر تھے اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔
>
> ایک دفعہ مؤطا امام مالک طلبا کو پڑھا رہے تھے کہ ضلع لاہور کے ڈپٹی کمشنر ملاقات کے لیے آئے اور خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئے۔ درس سے فراغت کے بعد سلام دعا ہوئی تو مولانا نے فرمایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث پڑھا رہا تھا۔ حدیث کی عظمت کے پیش نظر دورانِ تدریس آپ سے کوئی بات نہ کرسکا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نہایت خوش ہوئے۔
>
> مولانا عبدالرشید مزید فرماتے ہیں:

مولانا صاحب نے کبھی ننگے سر نماز نہیں پڑھی، بلکہ ان کی طرف سے دارالعلوم میں اعلان تھا کہ کوئی معلم یا متعلم ننگے سر نماز نہ پڑھے۔ دارالعلوم میں امامت کے لیے کسی کو مقرر فرما دیتے تھے۔ خود نماز نہ پڑھاتے تھے۔ نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا ان کے معمولات میں شامل تھا۔ انتظامی امور میں بہترین صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ایک دفعہ فرمانے لگے مولوی عبدالرشید اگر آپ کو کسی معاملے میں رخصت کی ضرورت پڑے تو درخواست لکھ کر چھٹی منظور کرایا کریں۔ اگر آپ بالفرض اپنے گھر میں ہیں اور فوری طور پر کوئی کام پڑ گیا ہے جس کی وجہ سے دارالعلوم میں حاضر نہیں ہوسکتے تو بذریعہ ٹیلی فون اطلاع دے دیا کریں۔ اگر ٹیلی فون میسر نہ آسکے تو رخصت کے بعد دارالعلوم میں آئیں تو مجھ سے مل کر نہ آنے کی وجہ بیان کریں۔ اس کے بعد مسند درس پر بیٹھیں۔

مولانا عبدالرشید تقریباً چھ سال مولانا کی حیاتِ مبارکہ میں دارالعلوم میں خدمت تدریس انجام دیتے رہے۔ مولانا کو کبھی ان سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ جب مولانا اس دارِ فانی سے عالم آخرت کو رخصت ہوگئے تو ان کے فرزند گرامی پروفیسر سید ابوبکر غزنوی کو دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے مہتمم وناظم مقرر کیا گیا۔ ان کے عہد اہتمام میں بھی مولانا عبدالرشید چھ سال درس وتدریس کی خدمت میں مصروف رہے۔ پھر ان کی اہلیہ بیمار ہوگئیں تو انھیں اس خدمت سے مجبوراً الگ ہونا پڑا۔ اس طرح انھوں نے بارہ سال دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں فریضۂ تدریس سرانجام دیا۔

مولانا عبدالرشید کے زمانۂ تدریس میں، یہ فقیر اخبار ”الاعتصام“ کا ایڈیٹر تھا اور اخبار کا دفتر دارالعلوم تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ میں تھا۔ میرے مولانا عبدالرشید سے اچھے مراسم تھے اور میں ان کی صالحیت اور صلاحیت سے بہت متاثر تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ ہر روز بلاناغہ سائیکل پر نو دس میل کا سفر کرکے آتے تھے اور آتے ہی مسند درس پر بیٹھ جاتے تھے۔ مولانا غزنوی ان کے طریق تدریس، ان کی محنت اور نیکی کا بہتر الفاظ میں تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔

کئی سال مولانا عبدالرشید مغل پورہ کی مسجد توحید گنج میں خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے اور نمازِ فجر کے بعد درسِ قرآن دیتے رہے۔ مغل پورہ کے ساتھ ہی ایک آبادی کا نام رام گڑھ تھا، قیامِ پاکستان سے قبل یہ ہندوؤں کی آبادی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں مسلمان آباد ہوئے اور اس آبادی میں اہل حدیث کی مسجد تعمیر ہوئی۔ جو لوگ اس مسجد کی تعمیر وترقی کے لیے بہت زیادہ سرگرم اور کوشاں تھے، ان میں ایک نمایاں نام مستری محمد حسن کا تھا جو دبلے پتلے منکسر مزاج شخص تھے۔ بعض بیماریاں بھی انھیں لاحق تھیں۔ لیکن تمام جسمانی تکلیفوں کے باوجود وہ مسجد کے لیے ہر وقت مستعد رہتے تھے۔ اس سلسلے میں میرے پاس اخبار ”الاعتصام“ میں ان کی آمد ورفت رہتی تھی۔ پھر ایک وقت آیا

کہ مولانا عبدالرشید نے اس مسجد میں ڈیرے ڈال دیے اور وہاں خطابت کے ساتھ سلسلۂ تدریس بھی شروع کردیا گیا۔ رام گڑھ کا نام بدل کر اسے مجاہد آباد بنا دیا گیا اور ساتھ ہی مولانا عبدالرشید اسلام پوری بھی مولانا عبدالرشید مجاہد آبادی ہوگئے۔

مسجد کی مجلس انتظامیہ سے مولانا عبدالرشید نے مدرسے کے قیام سے متعلق بات کی تو انھوں نے مولانا سے کہا کہ مدرسہ بے شک قائم کرلیجیے لیکن اس کے انتظام وانصرام کے ذمہ دار آپ خود ہی ہوں گے۔ مولانا نے اللہ پر توکل کر کے مسجد میں مدرسہ قائم کردیا۔ پہلے یہاں ریاض القرآن کے نام سے حفظ قرآن کا انتظام تھا۔ پھر ریاض القرآن والحدیث کے نام سے باقاعدہ مدرسہ جاری کردیا گیا اور تحفیظ القرآن کے ساتھ درسِ نظامی کی تعلیم کے لیے بھی طلبا کا داخلہ ہونے لگا۔ مسجد میں مولانا کی خطابت کا سلسلہ پہلے ہی سے جاری تھا، جس نے جلد ہی بہت شہرت حاصل کرلی تھی۔

ابتدائی مرحلے میں مولانا عبدالرشید اکیلے ہی درسِ نظامی کے طلبا کو پڑھاتے تھے۔ پھر ایک ساتھی اور مل گئے۔ اس کے بعد تین ساتھی مزید میسر آگئے اور مولانا سمیت یہ تعداد چار تک پہنچ گئی۔ مولانا ممدوح نے ۳۷ سال کا طویل عرصہ لاہور کی اس جامع مسجد اہل حدیث مجاہد آباد میں گزارا اور اس طویل مدت میں سیکڑوں لوگوں نے ان سے قرآن وحدیث کی تعلیم حاصل کی۔

ہمارے دینی مدارس کا یہ عجیب معاملہ ہے کہ ایک ہی معلم کئی مضامین روزانہ پڑھاتا ہے۔ وہ تفسیر قرآن بھی پڑھاتا ہے، حدیث کی مختلف کتابیں بھی پڑھاتا ہے، اصولِ حدیث، فقہ اور اصولِ فقہ، عربی ادبیات، منطق وفلسفہ اور صرف ونحو وغیرہ علوم کی چھوٹی بڑی کتابوں کی تدریس کا ذمہ دار ایک ہی معلم ہے۔ اس معلم کی ہمت کی داد دیجیے کہ وہ ایک دن میں کتنے ہی مضامین پڑھاتا ہے۔ اِدھر کالجوں اور یونیورسٹیوں کو دیکھیے کہ ایک پروفیسر بڑی مشکل سے ایک مضمون پڑھاتا ہے اور ۴۵ منٹ میں (یا زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں) اپنا پیریڈ ختم کردیتا ہے اور ہزاروں روپے تنخواہ لیتا ہے جب کہ دینی مدرسے کے معلم کو اس کے چوتھے حصے کی تنخواہ بھی نہیں ملتی۔

روزانہ اتنا کچھ پڑھانے اور دن رات محنت کرنے والے استاذ کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے مسجد یا مدرسے کی انتظامیہ کے چند افراد ہوتے ہیں جنھیں دینی علوم اور دینی مدارس کے نصاب اور اس موضوع کی کتابوں سے کوئی واقفیت نہیں ہوتی، وہ جب چاہتے ہیں، اسے فارغ کردیتے ہیں اور جس مدرسے میں اس نے دس بیس یا تیس چالیس پچاس برس محنت کی ہوتی ہے اور سیکڑوں ہزاروں لوگوں کو تعلیم سے آراستہ کیا ہوتا ہے، اسے چند منٹ میں وہاں سے نکال دیا جاتا ہے۔ نہ اس کی پنشن ہے، نہ پراویڈنٹ فنڈ ہے، نہ کہیں سے کچھ مالی امداد کی امید ہے۔ بلکہ بسا اوقات مدرسے سے نکالتے وقت اس کا شکریہ بھی ادا نہیں کیا جاتا اور کوئی شخص دروازے تک

اسے چھوڑنے نہیں جاتا۔

ان معاملات کا یقیناً مولانا عبدالرشید صاحب کو احساس ہوگا۔ ان کے دل میں یہ بات کروٹ لیتی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ توفیق مرحمت فرمائے تو یہ خدمت آزادی سے سرانجام دی جائے۔ کسی سے کسی قسم کا احتیاج نہ ہو۔ چناں چہ انھوں نے اس کا ذکر اپنے ایک انتہائی خیر خواہ اور راز دان سے کیا، جنھیں وہ اپنا روحانی فرزند قرار دیتے ہیں، ان کا نام نامی ہے، اشفاق احمد۔ اس مردِ عالی ہمت اور پیکر اخلاص مخلص نے ان کو تسلی دی اور کہا کہ ان شاء اللہ ہم یہ کام کریں گے اور اللہ تعالیٰ ہمیں اس کارِ خیر میں کامیابی عطا فرمائے گا۔

مدرسے کے قیام کے لیے سب سے پہلے زمین کی ضرورت تھی اور زمین اور اس کا محل وقوع دیکھنے میں کچھ وقت گزر گیا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی اور مولانا کی دعاے پرخلوص اور اشفاق احمد کی سعی باہمت کو شرفِ قبول بخشا۔ کینال بنک، عزیز پلی فتح گڑھ کے قریب تین کنال کا رقبہ پسند کیا گیا۔ بہت اچھا محل وقوع اور بہت اچھی فضا۔ سامنے کشادہ سڑک اور نہر۔ رقبے کے مالک سے بات ہوئی تو چالیس ہزار روپے مرلے کے حساب سے سودا طے پایا۔ کل رقم بائیس لاکھ روپے بنتی ہے۔ لیکن اتنی خطیر رقم ان کے پاس نہیں تھی۔ کل پچاس ہزار روپے تھے۔ عمدہ خصال اور نیک دل مالک نے کہا جو کچھ آپ فوری طور پر دے سکتے ہیں، دے دیں، گھبرانے کی ضرورت نہیں، باقی رقم بعد میں ادا کر دینا۔ یہ زمین آپ کی ہو چکی۔ اب اشفاق احمد صاحب، خود مولانا عبدالرشید صاحب اور حافظ عبدالرؤف نے رقم جمع کرنے کے لیے بھاگ دوڑ شروع کی تو تین سال میں رقم جمع کرنے میں کامیاب ہوئے۔

اشفاق احمد صاحب نے حافظ عبدالرؤف سے خاص طور پر یہ کہا کہ مولانا تو بزرگی کی عمر کو پہنچ گئے ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں صحت وعافیت سے رکھے اور ان کی دعائیں ہمارے شاملِ حال رہیں۔ جامعہ کے تعلیمی سلسلے کو آگے بڑھانا اور اس کے اخراجات پورے کرنا بڑا محنت طلب اور بے حد ذمہ داری کا مسئلہ ہے، اس کے لیے تگ ودو کرنا اب آپ کا کام ہے۔

اشفاق احمد صاحب عصری تعلیم سے آگاہ ہیں اور حافظ عبدالرؤف صاحب دینی تعلیم سے آشنا ہیں۔ ان شاء اللہ یہ تعلیمی ادارہ لازماً ترقی کی منزلیں طے کرے گا۔ ما شاء اللہ بہت بڑی مسجد تعمیر ہوگئی ہے اور تدریس کے لیے بھی کمرے تعمیر کر لیے گئے ہیں۔ تدریس کا سلسلہ بھی اللہ کے فضل سے جاری ہے اور تعمیر کا بھی۔ یہ فقیر دو تین دفعہ وہاں جا چکا ہے۔ جگہ اور ادارے کو دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔

۹۔ اگست ۲۰۰۶ء کو عالمی محفل قرأت قرآن کا اہتمام کیا گیا تھا، جس میں بہت سے قاری

حضرات شریک ہوئے تھے، دو مصری قاری بھی تشریف لائے تھے۔ بے شمار سامعین نے اس بابرکت محفل میں شرکت کی اور بے حد ذوق وشوق سے لوگوں نے قرآنِ مجید سنا۔ سلسلہ قرأت نمازِ مغرب کے بعد شروع ہوا اور رات ڈیڑھ بجے تک جاری رہا۔ میرے خیال کے مطابق لاہور میں یہ پہلی بابرکت محفل تھی، جسے بے حد پذیرائی حاصل ہوئی۔

مولانا عبدالرشید مجاہد آبادی کے بعض اساتذہ کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ ذیل میں ان کے تمام اساتذہ کے اسمائے گرامی درج کیے جاتے ہیں۔

① ...... میاں محمد باقر صاحب جھوک دادو: ان سے بعض ابتدائی کتابیں پڑھیں اور بہت کچھ حاصل کیا۔

② ...... مولانا محمد داؤد بھوجیانی: ان سے ہدایۃ النحو پڑھی۔

③ ...... مولانا حافظ محمد بھٹوی: ان سے صرف ونحو اور حدیث کی بعض کتابیں پڑھیں۔

④ ...... شیخ الحدیث حضرت مولانا حافظ محمد اسحاق: ان سے ادب عربی، صرف ونحو اور صحیح بخاری پڑھی۔

⑤ ...... مولانا محمد عبداللہ صاحب (جھنڈا بگا): ان سے صحیح مسلم اور ابوداؤد کا درس لیا۔

⑥ ...... مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی: ان سے عقائد کی تعلیم حاصل کی۔

⑦ ...... مولانا محمد عبدہ الفلاح: ان سے تفسیر بیضاوی پڑھی اور دیوانِ حماسہ پڑھا۔

⑧ ...... مولانا شریف اللہ خاں: ان سے مسلم الثبوت، توضیح تلویح، ہدایہ اخیرین، سلّم العلوم کتابیں پڑھیں۔

⑨ ...... مولانا محمد اسماعیل سلفی: ان سے مقدمہ ابن الصلاح پڑھا۔

⑩ ...... مولانا سید محمد داؤد غزنوی: ان سے تفسیر اتقان پڑھی۔

⑪ ...... مولانا محمد حنیف ندوی: ان سے البلاغۃ الواضحہ پڑھی۔

⑫ ...... مولانا حبیب الرحمٰن لکھوی: ان سے کافیہ پڑھا۔

⑬ ...... مولانا عطاء اللہ لکھوی: ان سے ہدایۃ النحو پڑھی۔

ان اساتذۂ عالی قدر کے علاوہ سرکاری سکول میں ان کو جن حضرات سے حصولِ علم کے مواقع ملے، ان کے نام پہلے لکھے جا چکے ہیں، یہاں بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔

① ماسٹر محمد زکریا، ② ماسٹر احمد دین، ③ ماسٹر معراج الدین۔ یہ تمام حضرات اپنی اپنی باری سے سفر آخرت اختیار کر چکے ہیں۔ رحمہم اللہ تعالی

مولانا عبدالرشید مجاہد آبادی کی اولاد تین لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ لڑکوں کے نام علی الترتیب یہ ہیں: حافظ عبدالرؤف، حافظ عبدالشکور اور عبدالباسط......! ماشاء اللہ پڑھی لکھی اور فرماں بردار اولاد ہے۔

مولانا کے گھر کے جن افراد نے وفات پائی، ان کی بہ ترتیب وفات تفصیل یہ ہے:

①......ان کی پھوپی کا نام قبولِ اسلام کے بعد جنت بی بی رکھا گیا تھا۔ وہ ۱۹۵۶ء میں فوت ہوئیں۔

②...... چھوٹے بھائی عبدالحمید تھے (جن کا ہندوانہ نام حاکم چند تھا) رمضان المبارک ۱۹۸۵ء میں فوت ہوئے۔

③...... والدہ صاحبہ (جن کا پہلا نام ریشم دیوی تھا) پھر ان کا نام فاطمہ بی بی رکھا گیا۔ ۱۰۔ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو بروز اتوار فوت ہوئیں۔

④...... اہلیہ محترمہ کا نام بھی فاطمہ بی بی تھا۔ یہ ۱۶۔ اپریل ۲۰۰۵ء کو فوت ہوئیں۔ بروز جمعۃ المبارک شب کے ۱۲ بج کر تیرہ منٹ پر۔

⑤...... بڑے بھائی چودھری عبدالمجید (جن کا پہلا نام برج لال تھا) ۱۹۔ اپریل ۲۰۰۶ء کو فوت ہوئے۔

اللھم اغفرلھم وارحمھم وعافھم واعف عنھم وادخلھم جنت الفردوس .

مولانا عبدالرشید مجاہد آبادی کا شمار پاکستان کے دینی مدارس کے مشہور مدرسین میں ہوتا ہے۔ ماشاء اللہ وہ نصف صدی سے زائد مدت سے خدمت تدریس انجام دے رہے ہیں۔ ہر فن کی تمام کتابیں کئی کئی دفعہ پڑھا چکے ہیں۔ علم صرف کی صرف بہائی سے لے کر شافیہ تک، علم نحو کی نحو میر سے لے کر شرح جامی اور شرح ابن عقیل تک۔ فقہ کی قدوری سے لے کر ہدایہ تک۔ اسی طرح اصول حدیث، اصولِ فقہ، عربی ادبیات اور دیگر مروّجہ نصاب کی سب چھوٹی بڑی کتابوں کی تدریس پر انھیں عبور حاصل ہے۔ تفسیر وحدیث کی تدریس تو ان کا محبوب ترین موضوع ہے۔ تفسیر میں بیضاوی، جلالین اور جامع البیان کا درس متعدد مرتبہ دے چکے ہیں۔ پھر کتب حدیث میں بلوغ المرام سے لے کر صحیح بخاری تک کی تدریس کا مرحلہ نہایت حسن وخوبی کے ساتھ کئی دفعہ طے کر چکے ہیں۔ اب وہ صرف کتب حدیث پڑھاتے ہیں اور طلبا ان کے طرزِ تدریس اور اندازِ تفہیم سے بہت متاثر ہیں۔

علاوہ ازیں وعظ وخطابت میں بھی ان کا ایک خاص اسلوب ہے جس سے سامعین بے حد متاثر ہوتے ہیں۔ وہ جس جذبے اور خلوص سے اپنی بات لوگوں تک پہنچاتے ہیں، وہ ان کے دلوں میں بیٹھتی اور ذہنوں میں راسخ ہوتی چلی جاتی ہے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ صحت وعافیت کے ساتھ انھیں عمر دراز عطا فرمائے اور وہ ہمیشہ درس وتدریس اور وعظ وخطابت کے ذریعے اس کے دین کی تبلیغ واشاعت میں مصروف رہیں۔

آمین یا رب العالمین

انھوں نے جامعہ الدراسات الاسلامیہ کی طرف سے ''ام الہدیٰ'' کے نام سے ماہانہ رسالہ بھی جاری کیا ہے جو ایک علمی رسالہ ہے اور اس کی ادارت کے فرائض حافظ مصطفیٰ صادق انجام دیتے ہیں جو مولانا کے داماد ہیں۔

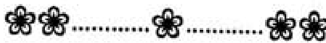
مولانا عبدالرشید مجاہد آبادی کے بے شمار شاگردوں میں سے چند شاگردوں کے نام جو فوری طور پر ذہن میں آئے، ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

①......حافظ عبدالوحید	ایڈیٹر اخبار ''الاعتصام''۔ لاہور
②......مولانا محمد شریف اللہ آبادی	خطیب مسجد اہل حدیث اللہ آباد (ضلع قصور) ومہتمم مدرسہ اللہ آباد
③...... حافظ محمد اشرف قمر	امیر جمعیت اہل حدیث۔ لاہور
④......مولانا اصغر علی	عربی ٹیچر ہائی سکول شکر گڑھ
⑤......مولانا عطاء اللہ	خطیب جامع مسجد اہل حدیث فیروز وٹواں ضلع شیخوپورہ
⑥...... حافظ عبدالروٗف	نائب ناظم جامعہ الدراسات الاسلامیہ، ہربنس پورہ۔ لاہور
⑦...... حافظ مصطفیٰ صادق	خطیب مسجد رضوان (بجلی گھر) لاہور ومدرس جامعہ الدراسات الاسلامیہ ہربنس پورہ۔ لاہور۔ مشہور مناظر اسلام
⑧...... حافظ احمد شاکر	مدیر مسئول ہفت روزہ ''الاعتصام''۔ لاہور
⑨......مولانا محمد ادریس ہاشمی	ایڈیٹر ماہنامہ صدائے ہوش۔ لاہور
⑩......مولانا حفیظ الرحمٰن لکھوی	ناظم جامعہ ابن تیمیہ۔ لاہور
⑪......مولانا عبدالحلیم مرحوم	شیخ الحدیث جامعہ محمدیہ۔ اوکاڑہ
⑫......مولانا حبیب الرحمٰن یزدانی	شہید ۲۳۔ مارچ ۱۹۸۷ء (قلعہ چھمن سنگھ۔ لاہور)
⑬......مولانا سید حبیب الرحمٰن شاہ مرحوم	راولپنڈی
⑭......مولانا محمد حنیف یزدانی مرحوم	متعدد کتابوں کے مصنف وناشر

یہ ہیں مولانا عبدالرشید اسلام پوری یا مجاہد آبادی کی داستانِ حیات کے چند پہلو، جنھیں آپ

''مندر سے مسجد تک'' سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ ''ہر دوار سے بیت اللہ تک'' کا عنوان بھی دے سکتے ہیں۔ ''گنگا سے زمزم تک'' سے بھی موسوم کر سکتے ہیں۔ ''کرشن لال سے عبدالرشید تک'' بھی کہہ سکتے ہیں۔

مولانا کے آبائی گاؤں کا نام اسلام پور تھا اور یہ عملی اور فکری اعتبار سے ہمیشہ ''اسلام پور'' ہی میں رہے۔ یعنی اسلام اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ ہر آن ان کی زندگی کے نشیب و فراز پر چھایا رہا۔ حفظہ اللہ تعالیٰ۔



مولانا عبداللہ امجد چھتوی

تقسیم ملک سے قبل متحدہ ہندوستان میں چھوٹی بڑی ساڑھے پانچ سو سے زائد ریاستیں تھیں، جن پر طویل مدت سے راجے مہاراجے اور نواب نسلاً بعد نسل حکومت کرتے چلے آرہے تھے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوکر ہندوستان اور پاکستان کے نام سے دو حصوں میں بٹا تو ہندوستان کی کانگرسی حکومت نے ریاستیں ختم کردی تھیں۔ ان ریاستوں میں ایک ریاست کا نام ''بیکانیر'' تھا۔ تقسیم ملک کے بعد اس ریاست کو حکومت ہند نے صوبہ راجستھان میں شامل کردیا تھا۔ مولانا عبداللہ امجد کے آبا واجداد آزادیٔ ملک سے قبل اسی ریاست کے ایک گاؤں میں سکونت پذیر تھے، جس کا نام دبلی باس (یعنی آبادی) تھا۔ یہ بستی ریاست بیکانیر کی تحصیل، بنومان گڑھ ضلع گنگا نگر میں تھی۔ عرف عام میں اسے ''ڈھانی'' کہا جاتا تھا۔ اس نواح میں ڈھانی کا اطلاق چھوٹی بستی یا آبادی پر ہوتا تھا اور تین چار ڈھانیاں تھیں جو قریب قریب واقع تھیں، ان میں سے ہر ڈھانی پر ایک دوسری سے امتیاز کے لیے بہ طور لاحقہ کوئی لفظ لگا لیا گیا تھا۔ مولانا عبداللہ امجد والی ڈھانی کو ''دبلی باس'' کے لاحقے سے دوسری ڈھانیوں سے ممیّز کیا گیا تھا۔

ان کے خاندان کی رشتے داریوں کا حلقہ دور تک پھیلا ہوا تھا، مثلاً پٹیالہ میں رحمۃ للعالمین کے مصنف نام دار قاضی محمد سلیمان منصور پوری سے ان کا تعلق تھا تو ضلع فیروزپور کی ایک چھوٹی سی بستی بڈھیمال کے لوگوں سے بھی ان کے رشتے ناتے قائم تھے۔ بڈھیمال بھی علمائے کرام کا مسکن تھا اور ڈھانی میں بھی متعدد اہل علم نے جنم لیا اور ان کے حدودِ اثرات وسیع ہوئے۔ قاضی محمد سلیمان منصور پوری مرحوم ومغفور ایک مرتبہ عبداللہ امجد کے کسی بزرگ کی شادی میں ڈھانی تشریف لے گئے تھے اور ان کا نکاح قاضی صاحب نے پڑھایا تھا۔

تقسیم ملک سے پہلے ہمارے دوست مولانا محمد یاسین شاد کے خاندان کا تعلق سکونت بھی اسی ڈھانی سے تھا۔ یہ اہل حدیث خاندان ہے جو ملتان میں اقامت گزیں ہے۔ مولانا محمد یاسین شاد کتاب دوست اور صاحب مطالعہ عالم دین ہیں۔ انھوں نے اپنے والد محترم کے نام سے ملتان میں ''عبدالرحمٰن اسلامک لائبریری'' قائم کی ہے اور خود جگہ خرید کر ایک مسجد تعمیر کرائی ہے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ڈھانی بے شک چھوٹا سا گاؤں تھا، لیکن اصحاب علم کا مجمع اور اہل حدیث کا مسکن تھا، جہاں جناب علامہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری جیسی عظیم شخصیتیں قدم رنجہ فرما چکی تھیں۔ بلاشبہ اس

گاؤں پر بقامت کہتر بقیمت بہتر کی ضرب المثل صادق آتی تھی۔

بڈھیمال کے بارے میں بعض باتیں یہ فقیر اپنی کتاب ''قافلہ حدیث'' کے اس طویل مضمون میں بیان کر چکا ہے جو حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی (متوفی ۹۔مئی ۱۹۸۷ء) کے حالات میں لکھا گیا ہے۔ ❶

زیر مطالعہ کتاب ''دبستانِ حدیث'' میں مولانا حافظ احمد اللہ صاحب بڈھیمالوی سے متعلق مضمون میں بھی مناسب مواقع پر بڈھیمال اور وہاں کے علمائے کرام کے بارے میں بعض ضروری باتیں ضبط تحریر میں لائی گئی ہیں۔ اس مختصر سی بستی میں متعدد علمائے کرام نے جنم لیا جو قیام پاکستان سے پہلے بھی خدمت تدریس انجام دیتے رہے، لیکن بعد میں انھوں نے بالخصوص مختلف مقامات میں مسانِد درس آراستہ کیں اور شائقین علوم دینیہ کے جم غفیر کو مستفید فرمایا۔ اس کارِ خیر کا صلہ انھیں اللہ ہی دینے والا ہے۔

عبداللہ امجد کے دادا تین بھائی تھے، جن کے نام علی الترتیب یہ ہیں: جمال الدین، جلال الدین اور عنایت اللہ! جمال الدین کے دو بیٹے تھے اور دونوں عالم تھے۔ بڑے کا نام مولوی عبداللہ تھا اور چھوٹے کا مولوی محمد۔

مولوی عبداللہ اُس دور میں اپنے علاقے کے مشہور عالم تھے۔ متقی اور پیکر صالحیت۔ واعظ اور مدرس۔ بہت سے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ عالم جوانی میں سفر آخرت پر روانہ ہو گئے تھے۔ عبداللہ امجد کا نام انہی کے نام پر عبداللہ رکھا گیا تھا۔

مولوی محمد بھی عالم دین تھے اور وعظ وخطابت سے دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے ۸۰ سال کے پس وپیش عمر پا کر قیامِ پاکستان کے بعد چک نمبر ۳۶ گ ب (تحصیل جڑاں والا) میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

میاں جلال الدین کے بھی دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام عبدالعزیز تھا اور چھوٹے کا مولوی

---

❶ ملاحظہ ہو ''قافلہ حدیث'' از صفحہ ۲۲۷ تا ۲۷۱۔ شائع کردہ مکتبہ قدوسیہ، اردو بازار۔ لاہور۔ یہاں یہ یاد رہے کہ قافلہ حدیث میں حضرت حافظ صاحب کی تاریخ وفات غلطی سے ۷۔مئی ۱۹۸۷ء لکھی گئی ہے، جب کہ ان کی تاریخ وفات ۹۔مئی ۱۹۸۷ء ہے۔ دو دن کے اس فرق کی غلطی کا تعلق معلوم نہیں مجھ سے ہے یا کمپوزر سے! لیکن میں اسے اپنے کھاتے ہی میں ڈال لیتا ہوں، جہاں اس گنہگار کے کھاتے میں، اور بہت سی غلطیاں ہیں، ایک غلطی یہ بھی سہی۔ لیکن میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ یہ فقیر پہلا شخص ہے، جس نے حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی پر مضمون لکھا۔ اس سے قبل یا بعد ان کے کسی عزیز یا شاگرد کو ان پر لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ کسی بزرگ کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنا آسان ہے، لیکن اس نسبت کا حق ادا کرنا بہت مشکل ہے۔

عبدالرشید! یہ دونوں بزرگ وفات پاچکے ہیں۔ مولوی عبدالرشید نے درس نظامی کی تکمیل کی تھی اور وہ مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کے شاگرد تھے۔ ان کے بڑے بھائی عبدالعزیز عالم دین تو نہ تھے لیکن قرآنِ مجید پڑھا تھا، دینیات کے سلسلے کی بعض اردو کتابیں بھی پڑھی تھیں اور حضرت حافظ محمد لکھوی کی تصانیف احوال الآخرت، زینت الاسلام اور انواعِ محمدی وغیرہ جو اس زمانے کے پنجاب میں بہت مقبول تھیں اور گھروں میں پڑھائی جاتی تھیں، انھوں نے بھی پڑھی تھیں۔ عبداللہ امجد انہی عبدالعزیز کے بیٹے ہیں۔

عنایت اللہ کے بھی دو ہی بیٹے تھے۔ بڑے کا نام محمد سلیمان تھا اور چھوٹے کا عبید اللہ۔ ان تینوں بھائیوں کے سب بیٹے بیٹیاں وفات پاچکے ہیں۔ البتہ ان کے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی اولاد ماشاء اللہ بہت پھیلی ہوئی ہے۔

میاں جمال الدین، جلال الدین اور عنایت اللہ میری والدہ کے حقیقی ماموں تھے۔ حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کے بھی ماموں تھے۔ میری والدہ اور حافظ صاحب آپس میں خالہ زاد تھے۔

عبد اللہ امجد کی ولادت ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ سابق ریاست بیکانیر کی بستی ڈھانی میں ہوئی۔ ناظرہ قرآنِ مجید اپنے والد عبدالعزیز سے پڑھا۔ حضرت حافظ محمد لکھوی کی تصانیف احوال الآخرت، زینت الاسلام اور بعض دیگر کتابیں بھی والد سے پڑھیں۔ تقسیم ملک کے بعد اپنے والدین اور دوسرے بزرگوں کے ساتھ چک نمبر ۳۶ گ ب (تحصیل جڑاں والا ضلع فیصل آباد) میں سکونت پذیر ہوئے اور پھر باقاعدہ طور سے حصولِ علم کا آغاز کیا۔ چک نمبر ۳۶ میں سکونت کی وجہ سے ''چھتوی'' کی نسبت سے شہرت پائی۔ پاکستان آکر سب سے پہلے میاں محمد باقر کے قائم کردہ مدرسہ خادم القرآن والحدیث (جھوک دادو) میں داخلہ لیا۔ اس وقت اس مدرسے میں مولانا محمد صدیق کرپالوی (جنھیں بعد میں لائل پوری کی نسبت سے پکارا جانے لگا) خدمت تدریس انجام دیتے تھے۔ عبداللہ امجد نے دو سال ان سے تعلیم حاصل کی، یعنی دینیات کے نصاب کی رو سے پہلی اور دوسری دو جماعتیں وہاں پڑھیں۔ اس کے بعد اوڈاں والا چک نمبر ۴۹۳ گ ب کا عزم کیا۔ وہاں صوفی عبداللہ مرحوم کے دارالعلوم تعلیم الاسلام میں داخل ہوئے اور تیسری اور چوتھی جماعت کی تکمیل کی، وہاں بھی دو سال قیام رہا۔ اوڈاں والا کے دارالعلوم میں جن اساتذہ کے حضور انھوں نے زانوے شاگردی تہ کیے، وہ تھے مولانا عبدالصمد رؤف، پیر محمد یعقوب قریشی، مولانا محمد صادق خلیل اور حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی۔ اور ان کے ہم جماعت تھے مولانا عبدالرشید ہزاروی (شیخ الحدیث دارالحدیث اوکاڑہ) قاضی محمد اسلم سیف مرحوم اور بعض دوسرے حضرات۔

حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، عبداللہ امجد کے ماموں تھے۔ عبداللہ امجد کی شادی بھی حافظ

صاحب کی دختر نیک اختر سے ہوئی۔ حافظ صاحب اوڈاں والا سے جامعہ محمدیہ (اوکاڑہ) تشریف لے گئے تو عبداللہ امجد بھی ان کے ساتھ وہاں چلے گئے۔ جامعہ محمدیہ میں انھوں نے حافظ محمد بھٹوی سے کتب حدیث میں سے جامع ترمذی، سنن ابی داؤد اور بعض دیگر علوم کی چند کتابیں پڑھیں۔

مولانا محمد عبدہ الفلاح بھی ان دنوں جامعہ محمدیہ میں فریضہ تدریس سرانجام دینے پر مامور تھے، عبداللہ امجد کو ان سے حجۃ اللہ البالغہ، متنبّی اور شرح العقائد نسفی وغیرہ کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ جامعہ محمدیہ میں شیخ الحدیث کی مسند پر حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی متمکن تھے، ان سے صحیح بخاری، تفسیر بیضاوی اور دیگر انتہائی کتابوں کا درس لیا۔

اسی اثنا میں ۱۹۵۳ء آ گیا اور تحریک تحفظ ختم نبوت کی وہ ملک گیر لہر اٹھی کہ جگہ جگہ مرزائیت کی زور دار مخالفت شروع ہوگئی۔ حکومت مرزائیوں کی حمایت پر اتر آئی اور لوگوں نے مرزائیوں اور حکومت دونوں کے خلاف زبردست محاذ قائم کرلیا۔ گرفتاریاں ہونے لگیں اور جیلیں بھری جانے لگیں۔ اوکاڑہ میں مولانا معین الدین لکھوی اور ان کے بہت سے ساتھیوں کو گرفتار کر کے منٹگمری جیل میں بند کردیا گیا تھا۔ میں نے اور حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے جیل میں ان سے ملاقات کی تھی۔ مولانا معین الدین کے بعد مولانا عبداللہ امجد نے جو اس وقت جامعہ محمدیہ میں طالب علم تھے، اپنے متعدد رفقائے کار کے ساتھ اوکاڑہ کے علاقے میں گھوم پھر کر خوب کام کیا اور لوگوں کو مرزائیت اور مرزائیت نواز حکومت کے خلاف تحریک میں شامل ہونے کی تلقین کی اور اپنی اس شب وروز کی جدوجہد میں کامیاب رہے۔ ان کی عمر اس وقت سترہ اٹھارہ سال کی تھی۔

ایک عرصے کے بعد حالات بدلے اور تحریک بہت حد تک کامیابی سے ہم کنار ہوئی تو تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا اور مولانا عبداللہ امجد نے جامعہ کے امتحان میں شمولیت کی۔ ان کا حجۃ اللہ البالغہ کا پرچہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے تیار کیا تھا اور انھیں اس کے بہت اچھے نمبر ملے تھے۔ ایک دن لاہور میں مولانا عبداللہ امجد کو مولانا غزنوی کی خدمت میں سلام عرض کرنے کا موقع ملا تو انھوں نے فرمایا آپ یہاں آ جائیں۔ ہم آپ کے اخراجات کے ذمہ دار ہوں گے۔ کچھ کتابیں دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں حافظ محمد اسحاق صاحب سے پڑھیں اور کچھ جامعہ اشرفیہ میں۔ لیکن انھوں نے یہ کہہ کر مولانا سے معذرت کرلی کہ آئندہ سال میں جامعہ محمدیہ (اوکاڑہ) میں تدریسی خدمت بھی انجام دینا چاہتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ مولانا عبدالحنان اور مولانا عبدالقدیر سے بعض فنون کی کتابیں بھی پڑھنا چاہتا ہوں۔ مولانا نے فرمایا مولانا عبدالحنان کیمل پور والے؟ انھوں نے کہا: جی ہاں وہی۔ مولانا نے فرمایا: بس ٹھیک ہے، ضرور پڑھیے اور فریضہ تدریس بھی انجام دیجیے۔ چناں چہ انھوں نے آئندہ سال منطق کی بعض کتابیں پڑھیں۔ اس سے اگلے سال مولانا معین الدین کے کہنے سے

مستقل طور پر تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔

اس زمانے میں مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی جامعہ محمدیہ میں شیخ الحدیث کی مسند علیا پر فائز تھے۔ مولانا عبداللہ امجد نے ۱۹۵۶ء میں جامعہ محمدیہ سے سند فراغت لی تھی۔ فراغت کے بعد وہیں مدرس مقرر کر لیے گئے۔ دو سال مدرسہ خادم القرآن والحدیث جھوک دادو کے اور دو سال دارالعلوم تعلیم الاسلام اوڈاں والا کے علاوہ طالب علمی کا پورا زمانہ جامعہ محمدیہ (اوکاڑہ) میں گزارا۔ جامعہ محمدیہ ہی سے فارغ ہوئے اور جامعہ محمدیہ کی وجہ سے انھیں شہرت بھی ملی اور بے شمار علما وطلبا سے تعارف ہوا۔

جامعہ محمدیہ میں مولانا عبداللہ امجد نے چار سال سلسلۂ تدریس جاری رکھا۔ اس اثنا میں سنن نسائی، مشکوٰۃ شریف، جامع ترمذی، تفسیر جامع البیان، کافیہ، تلخیص المفتاح، الفیہ وغیرہ کتابیں پڑھائیں۔ اس کے بعد مولانا عبداللہ ویرووالوی کے کہنے پر عبداللہ امجد فیصل آباد دارالقرآن والحدیث میں چلے گئے۔ اسی سال حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی (جو جامعہ محمدیہ میں شیخ الحدیث تھے) جامعہ سلفیہ تشریف لے گئے۔

مولانا عبداللہ ویرووالوی سے بات چیت کے بعد مولانا عبداللہ امجد نے مولانا معین الدین لکھوی کو ٹیلی فون کر دیا کہ ''میں آئندہ سال فیصل آباد میں مولانا عبداللہ ویرووالوی کے مدرسہ دارالقرآن والحدیث میں تدریس کرنا چاہتا ہوں کہ یہ میرے گاؤں (چک نمبر ۳۶) کے قریب ہے۔''

مولانا عبداللہ امجد کے بقول مولانا معین الدین لکھوی نے فرمایا: ''اچھا تیری مرضی۔''

اس سے پہلے مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی کا خط مولانا معین الدین لکھوی کو پہنچا تھا کہ ''میں آئندہ سال جامعہ محمدیہ نہیں آؤں گا، آپ جامعہ کے لیے کسی شیخ الحدیث کا انتظام کر لیں۔''

مولانا معین الدین لکھوی دو مدرسوں کے اچانک جواب دینے پر پریشان تو ہوئے لیکن ان کی جگہ بعض حضرات کی خدمات حاصل کر لی گئیں۔

بہر حال چار سال مولانا عبداللہ امجد فیصل آباد کے دارالقرآن والحدیث میں پڑھاتے رہے۔ اس کے بعد حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کے فرمان کے مطابق جامعہ سلفیہ میں تشریف لے گئے۔ وہاں موطا امام مالک، مختصر المعانی اور مسلم الثبوت وغیرہ کتابیں پڑھائیں۔ ایک سال وہاں رہے۔ پھر مولانا محمد عبدہ اور مولانا معین الدین کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے جامعہ محمدیہ (اوکاڑہ) چلے گئے۔ وہاں پہلے سال صحیح مسلم، شرح عقائد نسفی، موطا امام مالک اور سنن ابی داؤد وغیرہ کتابوں کی تدریس کی۔ اس وقت مولانا محمد عبدہ جامعہ محمدیہ کی مسند شیخ الحدیث پر متمکن تھے۔ اس سے اگلے سال ۱۹۷۰ء میں مولانا محمد عبدہ نے اپنی خدمات ادارہ علوم اثریہ (فیصل آباد) کے سپرد کر دیں تو مولانا معین الدین لکھوی نے مولانا عبداللہ امجد کو جامعہ محمدیہ کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث بنا دیا۔

مجموعی طور پر انھوں نے پندرہ سال جامعہ محمدیہ میں خدمت تدریس سرانجام دی۔ کئی سال صحیح بخاری کا درس دیتے رہے۔

اس اثنا (۱۹۷۳ اور ۷۴) میں دوبارہ تحریک تحفظ ختم نبوت شروع ہوئی تو مولانا معین الدین لکھوی کو اس تحریک میں حصہ لینے کی پاداش میں حکومت نے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ ان کے بعد اوکاڑہ شہر میں اس تحریک کی قیادت مولانا عبداللہ امجد نے کی، بالآخر انھیں بھی گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا گیا۔ جیل میں اور بھی متعدد حضرات ان کے ساتھ قید تھے۔ وہاں مولانا عبداللہ امجد نے درسِ قرآن وغیرہ کا سلسلہ جاری رکھا۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد مولانا عبداللہ امجد نے جامعہ محمدیہ کی تدریس سے استعفا دے دیا اور چک نمبر ۱۴۹ ای بی (متصل عارف والا، ضلع پاک پتن) کی درس گاہ ”جامعہ اشاعت الاسلام“ میں جانے کی تیاری کر لی۔ مولانا معین الدین لکھوی نے وہاں جانے سے روکنا چاہا لیکن وہ وعدہ کر چکے تھے، اس لیے وہاں تشریف لے گئے۔

دس سال اس گاؤں میں رہے۔ پھر بعض وجوہ کی بنا پر وہاں سے مستعفی ہو گئے اور عارف والا شہر کی جماعت کے کہنے سے وہاں جا کر سلسلہ تدریس شروع کر دیا۔ ڈیڑھ سال کے بعد وہاں کی جماعت نے اتنا خرچ برداشت کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ اس کا علم چیچہ وطنی کی جماعت کو ہوا تو اس کے چند ارکان عارف والا پہنچے اور مولانا عبداللہ امجد سمیت تمام مدرسین وطلبا کو چیچہ وطنی لے گئے اور انھوں نے وہاں کی درس گاہ ”جامعہ اشاعت العلوم المحمدیہ“ میں تدریس کا آغاز کر دیا۔ ایک سال وہاں خدمت تدریس سرانجام دی۔ اس کے بعد وہاں کے حالات کے پیش نظر مولانا نے ان سے فرمایا کہ اگر وہ بعض شرائط کے مطابق انھیں آئندہ رکھنا چاہتے ہیں تو چند روز تک اس کی اطلاع دیں۔ لیکن ان کی جانب سے اطلاع نہ آئی۔

اس کے بعد رمضان شریف میں دارالدعوۃ السّلفیہ ستیانہ بنگلہ کے ناظم مولانا عتیق اللہ اور بعض دیگر حضرات نے مولانا عبداللہ امجد سے ملاقات کی اور اصرار کیا کہ وہ ستیانہ بنگلہ تشریف لے جائیں اور وہاں خدمت تدریس سرانجام دیں۔ چناں چہ چیچہ وطنی کی جماعت کی طرف سے اطلاع نہ آنے پر مولانا عبداللہ امجد نے ۲۶ یا ۲۷ رمضان کو استعفا دے دیا اور ستیانہ بنگلہ کے حضرات کی درخواست پر ان کے ہاں جانے کا وعدہ کر لیا اور وہاں جا کر خدمت تدریس سرانجام دینے لگے۔ اب تیرہ چودہ سال سے مولانا عبداللہ امجد شیخ الحدیث کی حیثیت سے دارالدعوۃ السّلفیہ ستیانہ بنگلہ (ضلع فیصل آباد) میں تشریف فرما ہیں۔ تدریس کے علاوہ ہر رمضان المبارک میں دورہ تفسیر قرآن کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں اور لوگ ان کے درسِ قرآن سے مستفید ہوتے ہیں۔ بالخصوص طلبا کے لیے یہ سلسلہ انتہائی

فائدہ رساں ہے۔

مولانا ممدوح تقریباً ۱۹۵۶ء سے شعبہ تدریس سے منسلک ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یہ بابرکت خدمت وہ پچاس سال سے زیادہ مدت سے سرانجام دے رہے ہیں۔ اس اثنا میں وہ درسی کتابیں متعدد مرتبہ پڑھا چکے ہیں۔ اب تک وہ چالیس مرتبہ صحیح بخاری شریف پڑھا چکے ہیں۔ وہ تجربہ کار مدرس ہونے کے ساتھ اچھے مقرر اور خطیب بھی ہیں۔ مناظرانہ ذہن بھی رکھتے ہیں اور مختلف مسالک کے بعض اہل علم سے ان کے مناظروں کا سلسلہ جاری رہا۔

ان کے شاگردوں کی فہرست بہت وسیع ہے۔ ان میں سے بعض حضرات کو میں جانتا ہوں اور بہت اچھی طرح جانتا ہوں، ان کی تدریسی اور تصنیفی خدمات سے بھی آگاہ ہوں۔ ان کے تحقیقی دوائر کا بھی مجھے علم ہے۔ لیکن ان کے بعض شاگردوں سے صرف اسمی تعارف ہے اور بعض سے نہ اسمی تعارف ہے، نہ رسمی......! دعا ہے اللہ تعالیٰ ان سب کو خوش رکھے اور وہ کتاب وسنت کی تبلیغ واشاعت میں مشغول رہیں۔

ان کے شاگردانِ عالی ہمت کی وسعت پذیر فہرست میں مندرجہ ذیل حضرات شامل ہیں۔

① ......مولانا ارشاد الحق اثری: پاکستان کے نامور محقق ومصنف۔ فیصل آباد

② ......مولانا حافظ عبدالعزیز علوی: شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ، فیصل آباد

③ ......مولانا حافظ عبدالکبیر: شیخ الحدیث جامعہ تعلیمات اسلامیہ، فیصل آباد

④ ......مولانا گلزار احمد: شیخ الحدیث دار القرآن والحدیث، فیصل آباد

⑤ ......مفتی عبدالحنان: جامعہ سلفیہ، فیصل آباد

⑥ ......مولانا عطاء اللہ طارق: گگو منڈی، ضلع وہاڑی۔

⑦ ......مولانا احمد علی سیف: وہاڑی

⑧ ......مولانا اسد اللہ بھامبڑوی

⑨ ......مولانا محمد صدیق۔ گہلن۔ ضلع قصور

⑩ ......مولانا عبدالرشید

⑪ ...... حافظ مقصود احمد۔ اسلام آباد

⑫ ......ڈاکٹر پروفیسر عبدالغفور راشد۔ لاہور

مولانا عبداللہ امجد کی تدریسی خدمات کے جن پہلوؤں سے یہ فقیر آگاہ تھا، ان کا تذکرہ اپنی دانست میں مناسب الفاظ میں کردیا گیا ہے۔ ان کی طالب علمی کا دور بھی ان گزارشات میں آگیا ہے، ان کے خاندانی احوال بھی بیان کردیے گئے ہیں اور تحریک تحفظ ختم نبوت میں ان کی سرگرمیوں

کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے۔

یہ فقیر اپنے آپ کو علمائے کرام کا خادم سمجھتا ہے اور اپنے فہم اور محدود معلومات کے مطابق ان کے بارے میں تھوڑا بہت لکھتا لکھاتا رہتا ہے۔ اس کی تحریر سے کوئی کیا اثر لیتا ہے، اس سے یہ خادم بے نیاز ہے۔ کوئی اتفاق کرے یا اختلاف، اس کی پروا کیے بغیر کام جاری رہتا ہے اور جاری رہنا چاہیے۔ اختلاف میں پھنس گئے تو کوئی کام بھی نہیں ہو سکے گا۔

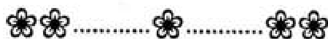
مولانا عبداللہ امجد کے جو حالات ہمیں معلوم ہوئے ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ ان کی طالب علمی کا زیادہ تر زمانہ جامعہ محمدیہ (اوکاڑہ) میں گزرا، وہاں کے اساتذہ سے انھوں نے انتہائی درسی کتابیں پڑھیں اور وہیں سے سند فراغت لی۔ وہیں سے طالب علمی کے زمانے ہی سے ان کی شہرت کا آغاز ہوا۔ پھر مدرس کی حیثیت سے بھی ان کے تعارف کا اوّلیں بیج جامعہ محمدیہ ہی کی زرخیز علمی سرزمین میں بویا گیا، جس نے آگے چل کر تناور درخت کی شکل اختیار کی، جس کے وسیع سایہ میں بے شمار لوگوں نے علمی آسودگی حاصل کی اور کر رہے ہیں۔

مولانا عبداللہ امجد چھتوی بہت اچھے مدرس ہیں اور نیک خاندان کے نیک فرد ہیں۔ اس فقیر کے قریبی رشتے دار ہیں۔ وہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں، لیکن میں ان کا بے حد احترام کرتا ہوں۔

ان کا قافلہ عمر منزلِ سبعین سے آگے نکل چکا ہے اور وہ ماشاء اللہ راہِ تدریس پر تیزی سے گام زن ہیں۔ حلیہ یہ ہے: نکلتا ہوا قد، متناسب جسم، نہ فربہی کا تسلط، نہ لاغری کا غلبہ۔ تیکھے نقوش۔ گندمی رنگ۔ سفید داڑھی یعنی چہرے پر بزرگی کا قبضہ۔ شلوار قمیص میں ملبوس۔ سر پر قراقلی ٹوپی۔ وضع دار عالم دین۔ اچھے مقرر اور خوش نوا خطیب۔

اللہ تعالیٰ تدین وصلاحیت کے اس پیکر پرخلوص کی خدمات کے دائرے کو مزید وسیع فرمائے اور انھیں صحت وعافیت کے ساتھ طویل زندگی عطا فرمائے، آمین یا رب العالمین۔

مولانا عبداللہ امجد کی اولاد بیٹے اور بیٹیاں سب تعلیم یافتہ ہیں اور سکول، کالج اور یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔



مفتی عبید اللہ خاں عفیف

مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور میں ایک گاؤں کا نام ''کُٹی بلوچاں'' تھا۔ اس گاؤں میں ایک بزرگ میاں علی محمد سکونت پذیر تھے جو اہل حدیث مسلک سے وابستہ تھے۔ ان کی تبلیغ سے وہاں کے بلوچ خاندان کے ایک فرد محمد اسماعیل نے مسلک اہل حدیث اختیار کیا۔ پھر محمد اسماعیل کو حصول علم کا شوق پیدا ہوا تو وہ لکھو کے چلے گئے جو ضلع فیروز پور کا ایک مشہور تدریسی مرکز تھا اور بہت سے ممتاز علمائے کرام نے وہاں کے اساتذہ سے تحصیل علم کی تھی۔ وہ مرکز تدریس قیام پاکستان کے بعد جامعہ محمدیہ کے نام سے اوکاڑہ میں منتقل ہوگیا تھا جو اللہ کی مہربانی سے کامیابی کے ساتھ اپنا تدریسی سفر طے کر رہا ہے۔

محمد اسماعیل خاں بلوچ نے لکھوی علمائے کرام سے استفادے کے بعد دیوبند کا رخ کیا اور وہاں کے دارالعلوم کے اصحاب علم سے فیض حاصل کرنے لگے۔ لیکن دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ کو جب یہ پتا چلا کہ محمد اسماعیل بلوچ اہل حدیث ہے اور اپنے گاؤں میں اس نے اقامت جمعہ کے فریضہ کا احیا کیا ہے تو انھوں نے ان کو دارالعلوم سے نکال دیا۔ اب وہ دہلی آگئے اور حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگردِ رشید حضرت مولانا احمد اللہ محدث پرتاپ گڑھی دہلوی کے حلقۂ درس میں شریک ہوکر ان سے کتب حدیث اور صحیح بخاری کا درس لیا اور سند حاصل کی۔ پھر وہ اپنے گاؤں کُٹی بلوچاں تشریف لائے اور بڑے بھائی میاں محمد ابراہیم خاں (متوفی ۱۹۵۴ء) کے تعاون سے مسلک اہل حدیث کی اشاعت میں سرگرم ہوگئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گاؤں کے تمام لوگوں نے یہ مسلک اختیار کرلیا۔ اس وقت علمائے احناف دیہات میں جمعہ پڑھنے کی شدید مخالفت کر رہے تھے۔ اس فریضے کی مخالفت میں انھوں نے کتابیں بھی لکھیں اور تقریروں کا سلسلہ بھی زوروں پر رہا۔ اس شدید مخالفت کے باوجود مولانا محمد اسماعیل خاں بلوچ کی تبلیغ سے اس نواح کے گیارہ دیہات میں باقاعدہ نمازِ جمعہ پڑھی جانے لگی۔ اس بلوچ عالم دین کا انتقال ۱۹۶۸ میں ہوا۔

مولانا محمد اسماعیل خاں بلوچ کے فرزند گرامی مولانا محمد حسین خاں تھے جو حضرت مولانا شرف الدین محدث دہلوی کے شاگرد اور سند یافتہ عالم دین تھے۔

انھوں نے بھی مسلک اہل حدیث کی بڑی تبلیغ کی۔ ان کا انتقال ۲۴۔ اپریل ۱۹۹۲ء کو ہوا۔

ہمارے فاضل دوست مفتی عبید اللہ عفیف انہی مولانا محمد اسماعیل خاں بلوچ کے پوتے اور مولانا محمد

حسین خاں بلوچ کے فرزند دلبند ہیں جو ۱۹۳۹ء میں بمقام گٹی بلوچاں پیدا ہوئے۔

عبیداللہ کچھ بڑے ہوئے تو سرکاری سکول میں داخل کرا دیے گئے۔ سکول میں چھ جماعتیں پاس کیں، جسے اس زمانے میں لوئر مڈل کہا جاتا تھا۔ پھر معاشی ناہمواری کی بنا پر سکول کی تعلیم چھوڑنا پڑی اور دینی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ کیوں کہ اس تعلیم سے قابلیت بڑھتی ہے اور خرچ کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ مفتی عبیداللہ عفیف نے مدرسہ نذیریہ میاں چنوں، مدرسہ خادم القرآن والحدیث جھوک دادو اور جامعہ سلفیہ فیصل آباد میں دینی تعلیم پائی۔ جامعہ سلفیہ میں وہ اس وقت طلب علم کے لیے آئے تھے، جب اس کے چند کمرے تو تعمیر ہوگئے تھے، لیکن نہ ان کمروں کے دروازے تھے، نہ چار دیواری اور بجلی تھی۔ چاروں طرف ریگستان تھا جب آندھی کا ریلا آتا تھا تو بسا اوقات رات کو بھوکے سونا پڑتا تھا۔

گھر میں یا مذکورہ بالا مدارس میں عبیداللہ عفیف نے شروع سے آخر تک جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں ① ان کے نانا میاں محمد ابراہیم خاں ② دادا مولانا محمد اسماعیل خاں ③ والدمحترم مولانا محمد حسین خاں ④ میاں حمزہ بن میاں محمد باقر ⑤ مولانا محمد حسین طور ⑥ حافظ عبداللطیف سمندری ⑦ مولانا عبدالقادر حلیم زیروی ⑧ مولانا محمد یحییٰ میاں چنوں ⑨ پروفیسر غلام احمد حریری ⑩ مولانا عبدالغفار حسن ⑪ حضرت حافظ محمد گوندلوی ⑫ مولانا عبدالحی تلمیذ مولانا حسین علی ⑬ مولانا محمد دین مردان ⑭ مولانا شریف اللہ خاں سواتی۔ مؤخر الذکر تینوں استاذ (نمبر ۱۲، ۱۳ اور ۱۴) مسلکاً حنفی تھے۔

مدارس کی تعلیم کے علاوہ مفتی عبیداللہ عفیف نے پنجاب یونیورسٹی میں فاضل عربی کا امتحان دیا۔ پھر وفاق المدارس السّلفیہ کے امتحان میں شامل ہوئے۔ ہر امتحان میں اوّل آئے۔

اب ان کی مختلف علمی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو حصول علم کے بعد جاری رہیں۔ پہلے تدریسی جدوجہد کی طرف آیئے۔

①...... ۹۔ اپریل ۱۹۶۱ کو ضلع فیصل آباد کے ایک گاؤں چک نمبر ۸۰ گ ب کے مدرسہ دارالقرآن والسنہ میں بہ طور نائب مدرس طلبا کو پڑھانا شروع کیا۔ پہلے سال ہی حدیث کی مشکوٰۃ شریف اور سنن نسائی، ادبِ عربی کی متنبی اور دیگر علوم کی کتابیں پڑھانے لگے۔ ۱۹۶۸ تک سات سال وہاں خدمتِ تدریس میں مشغول رہے۔

②...... ۱۹۶۹ء میں علامہ احسان الٰہی ظہیر اور مولانا عبدالخالق قدوسی شہید کی دعوت پر مسجد چینی والی لاہور کے مدرسے میں آگئے۔ دو سال وہاں قیام رہا۔ ۱۹۷۱ میں پہلی دفعہ اسی مسجد میں صحیح بخاری پڑھانے کا شرف حاصل ہوا۔

③...... اسی سال یعنی ۱۹۷۱ میں اوکاڑہ کے مدرسہ دارالحدیث میں چلے گئے۔ وہاں ایک سال تدریس کی۔

④...... ۱۹۷۲ کے تدریسی سال کے آغاز میں شیخ محمد اشرف (سیکرٹری مسجد چینی والی) کی دعوت پر پھر اس مسجد کے مدرسے میں آگئے۔ اب پانچ سال ۱۹۷۸ تک یہاں فریضہ تدریس انجام دیا۔

⑤...... ۱۹۷۸ کے آخر میں دارالحدیث محمدیہ عام خاص باغ ملتان کے ناظم کی دعوت پر ملتان روانہ ہوگئے۔ وہاں یہ حادثہ پیش آیا کہ ۲۱۔ مارچ ۱۹۷۹ کو ایک مقام پر درس قرآن دینے کے بعد پروفیسر عبدالحمید کے ساتھ موٹر سائیکل پر واپس آرہے تھے کہ موٹر سائیکل بے قابو ہو گیا اور مولانا عبیداللہ عفیف نیچے گر گئے، اور بایاں کندھا اتر گیا۔ کندھے کی تکلیف ابھی رفع نہ ہوئی تھی کہ اس سے چار دن بعد ۲۵ مارچ کو ایک اور حادثے میں دایاں گھٹنا بری طرح ٹوٹ گیا۔ اب چلنے پھرنے بلکہ بیٹھنے اٹھنے سے بھی عاجز آگئے تھے اور چارپائی پر لیٹے لیٹے طلبا کو پڑھاتے تھے۔ مدرسے کے اصحاب انتظام نے اپنے اس عالم و فاضل مدرس کا علاج کرانے کے بجائے ان سے یہ سلوک فرمایا کہ تدریسی سال ختم ہونے پر ماہ جون ۱۹۷۹ میں ان کو ملازمت سے جواب دے دیا اور یہ اپنی تکلیفوں کا پلندہ سر پر اٹھائے گھر آگئے۔ غالباً ایک سال ان کا ملتان میں قیام رہا۔ مولانا عبدالخالق قدوسی اور اپنے شاگرد محمد خاں نجیب کی درخواست پر بیماری کی حالت میں مولانا عبیداللہ لاہور آگئے۔ لاہور میں علامہ احسان الٰہی ظہیر نے انھیں ایک پرائیویٹ ہسپتال میں داخل کرایا اور ایک ماہر ڈاکٹر سے اپنے خرچ سے ان کا علاج کرایا، اور اللہ نے صحت عطا فرمائی۔

⑥...... جب چلنے پھرنے کے قابل ہوئے تو ۱۹۷۹ کے آخر میں تیسری دفعہ پھر مسجد چینی والی کے مدرسے میں سلسلۂ تدریس شروع کردیا۔ اب کی مرتبہ ۱۹۹۳ء تک یعنی تیرہ سال یہاں رہے۔ پھر سعودی عرب کے دارالافتا والدعوہ کے رئیس شیخ عبدالعزیز بن باز کے حکم سے مفتی عبیداللہ عفیف کو مسجد چینی والی (لاہور) کے مدرسے میں مبعوث مقرر کردیا گیا۔ کچھ عرصہ مبعوث کی حیثیت سے وہاں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ۷۔ اپریل ۱۹۹۴ کو سعودی عرب کی وزارت اوقاف اور دعوت و ارشاد نے ان کا تبادلہ جامعہ قدس اہل حدیث (چوک دال گراں لاہور) میں کردیا۔ تادم تحریر وہ جامعہ قدس اہل حدیث میں بہ طور مبعوث سعودی عرب خدمتِ تدریس سرانجام دے رہے ہیں اور اس عہد کے ممتاز مدرسوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

اب تک ۳۷ مرتبہ طلبا کو صحیح بخاری پڑھا چکے ہیں۔ یہ بہت بڑا اعزاز ہے جو انھیں اللہ کی مہربانی سے حاصل ہوا۔

تدریس کے دوران انھیں دو مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوچکی ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ

کا ان پر احسان ہے۔

تدریس کے علاوہ خطابت سے بھی انھیں دلچسپی ہے اور وہ بہت اچھے خطیب ہیں۔ تقریباً تیس برس سے ان کا شغلِ خطابت جاری ہے۔ وہ مختلف اوقات میں جامع مسجد اہل حدیث جھنگ، جامع مسجد اہل حدیث رائے ونڈ، جامع مسجد اہل حدیث عام خاص باغ ملتان، جامع مسجد اہل حدیث لسوڑے والی لاہور اور فیصل آباد کی بعض مساجد میں خطبات جمعہ ارشاد فرماتے رہے۔ ۱۹۹۸ کے رمضان المبارک سے وہ مسجد امۃ العزیز اہل حدیث (رحمت ٹاؤن فیصل آباد) میں خطابت و تولیت کا فریضہ ادا کر رہے ہیں۔ یہ مسجد خود ان کی کوشش سے تعمیر ہوئی ہے۔

مولانا مفتی عبید اللہ عفیف تحریر و نگارش کا ذوق بھی رکھتے ہیں اور بہتر اسلوب اور خوب صورت الفاظ میں اپنے ماضی الضمیر کا اظہار کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل کتابوں کے مصنف ہیں۔

① ...... پیارے نبی کی پیاری دعائیں: یہ کتاب ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

② ...... فرہنگ قرأۃ رشیدہ حصہ چہارم: یہ ایک درسی کتاب کا فرہنگ ہے۔

③ ...... مروّجہ جشن میلاد النبی کی شرعی اور تاریخی حیثیت: یہ ساٹھ صفحات کی کتاب ہے جو کئی دفعہ چھپ چکی ہے۔

④ ...... احکام جنازہ: ۹۶ صفحات کی اس کتاب میں جنازے کے احکام بیان کیے گئے ہیں اور بعض حضرات اس باب میں جن بدعات کا ارتکاب کرتے ہیں، احناف مصنفین کی کتابوں سے ان کی تردید کی گئی ہے۔ حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے اس کتاب کے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس کتاب کی موجودگی میں اس موضوع پر کسی اور کتاب کی شاید ہی ضرورت پڑے۔ مطلب یہ کہ اس موضوع سے متعلق یہ جامع کتاب ہے۔

⑤ ...... فتاویٰ عالم گیری پر ایک نظر: یہ کتاب ۱۳۰ صفحات پر مشتمل ہے جو متعدد مرتبہ طبع ہوئی۔ مکہ مکرمہ اور دہلی میں یہ بعض اضافوں کے ساتھ چھپی۔

⑥ ...... بیس رکعت تراویح کی اصلیت: یہ ایک کتابچہ ہے، جس کا مطلب اس کے نام سے ظاہر ہے۔

⑦ ...... الاجوبۃ الصحیحہ فی تردید مذہب الشیعہ: یہ غیر مطبوعہ رسالہ ہے۔

⑧ ...... فتاویٰ اہل حدیث: یہ مولانا مفتی عبید اللہ خاں عفیف کے ان فتووں کا مجموعہ ہے جو مختلف لوگوں کے استفتاء کے جواب میں متعدد اخبارات میں شائع ہوئے۔ یہ مجموعہ تین جلدوں پر مشتمل ہے اور ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ امید ہے ان شاء اللہ جلد شائع ہوگا۔ فتوے کا معاملہ نہایت اہم ہے اور وسیع مطالعے کا طالب۔!

کچھ مدت سے اہل حدیث کے تمام رسائل و جرائد میں علمائے کرام کے فتوے شائع ہو رہے ہیں۔ میرے پاس پاکستان، ہندوستان اور دیگر ممالک سے شائع ہونے والے اہل حدیث کے تقریباً تمام ہفت روزے، پندرہ روزے اور ماہنامے اخبارات و رسائل آتے ہیں اور میں ان کے مضامین و مشمولات کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتا ہوں۔ ایک یا دو صفحات کے فتوے سب رسائل میں چھپتے ہیں جو دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ مبارک باد کے مستحق ہیں یہ مفتی حضرات جو اتنی محنت سے فتوے تحریر فرماتے ہیں اور لوگ ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

ہر لائق احترام مفتی صاحب کا الگ الگ انداز نگارش اور نہج اظہار ہے اور بے حد موثر اور مبنی بر تحقیق ہے۔ مفتی عبید اللہ خاں عفیف کا بھی ایک طریق نگارش ہے جو ہمارے نزدیک قابل تعریف ہے۔

مفتی عبیداللہ عفیف کے فتاوے مختلف اوقات میں متعدد اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے جن میں ہفت روزہ الاعتصام، ہفت روزہ اہل حدیث، ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث، ماہنامہ ترجمان الحدیث، مجلّہ الدعوہ، الاخوہ، ماہنامہ صدائے ہوش شامل ہیں۔ دہلی کے اخبار ''اہل حدیث'' میں بھی ان کے بعض فتوے چھپ چکے ہیں۔ علاوہ ازیں مولانا علی محمد سعیدی نے اپنے مرتبہ ''فتاویٰ علمائے اہل حدیث'' میں ان کے بعض فتوے شائع کیے ہیں۔

مفتی عبید اللہ عفیف ہر سوال کا تفصیل سے جواب دیتے ہیں۔ ان کے اندازِ جواب کی تعریف حضرت حافظ صاحب گوندلوی، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا ابوحفص عثمانی، مولانا ابوالبرکات احمد اور مولانا محمد یوسف (راجووال) نے کی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ان کے بعض فتووں کا عربی زبان میں بعض حضرات سے شیخ عبدالعزیز بن باز نے بھی مطلب پوچھا اور اس کی تصدیق فرمائی۔ بہر حال اس انتہائی اہم موضوع سے متعلق ان کا ایک انداز بیان ہے جو قابل تحسین ہے۔

مولانا عبیداللہ عفیف ۴۴۔۴۵ سال سے شعبہ تدریس سے وابستہ ہیں۔ اس اثنا میں سیکڑوں طلبا نے ان سے حصول علم کیا۔ کسی نے ان سے زیادہ کتابیں پڑھی ہوں گی، کسی نے کم۔ ان کے دائرۂ شاگردی میں بہر حال انھوں نے شرکت کی۔ فراغت کے بعد ان میں سے بعض نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا ہوگا اور بعض خطابت و امامت کی راہ پر قدم زن ہوئے ہوں گے۔ بعض نے تصنیف و خطابت اور امامت و تالیف دونوں راہوں کو اپنایا ہوگا۔ یہ فقیر ان سب کا قدر دان ہے اور سب کی مساعی کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ میرے پاس ان کے ان تلامذہ کی جنھوں نے صحیح بخاری پڑھ کر ان سے سند حاصل کی جو فہرست پہنچی ہے، وہ تیس بتیس حضرات کی ہے۔

جن میں پاکستانی بھی ہیں اور غیر پاکستانی بھی۔ ظاہر ہے یہ فہرست سیکڑوں تلامذہ سے کشید کی

گئی ہے۔ اگر میں بھی اس میں سے کشید کرلوں تو کیا مضائقہ ہے۔ چنانچہ یہاں ان کے صرف غیر پاکستانی تلانذہ کے نام لکھے جاتے ہیں۔ پاکستانی شاگردوں میں سے اگر بعض حضرات کے نام لکھے گئے اور بعض کے نہ لکھے گئے تو وہ شاید معترض ہوں کہ ان کے کیوں نہیں لکھے۔ زیادہ نام لکھنے کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ صرف غیر پاکستانیوں کے نام ملاحظہ فرمایئے۔

① ......مولانا سراج الدین بنگالی: یہ چٹاگانگ (بنگلہ دیش) کے ایک عربی مدرسے میں مدرس ہیں۔

② ......مولانا فضل الرحمٰن بنگالی: یہ بھی چٹاگانگ کے ایک عربی مدرسے میں پڑھاتے ہیں۔

③ ......قاری روح الامین بنگالی: رکن قومی اسمبلی بنگلہ دیش۔

④ ......مولانا عبدالرشید: مبلغ و مدرس شقراء۔ سعودی عرب

⑤ ......مولانا محمد یحیٰی جیل: ملائیشیا

⑥ ......مولانا ابوحنیفہ: ملائیشیا

مولانا عبید اللہ عفیف فرماتے ہیں کہ اگرچہ تحریر وتقریر سے بھی انھیں کچھ لگاؤ ہے، لیکن ان کا طبعی میلان تدریس حدیث اور افتا کی طرف ہے۔ اس سے آگے انہی کے الفاظ پڑھیے: ''مگر افسوس ہے کہ اپنی بے بضاعتی، خام علمی اور خاندانی جھمیلوں کی وجہ سے نہ خدمت حدیث کا حق ادا کر پاتا ہوں اور نہ ملک کے اطراف واکناف سے اور بیرون ملک سے آنے والے سوالات کا بروقت جواب لکھ سکتا ہوں۔''

یہ ان کا انکسار ہے، ورنہ ماشاء اللہ وہ تدریس حدیث میں بھی سرگرم ہیں اور فتویٰ نویسی میں بھی ان کا قلم رواں دواں ہے۔

اب آئندہ سطور میں مفتی عبیداللہ عفیف کی دیگر سرگرمیوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۹۵۳ کی تحریک تحفظ ختم نبوت میں تو وہ حصہ نہیں لے سکتے تھے، اس وقت ان کی عمر صرف چودہ برس تھی۔ ان دنوں وہ شاید سرکاری سکول میں یا دینیات کے بالکل ابتدائی درجوں میں پڑھتے ہوں گے۔ البتہ تحفظ ختم نبوت کی اس تحریک میں حصہ لیا جو اس سے اکیس برس بعد ۲۹۔ مئی ۱۹۷۴ کو شروع ہوئی۔ اس وقت وہ چونتیس پینتیس برس کے جوان تھے۔ یہ خالص دینی تحریک تھی اور اس میں حصہ لینا ضروری تھا۔ تمام دینی جماعتیں اس میں سرگرم عمل تھیں۔ مفتی صاحب ممدوح اس تحریک میں بہت پرجوش تھے۔ انھوں نے مختلف شہروں اور قصبوں میں جا کر مرزائیت کے خلاف تقریریں کیں۔ جھنگ اور میاں چنوں میں ان پر مقدمات بھی قائم ہوئے۔ مگر پولیس انھیں گرفتار نہیں کرسکی۔

۱۱۔ جولائی ۱۹۷۴ کو انھوں نے یکی دروازہ لاہور میں تھانے کے قریب مسجد غوثیہ میں تحفظ ختم نبوت کے موضوع پر زوردار تقریر کی۔ اس تقریر میں انھوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کی کتاب کشتی

نوح کے حوالے سے اس کی نسوانی حرکات اور اس کے حمل وغیرہ کا تذکرہ کیا اور اس تحریر کی روشنی میں اس کے مذکر اور مونث ہونے کے بارے میں گفتگو کی۔ اس پر انھیں دفعہ ۱۶ ایم پی او کے تحت گرفتار کرکے کیمپ جیل بھیج دیا گیا۔ پھر ان کی گرفتاری کے خلاف چینی والی مسجد میں احتجاجی جلسہ ہوا، جس میں نواب زادہ نصر اللہ خاں، علامہ احسان الٰہی ظہیر اور بعض دیگر حضرات نے تقریریں کیں۔ بعد ازاں انھیں ضمانت پر رہا کردیا گیا۔ یہ مقدمہ چھ مہینے چلتا رہا۔ بالآخر عبدالمجید مجسٹریٹ کی عدالت سے انھیں بری کردیا گیا۔

رہائی کے بعد انھوں نے مرزائیت کے خلاف جامع مسجد قدس اہل حدیث (چوک دال گراں لاہور) میں تقریر کی۔ اس تقریر کے نتیجے میں انھیں پھر زیر دفعہ ۱۶ ایم پی او گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یہ مسجد سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ مقدمہ چلا اور کئی پیشیوں کے بعد عبدالمجید سٹی مجسٹریٹ کی عدالت سے بری ہوگئے۔

۱۹۷۵ کے ماہ محرم کی ابتدائی دس تاریخوں میں ٹکسالی دروازے سے موچی دروازے تک اور بھاٹی دروازے سے یکی دروازے تک ہر مسجد میں لاؤڈ سپیکر پر درس کی ممانعت کر دی گئی تھی، لیکن چینی والی مسجد میں مفتی عبیداللہ عفیف ممانعت کے باوجود لاؤڈ سپیکر پر درس دیتے تھے، جس میں صحابہ کرام اور خلفاے راشدین کے واقعات بیان کیے جاتے تھے۔ کسی نے حکومت سے شکایت کردی کہ عبیداللہ عفیف درس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت کرتے ہیں، معاملہ علاقہ مجسٹریٹ ممتاز جوئیہ کی عدالت میں گیا تو مفتی صاحب نے عدالت میں زوردار الفاظ میں اپنا دفاع کیا اور ان پر جو الزام لگایا گیا تھا اس کی تردید کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو صحیح دلائل کے ساتھ خلیفہ راشد ثابت کیا۔ تقریباً دو مہینے مقدمہ چلا۔ پھر اسی علاقہ مجسٹریٹ لاہور کی سفارش پر فیصل آباد کے ڈی سی نے ان کے تحفظ کی غرض سے ان کے لیے ریوالور کا لائسنس جاری کردیا۔

۱۹۷۷ میں مسلم لیگ، جماعت اسلامی، جمعیت علماے اسلام، پی ڈی پی اور جمعیت علماے پاکستان وغیرہ سیاسی اور نیم سیاسی جماعتوں نے جمہوریت کے خلاف تحریک شروع کی، جس میں بعض اہل حدیث حضرات بھی شامل ہوگئے۔ اس تحریک کے نتیجے میں ضیاء الحق نے مارشل لا نافذ کردیا اور وہ ڈکیٹر کی حیثیت سے ملک پر قابض ہوگیا۔ پھر اس نے جو حکومت بنائی، اس میں فوجی جرنیلوں کے علاوہ جماعت اسلامی، جمعیت علماے اسلام، جمعیت علماے پاکستان، پی ڈی پی اور مسلم لیگ کو بھی نمائندگی دی گئی اور ان جماعتوں میں سے دو دو تین تین آدمیوں کو وزیر بنا لیا گیا، لیکن اہل حدیث کے حصے میں صرف ڈنڈے اور دھکے آئے۔ وہ جماعتیں سیاست کے نشیب و فراز کو سمجھتی تھیں اور اقتدار میں آگئیں۔ اہل حدیث چوں کہ سیاسی چالیں نہیں جانتے اس لیے ان کے ساتھ

وہی کچھ ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔

اس خلافِ جمہوریت تحریک میں ہمارے ممدوح مولانا مفتی عبیداللہ خاں عفیف نے بھی حصہ لیا اور جیل گئے اور جو مار کھائی اور زخم سہے، اس کا علاج بھی اپنی گرہ سے کراتے رہے۔ اس تحریک کا نام احمد شاہ نورانی نے نظامِ مصطفیٰ رکھا تھا، جس کا نہ کوئی نظام تھا اور نہ اس میں مصطفیٰ (ﷺ) کے عمل و فرمان کے ہم آہنگ کوئی بات تھی۔ یہ محض جمہوری نظام کو ختم کرنے کی تحریک تھی، جس کی وجہ سے جاہ پسند ضیاء الحق نوے دن کے وعدے پر آیا، اور گیارہ سال لوگوں کی گردن پر سوار رہا۔

۱۹۸۱ (صفر ۱۴۰۲ھ) میں محمد خان نجیب شہید نے مروّجہ میلاد النبی کے متعلق چند سوالات لکھ کر مفتی عبید اللہ خاں کی خدمت میں پیش کیے۔ انھوں نے ان سوالات کے جو جواب دیے وہ اہل حدیث یوتھ فورس نے کتابی شکل میں شائع کردیے اور یہ چھوٹی سی کتاب حکومت کے تمام بڑے بڑے لوگوں کو بھیج دی۔ یہ ضیاء الحق کا زمانہ تھا۔ مفتی صاحب کے خلاف تھانہ ٹکی دروازہ میں زیر دفعہ ۵۰۵ اے ۱۵۳ مقدمہ درج ہوگیا۔ اس موقع پر مفتی صاحب گرفتار تو نہ ہوئے لیکن کچھ عرصہ مقدمہ چلتا رہا جو بالآخر ختم ہوگیا۔

بے شبہ مولانا مفتی عبید اللہ خاں عفیف جید عالم، صاحب تحقیق مفتی، تجربہ کار مدرس اور اچھے مقرر ہیں۔ تدریس وافتا کے سلسلے میں ان کی کاوشیں بالخصوص لائق تحسین ہیں۔ بے شمار علما وطلبا نے ان کے خرمن علم سے خوشہ چینی کی ہے اور اللہ کے فضل سے ان کے فیض یافتہ علمائے کرام مختلف مقامات میں خدمت دین میں مشغول ہیں۔ پھر آگے ان کے شاگردوں کے شاگرد بھی اشاعت دین میں مصروف ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مفتی عبید اللہ خاں عفیف کو اور ان کے تلانذۂ کرام کو صحت و عافیت کے ساتھ کتاب و سنت کی خدمت کے زیادہ سے زیادہ مواقع عطا فرمائے۔

مفتی صاحب کا اصل کام تدریس ہے اور تدریس سے انھیں بے حد دلچسپی ہے۔ انھیں اس کام میں مشغول رہنا چاہیے۔ حدیث کی تمام کتابوں پر ان کی گہری نظر ہے اور شروحِ حدیث سے بھی یہ خوب آگاہ ہیں۔ قلم میں بھی اللہ نے صفائی اور زور عطا فرمایا ہے۔ فتویٰ نہایت وضاحت سے تحریر فرماتے ہیں۔ میرا ان سے برسہا برس سے تعلق ہے۔

اس عالم دین کا حلیہ یہ ہے: پورا قد، قدرے فربہ جسم، گول چہرہ، سارے چہرے پر پھیلی ہوئی سفید داڑھی، گندمی رنگ، کھنک دار آواز۔ سادہ لباس۔ ملنسار اور خوش گفتار۔ دوستوں کے دوست۔



حافظ عبدالمنان نورپوری

۲۳۔اپریل ۲۰۰۱ کو حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے داماد جناب قاری سیف اللہ صاحب نے حافظ آباد کے قریب اپنے گاؤں جگاں والا میں وفات پائی۔علمی لحاظ سے قاری صاحب مرحوم اپنے علاقے کی بااثر شخصیت تھے۔حافظ آباد میں انھوں نے دینی تعلیم کا مدرسہ بھی قائم کیا ہے۔ان کے جنازے میں کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔جس عالم دین نے جنازہ پڑھایا، ان کا حلیہ یہ تھا: قد میانہ، سرخی مائل گورا رنگ، ستواں چہرہ جس پر سنجیدگی کا غلبہ، تیکھی ناک، خاموش طبع، پوری داڑھی جس میں سفید بال زیادہ اور سیاہ کم، سر پر سفید عمامہ اور شلوار قمیص پہنے ہوئے۔ میں انھیں دیکھ کر نہایت متاثر ہوا۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ ان کا اسم گرامی حافظ عبدالمنان نورپوری ہے۔ واقعی ان کے چہرے پر نور کی جھلکیاں تھیں جو اس گنہگار کو بھی اپنا جلوہ دکھا رہی تھیں۔ میں نے ان کا نام تو کئی دفعہ سنا تھا اور بہت سے اہل علم نے بہت اچھے الفاظ میں ان کا ذکر کیا تھا، لیکن افسوس ہے مجھے ان کی زیارت کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا۔آج پہلی دفعہ ان کو دیکھنے کی سعادت سے بہرہ مند ہوا۔

اب حافظ عبدالمنان نورپوری کے وہ حالات ملاحظہ فرمائیے جو میرے علم میں آئے۔

حافظ صاحب ۱۳۶۰ھ (۱۹۴۱) کو نور پور چہل (ضلع گوجراں والا) میں پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر کو پہنچے تو والدہ وفات پا گئیں۔ ان کے تین بھائی اور تھے، دو ان سے بڑے اور ایک چھوٹے۔ والد کا اسم گرامی عبدالحق تھا۔ والد نے عبدالمنان کو گاؤں کے پرائمری سکول میں داخل کرادیا۔ سکول میں ان کے ایک استاد مولوی غلام رسول تھے جو بچوں کو بڑی توجہ اور محنت سے پڑھاتے تھے۔

نور پور کی جامع مسجد اہل حدیث کے خطیب اور بانی مولوی چراغ دین تھے جن سے حافظ عبدالمنان قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا کرتے تھے۔ پرائمری پاس کر چکے تو مولوی چراغ دین نے ان کے والد عبدالحق سے پوچھا کہ آپ بچے کو ہائی سکول میں داخل کرانا چاہتے ہیں یا نہیں؟ انھوں نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر مولوی چراغ دین نے کہا کہ اگر آپ نہیں پڑھانا چاہتے تو یہ بچہ ہمیں دے دیں۔ اس کی تعلیم کا انتظام ہم کرلیں گے۔ چنانچہ انھوں نے عبدالمنان کو ان کے والد سے لیا اور گوجراں والا میں حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کے (دارالعلوم) مدرسہ محمدیہ میں داخل کرادیا۔ اس

وقت حضرت مولانا سلفی کے علاوہ مدرسے میں تین استاد اور تھے اور وہ تھے مولانا عبداللہ گجراتی، مولانا عبدالحمید ہزاروی اور مولانا محمد وزیر پونچھی۔ یہ ۱۳۷۶ھ (۱۹۵۷ء) کی بات ہے۔

مولوی چراغ دین نور پوری نہایت عالی کردار عالم دین تھے۔ انھوں نے والدین کو ترغیب دلا کر بہت سے بچوں کو دینی تعلیم کے حصول کی راہ پر لگایا۔ حافظ عبدالمنان کا شمار بھی انہی خوش بخت بچوں میں ہوتا ہے جنھوں نے مولوی چراغ دین کی کوشش سے تحصیل علم کی۔

یہاں یہ بھی سنتے جائیے کہ حافظ عبدالمنان کا نام والدین نے پیدائش کے وقت خوشی محمد رکھا تھا۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی نے اپنے استاد حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے نام پر ان کا نام عبدالمنان رکھا اور پھر اسی نام سے انھوں نے شہرت پائی اور اپنے عمل وعلم سے اس نام کی لاج بھی رکھی۔

مدرسہ محمدیہ گوجراں والا میں اس وقت چھ سال کا نصاب تعلیم تھا جو حافظ عبدالمنان نے وہیں مکمل کیا۔ حفظ قرآن اور تجوید کا نصاب اس کے علاوہ تھا، جس کی انھوں نے تکمیل کی۔ نماز فجر کے بعد حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کا درس قرآن کا سلسلہ جاری تھا، اس میں بھی حافظ صاحب باقاعدہ شریک ہوتے رہے۔

حافظ عبدالمنان نور پوری کے بقول مولانا سلفی کے درس کا طریقہ یہ تھا کہ وہ عربی تفسیر جامع البیان اپنے سامنے رکھتے تھے جب کہ سامعین کے سامنے سادہ قرآن مجید ہوتے تھے۔ مولانا جامع البیان سے قرآن مجید کی چار پانچ آیات تلاوت کرتے۔ پھر ان کا اردو میں ترجمہ فرماتے۔ بعد ازاں پنجابی زبان میں ان کی تفسیر بیان کرتے۔ تفسیر میں بسا اوقات حالاتِ حاضرہ بھی معرضِ بیان میں آجاتے۔ مولانا سلفی کا درس قرآن کا انداز نہایت معلومات افزا اور حکیمانہ ہوتا تھا۔ مولانا کو قرآن مجید پر بہت استحضار تھا اور نہایت شوق اور اہتمام سے وہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے۔ بعض اوقات وہ نماز تراویح میں قرآن سنانے والے حافظ کو بھی لقمہ دیتے تھے اور وہ لقمہ بالکل صحیح ہوتا تھا۔

مولانا سلفی سے ملاقات کے لیے علمائے کرام کی آمد رفت رہتی تھی۔ بعض حضرات کو وہ اپنے ہاں رات کو بھی ٹھہرا لیا کرتے تھے اور ان سے نماز فجر کے بعد درس کے لیے بھی درخواست کرتے تھے۔ حافظ عبدالمنان نور پوری کے بقول ان حضرات میں سے دو بزرگ مولانا سلفی کی طرح جامع البیان سے درس قرآن دیتے تھے۔ وہ تھے حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور مولانا عبداللہ ثانی۔ باقی علمائے کرام کا درس قرآن کا انداز اپنا تھا۔

حافظ عبدالمنان صاحب کے زمانہ طالب علمی میں درس قرآن کے بعد مولانا محمد اسماعیل

صاحب سے ایک طالب علم حاجی غلام نبی صاحب حدیث شریف کی ایک کتاب پڑھتے تھے۔ ان کے ساتھ حافظ صاحب نے بھی پڑھنا شروع کر دیا۔ اس طرح انھوں نے جامع ترمذی، صحیح مسلم، مؤطا امام مالک اور صحیح بخاری تک کتب احادیث مولانا ممدوح سے پڑھیں۔ صحیح بخاری کے درس میں مولانا محمد منشا حامد (خطیب جامع مسجد اہل حدیث فردوس الرحمٰن گوجراں والا) بھی ان کے ساتھ تھے۔

حافظ صاحب نے مولانا سے سند روایت کی درخواست کی تو مولانا نے فرمایا آج تک نہ مجھ سے کسی نے سندِ روایت لی ہے اور نہ میں نے سندِ روایت طبع کرائی ہے۔ انھوں نے مولانا سے عرض کیا کہ قدیم محدثین امام احمد بن حنبل، امام اسحاق بن راہویہ اور امام بخاری وغیرہ محدثین کی اسانید مطبوع نہیں تھیں۔ آپ ہمیں اپنے ہاتھ سے سند تحریر فرما دیں، ہم اسے خوش خط لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔ آپ اس پر دستخط کر دیں اور مہر لگا دیں۔ چنانچہ حافظ صاحب نے بازار سے خوب صورت کاغذ لیا اور خوب صورت طریقے سے مولانا کی تحریر فرمودہ سند کے الفاظ اس پر لکھے اور ان دونوں (حافظ صاحب اور مولانا محمد منشا حامد) نے مولانا سے دستخط کروائے اور مہر لگوائی۔ مولانا کی عطا فرمودہ یہ سند حافظ صاحب کے پاس موجود ہے۔

حافظ صاحب ہمیشہ مصروفِ کار رہے، انھوں نے کبھی وقت ضائع نہیں کیا۔ ۱۳۷۸ھ (۱۹۵۹ء) میں رمضان المبارک کی سالانہ چھٹیاں ہوئیں تو اپنے گاؤں کے ایک خیاط (درزی) سے خیاطت (سلائی کا کام) سیکھا۔

حافظ صاحب کا خط (ہینڈ رائٹنگ) بہت اچھا ہے۔ انھوں نے یہ فن باقاعدہ تختی پر لکھ کر گوجراں والا میں مولانا عبدالواحد اور پھر حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کے فرمان کے مطابق حکیم عبدالمجید صاحب سے سیکھا۔ یہ ۱۳۷۹ھ (۱۹۶۰) کی تعطیلات کے زمانے کی بات ہے۔ اس سے اگلے سال ۱۳۸۰ (۱۹۶۱) کی سالانہ تعطیلات کے دنوں میں حافظ عبدالمنان صاحب نے قاری محمد یونس پانی پتی کی خدمت میں جا کر ان سے قرآن مجید صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنے کی مشق کی۔ اس اثنا میں قاری صاحب ممدوح نے ان کو قرآن مجید کے دو پارے حفظ بھی کرائے۔

۱۳۸۱ (۱۹۶۲) کی تعطیلاتِ رمضان المبارک میں میاں چنوں کے مولانا محمد داؤد ارشد مرحوم نے اعلان کیا کہ ان کی مسجد میں طلبا کو تجوید قرآن پڑھانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ اعلان پڑھ کر حافظ عبدالمنان نور پوری میاں چنوں چلے گئے اور قاری ولی محمد سے تجوید کی کتاب جمال القرآن پڑھی۔ کچھ قواعد ان سے زبانی سنے۔ پھر قرآن مجید کی تلاوت کی مشق کی اور حروف تہجی کی ترتیب سے ایک جدول (یا نقشہ) تیار کیا۔ اس کے آخر میں عربی زبان میں ایک توضیحی نوٹ لکھا۔ موضع عبدالحکیم سے قاری تاج محمد امتحان کے لیے تشریف لائے تو قاری ولی محمد نے ان کو یہ جدول دکھایا۔ وہ

ت خوش ہوئے اور اس کے نیچے تقریظ لکھی اور اس پر مہر ثبت فرمائی۔

۱۳۸۲ھ (۱۹۶۳) کی سالانہ تعطیلات میں حافظ عبدالمنان جامعہ قدس (لاہور) میں حضرت افظ عبداللہ روپڑی کے دورۂ تفسیر میں شامل ہوئے اور قرآن کی تفسیر کے سلسلے میں ان سے استفادہ یا۔ اسی سال کے شعبان کی بات ہے کہ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی نے صبح کے درس قرآن کے عد سالانہ امتحان کے نتائج کا اعلان فرمایا تو گوجراں والا کی جماعت کے ایک بزرگ حاجی محمد یوسف ن سوتری والے نے کہا کہ امتحان میں اوّل آنے والے طالب علم کو وہ پچاس روپے انعام دیں گے۔ حافظ عبدالمنان صاحب امتحان میں اوّل آئے اور حاجی محمد یوسف صاحب نے مولانا محمد سماعیل سلفی کی وساطت سے ان کو پچاس روپے انعام دیے۔

پھر حالات نے پلٹا کھایا اور مولانا عبداللہ گجراتی نے جامع مسجد اہل حدیث (دال بازار، گوجراں والا) میں "دارالحدیث مدینۃ العلم" کے نام سے اپنا الگ دارالعلوم جاری کرلیا۔ اس میں حضرت حافظ محمد گوندلوی اور بعض دیگر حضرات کی خدمات بھی حاصل کرلی گئیں۔ اس دارالعلوم میں حافظ عبدالمنان نور پوری نے بھی داخلہ لے لیا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ابتدائی درجوں کے طلبا کو حافظ صاحب ابتدائی کتابیں پڑھایا کریں گے اور خود حضرت حافظ صاحب گوندلوی سے صحیح بخاری پڑھیں گے۔ چنانچہ اس فیصلے کے مطابق عمل کا آغاز ہوگیا۔ اس دارالعلوم کی انتظامیہ کا نام "اخوانِ اہل حدیث" رکھا گیا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد ایک بزرگ حاجی غلام محمد رنگ والے نے دارالعلوم کے لیے جی ٹی روڈ پر یک ایکڑ زمین دے دی اور وہاں چند کمرے تعمیر کرکے تدریس کا سلسلہ شروع کردیا گیا۔ اب دال بازار کی مسجد سے دارالعلوم وہاں چلا گیا اور اس کا نام "دارالحدیث مدینۃ العلم" کے بجائے حضرت حافظ صاحب گوندلوی کی تجویز سے "جامعہ شرعیہ" رکھا گیا۔ ۲۰ فروری ۱۹۶۸ کو حضرت مولانا محمد سماعیل وفات پاگئے تو جامعہ شرعیہ کو مدرسہ محمدیہ میں مدغم کردیا گیا اور اسے جامعہ شرعیہ کے بجائے "جامعہ محمدیہ" کہا جانے لگا۔ یعنی جامعہ شرعیہ ختم کردیا گیا۔

فیصلہ کیا گیا کہ حفظ و تجوید اور ناظرہ قرآن کا شعبہ بہ دستور مدرسہ محمدیہ چوک نیائیں میں رہے گا اور درس نظامی کا شعبہ جامعہ محمدیہ جی ٹی روڈ میں چلا جائے گا۔ جامعہ محمدیہ (جی ٹی روڈ) میں اساتذہ تھے خود مولانا عبداللہ گجراتی، مولانا ابوالحسن جمعہ خاں ہزاروی، مولانا بشیر الرحمٰن نور پوری اور حافظ عبدالمنان نورپوری۔! مدرسہ محمدیہ چوک نیائیں کے اساتذہ تھے شیخ الحدیث مولانا عبدالحمید ہزاروی، حافظ عبدالسلام بھٹوی اور مولانا حافظ محمد رفیق جھجھوی۔ کچھ عرصے کے بعد حافظ عبدالسلام بھٹوی نے استعفادے کرکے مدرسہ محمدیہ سے علیحدگی اختیار کرلی اور مولانا جمعہ خاں ہزاروی وفات

پاگئے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب جامعہ شرعیہ کو جامعہ محمدیہ میں مدغم کیا گیا تھا۔ اس کے بعد جامعہ محمدیہ میں درسِ نظامی کے اور اساتذہ کا تقرر بھی کیا گیا۔ نیز حفظ و تجوید اور ناظرہ کے اساتذہ کا سلسلہ بھی یہی رہا کہ بعض آئے اور بعض گئے۔

ذیل میں شروع سے لے کر آخر تک حافظ عبدالمنان نورپوری کے تمام اساتذہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس فہرست میں جو چھبیس حضرات پر مشتمل ہے، ان کے چھوٹے بڑے تمام استاد شامل ہیں۔ ترتیب کچھ اس طرح ہے۔

① ...... مولوی چراغ دین نورپوری: یہ حافظ عبدالمنان نورپوری کے ابتدائی دور کے نہایت شفیق استاد تھے۔ ان سے وہ اپنے گاؤں کی مسجد میں قرآن مجید با ترجمہ پڑھتے رہے۔ ان کے اندازِ تربیت سے حافظ صاحب ممدوح بہت متاثر ہیں۔

② ...... مولوی غلام رسول ساکن پھلوکی: ان سے انھوں نے نورپور کے پرائمری سکول میں نصاب کے مطابق ''ہمارا حساب'' کتاب پڑھی۔

③ ...... ماسٹر نذیر احمد: یہ بھی ان کے پرائمری سکول کے استاد تھے۔

④ ...... ماسٹر عبدالمنان راز: ان سے جامع مسجد اہل حدیث (دال بازار) میں چھٹی جماعت کی انگریزی کی کتاب پڑھی۔

⑤ ...... حکیم نذیر احمد جنڈیالوی: گوجراں والا کے تھانے والے بازار میں ان کا مطب تھا۔ حافظ صاحب نے ان سے طب کی کتاب شرح اسباب پڑھی۔

⑥ ...... حکیم عبدالمجید: یہ ہمارے نہایت مہربان بزرگ تھے اور مولانا محمد اسماعیل سلفی کے چچا زاد بھائی تھے۔ چوک نیائیں کی اونچی مسجد کی ایک دکان میں ان کا مطب تھا۔ حافظ صاحب ان سے خوش خطی سیکھتے رہے۔

⑦ ...... مولوی عبدالواحد: یہ بمباں والی کے رہنے والے تھے اور کاتب تھے۔ جامعہ محمدیہ چوک نیائیں کی دکانوں میں ان کی ایک دکان تھی۔ حافظ صاحب نے ان سے کچھ عرصہ کتابت کا فن سیکھا۔

⑧ ...... غلام محمد درزی: یہ نورپور کے رہنے والے تھے۔ حافظ صاحب نے ان سے اپنے گاؤں میں سلائی کا کام سیکھا۔

⑨ ...... خواجہ حافظ محمد قاسم: حافظ عبدالمنان نورپوری نے مدرسہ محمدیہ چوک نیائیں میں ان سے القرأۃ الرشیدہ کا تیسرا حصہ پڑھا۔

⑩ ...... مولانا عبدالحمید گجراتی: ان سے حافظ صاحب نے جامع مسجد اہل حدیث (دال بازار) میں شرح جامی، قطبی، میر قطبی، سعدیہ، رشیدیہ اور ہدیہ سعدیہ کتابیں پڑھیں۔

⑪...... مولانا غلام رسول گجراتی: ان سے علم صرف کی کتاب حاشیہ عبدالغفور پڑھی۔

⑫...... قاری ولی محمد: ان سے مولانا محمد داؤد ارشد کی جامع مسجد اہل حدیث میاں چنوں میں تجوید کے موضوع کی کتاب جمال القرآن پڑھی۔ کچھ قواعد زبانی سنے اور تلاوتِ قرآن کی مشق کی۔

⑬...... قاری محمد یونس پانی پتی: ان سے ان کے مدرسے کچے دروازے میں الفاظ قرآن کو صحیح طریقے سے پڑھنے کی مشق کی اور دو پارے حفظ کیے۔

⑭...... مولانا عزیز الرحمٰن ایبٹ آبادی: جامع مسجد اہل حدیث دال بازار میں ان سے سلّم العلوم اور جامعہ محمدیہ (جی ٹی روڈ) میں ہدایۃ الحکمۃ اور میبذی دو کتابیں پڑھیں۔

⑮...... مولانا ابوالحسن جمعہ خان ہزاروی: ان سے جامعہ محمدیہ (جی ٹی روڈ) میں حافظ عبدالمنان نورپوری نے جو درسی کتابیں پڑھیں وہ یہ ہیں تفسیر بیضاوی، الفوز الکبیر، شمس بازغہ، صدرا، ملاحسن، حمداللہ، مسلم الثبوت، توضیح تلویح، تاریخ الادب العربی، محیط الدائرہ، تحریر اوقلیدس، شرح تہذیب از ملا جلال، حاشیہ میر زاہد، خیالی، شرح مواقف، مطوّل، تصریح، شرح چغمینی وغیرہ۔

⑯...... علامہ احسان الٰہی ظہیر: ان سے مسجد اہل حدیث دال بازار میں حافظ صاحب ممدوح نے تین کتابیں پڑھیں رشیدیہ، دیوان حماسہ اور شرح عقائد، یہ معلوم نہیں کہ یہ تینوں کتابیں پوری پڑھیں یا ان کے کچھ حصے پڑھے۔

⑰...... مولانا عبداللہ امجد چھتوی: جامعہ محمدیہ (جی ٹی روڈ) میں ان سے دورۂ مناظرہ پڑھا۔

⑱...... مولانا عبدالرحمٰن لکھوی: یہ بھی جامعہ محمدیہ (جی ٹی روڈ) میں حافظ صاحب کے استاذ تھے۔ ان سے دو کتابیں پڑھیں۔ قاضی مبارک اور خلاصۃ الحساب۔

⑲...... مولانا محمد وزیر پونچھی: یہ مدرسہ محمدیہ چوک نیائیں میں پڑھاتے تھے اور حافظ صاحب کے زمانہ طالب علمی کے ابتدائی عہد کے استاذ تھے۔ ان سے یہ کتابیں پڑھیں: سنن ابن ماجہ۔ چھٹی جماعت کی کتاب فارسی، عربی کا معلم، نحومیر، صرف میر، میزان الصرف، صرف بہائی، نخبۃ الاحادیث اور درجات الادب۔

⑳...... شیخ الحدیث مولانا عبدالحمید ہزاروی: جامعہ محمدیہ چوک نیائیں میں ان کے سامنے جن کتابوں کے لیے حافظ صاحب نے زانوئے شاگردی تہ کیے۔ ان میں حدیث، فقہ، صرف ونحو، منطق، ادبِ عربی اور فارسی وغیرہ علوم کی متعدد کتابیں شامل ہیں، جن کے نام یہ ہیں: گلستاں، بوستاں، فصول اکبری، شافیہ، مراح الارواح، علم الصیغہ، ہدایۃ النحو، کافیہ، الفیہ ابن مالک، شرح ابن عقیل، شرح نخبہ، مقدمہ ابن الصلاح، مجموعہ منطق، مرقاۃ، شرح تہذیب، قطبی، سنن نسائی، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، مؤطا امام مالک، صحیح مسلم، صحیح بخاری، نورالایضاح، قدوری، شرح وقایہ،

کنز الدقائق، ہدایہ، تلخیص المفتاح، مختصر المعانی، القرأۃ الرشیدہ، (اول، دوم، چہارم) نفحۃ الیمن، سبعہ معلقہ، دیوان الحماسہ، کلیلہ دمنہ، مقامات حریری، دیوان متنبی، اصول شاشی، نورالانوار، حسامی وغیرہ۔

حافظ عبدالمنان نورپوری نے شیخ الحدیث مولانا عبدالحمید ہزاروی سے بہت استفادہ کیا اور بے شبہ مولانا ہزاروی تفسیر، حدیث اور دیگر علوم متداولہ میں مہارت رکھتے ہیں اور ان کے وسعت پذیر حلقۂ تدریس سے بے شمار علما و طلبا نے حصولِ فیض کیا۔ ان شاء اللہ کسی مجموعے میں ان پر مستقل مضمون لکھا جائے گا۔

(۲۱)...... مولانا عبداللہ گجراتی: ان سے جامعہ محمدیہ چوک نیائیں میں ابواب الصرف، بلوغ المرام، مشکوٰۃ شریف اور تفسیر جامع البیان پڑھیں۔ ڈال بازار کی مسجد میں ان سے بدایۃ المجتہد اور سراجی دو کتابیں پڑھیں۔

(۲۲)...... حافظ عبداللہ بڈھیمالوی: ان سے جامع مسجد اہل حدیث کورٹ روڈ کراچی میں دورۂ تفسیر پڑھا اور سند اجازہ حاصل کی۔

(۲۳)...... مولانا حافظ عبداللہ روپڑی: ان سے جامع مسجد قدس (لاہور) میں دورۂ تفسیر پڑھا اور اس کی سند لی۔

(۲۴)...... مولانا محمد اسماعیل سلفی: ان سے حافظ عبدالمنان نورپوری نے مدرسہ محمدیہ چوک نیائیں میں حصول فیض کیا۔ چھ سال ان کی خدمت میں رہے۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی اور موطا امام مالک ان سے پڑھیں۔ نمازِ فجر کے بعد بالالتزام ان کا درس قرآن سنتے رہے۔ اردو سے عربی ترجمہ کرکے بھی انھیں دکھاتے اور ان سے اصلاح لیتے رہے۔ ان سے انھوں نے سندِ روایت حاصل کی۔ مولانا سلفی جلیل القدر عالم، بہت بڑے مقرر اور مشہور مدرس تھے۔ ان سے فیض پانے والوں کا حلقہ بے حد وسیع ہے۔ حضرت مولانا سے متعلق اس فقیر نے اپنی کتاب "نقوش عظمت رفتہ" میں طویل مضمون لکھا ہے۔ ان شاء اللہ ان کے تفصیلی حالات میں ایک مستقل کتاب لکھی جائے گی۔

(۲۵)...... حضرت مولانا حافظ محمد گوندلوی: مسجد اہل حدیث دال بازار (گوجراں والا) میں حافظ عبدالمنان نے حضرت حافظ صاحب سے تحفۃ الاخوان پڑھی اور جامعہ محمدیہ (جی ٹی روڈ) میں قرآن مجید کی تفسیر اور دو دفعہ صحیح بخاری پڑھی۔

حافظ عبدالمنان نور پوری نے ابتدائے طالب علمی سے لے کر انتہائی کتابوں تک تعداد کے اعتبار سے پچیس اساتذہ سے استفادہ کیا۔ ان میں سے کسی سے کسی موضوع کی کتابیں پڑھیں، کسی سے کسی موضوع کی۔ پھر کسی سے زیادہ کتابیں پڑھنے کا موقع ملا، کسی سے کم۔ کسی سے کسی کتاب کا ایک حرف بھی نہیں پڑھا، بعض کام سیکھے۔ لیکن انھیں اساتذہ کی جماعت میں شمار کیا۔ یہ ان کی اخلاقی

برتری کی علامت ہے۔ حافظ صاحب اپنے چھوٹے بڑے تمام اساتذہ کا ذکر بے حد احترام سے کرتے ہیں۔ اساتذہ کے علاوہ دیگر علمائے کرام کے نام بھی بڑی تکریم سے لیتے ہیں۔ وہ تمام مسالک فقہ کے اہل علم کا تذکرہ احترام کے لہجے میں کرتے ہیں۔ یہ بہت بڑی خوبی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو ودیعت فرمائی ہے۔ ہمارے اسلاف کا یہی طریقہ تھا اور اسی پر عمل ہونا چاہیے۔ یہ فقیر اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس پر عمل کی پوری کوشش کرتا ہے اور تمام اہل علم کا احترام اس کے نزدیک ضروری ہے۔ حتی الامکان میں نے ہمیشہ ہر چھوٹے بڑے صاحب علم کی تکریم کی ہے۔ اگر میری جماعت کے کسی عالم نے کبھی میرے متعلق کچھ لکھا تو میں نے اس کا جواب نہیں دیا۔ البتہ اگر کسی نے میری جماعت، میرے مسلک یا میری جماعت کے کسی بزرگ پر حملہ کیا اور اس کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال کیے تو میں نے اسے ہرگز معاف نہیں کیا۔ ایسے مواقع پر خاموش رہنا میری فطرت کے خلاف اور میرے قلم کی غیرت کے منافی ہے۔ لیکن اس میں بھی میں نے ہر موقعے پر حدودِ احترام کو ملحوظ رکھا ہے۔

یہ بات میں نے مولانا محمد حنیف ندوی مرحوم و مغفور سے سیکھی ہے۔ ان کے متعلق بعض حضرات نے بعض باتیں لکھیں، لیکن انھوں نے کسی کا جواب نہیں دیا۔ اگر کسی نے اس کی طرف انھیں توجہ دلائی تو فرمایا کہ ہمارا یہ حضرات کیا لیتے ہیں۔ اگر اس سے انھیں راحت محسوس ہوتی ہے تو ہمیں خوش ہونا چاہیے کہ ہماری وجہ سے انھیں سکونِ قلب حاصل ہوا۔ ان کی وفات پر بیس برس گزر چکے ہیں، لیکن اب بھی بعض لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں۔ ان کی کتابیں تفسیر سراج البیان، مطالعہ قرآن اور بعض دیگر تصانیف ہندوستان کی جماعت اہل حدیث کے بعض مکتبے شائع کر رہے ہیں۔

حافظ عبدالمنان صاحب کی اخلاقی بلندی کے سلسلے میں مولانا محمد حنیف ندوی کے متعلق یہ ایک ضمنی سی بات تھی جو زبان قلم پر آ گئی۔ اب آئندہ سطور میں حافظ صاحب کی تصنیفی اور تحریری خدمات پر ایک نظر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

① ...... ارشاد القاری الیٰ نقد فیض الباری: حضرت حافظ محمد گوندلوی نے مولانا انور شاہ کاشمیری کی ''فیض الباری'' پر تنقیدی نوٹ لکھے تھے، جنھیں حافظ عبدالمنان نورپوری نے جمع کیا اور ان پر مفید اضافے کیے۔ کتاب العلم کے ''باب من اجاب الفتیا باشارۃ الید'' تک کام مکمل کر کے حضرت حافظ صاحب گوندلوی کی خدمت میں پیش کیا تو انھوں نے اس کی تحسین فرمائی اور بعض مقامات کی تصحیح کی۔ اور لکھا: ''وان تم کان مفیدا للطلبۃ وارجوا ان یوفقہ اللہ تعالٰی للاتمام۔''

محمد الگوندلوی۔ ۱۴۰۰/۵/۶۔

چنانچہ حافظ عبدالمنان صاحب نے اس کام کو جاری رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب تک اس کی

تین ضخیم جلدیں چھپ چکی ہیں۔

ہر نقد کی ترتیب کچھ اس طرح ہے۔

☆ ......قال: یہ مولانا انور شاہ کاشمیری کی فیض الباری کا اقتباس ہے۔

☆ ......اقول: اس کے قائل حضرت حافظ گوندلوی ہیں۔

☆ ......یقول: یہ حافظ عبدالمنان صاحب کے زوائد ہیں۔

☆ ......بعض الناس: اس سے گوجراں والا کے کچھ لوگ مراد ہیں۔

یہ حضرت حافظ محمد صاحب رحمہ اللہ کی اس موضوع سے متعلق نہایت اہم کتاب ہوگی اور اس کے مرتب حافظ عبدالمنان نور پوری کی بہت بڑی علمی کاوش۔

② ...... احکام و مسائل: مختلف مقامات کے لوگ بذریعہ خطوط حافظ عبدالمنان صاحب سے شرعی نوعیت کے مسائل پوچھتے ہیں۔ حافظ صاحب ہر سائل کو کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دیتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے اب تک لوگوں کے سیکڑوں سوالات کے جواب دیے جو ''احکام و مسائل'' کے نام سے دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہیں۔ ان جلدوں میں عقائد و ایمانیات سے لے کر ہر قسم کے مسائل خوب صورت انداز میں مندرج ہیں۔ ان دونوں جلدوں کو قرآنی احکام، رسول اللہ ﷺ کے فرامین اور فقہی نکات کا دلآویز مرقع قرار دینا چاہیے۔ اس میں قاری کو مختلف قسم کے استفسارات کے مدلل جواب ملیں گے۔ احکام و مسائل کی پہلی جلد ۶۳۲ صفحات اور دوسری جلد ۸۶۴ صفحات پر محیط ہے۔ یہ دونوں جلدیں کتاب و سنت کی اشاعت کے عظیم ادارے المکتبۃ الکریمیہ ۶۔ عظیم مینشن، نزد لکشمی چوک، رائل پارک لاہور نے نہایت اہتمام سے شائع کی ہیں۔ ان کی جمع و ترتیب کا فریضہ جامعہ محمدیہ جی ٹی روڈ گوجراں والا کے فاضل استاذ مولانا محمد مالک بھنڈر نے انجام دیا ہے۔

کتاب ''احکام و مسائل'' کی جلد اوّل میں ۱۹۸۵ء سے ۲۰۰۰ء تک کے خطوط کے جواب معرض اشاعت میں آئے ہیں اور جلد دوم میں ۲۰۰۱ء سے ۲۰۰۴ء تک کے جواب شائع کیے گئے ہیں۔ ۲۰۰۴ء سے بعد کے جوابات کی جمع و ترتیب کا کام مولانا محمد مالک بھنڈر بڑی محنت سے کر رہے ہیں۔ جناب محمد مسعود لون ایڈووکیٹ (مدیر المکتبۃ الکریمیہ) شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے یہ اہم کتاب بڑے آب و تاب کے ساتھ شائع کی۔ قارئین کو عظیم مینشن رائل پارک لاہور کے علاوہ یہ کتاب گلی نمبر ۱۴۱ وائی بلاک، پیپلز کالونی گوجراں والا سے بھی مل سکتی ہے۔ اس کتاب کو حافظ عبدالمنان نور پوری کے عظیم دینی شاہ کار کی حیثیت حاصل ہے۔ المکتبۃ الکریمیہ نے اسے شائع کر کے اصحابِ علم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

③ ...... مرآۃ البخاری: ہر سال صحیح بخاری شروع کرنے سے قبل حافظ عبدالمنان علم حدیث اور

امام بخاری اور ان کی کتاب صحیح بخاری سے متعلق طلبا کو بعض ضروری اور اہم معلومات اِملا کراتے ہیں۔ ''مرأۃ البخاری'' انہی معلومات پر مشتمل ہے، جسے حافظ صاحب کے لائق شاگرد مولانا محمد یونس عتیق نے ایڈٹ کر کے حافظ صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ ۲۴۰ صفحات کی یہ کتاب پہلی دفعہ ۱۹۹۹ میں مولانا محمد طیب (مدرس جامعہ شمس الہدیٰ ڈسکہ، ضلع سیالکوٹ) کی کوششوں سے شائع ہوئی۔

④...... زبدۃ المقترح فی علم المصطلح: یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور اس میں اصول حدیث اور حجیت حدیث پر بحث کی گئی ہے۔ نیز منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ کرنے کی سعی فرمائی گئی ہے۔ اسے ادارہ تحقیقات سلفیہ گوجراں والا نے شائع کیا۔

⑤...... فصل الخطاب فی تفسیر فاتحۃ الکتاب: حافظ صاحب ۱۹۹۸ سے نمازِ فجر کے بعد درس قرآن دے رہے ہیں۔ یہ کتاب انہی دروس پر مشتمل ہے جو سورہ فاتحہ کی تفسیر ہے۔ ۴۴۰ صفحات کی یہ تفسیر پہلی دفعہ ۱۴۲۴ھ میں مولانا محمد طیب نے شائع کی۔

⑥...... زبدۃ التفسیر لوجہ التفسیر: یہ کتاب اصول تفسیر کے مباحث پر مشتمل ہے اور عربی زبان میں ہے۔ ادارہ تحقیقات سلفیہ گوجراں والا کی طرف سے ۲۰۰۴ء (۱۴۲۴ھ) میں اشاعت پذیر ہوئی۔

⑦...... خطبات نور پوری: یہ مسائل جنازہ سے متعلق حافظ صاحب کے چالیس خطبات کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں اس موضوع کی وہ تفصیلات آ گئی ہیں جو کتاب و سنت میں مذکور ہیں۔ نیز اس سلسلے میں جن رسوم و بدعات کا ارتکاب کیا جاتا ہے، ان کی تردید فرمائی ہے۔ ۳۲۰ صفحات کے یہ خطبات دارالحسنیٰ گوجراں والا کی طرف سے شائع کیے گئے ہیں۔

⑧...... نخبۃ الاصول تلخیص ارشاد الفحول: یہ کتاب علامہ محمد بن علی شوکانی رحمہ اللہ کی اصول فقہ سے متعلق مبسوط تصنیف ''ارشاد الفحول الیٰ علم الاصول'' کی تلخیص ہے۔

⑨...... کیا مرزا قادیانی نبی ہے؟: یہ ایک تحریری مباحثہ ہے جو حافظ عبدالمنان صاحب نور پوری اور گوجراں والا کے ایک مرزائی محمد اعظم کے درمیان ہوا تھا۔ تین تین تحریروں کے بعد مرزائی مناظر نے خاموشی اختیار کر لی تھی اور حافظ صاحب کامیاب رہے تھے۔ یہ ۱۴۰۳ھ کی بات ہے۔ مکتبہ محمدیہ گوجراں والا نے اسے ۱۴۰۶ھ میں کتابی صورت میں شائع کیا۔

⑩...... نماز میں ہاتھ اٹھانے اور باندھنے کی کیفیت: اس رسالے میں نماز میں زیر ناف ہاتھ باندھنے کی تردید کی گئی ہے اور سینے پر ہاتھ باندھنے کو صحیح قرار دیا گیا ہے۔ تمام دلائل صحیح احادیث سے دیے گئے ہیں۔

⑪...... مسئلہ رفع الیدین: یہ دراصل تحریری بحث ہے جو حافظ عبدالمنان نور پوری اور قاری جمیل احمد صاحب حنفی کے درمیان ہوئی۔ جانبین سے کئی تحریروں کا تبادلہ ہوا۔ اسے کتابی شکل میں نوردین

خادم نے مدینہ کتاب گھر اردو بازار گوجراں والا سے ۱۴۰۸ھ میں شائع کرایا۔ صفحات ۲۱۴۔

⑫...... غنچہ نماز: نماز سے متعلق جیبی سائز کا کتابچہ۔

⑬...... نماز مترجم: یہ بھی جیبی سائز کا کتابچہ ہے۔

⑭...... مرآۃ التفسیر: یہ حافظ صاحب کے ان افادات کا مجموعہ ہے جو وہ ہر سال قرآن مجید کی تفسیر بیان کرنے سے قبل ارشاد فرماتے ہیں۔ اسے حافظ صاحب کے شاگرد مولانا محمد عظیم حاصل پوری (خطیب جامع مسجد تاج گوجراں والا) نے ایڈٹ کیا۔ ۱۲۵ صفحات کا یہ رسالہ مکتبہ نعمانیہ گوجراں والا کی طرف سے شائع ہوا۔ اپنے موضوع کا بہت اچھا رسالہ ہے۔

⑮...... حقیقت تقلید: یہ ایک تحریری مباحثہ ہے۔ پہلی دفعہ اسے کتابی صورت میں جمعیت شبان اہل حدیث گھر جاکھ (گوجراں والا) نے شائع کیا تھا۔

⑯...... کیا تقلید واجب ہے؟: یہ بھی ایک تحریری مباحثہ ہے جو حافظ عبدالمنان نورپوری اور حنفی عالم قاضی شمس الدین صاحب کے درمیان ہوا۔ فریقین کے درمیان پانچ پانچ تحریروں کا تبادلہ ہوا۔ حافظ صاحب نے آخری تحریر ۱۳۔ ذیقعدہ ۱۴۰۱ھ کو اپنے مدمقابل قاضی صاحب کو بھجوائی، جس کا ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔

⑰...... ردّ تقلید: یہ ایک حنفی عالم مولانا مفتی عبدالرشید صاحب کے فتوائے تقلید کی تردید میں ہے۔

⑱...... تعداد تراویح: ایک حنفی عالم مفتی غلام سرور گجراتی نے رسالہ بنام ''بیس رکعت تراویح کا شرعی ثبوت'' لکھا تھا۔ حافظ عبدالمنان نورپوری نے اس کے جواب میں ''تعداد تراویح'' کے نام سے کتاب لکھی۔ اس پر حافظ عبدالسلام بھٹوی نے بائیس صفحات کا مقدمہ لکھا۔ ۲۰۸ صفحات کی یہ کتاب ۱۴۰۷ھ میں چھپی۔

⑲...... تحقیق التراویح: یہ اس موضوع پر ایک تحریری مناظرہ ہے جو حافظ عبدالمنان اور دیوبندی عالم مولانا قاضی عصمت اللہ کے درمیان ہوا۔ حافظ صاحب نے بہ دلائل ثابت کیا ہے کہ تراویح بیس رکعت نہیں بلکہ آٹھ رکعت ہیں۔

⑳...... بیع التقسیط: یہ ایک عربی مضمون ہے جو اسلام آباد کے عربی مجلّے ''نداء الاسلام'' میں چھپا تھا۔ اس مضمون میں قسطوں کی بیع کی شرعی حیثیت بیان کی گئی ہے۔

㉑...... حج وعمرہ: ۱۰۶ صفحات کی اس کتاب میں حج اور عمرے کا مسنون طریقہ بیان کیا گیا ہے۔

㉒...... داڑھی: اس رسالے میں داڑھی رکھنے کے دلائل دیے گئے ہیں اور کٹوانے کو دلائل کی رو سے غلط قرار دیا گیا ہے۔

㉓...... آئمۂ اربعہ: یہ ایک رسالہ ہے جس میں آئمۂ اربعہ کے حالات، خدمات اور عقائد کا

تذکرہ کیا گیا ہے۔ نیز تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ کسی امام نے اپنی تقلید کا حکم نہیں دیا، بلکہ انھوں نے اپنی تقلید سے منع فرمایا ہے۔

⑭...... اتفاق امت: اس مختصر رسالے میں افتراق امت کے اسباب بیان کیے گئے ہیں اور اس کے اتفاق و اتحاد کا طریقہ اور اس کے فوائد و ثمرات کو قرآن و سنت کی روشنی میں ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔

⑮......ضعیف روایات: یہ صرف چالیس صفحات کا رسالہ ہے، جس میں ضعیف روایات کی پرکھ کا طریقہ، ان کا حکم، حجیت حدیث اور کتابت حدیث پر مختصر بحث کی گئی ہے۔ نیز دلائل کی رو سے ثابت کیا گیا ہے کہ ضعیف روایات فضائل اعمال میں بھی مقبول نہیں۔

⑯...... نکاح میں ولی کی حیثیت: اس رسالے میں حافظ صاحب نے نکاح کے موقع پر ولی کی حیثیت کو قرآن و سنت کے دلائل سے واضح کیا ہے۔

⑰...... سود کی حرمت: یہ رسالہ چار حصوں پر مشتمل ہے۔ حصۂ اول میں سود کے بارے میں آیاتِ قرآنی، حصہ دوم میں احادیث مبارکہ، حصہ سوم میں سود کی اقسام اور ان کی حرمت اور حصہ چہارم میں مجوزین سود کے دلائل کا رد کیا گیا ہے۔

⑱...... مسائل قربانی: اس رسالے میں قربانی کی فضیلت، اس کی شرعی حیثیت اور جانور کی کیفیت و شرکت کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

⑲...... تعداد رکعات: اس میں نماز کی فضیلت و اہمیت اور فرض نمازوں کی رکعات کی تعداد (سنن و نوافل سمیت) احادیث کی روشنی میں تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔

⑳...... ایمان کی حقیقت: اس کتابچے میں ایمان کی شرعی ولغوی وضاحت، ایمان کی شرائط اور مومنین کی علامتیں قرآن و سنت کی روشنی میں ذکر کی گئی ہیں۔

㉑...... اطاعت رسول: اس میں لفظ رسول کی وضاحت، نبی اور رسول کے درمیان فرق، رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم، قرآن و حدیث کی روشنی میں مرقوم ہے۔

㉒...... شادی: یہ صرف چھبیس صفحات کا کتابچہ ہے۔ اس میں قرآن و سنت کے دلائل کے ساتھ شادی کے مروجہ رسوم و رواج کی تردید کی گئی ہے۔

㉓...... ازدواجی زندگی: اس میں ازدواجی زندگی کی اہمیت اور مجردین کی تردید شریعت کی روشنی میں کی گئی ہے۔

㉔......قرآن و سنت کی تعلیم پر اجرت لینا جائز ہے؟: یہ رسالہ ایک شخص کے سوال کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ موضوع کا نام سے پتا چل جاتا ہے۔

۳۵...... قسطوں کی بیع: یہ حافظ صاحب کے عربی مضمون "التقسیط" کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں قسطوں کی بیع کو حرام قرار دیا گیا ہے اور اس سلسلے میں جو اعتراضات کیے جاتے ہیں، ان کا رد فرمایا گیا ہے۔

۳۶...... عقیقہ: یہ بیس صفحات کا کتابچہ ہے جس میں لفظ "عقیقہ" کے لغوی معنے، تحنیک کا طریقہ، نومولود کے بالوں کے برابر چاندی کا صدقہ، بچے کا نام رکھنے، کان میں اذان دینے، عقیقے کی فرضیت، عقیقے کے جانور، عقیقے کی تاریخ، وقت اور دیگر مسائل کو شریعت کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔

۳۷...... خِطبہ (منگنی) اس کتابچے میں حافظ صاحب نے منگنی کی تاریخی اور شرعی حیثیت بیان فرمائی ہے اور اس سلسلے کے رسوم و رواج کی تردید کی ہے۔

۳۸...... حجیت حدیث: اس میں منکرین حدیث کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔

۳۹...... ختم نبوت: یہ محدث العصر حضرت حافظ محمد گوندلوی کی اردو تصنیف ہے۔ اس میں مسئلہ ختم نبوت کے تشریح کی گئی ہے اور قادیانیوں کے اجرائے نبوت کے خود ساختہ نظریے کی بہ دلائل تردید فرمائی گئی ہے۔ کتاب کی اہمیت کے پیش نظر حافظ عبدالمنان نورپوری نے اسے عربی میں منتقل کردیا ہے۔

۴۰...... اثبات التوحید: حضرت حافظ صاحب گوندلوی نے کسی زمانے میں پادری عبدالحق کی "کتاب التوحید فی التثلیث" کی تردید میں "اثبات التوحید فی ابطال التثلیث" کے نام سے کتاب لکھی تھی۔ حافظ عبدالمنان نورپوری نے حضرت حافظ صاحب گوندلوی کی اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کردیا ہے۔

۴۱...... اسلام کی دوسری کتاب: حضرت حافظ صاحب گوندلوی رحمہ اللہ کی یہ کتاب عقائد سے تعلق رکھتی ہے۔ حافظ عبدالمنان نورپوری نے اس کی افادیت کے پیش نظر اسے بھی عربی کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔

۴۲...... سفر نورستان: ۱۴۰۴ھ میں حافظ عبدالمنان نے افغانستان کے علاقے نورستان کا سفر کیا۔ مولانا ذکی الرحمان لکھوی اور حکیم محمد اشفاق نورپوری بھی ان کے ہم سفر تھے۔ اس سفر کی روداد حافظ صاحب ممدوح نے "سفرِ نورستان" میں بیان کی ہے۔

یہ سطور ۷۔ اگست ۲۰۰۷ء کو لکھی گئی ہیں۔ اس وقت اللہ کے فضل سے حافظ عبدالمنان کی اولاد دو بیٹے ہیں اور سات بیٹیاں۔ ان کا ایک بیٹا جس کا نام عبدالرحمٰن تھا بچپن میں وفات پا گیا تھا۔ دوسرا بیٹا ۱۹۷۴ میں پیدا ہوا تو اس کا نام پہلے بیٹے کے نام پر "ثانی" کا لاحقہ لگا کر عبدالرحمٰن ثانی رکھا گیا۔

اب وہ ماشاء اللہ مولانا حافظ عبدالرحمٰن ثانی ہیں۔ انھوں نے جلیل القدر علماے کرام سے تعلیم حاصل کی اور ۱۹۹۴ میں سندِ فراغت لی۔ آج کل مرکزِ طیبہ مرید کے (ضلع شیخوپورہ) میں فریضہ تدریس سرانجام دے رہے ہیں۔

دوسرے بیٹے کا نام محمد عبداللہ ہے۔ وہ اپنے مسکن سرفراز کالونی، گوجراں والا کی جامع مسجد قدس اہل حدیث (المعروف حافظ عبدالمنان والی مسجد) میں قرآن مجید حفظ کر رہے ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ حافظ صاحب کی اولاد (ذکور واناث) کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور یہ لوگ باپ کی طرح اللہ کے دین کے مخلص ترین خادم اور نیک نام وخوش خصال ہوں۔ آمین یا رب العالمین۔

اب حافظ صاحب کے تلامذہ کی طرف آیے۔

ان کو تعداد کی گرفت میں لانا مشکل ہے۔ ان کے ایک شاگرد حکیم رانا محمد مدثر خاں (ساکن چک نمبر ۴۸۵ گ ب تحصیل سمندری، ضلع فیصل آباد) ہیں۔ نہایت شریف النفس اور امور خیر کے لیے سرگرم۔ مجھے حافظ صاحب کے واقعاتِ حیات سے مطلع کرنے کا اصل ذریعہ وہی ہیں اور میں اس پر ان کا شکر گزار ہوں۔ ان کا بیان ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ ایک رجسٹر دیکھا تھا جس میں ان حضرات کے نام درج ہیں جنھوں نے حافظ صاحب سے تفسیر، حدیث اور بعض دیگر علوم پڑھے۔ ۶۸ صفحات کے اس رجسٹر میں بارہ سو پچاس اشخاص کے نام درج ہیں۔ لیکن حکیم محمد مدثر خاں کے بقول اس تعداد کو حتمی نہیں قرار دیا جاسکتا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس رجسٹر کے مطالعہ سے مترشح ہوتا ہے کہ حافظ صاحب سے استفادہ کرنے یا اجازہ لینے والوں کا تعلق سعودی عرب، مصر، فلسطین، افغانستان، ایران، بنگلہ دیش، سری لنکا، شام، بحرین، الجزائر، ملائیشیا، تھائی لینڈ اور آزاد کشمیر سے بھی ہے۔

حافظ صاحب کے شاگردوں کی جو مختصر سی فہرست میرے سامنے ہے، اس میں موجودہ دور کے ان متعدد حضرات کے نام درج ہیں، جنھوں نے تدریس و تصنیف اور تقریر و خطابت کے شعبوں میں بڑا نام پایا۔ ان میں سے بعض وفات پاگئے ہیں۔ میں اس وسیع فہرست میں سے یہاں چند نام لکھتا ہوں۔ مختصر الفاظ میں ان کا تعارف بھی کرانا چاہیے۔ لیکن معذرت خواہ ہوں کہ ان سطور میں اس کی گنجائش نہیں۔ یہ خدمت حافظ صاحب کے کسی سوانح نگار کو سرانجام دینی چاہیے۔ بہرحال حافظ صاحب کے لائق شاگردوں میں سے چند نام مندرجہ ذیل ہیں۔

حافظ خالد مرجالوی (مرکز التربیۃ الاسلامیہ فیصل آباد)۔

مفتی عبدالرحمٰن عابد (مدرسہ الدعوۃ الاسلامیہ)۔

مولانا محمد مالک بھنڈر (جامعہ محمدیہ گوجراں والا)۔

حافظ محمد شریف (بانی مرکز التربیۃ الاسلامیہ فیصل آباد)۔

حافظ جمیل احمد (مدرس جامعہ الدعوۃ الاسلامیہ)۔

قاری گل ولی خاں (مدرس جامعہ سلفیہ اسلام آباد)۔

مولانا محمد طیب (مدرس جامعہ شمس الہدیٰ ڈسکہ ضلع سیالکوٹ)۔

قاری عبدالصمد سیف بلوچ خطیب جامع مسجد الکریمیہ گوجراں والا۔

مولانا محمد عظیم حاصل پوری (خطیب جامع مسجد تاج اہل حدیث گوجراں والا)۔

حافظ محمد لقمان نورپوری (مدرس جامع مسجد شفیق اہل حدیث سرفراز کالونی، گوجراں والا)۔

ڈاکٹر فضل الٰہی (برادرِ صغیر علامہ احسان الٰہی ظہیر۔ آج کل بین الاقوامی اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں پروفیسر ہیں۔)

حافظ ڈاکٹر عبدالحمید ازہر (اسلام آباد)۔

مولانا حافظ زبیر علی زئی (مصنف کتب کثیرہ و ایڈیٹر ماہنامہ "الحدیث" حضرو ضلع اٹک)۔

حافظ محمد امین (شیخ الحدیث دارالعلوم تقویۃ الاسلام اوڈاں والا)۔

مولانا محمد رمضان سلفی (استاذ جامعہ رحمانیہ، ماڈل ٹاؤن، لاہور)۔

حافظ ثناء اللہ زاہدی (صادق آباد ضلع رحیم یار خاں)۔

مولانا خاور رشید بٹ (مدرس دارالعلوم محمدیہ لوکو ورکشاپ لاہور)۔

مولانا محمد بشیر الطیب نزیل کویت۔

حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی۔ (بہت سی کتابوں کے مصنف و نائب مدیر ترجمان الحدیث فیصل آباد۔ مدرس جامعہ سلفیہ فیصل آباد)۔

اب حافظ عبدالمنان نورپوری کے چند مرحوم تلاندۂ کرام کے اسمائے گرامی بہ ترتیب تاریخ ہائے وفات۔

☆...... مولانا حبیب الرحمٰن یزدانی۔ شہادت ۲۳۔ مارچ ۱۹۸۷ء

☆...... قاری نعیم الحق نعیم۔ سابق ایڈیٹر ہفت روزہ الاعتصام۔ وفات ۳۰ جنوری ۱۹۹۹۔

☆...... علامہ محمد مدنی۔ (مہتمم جامعہ اثریہ جہلم۔ وفات ۱۸ فروری ۲۰۰۲)۔

شاگردوں کے ان چند اسمائے گرامی کے بعد آخر میں جناب حافظ عبدالمنان نورپوری کے بارے میں چند اور باتیں۔

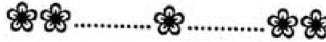
حافظ صاحب کے شاگردِ رشید جناب حکیم رانا محمد مدثر خاں صاحب کے بقول حافظ صاحب عربی کے شاعر بھی ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ انھوں نے حافظ صاحب کے دو قصیدے دیکھے ہیں۔ ایک حضرت محدث حافظ محمد گوندلوی کی مدح میں اور دوسرا مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی مدح میں۔

یہ دونوں قصیدے مجلّہ ''الرباط'' میں چھپے ہیں۔

انہی رانا محمد مدثر خاں کا بیان ہے کہ بعض فنون کی کتابوں کے متن حافظ صاحب نے حفظ کیے تھے۔ مثلاً علم میراث کی ''الطیب المرام'' کا متن انھیں زبانی یاد ہے۔ اسی طرح فن مناظرہ کی کتاب رشیدیہ کا متن ''شریفیہ''، اصول حدیث کی ''نخبۃ الفکر'' کا متن اور شاہ اسماعیل شہید دہلوی کے رسالہ ''اصول الفقہ'' کا متن بھی انھیں حفظ ہے۔ صرف ونحو اور بعض ادبی کتابوں کے متون بھی کسی زمانے میں انھوں نے باقاعدہ حفظ کیے تھے۔ نبی ﷺ کی بہت سی احادیث انھیں ازبر ہیں۔

حافظ صاحب نام ونمود سے پاک بالکل سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ نہ کسی سے کوئی جھگڑا۔ نہ کسی قسم کی ہنگامہ آرائی کا شوق۔ تمام وقت پڑھنے پڑھانے اور لکھنے لکھانے میں گزرتا ہے۔ عام جلسوں میں جانے سے گریزاں اور بڑے بڑے القاب سے نفور۔ ان کی تصانیف کو علوم کے خزانے اور مسائل کے گنجینے سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اسلوب تحریر ایسا آسان کہ ہر بات ہر شخص کو بہ آسانی سمجھ میں آجاتی ہے۔

ہم عاجز بندوں کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے دین کی خدمت کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرے۔



حافظ عبدالستار حماد

ہم اپنے علماے کرام کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ ان میں سے بعض حضرات سفرِ حیات کے مختلف مراحل میں مختلف حالات سے دو چار ہوئے، ان پر بے انتہا غربت کا دور بھی آیا اور وہ آسودہ حالی کی خوش کن منزلوں سے بھی گزرے۔ انھوں نے اپنے آبا و اجداد کی بے علمی کا مشاہدہ بھی کیا اور اپنے خاندان کے افراد کو علم و فضل کی مسرت آمیز وادیوں سے گزرتے ہوئے بھی دیکھا۔ ان پر ایسا وقت بھی آیا کہ کسی نہایت ضروری کام سے کہیں جانے کے لیے ایک پیسا جیب میں نہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب مہیا فرما دیے کہ وہ ہوائی جہازوں میں سوار ہوئے اور مختلف ملکوں میں جا کر اللہ کے دین کی تبلیغ کی۔ یہ دور بھی دیکھا کہ کوئی ان سے سیدھے منھ بات کرنے کا روا دار نہیں، پھر حالات نے ایسی کروٹ لی کہ وہ جدھر جاتے ہیں لوگ نہایت احترام سے ان کا استقبال کرتے ہیں بلکہ ان کی آمد کے منتظر رہتے ہیں۔

اب اس چند سطری متن کی شرح کی طرف آتے ہیں۔

ایک گاؤں کا ایک خاندان

مشرقی پنجاب کے ضلع امرتسر میں ایک قصبہ ''پٹی'' کے نام سے موسوم ہے۔ تقسیم ملک سے قبل یہ قصبہ ضلع لاہور میں واقع تھا اور اس نواح کے مسلمانوں کا مشہور مرکز تھا۔ اس قصبے کے قریب ایک گاؤں ''بھوپا رام'' تھا۔ اس گاؤں میں جو مسلمان آباد تھے، ان میں ایک شخص کا نام جان محمد تھا جو غربت کی زندگی بسر کرتا تھا اور محنت مزدوری اس کا پیشہ تھا۔ اس کی ضمانت پر اس کے بھائی نے ایک ہندو سے سود پر قرض لیا۔ ہر سال رقم میں سود شامل ہو جاتا تھا۔ کوشش کے باوجود جان محمد کا بھائی قرض نہ اتار سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سود کی ادائی میں ضمانت دینے والے جان محمد کی بھینسیں فروخت ہوگئیں۔ لیکن اصل رقم ادا نہ ہوسکی۔ اس کے بعد جان محمد کا مکان بھی قرض خواہ ہندو کے قبضے میں چلا گیا۔ لیکن اصل رقم اب بھی ادا نہ ہوسکی۔ اسی تنگ دستی کی حالت میں جان محمد وفات پا گیا۔

جان محمد کے ایک بیٹے کا نام مہتاب دین تھا، باپ کی طرح مہتاب دین بھی غریب اور مزدوری پیشہ تھا۔ جس طرح باپ بے علم تھے، یہ بھی علم سے تہی داماں تھے۔ ہندوؤں کی بھینسیں چراتے اور گزر اوقات کرتے تھے۔ باپ کی وفات کے بعد مہتاب دین کی منگنی ہوگئی اور محنت مزدوری کر کے

شادی کا بندوبست بھی ہوگیا۔ کسی رحم دل شخص نے رہائش کے لیے چھوٹے سے دو کمرے بھی دے دیے۔ لیکن ایک کمرا مالک مکان کی بھینسوں اور بھوسے کے لیے مخصوص تھا اور ایک کمرے میں مہتاب دین اپنی اہلیہ اور دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ رہتے تھے۔ مہتاب دین محنت مزدوری کرکے اپنی بیوی اور دو چھوٹے بھائیوں کی ضروریات کا انتظام کرتے تھے۔ اسی اثنا میں وہ اپنے گاؤں سے موضع پٹی چلے گئے اور انصاری برادری کی ایک نیک بخت خاتون نے رہائش کے لیے انھیں چھوٹا سا مکان دے دیا۔

دینی تبدیلی

اب مہتاب دین کی طرزِ حیات میں تبدیلی کے آثار ابھرے۔ اس انصاری خاتون کی ترغیب سے محنت مزدوری کے ساتھ ساتھ انھوں نے نماز بھی سیکھ لی اور باقاعدگی سے نماز پڑھنے لگے۔ قرآن مجید بھی پڑھ لیا۔ علما کی مجلسوں میں حاضر ہونے اور ان کے مواعظ سے مستفید ہونے لگے۔ انھی دنوں اس علاقے کے معروف اور صالح تریں بزرگ حضرت شاہ محمد شریف گھڑیالوی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے۔ صالحیت کی اس خوش گوار فضا سے متاثر ہوکر مہتاب دین نے دل میں فیصلہ کرلیا کہ وہ اپنی اولاد کو دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔

قیامِ پٹی کے زمانے میں تقسیم ملک سے چند سال پہلے مہتاب دین محنت مزدوری کے لیے پٹی سے اوکاڑہ چلے گئے۔ وہ ''بار'' کا علاقہ کہلاتا تھا۔ وہاں دیگر علاقوں کی نسبت مزدوری زیادہ ملتی تھی اور کام کے اوقات مقرر تھے۔ ان کی اہلیہ اور بھائی وغیرہ پٹی ہی میں سکونت پذیر تھے۔ وہ جو کچھ کماتے بیوی کو بھیج دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے پٹی کے محلہ مومن آباد میں سات مرلے جگہ خریدی اور دو مکان تعمیر کیے۔ استعمال کا ضروری سامان بھی خرید لیا گیا۔ ان کا ارادہ مستقل طور پر پٹی میں رہنے کا تھا۔ لیکن اسی اثنا میں ملک تقسیم ہوگیا اور وہ اہل و عیال کے ساتھ میاں چنوں آگئے۔ یہاں کچھ عرصہ ایک زمیندار کی حویلی میں قیام رہا۔ وہاں سے چک نمبر ۱۲۹۔ ۱۵۔ ایل جاکر سکونت اختیار کرلی۔

عبدالستار کی ولادت

حافظ عبدالستار حماد انھی مہتاب دین کے بیٹے اور جان محمد کے پوتے ہیں جو ۱۶۔ اپریل ۱۹۵۲ کو موضع چک نمبر ۱۲۹۔ ۱۵، ایل میں پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو نہایت احترام سے نوازا اور ملک اور ملک سے باہر علمی حلقوں میں شہرت عطا فرمائی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے جو نیک طینت والد

کی محنت اور حلال کی کمائی سے بیٹے کے حصے میں آیا۔

حصول علم کی راہ پر

اس گاؤں میں تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس لیے والد نے عبدالستار حماد کو میاں چنوں کے ایم سی پرائمری سکول میں داخل کرا دیا۔ پرائمری پاس کی تو والد محترم جو بیٹے کو دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کے خواہاں تھے، بچے کو چک نمبر ۷۔ ۸، اے آر میں لے گئے جہاں مولانا علی محمد سعیدی نے ''جامعہ سعیدیہ'' کے نام سے درس گاہ قائم کی تھی۔ اب وہ اس درس گاہ میں دینی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ لیکن چوں کہ وہ کھلے ماحول اور کھیل کود کی آزادانہ فضاؤں سے اس دینی مدرسے میں گئے تھے، اس لیے وہاں کی زندگی انھیں تنگ تنگ سی نظر آنے لگی اور وہاں رہنا اور ایسی تعلیم حاصل کرنا جس سے ان کا ذہن مانوس نہ تھا، ان کے لیے مشکل ہوگیا۔ دینی مدارس میں جمعرات کو آدھے اور جمعے کو پورے دن کی چھٹی ہوتی ہے۔ اس تعلیم سے چھٹکارا پانے کے لیے ایک دن عبدالستار نے والدہ سے کہا کہ میں جمعرات کو آپ سے ملنے کے لیے پیدل گاؤں آرہا تھا کہ راستے میں کیکر کے درخت سے آواز آئی کہ آئندہ یہاں سے گزرے تو تمھاری گردن توڑ دی جائے گی۔ اس لیے واپس مدرسے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ ایسا نہ ہو کہ واقعی گردن توڑ دی جائے۔ والدہ نے والد محترم کو بتایا تو انھوں نے فرمایا کہ یہ آئندہ یہاں نہ آیا کرے، جب ہمارا اس سے ملنے کو جی چاہے گا تو میں خود ہی اس کو مدرسے سے گاؤں لے آیا کروں گا اور خود ہی چھوڑ آیا کروں گا۔ والد کے ان الفاظ سے ان کا مدرسہ چھوڑنے کا منصوبہ ناکام ہوگیا اور انھیں بادلِ نخواستہ حصول علم کی راہ پر گامزن ہونا پڑا۔ یہ ۱۹۶۳ کی بات ہے۔ اب انھوں نے مدرسے میں حافظ محمد یحییٰ میر محمدی کا مرتب کردہ قاعدہ ''ترتیل القرآن'' پڑھا۔ اس کے بعد قرآن مجید پڑھنے لگے۔ مدرسے میں ان کے اولین استاذ حافظ عبدالرشید اظہر کے بڑے بھائی حافظ عبدالستار تھے۔

قرآن مجید پڑھ چکے تو درس نظامی کی بعض ابتدائی کتابیں بھی پڑھ لیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں حصول علم کا اس قدر شوق پیدا کردیا کہ مدرسے میں سالانہ چھٹیاں ہوئیں تو گھر نہیں گئے، وہیں استاذِ محترم سے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کردیا اور رمضان المبارک میں اڑھائی پارے حفظ کرلیے۔ چھٹیوں کے بعد درسی کتابیں پڑھنے کے بجائے، حفظ قرآن میں مشغول ہوگئے اور ڈیڑھ سال میں قرآن مجید حفظ کرلیا۔ چھ ماہ اس کی دہرائی پر لگائے۔ اس طرح نماز تراویح میں قرآن مجید سنانے کے قابل ہوگئے۔

کچھ عرصے کے بعد جامعہ سعیدیہ کا شعبۂ درس نظامی چک نمبر ۷۔ ۸، اے آر سے خانیوال

منتقل ہوا تو حفظ قرآن سے فارغ ہوکر ۱۹۶۵ میں حافظ عبدالستار حماد بھی خانیوال چلے گئے۔ وہاں انھوں نے مولانا محمد داؤد مسعود سے مشکوٰۃ شریف اور بعض دیگر درسی کتابیں پڑھیں۔ اس وقت خانیوال میں جامعہ سعیدیہ کی عمارت زیر تعمیر تھی۔ تعمیر میں طلبا بھی حصہ لیتے تھے۔ اس وقت حافظ عبدالرشید اظہر بھی وہیں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ سب طلبا اپنی ہمت کے مطابق تعمیر میں حصہ ڈالتے تھے۔ ساتھ ساتھ لطائف وظرائف کا سلسلہ بھی چلتا تھا۔ وہاں ایک بزرگ قاری عبدالحق قیام فرما تھے، وہ خاص لہجے سے قرآن مجید پڑھتے تھے اور طلبا بے حد شوق سے سنتے تھے۔ جامعہ کے مہتمم مولانا علی محمد سعیدی طلبا سے نہایت شفقت کا برتاؤ فرماتے تھے۔

عبدالستار حماد کو انہی دنوں معلوم ہوا کہ میاں چنوں کے قریب چک نمبر ۱۲۶۔ ۱۵، ایل پلی والی میں مدرسہ دارالہدیٰ کے نام سے ایک درس گاہ قائم ہے جس میں مولانا محمد یحییٰ فیروز پوری کا سلسلۂ تدریس جاری ہے جو حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے شاگرد ہیں اور صرف ونحو میں خاص طور سے درک رکھتے ہیں۔ یعنی نحوی ترکیبات اور صرفی تعلیلات میں انھیں مہارت حاصل ہے۔ حافظ عبدالستار حماد تعلیمی سال کے اختتام پر خانیوالؔ سے مولانا محمد یحییٰ فیروز پوری کی خدمت میں پہنچ گئے۔ مولانا عطاء اللہ لکھوی صرف ونحو کے علوم میں مرتبۂ امامت پر فائز تھے اور مولانا محمد یحییٰ فیروز پوری نے ان علوم میں عالی قدر استاذ سے خوب استفادہ کیا تھا۔

حافظ عبدالستار حماد دو سال چک نمبر ۱۲۶۔ ۱۵، ایل کے مدرسہ دارالہدیٰ میں مولانا محمد یحییٰ فیروز پوری کی خدمت میں رہے اور صرف ونحو کی کتابیں انؔ سے نہایت محنت سے پڑھیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس علم میں انھیں مہارت حاصل ہوگئی۔

میاں چنوں میں

اس زمانے میں حافظ عبدالستار حماد کے والد میاں مہتاب دین میاں چنوں کی جامع مسجد اہل حدیث میں موذن تھے اور مولانا عبدالقادر حلیم زیروی وہاں خطابت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ مولانا ممدوح نے مسجد میں دینی مدرسہ بھی جاری کیا تھا۔ وہ بہت اچھے خطیب اور بہت اچھے مدرس تھے۔ عام میل جول میں بھی وہ اچھی شہرت کے مالک تھے۔ حلم اور بردباری ان کا خاصہ تھا۔ حافظ عبدالستار حماد کے والد میاں مہتاب دین نے بیٹے سے کہا کہ تم میاں چنوں آجاؤ، یہاں مولانا عبدالقادر حلیم سے تعلیم بھی حاصل کرو اور مسجد کے کاموں میں میری معاونت بھی کرو۔ چنانچہ باپ کے حکم سے وہ میاں چنوں آگئے۔ یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔

میاں چنوں آکر انھوں نے مولانا عبدالقادر حلیم زیروی سے حدیث کی دو کتابوں سنن نسائی اور

ابن ماجہ کا درس لیا۔ البتہ علم نحو کی کتاب الفیہ ابن مالک پڑھنے کے لیے وہ روزانہ پیدل مولانا محمد یحییٰ فیروز پوری کی خدمت میں چک نمبر ۱۲۶۔ ۱۵، ایل جایا کرتے تھے۔ اب حافظ عبدالستار حماد تعلیم بھی حاصل کرتے تھے اور باپ کے ساتھ مسجد کی خدمت بھی کرتے تھے۔

مولانا عبدالقادر حلیم زیروی اور مولانا محمد یحییٰ دونوں وفات پاچکے ہیں۔ دونوں تقویٰ اور صالحیت کے اوصاف سے متصف تھے۔ دونوں بزرگ ضلع فیروز پور سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا محمد رمضان سلفی جو لاہور کے مدرسہ رحمانیہ کی مسند شیخ الحدیث پر فائز ہیں مولانا محمد یحییٰ کے داماد ہیں۔ ان کی کوشش سے چوتھے پارے کی نحوی ترکیب (جو مولانا محمد یحییٰ نے مرتب کی تھی) چھپ گئی ہے۔

۱۱۔ اگست ۱۹۶۹ء کو حافظ عبدالستار حماد نے میاں چنوں میں مولانا عبدالقادر حلیم مرحوم سے سنن ابن ماجہ مکمل کی تو اس موقع پر مولانا علی محمد سعیدی کو دعوت دی گئی، جن کے مدرسے میں حافظ صاحب نے دینی تعلیم کے حصول کا آغاز کیا تھا۔ مولانا علی محمد سعیدی کا وطنی تعلق ضلع فیروز پور سے تھا۔ دونوں اساتذہ نے حافظ صاحب کو دعائیں دیں اور مشورہ دیا کہ آئندہ وہ جلال پور پیر والا کے دارالحدیث محمدیہ میں داخلہ لیں اور مولانا سلطان محمود سے کتب حدیث پڑھیں۔ اس سے پہلے بورے والا میں وہ مولانا سلطان محمود کا درسِ قرآن سن چکے تھے اور بہت متاثر ہوئے تھے۔

جلال پور پیر والا کا عزم

حافظ عبدالستار حماد نے جلال پور پیر والا جانے کے لیے اپنے ایک ساتھی حافظ عبدالرحیم زاہد کو بھی تیار کرلیا (جو آج کل کمالیہ میں خطیب ہیں اور انقلابی دواخانہ کے نام سے وہاں اپنا مطب بھی چلا رہے ہیں) یہ دونوں ماہِ رمضان کے بعد تعلیمی سال کے آغاز (ماہِ شوال) میں وہاں پہنچے تو داخلے کا امتحان لے کر انھیں داخل کرلیا گیا اور پڑھائی شروع ہوگئی۔ مولانا سلطان محمود محدثانہ وقار کے ساتھ علم حدیث پڑھاتے تھے۔ ان کے درس میں سند پر بحث ہوتی، سنن حدیث کی تشریح کی جاتی، ہر اہم مسئلے میں مختلف مسالک کا بہ دلائل تذکرہ کیا جاتا۔ پھر دلائل کے اعتبار سے راجح مسلک کو ترجیح دی جاتی۔ یہ ان کے درس حدیث کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ مولانا ممدوح سے انھوں نے جامع ترمذی اور صحیح بخاری (دو کتابیں) پڑھیں اور سند لی۔ دارالحدیث محمدیہ پیر والا سے انھیں جو سند حاصل ہوئی، اس پر ۴۔ اپریل ۱۹۷۱ کی تاریخ مرقوم ہے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد

سندِ فراغت حاصل کرنے کے بعد قدرتی طور پر حافظ صاحب کو فکر معاش لاحق ہوئی۔ دل میں

بار بار خیال آتا کہ والد محترم کا بوجھ کیسے ہلکا کیا جائے۔ ایک دن اخبار میں اشتہار پڑھا کہ لاہور بھاٹی گیٹ کے قریب "ست گھرا" مسجد میں حفاظِ قرآن کو فنِ تجوید پڑھایا جائے گا اور دورانِ تعلیم طلبا کو وظیفہ بھی دیا جائے گا۔ تکمیل کے بعد انھیں سکولوں میں قرآن مجید اور فنِ تجوید پڑھانے کے لیے متعین کیا جائے گا۔ حافظ صاحب نے وہاں خط لکھا تو جواب آیا کہ آپ کو داخلے کی اطلاع دی جائے گی، اطلاع سے پہلے نہ آئیں۔ لیکن انھوں نے بستر اٹھایا اور لاہور کو روانہ ہوگئے۔ شام کے وقت وہاں کے ناظم قاری صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ ناظم صاحب نے پوچھا کہ آپ کے پاس داخلے کا اطلاعی خط ہے؟ انھوں نے نفی میں جواب دیا تو ناظم صاحب نے نہ صرف داخلے سے انکار کردیا بلکہ انھیں اجنبی اور غیر متعارف ہونے کی وجہ سے وہاں رات گزارنے کی بھی اجازت نہ دی۔ البتہ یہ مشورہ دیا کہ شیراں والا گیٹ میں ایک دینی جلسہ ہورہا ہے، وہاں چلے جائیے اور رات گزاریئے۔

اب حافظ عبدالستار حماد نے رات وہاں گزاری اور دوسرے دن لسوڑے والی مسجد اہل حدیث میں پہنچے جو جلسہ گاہ سے بالکل قریب تھی۔ وہاں سے ملتان آئے اور مدرسہ رحمانیہ میں ٹھہرے۔ وہیں خانیوال سے آنے والے چند حضرات سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ انھیں تحفیظ القرآن کے لیے مدرس کی ضرورت ہے۔ اس طرح خانیوال کی جامع مسجد اہل حدیث میں بہ طور مدرس ان کی تقرری عمل میں آئی اور ۹۰ روپے تنخواہ مقرر ہوئی۔ اگلے سال (۱۹۷۳ میں) ملتان آئے۔ وہ دراصل مساجد و مدارس کے اصحاب انتظام کے رویے سے تنگ آکر فاضل فارسی کا امتحان پاس کرکے سرکاری سکول میں ملازمت کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ملتان میں یہ امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔ ۱۹۷۴ میں او ٹی کرنے کے لیے بہاول پور کے ٹیچر ٹریننگ کالج میں داخلہ لیا۔ اسی اثنا میں مرزائیوں کے خلاف اتنی زبردست تحریک چلی کہ سکول کالج بند ہوگئے۔

مدینہ یونیورسٹی میں داخلے کے اسباب

اب حافظ عبدالستار حماد کا قافلۂ حیات ایسی راہ پر گامزن ہوتا ہے جو کچھ عرصے کے بعد اللہ کی مہربانی سے انھیں مدینہ یونیورسٹی میں پہنچا دیتی ہے۔ چند الفاظ میں اس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۹۷۴ میں مولانا سلطان محمود ایک سال کے لیے شیخ الحدیث کی حیثیت سے فیصل آباد کی جامعہ سلفیہ میں تشریف فرما تھے۔ ٹیچر ٹریننگ کالج بند ہونے کی وجہ سے حافظ عبدالستار حماد اپنے گھر جانے کی بجائے بہاول پور سے مولانا سلطان محمود کے پاس جامعہ سلفیہ آگئے اور مولانا سے استفادے کے لیے انھیں جامعہ سلفیہ میں داخلہ مل گیا۔ لیکن چند روز کے بعد کالج کھلے تو وہ استادِ محترم کے مشورے سے او ٹی کا امتحان دینے کے لیے بہاول پور چلے گئے۔ امتحان دے کر پھر جامعہ

سلفیہ میں آکر پڑھائی میں مصروف ہوگئے۔ وہاں ان کے دیرینہ ساتھی حافظ عبدالغفار اعوان اور مولانا محمد داؤد فہیم بھی موجود تھے۔ اب یہ تینوں جامعہ میں مولانا سلطان محمود کے حلقۂ درس میں شامل تھے، جنھیں مولانا مرحوم اصحاب ثلاثہ کہا کرتے تھے اور یہ جامعہ میں اسی نسبت سے متعارف ہوئے۔

جامعہ میں سالانہ امتحانات کا وقت آیا تو وہاں کی انتظامیہ نے فیصلہ کیا کہ حافظ عبدالستار امتحان میں شامل نہیں ہوسکتے، اس لیے کہ انھوں نے یہاں پورا سال تعلیم حاصل نہیں کی، ان کا زمانہ تعلیم صرف چند ماہ پر مشتمل ہے۔ حافظ صاحب نے اس کا ذکر مولانا سلطان محمود صاحب سے کیا تو انھوں نے انتظامیہ سے بات کی اور فرمایا کہ آپ نے جب ایک طالب علم کو داخل کیا ہے اور اس کا نام آپ کے رجسٹر میں باقاعدہ طالب علم کے طور پر درج ہے تو اسے امتحان میں شمولیت سے کیوں روکا جارہا ہے؟۔ اس کے بعد انتظامیہ کی طرف سے انھیں امتحان میں شامل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔

ان دنوں جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ امتحانات میں پہلے، دوسرے، تیسرے اور چوتھے نمبر پر آنے والے چار طلبا کا مدینہ یونیورسٹی میں خود بخود داخلہ ہو جاتا تھا۔ اس لیے طلبا یہ اعزاز حاصل کرنے کے لیے دن رات محنت کرتے تھے۔ یہ جامعہ سلفیہ کی آخری کلاس کا امتحان تھا جو بے حد اہم تھا۔ امتحان ہوا تو اس کا نتیجہ اس ترتیب سے نکلا۔

اوّل: حافظ عبدالستار حماد۔

دوم: مولانا محمد داؤد فہیم۔

سوم: حافظ عبدالغفار اعوان۔

چہارم: مولانا محمد اشرف۔

سفرِ حیات کا نہایت خوش گوار موڑ

یہ حافظ عبدالستار کے سفرِ حیات کا ایسا خوش گوار موڑ تھا کہ جس کا انھیں وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اس کے بعد مدینہ یونیورسٹی میں داخلے کے لیے کاغذات تیار ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے حافظ صاحب کا داخلہ مدینہ یونیورسٹی میں ہوگیا اور ایک ان پڑھ خاندان کا فرد دنیا کے بہت بڑے روحانی اور علمی مرکز میں پہنچ گیا۔

اصحاب ثلاثہ یعنی مولانا محمد داؤد فہیم، حافظ عبدالستار حماد اور حافظ عبدالغفار اعوان اکٹھے جامعہ سلفیہ کی طرف سے مدینہ یونیورسٹی پہنچے تھے۔ ان میں سے محمد داؤد فہیم کا داخلہ یونیورسٹی کے کلیۃ الدعوۃ (دعوہ کالج) میں اور حافظ عبدالستار حماد اور حافظ عبدالغفار اعوان کا کلیۃ الشریعہ (شریعت کالج) میں ہوا تھا۔ اس وقت مدینہ یونیورسٹی کے نائب رئیس شیخ عبدالمحسن عباد تھے جو سلفی العقیدہ

تھے اور طبیعت کے کچھ سخت تھے۔ ایک دن مسجد نبوی میں ان تینوں کی ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے ان سے پوچھا کہ تم میں سے حافظ قرآن کون کون ہیں؟ عبدالستار حماد اور عبدالغفار اعوان نے جواب دیا کہ ہم دو حافظ قرآن ہیں۔ جواب سن کر فرمایا ''کل تم دونوں میرے دفتر آؤ''۔ یہ کہہ کر وہ نماز میں مصروف ہو گئے۔

دوسرے دن وہ ان کے دفتر گئے تو پتا چلا کہ ان کا داخلہ کلیتہ القرآن (قرآن کالج) میں ہو چکا ہے۔ انھوں نے کلیتہ الشریعہ (شریعت کالج) میں رہنے پر اصرار کیا تو جواب ملا کہ تم یہاں پڑھنا چاہتے ہو تو کلیتہ القرآن میں پڑھو، ورنہ ٹکٹ لے کر پاکستان چلے جاؤ۔

کلیتہ القرآن کے طلبا کا ماہانہ وظیفہ چھ سو ریال تھا اور دوسرے کلیات (کالجوں) کے طلبا کو ساڑھے تین سو ریال ملتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود طلبا کلیتہ القرآن میں داخلے سے گھبراتے تھے۔ اس لیے کہ اس میں بعض کتابوں کے متون زبانی یاد کرنا پڑتے تھے۔ بہر حال حافظ عبدالستار حماد اور حافظ عبدالغفار اعوان نے کلیتہ القرآن میں داخلہ لیا اور شاطبیہ وغیرہ کتابوں کے اشعار زبانی یاد کیے۔ مدینہ یونیورسٹی میں انھوں نے شیخ محمد ناصر الدین البانی اور شیخ محمد بن حماد انصاری کی علمی مجلسوں سے بے حد استفادہ کیا۔

یونیورسٹی میں تعلیم کے علاوہ مسجد نبوی میں پاکستانی طلبا کے دعوتی پروگرام بھی ہوتے تھے، جس کی سعودی حکومت کی طرف سے عام اجازت تھی۔ چنانچہ نماز مغرب کے بعد مولانا محمد مدنی، مولانا صدیق الحسن کشمیری، سید الطاف الرحمٰن، مولانا محمد داؤد فہیم، حافظ عبدالغفار اعوان اور حافظ عبدالستار حماد پاکستانی حضرات کو خوب وعظ و نصیحت کرتے۔

عصر کے بعد ڈاک تقسیم کی جاتی تھی۔ اس کی ذمہ داری حافظ عبدالستار حماد نے لے رکھی تھی۔ یونیورسٹی کی طرف سے ایک سات منزلہ بلڈنگ ''عمارۃ السبعی'' کو ہوسٹل بنایا گیا تھا، جس میں یہ طلبا سکونت پذیر تھے۔ یہ سب نوجوان تھے۔ ان میں کبھی کبھی رات کو لطائف و ظرائف کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا تھا۔ اس سلسلے میں مولانا محمد مدنی اور مولانا محمد داؤد فہیم نمایاں رہتے تھے۔ یہ دونوں بزرگ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ (غفر اللہ لھما) لطائف ہر شخص اپنے انداز میں بیان کرتا ہے اور یہ انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہے۔

حافظ عبدالستار حماد نے ۱۹۷۶ میں مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ چار سال ان کا وہاں قیام رہا۔ ۱۹۸۰ میں یونیورسٹی سے سندِ فراغت حاصل کی۔ وہاں سے یہ ایک نیا جذبہ، نئی سوچ، نئی فکر اور نیا اسلوب فہم لے کر واپس آئے۔

پہلے یہ قرآن کے الفاظ کل من علیھا فان (زمین کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے) کے مطابق ''

عبدالستار فانی'' کہلاتے تھے اور اس نام سے جماعتی اخباروں میں مختلف موضوعات پر ان کے مضامین بھی شائع ہوئے۔ مدینہ طیبہ میں انھوں نے اپنے استاذ شیخ محمد بن حماد انصاری سے نبی ﷺ کی یہ حدیث سنی کہ ''اللہ کے نزدیک بہترین بندے الحمادون ہیں یعنی جو کثرت سے اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔ یہ حدیث سن کر انھوں نے عبدالستار حماد کہلانا شروع کر دیا اور اسی نام سے شہرت پائی۔

مدینہ منورہ میں قیام کے زمانے میں تعلیم کے علاوہ حافظ عبدالستار حماد نے حسب ذیل خدمات سرانجام دیں۔

❀...... مسجد نبوی کے خطیب کے خطبہ جمعہ کا بالالتزام اردو ترجمہ کر کے ہفت روزہ '' اہل حدیث'' کو بھیجتے رہے اور وہ خطبات اس اخبار میں شائع ہوئے۔

❀...... شیخ عبدالعزیز بن باز کے بیس سے زائد اصلاحی کتابچوں کا اردو ترجمہ کیا، جسے چھوٹے چھوٹے رسائل کی صورت میں مکتبہ الدعوہ نے ہزاروں کی تعداد شائع کر کے تقسیم کیا۔

❀...... محمد عمر یمنی اور محمد عبداللہ یمنی کو عربی میں باقاعدہ علم الفرائض پڑھایا۔

❀...... محمد سعد الحربی ان سے قواعد اللغۃ العربیہ یعنی گرامر پڑھتے رہے۔

❀...... ہر مہینے کے اختتام پر مدینہ منورہ سے عمرے کے لیے مکہ مکرمہ جاتے۔ وہاں اہل علم سے ملاقات ہوتی۔ اس سلسلے میں حافظ فتح محمد (فتحی) بالخصوص ان کے معاون ہوتے۔ حافظ فتحی روزانہ بیت اللہ شریف میں بیٹھتے تھے اور اصحاب علم کا ہجوم ان کے اردگرد رہتا تھا۔

تدریسی خدمات

اب حافظ عبدالستار حماد کی تدریسی خدمات کی طرف آتے ہیں۔

۱۹۸۰ میں وہ مدینہ یونیورسٹی کی تعلیم سے فارغ ہوئے تو ادارۃ البحوث العلمیہ ریاض کی طرف سے پاکستان میں ان کی تقرری عمل میں آئی۔ اس سے قبل مولانا محمد یوسف بانی و مہتمم دارالحدیث کمالیہ (راجو وال ضلع قصور) کی صاحب زادی سے ان کی شادی ہو چکی تھی (جس کا ذکر آگے آئے گا) مولانا چاہتے تھے کہ تدریس کے لیے ان کی تقرری راجو وال کے دارالحدیث میں کی جائے، چنانچہ اس کے لیے وہ سفارشی کے طور پر علامہ احسان الٰہی ظہیر کو ساتھ لے کر مکتبہ الدعوہ (پاکستان) کے مدیر شیخ عبدالعزیز بن محمد کی خدمت میں گئے۔

علامہ صاحب نے ان سے بات کی تو انھوں نے ان الفاظ میں دوٹوک جواب دیا:

اما الشیخ عبدالستار فقضی الامر الذی فیہ تستفتیان.

''یعنی شیخ عبدالستار کے متعلق فیصلہ تو پہلے ہی کر دیا گیا ہے''

انھوں نے حافظ عبدالستار حماد کا تقرر جامعہ اسلامیہ (بند روڈ لاہور) میں کردیا۔ لیکن وہاں عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ چند لڑکے تھے، وہ بھی وہاں سے نکلنے کی تیاری کر رہے تھے۔ حافظ عبدالستار حماد فرماتے ہیں، اس سے پہلے انھوں نے خواب دیکھا تھا کہ انھیں ایک سکول کا ہیڈ ماسٹر بنا دیا گیا ہے، جس میں پڑھنے والا کوئی نہیں ہے۔ جامعہ اسلامیہ بند روڈ میں پہنچے تو پتا چلا کہ ان کے خواب کی یہ تعبیر ہے۔ بہرحال حافظ صاحب نے وہاں دو سال تدریس اور ادارت کے فرائض انجام دیے۔ ان دنوں وہ سمن آباد کی مسجد الہدیٰ میں خطبہ جمعہ دیتے تھے اور اہل وعیال سمیت وہیں ان کی رہائش تھی۔ اس طرح تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا اور خطابت کا بھی۔!

دو سال کے بعد ان کا تبادلہ جامعہ عزیزیہ ساہیوال میں کردیا گیا۔ وہاں نیا نیا شعبہ تدریس قائم کیا گیا تھا جو کامیاب نہ ہوسکا۔

اب انھیں وہاں سے مدرسہ عربیہ انوریہ طاہروالی (ضلع رحیم یار خاں) بھیج دیا گیا۔ یہ مدرسہ دیوبندی نقطہ نظر کے حضرات کا تھا۔ ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے ہر روز کوئی نہ کوئی ناخوش گوار مسئلہ پیدا ہوجاتا تھا۔ ایک دن وہاں مولانا عبداللہ درخواستی تشریف لے گئے تو اصحاب مدرسہ نے انھیں حافظ عبدالستار حماد کے متعلق بتایا کہ یہ استاد سعودی عرب کی طرف سے ہمارے مدرسے میں مقرر کیے گئے ہیں۔ مولانا عبداللہ درخواستی نے اس پر تبصرہ فرمایا کہ دراصل یہ لوگ شکاری ہیں اور شکار کے لیے ہمارے مدارس کا رخ کرتے ہیں۔ ان کی یہ بات کسی حد تک صحیح تھی۔ اس مدرسے کے بعض لڑکوں کو جب احادیث کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئیں تو انھوں نے وہاں سے نکل کر اہل حدیث مدارس میں داخلہ لے لیا۔ حافظ عبدالستار حماد کی رہائش ایک مدرس حافظ شبیر احمد کے ساتھ تھی۔ وہ بھی ان کی رفاقت میں رہ کر ان سے متاثر ہوئے اور تقلید کی مخالفت کرنے لگے۔

حافظ عبدالستار حماد ۲۶۔ اکتوبر ۱۹۸۲ سے ۲۰۔ جولائی ۱۹۸۴ تک مدرسہ عربیہ انوریہ میں رہے اور ان کی تدریس سے مدرسے کے طلبا پر بہت اچھے اثرات پڑے۔

۲۳۔ جولائی ۱۹۸۴ کو مدرسہ عربیہ انوریہ سے حافظ عبدالستار حماد کا تبادلہ مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں کردیا گیا۔ ان دنوں مولانا فضل الرحمٰن مدرسہ قاسم العلوم کی تدریس چھوڑ کر سیاست کی وادی میں داخل ہوگئے تھے۔ ان کے اسباق حافظ عبدالستار حماد کے سپرد کردیے گئے تھے۔ حافظ صاحب اس مدرسے میں نفحۃ العرب، مقامات حریری اور دروس البلاغہ پڑھاتے تھے۔ مدرسہ قاسم العلوم میں ان کی تدریس صرف چھ ماہ پر مشتمل ہے۔ اس اثنا میں ان کا قیام دارالحدیث محمدیہ میں رہا۔

۲۷۔ نومبر ۱۹۸۴ کو ان کا تقرر بہ طور عربی ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول میاں چنوں کردیا گیا۔ وہ پانچ سال وہاں رہے۔ اس دوران میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات اور بہاء

الدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے ایم اے عربی کا امتحان پہلی پوزیشن میں پاس کیا۔ سکول میں اگرچہ درسیات کی متداول کتابیں پڑھانے کا سلسلہ نہیں تھا، لیکن ان کے دروس قرآن سے طلبا کے ذہن بدلے اور دینیات کی طرف ان کا رجحان ہوا۔

۱۲۔ جون ۱۹۸۸ کو ان کا تبادلہ اپنی مادر علمی جامعہ سلفیہ میں ہوگیا، جہاں سے وہ بارہ سال قبل ۱۹۷۶ میں مدینہ یونیورسٹی کو روانہ ہوئے تھے۔ یہاں وہ چار سال خدمات سرانجام دیتے رہے۔ تدریس کے علاوہ دارالافتا میں رضا کارانہ طور پر فتویٰ نویسی کی ذمہ داری بھی ان کے سپرد تھی اور رسالہ ترجمان الحدیث کی ادارت بھی انہی کے حوالے کردی گئی تھی۔ یہاں کے اساتذہ اور طلبا سے وہ بے حد خوش تھے۔ ذہنی ہم آہنگی، مسلکی یک جہتی اور فکری موافقت اللہ کا بہت بڑا احسان تھا۔ یہاں ترجمہ قرآن، کتب فقہ، صرف ونحو، اصول حدیث اور تخریج وغیرہ کی تدریس ان کے ذمے تھی۔ پانچ سال کا عرصہ انتہائی مسرت کے ساتھ انھوں نے یہاں گزارا۔

اس کے بعد اچانک انھیں اطلاع دی گئی کہ وہ جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن چلے جائیں، چنانچہ وہ وہاں تشریف لے گئے۔ جامعہ تعلیم الاسلام کا ماحول بھی ان کے فکر و ذہن کے عین مطابق تھا۔ یہاں بھی ان کا ذہین طلبا اور خوش مزاج اساتذہ سے واسطہ پڑا۔ جامعہ تعلیم الاسلام میں ان کو جامع ترمذی، عقیدہ طحاویہ اور حجۃ اللہ البالغہ جیسی کتابیں پڑھانے کا موقع ملا۔ یہاں کی مدتِ تدریس صرف ایک سال رہی۔

پھر جامعہ اشاعۃ العلوم چیچہ وطنی بھیج دیے گئے۔ بعد ازاں کچھ عرصہ دارالحدیث محمدیہ ملتان میں رہے۔ اس کے بعد دوبارہ جامعہ اشاعۃ العلوم چیچہ وطنی تبادلہ کردیا گیا۔ یہ سطور ۱۵۔ ستمبر ۲۰۰۷ء کو لکھی جارہی ہیں۔ اب تک وہ چیچہ وطنی میں مصروف تدریس ہیں اور صحیح بخاری، فوز الکبیر، مصطلح الحدیث، ہدایۃ النحو اور نفحۃ العرب کی تدریس ان کے ذمے ہے۔ وہ اٹھائیس سال سے مختلف مدارس میں خدمت تدریس سرانجام دے رہے ہیں۔

چند تلامذہ

اس طویل عرصے میں بے شمار طلبا نے ان سے تحصیل علم کی جن میں سے متعدد حضرات مختلف مقامات میں تدریس و خطابت اور دیگر اہم خدمات پر مامور ہیں۔ ان سب کے نام تو کسی کو بھی یاد نہیں ہوں گے اور یاد ہوں بھی تو ان سب کے نام لکھے نہیں جاسکتے، البتہ ان میں سے بعض حضرات کے اسمائے گرامی یہاں درج کیے جاتے ہیں۔ سید ضیاء اللہ شاہ بخاری (ساہیوال)، سیف اللہ خالد (دارالاندلس لاہور) حافظ شبیر احمد (جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ) حافظ محمد نذیر (ڈیرہ غازی خاں) حافظ

عبدالماجد (ڈیرہ غازی خاں) حافظ محمد ایوب (شیخ الحدیث مدرسہ تعلیم القرآن حیدر آباد) پروفیسر عبدالرحمٰن عتیق (انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد) محمد سعد مکی (مدرس الحرم المکی مکہ مکرمہ) حافظ عبدالغفار (خطیب مسجد الفردوس میاں چنوں) محمد عمر یمنی (مدرس مدرسہ اشاعۃ التوحید یمن) محمد عبداللہ یمنی (مدرس مدرسہ اشاعۃ التوحید یمن) محمد ہارون سوڈانی (مدرس مدرسہ اسلامیہ سوڈان) محمد سرور عاصم (مکتبہ اسلامیہ، فیصل آباد و لاہور) قاری رفیق الرحمٰن (قباء اسلامک اکیڈیمی سرگودھا) عبداللطیف (مدرسہ البدر الاسلامیہ بہاول پور) قاری محمد ایوب (جامعہ ختم النبوت چنیوٹ)

جہاد افغانستان

اب چند الفاظ حافظ عبدالستار حماد کی جہادی سرگرمیوں کے بارے میں۔!

۱۹۸۸ سے ۱۹۹۲ء تک کم وبیش پانچ سال حافظ عبدالستار حماد جامعہ سلفیہ میں بہ سلسلہ تدریس قیام فرما رہے۔ اس زمانے میں افغانستان میں روس کے ساتھ جہاد جاری تھا۔ ۱۹۸۸ میں جامعہ میں سالانہ چھٹیاں ہوئیں تو حافظ صاحب نے پچاس طلبا کے ساتھ اس جہاد میں شرکت کی۔ مولانا محمد داؤد فہیم بھی ان کے ہمراہ تھے۔ یہ قافلہ پشاور سے ہوتا ہوا پارا چنار کے راستے صوبہ جاجی گیا، جہاں چند عرب مجاہدین کی معاونت سے ایک ٹریننگ سنٹر قائم تھا۔ اس سنٹر کے انچارج ذکی الرحمٰن لکھوی تھے۔ دو مہینے حافظ عبدالستار حماد اور ان کے ساتھیوں کا قیام وہاں رہا۔

آئندہ سال کی سالانہ چھٹیوں میں حافظ صاحب تیس طلبا کے قافلے کے ساتھ جہاد کے لیے روانہ ہوئے اور افغانستان کے مختلف مقامات میں خدمات انجام دیں۔ وہاں انھوں نے بہت کچھ سیکھا۔ بہت لوگوں سے ملے اور افغانستان کے متعدد پہاڑی علاقوں میں جانے اور جہادی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے مواقع حاصل ہوئے۔ یہ ان کی زندگی کا ایک مستقل موضوع اور عجیب و غریب تجربہ ہے، جس کی اس مضمون میں تفصیل بیان کرنا مشکل ہے۔ یہ ایک کتاب کا موضوع ہے۔ میرے خیال میں حافظ صاحب کو اس کے متعلق وضاحت سے لکھنا چاہیے کہ وہ کہاں کہاں گئے۔ کن کن لوگوں سے ملے۔ اس علاقے کی کیا صورت حال ہے اور جہاد افغانستان سے ان پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔ اس کا موجودہ صورت حال سے بھی موازنہ کرنا چاہیے۔ یہ بھی بتانا چاہیے کہ اس جہاد سے پاکستان کو کیا فائدہ پہنچا۔

کویت میں دعوت دین

حافظ عبدالستار حماد باہمت عالم دین اور اسلام کے مخلص ترین داعی ہیں۔ ۵۔ دسمبر ۱۹۹۹ کو

انھیں جمعیت احیاء التراث الاسلامی کویت کی معرفت وہاں کی وزارت اوقاف کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہوا کہ وہ یہاں تشریف لائیں اور وزارت اوقاف کے مرتبہ پروگرام کے مطابق اصلاح معاشرہ کے متعلق تقریریں کریں۔ چنانچہ وہ اسلام آباد میں کویت کے سفارت خانے پہنچے اور ٹکٹ اور ویزے کے لیے ان سے گفتگو کی۔ یہ مرحلہ طے ہوا تو ۲۳۔ دسمبر ۱۹۹۹ کو لاہور سے کویت کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ چار گھنٹے کا ہوائی سفر تھا۔ کویت کے ہوائی اڈے پر ان کے کاغذات کی جانچ پڑتال میں کافی وقت لگا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو حضرات ہوائی اڈے پر ان کو لینے کے لیے آئے تھے وہ مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔ ضروری کارروائی سے فراغت کے بعد حافظ صاحب اکیلے ہی جلیب الشیوخ پہنچے جہاں جمعیت احیاء التراث الاسلامی کا دعوتی سنٹر ہے اور مولانا عبدالخالق محمد صادق اس کے انچارج ہیں۔ انھی کے تحریک سے کویت میں حافظ صاحب کا دعوتی پروگرام ترتیب دیا گیا تھا۔ ہمارے دوست مولانا عارف جاوید محمدی بھی وہیں ہیں جو جماعت اہل حدیث کے سرگرم رکن ہیں۔

حافظ عبدالستار حماد کو کویت میں سرکاری طور پر دعوت دی گئی تھی۔ اس لیے ان کا قیام کراؤن پلازہ میں تھا جو کویت کا ایک بہترین ہوٹل ہے۔ ڈرائیور سمیت انھیں گاڑی بھی دی گئی تھی۔ کھانے پینے کا انتظام بھی ہوٹل میں تھا۔ وہاں ان کا متعدد حضرات سے تعارف ہوا جن میں حافظ ڈاکٹر محمد اسحاق زاہد، حاجی محمد یعقوب اور محمد عبداللہ شاد کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ دعوتی پروگرام کا عملی پروگرام مولانا عبدالخالق محمد صادق نے ترتیب دیا تھا۔

حافظ عبدالستار حماد نے ۲۴۔ دسمبر ۱۹۹۹ سے لے کر ۱۲۔ جنوری ۲۰۰۰ء تک کویت کی مختلف مساجد میں مختلف موضوعات پر تقریریں کیں اور وہ ۱۲ جنوری کا آخری پروگرام کر کے اسی تاریخ کو واپس پاکستان تشریف لے آئے۔

تصنیفی خدمات

اب حافظ عبدالستار حماد کی تصنیفی تگ و دو کی طرف آیئے۔

حافظ صاحب نے مدینہ یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران ہی میں قلم و قرطاس سے رابطہ پیدا کر لیا تھا۔ اس کا آغاز انھوں نے ترجمے سے کیا۔ جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا وہ ہر جمعے کو مسجد نبوی کے خطیب کے خطبے کا ترجمہ کر کے اخبار "اہل حدیث" کو اشاعت کے لیے بھیجتے تھے۔ اس طرح ان کے بہت سے خطبات کے تراجم اس اخبار میں شائع ہوئے۔

دوران تعلیم ہی میں انھوں نے شیخ عبدالعزیز بن باز کے مختلف عربی رسائل کو اردو میں منتقل کیا، جس کی تفصیل یہ ہے (۱) غیر اللہ سے فریاد اور اسلام (۲) بدعات و رسوم اور اسلام (۳) فتنہ انکار

حدیث اور اسلام (۴) فضیلت جہاد اور اسلام (۵) تصویر کشی اور اسلام (۶) دعوت وتبلیغ اور اسلام (۷) ماہِ رمضان اور اسلام (۸) جشن میلاد اور اسلام (۹) فریضہ زکوٰۃ اور اسلام (۱۰) ایک جھوٹا وصیت نامہ (۱۱) پردہ اور اسلام (۱۲) ناموس عورت اور اسلام (۱۳) قوم یہود اور اسلام (۱۴) شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کی دعوت (۱۵) نصرت ایزدی اور اسلام (۱۶) اہمیت نماز اور اسلام (۱۷)طریقہ نماز نبوی (۱۸) رہنمائے حج وعمرہ۔

شیخ عبدالعزیز بن باز کے ان رسالوں کا اردو ترجمہ رسائل کی صورت میں سعودی عرب بھی ہزاروں کی تعداد میں چھپا اور اردو دان طبقے نے اس ترجمے سے بے حد استفادہ کیا۔ پاکستان میں یہ رسائل مرکز الدراسات الاسلامیہ ۱۲۹۔ ۱۵ ایل میاں چنوں ضلع خانیوال کی طرف سے معرض اشاعت میں آئے۔

اس کے علاوہ حافظ عبدالستار حماد نے سعودی عرب کے اس دور کے چیف جسٹس شیخ عبداللہ بن حمید کے رسائل اردو میں شائع کیے، جن کے نام یہ ہیں۔

(۱) پند ونصیحت (۲) نظام اشتراکیت اور اسلام۔

حافظ صاحب نے شیخ عبدالرحمٰن ناصر سعدی کے ایک عربی رسالے کا اردو ترجمہ ''تمباکو نوشی کا شرعی حکم'' کے نام سے شائع کیا۔

عقیدے کے موضوع پر حافظ صاحب نے شیخ محمد صالح عثیمین کے ایک عربی رسالے کا ترجمہ بنام ''عقیدہ اہل السنۃ والجماعہ کتاب وسنت کی روشنی میں'' کیا جو مرکز الدراسات الاسلامیہ ۱۲۹۔ ۱۵، ایل میاں چنوں کی طرف سے شائع ہوا۔

دارالحدیث مکہ مکرمہ کے ایک سلفی المسلک استاذ شیخ محمد جمیل زینو کا عقیدے سے متعلق ایک رسالہ عربی سے اردو کے قالب میں ڈھال کر ''اصلاح عقیدہ'' کے نام سے طبع کیا۔ اس رسالے کو اس قدر قبولیت عامہ نصیب ہوئی کہ مختلف ممالک میں اب تک اس کے پندرہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پاکستان کے کئی پبلشروں نے اسے شائع کیا۔

یہ وہ رسائل ہیں، جن کا حافظ عبدالستار حماد نے مدینہ یونیورسٹی کے زمانۂ طالب علمی میں عربی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا اور ان کی اشاعت عمل میں آئی۔

اب ذیل میں ان کی ان قلمی خدمات کا ذکر کیا جاتا ہے جو انھوں نے نصابی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد تدریسی دور میں سرانجام دیں۔ ان کا تعلق ترجمے سے بھی ہے اور تصنیف وتالیف سے بھی۔

①...... مختصر صحیح بخاری: یہ کتاب دراصل نویں صدی ہجری کے ایک محدث جلیل امام زین

الدین احمد بن عبداللطیف زبیدی کی تصنیف ہے، جس کا نام انھوں نے ''التجرید الصریح لاحادیث الجامع الصحیح'' رکھا ہے۔ یہ صحیح بخاری کی مرفوع متصل احادیث کا انتخاب و اختصار ہے۔ امام بخاری فقہی مسائل کے استنباط کی وجہ سے ایک ایک حدیث بعض دفعہ متعدد مقامات پر لے آئے ہیں، امام زبیدی نے محنت کر کے یہ تکرار ختم کر دیا ہے اور حدیث صرف ایک دفعہ ایسے باب کے تحت درج کر دی ہے، جس کے ساتھ اس کی مطابقت بالکل واضح ہے۔ اس بنا پر انھوں نے امام بخاری کے بہ صورت ''کتاب'' قائم کردہ بعض بڑے عنوانات اور بہت سے ذیلی عنوانات (باب) بھی حذف کر دیے ہیں۔ یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد ۷۴۸ صفحات کا اور دوسری جلد ۶۴۵ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ حافظ عبدالستار حماد نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے اور فاضل مترجم نے جن مقامات پر ضروری سمجھا وہاں مختصر مگر جامع فوائد بھی تحریر کیے ہیں۔ ترجمہ شگفتہ اور رواں دواں ہے۔ ترجمہ و فوائد پر نظر ثانی جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) کے شیخ الحدیث مولانا حافظ عبدالعزیز علوی نے کی ہے۔ یہ کتاب مشہور بین الاقوامی طباعتی و اشاعتی ادارے ''دارالسلام'' نے شائع کی ہے۔ پاکستان میں اس ادارے کا مرکز لاہور میں پنجاب سیکرٹریٹ کے قریب ہے۔

۲...... آئینہ جمال نبوت: یہ ابراہیم بن عبداللہ حازمی کی عربی تصنیف ہے جس میں نبی ﷺ کے حلیہ مبارک اور آپ کے حسن و رعنائی کا دلکش انداز میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ حافظ عبدالستار حماد نے خوب صورت الفاظ میں اس کا اردو ترجمہ کیا ہے اور اس میں درج احادیث کی تخریج و تحقیق کا فریضہ معروف عالم دین مولانا حافظ زبیر علی زئی نے سرانجام دیا ہے۔ یہ کتاب بھی دارالسلام نے شائع کی ہے۔

۳...... حجیت حدیث: حجیت حدیث نہایت اہم موضوع ہے۔ اس کتاب میں حافظ عبدالستار حماد نے اس موضوع پر وضاحت سے گفتگو کی ہے اور منکرین حدیث کی طرف سے حدیث کی جمع و تدوین پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں، اس کے محققانہ اسلوب میں جواب دیے ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت بھی دارالسلام کی طرف سے ہوئی ہے۔

۴...... اسلامی قانونِ وراثت: یہ کتاب مولانا ابونعمان بشیر احمد کی تصنیف ہے۔ حافظ عبدالستار حماد نے اس پر نظر ثانی فرمائی ہے۔ عالمی اشاعتی ادارے دارالسلام نے اسے شائع کیا ہے۔

۵...... تسہیل مقدمہ ابن الصلاح (سوالاً جواباً) اصول حدیث کے موضوع پر یہ نہایت اہم کتاب امام و محدث ابن الصلاح کی تصنیف ہے جو دینی عربی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ حافظ عبدالستار حماد نے اساتذہ و طلبا کی سہولت کے لیے سوال و جواب کی صورت میں اس کا آسان اردو ترجمہ کر دیا ہے۔ اسے مکتبہ ناصریہ امین پور بازار فیصل آباد نے شائع کیا ہے۔

⑥...... قیام رمضان اور احکام صیام وعیدین: یہ علامہ ناصر الدین البانی کی عربی تصنیف ہے جو قیام رمضان، روزے کے احکام، عیدین کے مسائل اور قربانی کے آداب پر مشتمل ہے۔ حافظ عبدالستار حماد نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔

⑦...... کتاب الجہاد: امام المحدثین عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کی اس تصنیف کا اردو ترجمہ مولانا ابوسعید عبدالحنان نے کیا ہے اور اس پر نظر ثانی حافظ عبدالستار حماد نے کی ہے۔ مقدمہ بھی انھوں نے لکھا ہے۔ ناشر ہے مکتبہ دارالہدیٰ، لاہور۔

⑧...... المستفاد من مبهمات المتن والاسناد: شیخ الاسلام علامہ ولی الدین ابو زرعہ احمد بن عبدالرحیم مصری کی اس عربی کتاب پر تقدیم و تعلیق کی خدمت حافظ عبدالستار حماد نے انجام دی ہے اور اسے مرکز الدراسات الاسلامیہ ۲۹۔، ۱۵، ایل نے شائع کیا ہے۔

⑨...... قرآنی قاعدہ: چھوٹے سائز کے ۳۲ صفحات پر مشتمل یہ قرآنی قاعدہ بچوں کے لیے لکھا گیا ہے۔ استاذ اسے اچھی طرح بچے کو پڑھا دے تو قرآن مجید آسانی سے تھوڑی مدت میں پڑھا جاسکتا ہے۔ قرآنی قاعدہ مرکز الدراسات الاسلامیہ میاں چنوں کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔

⑩...... فتاویٰ اصحاب الحدیث: حافظ عبدالستار حماد کی تصنیفی خدمات میں ایک قابل ذکر خدمت ''فتاویٰ اصحاب الحدیث'' ہے۔ یہ ان کی نہایت محققانہ خدمت ہے۔ لوگ ان سے مختلف دینی مسائل کے بارے بذریعہ خطوط سوال کرتے ہیں اور وہ بہت سی کتابوں کا مطالعہ کر کے قرآن و حدیث اور ائمہ دین کے فرامین کی روشنی میں ان کو جواب دیتے ہیں۔ یہ بے حد محنت طلب اور نازک تریں سلسلہ ہے۔ فتاویٰ اصحاب الحدیث کی پہلی جلد مطبوعہ جنوری ۲۰۰۶ء اس وقت ہمارے سامنے ہے جو بڑے سائز کے پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ حرف اول کے عنوان سے مصنف شہیر کے مقدمے کے بعد ''پیش لفظ'' مولانا عبدالخالق بن محمد صادق مدنی (کویت) کا تحریر فرمودہ ہے، جس میں فتویٰ اور مفتی اور مستفتی کے بارے میں انتہائی ضروری باتیں تحریر فرمائی گئی ہیں۔

اس کے بعد ''فتاویٰ اصحاب الحدیث'' کے فاضل مصنف نے جن فتووں کا جواب دیا ہے ان کے اہم عنوانات یہ ہیں: ① توحید وعقیدہ ② رسالت و ولایت ③ طہارت و وضو ④ اذان و نماز ⑤ جنائز و زیارت قبور ⑥ زکوٰۃ و صدقات ⑦ حج و عمرہ ⑧ روزہ و اعتکاف ⑨ خرید و فروخت ⑩ وصیت و وراثت ⑪ نکاح و طلاق ⑫ جمعہ وعیدین ⑬ آداب و اخلاق اور ⑭ متفرقات۔

یہ ''فتاویٰ اصحاب الحدیث'' کی پہلی جلد ہے جو مکتبہ اسلامیہ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور اور مکتبہ اسلامیہ امین بازار فیصل آباد نے شائع کی ہے۔ اس سے آگے بھی ان شاء اللہ فتاویٰ اصحاب الحدیث کی اشاعت کا سلسلہ چلے گا۔

ان تصانیف و تراجم کے علاوہ حافظ صاحب کے مختلف رسائل میں شائع ہونے والے مضامین مندرجہ ذیل ہیں۔

①...... ماہنامہ ''ترجمان الحدیث'' میں ''عصمت انبیا'' کے عنوان سے ان کا ایک مضمون اکیس قسطوں میں چھپا۔

②...... پندرہ روزہ ''صحیفہ اہل حدیث'' (کراچی) میں ''مزارعت کے جواز میں'' ان کا ایک مضمون سات قسطوں میں شائع ہوا۔ یہ مضمون ''فکر و نظر'' (اسلام آباد) کے ایک مضمون کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

③...... مولانا حمید الدین فراہی نے علامہ سیوطی کی کتاب ''الاتقان'' پر حواشی لکھے تھے، جن میں علامہ سیوطی کے طرزِ تحریر پر اعتراضات کیے گئے تھے۔ ان اعتراضات کا جواب حافظ عبدالستار حماد نے ''حواشئ فراہی پر ایک نظر'' کے عنوان سے لکھا جو ہفت روزہ ''اہل حدیث'' (جلد ۱۷، ۱۹۸۶) میں چھپا۔ یہ مضمون آٹھ اقساط پر مشتمل تھا۔

④...... ماہنامہ ''شہادت'' (اسلام آباد) میں حافظ صاحب ممدوح ''ایمان و عقیدہ'' کے عنوان سے مستقل طور پر لکھ رہے ہیں۔ یہ مضمون چار حصوں پر مشتمل ہے۔

① ایمان کی حقیقت ② کبیرہ گناہوں کی تفصیل ③ کبیرہ گناہوں کا کفارہ ④ ایمان کی شاخیں۔ اس مضمون کی تیس سے زیادہ قسطیں چھپ چکی ہیں۔ ⑤ہفت روزہ ''اہل حدیث'' میں احکام و مسائل کے عنوان سے ہر ہفتے ان کے فتوے شائع ہو رہے ہیں۔

اس کے علاوہ الاعتصام، تعلیم الاسلام، ام القریٰ میں ان کے مختلف عنوانات سے متعدد مضامین شائع ہوئے۔

دو اہم منصوبے

ان تالیفات و تراجم اور مضامین کے علاوہ خدمت حدیث کے دو منصوبے اور ہیں جن پر حافظ عبدالستار حماد کی نگرانی میں ''مرکز الدراسات الاسلامیۃ'' کے ذیلی ادارے ''خدمۃ الکتاب والسنۃ'' کے تحت یکم محرم ۱۴۲۲ھ (۲۶۔ مارچ ۲۰۰۱ء) سے کام ہو رہا ہے۔

پہلا منصوبہ یہ ہے کہ مسند امام احمد کا (جو تیس ہزار سے زائد احادیث پر مشتمل ہے) اردو ترجمہ کیا جائے اور فوائد ضبط تحریر میں لائے جائیں جن کا انداز خالص محدثانہ اور فقیہانہ ہو، الفتح الربانی کی ترتیب کے مطابق۔ فوائد مندرجہ ذیل خصوصیات پر مشتمل ہونا چاہئیں۔

❀...... زندگی میں پیش آنے والے تمام مسائل کا مسند امام احمد کی احادیث سے حل پیش کیا جائے۔

❀......جن احادیث میں بہ ظاہر تعارض معلوم ہوتا ہو، ان میں تطبیق یا ترجیح کی صورت پیدا کی جائے۔

❀......منکرین حدیث کے اعتراضات کا اچھے الفاظ میں بادلائل جواب دیا جائے۔

❀......ملحدین و مستشرقین کی طرف سے مسند امام احمد پر جو اعتراضات وارد کیے جاتے ہیں، ان کا جائزہ لیا جائے اور صحیح ترین جواب دیا جائے۔

❀......مسند امام احمد کی جو احادیث الفتح الربانی میں نہیں آسکیں، اگر وہ مل جائیں تو ان کے ترجمہ و تشریح کو بھی اس میں شامل کیا جائے۔

یہ منصوبہ بعض اہل علم کی محنت سے تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔

دوسرا منصوبہ یہ ہے کہ نبی ﷺ کی تمام صحیح احادیث کو جو حدیث کی مختلف کتابوں میں موجود ہیں، یک جا کرکے ان کا اردو اور انگریزی زبانوں میں ترجمہ کیا جائے۔ اس منصوبے پر متعدد اصحاب علم کام کر رہے ہیں۔ زیادہ تر کام ہو چکا ہے، کچھ باقی ہے۔ ان شاء اللہ جلد ہی اسے شائع کر دیا جائے گا۔

باہمت عالم دین

حافظ عبدالستار حماد ماشاء اللہ مستعد اور باہمت عالم دین ہیں۔ انھیں اللہ کے فضل سے رجال کار بھی میسر آگئے ہیں جو تیز رفتاری سے مصروفِ عمل ہیں۔ خود ان کا یہ حال ہے کہ صبح کی نماز کے بعد اپنی مسجد میں درس قرآن دیتے ہیں۔ اس کے بعد میاں چنوں سے پچیس کیلو میٹر دور چیچہ وطنی کے مدرسے میں فریضہ تدریس انجام دیتے ہیں۔ ظہر کے وقت وہاں سے اپنے گھر (میاں چنوں) آتے ہیں تو بچوں اور بچیوں کے اس مدرسے کی تعلیمی و انتظامی خدمت میں مصروف ہو جاتے ہیں جو انھوں نے جاری کر رکھا ہے۔ اسے باقاعدگی کے ساتھ چلانے کے لیے بے حد بھاگ دوڑ کرنا پڑتی ہے۔ اپنے علاقے میں دعوت و تبلیغ کے لیے بھی وقت دیتے ہیں۔ ملتان کی ایک سب سے قدیم اور بڑی مسجد اہل حدیث میں خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے ہیں۔ بچے حصول تعلیم کے لیے گھر سے باہر ہیں، گھریلو ذمہ داری بھی انھی کے سپرد ہے۔ صحیح بخاری پر کام شروع کر رکھا ہے۔ تقریباً تیرہ پارے مکمل ہو گئے ہیں۔ یہ کام نہایت محنت اور مطالعہ کا طالب ہے۔ اس طرح مختلف علمی کاموں میں وہ ہر وقت مصروف رہتے ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں تمام امورِ خیر کی انجام دہی کی توفیق مرحمت فرمائے۔

چند نا قابل فراموش واقعات

اب چند باتیں اور سنیے:

دورانِ تعلیم اور دورانِ تدریس حافظ صاحب کو کئی ایسے واقعات پیش آئے جو ان کے نزدیک انتہائی سبق آموز اور نا قابل فراموش ہیں۔ ان میں سے چند واقعات حسب ذیل ہیں۔

❀...... ۱۹۶۴ کا واقعہ ہے جب وہ جامعہ سعیدیہ چک نمبر ۷ میں قرآن مجید حفظ کرتے تھے، اس وقت وہاں بجلی نہ تھی، ایک لیمپ تھا، جس کے ارد گرد بیٹھ کر طلبا پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے لیمپ کا شیشہ توڑ دیا۔ اس بہانے رات پڑھنے سے چھٹی ہوگئی۔ استادِ محترم کی طرف سے یہ پروگرام دیا گیا تھا کہ صبح کی نماز کے بعد سبق پھر سبقی سنانا اور اس کے بعد آگے سبق لینا ہے۔ ظہر کے بعد منزل سنانا ہوتی تھی۔ اس رات نہ سبق یاد ہوا اور نہ سبقی کو دہرایا۔ حسب معمول صبح کی نماز کے بعد سبق سنانے گئے۔ رات کو سبق یاد کیا ہوتا تو آتا اس لیے ''کچا سبق'' ہونے کی وجہ سے انھیں واپس کردیا گیا۔ ان کے ساتھ بعض لڑکے بھی اس '' سازش'' میں شریک تھے۔ وہ بھی سبق نہ سنا سکے۔ استادِ محترم نے اس دن ان کی خوب مرمت کی۔ شرمندگی اس کے علاوہ اٹھانا پڑی۔ اس دن سے ''توبہ نصوح'' کی کہ آئندہ کوئی ایسا کام نہیں کریں گے جو اساتذہ کی خفگی کا باعث ہو۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اگر کسی وجہ سے لیمپ خراب ہوتا تو رات کو چاند کی چاندنی میں سبق یاد کرتے۔

❀...... ۱۹۶۹ کی بات ہے کہ حافظ صاحب مولانا عبدالقادر حلیم زیروی سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اپنی تعلیم کے علاوہ صبح صبح مقامی بچوں کو ناظرہ قرآن پڑھاتے تھے۔ ان کے والدِ محترم وہاں مسجد کے خادم اور موذن تھے جس کا انھیں پینتیس روپے مشاہرہ ملتا تھا۔ مولانا عبدالقادر زیروی نے ان سے کہا کہ ایک درخواست لکھو تا کہ انتظامیہ سے آپ کے لیے کچھ وظیفہ منظور کرایا جائے۔ انھوں نے عرض کیا کہ میں تو یہاں پڑھتا ہوں، کھانا وغیرہ مل جاتا ہے، میرے لیے یہی کافی ہے، لیکن مولانا کا اصرار تھا کہ ضرور درخواست لکھو۔ بالآخر وہ ایک دن خود درخواست لکھوا لائے اور اس پر ان سے دستخط کرالیے۔ اب یہ انتظار کرنے لگے کہ وظیفہ کب اور کتنا منظور ہوتا ہے؟ دو تین ہفتے انتظار کرنے کے بعد ایک دن انھوں نے خود ہی مولانا سے پوچھ لیا کہ وہ درخواست کس مرحلے میں ہے؟ فرمانے لگے کہ میں نے یہ درخواست انتظامیہ کو پیش کی تھی۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم اس کے والد کو پینتیس روپے تنخواہ دیتے ہیں۔ اس لیے اسے وظیفہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں اس دن میں دنیا دار انتظامیہ کے رویے سے آگاہ ہوا کہ یہ لوگ کس طرح غریبوں کا استحصال کرتے ہیں۔ نیز پتا چلا کہ دنیا کا لالچ محض دھوکے کا سامان ہے یہ لوگ مسجد میں

بھی وہی کچھ کرتے ہیں جو اپنے کاروباری اداروں میں کرتے ہیں۔

❀...... ۱۹۷۱ میں حافظ صاحب جلال پور پیر والا میں زیر تعلیم تھے۔ انھوں نے اساتذہ کے لیے عصر کے بعد مسواکیں فراہم کرنا ہوتی تھیں۔ اس لیے انھوں نے کلہاڑی رکھی تھی اور وہاں انھیں ''کلہاڑی والا جوان'' کہا جاتا تھا۔ یہ ایک خدمت تھی۔ اس خدمت کا اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں یہ صلہ دیا کہ حصول تعلیم کے لیے جہاں بھی گئے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ جلال پور پیر والا کے ممتحن مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی تھے۔ انھوں نے ان کی کلاس کا زبانی طور پر اجتماعی امتحان لیا تھا۔ نتیجہ نکلا تو حافظ صاحب کی پہلی پوزیشن تھی۔

❀...... ۱۹۷۶ کا واقعہ ہے جب حافظ صاحب حصول تعلیم کے لیے مدینہ یونیورسٹی داخل ہوئے۔ سالانہ چھٹیوں میں انھیں تین ماہ کا اکٹھا وظیفہ دیا جاتا تھا۔ پہلے سال چھٹیوں میں وہ مدینہ منورہ سے عمرہ کرنے کی غرض سے مکہ مکرمہ آئے۔ عمرہ کرنے کے بعد ایک مرتبہ عام لباس میں عمرہ کررہے تھے کہ کسی نے ان کی جیب سے پندرہ سو ریال نکال لیے جو تین ماہ کا وظیفہ تھا۔ بہت پریشان ہوئے کہ اب گزر اوقات کیسے ہوگی۔ اسی دن انھوں نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں شاہ فہد مرحوم کو خط لکھا جو اس وقت مدینہ یونیورسٹی کے چانسلر تھے کہ میری جیب کٹنے سے میں پندرہ سو ریال سے محروم ہوگیا ہوں۔ جب دو ہفتوں کے بعد وہ واپس مدینہ طیبہ گئے تو مدینہ یونیورسٹی کی طرف سے ایک نمائندہ انھیں تلاش کررہا تھا اور ان کی رہائش گاہ کے دو تین چکر لگا چکا تھا۔ حافظ صاحب کو پتا چلا تو وائس چانسلر کے دفتر پہنچے۔ انھوں نے شاہ فہد مرحوم کی طرف سے آمدہ پندرہ سو ریال کا چیک ان کے حوالے کیا اور کہا کہ اسے مدینہ طیبہ کے کسی بھی بنک میں جمع کراؤ اور اپنی رقم حاصل کرلو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے حکمرانوں کو کس قدر اپنی رعایا کا خیال ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حکومت کو تادیر قائم رکھے۔ (آمین)

❀...... مدینہ یونیورسٹی جانے سے پہلے حافظ عبدالستار حماد ۱۹۷۵ میں حافظ عبدالرحمٰن مدنی کے مدرسے میں مدرس تھے۔ اس وقت مدرسہ کے کونے میں بریلویوں کی ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ حافظ عبدالرحمٰن صاحب چاہتے تھے کہ اس مسجد پر قبضہ کرکے اسے مدرسے میں شامل کرلیا جائے۔ پروگرام کے مطابق ''کیر کلاں'' کے چند لوگوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ انھوں نے ہوائی فائرنگ کی اور مدرسے سے ملحقہ مسجد کی دیوار گرانا شروع کردی۔ محلے کے لوگ مزاحمت کے لیے باہر نکلے۔ عورتوں نے بھی اس میں حصہ لیا۔ قریب ہی اومنی بس کی ورکشاپ تھی۔ وہ لوگ مدرسے کو آگ لگانے کے لیے وہاں سے پٹرول لے آئے۔ پولیس کو پتا چلا تو انھوں نے جذباتی لوگوں کو منتشر کردیا۔ جن لوگوں کو لایا گیا تھا وہ تو فرار ہوگئے۔ حافظ عبدالستار حماد اس وقت بچوں کو پڑھا رہے تھے کہ چند

بچوں سمیت انھیں گرفتار کرلیا گیا۔ ان کے ساتھ حافظ عبدالرحمٰن مدنی کے بھانجے حافظ محمد ایوب بھی تھے۔ ان لوگوں کو ایک دن وحدت روڈ تھانے میں رکھا۔ پھر چالان کرکے کیمپ جیل پہنچا دیا گیا۔ اس طرح یہ پندرہ دن تک ''سنت یوسف'' اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس کے بعد ان کی ضمانت ہوئی اور باہر نکلے۔ حافظ عبدالستار حماد فرماتے ہیں کہ ایسے کاموں سے اجتناب کرنا چاہیے، جن سے دنیا میں ذلت کا سامنا کرنا پڑے۔ اللہ تعالیٰ سب کو معاف کرے۔

❀......۱۹۸۰ کی بات ہے کہ حافظ عبدالستار حماد نے مدینہ یونیورسٹی سے فراغت کے بعد مکہ مکرمہ میں جیاد تھانہ کی ملازمت اختیار کرلی۔ ان کا کام پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش میں رہنے والے لوگوں کی ترجمانی کرنا تھا۔ اس اثنا میں ان کے پاس ڈیرہ غازی خاں کے لوگوں کا مقدمہ آیا کہ ان میں سے ایک شخص غلام رسول نے کسی لڑکی کو اغوا کرلیا ہے۔ حافظ عبدالستار حماد انھیں پولیس کی حراست میں سماعت کے لیے جج کے پاس لے گئے۔ ان کی ترجمانی کے لیے وہ ملزموں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ جج نے ان کی طرف اشارہ کرکے کہا ''**انت غلام رسول**'' تو غلام رسول ہے؟ انھوں نے کہا کہ میں تو ترجمان ہوں۔ یہ سن کر جج صاحب اٹھے اور پولیس والوں کو ڈانٹا۔ نیز معذرت کرتے ہوئے انھیں وہاں سے اٹھایا اور اپنے برابر رکھی ہوئی کرسی پر بٹھا کر کہا آپ کے بیٹھنے کی یہ جگہ ہے۔ اس کے مقابلے میں جب ہم اپنے حکمرانوں کا رویہ دیکھتے ہیں تو حیران ہوتے ہیں۔ **ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔**

❀......۱۹۷۴ میں جب حافظ عبدالستار حماد دارالحدیث جلال پور پیر والا میں تعلیم حاصل کرتے تھے، وہاں کے ایک جادوگر سے ان کو جادو سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چند دن جادوگر کے پاس گئے جو انتہائی گندے اور غلیظ ماحول میں رہتا تھا۔ حافظ صاحب اسے اپنے سے مانوس کرنے کی کوشش کرتے اور خود بھی اس سے مانوس ہونے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرتے۔ آخر انھوں نے اس سے ایک دن اپنی آمد و رفت کا مقصد بیان کیا تو اس نے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ آپ کے پڑوس کے مدرسے میں تعلیم حاصل کرتا ہوں اور دن رات قرآن و حدیث پڑھنے میں مصروف رہتا ہوں۔ ان کی یہ بات سن کر جادوگر نے کہا کہ آپ جادو نہیں سیکھ سکتے، کیونکہ جادو سیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ سیکھنے والا قضائے حاجت کے بعد طہارت نہ کرے۔ ایسا کرنے سے جادو جلدی آتا ہے اور اس میں رنگ بھی گہرا ہوتا ہے۔ حافظ صاحب یہ سن کر حیران ہوئے اور یہ عقدہ کھلا کہ جادوگر خود کیوں اتنا گندا ہے اور کیوں غلیظ ماحول میں رہتا ہے۔

❀...... ۱۹۸۹ میں جب حافظ صاحب کا قیام جامعہ سلفیہ میں تھا اور وہاں وہ تدریس کے فرائض سر انجام دیتے تھے، انہی دنوں مولانا عبید اللہ رحمانی مبارک پوری (مؤلف مرعاۃ المفاتیح)

نے وفات پائی۔ یہ عظیم کتاب (مرعاۃ المفاتیح) ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت جسمانی اور ذہنی لحاظ سے حافظ صاحب تندرست اور توانا تھے۔ انھیں خیال ہوا کہ اس عظیم کتاب کو اسی نہج سے مکمل کرنا چاہیے اور اس کا تکملہ اور تتمہ لکھنا چاہیے۔ انھوں نے اس کام سے عہدہ برآ ہونے کا منصوبہ تیار کرلیا اور جامعہ سلفیہ کی انتظامیہ سے بات کی کہ وہ اس کام کے لیے ان کی معاونت کریں۔ اس کی صورت یہ پیش کی کہ مجھے دو اساتذہ دیے جائیں اور ان سے تدریس کا بوجھ کچھ ہلکا کردیا جائے تاکہ وہ دل جمعی اور یک سوئی سے اس کام میں حصہ لیں۔ لیکن افسوس کہ اس سلسلے میں ان کی حوصلہ افزائی نہ کی گئی۔ اس بنا پر یہ حسرت دل میں رہ گئی، جس کا انھیں بہت افسوس ہوا۔

شادی

ہم چلتے چلتے اتنی دور نکل آئے لیکن حافظ عبدالستار حماد کی شادی کے بارے میں کوئی بات نہ کرسکے۔ آیئے اب اس فرض سے بھی سبک دوش ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

حافظ صاحب کی شادی ۲۳۔ اگست ۱۹۷۸ کو مشہور عالم دین محترم المقام مولانا محمد یوسف بانی و ناظم دارالحدیث کمالیہ (راجو وال ضلع قصور) کی صاحب زادی سے ہوئی جو حافظ قرآن اور نیک باپ کی نیک بیٹی ہیں۔ بارات حافظ عبدالستار حماد کے استاذِ محترم مولانا عبدالقادر حلیم زیروی کی قیادت میں میاں چنوں سے راجو وال پہنچی۔ مولانا عبدالقادر اس وقت جامع مسجد اہل حدیث میاں چنوں کے خطیب اور وہاں کے مدرسے کے مدرس تھے اور دولھا میاں اس زمانے میں مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کررہے تھے اور چھبیس برس کے جوان رعنا تھے۔ بارات میں حافظ صاحب کے چند خاص رشتے داروں کے علاوہ حافظ عبدالغفار اعوان اور مولانا محمد داؤد فہیم بھی شامل تھے۔ نکاح مولانا عبدالقادر حلیم زیروی نے پڑھایا۔

شرعی اعتبار سے نکاح کا ایک لازمی حصہ حق مہر ہے جو دولھے کی حیثیت کے مطابق مقرر کیا جاتا ہے اور جس کا ادا کرنا بہرحال ضروری ہے۔ حافظ عبدالستار حماد کے نکاح کے موقع پر حق مہر کے متعلق بات ہوئی تو لڑکی کے والد مولانا محمد یوسف نے نکاح خواں مولانا عبدالقادر حلیم زیروی سے فرمایا کہ پونے تین تولے طلائی زیور حق مہر مقرر کیا جائے۔ نکاح خواں نے فرمایا یہ کیا حق مہر ہے۔ یہ برخوردار حافظ عبدالستار حماد کی حیثیت سے بہت کم ہے، اس سے زیادہ ہونا چاہیے۔

مولانا محمد یوسف نے جواب دیا اگر حق مہر زیادہ مقرر کردیا جائے تو مجھے ذاتی طور پر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ اس برخوردار کے گھر ہی چلا جائے گا۔ اگر آپ حق مہر کا مجھے فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں تو میری تجویز یہ ہے کہ میری کوشش سے میری بیٹی نے قرآن مجید کے اٹھارہ پارے یاد کیے

ہیں۔ برخوردار حافظ عبدالستار حماد میری بیٹی کو باقی بارہ پارے یاد کرا دے۔ بس یہی میری بیٹی کا حق مہر ہے۔ حاضرین مجلس نے اس حق مہر کو پسند کیا اور نکاح پڑھا دیا گیا۔

اولاد

اللہ تعالیٰ نے اس جوڑے کو سات بیٹوں اور تین بیٹیوں سے نوازا۔ ماشاء اللہ سب حافظ قرآن اور دینی تعلیم کے حصول میں کوشاں ہیں۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

① ...... فوزیہ حماد: یہ بڑی بیٹی ہے جو حافظ قرآن اور ایف اے پاس ہے۔ وفاق المدارس السّلفیہ سے الشہادۃ العالمیہ (بی اے) کیا ہے۔

② ...... محمد حماد: حافظ قرآن، مرکز الدعوہ السّلفیہ ستیانہ سے فارغ التحصیل، وفاق المدارس سے الشہادۃ العالمیہ اوّل پوزیشن میں حاصل کی۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے ایم اے کیا۔ اب اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں ایم فل کر رہے ہیں۔

③ ...... احمد حماد: حافظ قرآن، وفاق المدارس السّلفیہ سے الشہادۃ العالمیہ حاصل کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کیا۔ ان سطور کی تحریر کے وقت جامعہ اسلامیہ اسلام آباد کے کلیہ اصول الدین کے آخری سال میں پڑھ رہے ہیں۔

④ ...... حامد حماد: حافظ قرآن، لاہور میں جناب قاری محمد ادریس عاصم سے قرأت و تجوید کا ایک سالہ نصاب مکمل کیا۔ وفاق المدارس السّلفیہ سے الشہادۃ العالمیہ حاصل کرنے کے بعد بہاء الدین زکریا یونیورسٹی (ملتان) سے بی اے کیا۔ اب (ان سطور کی تحریر کے وقت) حافظ محمد شریف کے زیر نگرانی مرکز التربیۃ الاسلامیہ فیصل آباد میں تخصص فی الحدیث والفقہ کے طالب علم ہیں۔

⑤ ...... حامدہ حماد: حافظ عبدالستار حماد کی یہ بیٹی حافظہ قرآن ہیں۔ مرکز الدراسات الاسلامیہ کے زیر اہتمام تفسیر قرآن میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ وفاق المدارس السّلفیہ سے الشہادۃ العالمیہ کرنے کے بعد ریگولر بی اے کیا۔ اب علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم اے کا پروگرام ہے۔ مضمون نویسی کا صاف ستھرا ذوق رکھتی ہیں۔

⑥ ...... محمود حماد: حافظ قرآن اور سکول میں آٹھویں جماعت کا طالب علم۔

⑦ ...... حُمید حماد: سکول میں ساتویں جماعت کا طالب علم۔

⑧ ...... عمرہ حماد: یہ بچی مرکز الدراسات الاسلامیہ کے شعبہ تحفیظ القرآن میں پڑھ رہی ہے۔ بائیس پارے حفظ کر لیے ہیں۔

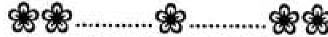
⑨ ...... حمید حماد: مرکز الدراسات الاسلامیہ کے شعبہ تحفیظ القرآن میں قرآن مجید حفظ کر رہے

ہیں۔ آٹھ پارے حفظ کر لیے ہیں۔

⑩...... خزیمہ حماد: یہ بچہ اپنی والدہ سے قرآنی قاعدہ پڑھ رہا ہے جو حافظ عبدالستار حماد نے ترتیب دیا ہے۔ ''قرآنی قاعدہ'' کا ذکر گزشتہ سطور میں حافظ صاحب کی تصنیفی خدمات میں کیا گیا ہے۔

یہ سطور ۱۵۔ ستمبر ۲۰۰۷ء تک ضبط تحریر میں لائی گئی ہیں۔ اس وقت تک حافظ عبدالستار حماد ساڑھے پچپن سال کی عمر کو پہنچ گئے ہیں۔ ماشاء اللہ صحت بہت اچھی ہے اور انھوں نے کام بھی بہت کیا ہے۔ وہ اپنے خاندان سمیت حالات کی جن منزلوں سے گزرے ہیں وہ بے حد عجیب و غریب ہیں۔ مناسب انداز میں ان سب باتوں کا ذکر گزشتہ سطور میں کر دیا گیا ہے۔ ان کو اللہ نے جو شہرت عطا فرمائی اور جس عروج سے نوازا، وہ اللہ کے دین کے حصول اور اس کی اشاعت کے لیے کوشاں ہونے اور کوشاں رہنے کا نتیجہ ہے۔

اب ان کا حلیہ میانہ قد، گندمی رنگ، گول چہرہ اور اس پر ابھرا ''تل'' جسے پنجابی میں ''موکا'' کہا جاتا ہے، ماتھے پر محراب، آنکھوں پر نظر کی عینک، صاف ستھرا مگر سادہ لباس، ملنسار اور خوش گفتار۔!



حافظ صلاح الدین یوسف

میانہ قد، گداز جسم، گندمی رنگ، گول چہرہ، گھنی سفید داڑھی، آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔ باطن کا معاملہ اللہ جانے یا وہ جانیں بہ ظاہر خوش مزاج، شلوار قیص میں ملبوس، یہ ہیں ہمارے دوست حافظ صلاح الدین یوسف۔! پاکستان کے معروف عالم اور مشہور مصنف و محقق۔!

حافظ صلاح الدین یوسف آزادیٔ برصغیر سے دو سال قبل ۱۹۴۵ میں ہندوستان کے شہر جے پور میں پیدا ہوئے۔ یہ ہندو راجپوتوں کی ایک ریاست کا دارالحکومت تھا اور یہی اس ریاست کا نام بھی تھا۔ آزادی کے بعد حکومت ہند نے ریاستیں ختم کردی تھیں اور ریاست جے پور کو صوبہ راجستھان میں شامل کردیا گیا تھا۔

حافظ صاحب کے والد گرامی کا نام حافظ عبدالشکور تھا۔ وہ معروف معنوں میں تو عالم دین نہ تھے لیکن علما کے نہایت قدر دان تھے۔ بے حد شوق سے ان کی مجلسوں میں بیٹھتے اور اپنے فہم کے مطابق ان سے استفادہ کرتے۔ ''حقیقۃ الفقہ'' کے مصنف مولانا محمد یوسف جے پوری کے شاگرد تھے۔ ان سے انھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا تھا۔ انہی کے نام پر انھوں نے اپنے اس بیٹے کا نام محمد یوسف رکھا۔ بعد میں جب محمد یوسف کا قلم و قرطاس سے رابطہ ہوا تو انھوں نے ''محمد'' کی جگہ صلاح الدین کا سابقہ لگایا اور صلاح الدین یوسف کہلانے لگے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ سلطان صلاح الدین ایوبی کا نام بھی دراصل یوسف تھا اور غالباً اسی وجہ سے ہمارے ممدوح صاحبِ ترجمہ نے اپنے لیے صلاح الدین یوسف کی ترکیب کو پسند فرمایا۔

صلاح الدین یوسف کا آبائی مولد و مسکن جے پور ایک پر امن شہر تھا۔ ۱۹۴۷ میں جب پورا برصغیر فسادات کی زد میں تھا، ریاست جے پور اس وقت ہر قسم کے ہنگاموں سے محفوظ تھی۔ لوگ ہندوستان سے پاکستان آرہے تھے لیکن ان کے والد حافظ عبدالشکور وہیں رہنا چاہتے تھے۔ اس اثنا میں حافظ صلاح الدین یوسف کے ایک بڑے بھائی اپنے دوستوں کے ساتھ پاکستان آگئے تھے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد ان کی شدید بیماری کی اطلاع پہنچی تو ان کے والد (حافظ عبدالشکور) نے بھی پاکستان آنے کا فیصلہ کرلیا۔ پہلے انھوں نے قیام پاکستان کے دو سال بعد ۱۹۴۹ میں اپنے اہل و عیال کو کھوکھرا پار کے راستے پاکستان بھیجا۔ کچھ عرصے کے بعد خود بھی آگئے۔ ابتدا میں کئی سال یہ لوگ حیدرآباد (سندھ) میں رہے۔ پھر کراچی منتقل ہوگئے۔

صلاح الدین یوسف کے والد سات بھائی تھے لیکن اپنے خاندان میں یہ واحد اہل حدیث تھے۔ بعد میں ان کے چھوٹے بھائی عبدالقیوم بھی اہل حدیث ہوگئے تھے اور پاکستان آگئے تھے۔ پھر ان کے ایک بڑے بھائی عبدالغنی بھی ایک بیٹے کے ساتھ پاکستان آگئے تھے۔ ان کی باقی اولاد اور دوسرے تمام بھائی اور ان کی آل اولاد جے پور ہی میں رہے۔

پاکستان آکر ابتدا میں جس طرح بہت سے لوگ معاشی پریشانیوں سے دوچار ہوئے اسی طرح صلاح الدین یوسف کے والد کو بھی اس پریشانی کا شکار ہونا پڑا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا اور حالات سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرلیا۔

اس گھرانے میں تعلیم و تعلم کا زیادہ رواج نہ تھا۔ ان کے والد کی تعلیم فقط اتنی تھی کہ وہ حافظ قرآن تھے، اس کا ترجمہ بھی پڑھا تھا اور اردو کی بعض کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ لیکن نہایت نیک بزرگ تھے۔ روزانہ صبح کو تلاوت قرآن کرتے تھے، ضرورت کے مطابق مسئلے مسائل جانتے تھے اور جو کچھ جانتے تھے اپنے خاندان میں اس کی تبلیغ کرتے رہتے تھے۔ پکے اہل حدیث تو تھے ہی اس کے علاوہ علمائے اہل حدیث سے بے حد تعلق رکھتے تھے۔

مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی کا مسکن کھنڈیلا بھی ریاست جے پور میں واقع تھا، وہ تقسیم ملک سے قبل کھنڈیلا سے جے پور تشریف لاتے تو حافظ صلاح الدین یوسف کے والد کے گھر ہی قیام فرماتے۔ کراچی میں ان کے فرزند گرامی قاری عبدالخالق مرحوم کی بھی ان کے گھر آمد و رفت رہتی تھی۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ خاندان میں تعلیم کا زیادہ رواج نہ ہونے کی وجہ سے صلاح الدین یوسف اپنے بچپن کے زمانے میں حصول علم کی راہ پر گامزن نہ ہوسکے۔ البتہ گھر میں والد صاحب سے تھوڑی سی اردو پڑھ لی تھی۔

جب یہ لوگ حیدر آباد سے کراچی منتقل ہوئے، اس وقت حافظ صلاح الدین یوسف کی عمر دس گیارہ سال تھی۔ کراچی میں اہل حدیث کی مسجد رحمانیہ میں ان کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ پھر جامع العلوم سعودیہ میں داخل ہوئے، وہاں قاری محمد بشیر تبتی سے ناظرہ قرآن پڑھا۔ انھی قاری صاحب نے ان کے والد کو مجبور کیا کہ وہ اپنے اس بچے کو قرآن مجید حفظ کروائیں۔ چنانچہ یہ قرآن مجید حفظ کرنے لگے۔ ان کے حفظ کے استاذ قاری محمد اشفاق تھے جو احناف کے دیوبندی نقطہ نظر سے تعلق رکھتے تھے اور بہت احتیاط اور محنت سے پڑھاتے تھے۔ چنانچہ صرف ایک سال میں انھوں نے قرآن مجید یاد کرلیا۔

بیٹے کے قرآن مجید یاد کرنے پر ان کے والد حافظ عبدالشکور صاحب بھی بہت خوش تھے اور خود حافظ صلاح الدین یوسف بھی نہایت مسرت کا اظہار کرتے تھے۔ چنانچہ جو عالم دین ان کے گھر

آتے، ان سے قرآن مجید سنتے۔ ایک روز قاری عبدالخالق رحمانی تشریف لے آئے۔ انھوں نے بھی قرآن مجید سننے کی خواہش ظاہر فرمائی۔ اتفاق سے صلاح الدین یوسف نے ان کو سورہ بقرہ کا وہ رکوع سنایا جس میں آیت **اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم وانتم تتلون الکتاب افلا تعقلون** آتی ہے۔ انھیں تو اس کے ترجمے کا پتا نہ تھا لیکن یہ سن کر قاری صاحب نے فرمایا بھئی تم نے تو ہمیں ہی وعظ سنا دیا ہے۔

حفظ قرآن کے بعد کسی نہ کسی طرح حافظ صلاح الدین یوسف علوم دینی کے حصول کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس وقت کراچی میں جامع العلوم سعودیہ نام کی درس گاہ ایک چھوٹے سے مکان میں جاری تھی۔ اس میں ناظرہ اور حفظ قرآن کے علاوہ درس نظامی کا شعبہ بھی قائم تھا۔ وہاں پہلے علامہ محمد یوسف کلکتوی شیخ الحدیث تھے۔ پھر وہ پنجاب آگئے تھے۔ ان کے بعد مولانا حاکم علی دہلوی کو صدر المدرسین مقرر کیا گیا تھا۔ مولانا ممدوح بہت بڑے مدرس اور تجربہ کا معلم تھے۔ منقول ومعقول میں مہارت رکھتے تھے۔ حافظ صلاح الدین یوسف نے ان سے درس نظامی کا آغاز کیا۔ یہی مدرسہ بعد میں سفید مسجد سولجر بازار میں منتقل ہوا اور اس کا نام دارالحدیث رحمانیہ رکھا گیا۔ اس مسجد کے بانی و ناظم شیخ عبدالوہاب تھے جو دارالحدیث رحمانیہ (دہلی) کے مہتمم شیخ عطاء الرحمٰن کے فرزند گرامی تھے۔ انھوں نے اپنے مرحوم بزرگوں کی یادگار (دارالحدیث رحمانیہ دہلی) کو زندہ کرنے کے لیے اس مدرسے کا یہ نام تجویز کیا اور اس کے اہتمام کی ذمہ داری قبول کی۔ حافظ صلاح الدین یوسف نے اسی مدرسے میں درس نظامی کی تعلیم کا آغاز کیا اور مولانا حاکم علی دہلوی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔

ڈھائی تین سال حافظ صلاح الدین یوسف کو مولانا حاکم علی کے حلقۂ درس میں رہنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس اثنا میں درسی کتابوں کے علاوہ انھوں نے علمی اور ادبی رسائل و جرائد کا بھی مطالعہ کیا۔ ان رسائل و جرائد میں ماہنامہ ''تجلی'' (دیوبند) چراغ راہ (کراچی) فاران (کراچی) سیارہ (لاہور) ترجمان القرآن (لاہور) میثاق (لاہور) رحیق (لاہور) ہفت روزہ شہاب (لاہور) ہفت روزہ ایشیا (لاہور) شامل ہیں۔

ان رسائل و جرائد کے علاوہ مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی وغیرہ متعدد اصحاب قلم کی تصانیف کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر مولانا ابوالکلام آزاد، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی اور مولانا مودودی کی کتابیں پڑھنے کی تمنا دل میں ابھری اور اللہ کے فضل سے یہ تمنا پوری ہوئی۔

اس زمانے میں بند روڈ کے فٹ پاتھ پر ایک بزرگ کتابوں کا سٹال لگاتے تھے۔ یہ حافظ صلاح الدین یوسف کی روزانہ کی گزرگاہ تھی۔ اس بک سٹال پر حافظ صاحب رکتے اور کتابیں دیکھتے

اور اپنی ضرورت اور مالی حالت کے مطابق کوئی نہ کوئی کتاب خرید لیتے۔ اس طرح مطالعے کا خاصا ذوق پیدا ہوگیا، جس کی وجہ سے ان کی زبان بھی نکھر گئی اور معلومات میں بھی اضافہ ہوا۔ لکھنے کا بھی جذبہ ابھرا۔ ذہن اخذ وقبول کی صلاحیت سے بہرہ ور تھا اور حالات نے بھی موافق سمت اختیار کرلی تھی، اس لیے جیسے جیسے حصول علم کی منزلیں طے کرتے گئے، اسی نسبت سے قلم و قرطاس سے بھی روابط کا شوق بڑھتا گیا۔

ان کے ذوقِ مطالعہ میں اضافے کا سبب جامع العلوم سعودیہ کے ایک استاذ مولانا عبدالرشید ندوی لداخی کی تربیت بھی ہوئی۔ انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں متعدد مشہور اساتذہ سے حصول فیض کیا تھا اور ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ نہایت متواضع اور منکسر مزاج اہل علم تھے۔ زندگی کے آخری دور میں انھوں نے اپنی تدریسی خدمات جامعہ دارالعلوم بلتستان غواڑی کے سپرد کردی تھیں۔ بہت اچھے معلم تھے اور طلبا کی بہترین انداز سے تربیت کرتے تھے۔ یکم جنوری ۲۰۰۱ کو جامعہ دارالعلوم غواڑی میں فوت ہوئے۔

اب حالات نے ایک اور پلٹا کھایا جس کے نتیجے میں حافظ صلاح الدین یوسف طلبِ علم کے لیے کراچی سے لاہور آگئے۔ اس وقت ان کی عمر چودہ پندرہ سال ہوگی۔ یہاں انھوں نے دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں داخلہ لیا۔ دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی تھے اور اساتذہ تھے شیخ الحدیث مولانا حافظ محمد اسحاق، مولانا حافظ عبدالرشید گوہڑوی اور مولانا عبدالرشید مجاہد آبادی۔ اس سے ایک سال قبل مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کراچی تشریف لے گئے تھے اور ان کا قیام جامع العلوم سعودیہ میں رہا تھا۔ وہیں حافظ صلاح الدین یوسف کو ان کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا۔ مولانا نے حافظ صاحب کے ذوق مطالعہ کے پیش نظر انھیں علمی نوعیت کے بعض مشورے بھی دیے اور کچھ کتابیں بھی پڑھنے کے لیے فرمایا۔ اب وہ طالب علم کی حیثیت سے لاہور آئے تو مولانا سے میل ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا۔ مولانا کسی زمانے میں دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں بہ طور شیخ الحدیث خدمات سرانجام دیتے رہے تھے۔ اب دارالعلوم میں کوئی تدریسی ذمہ داری تو ان کے سپرد نہ تھی، البتہ مکتبہ سلفیہ کے نام سے دارالعلوم کی ایک دکان میں انھوں نے اپنے ذوق کی کتابوں کی نشرو اشاعت کے لیے مکتبہ قائم کرلیا تھا جس میں اسباق سے فراغت کے بعد حافظ صلاح الدین یوسف بھی آجاتے تھے وہ وہاں بیٹھتے اور مولانا کے افکارِ عالیہ سے مستفید ہوتے۔

طالب علمی کے زمانے میں مختلف قسم کی کتابوں اور رسالوں کے مطالعے کی وجہ سے حافظ صاحب ممدوح میں اظہار مدعا کے سلسلے میں اعتماد پیدا ہوگیا تھا اور ان کے ذہن میں یہ سوچ ابھر آئی تھی کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو واضح الفاظ میں بیان کرسکتے ہیں۔ چنانچہ قلم ہاتھ میں پکڑا اور لکھنا شروع

کر دیا۔ مندرجہ ذیل تین مضمون انھوں نے اپنے عہد طالب علمی میں حوالۂ قرطاس کیے۔

① ...... ایوب خاں کے زمانے بڑی دھوم دھام کے ساتھ ''جشن میلاد النبی'' منایا گیا تھا۔ اس وقت میاں محمد دین کے نیشنل فین کی بڑی شہرت تھی اور شاہدرہ میں ان کی بہت بڑی فیکٹری تھی جس میں یہ پنکھے بنائے جاتے تھے۔ جشن میلاد النبی گرمیوں کے موسم میں آیا تھا اور اس کے لیے میاں محمد دین کی فیکٹری سے کئی ہزار پنکھے لاہور کے مختلف بازاروں میں نصب کیے گئے تھے جو فضا میں لہراتی ہوئی رنگ برنگ جھنڈیوں کے جھرمٹ میں تیزی سے گھومتے تھے۔ یہ بے حد خوب صورت منظر تھا جو میں نے اپنے بعض دوستوں کے ساتھ مختلف مقامات میں گھوم پھر کر دیکھا تھا۔ میاں محمد دین تقسیم ملک کے زمانے میں امرتسر سے لاہور آئے تھے اور لاہور کی گوالمنڈی میں امرتسر کے رہنے والے لوگ زیادہ تعداد میں آباد تھے۔ اس لیے میاں صاحب کی فیکٹری کے پنکھے گوالمنڈی میں کثرت سے نصب کیے گئے تھے۔ حافظ صلاح الدین یوسف بھی میلاد النبی کی رونقیں دیکھنے کے لیے دارالعلوم کے طلبا کے ساتھ مختلف مقامات میں گئے اور پھر اس کے نتیجے میں مضمون لکھا: ''میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا۔'' یہ مضمون ۱۶۔ اگست ۱۹۶۵ کے ''الاعتصام'' میں چھپا۔ میں اس سے ڈھائی مہینے پیشتر ۳۰ مئی ۱۹۶۵ کو ''الاعتصام'' کی ادارت سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ان کا یہی مضمون ان کی کتاب ''عید میلاد کی تاریخی و شرعی حیثیت'' میں شامل ہوا۔

② ...... حافظ صاحب کا دوسرا مضمون ''الاعتصام'' میں پاکستان کی روزنامہ صحافت کے متعلق چھپا۔ اس کا عنوان تھا ''پاکستانی صحافت۔ جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے۔''

③ ...... حافظ صاحب اپنے دورِ طالب علمی میں ماہنامہ ''تجلی'' (دیوبند) کے مدیر عامر عثمانی مرحوم کے طرزِ تحریر سے بہت متاثر تھے۔ عامر عثمانی مرحوم کسی نہ کسی صورت میں اہل حدیث کے خلاف عام طور سے لکھتے رہتے تھے۔ حافظ صاحب نے ''خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے'' کے عنوان سے ''الاعتصام'' کی دو قسطوں میں مضمون لکھا جس میں اہل حدیث کے متعلق ان کے معاندانہ اور مخالفانہ رویے کی مذمت کی گئی تھی۔ بحمد اللہ میں مرحوم مدیر ''تجلی'' کے طرز نگارش سے کبھی متاثر نہیں ہوا۔ ان کا زیادہ تر سلسلۂ تحریر اپنے سے اختلاف کرنے والوں سے متعلق طنز و تشنیع پر چلتا تھا۔ ان کی تحریروں میں کوئی خاص علمی بات تو نہیں ہوتی تھی، البتہ قاری کو ان کی تحریروں سے کچھ نئے الفاظ مل جاتے تھے۔

حافظ صلاح الدین یوسف کی پہلی تصنیف ''خلافت سے ملوکیت تک'' ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کا ایک مضمون ان کے رسالے ''ترجمان القرآن'' کی متعدد قسطوں

میں شائع ہوا تھا جو بعد میں ''خلافت وملوکیت'' کے نام سے کتابی صورت میں چھپا۔ مولانا مرحوم کی سب کتابیں اسی طرح چھپی ہیں۔ پہلے وہ کسی موضوع پر ''ترجمان القرآن'' میں لکھتے رہے، اس کے بعد ان مضامین کو جمع کر کے ان میں حک و اضافہ کیا اور کتابی شکل میں چھاپ دیا۔ ''خلافت و ملوکیت'' بھی اسی طرح معرضِ اشاعت میں آئی۔ حافظ صلاح الدین یوسف نے اس کے جواب میں ''خلافت سے ملوکیت تک'' کے عنوان سے ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں لکھنا شروع کیا۔ اس مضمون کی بیس قسطیں چھپیں تو مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف بھوجیانی کے مشورے اور ان کی رہنمائی میں ضروری اصلاحات و ترجیحات کے بعد اسے کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا۔ یہ حافظ صاحب ممدوح کی پہلی باقاعدہ تصنیف تھی جو اس وقت شائع ہوئی تھی جب وہ عمر کی بیسویں یا اکیسویں منزل طے کر رہے تھے۔ جوانی کے دور کی اس اوّلیں تصنیف سے ظاہر ہے انسانی فطرت کے مطابق انھیں بہت مسرت ہوئی ہوگی اور ان کا حوصلہ بڑھا ہوگا۔

اس وقت ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے مدیر علامہ احسان الٰہی ظہیر تھے اور اخبار مرکزی جمعیت اہل حدیث کا ترجمان تھا لیکن اس کا ڈیکلریشن ابتدا ہی سے مولانا عطاء اللہ حنیف کے نام تھا۔ پھر حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ مولانا عطاء اللہ صاحب نے اخبار اپنی تحویل میں لے لیا اور علامہ احسان الٰہی ظہیر اس کی ادارت سے علیحدہ ہو گئے۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا اور نہ جانے کی ضرورت ہے۔

اب اخبار کے اخراجات، اس کی اشاعت اور ادارت کی تمام تر ذمہ داری مولانا عطاء اللہ حنیف پر آ پڑی تھی۔ یہ ۱۹۷۰ یا اس کے پس و پیش کی بات ہے۔ ان حالات میں (اخباری معاملات کا تجربہ نہ ہونے کے باوجود) حافظ صلاح الدین یوسف ان کے ساتھ تعاون کرنے لگے۔ مولانا کے بھانجے مولانا محمد سلیمان انصاری اور صاحب زادے حافظ احمد شاکر بھی اخبار کے انتظامی معاملات میں سرگرم عمل ہوئے۔ پھر آہستہ آہستہ ایک وقت آیا کہ اخبار کی ادارتی ذمہ داری حافظ صاحب کے سپرد کر دی گئی۔ لیکن وہ مولانا سے رہنمائی لیتے رہے۔ مولانا کی وفات تک پندرہ سولہ سال حافظ صاحب ''الاعتصام'' کے مدیر رہے۔ مولانا کی وفات (۳۔اکتوبر ۱۹۸۷) کے بعد بھی کئی سال اس اخبار سے بہ حیثیت مدیر ان کی وابستگی رہی۔ اس طرح تقریباً چوبیس برس ان کا ''الاعتصام'' سے انسلاک رہا۔ اس اثنا میں مختلف موضوعات و عنوانات پر ان کے بے شمار اداریے، شذرات اور مضامین اس اخبار میں شائع ہوئے۔ وفیات اور کتابوں پر تبصروں کی صورت میں بھی بہت کچھ چھپا۔ بے شبہ یہ مواد ہزاروں صفحات پر مشتمل ہوگا۔ علاوہ ازیں وفاقی شرعی عدالت کے

سلسلے میں بھی ان کے متعدد مقالات ضبط تحریر میں آئے۔

الاعتصام سے علیحدگی کے بعد حافظ صلاح الدین یوسف کو مولانا عبدالمالک مجاہد نے اپنے قائم کردہ اشاعتی ادارے دارالسلام سے وابستہ کرلیا جو دینی کتب کی اشاعت کا بین الاقوامی ادارہ ہے اور جس کا مرکزی دفتر ریاض (سعودی عرب) میں ہے۔ ابتدا میں چار مہینے حافظ صاحب ریاض میں رہے اور وہاں ''حسن البیان'' کے نام سے مختصر تفسیر لکھنے کا آغاز کیا۔ پھر لاہور آگئے اور تفسیر مکمل کی۔ اس تفسیر کو اللہ تعالیٰ نے بڑی قبولیت عطا فرمائی۔ پوری دنیا میں یہ تفسیر پہنچی اور اردو پڑھنے والوں نے اس سے استفادہ کیا۔ اس بین الاقوامی اشاعتی ادارے کی شاخ لاہور میں بھی قائم ہے، جس کا پنجاب سیکرٹریٹ کے قریب لوئر مال پر بہت بڑا دفتر ہے۔ اس میں متعدد اصحاب علم تصنیف و تالیف اور دینیات سے متعلق بعض اہم عربی کتابوں کے تراجم میں مصروف ہیں۔ حافظ صلاح الدین یوسف اس شعبے کے مدیر ہیں۔

تفسیر ''حسن البیان'' میں قرآن مجید کا اردو ترجمہ مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی کا لگایا گیا ہے اور یہ بہت اچھا ترجمہ ہے، زبان کے اعتبار سے بھی اور شستگی و روانی کے اعتبار سے بھی۔! یہ وہی ترجمہ ہے جو مولانا مرحوم کی اردو ترجمے والی تفسیر ابن کثیر میں عام پڑھا جاتا ہے۔ لیکن اب حافظ صاحب نے خود ترجمہ کیا ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ غالباً اگلے ایڈیشن میں یہی ترجمہ لگایا جائے گا۔ ترجمے کے علاوہ سنا ہے تفسیر میں بعض مقامات پر اضافے بھی کیے گئے ہیں۔ تفسیر کا یہ نیا ایڈیشن تقریباً دو ہزار صفحات پر محیط ہوگا۔

تفسیر کے علاوہ حافظ صلاح الدین یوسف کی دیگر تصانیف اور ترجمے کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

① ...... ریاض الصالحین: ترجمہ و فوائد مشتمل پر دو جلد۔

② ...... خلافت و ملوکیت کی تاریخی و شرعی حیثیت: یہ وہی کتاب ہے جو مولانا مودودی کی کتاب ''خلافت ملوکیت'' کے جواب میں لکھی تھی۔

③ ...... عورتوں کے امتیازی مسائل وقوانین: اس کتاب میں ان معاملات پر بحث کی گئی ہے جن میں اسلام نے مرد اور عورت کے درمیان امتیاز کیا ہے۔

④ ...... زکوٰۃ وعشر کے احکام اور مسائل و فضائل: یہ اپنے موضوع کی ایک اہم کتاب ہے۔

⑤ ...... رمضان المبارک۔ فضائل اور احکام و مسائل: کتاب کے نام سے موضوع کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

⑥......مسنون نکاح اور شادی بیاہ کی رسومات: نکاح سنت ہے لیکن رسوم کا سلسلہ خلافِ سنت ہے۔

⑦......مفرور لڑکیوں کا نکاح اور ہماری عدالتیں: اس کتاب میں شریعت کی روشنی میں نکاح کے سلسلے میں ولایت کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

⑧......رسوماتِ محرم الحرام اور سانحہ کربلا: یہ کتاب پہلے "ماہ محرم اور موجودہ مسلمان" کے نام سے چھپتی رہی ہے۔ پھر نئے نام سے سانحہ کربلا کے اضافے کے ساتھ شائع ہوئی۔

⑨......نماز مسنون مع ادعیہ ماثورہ: اس کتاب کے مندرجات کا اندازہ اس کے نام سے ہو جاتا ہے۔

⑩......نماز محمدی: بچوں کے لیے مسنون نماز کی تلخیص۔

⑪......توحید و شرک کی حقیقت مع مغالطات و شبہات کا ازالہ۔

⑫......قبر پرستی: قبر پرستوں کے دلائل کا جائزہ۔

⑬......احکام و مسائل عیدالاضحیٰ: اس میں عید الاضحیٰ کے احکام و مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

⑭......حصن المسلم: صحیح دعاؤں پر مشتمل عربی کتاب کا ترجمہ۔

⑮......کیا خواتین کا طریقۂ نماز مردوں سے مختلف ہے: یہ کتاب اس موضوع میں احناف کے جواب میں لکھی گئی ہے۔

⑯...... نفاذ شریعت کیوں اور کیسے؟: یہ ایک مقالہ ہے جو حافظ صاحب نے امام ابوحنیفہ کانفرنس منعقدہ اسلام میں پڑھا۔

⑰...... اجتہاد اور تعبیر شریعت کے اختیار کا مسئلہ ۔ پارلیمنٹ اس کی اہل ہے یا باصلاحیت علمائے اسلام؟

⑱...... ایصال ثواب اور قرآن خوانی: فوت شدہ کے لیے ایصال ثواب کی خاطر جو قرآن خوانی کی جاتی ہے، اس کتاب میں اس کے متعلق شرعی نقطہ نظر سے وضاحت کی گئی ہے۔

⑲......جشن عید میلاد: جو لوگ اسے جائز قرار دیتے ہیں اس رسالے میں ان کے دلائل کا جائزہ لیا گیا ہے۔

⑳......اہل حدیث اور اہل تقلید: اس میں ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو جماعت اہل حدیث اور مسلک اہل حدیث پر کیے جاتے ہیں۔

(۲۱)......تمیمۃ الصبی فی ترجمۃ الاربعین من احادیث النبیؐ: نواب صدیق حسن خاں کی کتاب کی تسہیل و تنقیح۔

(۲۲)......حدِ رجم کی شرعی حیثیت: مولانا امین احسن اصلاحی اور دیگر منکرین رجم کے ردّ میں۔

(۲۳)......عورت کی سربراہی کا مسئلہ اور شبہات و مغالطات کا جائزہ: کتاب کا مطلب نام سے ظاہر ہے۔

(۲۴)...... اسلامی خلفا و ملوک کے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ: کتاب کے مشمولات کا اندازہ اس کے نام سے ہو جاتا ہے۔

(۲۵)......تحریک جہاد اور اہل حدیث و احناف: اس میں تحریک جہاد کے بارے میں علمائے احناف کے دعاوی کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

(۲۶)......تنقیح الرواۃ فی تخریج احادیث المشکوۃ: یہ عربی کتاب ہے جو ''احسن التفاسیر'' کے فاضل مصنف ڈپٹی سید احمد حسن دہلوی رحمہ اللہ کی چار جلدوں پر مشتمل تصنیف ہے۔ اس کی دو جلدیں تقسیم ملک سے پہلے مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوئی تھیں۔ تیسری جلد کا مسودہ تھا جو حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف کی تحقیق سے شائع ہوا۔ چوتھی جلد حافظ صلاح الدین یوسف اور مرحوم قاری نعیم الحق نعیم کی تحقیق سے شائع ہوئی۔

(۲۷) حقوق امۃ (۲۸) حقوق العباد (۲۹) حقوق الوالدین (۳۰) حقوق الاولاد (۳۱) حقوق الزوجین (۳۲) واقعہ معراج اور اس کے مشاہدات (۳۳) کھانے پینے کے آداب (۳۴) سونے جاگنے کے آداب (۳۵) سلام کے آداب و احکام (۳۶) خواتین سے متعلقہ بعض اہم مسائل احادیث کی روشنی میں (۳۷) ایام مخصوصہ میں عورت کا قرآن پڑھنا اور چھونا (۳۸) مسئلہ طلاق ثلاثہ اور علمائے احناف (۳۹) عظمت حدیث اور اس کے تقاضے (۴۰) اسلامی لباس...... آداب و احکام (۴۱) ترجمۃ القرآن (لفظی بکسوں میں)

(۴۲) منحۃ الباری ترجمہ الادب المفرد للبخاری: یہ ترجمہ ماہنامہ ''شہادت'' اسلام آباد میں بالاقساط شائع ہو رہا ہے۔

یہ سطور ۱۲۔ اکتوبر ۲۰۰۶ کو لکھی گئی ہیں اور اپنی دانست میں حافظ صلاح الدین یوسف کی ان تمام علمی و تصنیفی سرگرمیوں کا ذکر کردیا گیا ہے جو اس تاریخ تک انھوں نے سرانجام دیں۔ ان بیالیس تصانیف میں جن کے نام گزشتہ سطور میں درج ہوئے، بعض چھوٹے چھوٹے رسائل کی صورت میں ہیں، جس کا اندازہ ان کے نام سے ہو جاتا ہے اور بعض ضخیم ہیں، لیکن یہ چھوٹی بڑی

سب تصانیف اپنے اپنے موضوع کی اہم تصانیف ہیں۔ ان میں فاضل مصنف نے جن مسائل کی وضاحت فرمائی ہے، اپنے اسلوب میں پوری تحقیق سے فرمائی ہے۔

ہر چند کہ حافظ صاحب کے یہ رسائل و کتب سنجیدہ مضامین پر مشتمل ہیں۔ لیکن یہاں ایک آدھ ہلکا پھلکا سا لطیفہ بھی ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ ایک مرتبہ حافظ صاحب نے مجھے حقوق الوالدین، حقوق الاولاد، حقوق الزوجین، حقوق الامہ اور حقوق العباد کتابیں عنایت فرمائیں۔ میں نے اس عنایت پر ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کیا کہ میرے والدین وفات پا چکے ہیں۔ ان کی زندگی میں ان کے چھوٹے بڑے جو حقوق میں ادا کرسکتا تھا، ادا کرتا رہا۔ اپنی دو بیٹیوں کی میں نے شادی کردی ہے اور وہ اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں اور ماشاء اللہ بال بچوں والی ہیں۔ اس طرح اپنی حیثیت کے مطابق میں نے ان کے حقوق یعنی حقوقِ اولاد ادا کردیے۔ میری عمر ۸۰ سال سے اوپر چلی گئی ہے اور بیوی بھی شاید ۷۰ کے پس و پیش میں ہو۔ ہم نے ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یعنی میں، والدین، اولاد اور بیوی کے حقوق کی ادائی سے فارغ ہو چکا ہوں۔ رہا حقوق العباد کا معاملہ تو اس کے متعلق عرض ہے کہ میں اس عمر میں کسی ''عبد'' کا کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا۔ ہر عبد حق خود اختیاری کے مطابق خود ہی اپنا کام کرے۔ حقوق الامت کے سلسلے میں یہ گزارش ہے کہ میں بھاگ دوڑ کے قابل نہیں ہوں اور نہ میرے پاس اتنے پیسے اور اتنا وقت ہے کہ کسی شہر یا کسی علاقے یا کسی ملک میں جا کر امت کی کوئی خدمت سرانجام دے سکوں۔ آپ اس کی لوگوں کو ترغیب دیتے ہیں، لیکن ان پر عمل آپ کا بھی نہیں ہے اور ہو بھی نہیں سکتا۔ اس لیے بہ ظاہر حالات یہ کتابیں میرے کسی کام کی نہیں ہیں۔ ان میں آپ نے جو کچھ لکھا ہوگا، میں اس کے متعدد حصوں پر عمل کر چکا ہوں بلکہ بعض حقوق تو زیادہ ہی ادا ہوگئے ہوں گے۔

حافظ صاحب نے فرمایا: آپ کے لیے تو پھر یہ کتابیں بے کار ہوئیں۔

میں نے عرض کیا: حقوق کی ادائیگی کے متعلق تو معاملہ ختم ہوا، البتہ میں یہ کتابیں یہ معلوم کرنے کے لیے پڑھوں گا کہ آپ نے حقوق کی کیا تعریف کی ہے اور ان کو ادا کرنے کے کیا طریقے بیان فرمائے ہیں۔

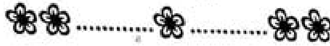
تمام حقوق کی نوعیت مختلف ہے اور ان کو ادا کرنے کے طریقے الگ الگ ہیں جو بسا اوقات حالات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔

حافظ صلاح الدین یوسف ہمارے دوست ہیں اور ان کی علمی خدمات کا دائرہ ماشاء اللہ بہت پھیلا ہوا ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں صحت و عافیت سے رکھے اور وہ کتاب وسنت کی زیادہ سے

زیادہ اشاعت فرمائیں۔

وہ لاہور کی ایک مسجد میں خطابت کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں اور اچھے خطیب ہیں۔ خطابت بھی خدمت دین کا ایک ذریعہ ہے اور ہر جمعے کو لوگ ان کے ارشادات سنتے اور ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہیں درس قرآن بھی دیتے ہوں، یہ بھی اشاعت دین کا بہترین طریقہ ہے اور شاید حقوق العباد اور حقوق الامت بھی اس میں آجاتے ہوں۔

حافظ صاحب کو ایک کتاب ''حقوق الائمہ'' بھی لکھنی چاہیے، جس میں ائمہ اربعہ سے لے کر ائمہ مساجد تک کے حقوق ادا کرنے کی فضیلت اور فرضیت بیان کی جائے۔



مولانا ابوالاشبال احمد شاغف

۲۲۔ مارچ ۲۰۰۰ء کی شام کو حرم شریف میں مجھے حافظ احمد شاکر کے صاحب زادے عزیز القدر عباد شاکر نے کہا کہ میں مولانا ابوالاشبال کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، انھوں نے آپ کو سلام کہا ہے اور فرمایا ہے کہ ہم دونوں آج عشا کے بعد ان کے مکان پر ان سے ملیں اور رات کا کھانا ان کے ہاں کھائیں۔ عشا کے بعد ہم نے حرمِ شریف سے ٹیکسی لی اور مولانا ابوالاشبال کے مکان کی طرف روانہ ہوگئے۔ عباد شاکر ان کے مکان پر اس سے پہلے دو تین مرتبہ جا چکے تھے اور راستے کی چند نشانیاں بھی انھوں نے ذہن میں محفوظ کر لی تھیں، لیکن تھوڑی دور جا کر چکرا گئے۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح ہم مولانا ابوالاشبال کے درِ دولت پر پہنچ گئے۔ عزیزی عباد شاکر نے مولانا ابوالاشبال کے مکان کی گھنٹی بجائی تو ایک لڑکا باہر آیا جس نے مؤدبانہ انداز میں سلام کیا اور ہمیں مکان کی دوسری منزل میں لے گیا۔ وہاں ایک اور لڑکا بیٹھا تھا جو اس سے چھوٹی عمر کا تھا۔ پتا چلا کہ یہ دونوں مولانا ابوالاشبال کے صاحب زادے ہیں۔ اب ہم مولانا ممدوح کے کتب خانے میں بیٹھے تھے۔ ان بچوں نے عربوں کے طریق مہمان نوازی کے مطابق چھوٹے چھوٹے فنجانوں میں قہوہ پیش کیا اور پلیٹ میں کھجوریں عنایت کیں۔ مولانا ابوالاشبال کو اطلاع ہوئی تو وہ تشریف لائے۔ میانہ قد، ستواں چہرہ، مناسب نقش ونگار، عربوں کی سی سفید لمبی عبا، سر پر سفید رومال اور اس کے نیچے کپڑے کی ٹوپی۔ دورانِ گفتگو انھوں نے اپنا ماضی بیان کیا اور حال کی باتیں سنائیں۔ ہم نے ان کا کتب خانہ دیکھا جو مختلف موضوعات کی بہت سی کتابوں پر مشتمل ہے۔ ہر کتاب کی خوب صورت جلد ہے اور کتابیں خوب صورت الماریوں میں قرینے اور سلیقے سے رکھی گئی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد کھانا لگایا گیا۔ ایک بجے کے بعد آدھ پون گھنٹا سوئے اور پھر وہاں سے چل پڑے۔ مولانا ابوالاشبال دروازے کے باہر تک چھوڑنے آئے۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی اور اب تک آخری بھی۔

اب آتے ہیں ان کے تھوڑے بہت حالات کی طرف، جن سے یہ فقیر مطلع ہو سکا ہے۔

ان کا پورا نام ابوالاشبال احمد شاغف ہے۔ مارچ ۱۹۴۲ء میں ہندوستان کے صوبہ بہار کے ضلع چمپارن کے ایک غیر معروف گاؤں ''ٹولہ سوتا'' میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یعنی قاعدہ بغدادی کا آغاز گاؤں کے ایک بزرگ میاں محمد اسماعیل سے کیا۔ قاعدہ بغدادی پڑھ چکے تو قریب کے ایک گاؤں کے ابتدائی مدرسے میں داخل کرا دیے گئے۔ ایک سال وہاں پڑھا۔ پھر مدرسہ اسلامیہ میودا

میں داخلہ لیا۔ اس میں تین سال گزارے۔ اس اثنا میں قرآنِ مجید پڑھا اور ابتدائی درجوں کی اردو کی بعض کتابیں پڑھیں نیز حساب وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ پھر اپنے گاؤں سے قریب کے شہر کو روانہ ہوئے۔ وہاں کے مدرسہ اسلامیہ میں ابتدائی عربی صرف ونحو اور عربی ادب کی بعض کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں دہلی کا عزم کیا اور وہاں کے مدرسہ سبل السلام میں جو پھاٹک حبش خاں میں جاری تھا، تین سال تعلیم حاصل کرتے رہے۔ دہلی سے بنارس گئے اور جامعہ رحمانیہ میں داخل ہوئے۔ وہاں تقریباً ایک سال گزارا تھا کہ بعض گھریلو مجبوریوں کی بنا پر تعلیم کا سلسلہ باقاعدہ تو جاری نہ رہ سکا، البتہ کسی نہ کسی طرح بعض علمائے کرام سے استفادہ کرتے رہے۔

پھر کلکتے چلے گئے اور وہاں ایک سال سے زیادہ عرصے تک ادھر اُدھر کے کام کرتے رہے، لیکن وہاں بھی وقت نکال کر بعض مدرسین سے تھوڑا بہت حصولِ علم کا سلسلہ جاری رکھا۔ اسی اثنا میں کلکتہ سے بمبئی روانہ ہوگئے۔ وہاں بھونڈی بازار میں شیخ عبدالصمد شرف الدین (تاجرانِ کتب) کے الدر القیمہ میں کام کرنے لگے۔ وہاں دس سال تحقیق وتصحیح کا کام جاری رہا۔ المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی کی چوتھی جلد کے نصف آخر کی طباعت اسی مطبع میں ہوئی۔ اس کی تصحیح یعنی پروف ریڈنگ وغیرہ کے زیادہ ترحصے کی ذمے داری ان کے سپرد تھی جس سے اللہ تعالیٰ کے فضل سے بحسن وخوبی عہدہ برآ ہوئے۔ اس کے علاوہ مطبع الدر القیمہ کی بعض دوسری مطبوعات کی تصحیح وتعلیق وغیرہ میں شیخ عبدالصمد کے شریک کار رہے۔ مزی کی تحفۃ الاشراف کی پہلی تین جلدوں کی تحقیق وتعلیق اور تصحیح میں اگرچہ بعض دیگر حضرات بھی شامل تھے لیکن اس اہم کام کی زیادہ ذمہ داری مولانا ابوالاشبال کو سونپی گئی تھی۔

بمبئی سے مشرقی پاکستان کو روانہ ہوئے۔ ۱۹۷۱ء کے ہنگاموں میں وہاں سے نکلے اور کراچی آئے۔ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۶ء تک کراچی رہے۔ اس اثنا میں ایک سال کے لیے کراچی سے فیصل آباد آئے اور حکیم عبدالرحیم اشرف کی قائم کردہ جامعہ تعلیمات اسلامیہ میں تدریسی خدمات میں مصروف رہے۔ اس کے بعد پھر کراچی چلے گئے۔ وہاں چند اہل علم کی رفاقت میں شروحِ ترمذی کی تصحیح کا فریضہ انجام دیا۔ وہاں ایک سال دارالحدیث رحمانیہ (سولجر بازار) میں تدریسی خدمت میں صرف ہوا۔ ۱۹۷۶ء ہی میں عمرے کے لیے سعودی عرب کا سفر کیا۔ عمرے سے واپسی پر جامعہ الملک عبدالعزیز (جدہ) سے عمل کا ویزا لے کر واپس کراچی آگئے۔ پھر ۱۹۷۷ء کے ابتدا میں اہل وعیال سمیت سعودی عرب گئے اور وہاں مصروفِ کار ہوگئے۔ پھر بارہ سال کے بعد شیخ عبدالمجید زندانی کی طلب پر رابطہ عالم اسلامی کے ایک شعبہ ہیئۃ الاعجاز العلمی سے منسلک ہوکر مکہ مکرمہ آگئے اور اب تک وہیں ہیں۔

اب مولانا ابوالاشبال احمد شاغف کے لائق احترام اساتذہ کے اسمائے گرامی ملاحظہ فرمایئے۔

اردو اور فارسی کے مشہور اساتذہ میں جناب فرمان علی، کرامت علی، عبدالغفار شمسی، حاجی نور محمد، مولوی عبدالرحمٰن اور بعض دیگر حضرات۔ قرآنِ مجید ناظرہ کی ابتدا فرمان علی صاحب سے ہوئی اور اختتام جناب عبدالغفار صاحب شمسی اور حاجی نور محمد صاحب کی خدمت میں ہوا۔ قرأت کی تعلیم قاری سعید اختر صاحب سے حاصل کی۔

عربی ادب اور صرف ونحو کے لیے مولانا ابوالبرکات اور مولانا عبدالرشید لداخی ندوی کے حضور زانوئے شاگردی تہ کیا۔ ترجمہ قرآن کا آغاز مولانا ابوالبرکات سے ہوا اور اس کی انتہا مولانا عبدالصمد بہاری سے ہوئی۔

حدیث شریف کی کتابوں میں سے ریاض الصالحین مولانا ابوالبرکات سے پڑھی اور بلوغ المرام اور مشکوٰۃ مولانا عبدالصمد بہاری سے پڑھیں۔ مولانا عبدالصمد بہاری کو مولانا نذیر احمد املوی رحمانی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔

تفسیر قرآن اور صحاح ستہ کی تعلیم بغیر کسی درس گاہ میں داخلہ لیے کلکتہ اور بعض دیگر مقامات میں مولانا عبدالرحمٰن، مولانا عبداللہ اور مولانا محمد اکرم سے حاصل کی۔ یہ تینوں علمائے کرام حضرت مولانا ابوالقاسم بنارسی کے شاگرد تھے۔ لیکن تفسیر وحدیث میں مولانا ابوالاشبال نے سب سے زیادہ استفادہ مولانا عبدالرشید لداخی ندوی اور مولانا محمد منظور الحق رام پوری سے کیا۔ مولانا عبدالرشید لداخی ندوی مشہور عالم دین، شاہ عبد الحلیم عطا کے شاگرد تھے اور مولانا محمد منظور الحق نے مولانا عبدالوہاب دہلوی سے تحصیل علم کی تھی۔

اب دیکھتے ہیں کہ مولانا ابوالاشبال تحریر ونگارش کی وادی میں کیسے داخل ہوئے اور اس کا آغاز کس طرح ہوا۔

کسی زمانے میں دیوبند سے ایک ماہانہ رسالہ شائع ہوتا تھا، جس کا نام ''تجلی'' تھا۔ اس کے ایڈیٹر عامر عثمانی مرحوم تھے جو مولانا شبیر احمد عثمانی کے عزیزوں میں سے تھے۔ اس کے ایک شمارے میں عامر عثمانی صاحب نے اس موضوع پر مضمون لکھا کہ جو شخص ایسے وقت پر مسجد میں آتا ہے جب خطیب خطبہ جمعہ دے رہا ہو تو وہ آکر بیٹھ جائے اور خطبہ سنے، دو رکعت (جن کے پڑھنے کا نبی ﷺ نے حکم دیا ہے) بالکل نہ پڑھے۔ یہ مضمون ۳۱ صفحات پر مشتمل تھا۔ مولانا ابوالاشبال نے صرف ایک صفحے میں اس کا مختصر سا جواب لکھ کر ایڈیٹر کو بھیجا۔ یہ جواب ''تجلی'' میں شائع تو نہ ہوا، البتہ اس کے بعد عامر عثمانی صاحب نے اس موضوع پر کچھ لکھا نہیں۔

یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا عامر عثمانی جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے آپ کو

اختلافی مسائل کے اظہار سے بچا کر رکھنے کے مدعی تھے۔ لیکن نبی ﷺ کے واضح فرمان کی مخالفت میں انھوں نے اکتیس صفحات کا طویل مضمون سپرد قلم فرمایا۔ یہ صرف ایک مسئلہ ہے۔ باقی مسائل اس سے الگ ہیں۔ یہ جماعت اسلامی کے اہل علم کا حال ہے۔

اس کے بعد مجلّہ ''اہل حدیث'' (دہلی) میں کسی موضوع پر مولانا ابوالاشبال کے دو مضمون شائع ہوئے۔

ان ابتدائی اخباری مضامین کے بعد مولانا ابوالاشبال کی تصنیفی تگ وتاز کی طرف آتے ہیں۔

① ...... **اہل حدیث کا مذہب**: یہ ان کی اوّلیں تصنیف ہے جو اردو زبان میں ہے۔ حیدر آباد (دکن) سے شائع ہوئی۔

② ...... **تدوین فقہ حنفی پر ایک طائرانہ نظر**: یہ کتاب بھی اردو زبان میں ہے اور یہ بھی حیدر آباد (دکن) سے چھپی۔

③ ...... **صراطِ مستقیم اور اختلافِ امت**: یہ بھی اردو زبان میں ہے۔ دو مرتبہ پاکستان میں اور ایک مرتبہ ہندوستان میں چھپی۔

④ ...... **تقریب التهذيب تعليق وتحقيق**: امام ابن حجر کی تصنیف تقریب التہذیب ایک مشہور کتاب ہے۔ مولانا ابوالاشبال نے اس پر عربی میں تعلیق وتحقیق کی خدمت انجام دی۔ یہ کتاب دو مرتبہ ریاض (سعودی عرب) سے شائع ہو چکی ہے۔

⑤ ...... **قيام الليل**: یہ بھی عربی میں ہے۔ بعض حضرات نے اسے کویت سے طبع کرا کے تقسیم کیا۔

⑥ ...... **زبده تعجيل المنفعه**: عربی زبان کی یہ کتاب ریاض سے شائع ہوئی۔

⑦ ...... **اتحاف القارى بياضات فتح البارى**: بہ زبان عربی ریاض میں طبع ہوئی۔

⑧ ...... **التعليقات المفيده على الكتب القديده**: عربی زبان میں ہے۔ ریاض میں چھپی۔

⑨ ...... **المستدرک علی تحفة الاشراف للمزی**: بہ زبان عربی ریاض میں طبع ہوئی۔

⑩ ...... **المستدرک على الكتب العديده**: بہ زبان عربی، مطبوعہ ریاض۔

⑪ ...... **ضياء القارى بمعرفة رجال صحيح البخارى**: عربی غیر مطبوع۔

⑫ ...... **قرة العين بترجمة السيد نذير حسين**: عربی مطبوع۔

⑬ ...... **قرة العين الجمع بين رجال الصحيحين**: عربی غیر مطبوع:

⑭ ...... **تلخيص شرح بلوغ المرام**: عربی غیر مطبوع۔

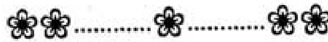
⑮ ...... **مقالات شاغف**: یہ چھوٹے بڑے ۴۷ مقالات ہیں جو مختلف عنوانات پر محیط ہیں۔ ان میں قرآن، حدیث، تاریخ، تنقید، طب وغیرہ بہت سے موضوعات شامل ہیں۔ لیکن ان میں اصل

زور دفاعِ حدیث اور محدثین کی خدمات پر ہے اور یہی درحقیقت مولانا موصوف کا موضوع اور ان کی علمی مساعی کا بنیادی مقصد ہے۔ تمام مقالے اردو میں ہیں اور ہر مقالہ قرآن وحدیث اور ائمہ سلف کے ارشادات کے حوالے سے مزین ہے۔ ان مقالات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ابوالاشبال کو اللہ تعالیٰ نے کس قدر اخاذ ذہن سے نوازا ہے اور ان کے معلومات کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ مقالات کا یہ مجموعہ پہلی مرتبہ اکتوبر ۲۰۰۴ء میں مولانا محمد نعیم الدین فیضی ناظم مدرسہ محمدیہ سلفیہ بڑھیا ٹولہ، مغربی چمپارن (بہار) نے شائع کیا تھا۔ بعد ازاں مقالات کا یہ مجموعہ انھوں نے بیت الحکمت لاہور کے مدیر محترم جناب پروفیسر عبدالجبار شاکر کی درخواست پر ان کو عنایت فرما دیا۔ پروفیسر صاحب کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ وہ پاکستان کے ممتاز اہل علم اور نامور صاحب قلم ہیں۔ مختلف موضوعات اور متعدد زبانوں کی ہزاروں کتابیں ان کے بیت الحکمت میں جمع ہیں۔ انھوں نے ''مقالات شاغف'' پر ''حرفِ اوّل'' کے عنوان سے خوب صورت مقدمہ لکھا ہے، جس میں مولانا ابوالاشبال کے علمی اور عملی پہلوؤں کی دلکش اسلوب میں وضاحت کی گئی ہے اور ان کے مجموعہ مقالات کی تحقیقی حیثیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ ساڑھے پانچ سو صفحات کا مجموعہ مقالات اضافات وتصحیحات کے ساتھ جنوری ۲۰۰۶ء میں کتاب سرائے، الحمد مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ اس کتاب کا باطن تو پر از معلومات ہے ہی، ظاہر بھی دیدہ زیب ہے۔ اس پر ناشر بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

⑯...... **التعلیقات السلفیہ علی سنن النسائی:** حضرت مولانا عطاء اللہ حنیفؔ بھوجیانی نے نسائی شریف کی شرح التعلیقات السّلفیہ کے نام سے لکھی تھی جو ۱۳۷۶ھ (۱۹۵۶ء) میں ان کے قائم کردہ اشاعتی ادارے مکتبہ سلفیہ کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ جلد ہی اس شرح کو نہ صرف برصغیر میں بلکہ عرب ممالک اور مصر میں بھی مقبولیت حاصل ہوگئی تھی اور اہل علم اس سے مستفید ہوئے تھے۔ مولانا عطاء اللہ صاحب سنن نسائی کی احادیث کی تخریج کے بھی خواہاں تھے۔ چناں چہ جس طرح وہ اس کی تخریج کرنا چاہتے تھے اسی طرح مولانا ابوالاشبال شاغف نے اس کی تخریج کردی۔ تعلیقات سلفیہ کے سلسلے میں مولانا احمد مجتبیٰ سلفی اور جامعہ سلفیہ بنارس کے دیگر اصحابِ علم اور مولانا عزیر شمس صاحب کی علمی مساعی بھی قابل قدر ہیں، لیکن اس موقعے پر ہمارا مقصد اس موضوع کی تفصیل میں جانے اور التعلیقات السّلفیہ کے متعلق کوئی مستقل مضمون لکھنے کا نہیں ہے، اس سلسلے میں صرف مولانا ابوالاشبال کی علمی سرگرمیوں اور اس شرح سے ان کے اعتنا کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ مولانا ابوالاشبال کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے کہ انھوں نے اس اہم موضوع سے تعلق رکھنے والے بعض اصحابِ علم سے مشاورت کی اور پھر اس کا اشاریہ بھی ترتیب دیا اور اس ضمن میں

اور بھی ضروری خدمات سرانجام دیں۔ مولانا ابوالاشبال صاحب کا یہ نہایت دلچسپی کا موضوع ہے چناں چہ انھوں نے اسے بے حد حسن وخوبی سے سرانجام دیا۔ اب یہ شرح مع متن نسائی اور دیگر اضافات کے پانچ خوب صورت جلدوں پر مشتمل ہے جو مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

بے شبہ مولانا ابوالاشبال کا شمار موجودہ دور کے برصغیر کے مشاہیر اصحاب تحقیق علمائے کرام اور معروف اہل قلم میں ہوتا ہے۔



مولانا اللہ یار خاں

جنوبی پنجاب کے جن اصحاب علم نے درس و تدریس کے ذریعے سے خدمت دین کو اپنا شعار بنایا ان میں ایک عالم دین مولانا اللہ یار خاں ہیں۔ ان کے والد کا نام اللہ رکھیا اور دادا کا اسم گرامی محراب خاں تھا۔ بلوچ قوم کی رند گوت سے تعلق رکھتے ہیں۔

مولانا اللہ یار خاں ۱۹۴۳ کے پس و پیش موضع سکندر والا (ضلع لودھراں) میں پیدا ہوئے۔ غربت اور تنگ دستی کے ماحول میں شعور کی منزل کو پہنچے۔ والد مزدوری کر کے گزر اوقات کرتے تھے۔ مسلک کے اعتبار سے بریلوی (حنفی) تھے۔ لیکن نماز کے پابند اور تہجد گزار تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت باقاعدگی سے کرتے تھے۔ اپنے اس بیٹے (اللہ یار) کی پیدائش سے قبل ایک قبر پر حاضری کی منت مانی تھی، لیکن غربت کی وجہ سے اس قبر پر حاضر نہیں ہو سکے تھے۔

1951 میں مولانا اللہ یار نے مدرسہ سبل السلام مراقی والا (لودھراں) میں قرآنِ مجید ناظرہ، اردو کی ابتدائی کتابیں اور حساب وغیرہ پڑھنا شروع کیا۔ چار سال وہاں رہے۔ اس وقت اس مدرسے کے مدرس مولانا عبدالرحمٰن جلال پوری تھے جو طلبا کو بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔ اپنے فہم کے مطابق مولانا اللہ یار نے ان سے خوب استفادہ کیا۔

۱۹۵۵ء میں اللہ یار خاں ایک بزرگ ملک محمد یوسف مرحوم کے مشورے سے براقی والا سے دارالحدیث محمدیہ جلال پور آ گئے۔ وہاں جن حضرات سے حصول فیض کیا، وہ ہیں حضرت مولانا سلطان محمود رحمہ اللہ اور مولانا محمد رفیق اثری۔ ان کے علاوہ مولانا سید محمد قاسم شاہ صاحب (صدر مدرس دارالحدیث لودھراں) اور مولانا محمد صدیق (مظفر گڑھ) کے حضور بھی زانوئے شاگردی تہ کیے۔ جنوری ۱۹۶۳ میں دارالحدیث محمدیہ (جلال پور والا) میں حضرت مولانا سلطان محمود سے سندِ فراغت حاصل کی۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا مولانا اللہ یار خاں کا مسلکی لحاظ سے بریلوی خاندان سے تعلق تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں جب وہ مشکوٰۃ شریف پڑھتے تھے، ایک دفعہ گھر آئے۔ دادا محراب خاں نے پوچھا کہ تم قرآن اور حدیث کی تعلیم حاصل کرتے ہو، صحیح صحیح بتاؤ کہ سچا مسلک کون سا ہے؟ انھوں نے جواب دیا قرآن و حدیث کی رو سے صحیح اور سچا مسلک اہل حدیث ہے۔ ان کے دادا محراب خاں نے اسی وقت بریلویت ترک کر کے مسلک اہل حدیث اختیار کر لیا۔

مولانا اللہ یار خاں نے جنوری ۱۹۶۳ میں دارالحدیث محمدیہ (جلال پور پیروالا) سے سندِ فراغ لی تھی۔ اسی وقت اپنے استاذِ عالی قدر مولانا سلطان محمود مرحوم ومغفور کے حکم سے وہاں سلسلۂ تدریس شروع کردیا تھا جو اللہ کے فضل سے اب تک جاری ہے، یعنی ۴۵ سال سے اپنے معہد علمی کی مسند تدریس پر فائز ہیں۔ اب تک بلوغ المرام سے لے کر حدیث کی تمام کتابیں بے شمار دفعہ پڑھا چکے ہیں۔ ستائیس اٹھائیس مرتبہ صحیح مسلم کا درس دے چکے ہیں۔ علاوہ ازیں تفسیر، فقہ، اصول حدیث، عربی ادبیات، صرف ونحو، بیان ومعانی وغیرہ کی وہ تمام کتابیں جو دینی مدارس کے نصاب میں شامل ہیں، متعدد مرتبہ بہت سے طلبا کو پڑھانے کا شرف حاصل کیا اور کر رہے ہیں۔

قرآن مجید سے انھیں بے حد شغف ہے اور تفسیر قرآن ان کا خاص موضوع ہے۔ چنانچہ دارالحدیث محمدیہ کے طلبا کو تفسیر بیضاوی اور تفسیر جلالین کا درس نہایت شوق اور اہتمام سے دیتے ہیں۔ خود انھوں نے بھی ایک تفسیر تحریر فرمائی ہے جو بہت سی مشہور ومتداول تفسیروں کے مطالعہ سے ضبط کتابت میں لائی گئی ہے۔

دارالحدیث محمدیہ کی سالانہ تعطیلات کے زمانے میں مولانا اللہ یار خاں صاحب کو مختلف مدارس دینیہ کی طرف سے درس قرآن کے لیے دعوت دی جاتی ہے۔ چنانچہ بعض مدارس میں وہ تشریف لے گئے اور دورۂ تفسیر پڑھایا، ڈیرہ غازی خاں کے مشہور تدریسی مرکز "کلیۃ البنات لدراسات الاسلامیہ" میں انھوں نے مسلسل کئی سال دورۂ تفسیر پڑھایا۔ اسی طرح میاں چنوں کے مرکز الدراسات الاسلامیہ میں بھی ان کی یہ خدمت قرآن جاری رہی۔ وہ نہایت مخلص، محنتی اور سرگرم خادمِ قرآن وحدیث ہیں۔ طلبا ان کے طریق تدریس سے بے حد مطمئن ہیں اور ان کے اندازِ تفہیم سے مشکل مسائل کی آسانی سے وضاحت ہو جاتی ہے۔

مولانا ممدوح مسلسل ستائیس اٹھائیس سال سے ہر جمعہ کو جلال پور پیر والا سے ملتان جاتے اور وہاں کی ایک مسجد اہل حدیث میں جمعہ پڑھاتے ہیں۔ ان کے وعظ وخطابت سے لوگ بہت متاثر ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ لوگوں کے فہم کے مطابق سیدھے اور آسان الفاظ میں بات کرتے ہیں۔

سالہا سال سے دارالحدیث محمدیہ کے مطبخ کا انتظام بھی ان کے پاس ہے۔ وہ خود ہی سبزی وغیرہ خریدنے کے لیے دکان پر جاتے اور اپنے کندھوں پر اٹھا کر لاتے ہیں۔ سادہ زندگی بسر کرتے ہیں اور علما وطلبا کی خدمت کو اپنے لیے سعادت قرار دیتے ہیں۔

وہ ایک غریب گھر میں پیدا ہوئے اور غربت کی حالت میں ہوش سنبھالا، لیکن علوم دین کی تحصیل اور تدریس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو بے حد عزت سے نوازا۔ اب وہ مدرس بھی ہیں، خطیب بھی ہیں اور بہت اچھے واعظ بھی ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ یادِ الٰہی اور خدمت دین

میں گزرتا ہے۔ یہ ان کی بہت بڑی خوش بختی اور اللہ کا ان پر بہت بڑا کرم ہے۔

یہ سطور ۱۲۔ ستمبر ۲۰۰۷ء کو لکھی جا رہی ہیں۔ اب تک ان سے بے شمار حضرات استفادہ کر چکے ہیں، جن میں سے متعدد علمائے کرام مختلف مدارس میں فرائض تدریس سرانجام دے رہے ہیں۔ بعض اسی دارالحدیث محمدیہ (جلال پور پیروالا) کی مسند درس پر فائز ہیں۔ مثلاً حافظ عبدالرشید، حافظ محمد رفیق سلفی، حافظ عبدالحمید، مولانا اسامہ عتیق اور مولانا ضیاء الرحمٰن کا شمار ان کے ان سعادت مند تلامذہ میں ہوتا ہے، جنھوں نے اسی دارالحدیث سے تعلیم حاصل کی اور پھر یہیں مصروف تدریس ہوئے۔ ان کے علاوہ حضرت حافظ عبدالستار حماد (مرکز الدراسات الاسلامیہ میاں چنوں) حافظ عبدالغفار مدنی (جامعہ محمدیہ اوکاڑہ) اور دیگر بہت سے اصحاب علم ہیں جن کی مختلف مقامات میں تصنیفی، تدریسی اور خطابتی سرگرمیاں جاری ہیں اور وہ مولانا اللہ یار کے شاگردانِ کرام کی وسیع فہرست میں شامل ہیں۔

مولانا اللہ یار کو متعدد مدارس کے ارباب انتظام نے اپنے مدارس میں خدمت تدریس سرانجام دینے کی دعوت دی، لیکن وہ اس درس گاہ سے اپنا رشتہ توڑنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس درس گاہ سے انھیں سچی اور حقیقی محبت ہے جو انھیں وہاں سے علیحدہ نہیں ہونے دیتی۔ اس درس گاہ کے بانی اور مولانا اللہ یار کے استاذ گرامی بھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ اس سے علیحدگی اختیار کریں۔ ایک مرتبہ ساہی وال کے قاری محمد یحییٰ رسول نگری نے اپنے مدرسے کے کتب خانے کے افتتاح کے لیے مولانا اللہ یار کو دعوت دی۔ اس کا مولانا سلطان محمود صاحب کو پتا چلا تو انھیں شبہ پڑا کہ یہ وہیں نہ رہ پڑیں۔ اس کا اظہار انھوں نے مولانا اللہ یار سے تو نہیں کیا البتہ جامعہ کے ٹائم ٹیبل پر فارسی کے یہ دو شعر لکھ دیے۔

آموختی ازما بکار دیگراں کردی
ربودی گوہر از ما نثار دیگراں کردی

(پڑھا ہم سے اور کام دوسروں کے کرتے ہو۔ موتی ہم سے لیا اور نثار دوسروں پر کیا)۔

کہن شاخ کہ زیر سایۂ او پر بر آوردی
چوں برگش ریخت آشیانہ ازاو برداشتن ننگ است

(جس پرانی ٹہنی کے سائے میں بیٹھ کر تو نے اڑنا سیکھا، اس کے پتے جھڑنے لگیں تو وہاں سے آشیانہ اٹھا لینا بے وفائی ہے)

یہ شعر پڑھ کر مولانا اللہ یار حضرت مولانا سلطان محمود کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اب اس دارالحدیث سے میرا جنازہ ہی اٹھے گا۔

شاگرد کی زبان سے یہ الفاظ سن کر مولانا نہایت خوش ہوئے اور ڈھیروں دعائیں دیں۔

مولانا اللہ یار کی نرینہ اولاد چار بیٹے ہیں، جن کا مختصر الفاظ میں تعارف یہ ہے۔

①......محمد لقمان خاں: یہ مولانا کے بڑے بیٹے ہیں۔ گورنمنٹ سیکنڈری سکول میں ایس ایس ٹی کے عہدے پر فائز ہیں۔

②......محمد سلیمان خاں: انھوں نے بی اے، پی ٹی سی کیا ہے اور اب کاروبار کرتے ہیں۔

③......محمد عثمان خاں: یہ دارالحدیث محمدیہ (جلال پور پیر والا) کے سند یافتہ ہیں۔ مروجہ نصابی علوم اسی دارالحدیث کے ذی مرتبت اساتذہ سے حاصل کیے۔ اب یہیں خدمت تدریس سرانجام دے رہے ہیں۔

④......محمد عمران خاں سلفی: یہ مولانا اللہ یار خاں کے چوتھے اور سب سے چھوٹے بیٹے ہیں۔ انھوں نے دارالحدیث محمدیہ کے اساتذہ سے تحصیل علم کی۔ شیخ الحدیث مولانا محمد رفیق اثری سے بہت متاثر ہیں۔ تحقیق کا خاص ذوق رکھتے ہیں۔ قادیانیت، شیعیت اور فتنہ انکارِ حدیث سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کافی وسیع ہے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا اللہ یار خاں کی زندگی دراز فرمائے اور وہ کتاب وسنت کی زیادہ سے زیادہ خدمت سرانجام دیں۔ ان کے شاگردان گرامی جو مختلف مقامات پر تصنیفی، تدریسی اور خطابتی سرگرمیوں میں مشغول ہیں، ہمیشہ اس کارِ خیر میں منہمک رہیں۔ مولانا ممدوح کی اولاد کو بھی اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمت کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرے۔ آمین یا رب العالمین۔



مولانا عبدالسلام رحمانی

۱۹۹۰ء کے ماہِ جنوری کی ۱۵ یا ۱۶ تاریخ تھی کہ میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے دفتر گیا۔ وہاں حافظ احمد شاکر نے ایک صاحب سے تعارف کرایا۔ نکھرا ہوا گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، میانہ قد، متوازن جسم، آنکھوں پر نظر کی عینک، اچھی صحت۔ معلوم ہوا کہ ان کا اسم گرامی مولانا عبدالسلام رحمانی ہے اور ہندوستان کے رہنے والے ہیں۔ بہت محبت سے ملے اور انکسار کے لہجے میں بہت سی باتیں کیں۔ فرمایا آپ سے ملنے کا بے حد اشتیاق تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں اخبار ''الاعتصام'' کا خریدار اور قاری تھا۔ آپ کے مضامین اور اداریے بڑے شوق اور عقیدت سے پڑھا کرتا تھا۔ اس مفہوم کے اور بھی بہت سے الفاظ کہے۔ یہ ان کی مہربانی تھی کہ انھوں نے اس فقیر کو یاد رکھا اور میرا الاعتصام کا پندرہ سالہ عہد ادارت ان کے ذہن میں محفوظ رہا۔ ورنہ اس خود پسندی اور مادیت زدہ دور میں کون کسی کو یاد رکھتا اور کون کسی کے مقالے یا اداریے پڑھتا اور ان سے اثر پذیر ہوتا ہے، اور پھر ایسے اثر کی جو طویل عرصے تک ذہن پر چھایا رہے کسی سے توقع کرنا بھی مشکل ہے۔

میں ان کی باتیں سن کر ان کا شکریہ ادا کرتا رہا اور حیران ہوتا رہا کہ یہ اس فقیر کے بارے میں کس قسم کے خیالات رکھتے اور کس قدر ''عقیدت مندانہ'' حسن ظن کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس وقت میں ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک تھا اور تصنیف و تالیف کی خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ اس سلسلے میں بھی انھوں نے بعض باتیں پوچھیں اور میں نے اپنی دانست میں انھیں مناسب الفاظ میں جواب دینے کی کوشش کی۔

مولانا عبدالسلام رحمانی ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ضلع بلرام پور کے ایک گاؤں موضع کنڈوَ میں اگست ۱۹۳۸ء (جمادی الاخریٰ ۱۳۵۷ھ) میں پیدا ہوئے۔ مختصر سلسلہ نسب یہ ہے: عبدالسلام بن محمد عباس بن حبیب اللہ بن جمائی بن کریم بخش خاں۔

حصولِ علم کا آغاز موضع بونڈیہار کے مدرسہ سراج العلوم سے ہوا۔ وہیں قرآنِ مجید پڑھا، وہیں اردو اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ یعنی نو سال کی عمر میں قرآنِ مجید ناظرہ پڑھنے کے علاوہ فارسی اور اردو سے بھی شناسائی ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں ان کے چچا مولانا محمد عابد رحمانی دہلی کے دار الحدیث رحمانیہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، وہ عبدالسلام کو بھی وہیں لے جانا چاہتے تھے۔ یہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ ان کی عمر اس وقت صرف نو سال کی تھی۔ وہ انھیں دہلی لے آئے اور دارالحدیث رحمانیہ میں داخلے کے لیے مولانا نذیر احمد رحمانی کی خدمت میں انھیں پیش کیا۔ مولانا

نذیر احمد اس وقت روزنامہ اخبار ''سیاست'' پڑھ رہے تھے جو کان پور سے شائع ہوتا تھا۔ انھوں نے یہ اخبار عبدالسلام کے سامنے رکھا اور اس کی چند سطریں سنیں اور بعض الفاظ کے معنے پوچھے۔ عبدالسلام نے وہ سطریں پڑھیں اور الفاظ کے معانی بتادیے تو انھیں اسی وقت دارالحدیث رحمانیہ میں داخل کرلیا گیا۔

وہ سیاسی لحاظ سے برصغیر کا نہایت ہنگامہ خیز دور تھا اور یہ خطۂ ارض جہاں انگریزی حکومت سے حصولِ آزادی کے فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوچکا تھا، وہاں تقسیم ملک کے نتیجے میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان فسادات کا ریلا بھی پورے زور پر تھا۔ صدیوں سے ایک جگہ رہنے اور ایک دوسرے سے دوستانہ تعلقات رکھنے والے لوگ اب باہم دشمن کا روپ دھار چکے تھے۔ چناں چہ عبدالسلام کے دہلی کے دارالحدیث رحمانیہ مین داخلے سے ساڑھے تین مہینے بعد دہلی شہر شدید فسادات کی زد میں آگیا اور قتل وغارت کا وہ طوفان بپا ہوا کہ خدا کی پناہ۔

اس وقت دارالحدیث رحمانیہ کے مہتمم شیخ عبدالوہاب تھے۔ انھوں نے فسادات کے آغاز ہی میں جامعہ ملیہ کے پرنسپل ڈاکٹر ذاکر حسین سے رابطہ قائم کیا اور دارالحدیث کی عمارت اور لائبریری ان کی وساطت سے جامعہ کے حوالے کرکے خود کراچی چلے گئے۔ انھی فسادات کے زمانے میں عبدالسلام رحمانی نے دہلی میں مولانا ابوالکلام آزاد کو دیکھا اور وہیں دو مقامات پر اپنے ساتھی طلبا کی معیت میں مولانا کی تقریریں سننے کا موقع ملا۔

جب پورا دہلی شہر فسادات کی لپیٹ میں آگیا اور امن وامان کی امید بہ ظاہر باقی نہ رہی تو عبدالسلام رحمانی اپنے چچا محمد عابد رحمانی کے ساتھ کسی طرح دہلی سے نکلے اور نومبر ۱۹۴۷ھ میں اپنے گھر واپس آگئے۔ پھر وہیں مدرسہ سراج العلوم میں پڑھائی کا سلسلہ شروع کردیا۔ ۱۹۵۱ء تک وہاں کے اساتذہ سے حصولِ علم کا سلسلہ جاری رہا۔

۱۹۵۰ء میں ان کے چچا مولانا محمد عابد رحمانی جامعہ رحمانیہ (بنارس) میں داخل ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں وہ ان کو بھی وہیں لے گئے۔ دارالحدیث رحمانیہ (دہلی) کے خاتمے کے بعد مولانا نذیر احمد رحمانی بھی جامعہ رحمانیہ (بنارس) میں خدمت تدریس سرانجام دینے لگے تھے۔ اب عبدالسلام وہاں پہنچے تو پھر انھی نے ان کا امتحان لیا اور انھیں جامعہ میں داخل کرلیا گیا۔

مولانا عبدالسلام نے مدرسہ سراج العلوم میں حصولِ تعلیم کا آغاز کیا اور جامعہ رحمانیہ میں اس کی تکمیل ہوئی۔ جامعہ رحمانیہ کے دورانِ تعلیم ہی میں انھوں نے الٰہ آباد کے سرکاری عربک بورڈ سے فروری ۱۹۵۵ء میں مولوی کا، فروری ۱۹۵۶ء میں مولوی عالم کا اور فروری ۱۹۵۸ء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ مارچ ۱۹۵۸ء (شعبان ۱۳۷۷ھ) میں جامعہ رحمانیہ (بنارس) سے سند فضیلت

حاصل کی۔ انھوں نے چوں کہ دو ہی مقامات سے تعلیم حاصل کی ہے، اس لیے اساتذہ کی تعداد کم ہے۔ ابتدائی مدرسے میں منشی محمد زمان اور مولانا محمد اقبال رحمانی سے پڑھا اور جامعہ رحمانیہ (بنارس) میں (عربی مدارس کے نصاب کے مطابق) جماعت ثانیہ سے درجہ فضیلت تک مولانا نذیر احمد رحمانی املوی، مولانا مفتی عبدالعزیز عمری مئوی، مولانا فضل الرحمٰن عمری مئوی اور مولانا عبدالوحید رحمانی کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیے۔ جامعہ رحمانیہ ہی میں حضرت مولانا ابوالقاسم بنارسی کے برادرِ صغیر قاری احمد سعید بنارسی سے تجوید قرآن کے قواعد کی تعلیم حاصل کی۔ ابتدا بغدادی قاعدہ سے ہوئی اور مروّجہ علوم کی انتہا کا معاملہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم تک پہنچا۔ حدیث پاک کی یہ دونوں آخری کتابیں مولانا نذیر احمد رحمانی املوی سے پڑھیں۔ مولانا نذیر احمد رحمانی نے یہ کتابیں حضرت مولانا احمد اللہ پرتاب گڑھی سے پڑھی تھیں اور حضرت مولانا احمد اللہ کا شمار حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے اصحابِ تکریم تلامذہ میں ہوتا تھا۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

مولانا عبدالسلام رحمانی اپنے تمام اساتذہ کا بے حد تکریم سے ذکر کرتے ہیں اور ان کے اندازِ تعلیم اور طریق تربیت سے بہت متاثر ہیں۔ اساتذہ کے علاوہ جن حضرات کے اوصاف نوع بنوع نے خاص طور سے ان کے قلب وذہن پر غلبہ پایا، ان میں ایک عظیم شخصیت حضرت مولانا عبید اللہ رحمانی مبارک پوری کی ہے۔ ان کے علم وفضل، وسعت مطالعہ، تحقیق وتدقیق، تدین وتقویٰ اور کریمانہ اخلاق کا ان پر بہت گہرا اثر ہے۔ نیز شیخ عبدالعزیز بن باز کی فضیلت علمی اور جذبہ اتباعِ سنت سے بھی وہ بہت متاثر ہیں۔ شیخ ممدوح کا دل ملت اسلامیہ کی ہم دردی سے بھرپور تھا اور انسانیت کی خیر خواہی ان کے قلب صافی میں راسخ ہوچکی تھی۔ شیخ نصیر الدین البانی کی تحقیقی کاوشوں اور علمی مساعی نے بھی ان پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔

مروّجہ درسی نصاب سے فراغت کے بعد ایک سال تو انھیں کہیں کوئی کام نہ مل سکا اور ان کا یہ سال پریشانی کی نذر ہوا۔ پھر تین مہینے ایک مقام ریوا کی مسجد میں خطابت وامامت کرتے رہے۔ وہاں کچھ تدریسی خدمت بھی انجام دی۔ کچھ عرصہ گھی کی خرید وفروخت میں گزرا۔ پھر کچھ عرصہ اِدھر اُدھر کے چکر لگاتے ہوئے ایک صاحب کی معرفت مراد آباد کی مسجد اہل حدیث میں پہنچے اور وہاں خطیب وامام مقرر کرلیے گئے۔ وہ مسجد حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کے ایک شاگرد حضرت مولانا حافظ عزیز الدین صاحب مراد آبادی رحمہ اللہ کی تعمیر کردہ تھی۔ اس مسجد میں حضرت حافظ عزیز الدین صاحب کا بیش قیمت کتب خانہ بھی تھا۔ مسجد اور کتب خانے کے متولی حافظ صاحب کے فرزند گرامی محمد جمیل صاحب تھے جو نیک دل اور سادہ مزاج بزرگ تھے۔ کتب خانہ مکڑی کے جالوں اور گرد وغبار سے اٹا پڑا تھا۔ مولانا عبدالسلام رحمانی نے تمام کتابوں کو صاف کیا اور ان سے استفادہ

کیا۔ جمیل صاحب کے ساتھ اردگرد کے دیہات میں تبلیغی دورے بھی کرتے رہے۔ لیکن وہاں ان کا قیام صرف تین مہینے رہا۔ دراصل وہ کہیں جم کر تدریسی خدمات انجام دینا چاہتے تھے، لیکن اس کی کوئی صورت نہیں پیدا ہو رہی تھی۔ البتہ شوال ۱۳۷۹ھ سے شعبان ۱۳۸۳ھ (عیسوی حساب کے مطابق اپریل ۱۹۶۰ء سے دسمبر ۱۹۶۳ء) تک چار سال مدرسہ سراج العلوم جھنڈا نگر (نیپال) میں تدریس کا موقع ملا۔ لیکن اس دور میں وہاں (دینی نصاب کی رو سے) چھٹی جماعت تک ہی تعلیم کا انتظام تھا۔

دینی مدارس میں نصف شعبان سے نصف شوال تک دو مہینے کی رخصتیں ہوتی ہیں۔ ۱۳۸۳ھ میں مدرسہ سراج العلوم (جھنڈا نگر، نیپال) میں رخصتیں ہوئیں تو وہ رمضان شریف میں بمبئی کے علاقہ کوکن کے ایک مقام ''مہلہ'' چلے گئے اور رمضان کا مہینا وہیں گزارا۔ اس زمانے میں مولانا عبدالصمد شرف الدین نے الدار القیمہ بھیمبڑی (ضلع تھانہ، صوبہ بمبئی) میں امام جمال الدین ابوالحجاج مزی (متوفی ۷۶۵ھ) کی مشہور تصنیف تحفۃ الاشراف بمعرفۃ الاطراف کی تحقیق وتعلیق اور طباعت کا کام شروع کررکھا تھا۔ علاوہ ازیں المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی بھی ان دنوں الدار القیمہ میں چھپ رہی تھی۔ تحفۃ الاشراف کی تحقیق وتعلیق کے اہم کام کے لیے مولانا عبدالصمد شرف الدین کو معاون کی ضرورت تھی۔ انھوں نے اس سلسلے میں حضرت مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری کو خط بھی لکھا تھا۔ چناں چہ مولانا مبارک پوری نے مولانا عبدالسلام کو خط لکھ کر الدار القیمہ بھیج دیا۔ یہ کام ان کے ذوق کے مطابق تھا اور انھوں نے مولانا عبدالصمد شرف الدین کی نگرانی میں عزم وشوق اور محنت کے ساتھ تحفۃ الاشراف پر تحقیق وتعلیق کام شروع کردیا۔ مولانا عبدالصمد شرف الدین ان کے کام سے خوش تھے اور جس طریقے سے یہ اس کام کو آگے بڑھا رہے تھے، اس پر وہ مطمئن تھے۔ مولانا عبدالصمد بعض دفعہ سعودی عرب چلے جاتے اور ان کا قیام وہاں کافی لمبا ہوجاتا لیکن تحفۃ الاشراف کی تحقیق وتعلیق اور طباعت کا کام بہ دستور جاری رہتا۔ المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی کے سلسلے میں بھی ایک صاحب کام کررہے تھے، اگر وہ موجود نہ ہوتے تو ان کا کام بھی مولانا عبدالسلام رحمانی کرتے تھے۔

الدار القیمہ میں قیام کے زمانے میں مولانا عبدالسلام رحمانی بعض مقامات پر وہاں تدریسی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ لیکن وہ تقریباً دو سال ہی وہاں رہ سکے۔ ہوا یہ کہ ۱۳۔ شعبان ۱۳۸۴ھ (۱۸۔ دسمبر ۱۹۶۴ء) کو ان کے والد مکرم انتقال کرگئے اور یہ بعد مسافت کی وجہ سے ان کی تجہیز وتکفین میں شامل نہ ہوسکے۔ والدہ کو اس کا سخت صدمہ ہوا اور ان کی طرف سے حکم اور اصرار ہوا کہ وہاں سے آجاؤ اور گھر سے قریب کہیں کام کرو۔ چناں چہ بہ امر مجبوری انھیں الدار القیمہ کو چھوڑنا

پڑا۔ الدار القیمہ میں انھوں نے ۹۔ شوال ۱۳۸۳ھ (۲۴۔ فروری ۱۹۶۴ء) کو کام شروع کیا تھا۔ ۲۵۔ ذیقعدہ ۱۳۸۵ھ (۱۸۔ مارچ ۱۹۶۶ء) کو اس خدمت سے الگ ہوئے۔ اس عرصے میں تحفۃ الاشراف کی پہلی جلد چھپ گئی تھی اور دوسری جلد کی تحقیق و تعلیق کا کام آخری مرحلے میں تھا۔ اسی زمانے میں مولانا ابوالاشبال صغیر احمد شاغف وہاں تشریف لے گئے تھے اور یہ دونوں اس اہم ترین کام میں مصروف تھے۔

اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مولانا عبدالسلام رحمانی کے لیے خدمت دین کا ایک اور دروازہ کھلتا ہے اور وہ تدریس کی وادی میں داخل ہوتے ہیں، جس کی تکمیل تعلیم کے بعد سے انھیں شدید خواہش تھی۔ ۲۰۔ مارچ ۱۹۶۶ء (۲۷۔ ذیقعدہ ۱۳۸۵ھ) کو جامعہ سلفیہ بنارس کے تعلیمی افتتاح کی تقریب تھی۔ وہ الدار القیمہ بھیمڑی سے استعفیٰ دے کر اس تقریب میں شرکت کے لیے بنارس گئے۔ جامعہ رحمانیہ (بنارس) کے متعدد اساتذہ اس نئے مرکزی دارالعلوم یعنی جامعہ سلفیہ میں منتقل کردیے گئے تھے، اس لیے جامعہ رحمانیہ میں ان کی جگہ نئے اساتذہ کی ضرورت تھی۔ مولانا عبدالسلام رحمانی اسی جامعہ کے فارغ التحصیل تھے اور جامعہ کی مجلس منتظمہ کے ارکان ان سے واقف تھے۔ چناں چہ جامعہ رحمانیہ کے عربی شعبے میں تدریس کے لیے ان کی تقرری ہوگئی اور وہ ۲۳۔ ذی الحجہ ۱۳۸۵ھ (۱۵۔ اپریل ۱۹۶۶ء) سے ۱۵۔ شعبان ۱۳۹۲ھ (۲۴۔ ستمبر ۱۹۷۲ء) تک تقریباً سات سال وہاں فریضہ تدریس انجام دیتے رہے۔ سات سال کی اس طویل مدت میں انھوں نے اس وقت کی جمعیت اہل حدیث ہند کے ناظم اعلیٰ مولانا عبدالجلیل رحمانی کے حسب ارشاد جنوبی ہند کے مختلف شہروں کا دورہ کیا اور رمضان ۱۳۸۹ھ (دسمبر ۱۹۶۹ء) میں علاقہ کوکن کے دورے پر روانہ ہوئے۔ ان دوروں کا تعلق جماعتی تنظیم سے تھا۔

جامعہ رحمانیہ بنارس کی تدریس کے زمانے میں ان کو گھریلو عربی زبان سے شناسائی کا بہترین موقع ملا۔ جامعہ سلفیہ (بنارس) کے قیام کے بعد جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) کی طرف سے اس میں طلبا کو پڑھانے کے لیے دو سعودی اساتذہ (شیخ زبیع اور شیخ ہادی) کا تقرر عمل میں آیا تھا۔ وہ دونوں شوال ۱۳۸۹ھ میں اپنے اہل و عیال سمیت بنارس آئے۔ ان دونوں اساتذہ سے مولانا عبدالسلام رحمانی کے اچھے مراسم تھے، چناں چہ شیخ زبیع نے اپنے بیٹے عبدالکریم کو اور شیخ ہادی نے اپنے بیٹے محمد کو ان کی شاگردی میں دے دیا اور وہ دونوں لڑکے روزانہ نمازِ عصر کے بعد ان سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔ یہ سلسلہ آٹھ مہینے جاری رہا اور مولانا عبدالسلام کو زندگی میں پہلی مرتبہ عرب بچوں کی گفتگو سننے اور جاننے کا موقع ملا۔

جامعہ رحمانیہ (بنارس) کی سات سالہ تدریس کے بعد ان کی تگ و تاز کا ایک اور دور آتا ہے،

جس کا تعلق ہندوستان کی جماعت اہل حدیث کی تنظیم اور اس کے اخبار پندرہ روزہ ''ترجمان'' (دہلی) کی ادارت سے ہے۔ دس اور گیارہ ستمبر ۱۹۷۲ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کی مجلس شوریٰ کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا، جس میں مرکزی جمعیت کے عہدے داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ ڈاکٹر سید عبدالحفیظ سلفی کو صدر اور مولانا عبدالوحید اور حافظ محمد یحییٰ (دونوں) کو نائب صدر منتخب کیا گیا۔ مولانا عبدالحمید رحمانی کا انتخاب بہ طور ناظم اعلیٰ ہوا اور مولانا عبدالسلام رحمانی کو نائب ناظم بنایا گیا۔ نیز پندرہ روزہ ''ترجمان'' (دہلی) کے معاون مدیر مقرر کیے گئے۔ بعد ازاں ۲۷۔ جولائی ۱۹۷۵ سے ۲۲۔ جون ۱۹۷۸ء تک مرکزی جمعیت کی نظامت علیا اور پندرہ روزہ ''ترجمان'' کی ادارت کا منصب ان کے سپرد رہا۔ اس اثنا میں انھوں نے کیرالا، کشمیر، آسام وغیرہ ہندوستان کے بہت سے مقامات کے دورے کیے اور ان مقامات کی جو جمعیتیں مرکزی جمعیت اہل حدیث سے منسلک نہیں تھیں، انھیں مرکزی جمعیت سے منسلک کیا۔

مرکزی جمعیت ہند سے تعلق کے دوران بحری جہاز کے ذریعے حج وعمرہ کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ اس کے لیے وہ ۱۱۔ ستمبر ۱۹۷۳ء کو گھر سے نکلے تھے اور پونے چار مہینے کے بعد واپس آئے۔ قیامِ حجاز کے دوران بہت سے علماء ومشائخ سے ملاقات ہوئی، جن میں شیخ عبدالعزیز بن باز، ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی، علامہ ناصر الدین البانی، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، سید بدیع الدین راشدی، شیخ صالح قراز امینِ عام رابطہ عالم اسلامی، شیخ ابراہیم بن محمد بن ابراہیم آل شیخ، شیخ عبدالملک آل شیخ، مفتی امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین، شیخ امین شنقیطی، شیخ محمد قطب، شیخ حسین مخلوف مفتی مصر، مولانا محمد زکریا مولانا محمد یوسف بنوری اور دیگر بہت سے حضرات شامل ہیں۔

جون ۱۹۹۵ء تک انھیں سعودی عرب جانے کا موقع نو مرتبہ حاصل ہوا۔ متحدہ عرب امارات جانے کا پانچ مرتبہ، کویت کا چار مرتبہ اور مصر اور پاکستان جانے کا ایک ایک مرتبہ موقع ملا۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند سے مستعفی ہونے کے بعد فیجی کی انجمن اہل حدیث کی دعوت پر ۲۴۔ جون ۱۹۷۸ء کو فیجی چلے گئے۔ وہاں انھوں نے اپنی جماعت اور مسلک کی بہت خدمت کی اور اس سلسلے میں ان کی تبلیغ نہایت موثر ثابت ہوئی۔ ۱۰۔ مارچ ۱۹۸۵ء تک سات سال وہاں رہے۔ واپس آئے تو جامعہ سراج العلوم بونڈیہار کے منتظمین کی درخواست پر وہاں تدریسی خدمات انجام دینے لگے اور انتظامیہ نے اس کے مہتمم بھی ان کو بنا دیا۔ ۱۱۔ مئی ۱۹۸۵ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث کی مجلس شوریٰ کا اجلاس بنگلور میں ہوا تو انھیں پھر جمعیت کا ناظم اعلیٰ بنا دیا گیا۔ اس طرح ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

اب مولانا عبدالسلام رحمانی کے مختلف ممالک کے سفر کے بارے میں مزید چند باتیں:

مولانا عبدالسلام رحمانی کے سلسلۂ اسفار کا آغاز ۱۹۷۳ء سے حج بیت اللہ سے ہوتا ہے۔ پھر یہ سلسلہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ انھوں نے دنیا کی بتیس ایئر لائنوں کے بہت سے ہوائی جہازوں پر سفر کیا۔ صرف تین سیٹ والے جہاز سے بھی اور سب سے بڑے جہاز بوئنگ ۷۴۷ (جمبو جیٹ) سے بھی۔ بعض ائیر لائنوں پر تو بار بار سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ اپنے ملک ہندوستان کے مختلف مقامات کے سفروں کے علاوہ انھوں نے جن ممالک کے سفر کیے وہ ہیں فیجی، ملائشیا، سڈنی، سنگا پور، نیوزی لینڈ، امریکا، آسٹریلیا، جاپان، اٹلی، ابوظبی، سعودی عرب، چین، انگلستان، فرانس، مصر، کویت، نیپال، پاکستان، دوبئی، بحرین، مسقط، دوحہ، شام، اردن، انڈونیشیا، کنیڈا، جنیوا، ڈنمارک۔ پھر جس ملک میں انھیں جانے کا اتفاق ہوا، اس کے بہت سے شہروں میں گھومے پھرے۔ ان تمام ملکوں کے سفروں میں انھوں نے مختلف سنٹروں اور اداروں میں تقریریں کیں اور ہر جگہ اسلام کی تبلیغ کی۔ اس طرح کہنا چاہیے کہ انھوں نے دنیا کے بہت سے بلاد وامصار میں اسلام کا پیغام حق پہنچایا اور اللہ کا کلمہ بلند کیا۔ بہ الفاظ دیگر دنیا کے بہت بڑے مبلغین اسلام میں ان کا شمار ہوا۔

مولانا عبدالسلام رحمانی نے جہاں تقریر وخطابت اور تدریس میں بے پناہ دلچسپی لی، وہاں تحریری رنگ میں بھی ان کی خدمات بڑی پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کی مطبوعہ کتابیں مندرجہ ذیل ہیں جن میں سے بعض کتابیں کئی کئی دفعہ چھپی ہیں:

① ...... اسلامی کہانیاں: (حصہ اول، دوم، سوم)۔ یہ کتاب مکتب میں زیر تعلیم بچوں کی ذہنی تربیت واصلاح کے لیے لکھی گئی ہے۔ حصہ اول درجۂ سوم کے لیے، حصہ دوم درجۂ چہارم کے لیے اور حصہ سوم درجۂ پنجم کے لیے۔ اس کتاب نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔

② ...... حضرت حسن بصری۔ حالات وملفوظات: حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے حالات وملفوظات بڑے مؤثر اور حکیمانہ ہیں اور اصلاح کا ذریعہ۔ یہ کتاب بھی متعدد مرتبہ چھپ چکی ہے۔

③ ...... المنکرات فی العقائد والاعمال والعادات: مسلمانوں میں عقائد واعمال کے سلسلے کی جو برائیاں پیدا ہوچکی ہیں اور عادات ورسوم کی جن بدعات نے ان کو گھیر رکھا ہے، ان کی قرآن وحدیث اور اقوالِ سلف کی روشنی میں اس کتاب میں مذمت کی گئی ہے۔ یہ کتاب اب تک ہزاروں کی تعداد میں چھپ چکی ہے۔

④ ...... محرم الحرام اور مسئلہ حضرت حسین ویزید: ماہِ محرم میں جن بدعات کا ارتکاب کیا جاتا ہے، اس کتاب میں ان کی تردید کے ساتھ ان روایات کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے جو ماہِ محرم اور عاشورا کی فضیلت کے سلسلے میں بیان کی جاتی ہیں۔ نیز حضرت حسین اور یزید کے متعلق امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا نقطہ نظر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

⑤...... ماہِ ربیع الاوّل اور حب رسول (ﷺ) کے مظاہرے: یہ کتاب ان بدعات کے رد میں لکھی گئی ہے جو ماہِ ربیع الاوّل میں کی جاتی ہیں۔

⑥...... تزئین مساجد کی شرعی حیثیت: امت مسلمہ میں مسجدوں کی تزئین وآرائش کا سلسلہ بہت بڑھ گیا ہے۔ اس کتاب میں اس کی شرعی حیثیت واضح کی گئی ہے۔

⑦...... خضاب کی شرعی حیثیت: اس کتاب میں خضاب کی مشروعیت کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

⑧...... تزیّن وتجمل کی شرعی حیثیت: بعض حلقوں میں تزیّن وتجمل کو شرعاً غیر مستحسن سمجھا جاتا ہے، اس کتاب میں اس کی شرعی حیثیت واضح کی گئی ہے۔

⑨...... فریضہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر: اس کتاب میں قرآن وحدیث کی روشنی میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید واہمیت تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔

⑩...... اتباعِ سنت کا مفہوم کتاب وسنت اور اقوالِ سلف کی روشنی میں: مسلمانوں کا ہر طبقہ اپنے آپ کو متبع سنت قرار دیتا ہے۔ اس کتاب میں (جیسا کہ نام سے ظاہر ہے) اتباعِ سنت کے صحیح مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے۔

⑪...... ضعیف وموضوع روایات: ہمارے یہاں تقریر وتحریر میں بعض موضوع اور ضعیف روایات بیان کی جاتی ہیں، اس کتاب میں ان روایات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس موضوع کی یہ نہایت اہم کتاب ہے۔

⑫...... دیارِ غیر میں: یہ مولانا عبدالسلام رحمانی کا سفر نامہ ہے جو ۳۲۱ صفحات پر محیط ہے۔ نہایت دلچسپ سفرنامہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے مولانا نے تقریباً پوری دنیا کی سیاحت کرڈالی ہے۔ ان کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ جہاں گئے اسلام کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیا۔ سفر نامے کی زبان اور مولانا کے اندازِ بیان میں بڑی کشش پائی جاتی ہے۔ اس سفر نامے میں ان کا پاکستان کا سفر بھی شامل ہے جو انھوں نے جنوری ۱۹۹۰ء میں کیا۔ لاہور میں ان کا قیام دفتر ''الاعتصام'' (دارالدعوۃ السّلفیہ) میں رہا۔ یہیں میری ان سے ملاقات ہوئی۔ اس کا ذکر انھوں نے جن الفاظ میں کیا ہے، وہ الفاظ بھی اگر یہاں درج کردیے جائیں تو کیا مضائقہ ہے۔ قارئین کرام نے اتنا کچھ پڑھا ہے تو یہ چند الفاظ بھی پڑھ لیجیے جو انھوں نے اس فقیر کے بارے میں تحریر کیے ہیں۔ ان الفاظ کے اندراج کو میں اپنی ذات تک محدود کرکے بخل سے کام نہیں لینا چاہتا بلکہ اس زمانے (۱۹۹۰ء) کے ''الاعتصام'' کے ارکانِ ادارت کا ذکر بھی انہی کے الفاظ میں کرتا ہوں۔ لکھتے ہیں:

وہیں میری ملاقات جناب حافظ صلاح الدین یوسف صاحب، حافظ نعیم الحق صاحب،

حافظ محمد سلیمان انصاری صاحب اور علیم ناصری صاحب سے ہوئی جو ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور سے منسلک تھے، جن کی نگارشات سے میں ''الاعتصام'' کے ذریعے مستفید ہوتا رہا تھا، ان سے ملاقات کرکے دل کو بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ خاص کر مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب سابق مدیر الاعتصام سے ملاقات میرے لیے بہت زیادہ خوشی کا موجب ہوئی۔ میں زمانۂ طالب علمی ہی سے ''الاعتصام'' کا خریدار تھا اور اس دور میں بھٹی صاحب کے اداریے الاعتصام میں بہت شوق وعقیدت سے پڑھتا تھا، اب حافظ احمد شاکر صاحب کی مہربانی سے مجھے مولانا بھٹی کے دیدار وملاقات کا شرف حاصل ہوگیا تو بہت خوشی ہوئی۔ [1]

''کویت وپاکستان کا سفر'' کے عنوان سے ان کی تحریر صفحہ ۲۷۳ سے چلتی ہے اور صفحہ ۲۸۳ پر ختم ہوتی ہے۔ ان صفحات میں کویت اور پاکستان کی متعدد شخصیات سے ملاقات کا ذکر کیا گیا ہے۔

⑬...... بڑے بڑے گناہ: ان کی یہ تصنیف فردوس پبلی کیشنز نئی دہلی سے شائع ہوئی۔

⑭...... مکاتیب حضرت شیخ الحدیث: یہ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبید اللہ رحمانی مبارک پوری کے مکتوباتِ گرامی ہیں جو حضرت مرحوم نے مختلف اوقات میں مولانا عبدالسلام رحمانی کے نام لکھے۔ یہ مجموعہ خالص علمی نوعیت کا ہے اور ۱۲۰ مکتوبات پر مشتمل ہے۔ بہت دلچسپ مجموعہ ہے۔ آخر میں دس بزرگانِ دین کی تحریروں کا عکس شائع کیا گیا ہے، جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں: ① حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی، ② حضرت شیخ حسین بن محسن انصاری، ③ حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری، ④ حضرت مولانا عبدالسلام مبارک پوری، ⑤ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی، ⑥ حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، ⑦ حضرت مولانا عبید اللہ رحمانی مبارک پوری، ⑧ حضرت مولانا نذیر احمد رحمانی املوی، ⑨ حضرت مولانا محمد اقبال رحمانی اور ⑩ حضرت مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری۔

اب مولانا عبدالسلام رحمانی کی غیر مطبوعہ تحریرات کی طرف آیئے۔

①...... تذکار الصنادید فی ترجمۃ اصحاب الصحاح والمسانید: یہ کام انھوں نے جامعہ رحمانیہ (بنارس) کی طالب علمی کے آخری سال کیا۔ اس میں تمام اصحابِ صحاح اور اصحابِ مسانید کے حالات مرقوم ہیں۔ بعض اہل علم نے ابن ماجہ کے بجائے موطا امام مالک کو صحاح ستہ میں شامل کیا ہے، اس لیے امام مالک کے حالات بھی مولانا نے اس کتاب میں تحریر کردیے ہیں۔ اصحابِ مسانید کے ضمن میں تین ائمہ (امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل) کے حالات رقم کیے گئے ہیں۔ امام

---

[1] دیارِ غیر میں، صفحہ: ۲۸۰، ۲۸۱۔

ابوحنیفہ ؒ کی اگرچہ کوئی تصنیف نہیں ہے، مگر مسند امام اعظم کے نام سے ایک کتاب موسوم ہے جو ساتویں صدی ہجری کے قاضی القضاۃ ابوالموید محمد الخوارزمی کی تصنیف ہے، لیکن امام صاحب کی طرف منسوب ہے، اس لیے مولانا رحمانی نے انھیں بھی اس فہرست میں شامل کرلیا ہے۔ اس طرح اس کتاب میں ائمہ اربعہ، اصحابِ صحاح ستہ اور اصحابِ مسانید کے حالات ضبط تحریر میں آ گئے ہیں۔ یہ مجموعہ کافی ضخیم ہے۔

۲...... طالب علمی کے زمانے ہی میں مولانا رحمانی نے بعض مکمل کتابوں کی اور بعض کے کچھ حصوں کی تلخیص کی تھی۔ مثلاً شہرستانی کی الملل والنحل کی، ابوالحسن علی ماوردی کی الاحکام السلطانیہ کی، امام رازی کی محصل کی، تاریخ التشریع الاسلامی کے اردو ترجمہ فقہ اسلامی کی مکمل کتابوں کی تلخیص کی۔ بعض کتابوں کے بعض حصوں کی تلخیص کی۔ یہ ملخص مسودات ان کے پاس محفوظ ہیں۔

۳...... جامعہ رحمانیہ (بنارس) کے تدریسی دور میں امام احمد بن حنبل کی کتاب الصلوٰۃ کا ضروری تعلیقات کے ساتھ اردو ترجمہ کیا تھا، جس کا کچھ حصہ ۱۹۷۱ء میں ''ترجمان'' دہلی کے پانچ شماروں میں چھپا تھا۔ اس کا زیادہ حصہ مسودے کی صورت میں مولانا کے گھر میں محفوظ ہے۔

علاوہ ازیں متعدد رسائل وجرائد میں ان کے مضامین شائع ہوئے۔ تحریر ونگارش کا سلسلہ انھوں نے ۱۹۵۹ء میں شروع کیا تھا۔

جامعہ سراج العلوم بونڈھیار (ضلع بلرام پور یوپی، انڈیا) سے ''الضیاء'' کے نام سے ایک سالانہ میگزین شائع ہوتا ہے، اس میں مولانا عبدالسلام رحمانی کا ایک طویل انٹرویو شائع ہوا تھا جو ایک صاحب نے ان سے لیا تھا۔ اس میں انھوں نے اس فقیر کا ذکر بھی کیا ہے۔ انٹرویو لینے والے نے مولانا عبدالسلام رحمانی سے سوال کیا کہ کوئی ایسی کتاب بتایئے جو آپ کے نزدیک طلبا کے مطالعہ کے لیے زیادہ مفید ہو۔

مولانا نے جواب دیا: علامہ ناصر الدین البانی کی تالیفات کا مطالعہ ان شاء اللہ بہت زیادہ مفید ثابت ہوگا اور اس سے تحقیق کا شعور پیدا ہوگا۔ اردو کتب میں (پاکستان کے) مولانا محمد اسحاق بھٹی کی تازہ ترین شائع شدہ کتابیں نقوشِ عظمت رفتہ، بزم ارجمنداں، کاروانِ سلف، قافلہ حدیث کا مطالعہ کیجیے، جن میں علماوصلحا کے کردارِ زندگی سے بڑا سبق ملے گا اور مولانا بھٹی کے اسلوبِ نگارش سے لکھنے کا اچھا اسلوب ملے گا، ان شاء اللہ۔

کرشنا نگر (نیپال) سے مولانا عبداللہ مدنی جھنڈانگری کی ادارت میں ''نورِ توحید'' کے نام سے ایک ماہنامہ شائع ہوتا ہے۔ اس کی ہر اشاعت میں ''ساعتے با اہل دل'' کے عنوان سے مولانا عبدالسلام رحمانی اس فقیر کی مذکورہ بالا کتابوں میں سے کسی بزرگ کے حالات اور ان کے تدین

وتقویٰ کے واقعات قسط وار شائع کررہے ہیں۔ آج جب یہ سطور لکھی جارہی ہیں ۷۔ ستمبر ۲۰۰۶ء ہے اور اس سے دو مہینے قبل جولائی ۲۰۰۶ء کا ''نورِ توحید'' میرے سامنے ہے، اس میں اس موضوع (ساعتے با اہل دل) کی آٹھویں قسط شائع ہوئی ہے، جس میں اس فقیر کی کتاب کے اقتباسات درج کیے گئے ہیں۔ اس عزت افزائی پر میں مولانا عبدالسلام رحمانی کا بے حد شکر گزار ہوں۔

یہاں یہ بھی سنتے جایئے کہ ۳۰۔ اپریل ۲۰۰۳ء کو نیپال کے مرکز التوحید کے زیر اہتمام نیپال اور ہندوستان کے عمائد اور اربابِ صحافت کا اجلاس ہوا، جس میں اس مرکز کی طرف سے شائع ہونے والے مجلّے ''نورِ توحید'' کی اشاعت کے پندرہ سال پورے ہونے پر مولانا عبدالسلام رحمانی کی تحریری خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے مرکز التوحید کی طرف سے ان کی خدمت میں سولہ ہزار روپے کا چیک پیش کیا گیا، لیکن مولانا نے چار ہزار اپنی طرف سے شامل کرکے بیس ہزار روپے مجلّہ ''نورِ توحید'' کے اشاعتی فنڈ میں جمع کرادیے۔

کچھ عرصہ پیشتر مولانا کی بائی پاس سرجری ہوئی تھی، جس سے وہ کافی کمزوری محسوس کررہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جامعہ سراج العلوم بونڈیہار (ضلع بلرام پور) میں حدیث کی بعض کتابیں طلبا کو باقاعدہ پڑھاتے ہیں۔ یہ سطور ۷۔ ستمبر ۲۰۰۶ء کو لکھی گئی ہیں۔ اس وقت تک وہ عمر عزیز کی ۶۸ منزلیں طے کرچکے ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں صحت وعافیت سے نوازے رکھے اور وہ کتاب وسنت کی خدمت میں مصروف رہیں۔



ڈاکٹر صہیب حسن

برصغیر کے عمر پوری خاندان کے علمائے کرام نے تدریسی اور تصنیفی میدان میں بہت سے کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ اس خاندان کے ایک مشہور رکن مولانا عبدالغفار حسن ہیں، جن کا تذکرہ ''برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن'' میں کیا گیا ہے اور قرآنِ مجید سے متعلق ان کی مساعی کی وضاحت کی گئی ہے۔ زیر مطالعہ کتاب ''دبستانِ حدیث'' میں بھی ان کے متعلق تفصیلی مضمون لکھا گیا ہے۔ مولانا کے لائق فرزندوں میں سے ایک فرزند ڈاکٹر صہیب حسن ہیں جو نومبر ۱۹۴۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا ذکر بھی اس فقیر کی کتاب ''برصغیر کے اہل حدیث خدامِ قرآن'' میں کیا گیا ہے اور قرآنِ مجید سے متعلق ان کی مساعی کی وضاحت کی گئی ہے۔ زیر مطالعہ کتاب ''دبستانِ حدیث'' میں ان کی اس تگ وتاز کی نشان دہی کی جارہی ہے جس کا تعلق خدمت حدیث سے ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

① ...... لندن میں جمعیت اہل حدیث کے زیر اہتمام قائم کردہ مسجد توحید (تاسیس ۱۹۸۴ء) میں شروع ہی سے ڈاکٹر صاحب نے صحیح مسلم کا ہفتہ وار درس (بزبانِ انگریزی) دینا شروع کیا یہ سلسلہ ماشاء اللہ باقاعدگی سے جاری ہے۔

② ...... مسجد توحید میں عشا کی نماز کے بعد ہر روز دو یا تین احادیث مختصر تشریح کے ساتھ (بزبان انگریزی) پیش کی جاتی ہیں۔ دو سال کی مدت میں الادب المفرد للبخاری کا درس مکمل ہو چکا ہے اور اپنے والد گرامی مولانا عبدالغفار حسن کی ترتیب کردہ کتاب ''انتخابِ حدیث'' کا درس بھی تکمیل کی منزل کو پہنچ گیا ہے۔

③ ...... مسجد توحید ہی میں چند طلبہ کو عربی میں ابن کثیر کی ''الباعث الحثیث اختصار علوم الحدیث'' کا درس چکے ہیں۔ یہ کتاب اصولِ حدیث سے متعلق ہے۔

④ ...... مسجد توحید میں منعقدہ ایک پروگرام میں ڈاکٹر صاحب ممدوح محدثین کرام (امام مالک، بخاری، مسلم، نسائی، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ) کی حیات اور کام کا مختصر تعارف پیش کر چکے ہیں۔

⑤ ...... القرآن سوسائٹی کے تحت سنت سے متعلق یہ تین کاوشیں شائع کی گئیں۔

ا۔ کتابچہ بعنوان ''تعارفِ سنت'' Introduction to Sunnah

ب۔ کتابچہ بعنوان ''اصولِ حدیث'' Science of Hadith

اس کتاب کا علیحدہ سے ایک ضمیمہ بھی تیار کیا جا چکا ہے جو طلبا کے زیر استعمال ہے لیکن باقاعدہ

شائع نہیں ہوا۔

⑥...... دو سال قبل شاہ فہد کمپلیکس کے زیر اہتمام سنت نبوی پر ایک سیمینار منعقد ہوا تھا جس میں ڈاکٹر صہیب حسن نے انگریزی زبان میں سنت سے متعلق تمام مطبوعہ مقالات اور کتب کی فہرست (ببلیوگرافی) پیش کی تھی۔

یہ مقالہ کتابی شکل میں وزارت شئونِ اسلامیہ (سعودی عرب) کی طرف سے شائع کیا جاچکا ہے، جس میں نوسو چار (۹۰۴) حوالجاتِ کتب ومقالات دیے گئے ہیں۔

ج: کتاب بعنوان ''محدثین کے نزدیک معیار نقد حدیث سنن ابن ماجہ کی موضوع احادیث کے حوالے سے'' (بزبانِ انگریزی) ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ دراصل برمنگھم یونیورسٹی سے ایم اے کی سند کے حصول کا ذریعہ بنا اور کتابی شکل میں دارالافتاء (ریاض) اور القرآن سوسائٹی (لندن) کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے۔ Criticism of Hadith Among the traditionists

7...... ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حصول کے لیے انھوں نے محدث نعیم بن حماد کی کتاب الفتن کے ''باب المهدی'' کا انتخاب کیا تھا اور اس باب میں مندرجہ دوسو احادیث کی تخریج کے ساتھ ساتھ مہدویت کے بارے میں اصولی بحث پیش کی تھی۔ یہ مقالہ ''برمنگھم یونیورسٹی'' کی لائبریری میں موجود ہے۔ ابھی زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔ The concept of mahdi among ahl_ul_sunnah۔

8...... کئی سال ''لندن اوپن کالج'' کے ٹیوٹر بھی رہے اور طلبا وطالبات کی علوم القرآن، حجیت سنت، اصولِ حدیث، تفسیر اور فیملی لاز (نکاح وطلاق سے متعلق قوانین) جیسے موضوعات میں بذریعہ ٹیلی فون رہنمائی کرتے رہے۔ علوم قرآن، اصولِ حدیث سے متعلق ان کے رسائل سلیبس میں شامل ہیں۔

⑨...... حدیث کے موضوع پر لندن، شیکاگو اور جزائر فیجی میں متعدد تعلیمی وتربیتی پروگراموں میں حصہ لیا۔

⑩...... مقالہ بعنوان ''تحقیق روایات بجواب تبادلہ خیالات'' (ایک شیعہ تحریر کا ردّ)۔ غیر مطبوع، ۱۶ صفحات۔

ڈاکٹر صاحب ماشاء اللہ تبلیغ دین کے بارے میں نہایت تیز ہیں اور یہ خدمت بے حد شوق سے سرانجام دیتے ہیں۔

ادبی، دعوتی اور فقہی میدان میں ان کی دوسری تحریریں بھی ملاحظہ گرامی میں لائیے۔

①...... **''القادیانیه فی المیزان''**: یہ پمفلٹ اردو اور انگریزی میں شائع کیا گیا۔ اور عربی

میں ''التوعیہ الاسلامیہ'' (مکہ مکرمہ) میں بالاقساط شائع ہوا۔ نیز متعدد عربی مقالات سعودی عرب کے کئی رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے۔

②...... ''لندن سے غرناطہ'' سفر نامہ بزبانِ اردو۔ ماہنامہ صراطِ مستقیم (لندن)، البلاغ (بمبئی) اور اردو ڈائجسٹ (لاہور) میں بھی شائع ہوا۔ دوسرے متعدد سفرنامے انہی رسائل میں اور جریدہ المنبر میں شائع ہوئے۔ جن ممالک کے بارے میں سفر نامے شائع ہو چکے ہیں وہ یہ ہیں:

① کراچی سے ریاض (بحری وبری سفر)، ② بحرین، ③ ناروے، ④ جزائر فیجی، ⑤ اسپین، ⑥ بیت المقدس، ⑦ برلن، ⑧ امریکہ (غیر مطبوع)، ⑨ بیروت (زیر ترتیب)، ⑩ جبرالٹر (غیر مطبوع)، ⑪ بوسنیا، ⑫ ملائیشیا۔

③...... ''خدائی وعدہ'' قادیانیت کی تردید میں ایک پمفلٹ (اردو، شائع کردہ جمعیت اہل حدیث، لندن)

④...... ''امت مسلمہ کے مسائل اور سیرت نبوی کی روشنی میں ان کا حل'' (اردو) شائع کردہ جمعیت اہل حدیث، لندن۔

⑤...... وہ تحقیقی مقالے جو بین الاقوامی کانفرنسوں میں بزبانِ عربی پیش کیے گئے۔

- جهود المملكة العربية السعودية فى دعم الاسلام والمسلمين وبريطانيا. (٢١ صفحات)
- جهود خادم الحرمين الشريفين فى دعم المساجد والمؤسسات الاسلامية فى المملكة المتحدة. (٢٨ صفحات)
- واجب الأقلية فى تبليغ رسالة الإسلام. (مؤتمر ايڈنبرا) مطبوع. (٢٨. صفحات)
- الحملات المغرضة لوسائل الإعلام وأالمفاهيم الخاطئة عن الاسلام لدى الغرب (لاهور. ١٣ صفحات)
- مواطن الضعف فى الجالية المسلمة بالغرب وطرق معالجتها. (١٨ صفحات)
- الجمعيات والمؤسسات والمراكز الاسلامية فى خدمة الدعوة والتعليم. (بوڈاپسٹ. ١٨ صفحات)
- تنشيط مهمة المسجد فى الغرب. (رابطه عالم اسلامى، مكه مكرمه، مطبوع (٣٦ صفحات)
- تصحيح مفاهيم خاطئة عن حركة الشيخ محمد بن عبدالوهاب فى مصادر

عربیة. برمنگھم (۱۶ صفحات)

⑥...... وہ تحقیقی مقالے جو بین الاقوامی کانفرنسوں میں بزبانِ انگریزی پیش کیے گئے۔

1- Principlers of understanding of the Quran.

(کانفرنس۔لندن۔۱۱صفحات)

2- Instument of revelation.

(موسیقی پر ایک سیمینار۔لندن۔۱۷صفحات)

3- Marital Prblems & Issues appecting Muslims family life in Britain.

(کانفرنس۔ڈبلن۔۷صفحات)

4- How to call others to Islam.

(جمعیت اہل حدیث کانفرنس۔برمنگھم۔۱۱صفحات)

5- A correction of Misunderstandings found in non-Arabic sources upon the movement of Shaikh Muhammad bin Abdul Wahhab.

(جمعیت اہل حدیث کانفرنس۔برمنگھم۔۱۸صفحات)

6- The Muslim personal law.

(اسلامی شریعہ کونسل سیمینار۔لندن)

مزید انگریزی رسائل اور کتب جو ڈاکٹر صاحب ممدوح کی تصانیف میں شامل ہیں۔

⑦......"ہم نماز کیوں پڑھیں" Why do We pray

⑧......تربیت اولاد Raising Children in Islam

⑨......روح کا سفر Journe of the suol

⑩......وظیفہ مسجد Role of mosque in Islam

⑪......"سوالات کے جوابات" مجلّہ صراطِ مستقیم (برمنگھم) کا ایک مستقل سلسلہ مضمون جس میں فقہی نوعیت کے جوابات دیے جاتے ہیں۔

⑫......اسلامی شریعہ کونسل کی "ویب سائٹ" جس میں وہ تمام فتاویٰ محفوظ کردیے گئے ہیں جو انگریزی میں تحریر کیے گئے ہیں۔

⑬......متعدد ٹیپ اور سی ڈیز جن میں مندرجہ ذیل مضامین کا احاطہ کیا گیا ہے۔

ا......خلاصہ "الاتقان فی علوم القرآن" للسیوطی۔

ب...... درس ''العواصم من القواصم'' لابی بکر العربی۔

ج...... درس ''القواعد الفقہیہ الجامعہ'' للشیخ عبدالرحمٰن السعدی۔

د...... سیرتِ نبوی پر سلسلہ تقاریر۔

ر...... غزوہ بدر، غزوہ احد، فتح مکہ، معراج پر خصوصی تقاریر۔

ز...... شرک، بدعت کے موضوعات پر ویڈیو ٹیپس۔

ر...... آیات بنی اسرائیل کی روشنی میں امت مسلمہ کا عروج وزوال۔ یعنی قضیہ فلسطین کا احاطہ کیا گیا۔ (اردو، انگریزی، عربی)

س...... مسئلہ تقدیر پر ایک مفصل تقریر (اردو، انگریزی)

ش...... تربیت اولاد پر ایک مفصل تقریر (اردو، انگریزی)

ص...... مسئلہ کشمیر پر مفصل تقریر (انگریزی، عربی)

مشہور ٹیلی ویژن چینل ''الجزیرہ'' کے دو عربی پروگراموں میں حصہ لیا جو مسئلہ کشمیر سے متعلق تھے۔

ڈاکٹر صہیب حسن کے بیٹے بیٹیاں بھی ماشاء اللہ تحریر وتدریس کی صورت میں خدمت اسلام میں مصروف ہیں۔ ان کے ایک بیٹے کا نام ڈاکٹر حافظ اسامہ حسن ہے۔ انھوں نے قرآن وحدیث کے سلسلے میں بزبانِ انگریزی جو خدمات سرانجام دیں۔ وہ مختصر الفاظ میں مندرجہ ذیل ہیں:

① ...... شیخ الالبانی کی کتاب ''صفۃ صلوٰۃ النبی'' کا ترجمہ جو ملائیشیا میں چھپا اور برطانیہ میں زیادہ تر تقسیم ہوا۔

② ...... اصول حدیث سے متعلق اپنے والد محترم ڈاکٹر صہیب حسن کی کتاب کا مبسوطہ مقدمہ اور ملحق لکھا جس میں مصطلح سے متعلق تمام احادیث کی تخریج پیش کی گئی ہے۔

③ ...... امام الآجری کی کتاب ''فضل حملة القرآن واهله'' کا ترجمہ۔

④ ...... امام ابن القیم کی حج سے متعلق نظم کا ترجمہ۔

مؤخر الذکر تینوں کتابیں القرآن سوسائٹی لندن نے شائع کیں۔

⑤ ...... اپنے مرحوم دادا مولانا عبدالغفار حسن کی کتاب ''انتخاب حدیث'' کا مکمل ترجمہ تخریج احادیث کے ساتھ کیا۔ یہ کتاب زیر طبع ہے۔

ڈاکٹر صہیب حسن کی صاحب زادی خولہ کی مساعی قرآن وحدیث یہ ہیں:

① ...... فضل الرحمٰن کاشمیری کے رسالہ ''اسبابِ شرک'' کا ترجمہ۔

② ...... مطالعہ قرآن کے عنوان سے اُن بیس اسباق کو از سر نو تحریر کیا جو پچیس چھبیس سال قبل ڈاکٹر صہیب حسن نے کورس برائے مراسلت کے سلسلے میں تالیف کیے تھے۔ ان اسباق میں ان تمام

انبیا کی تعلیمات کو پیش کیا گیا ہے جن کا تذکرہ قرآنِ مجید میں فرمایا گیا ہے۔

④...... اپنے مرحوم جد امجد حضرت مولانا عبدالغفار حسن کے کتابچہ ''اسلام میں عورت کا مقام'' کا انگریزی ترجمہ۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صہیب حسن اور ان کے بچوں کی عمر دراز فرمائے اور ایہ اپنے اسلاف کی طرح ہمیشہ اسلام کی خدمت میں مصروف رہیں۔

یہ سطور ۱۱۔ ستمبر ۲۰۰۷ء کو لکھی گئی ہیں۔



ڈاکٹر سہیل حسن

اب مولانا عبدالغفار حسن کے صاحب زادۂ گرامی ڈاکٹر سہیل حسن کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

سہیل حسن ۱۹۵۱ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالا تو جماعت اسلامی کے ایک تعلیمی ادارے "نیا مدرسہ" میں حصولِ علم کا آغاز کیا۔ ۱۹۵۷ء میں مولانا عبدالغفار حسن نے اپنے چند رفقا کے ساتھ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے نقطۂ نظر سے اختلاف کی بنا پر جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کی تو حکیم عبدالرحیم اشرف مرحوم کی تجویز کے مطابق لائل پور (حال فیصل آباد) منتقل ہوگئے اور وہاں جامعہ تعلیماتِ اسلامیہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ سہیل حسن کو فیصل آباد میں بھی جماعت اسلامی کے ایک تعلیمی ادارے میں داخل کرا دیا گیا۔ وہاں انھوں نے پرائمری تعلیم مکمل کی تھی کہ جامعہ تعلیمات اسلامیہ کی مالی حالت دگرگوں ہونے کی وجہ سے مولانا عبدالغفار حسن نے ساہیوال کا قصد کیا۔ مولانا ایک سال ساہیوال رہے۔ سہیل حسن صاحب نے وہاں بھی کچھ نہ کچھ پڑھا ہوگا۔

اس کے بعد یہ گھرانا کراچی چلا گیا۔ وہاں کے دارالحدیث رحمانیہ میں مولانا عبدالغفار حسن صاحب کا تقرر شیخ الحدیث کے طور پر ہوا اور ان کی تدریسی سرگرمیاں شروع ہوگئیں۔ سہیل حسن صاحب کی چلتی پھرتی سکول کی تعلیم اب اگرچہ کراچی تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن اس کی رفتار بہت کم تھی۔

اکتوبر ۱۹۶۴ء میں مولانا ممدوح کو تدریس کے لیے مدینہ یونیورسٹی سے دعوت نامہ آیا اور وہ وہاں تشریف لے گئے۔ اس وقت سہیل صاحب سکول میں آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ اس سے قبل مولانا کے فرزند گرامی صہیب حسن مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

نومبر ۱۹۶۵ء میں سہیل حسن صاحب اپنی والدہ اور چھوٹے بھائیوں کے ساتھ عازمِ مدینہ منورہ ہوئے۔ وہاں پرائیوٹ طور پر پاکستانی سفارت خانے کے ذریعے میٹرک پاس کرنے کی کوشش کی، لیکن کوئی معلم نہ ملا اور میٹرک تک تعلیم حاصل نہ کرسکے۔ اب والد مکرم کے حکم کے مطابق دارالحدیث میں مرحلہ تمہیدی میں داخلہ لیا اور ابتدائی عربی اور دینی تعلیم کا آغاز ہوا۔ اس سے ایک سال بعد جامعہ اسلامیہ کے مرحلہ متوسط میں داخلہ ملا اور اس طرح جامعہ اسلامیہ ہی سے متوسط، ثانویہ، کلیۃ الدعوۃ اور اصول الدین سے بی۔ اے اور ایم۔ اے کیا۔

اثنائے تعلیم میں ۱۹۷۵ء میں شادی ہوگئی اور اس سے چھ سال بعد ۱۹۸۱ء میں ایم اے مکمل ہوا۔ تکمیل تعلیم کے بعد والدہ محترمہ کی خواہش کے مطابق سہیل حسن صاحب پاکستان آگئے اور

جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) کی طرف سے جامعہ تعلیماتِ اسلامیہ فیصل آباد میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ انھی ایام میں مولانا عبدالغفار حسن صاحب بھی مدینہ منور سے پاکستان تشریف لے آئے اور ان کی نگرانی میں سہیل حسن صاحب تین سال جامعہ تعلیماتِ اسلامیہ (فیصل آباد) میں تدریسی اور انتظامی ذمہ داریاں انجام دیتے رہے۔

تین سال بعد ۱۹۸۴ء میں جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) کی طرف سے یہ سلسلہ ختم ہوگیا تو وزارتِ شئونِ اسلامیہ سعودی عرب کی طرف سے ان کی تقرری جامعہ اسلامیہ عالمیہ اسلام آباد میں کر دی گئی، چناں چہ وہ اسلام آباد میں منتقل ہوگئے۔ شروع میں کلیۃ الشریعہ، القانون میں پڑھاتے بھی رہے اور انتظامی ذمہ داریاں بھی ان کے سپرد رہیں۔ اس اثنا میں ایک زیرِ تربیت گروپ کے ساتھ مصر اور سعودی عرب کا دورہ کیا۔

۱۹۹۰ء میں ادارہ تحقیقاتِ اسلامی (اسلام آباد) میں بہ طور اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ قرآن وحدیث میں تقرری ہوئی اور تدریس کے ساتھ تحقیق کا کام بھی کرنے لگے۔

۱۹۹۳ء میں جامعہ امام محمد بن سعود (ریاض) میں جامعہ اسلامیہ کے اساتذہ کے لیے پی ایچ ڈی سکالر شپ پیش کیے گئے اور اس میں سہیل حسن صاحب کا نام بھی آیا اور اس طرح تعلیمی مدارج کی تکمیل کے لیے وہ ریاض گئے۔ ریاض میں چار سال کی تعلیم کے بعد انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی اور وہ ڈاکٹر سہیل حسن ہوگئے۔ پاکستان واپس آ کر حسب سابق ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی میں کام شروع کیا اور اس دوران وہ ایسوسی ایٹ پروفیسر کے منصب پر پہنچے۔

چند سال پہلے کلیۂ اصول الدین میں تدریسی ذمہ داریاں بھی ان پر ڈال دی گئیں۔ اب وہ تحقیقی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ شعبہ حدیث میں ڈاکٹر فضل الٰہی کے زیرِ صدارت تدریس کا فریضہ بھی انجام دے رہے ہیں۔

ان مختصر مگر ضروری حالات کے بعد ملاحظہ ہوں ڈاکٹر سہیل حسن کے اساتذہ کرام کے اسمائے گرامی:

① ...... ان کے اوّلیں استاذ تو ان کے والد مکرم مولانا عبدالغفار حسن صاحب ہیں۔ اگرچہ انھیں اپنے والد سے باقاعدہ تلمذ کا شرف حاصل نہیں ہوسکا، تاہم عمومی دروس اور وعظ ونصیحت کے ذریعے ان سے مستفید ہونے کے بے شمار مواقع میسر آئے۔ وہ اپنے والد کے بے حد دینی شغف اور معتدل مزاجی سے بے حد متاثر ہیں۔ نیز ان میں تعلیم وتعلم کا جو جذبہ پایا جاتا ہے، وہ ان کے لیے ہر موقعے پر مشعل راہ ثابت ہوا۔

ڈاکٹر سہیل حسن صاحب کی تعلیم کا تمام عرصہ سعودی عرب میں گزرا ہے، اس لیے ان کے اساتذہ سعودی عرب، مصر، شام، عراق، فلسطین اور یمن سے تعلق رکھتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

①...... شیخ حماد بن محمد الانصاری مرحوم

②...... شیخ عبداللہ الغنیمان

③...... شیخ ربیع بن صادی المدخلی

④...... ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری

⑤...... ڈاکٹر اسید الحکیم مرحوم

⑥...... ڈاکٹر محمود الطحان

⑦...... ڈاکٹر محمود

⑧...... ڈاکٹر ابراہیم الصبیحی

⑨...... ڈاکٹر احمد حسن فرحات

⑩...... ڈاکٹر محمد المجذوب مرحوم

ریاض کی جامعہ امام محمد بن سعود میں ڈاکٹر سہیل حسن نے ڈاکٹر ابراہیم الصبیحی کی نگرانی میں سنن ابوداؤد کی اس شرح پر کام کیا جو ابن رسلان الرملی کی تحریر کردہ ہے۔

ڈاکٹر سہیل حسن کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں اور سب حدیث سے متعلق ہیں۔

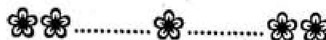
①...... السنن والآثار فی النھی عن التشبہ بالکفار جمع ودراستہ وتحقیق: یہ عربی زبان میں ڈاکٹر صاحب کا ایم اے کا مقالہ ہے اور چھپ چکا ہے۔

②...... معجم اصطلاحاتِ حدیث: حدیث کی اصطلاحات سے متعلق یہ ان کی اردو کتاب ہے جو اس موضوع کی نہایت جامع تصنیف ہے۔ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ علما وطلبا کے لیے بے حد مفید کتاب ہے۔

③...... موسوعۃ احادیث المعاملات: یہ عربی میں ہے اور زیر طبع ہے۔

ڈاکٹر صاحب ممدوح مختلف اوقات میں سعودی عرب، شام، مصر، برطانیہ، اردن اور شارجہ کے علمی اور دعوتی سفر کر چکے ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کی زندگی دراز فرمائے اور انھیں خدمت دین کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرے، آمین۔



ڈاکٹر عبدالعلیم بستوی

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے مختلف بلاد وقصبات اور دیہات میں بے شمار علمائے دین پیدا ہوئے، جنھوں نے تدریسی میدان میں بھی بے پناہ خدمات انجام دیں، تصنیفی اعتبار سے بھی بہت آگے بڑھے اور تبلیغ وتقریر کے ذریعے بھی انھوں نے بے حد کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ ان لائق احترام حضرات میں ایک بزرگ مولانا عبدالعظیم بستوی تھے جو ضلع بستی کے ایک گاؤں ''اکرہرا'' کے رہنے والے تھے، اور اپنے ضلعے کی بنا پر ''بستوی'' کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ انھوں نے دہلی میں حضرت مولانا عبدالوہاب دہلوی سے تعلیم حاصل کی اور اپنے علاقے کے ممتاز علما میں گردانے گئے۔ دہلی میں طالب علمی کے دور میں ان کی ملاقات مولانا محمد جوناگڑھی سے ہوئی۔ یہ بھی مولانا عبدالوہاب صاحب کے شاگرد تھے اور تحریر وتقریر میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ مولانا عبدالعظیم بستوی فارغ التحصیل ہوئے تو مولانا محمد جوناگڑھی نے خواہش ظاہر کی کہ وہ مستقل طور پر دہلی میں سکونت اختیار کرلیں اور توحید وسنت کی دعوت کا کام ان کے ساتھ مل کر کریں۔ لیکن مولانا عبدالعظیم بستوی نے اپنے علاقے کے لوگوں کی اصلاح کو اصل اہمیت دی اور اپنے گاؤں چلے گئے۔ گاؤں میں امامت وخطابت کا فریضہ انجام دینے لگے اور علاقے میں وعظ وتبلیغ کے دوروں کا سلسلہ شروع کیا۔ اس طرح ان کے گاؤں کے لوگ بھی ان کے مواعظ سے مستفید ہوئے اور اردگرد کے لوگوں کو بھی ان کی تبلیغی مساعی سے بہت فائدہ پہنچا۔ ان کے دلوں میں جذبہ توحید راسخ ہوا اور وہ کتاب وسنت کی ہم وار اور صاف ستھری راہوں پر قدم فرسا ہوئے۔ مولانا عبدالعظیم بستوی نے ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو اپنے گاؤں میں وفات پائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

مولانا عبدالعظیم بستوی کی نرینہ اولاد چار بیٹے تھے اور چاروں علم کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ ان کے نام علی الترتیب یہ ہیں: عبدالودود، عبدالصبور، عبدالنور اور عبدالعلیم......!

مولانا عبدالودود اور مولانا عبدالصبور نے دارالحدیث رحمانیہ (دہلی) سے تعلیم حاصل کی اور اپنے اپنے انداز میں خدمت دین کو اپنا مشغلہ بنایا۔

مولانا عبدالنور نے دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں داخلہ لیا اور وہیں سے سند فراغ حاصل کی۔ پھر مصر جا کر جامعہ ازہر سے عربی ادب میں ایم اے کیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلما اور جامعہ ازہر کے تعلیم یافتہ ہونے کی بنا پر انھیں ندوی اور ازہری کہا جانے لگا۔ اپنی قابلیت کی بنا پر وہ دارالعلوم ندوۃ

العلما میں عربی ادب کے استاد مقرر کیے گئے۔ عربی اور اردو ادب وتنقید اور ان زبانوں میں تقریر وتحریر میں انھیں مہارت حاصل تھی۔ اردو صحافت میں بھی ان کا ایک مقام تھا۔ آخر دم تک ندوۃ العلما میں عربی ادب کے استاد رہے۔ اس دوران میں لا تعداد علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ وہ اپنے عہد کے قابل استاد اور عربی کے معروف ادیب تھے۔ رحمۃ اللہ علیہ

ان سب بھائیوں سے چھوٹے صاحبِ ترجمہ ڈاکٹر عبدالعلیم بستوی ہیں۔ یہاں یہ یاد رہے کہ ضلع بستی اب تین ضلعوں میں تقسیم ہوگیا ہے۔ مولانا عبدالعلیم کا گاؤں ضلع سدھارتھ نگر میں آ گیا ہے، لیکن ان کی نسبت وہ قدیم دور کی ''بستوی'' رہی۔

عبدالعلیم یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد مولانا عبدالعظیم سے حاصل کی۔ پھر گاؤں میں ایک مدرسہ قائم ہوا تو اس میں داخل ہوگئے۔ یہ مدرسہ پچاس سال سے زیادہ عرصے سے قائم ہے اور اب یہ مدرسہ ''المعہد الاسلامی'' کے نام سے مشہور ہے۔ مدرسہ سراج العلوم (جھنڈا نگر) سے تقریباً آٹھ کلومیٹر جنوب میں واقع ہے اور اس علاقے کے مشہور مدارس میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

گاؤں کے مدرسے سے فارغ ہو کر ۱۹۶۱ء میں عبدالعلیم اپنے بڑے بھائی مولانا عبدالنور ندوی ازہری کے پاس لکھنؤ چلے گئے اور دارالعلوم ندوۃ العلما میں داخل ہوگئے۔ ۱۹۶۶ء میں وہاں عالمیت کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال بنارس میں جامعہ سلفیہ میں تعلیم کا آغاز ہوا تو انھوں نے بنارس آ کر جامعہ سلفیہ میں داخلہ لے لیا اور ۱۹۶۷ء میں وہاں سے فضیلت (تخصص فی الشریعۃ الاسلامیہ) کی سند حاصل کی۔

۱۹۶۹ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔ ۱۹۷۳ء میں وہاں پر کلیۃ الدعوۃ واصول الدین سے لسانس (بی۔ اے) کی ڈگری لی۔ پھر اسی سال کلیۃ الشریعۃ والدراسات الاسلامیہ مکہ مکرمہ (موجودہ جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ) میں داخلہ لیا اور وہاں سے ۱۹۷۸ء میں ''شعبہ قرآن وسنۃ'' سے ماجستر (ایم۔ اے) کی سند حاصل کی۔ اسی سال رابطہ عالم اسلامی میں ملازمت مل گئی۔ رابطہ عالم اسلامی کے مختلف شعبوں میں (ستمبر ۲۰۰۶ء تک جب کہ یہ سطور لکھی جارہی ہیں) قمری کیلنڈر کے حساب سے ملازمت کا یہ تیسواں سال ہے۔ رابطہ عالم اسلامی میں ملازمت کے ساتھ ساتھ ۱۹۸۹ء میں جامعہ ازہر (مصر) سے علم حدیث میں ڈاکٹریٹ (پی ایچ ڈی) کی ڈگری لی۔

یہاں مناسب ہوگا کہ ہم ڈاکٹر عبدالعلیم بستوی کے اساتذہ کرام کے اسمائے گرامی سے بھی مطلع ہوجائیں۔ ابتدائی تعلیم کے استاذ تو ان کے والد مکرم مولانا عبدالعظیم بستوی تھے۔ اس کے بعد جن اساتذہ کے حضور زانوے شاگردی تہ کیے، ان میں مندرجہ ذیل حضرات شامل ہیں۔ پہلے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی تعلیم کے دور کے چند حضرات۔

ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی، شیخ عبدالمحسن، مشہور شامی ادیب شیخ محمد المجذوب، علامہ محمد امین

شنقیطی۔ ان کے علاوہ شیخ عبدالعزیز بن باز اور علامہ ناصر الدین البانی کے دروس وتقاریر سے بھی استفادہ کیا۔ شیخ حماد بن محمد انصاری کی مجالس اور دروس سے بھی مستفید ہوئے۔ ان سے روایت حدیث کی سند واجازہ کا حصول بھی ہوا۔

مکہ مکرمہ میں وہاں کے مشہور اساتذہ میں ڈاکٹر محمد امین مصری کا نام سرفہرست ہے۔

مصر کے ممتاز ومعروف اصحابِ علم میں سے ڈاکٹر محمد ابوشہبہ شامل ہیں۔

ہندوستان کے جلیل القدر اصحابِ تحقیق میں حضرت مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری کا نام نامی خاص طور سے قابل ذکر ہے، جن سے روایت کی سند اور اجازہ سے متفخر ہوئے۔

ان حضراتِ ذی شان کے علاوہ ہندوستان، مصر، شام اور سعودی عرب کے درجنوں اساتذۂ فن سے فیض یابی کا شرف حاصل ہوا۔

ان سطور کے بعد ڈاکٹر عبدالعلیم بستوی کی تحریری اور تصنیفی کاوشوں پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ہندوستان میں صرف ڈیڑھ برس کے قریب تدریسی کام کیا تھا، پھر مدینہ منورہ چلے گئے اور سلسلۂ تدریس ختم ہوگیا۔ پھر مزید تعلیم کے حصول کے بعد رابطہ عالم اسلامی کی ملازمت اور تصنیف وتالیف میں وقت صرف ہونے لگا اور مندرجہ ذیل تصنیفی اور تحقیقی خدمات سرانجام دیں:

① ...... شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کی دعوت: یہ شیخ عبدالعزیز بن باز کے ایک عربی رسالے کا اردو ترجمہ ہے جو مدینہ یونیورسٹی کے زمانہ طالب علمی میں کیا تھا۔ یہ ترجمہ پہلے پاکستان وہندوستان کے بعض جرائد میں قسط وار چھپا۔ پھر کتابی صورت میں کئی بار شائع ہوا۔

② ...... محمد بن عبدالوہاب ...... مصلح مظلوم ومفتریٰ علیہ: مولانا مسعود عالم ندوی کی مشہور کتاب "محمد بن عبدالوہاب۔ ایک مظلوم اور بدنام مصلح" کا عربی ترجمہ ہے۔ اس ترجمے میں بہت سی معلومات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ سعودی عرب میں متعدد مرتبہ چھپ چکا ہے اور اہل علم میں بہت مقبول ہے۔

③ ...... معرفۃ الثقات للامام العجلی (متوفی ۲۶۱ھ) یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ مدینہ منورہ میں ۱۹۸۵ء میں چھپی۔

④ ...... الشجرۃ فی احوال الرجال وامارات النبوۃ: الامام جوزجانی (متوفی ۲۵۹ھ) ۱۹۹۰ء میں ریاض میں چھپی۔

⑤ ...... سوالات ابی عبید الآجری ابو داؤد سلیمان بن الاشعث السجستانی (متوفی ۲۷۵ھ) دو جلدوں میں۔ طبع مکہ مکرمہ۔ ۱۹۹۷ء۔

⑥ ...... المھدی المنتظر فی ضوء الاحادیث والآثار الصحیحۃ: طبع مکہ مکرمہ ۱۹۹۹ء۔

⑦...... الموسعة فی احادیث المهدی الضعیفة و الموضوعة: طبع مکہ مکرمہ ۱۹۹۹ء۔
یہ کتاب اور اس سے پہلی (نمبر ۶) دونوں کتابیں مولانا عبدالعلیم کے ایم۔ اے کے مقالات ہیں جسے "الاحادیث الواردة فی المهدی فی میزان الجرح والتعدیل" کے عنوان سے پیش کیا گیا تھا، بعد میں اسے دو مستقل کتابوں کی شکل دے دی گئی۔

⑧...... الجزء الحادی عشر من کتاب "اتحاف المهرة" الحافظ ابن حجر العسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ) طبع مدینہ منورہ ۱۹۹۷ء۔

⑨...... سیرۃ الامام البخاری: یہ حضرت مولانا عبدالسلام مبارک پوری (متوفی ۱۹۲۴) کی مایہ ناز تصنیف "سیرۃ البخاری" کا عربی ترجمہ ہے جو بہت سے مزید حواشی اور فوائد کے اضافے کے ساتھ دو جلدوں میں شائع کیا گیا۔ طبع مکہ مکرمہ ۱۴۲۳ھ

⑩...... فوائد فی علوم الحدیث وکتبه واهله۔ للعلامۃ محمد عبدالرحمٰن المبارک فوری (متوفی ۱۳۵۳ھ) تحقیق وتعلیق۔ دو جلدوں میں زیر طبع۔

⑪...... الارحام المستاجرة و الانجاز النبوی: حدیث "ان تلد الامة ربتها" کی سنداً ومتناً وفقہاً تحقیق۔ یہ مفصل علمی مقالہ "صوت الامۃ" بنارس میں ۱۴۱۴ھ میں شائع ہوا۔ نیز مجلّہ "رابطۃ العالم الاسلامی" کے شوال ۱۴۱۴ھ اور شعبان ۱۴۱۵ھ کے شماروں میں چھپا۔

⑫...... محدث المدینۃ المنورۃ الشیخ العلامۃ حماد بن محمد الانصاری رحمہ اللہ: مفصل علمی مقالہ شائع شدہ مجلّہ صوت الامۃ بنارس۔ ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ اور محرم ۱۴۱۹ھ۔

⑬...... "الجزء السادس من لسان المیزان" للحافظ ابن حجر العسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ) تحقیق حسب طلب مرکز خدمۃ السیرۃ والسنۃ النبویۃ۔ مدینہ منورہ۔ غیر مطبوع۔

⑭...... القسم الرابع من سنن ابی داؤد (از اوّل کتاب الصید تا آخر کتاب الاطعمۃ) تخریج، تحقیق، تعلیق۔ ڈاکٹریٹ کا مقالہ چار جلدوں میں۔ غیر مطبوع۔

⑮...... مرویات عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده، بین القبول والرد: (زیر ترتیب)

⑯...... الجواهر المفقودة فی المانیا: جنگ عظیم سے قبل جرمنی میں موجود حدیث کی نادر کتابوں کی فہرست اور ان کا سیر حاصل تجزیہ۔ (زیر ترتیب)

ان کے علاوہ ڈاکٹر عبدالعلیم بستوی کے اردو اور عربی رسائل ومجلّات میں بہت سے علمی مقالات شائع ہوئے۔ اللہ انھیں خوش رکھے، وہ جماعت اہل حدیث کی بہت بڑی علمی اور تحقیقی متاع ہیں۔



مولانا صلاح الدین مقبول احمد

ہندوستان کے صوبہ یو پی میں ایک ضلع گونڈہ تھا۔ اب اسے ضلع بلرام پور کہا جاتا ہے۔ اس ضلع میں ایک گاؤں کا نام ''اونر ہوا'' ہے جو اِس وقت اس علاقے میں اہل حدیث کا مشہور گاؤں ہے۔ آج سے اسی پچاسی سال پہلے اس علاقے میں کوئی اہل حدیث نہ تھا۔ ہر طرف بدعات کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نواح میں حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری، مولانا عبدالسلام مبارک پوری اور بعض دیگر علمائے اہل حدیث کی کوششوں سے لوگ اہل حدیثیت سے آشنا ہوئے اور ان کے عقائد و افکار کتاب و سنت کے سانچے میں ڈھلنے لگے۔

مولانا صلاح الدین اپنے دادا کے بھائی عبدالرزاق خاں کی روایت سے بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ ایک پیر کے مرید تھے۔ پیر صاحب کا انتقال ہوگیا تو ان کی بیوی نے یہ معمول بنا لیا کہ وہ سال میں ایک یا دو مرتبہ ان کے گھر آیا کرتی تھیں اور ہم لوگ ان کی خدمت کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ آئیں اور گھر میں مصلے پر بیٹھی تھیں کہ مغرب کی اذان ہوئی، لیکن انھوں نے نماز نہیں پڑھی۔ نماز نہ پڑھنے کی وجہ پوچھی گئی تو کہا کہ مغرب کے وقت ان کا ایک بچہ فوت ہوگیا تھا، اس لیے ان کے نزدیک یہ منحوس وقت ہے اور اس منحوس وقت کی نماز پڑھنا انھوں نے چھوڑ دی ہے۔

مولانا صلاح الدین کی دادی نے یہ بات اپنے شوہر کو بتائی تو انھوں نے کہا کہ جب یہ گھر سے رخصت ہونے لگیں تو انھیں کہہ دینا کہ آئندہ وہ ہمارے ہاں نہ آیا کریں۔ یہ تقریباً ۸۰ سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت ان لوگوں میں کتاب و سنت کی روشنی آ گئی تھی۔

ان میں سے جو بزرگ سب سے پہلے دعوت توحید سے متاثر ہوکر گاؤں میں آئے ان سے لوگوں نے تعلقات منقطع کر لیے تھے۔ لیکن ان کی کوششوں سے اللہ تعالیٰ نے ان سب لوگوں کو ہدایت دی اور پورا گاؤں مسلک اہل حدیث کا پابند ہوگیا۔ اسی گاؤں میں ۱۵۔ جنوری ۱۹۵۶ کو صلاح الدین پیدا ہوئے۔ والد کا نام مقبول احمد ہے۔

صلاح الدین کی تعلیم کا آغاز گاؤں کے مدرسہ نور الہدیٰ سے ہوا۔ دینیات کے علاوہ اردو، عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی پڑھنے کی ابتدا یہیں سے ہوئی۔ ان کے اس دور کے مشہور اساتذہ میں میاں ضیاء اللہ، میاحسن، مولانا محمد حسن رحمانی، مولانا سیف الاسلام صدیقی، مولانا محمد احمد اثری بسکوہری اور ماسٹر محمد اقبال وغیرہ حضرات شامل ہیں۔

اسی ابتدائی دور میں انھیں پتا چلا کہ جامعہ سلفیہ بنارس کے طلبا کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے مدینہ یونیورسٹی بھیجا جاتا ہے۔ انھوں نے ہر نماز کے بعد مدینہ یونیورسٹی میں داخلے کے لیے اللہ سے دعا مانگنا شروع کر دی۔ اللہ نے دعا قبول فرمائی اور ۱۹۷۸ میں انھیں مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ اس کی ضروری تفصیل آگے آئے گی۔

صلاح الدین کی ابتدائی تعلیم ۱۹۶۶ تک چلتی ہے۔ متوسط تعلیم کے لیے مدرسہ شمس الہدیٰ سمرا ضلع بستی کا رخ کیا۔ (اب ضلع بستی کو سدھالت نگر کہا جاتا ہے) یہ مدرسہ ہندوستان کی جماعت اہل حدیث کے ایک مشہور عالم و مناظر مولانا عبدالمبین منظر نے جاری کیا تھا۔ اُس وقت مدرسہ شمس الہدیٰ کے اساتذہ کی جماعت میں خود مولانا عبدالمبین منظر، مولانا عبدالعلیم ماہر بستوی اور مولانا محمد عثمان شامل تھے۔ داخلے کے خواہش مند طلبا کا امتحان ضلع بستی کے اہل حدیث مدارس کا ایک بورڈ لیتا تھا۔ صلاح الدین نے بورڈ کے امتحان میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔ متوسط تعلیم کے آخری سال کی تکمیل انھوں نے جامعہ رحمانیہ بنارس میں کی۔ وہاں کے اساتذہ میں مولانا عبدالسلام رحمانی، مولانا عزیز احمد ندوی اور مولانا عبدالسلام طیبی کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ تعلیم کا یہ مرحلہ ۱۹۷۰ میں ختم ہوا، اور امتحان میں یہ پہلی پوزیشن کے حق دار قرار پائے۔

حصول تعلیم کے ابتدائی دور میں مولانا صلاح الدین شعر و شاعری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ مدرسہ شمس الہدیٰ میں پہنچے تو دلچسپی مزید بڑھ گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس بستی (سمرا) میں یہ مدرسہ جاری تھا، اسے شاعروں کی بستی کہا جاتا تھا۔ اس مدرسے کے اساتذہ میں سے مولانا عبدالمبین منظر اور مولانا عبدالعلیم ماہر بستوی کا شمار اس علاقے کے معروف شعرا میں ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ مدرسہ شمس الہدیٰ کے سالانہ جلسے میں صلاح الدین نے استقبالیہ نظم پیش کی۔ سٹیج سیکرٹری مولانا انجم جمال اثری تھے جو شاعر تھے۔ انھوں نے صلاح الدین کی نظم سن کر کہا کہ "یہ بچہ شاعری کرتا رہا تو اپنے دور کا اقبال ہوگا"۔ لیکن بعد میں انھوں نے شاعری میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ کبھی کبھار طبیعت آمادہ ہوئی تو چند شعر کہہ دیے ورنہ اس شغل سے اپنے آپ کو دور ہی رکھا۔

صلاح الدین صاحب فرماتے ہیں کہ مدینہ یونیورسٹی جانے سے پہلے انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یہ عادت چھوٹ جائے۔ چنانچہ اللہ نے دعا قبول فرمائی اور شوقِ شعر گوئی کا خاتمہ ہوگیا۔ اگر کبھی تھوڑی بہت آمادگی ہوئی بھی تو چند ابیات سے بات آگے نہ بڑھی اور کوئی نظم مکمل نہ ہوسکی۔

میرے خیال میں یہ محض تکلف ہے۔ نہ شعر کہنا یا اس سے نفرت کرنا دین داری ہے اور نہ ترکِ شعر گوئی کی دعا کرنا مدینہ یونیورسٹی میں داخلے کی شرائط میں شامل ہے۔ بلکہ شعر گوئی ذوق کی بلندی کی علامت ہے اور کسی عالم دین کا شاعر ہونا اس کی قابلیت کا ایک اضافی اعزاز ہے جس پر اسے

خوش ہونا چاہیے۔ بسا اوقات شاعری، نثر سے زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے۔ لیکن شاعری ہو، تک بندی نہ ہو۔

مدینہ یونیورسٹی کے اساتذہ وطلبا میں بھی بعض حضرات عربی، اردو یا کسی اور زبان کے شاعر ہوں گے۔ پھر خود مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ میں اب تک ہزاروں لاکھوں شعرا پیدا ہو چکے ہیں۔ بے شمار محدثین بہت بڑے شاعر بھی تھے اور ان کے اشعار کتابوں میں منقول ہیں۔ ان میں سے کبھی کسی نے ترکِ شعر گوئی کی دعا نہیں کی۔

شعر گوئی سے نہ طلب علم کی سرگرمیاں ماند پڑتی ہیں اور نہ اس سے نیکی کا جذبہ مجروح ہوتا ہے۔

بہرحال ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ ہمارے ممدوح صلاح الدین مدینہ یونیورسٹی میں داخلے کے لیے بہت بے تاب تھے اور اس کے لیے ان کے نزدیک جامعہ سلفیہ (بنارس) میں داخل ہونا اور وہاں تعلیم حاصل کرنا ضروری تھا اس لیے کہ اس وقت ہندوستانی طلبا کے لیے مدینہ یونیورسٹی میں داخلے کا راستہ یہیں سے نکلتا تھا۔ چنانچہ انھیں جامعہ سلفیہ میں آسانی سے داخلہ مل گیا اور یہاں انھوں نے چار سال میں عالمیت کا اور دو سال میں فضیلت کا کورس مکمل کیا۔ یہ کل مدت چھ سال ہوئی جو بنارس کی جامعہ سلفیہ میں بے حد محنت کرتے ہوئے گزری۔

اب ان کی مراد برآئی اور انھیں جامعہ سلفیہ بنارس کی طرف سے مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ انھیں ”کلیۃ الحدیث الشریف والدراسات الاسلامیہ“ میں داخل کیا گیا۔ یہ چار سال کا کورس تھا جس کی انھوں نے تکمیل کی اور ہمیشہ کلاس میں پہلی یا دوسری پوزیشن حاصل ہوتی رہی۔ آخری سال میں انھیں میرٹ کی بنا پر ایم اے میں داخلہ مل جانا چاہیے تھا لیکن نہیں مل سکا۔ اس کے بعد مکہ مکرمہ گئے اور جامعہ ام القریٰ میں ایم اے میں داخلے کی کوشش کی۔ لیکن وہاں بھی داخلے کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔

مدینہ یونیورسٹی میں مولانا صلاح الدین مقبول احمد نے جن اساتذہ سے استفادہ کیا، ان میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

① ...... مولانا عبدالغفار حسن (پاکستان)

② ...... شیخ ربیع بن ہادی المدخلی (سعودی عرب)

③ ...... ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن الاعظمی (سعودی عرب)

④ ...... ڈاکٹر محمد علی طٰہٰ ریان (مصر)

⑤ ...... ڈاکٹر البشیر البشیر (سوڈان)

⑥ ...... ڈاکٹر عبدالفتاح سلامہ (مصر)

⑦...... ڈاکٹر عبدالفتاح عاشور (مصر)
⑧...... ڈاکٹر سید عبدالمنعم نجم (مصر)
⑨...... شیخ محمد علی الجامی (عمید الکلیہ)
⑩...... ڈاکٹر السید الوکیل (سعودی عرب)
⑪...... شیخ حبیب اللہ عبدالقادر سندھی

میرٹ پر پورا آنے کے باوجود جب مولانا صلاح الدین کو کسی وجہ سے مدینہ یونیورسٹی میں ایم اے میں داخلہ نہ ملا اور پھر جامعہ ام القریٰ میں بھی یہی صورت حال پیش آئی تو شیخ عبدالعزیز بن باز نے دارالافتاء کی طرف سے پیرس میں ان کی تقرری کردی۔ لیکن مولانا مختار احمد ندوی نے ان کو بتائے بغیر اپنے ہاں جامعہ محمدیہ (مالیگاؤں، ہندوستان) میں ان کا تبادلہ کرالیا۔ اسی اثنا میں ان کے کچھ دوست کویت سے مدینہ منورہ گئے اور انھیں معاملے کا علم ہوا تو انھوں نے ان کو ہندوستان جانے کے بجائے کویت جانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ یہ اپنے دوست اور کویت کے مشہور محقق شیخ بدر عبداللہ البدر اور ڈاکٹر فلاح ثانی السعیدی (استاذ کویت یونیورسٹی) کی کوششوں سے ۱۷ فروری ۱۹۸۲ کو کویت پہنچ گئے اور وہاں کا ماحول انھیں بہت پسند آیا۔

کویت میں وزارت اوقاف کے شعبہ مساجد میں ان کا تقرر ہوا۔ اذان، امامت اور خطابت کی ذمہ داری ان کے سپرد ہوئی۔ یہ سلسلہ فروری ۱۹۸۲ سے ۲۔ اگست ۱۹۹۰ (یعنی کویت پر عراقی قبضے) تک آٹھ سال جاری رہا۔

اس اثنا میں چھوٹی بڑی چند کتابوں کی تحقیق کا کام بھی ہوتا رہا۔ دو کتابیں خاص طور سے تصنیف کیں۔ ایک کتاب کا نام ہے ''زوابع فی وجہ السنۃ قدیماً و حدیثاً'' اور دوسری کتاب ہے ''دعوۃ شیخ الاسلام ابن تیمیہ و اثرھا فی الحرکات الاسلامیۃ المعاصرۃ۔''

کویت پر عراقی قبضے کے بعد مولانا صلاح الدین دہلی چلے گئے۔ وہاں ہندوستان کے مشہور عالم مولانا عبدالحمید رحمانی نے ان کی خدمات اپنے ادارے ''ابوالکلام آزاد اسلامک اویکننگ سنٹر'' کے لیے حاصل کرلیں۔ وہاں انھیں سنٹر کی ''اسلامک ریسرچ اکیڈمی'' کے نگران مقرر کیا گیا۔ ان کی مذکورہ بالا دونوں کتابیں سب سے پہلے اسی سنٹر کی طرف سے شائع ہوئیں۔ امام ابن تیمیہ کے دفاع کے سلسلے کا شعری مجموعہ ''الحمیۃ الاسلامیہ'' بھی اوّلیں مرتبہ ان کی تحقیق سے یہیں چھپا۔ مولانا عبدالحمید رحمانی کا جاری کردہ ماہنامہ ''التوعیۃ'' (دہلی) مضامین و مندرجات کے لحاظ سے بہت اچھا رسالہ تھا۔ اس میں عورتوں اور بچوں سے متعلق مولانا صلاح الدین کے کالم چھپتے رہے۔

قیامِ دہلی کے زمانے ہی میں انھوں نے سید بدیع الدین شاہ راشدی کی کتاب ''انماء الزکن''

ایڈٹ کی جس میں مولانا ظفر احمد تھانوی کی کتاب ''اعلام السنن'' کے مقدمے پر تنقید کی گئی ہے۔ بعد میں شاہ صاحب ممدوح کی اجازت سے اس کا نام بدل کر اسے ''نقض قواعد فی علوم الحدیث'' کے نام سے کویت سے شائع کیا گیا۔

تقریباً پونے تین سال مولانا صلاح الدین کا دہلی میں قیام رہا۔ پھر کویت چلے گئے۔ وہاں پہلے والی محکمۂ اوقاف کی ملازمت تو نہ ملی البتہ دوستوں کے مشورے سے ''جمعیت احیاء التراث الاسلامی'' (فرع الجہراء) سے منسلک ہوگئے اور بحث و تحقیق، درس و تدریس اور دعوت و تبلیغ کا اہم کام ان کے سپرد ہوا۔

جب مولانا صلاح الدین ۱۹۸۲ میں پہلی مرتبہ کویت گئے تھے تو ان کے وہ عرب دوست جو اس وقت تعلیم حاصل کر رہے تھے یا عملی میدان میں ان کی طرح نئے نئے آئے تھے، اب انھیں جہرا میں دعوت و تبلیغ کے اکابر و عمائد کی حیثیت حاصل ہے۔ ماشاء اللہ وہاں ان کے دوستوں کی ایک اچھی خاصی جماعت ہے جو محنت اور مستعدی سے تبلیغی خدمت سرانجام دے رہی ہے۔

شیخ عبدالعزیز الہدہ کی کوششوں اور تعاون سے ''لجنہ علمیہ'' کا قیام عمل میں آیا تھا۔ کئی سال اس میں مولانا صلاح الدین کا درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر آگے چل یہ لجنہ ''المعہد الشرعی'' میں تبدیل ہوگئی۔ اس سے سیکڑوں طلبا نے فائدہ اٹھایا۔ بہت سے طلبا ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کر کے بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز ہوگئے جو اپنی قابلیت کے مطابق دعوت و تبلیغ میں مصروف ہیں۔

مولانا صلاح الدین تالیف و تحقیق کے آدمی ہیں اور اس سلسلے میں ان کی خدمات کا دائرہ بہت پھیلا ہوا ہے۔ تفسیر جامع البیان قرآن مجید کی مشہور تفسیر ہے۔ اب تو معلوم نہیں لیکن پہلے یہ تفسیر ہمارے مدارس میں پڑھائی جاتی تھی اور ان سطور کے راقم نے پڑھی تھی۔ یہ تفسیر کئی دفعہ چھپ چکی ہے۔ حضرت مولانا سید عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کے فرزند گرامی مولانا سید محمد غزنوی نے اس پر حواشی تحریر فرمائے تھے۔ صاحبِ ترجمہ مولانا صلاح الدین نے اس پر مقدمہ لکھا ہے اور احادیث کی تخریج کی ہے۔ اس باب میں انھوں نے تفسیر کے مطبوعہ نسخوں سے بھی استفادہ کیا ہے اور مخطوطہ بھی ان کے پیش نگاہ رہا ہے۔ یہ تفسیر نہایت خوب صورت اور عمدہ انداز میں کویت سے شائع ہو رہی ہے۔ قرآن کے بارے میں بعض لوگ جو اعتراضات کرتے اور شبہات پیدا کرتے ہیں مولانا صلاح الدین نے اپنے سلسلہ ''ارکان الایمان'' کے ''الایمان بالکتب'' میں ان اعتراضات و شبہات کا ازالہ کیا ہے۔

حدیث کے سلسلے میں مولانا صلاح الدین نے ابن المنیر کی المتوازی فی ابواب البخاری پر تحقیقی کام کیا۔ اس کام کی تکمیل میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اور مولانا عارف جاوید محمدی کی

کوششوں کا بڑا دخل ہے۔ یہ بہت بڑی خدمت حدیث ہے جو انھوں نے سرانجام دی اور اس کے لیے استاذ محترم مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی تحریک اور ہمارے دوست مولانا عارف جاوید محمدی کی حوصلہ افزائی لائق تحسین ہے۔

حجیت حدیث اور تائید سنت کے موضوع پر مولانا صلاح الدین نے ''روائع فی وجہ السنۃ'' کے نام سے کتاب تصنیف کی ہے۔ اس کتاب میں منکرین حدیث کے علاوہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی، امام غزالی، سعیدحوی وغیرہ کی حدیث کے بارے میں کم زور تحریروں کا عربی میں جائزہ لیا گیا ہے اور تبلیغی نصاب اور غزالی کی احیاء علوم الدین پر تنقید کی گئی ہے۔ نصوص حدیث کے بارے میں متعصبین کی تحریروں کو ہدف جرح ٹھہرایا گیا ہے۔

مولانا ممدوح کی تصنیف ''دعوۃ شیخ الاسلام ابن تیمیہ واثرھافی الحرکات الاسلامیۃ المعاصرہ'' کا نام پہلے آچکا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے مختلف تحریکوں کا ذکر کیا ہے جن میں جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہ کی اصلاحی تحریک، اخوان المسلمین، جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت، دیوبندیت، بریلویت اور صوفی تحریکوں سے سلفی تحریکات کا موازنہ کیا ہے۔ کوثریت اور اس کے مداح افراد کی ناکام کوششوں کی طرف بھی واضح اشارے کیے ہیں۔

مولانا مودودی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتابوں پر بھی انھوں نے کام کیا ہے۔

مولانا محمد اسماعیل سلفی کی کتاب جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث کا عربی میں ترجمہ کیا ہے اور اس کے بعض مقامات پر وضاحتی نوٹ لکھے ہیں۔ اس کتاب پر مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اور سید بدیع الدین شاہ راشدی کے مقدمات بھی ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۸۶ میں شائع ہوئی تھی۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی پر مولانا صلاح الدین نے عربی میں ایک کتاب تصنیف کی ہے جو ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب کئی سال پہلے چھپی تھی جو بقول ان کے ''علمی نقد و نظر پر مشتمل صوفیانہ رجحانات کی ترویج و اشاعت پر ایک بے لاگ تبصرہ ہے۔''

مولانا ممدوح نے ایک کتاب عورت کے موضوع پر لکھی، جس کا نام ہے ''المرأۃ بین ہدایۃ الاسلام وغوایۃ الاعلام۔''

مسلمانوں کے موجودہ حالات کے پیش نظر'' آلام وآمال'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا، جس میں اسلامی تاریخ کی روشنی میں مسلمانوں سے حالات کا مقابلہ کرنے کی اپیل کی گئی ہے۔ اس رسالے میں دشمنانِ اسلام بالخصوص امریکی حکام اور بش کی مذمت کی گئی ہے۔

ان کی کتابوں پر عالم اسلامی کے بعض معروف علمائے کرام نے مقدمات تحریر کیے ہیں جن میں حسب ذیل حضرات شامل ہیں۔

①...... ڈاکٹر ربیع بن ہادی المدخلی: سابق صدر شعبہ دراسات علیا مدینہ یونیورسٹی۔

②...... ڈاکٹر بکر بن عبداللہ ابو زید: رکن ہیئت کبار العلماء سعودی عرب و مدیر المجمع الفقہی الاسلامی جدہ۔

③......سید بدیع الدین شاہ راشدی۔ (پاکستان)

④......شیخ محمد صفوت نورالدین: صدر انصار السنۃ المحمدیہ۔ مصر

⑤......مولانا عبدالحمید رحمانی: صدر ابوالکلام آزاد اسلامک اویکننگ سنٹر نئی دہلی۔

مولانا صلاح الدین مقبول احمد کی تصانیف کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ان کی بعض کتابیں بعض حلقوں میں درساً درساً پڑھائی جاتی ہیں۔

صوفیت اور کوثریت سے متعلق ان کی تحریروں پر تنقید بھی ہوئی۔ فرماتے ہیں "جسے میں اپنے لیے شرف سمجھ رہا ہوں۔" میرے سامنے افسوس ہے ان کی کوئی تحریر اور کوئی کتاب نہیں ہے۔ اگر ان کا کوئی تحریری مواد میرے پیش نگاہ ہوتا تو ممکن ہے میں بھی اس کے کسی پہلو پر "تنقید" کر کے ان کے لیے "شرف سمجھنے" کا اعزاز حاصل کرتا۔ اگر تنقید "شرف" ہے تو (جیسا کہ ہمیں معلوم ہو چکا) خود انھوں نے بھی متعدد اہل علم کو فراوانی سے یہ شرف بخشا ہے۔

ہر شخص کسی نہ کسی معاملے میں کسی نہ کسی سے متاثر ہوتا ہے۔ میں بھی بعض شخصیات سے متاثر ہوں اور بہت متاثر ہوں۔ صاحب ترجمہ مولانا صلاح الدین بھی متاثر ہیں۔ جن عرب اہل علم سے وہ متاثر ہیں وہ ہیں علامہ محمد احمد شاکر مصری، ان کے چھوٹے بھائی محمود احمد شاکر مصری، محب الدین الخطیب، علامہ عبدالرحمٰن یحییٰ معلمی، علامہ ناصر الدین البانی، شیخ عبدالعزیز بن باز، ڈاکٹر محمد تقی الدین ہلالی، شیخ محمد بن صالح العثیمین، شیخ ربیع بن ہادی المدخلی، شیخ بکر بن عبداللہ ابو زید، شیخ مقبل بن ہادی الوداعی اور بعض دیگر شخصیات۔!

برصغیر کے اکابر محدثین کے علاوہ ماضی قریب کی جن شخصیات سے وہ متاثر ہیں، ان شخصیات میں ان کے نزدیک "مولانا ابو الکلام آزاد، سید محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، سید بدیع الدین راشدی اور مولانا محمد عطا اللہ حنیف بھوجیانی قابل ذکر ہیں۔"

ہندوستان کے موجودہ دور کے جن حضرات کا خاص طور سے ان پر اثر ہے، ان کی فہرست میں مذکور بعض حضرات کو وہ اپنے بزرگ اور بعض کو دوست قرار دیتے ہیں، وہ فہرست مندرجہ ذیل حضرات کی ہے:

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، مولانا عبدالحمید رحمانی، ڈاکٹر عبدالعلی، مولانا عبدالسلام رحمانی، ڈاکٹر وصی اللہ عباس، ڈاکٹر عبدالعلیم، ڈاکٹر صغیر احمد، ڈاکٹر محمد لقمان سلفی، ڈاکٹر اختر جمال، ڈاکٹر فضل

الرحمٰن، ڈاکٹر محمد رمضان، شیخ عبدالقدوس محمد نذیر، ڈاکٹر عبدالباری، مولانا عبدالمتین سلفی، مولانا عبدالواحد مدنی اور مولانا ابو صادق اثری۔

”صحافت کی دنیا میں مولانا عبدالمعید، مولانا شمیم احمد اور جناب عبدالقدوس نقوی قابل ذکر ہیں۔“

ان کے نزدیک ”دوستوں میں شیخ محمد عزیز شمس، ڈاکٹر بدرالزمان، شیخ شہاب اللہ، شیخ عبدالقیوم، شیخ عبدالمجید اور شیخ عبدالباری اپنی علمی، تحقیقی اور تدریسی خدمات کے سبب بلند مقام پر فائز ہیں۔“

اب پاکستان کی طرف آیئے۔ ان کے نزدیک ”حافظ عبدالمنان نور پوری، حافظ ثناء اللہ مدنی، مولانا ارشاد الحق اثری، حافظ صلاح الدین یوسف اور مولانا عبدالعزیز نورستانی پاکستان میں قابل تعریف ہیں۔“

”ان پنج تن پاک“ کے بعد وہ اس فقیر کا یعنی ”چھٹے تن“ کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں: ”اور مولانا محمد اسحاق بھٹی نے علمائے اہل حدیث کے تراجم کی تدوین کرکے جماعت کا جو قرض اتارا ہے اس کے لیے ان کا ممنون و شاکر ہوں۔“

اس پر یہ فقیر ان کا بے حد شکر گزار ہے۔ وہ میرے ”شاکر“ ہیں تو میں ان کا ”شاکر“ ہوں۔ معاملہ برابر کا ہے۔ قرآن کے الفاظ کے عین مطابق۔ اِذَا حُيِّيْتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا۔ (جب تم کو کوئی دعا دے تو (جواب میں) تم اس سے بہتر (لفظوں سے) دعا دو یا انھی لفظوں میں دو)۔

جو شخص تمھیں سلام کرے، اس کا جواب دو، اس سے بہتر الفاظ میں یا انھی الفاظ میں جن سے اس نے تمھیں سلام کیا۔ جو شخص کسی اچھے معاملے میں تمھاری مدد کرے، تم بھی اس کی مدد کرو۔ جو شخص کسی سلسلے میں تمھارا شکریہ ادا کرے، تم بھی خوب صورت الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کرو۔

چوں کہ مولانا صلاح الدین نے ”علمائے اہل حدیث کے تراجم کی تدوین“ کے سلسلے میں اس فقیر کا شکریہ ادا کیا ہے تو یہ فقیر بھی ان کے شکریے کے جواب میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ ان سے بہتر الفاظ میں ان کا شکریہ ادا نہ ہوسکے تو اس پر میں ان سے معذرت خواہ ہوں۔ میرا خیال ہے کسی مسلمان سے معذرت خواہی بھی حصولِ ثواب کا ذریعہ ہے۔

مولانا صلاح الدین باہمت عالم دین ہیں کہ انھوں نے اپنے مفوضہ فرائض کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ تحقیقی اور تالیفی خدمات بھی سرانجام دی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔ ان میں سے بعض کتابوں کا ذکر مختلف مقامات پر پہلے ہو چکا ہے۔ اب ان کے نام یک جا ملاحظہ فرمایئے۔

تحقیقات

☆ مسألة العلو والنزول: لابن طاهره، مكتبة ابن تيمية بالكويت.

☆ مختصر المؤمل في الردّ الى الأمر الأول، لابن شامة، مكتبة الصحوة الأولى: غراس الكويت الطبعة الثانية.

☆ ارشاد النقاد للأمير الصنعاني: الدار السلفية.

☆ تحفة الأنام لمحمد حياة السندي: مكتبة المعلا الطبعة الأولى. غراس الكويت الطبعة الثانية.

☆ المتواري لابن المنير الاسكندراني: مكتبة المعلا.

☆ الامتاع بالأربعين: لابن حجر العسقلاني، الدار السلفية.

☆ الزهر النضر في حال الخضر: له أيضاً. ط. ثانية، مكتبة اهحل الأثر بالكويت.

☆ الحمية الاسلامية للسرمري وقصيدة اليافعي فى الدفاع عن شيخ الاسلام: نيو دلهي الأولى. غراس الكويت الطبعة الثانية.

☆ تحفة المودود بأحكام المولود: لابن القيم. (مع الآخرين) دار ايلاف الدولية. بالكويت.

☆ نقض قواعد في علوم الحديث: للراشدي السندي، دار غراس بالكويت.

☆ الطوام المرعشة في بيان تحريفات أهل الرأي المدهشة: للراشدي السندي، مكتبة أهل الأثر بالكويت.

تعریبات

تعریب صرف ایک ہی کتاب کی ہے۔

☆ موقف الجماعة الاسلامية من الحديث: لمحمد اسماعيل السلفي الدار السلفية

تالیفات

☆ دعوة شيخ الاسلام وأثرها في الحركات المعاصرة: (الطبعة الثانية) دار ابن الأثير بالكويت. (جزءان)

☆ زوابع في وجه السنة قديماً وحديثاً: (الطبعة الثانية) دار ابن الأثير بالكويت.

☆ المرأة بين هداية الاسلام و غواية الاعلام، دار ايلاف الدولية بالكويت.

☆ الأستاذ أبو الحسن الندوي: الوجه الآخر من كتاباته. دار غراس بالكويت.

☆ سلسلة أركان الايمان: دار ايلاف بالكويت. (٦ اجزاء)

☆ آلام و آمال: دار غراس بالكويت.

غیر مطبوعہ

☆ نظرة فى مذهب أهل الحديث: لأبى القاسم البنارسى (تعريب)

☆ تأريخ أهل الحديث فى شبه القارّة الهندية

☆ الدفاع عن الحديث وردّ شبهات المستشرقين:

☆ عوامل وحدة الأمه الاسلامية:

☆ مدارسنا مهدّدة من داخلها:

☆ التسامح الاسلامی بين وقائع التأريخ و دوافع الخصوم:

مولانا صلاح الدین مقبول احمد کی کتابوں کے نام قارئین کرام نے پڑھے۔ یہ سب کتابیں عربی زبان میں ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ بے حد لائق تحسین کارنامہ ہے۔ ذیل میں ہم ان کی خدمت میں چند گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں۔

پہلی گزارش یہ ہے کہ یہ بہت بڑی علمی اور تحقیقی خدمت ہے جو انھوں نے سرانجام دی ہے اور اللہ کی مہربانی سے دے رہے ہیں۔ اس پر ہم انھیں بہ صمیم قلب مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی خدمت میں یہ عرض کرنے کو بھی جی چاہتا ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا یہ بے پایاں احسان ہے کہ وہ عربی، اردو، ہندی، انگریزی چار زبانیں جانتے ہیں۔ اردو ان کی مادری زبان ہے، ہندی ان کے ملک کی سرکاری زبان ہے اور انگریزی بھی وہاں بولی جاتی ہے اور انھوں نے پڑھی ہے۔ انھیں اسلامی احکام کو اپنے ملک میں عام کرنے کے لیے اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں بھی لکھنا چاہیے۔ اگر ہندی اور انگریزی میں نہ لکھنا چاہیں تو اردو کو ذریعہ اظہار ضرور بنائیں۔ برصغیر کے علمائے دین نے تحریری اور تقریری صورت میں پہلے فارسی زبان میں اسلام پھیلایا، کیوں کہ اس خطۂ ارض میں اس وقت فارسی کا رواج تھا اور دفتری زبان بھی یہی تھی۔ حتیٰ کہ پنجاب میں سکھوں کے راج میں بھی سرکاری زبان فارسی تھی۔ پھر اردو زبان نے ترقی کے مراحل طے کیے تو اسے ذریعۂ تبلیغ بنایا گیا۔ انگریزوں کے دورِ اقتدار میں یہاں انگریزی زبان کا چلن ہوا تو مسلمان اہل قلم نے

اسلامی لٹریچر کو اس زبان میں منتقل کرنے کا عزم کیا اور اس کے ساتھ مدارس میں عربی تعلیم اور عربی میں تحریر و نگارش کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اب ہندوستان کی سرکاری زبان ہندی قرار پا گئی ہے تو وہاں کے مسلمان اہل علم کا فرض ہے کہ وہ اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے اس زبان کا سہارا لیں۔ اور اللہ کا شکر ادا کریں کہ اس ملک میں اسلام کی تبلیغ کے لیے انھیں ایک اور زبان مل گئی۔ وہ عربی میں تحقیقی کام ضرور کریں لیکن جس ملک سے ان کا اصل تعلق ہے، اس ملک کے لوگوں کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ وہاں کے مسلمان جو ہماری اطلاع کے مطابق پچیس چھبیس کروڑ کے لگ بھگ ہیں، اردو بولتے ہیں اور اردو لکھتے ہیں۔ ان کا اسلام سے رابطہ مضبوط رکھنے کے لیے اہل علم کا فرض ہے کہ اظہار و بیان میں اردو کو اہمیت دی جائے۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ بیس پچیس برس سے ہمارے بعض اصحاب قلم نے صوفیا پر تنقید کو اپنے لیے ضروری قرار دے رکھا ہے۔ مولانا صلاح الدین کی بعض تصانیف کے ناموں سے اشارے ملتے ہیں کہ انھوں نے بھی اپنی تحقیق کے مطابق یہ فریضہ ادا فرمایا ہے۔ میں نے ان کی کتابیں نہیں پڑھیں، اس لیے مجھے نہیں معلوم کہ ان کے نزدیک ''صوفی'' کی کیا تعریف (ڈیفی نیشن) ہے۔ برصغیر میں صوفی کا اطلاق نیک، پرہیز گار، ہم دردِ خلائق اور احکام شریعت کی پابندی کرنے والے شخص پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی دعائیں قبول فرماتا ہے، اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل پیرا ہوتے اور اس کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ دور نہ جایئے صرف پنجاب کی جماعت اہل حدیث کو دیکھیے کہ ان میں حضرت سید عبداللہ غزنوی، سید الامام عبدالجبار غزنوی، مولانا غلام رسول (قلعہ میہاں سنگھ والے) مولانا صوفی محمد سلیمان (روڑی والے) صوفی ولی محمد (فتوحی والا) قاضی محمد سلیمان منصور پوری اور صوفی عبداللہ (ساکن ماموں کانجن) کا شمار انہی برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا تھا۔ ان کی تبلیغ اور صالحیت سے متاثر ہو کر جہاں بے شمار بے عمل مسلمان باعمل ہوئے وہاں بہت سے غیر مسلمانوں نے کفر کی راہ ترک کر کے اسلام کی راہ اختیار کی۔

اسی طرح آج سے سیکڑوں برس قبل کے برصغیر میں بہت سے بزرگانِ دین اور صوفیائے عظام کی مساعئ تبلیغ سے لاتعداد غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔ ان صوفیا میں شیخ علی ہجویری، شیخ مسعود بابا فرید الدین گنج شکر، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی، شیخ نظام الدین اولیا، شیخ معین الدین اجمیری اور دیگر بہت سے حضرات شامل ہیں۔ ان میں سے کبھی کسی نے اپنے آپ کو نہ بزرگ قرار دیا، نہ کسی نے صوفی کہلایا، اور نہ کسی نے متقی ہونے کا اعلان کیا۔ لیکن چوں کہ وہ پرہیز گار، عبادت گزار اور زہد پیشہ لوگ تھے، اس لیے برصغیر کی مذہبی اور دینی تاریخ کی کتابوں میں انھیں ''صوفیا'' لکھا گیا۔ ان کے قول و عمل کے بعض پہلوؤں سے اختلاف بھی ہوسکتا ہے اور شرعی حدود میں رہ کر اختلاف کرنا

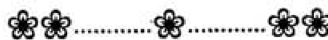
کوئی بری بات نہیں، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ان کی تعلیم کو بعض لوگوں نے بگاڑ کر پیش کیا اور بگاڑ کا یہ سلسلہ بہت پرانا ہے۔ جس طرح لوگوں نے بعض مصالح کی بنا پر حدیثیں گھڑ لیں اور ایسی باتیں نبی ﷺ کی طرف منسوب کردیں جو آپ ﷺ نے نہیں فرمائیں، اسی طرح بزرگانِ دین کی تعلیم میں بھی اپنے دنیوی مفاد کی خاطر غلط باتیں داخل کردی گئیں۔ ماہرین فن حدیث پر اللہ تعالیٰ کی لاکھ لاکھ رحمتیں ہوں کہ انھوں نے موضوع احادیث کی نشان دہی فرما دی۔ یہ فقیر اللہ تعالیٰ سے معافی اور قارئین کرام سے معذرت خواہ ہے کہ من گھڑت باتوں کو ''احادیث'' قرار دے رہا ہے، لیکن مجبوری یہ ہے کہ موضوعات کو ''احادیث'' ہی لکھا جاتا ہے۔ یعنی موضوع بھی ہیں اور احادیث بھی ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہمیں خود ہی سوچنا چاہیے کہ بزرگان دین کی تعلیمات کے کن کن حصوں کو غلط رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کی کتابوں کی عبارتیں بھی بدلی گئی ہوں گی۔

بعض حضرات چمٹے بجانے اور دھونی رمانے والوں کو ''صوفی'' قرار دیتے ہیں۔ ان کو صوفی کہنا اس لفظ کی توہین ہے۔ بہرحال اس فقیر کا مطالعاتی اور ذاتی رابطہ ان صوفیا سے پڑا ہے جو عالم بھی تھے اور متقی بھی۔ بحمد اللہ غلط کردار ''صوفیوں'' سے نہیں پڑا۔

سیکڑوں برس قبل کے برصغیر میں اسلام کی اشاعت کے سلسلے میں صوفیا کی کوششوں سے انکار کرنا بہت مشکل ہے۔ ذرہ غور فرمائیے صدیوں پیشتر اجمیر اور اس کے ارد گرد کے علاقے میں معروف معنی کے کس عالم دین نے اسلام کی تبلیغ کی تھی؟ فیروز پور، فرید کوٹ اور پاک پتن کے جنگلوں میں کون عالم دین اسلام کی اشاعت کے لیے گئے تھے؟ ''فرید کوٹ'' کا تو نام ہی بابا فرید الدین کے نام پر رکھا گیا ہے۔

بہرکیف میرے خیال میں یہ مسئلہ بہت نازک ہے۔ ہمارے علمائے کرام کو اس موضوع کی اصل کتابیں پڑھ کر ہی اظہار رائے کرنا چاہیے اور یہ زیادہ تر کتابیں فارسی زبان میں ہیں اور فارسی زبان کی کتابوں کا مطالعہ علمائے کرام کے لیے نہایت آسان ہے۔ جو چیزیں الحاقی یا غلط ہیں، انھیں چھوڑ دیجیے۔ لیکن بزرگوں کا ذکر احترام سے کیجیے۔

مولانا صلاح الدین مقبول احمد کی خطابتی، تدریسی اور تصنیفی و تالیفی خدمات کا میدان ماشاء اللہ بہت وسیع ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے دین کی خدمت کے مزید مواقع عطا فرمائے اور انھیں صحت و عافیت کی نعمت سے نوازے۔ آمین



پروفیسر محمد اقبال کیلانی

حافظ محمد ادریس کیلانی کا ذکر یہ فقیر اپنی کتاب ''برصغیر کے اہل حدیث خدامِ قرآن'' میں کر چکا ہے، جنھوں نے ۱۳۔ اکتوبر ۱۹۹۲ء کو وفات پائی۔ ان کا تعلق سکونت موضع کیلیاں والا (ضلع گوجراں والا) سے تھا۔ ان کے ایک فرزند گرامی پروفیسر محمد اقبال کیلانی ہیں جو ریاض (سعودی عرب) میں مقیم ہیں۔ دوسرے ریاض احمد تربیلا ڈیم میں ایک اچھے منصب پر فائز ہیں۔ تیسرے ہارون الرشید لاہور میں واپڈا کے محکمے میں کام کرتے ہیں اور چھوٹے خالد محمود کیلانی ہیں جو لاہور میں شیش محل روڈ پر حدیث پبلی کیشنز کے نام سے اسلامی و دینی کتابوں کی نشرواشاعت میں مصروف ہیں۔ مندرجہ ذیل سطور میں محمد اقبال کیلانی اور ان کی تصنیفی خدمات کے سلسلے میں چند گزارشات پیش کرنا مقصود ہے۔

محمد اقبال کیلانی ۷۔ جولائی ۱۹۴۵ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۱ء میں علی پور چٹھہ (ضلع گوجراں والا) کے ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران اپنے والد محترم حافظ محمد ادریس سے قرآنِ مجید کا ترجمہ پڑھا اور عربی زبان کے قواعد سیکھے اور گرامر کی چند کتابیں پڑھیں۔ والد ہی سے ابتدائی کتب حدیث میں سے کچھ حصہ بلوغ المرام کا اور بعد میں کچھ حصہ مشکوٰۃ شریف کا پڑھا۔ میٹرک کے بعد اسلامیہ کالج ریلوے روڈ (لاہور) میں داخلہ لیا اور ایف ایس سی کا امتحان دیا۔ پھر بی ایس سی اور ایم ایس سی (کیمسٹری) کے امتحانات ۱۹۶۸ء میں گورنمنٹ کالج (لاہور) سے پاس کیے۔

لاہور میں اسلامیہ کالج میں داخلے کے بعد حافظ محمد ادریس اپنے اس بیٹے کو مولانا عطاء اللہ حنیف کی خدمت میں لائے اور ان سے حدیث کی کتابیں پڑھانے کے لیے درخواست کی۔ چناں چہ وہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے لگے، ان سے حدیث کا درس تو نہ لیا جاسکا، البتہ ان کی صحبت سے مطالعہ کا شوق پیدا ہوگیا۔ مولانا نے ان کو مولانا ابوالکلام آزاد کی کتابیں پڑھنے کی تاکید کی اور بعض ماہانہ رسائل پڑھنے کو دیے، جس سے ان کو بہت فائدہ پہنچا۔

یہاں اقبال کے لیے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی ایک اور نصیحت سنیے۔ اسلامیہ کالج کی طالب علمی کے زمانے میں وہ جس مکان میں رہتے تھے، اس کے قریب بریلوی حضرات کی مسجد تھی۔ وہ اس مسجد میں نماز نہیں پڑھتے تھے، گھر ہی میں پڑھتے تھے۔ مولانا کو پتا چلا تو فرمایا تم بریلویوں کی مسجد میں باجماعت نماز پڑھا کرو، تمھاری نماز بریلوی امام کی اقتدا میں ہوجاتی ہے۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۸ء تک نوسال انھوں نے تربیلا ڈیم پراجیکٹ پر سینئر ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر کام کیا۔ وہاں جماعت اسلامی کے کچھ لوگوں سے رابطہ

پیدا ہوا تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تصنیفات پڑھنے کا موقع ملا اور ان سے متاثر ہوئے اور جماعت سے وابستگی اختیار کی۔

۱۹۷۸ء میں سعودی عرب چلے گئے اور ریاض کی جامعہ ملک سعود میں پروفیسر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دینے لگے۔ وہاں بھی کچھ عرصہ جماعت اسلامی سے تعلق رہا۔ پھر جب دیکھا کہ جماعت کے زیادہ تر لوگ حدیث رسول ﷺ کے مقابلے میں فقہ کو ترجیح دیتے ہیں تو جماعت سے تعلق کا رشتہ ڈھیلا پڑ گیا اور دل میں اشاعت حدیث (ﷺ) کا جذبہ ابھر آیا۔

۱۹۸۴ء کے رمضان المبارک کی آمد آمد تھی کہ ذہن نے فیصلہ کیا کہ حدیث شریف کی روشنی میں رمضان المبارک سے متعلق مسائل مرتب کیے جائیں، چناں چہ دو تین مہینوں میں ''کتاب الصیام'' کے نام سے کتاب ترتیب دی جس کی مولانا عبدالمالک مجاہد کی کوشش سے کمپوزنگ ہوئی اور چند اصحابِ خیر کے تعاون سے ریاض میں اس کی طباعت ہوئی اور اسے بلا قیمت تقسیم کیا گیا۔

۱۹۸۵ء میں جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوگئے اور ''تفہیم السنہ'' کے نام سے ادارہ قائم کرکے اشاعت حدیث کا سلسلہ شروع کیا۔ عمر کے ساٹھ سال پورے ہونے کے بعد ۲۰۔ اگست ۲۰۰۵ء کو ملازمت سے سبک دوش ہوئے اور پھر تمام وقت خدمت حدیث میں صرف ہونے لگا۔ ادارہ تفہیم السنہ کے قیام یعنی ۱۹۸۵ء سے ۲۰۰۶ء تک اکیس برس میں ان کی اکیس کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ حدیث سے متعلق ہر سال ایک کتاب کی اشاعت مصنف پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے۔

گزشتہ اکیس بائیس سال سے ریاض میں اشاعت حدیث کی خدمت سرانجام دینے والے حضرات کا ایک مستقل حلقہ قائم ہے، جس میں پاکستان اور ہندوستان کے اصحابِ علم شامل ہیں۔ ان حضرات کے باہمی تعاون سے اردو زبان کے علاوہ تلنگو حیدرآباد (دکن) کی مقامی زبان نیز انگریزی اور ہندی زبانوں میں حدیث کے بارے میں کتابیں شائع ہورہی ہیں۔ بنگالی زبان میں بھی بعض کتابوں کے ترجمے شائع ہوئے ہیں۔ سب سے زیادہ ترجمے سندھی زبان میں ہوئے۔ اب تک یعنی یکم ستمبر ۲۰۰۶ء تک جب یہ سطور لکھی جارہی ہیں اکیس کتابوں کے ترجمے سندھی زبان میں شائع ہوچکے ہیں۔ یہ اہم کام جناب سکندر عباسی کررہے ہیں جو دس بارہ سال ریاض میں رہے ہیں اور آج کل حیدرآباد (سندھ) میں مقیم ہیں اور ترجمے کررہے ہیں۔

پروفیسر محمد اقبال کیلانی کی اب تک حدیث سے متعلق خدمات کی تفصیل درج ذیل ہے جو مختلف عنوانات کے تحت بیس کتابوں پر مشتمل ہے۔ یہ تمام کتابیں حدیث پبلی کیشنز شیش محل روڈ کی طرف سے چھپ چکی ہیں۔

① ...... کتاب التوحید (توحید کے مسائل): یہ کتاب ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں

فاضل مصنف نے قرآن وحدیث کے حوالوں سے توحید کے بارے میں تمام مسائل جمع کر دیے ہیں۔

②...... کتاب اتباع السنہ (اتباع سنت کے مسائل): اس میں تفصیل کے ساتھ اتباع سنت کی وضاحت کی گئی ہے۔ ہر مسئلے کا باقاعدہ حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۲۸ صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔

③...... کتاب الطہارۃ (طہارت کے مسائل): ۹۶ صفحات کی اس کتاب میں طہارت کے بارے میں تمام ضروری باتیں بیان کردی گئی ہیں اور ہر بات کو حوالوں سے مزین کیا گیا ہے۔

④...... کتاب الصلوٰۃ (نماز کے مسائل): یہ کتاب ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور نماز کے مسائل پر محیط ہے۔

⑤...... کتاب الجنائز (جنازے کے مسائل): ہر شخص کو دنیا کا یہ عارضی سفر طے کر کے موت کی وادی میں داخل ہونا ہے۔ اس کتاب میں زندگی اور موت کے متعلق بہت سی باتیں درج کی گئی ہیں اور پھر جنازے کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب ۱۲۰ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

⑥...... کتاب الصلوٰۃ علی النبی ﷺ (درود شریف کے مسائل): جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے اس میں نبی ﷺ پر دورد شریف پڑھنے کے بارے میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ کتاب کے صفحات ۵۶ ہیں۔

⑦...... کتاب الدعاء (دعا کے مسائل): یہ کتاب جن امور کو اپنے دامن صفحات میں سمیٹے ہوئے ہے، ان کی تعداد ۳۳ تک پہنچتی ہے اور وہ ہیں دعا کی فضیلت، دعا کی اہمیت، دعا کے آداب، دعا مانگنے کا طریقہ، قبولیت دعا کے اوقات اور بہت سی مختلف دعائیں۔ ۱۶۸ صفحات کی یہ کتاب اپنے موضوع کی ایک اہم کتاب ہے۔

⑧...... کتاب الزکوٰۃ (زکوٰۃ کے مسائل): ۹۶ صفحات کی اس کتاب میں لائق مصنف نے زکوٰۃ کے سلسلے کے تمام مسائل کی وضاحت فرمادی ہے۔

⑨...... کتاب الصیام (روزوں کے مسائل): اس کتاب میں روزے کی فرضیت، روزے کی فضیلت، روزے کی اہمیت، سحری اور افطاری کے مسائل، نماز تراویح کے مسائل وغیرہ تمام امور کی صراحت کردی گئی ہے۔ صفحات ۱۰۴ ہیں۔

⑩...... کتاب الحج والعمرۃ (حج اور عمرے کے مسائل): حج اور عمرہ کے موضوع کی یہ کتاب ۲۳۲ صفحات پر محتوی ہے، جس میں اس سلسلے کے مسائل وضاحت سے مرقوم ہیں۔

⑪...... کتاب الجہاد (جہاد کے مسائل): اس کتاب میں جہاد کے بارے میں بہت سی تفصیلات معرض بیان میں لائی گئی ہیں۔ صفحات ۱۸۴ ہیں۔

⑫...... کتاب النکاح (نکاح کے مسائل): اس کتاب میں نکاح کے احکام، خطبۂ نکاح، مہر،

ولیمہ، حقوق الزوجین وغیرہ متعدد مسائل حدیث کی روشنی میں بہ صراحت ذکر کیے گئے ہیں۔ ۱۹۲ صفحات میں پھیلی ہوئی یہ کتاب اس موضوع کی ایک اہم کتاب ہے۔

⑬...... کتاب الطلاق (طلاق کے مسائل): یہ کتاب ۱۱۱ صفحات پر مشتمل ہے اور متعلقہ موضوع کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔

⑭...... کتاب الجنۃ (جنت کا بیان): یہ کتاب ۲۱۶ صفحات کو گھیرے ہوئے ہے اور اپنے موضوع کی لائق مطالعہ کتاب ہے۔ اس میں ان تمام نعمتوں کا مفصل تذکرہ کیا گیا ہے جو اصحابِ جنت کو اللہ کی طرف سے عطا کی جائیں گی۔

⑮...... کتاب النار (جہنم کا بیان): ۲۲۴ صفحات کی اس کتاب میں جہنم کے ابواب، جہنم کی گہرائی، جہنم کی وسعت، جہنم کے عذاب کی ہولناکی، جہنمیوں کا حال، جہنم کی آگ کی شدت، جہنمیوں کا کھانا پینا وغیرہ بہت سی چیزیں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ ہر شخص کو اس قسم کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ پتا چلے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے نافرمانوں کا آخرت میں کیا حال ہوگا اور انھیں کس قسم کی سزائیں دی جائیں گی۔

⑯...... کتاب الشفاعۃ (شفاعت کا بیان): ۱۰۴ صفحات کی اس کتاب میں فاضل مصنف نے حدیث کی رو سے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ شفاعت کا کیا مطلب ہے، قیامت کو کون لوگ شفاعت کے حق دار ہوں گے، شفاعت کے لیے کن اعمال کی ضرورت ہے، شفاعت کی اجازت کسے ملے گی اور محروم شفاعت کون ہوں گے۔ یہ اور اس قسم کی متعدد باتیں اس کتاب میں مذکور ہیں۔

⑰...... کتاب احوال القبر (قبر کا بیان): قبر کے تصور ہی سے انسان کانپ اٹھتا ہے۔ ۱۸۴ صفحات کی اس کتاب میں ان واقعات کی حدیث پاک کی روشنی میں صراحت کی گئی ہے جو قبر میں اللہ کے اطاعت شعار بندوں اور اس کے نافرمانوں کو پیش آئیں گے۔

⑱...... کتاب اشراط الساعۃ (علامات قیامت کا بیان): اس کتاب میں نبی ﷺ کی احادیث مبارکہ کی روشنی میں ان علامتوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جو قیامت سے پہلے دنیا کے مختلف حصوں میں رونما ہوں گی۔ یہ بہت سی علامتیں ہیں مثلاً بعض خوں ریز جنگیں، امام مہدی کا ظہور، فتنۂ دجال، عیسیٰ علیہ السلام کا نزول، یاجوج ماجوج کا خروج، دابۃ الارض کا خروج وغیرہ۔ ۲۵۶ صفحات کی یہ کتاب چھوٹی بڑی بہت سی علاماتِ قیامت کے تذکرے پر مشتمل ہے۔

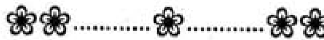
⑲...... کتاب احوال الساعۃ (قیامت کا بیان): یہ کتاب ۲۶۴ صفحات پر محیط ہے جس میں قیامت کے احوال ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں۔ ابتداے کتاب میں آخرت پر ایمان لانے کے وجوب اور قیامت کی آمد کے دلائل وغیرہ ضروری امور بیان کیے گئے ہیں۔ پھر قیامت کی

ہولناکیوں، قیامت اور اجرام فلکی، قیامت اور اجرام ارضی، صور، نفخ اول، نفخ دوم، قبروں سے اٹھنا، سورج کی گرمی وغیرہ بہت سے مسائل کی تصریح کی گئی ہے۔

⑳...... کتاب الولاء والبراء (دوستی اور دشمنی): اس کتاب میں کتاب وسنت کی روشنی میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ مسلمان کے لیے کسی سے دوستی اور دشمنی کے کیا پیمانے ہیں۔ صفحات ۲۰۰ ہیں۔

㉑...... فضائل القرآن المجید (فضائل قرآنِ مجید): ۲۶۴ صفحات کی اس کتاب میں فاضل مصنف نے قرآنِ مجید کے فضائل بیان کیے ہیں۔

پروفیسر محمد اقبال کیلانی کی یہ اکیس کتابیں ہیں جو اس وقت میرے سامنے ہیں اور یہ مصنف نام دار کی بہت بڑی علمی خدمت ہے۔ یہ سلسلہ ما شاء اللہ تیزی سے آگے چل رہا ہے۔ تمام کتابیں جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، حدیث پبلی کیشنز شیش محل روڈ، لاہور کی طرف سے شائع کی گئی ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مصنف کو صحت وعافیت سے نوازے رکھے اور انھیں کتاب وسنت کی زیادہ سے زیادہ خدمت کے مواقع عطا فرمائے، آمین یا رب العالمین۔



پروفیسر سعید مجتبیٰ سعیدی

پروفیسر سعید مجتبیٰ سعیدی کا تذکرہ ''برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن'' میں ان کی خدمت قرآن کے ضمن میں کیا گیا ہے۔

اب آئندہ سطور میں ان کی خدمت حدیث کا ذکر کیا جاتا ہے۔

پروفیسر صاحب ممدوح ۷ستمبر ۱۹۵۷ء کو منکیرہ (ضلع بھکر) میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی مولانا عبدالعزیز سعیدی تھا، جن کے حالات میں نے اپنی کتاب ''کاروانِ سلف'' میں بیان کیے ہیں۔ (ملاحظہ ہو صفحہ: ۱۹۹ تا ۲۴۱)

ابتدائی تعلیم منکیرہ میں حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے جلال پور پیر والا (ضلع ملتان) اور جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) گئے اور وہاں کے اساتذہ سے مستفید ہوئے۔ پھر مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں چار سال تحصیل علم میں مشغول رہے۔ ۱۹۸۳ء میں واپس وطن آئے۔

اساتذہ کرام میں مولانا سلطان محمود، مولانا محمد رفیق اثری، مولانا اللہ یار خاں، حافظ ثناء اللہ مدنی، مولانا محمد صدیق لائل پوری، حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی، مولانا قدرت اللہ فوق، شیخ عمر فلاتہ، شیخ عبدالقادر حبیب اللہ سندھی، شیخ ربیع الہادی، شیخ عطیہ سالم، ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن عمری ہندی شامل ہیں۔

پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے عربی اور ایم اے اسلامیات کے امتحانات امتیازی نمبروں میں پاس کیے۔

جامعہ اسلامیہ (گارڈن ٹاؤن لاہور) میں تقریباً چھ سال خدمت تدریس انجام دی۔ اسی دوران ''المعہد العالی للشریعۃ والقضاء'' میں عدالتوں کے ججوں اور وکیلوں کو اسلامی فقہ اور اسلامی قانون کی تدریس کا فریضہ انجام دیا۔ پنجاب پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں کامیابی کے بعد ۱۹۹۰ء میں گورنمنٹ کالج لیہ میں بہ طور لیکچرر اسلامیات متعین ہوئے۔ بعض دیگر تعلیمی اداروں میں بھی پڑھاتے رہے۔ متعدد رسائل وجرائد میں مضامین نگاری کا سلسلہ جاری رکھا۔ تصنیف وترجمے کے سلسلے میں انھوں نے کافی کام کیا جو حدیث اور مسائل حدیث سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کی اس ضمن کی مساعی کا ذکر مندرجہ ذیل سطور میں کیا جاتا ہے۔

① ...... اربعین نبوی: حضرت علی بن ابی طالب، عبد اللہ بن مسعود، معاذ بن جبل، ابوالدرداء، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، انس بن مالک، ابوہریرہ اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص میری امت کے لیے امورِ دینیہ سے متعلق چالیس احادیث یاد

کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن علما اور فقہا کی جماعت میں اٹھائے گا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے فقیہ عالم کی حیثیت سے اٹھائے گا۔

ماہرین حدیث نے کثرتِ اسانید کے باوجود اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ پھر بھی اہل علم نے چالیس چالیس احادیث کے بہ کثرت مجموعے ترتیب دیے ہیں۔ ان مجموعوں میں سب سے زیادہ شہرت ومقبولیت امام ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی (متوفی ۶۷۶ھ) کی مرتبہ ''الاربعین'' کو حاصل ہوئی۔ ''الاربعین'' کا اطلاق چالیس احادیث کے مجموعے پر ہوتا ہے، لیکن امام نووی کا مجموعہ بیالیس احادیث پر محیط ہے۔

ان احادیث پر عنوان قائم کرکے مفرداتِ حدیث کی تشریح کی گئی ہے اور ہر حدیث کے فوائد بیان کیے گئے ہیں۔ پروفیسر سعید مجتبیٰ نے اس ''الاربعین'' کا اردو ترجمہ کیا ہے جو فاروقی کتب خانہ ملتان کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

② ...... شرح اربعین نووی: اہل علم میں امام نووی کی اربعین کو بے حد پذیرائی ملی اور انھوں نے فارسی اور اردو زبانوں میں اس کے متعدد شروح وحواشی لکھے اور اس کے نظم ونثر میں ترجمے کیے گئے۔ پروفیسر سعید مجتبیٰ سعیدی نے اس کی شگفتہ اردو میں تشریح کی ہے اور ہر مسئلہ قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح کیا ہے، جس کی وجہ سے اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ خطیبوں اور واعظوں کے لیے یہ شرح بالخصوص فائدہ مند ہوگی۔ کتابی صورت میں اسے ادارہ دارالسلام نے خوب صورت انداز میں شائع کیا ہے۔ کتاب ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

③ ...... **الصحيفه في العشرة الضعيفه:** جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں تکمیل تعلیم کے آخری سال سعید مجتبیٰ نے ''**تخريج الاحاديث العشرة الضعيفه من كتاب الحدود من سنن ابي داؤد**'' کے عنوان سے مقالہ لکھا تھا اور پھر یہی مقالہ ''**الصحيفه في العشرة الضعيفه**'' کے مختصر مگر جامع نام سے پیش کیا تھا۔

④ ...... **تخريج الاحاديث الواردة في حد السرقة وما يستنبط منها من احكام:** یہ مقالہ سعید مجتبیٰ نے مدینہ یونیورسٹی کے تعلیم کے آخری سال لکھا تھا۔ اس میں سرقہ سے متعلقہ احادیث کی تخریج کی گئی ہے اور اس موضوع کی ہر حدیث سے جو مسائل مستنبط ہوتے ہیں، ان کی نشان دہی کی گئی ہے۔ یہ مقالہ غیر مطبوعہ ہے۔

⑤ ...... احادیث عمامہ اور ان کی استنادی حیثیت: ماہنامہ ''محدث'' (لاہور) میں ''عمامہ اور اتباعِ سنت'' کے عنوان سے ایک مقالہ شائع ہوا تھا، جس میں امام بیہقی کی شعب الایمان کے حوالے سے ایک روایت نقل کرکے عمامے کی فضیلت بیان کی گئی تھی۔ پروفیسر سعید مجتبیٰ نے

''احادیث عمامہ اور ان کی استنادی حیثیت'' کے عنوان سے ماہنامہ ''محدث'' (لاہور) میں مقالہ لکھا، جس میں عمامہ باندھنے سے متعلق احادیث کی استنادی حیثیت کو واضح کیا۔

⑥...... آداب دین ودنیا: امام احمد، امام نسائی، ترمذی اور ابن حبان وغیرہ محدثین عظام نے بروایت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث روایت کی ہے کہ

ما ذئبانِ جائعانِ ارسلہ فی غنم بافسد لھا من حرص المرء علی المال والشرف لدینہ .

یعنی وہ بھوکے بھیڑیے جنھیں بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیا جائے، اتنا نقصان نہیں کرسکتے، جتنا نقصان دنیا کے مال اور عزت وشہرت کی حرص سے انسان کے دین کا ہوتا ہے۔

اس حدیث کی جامعیت کے پیش نظر مشہور محدث امام ابن رجب حنبلی نے ایک مستقل کتاب میں اس کی مفصل شرح کی ہے۔ سعید مجتبیٰ نے ''آدابِ دین ودنیا'' کے زیرِعنوان اس کا اردو ترجمہ کیا جو ماہنامہ ''محدث'' (لاہور) کی چند قسطوں میں چھپا۔

⑦...... **غایۃ النفع فی شرح تمثیل المومن بخامۃ الزرع:** صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مثل المومن کمثل خامۃ الزرع من حیث اتتھا الریح کفائتھا فاذا اعتدلت تکفأ بالبلاء والفاجر کالارزۃ صراء متعدلۃ حتّٰی یقصھا اللہ اذا شاء .

یعنی مومن کی مثال لہلہاتی ہوئی کھیتی کی ہے۔ کسی طرف سے بھی آنے والی ہوا اسے جھکا دیتی ہے۔ جب وہ سیدھی ہوتی ہے تو اسے دوبارہ کسی مشکل اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس فاجر آدمی کی مثال صنوبر کے سیدھے اور مضبوط درخت کی سی ہے جو ہوا کے جھونکوں سے سرنگوں نہیں ہوتا بلکہ اللہ جب چاہے اسے اکھاڑ پھینکتا ہے۔

اس حدیث کی شرح میں امام ابن رجب حنبلی نے ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے۔ سعید مجتبیٰ نے اس کا اردو ترجمہ کیا جو رسالہ ''محدث'' کی جلد ۲۲ کے شمارہ نمبر ۸ میں چھپا۔

⑦...... **اللؤلؤ والمرجان:** یہ کتاب دو جلدوں پر محتوی ہے۔ اس میں علامہ محمد فواد عبدالباقی نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ۱۹۰۶ احادیث جمع کردی ہیں۔ سعید مجتبیٰ نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے اور جس حدیث سے جو مسائل مستنبط ہوتے ہیں، وہ مناسب انداز میں بیان کردیے ہیں۔ یہ کتاب ادارہ دارالسلام کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔

⑧...... **الفتح الربانی لترتیب مسند الامام احمد بن حنبل الشیبانی:** کتب احادیث میں مسند امام احمد بن حنبل ایک معروف اور اہم ترین کتاب ہے جو چالیس ہزار احادیث کا ضخیم ترین

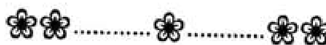
مجموعہ ہے۔ ''مسند'' اصولِ حدیث کی ایک اصطلاح ہے۔ مسند نام کی کتاب میں احادیث عام فقہی انداز کے ابواب قائم کرکے درج نہیں کی جاتیں بلکہ صحابی کا نام بہ طور عنوان لکھ کر اس صحابی سے مروی احادیث درج کی جاتی ہیں، اگرچہ وہ احادیث کسی موضوع سے تعلق رکھتی ہوں۔ مثلاً ایک حدیث وضو سے تعلق رکھتی ہے تو اس کے ساتھ دوسری حدیث تجارت سے متعلق ہے۔ ایک جہاد کے سلسلے کی ہے تو اس سے اگلی روزے کے بارے میں ہے۔ اس طرح کسی حدیث کا تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔ امام عبدالرحمٰن الساعاتی نے بے حد محنت کرکے مسند امام احمد کو فقہی ابواب کے تحت مرتب کردیا ہے اور اس کا نام ''**الفتح الربانی لترتیب مسند امام احمد بن حنبل الشیبانی**'' رکھا ہے۔ اس فقہی تبویب وترتیب کی صورت میں اس کتاب سے استفادہ بہت آسان ہوگیا ہے۔ امام موصوف نے ہر حدیث کی تخریج بھی کردی ہے۔ یہ بہت بڑی خدمت ہے جو امام رحمہ اللہ نے سرانجام دی ہے۔ اصل کتاب چوبیس اجزا پر مشتمل ہے۔ پروفیسر سعید مجتبیٰ اور چند اہل علم اس کا اردو ترجمہ کر رہے ہیں۔

⑨...... **تدریب الراوی:** مصطلح الحدیث کے موضوع کی جامع کتاب ''علوم الحدیث'' ہے جو مقدمہ ابن صلاح کے نام سے متعارف ہے۔ اس کتاب نے اہل علم میں بڑی شہرت پائی اور اس کے شروح، ذیول، حواشی اور اختصارات وزوائد لکھے گئے۔ بعض نے اسے منظوم بھی کیا۔ امام نووی نے مقدمہ ابن صلاح کا اختصار کیا، جسے ''الارشاد'' کے نام سے موسوم کیا۔ بعد میں اس کا مزید اختصار کیا اور اس کا نام رکھا ''**التقریب والتیسیر لمعرفة سنن البشیر النذیر**''۔ متعدد اہل علم نے امام نووی کے اس اختصار (التقریب) کی شروح قلم بند کیں، جن میں امام جلال الدین سیوطی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ انھوں نے اس موضوع کو بڑا منقح اور مصرح کردیا۔ سعید مجتبیٰ سعیدی نے اس کتاب کو اردو کے قالب میں ڈھالا۔ یہ سطور ۱۶۔ جولائی ۲۰۰۵ء کو لکھی جارہی ہیں۔ اس تاریخ تک یہ اردو ترجمہ شائع نہیں ہوا۔

علاوہ ازیں سعید مجتبیٰ نے مندرجہ ذیل عربی کتابوں کا اردو ترجمہ کیا۔

آداب الدعاء، کتاب التوحید، تحقیق کلمۃ الاخلاص، عبداللہ علوان کی ''**الاستشارة والاستخاره**'' کا اردو ترجمہ۔ عادل مختار کی **الوفاء بالعهد والصدق فی العهد** کا ترجمہ۔ ابوعبدالرحمٰن مصری کی ''**العبر**'' کا ترجمہ۔ مجدی فتحی السعید کی ''عقوق الوالدین'' کا ترجمہ۔ سمیر الحلبی کی ''الایثار'' کا ترجمہ۔ ان کی ایک کتاب ''آدابِ حج'' ہے۔

پروفیسر سعید مجتبیٰ ماشاء اللہ اب تک کافی کام کرچکے ہیں اور یہ سلسلہ اللہ کے فضل سے جاری ہے۔



حافظ محمد بنیامین طور

تحصیل علم کے بعد جن حضرات نے درس وتدریس کو اپنا مقصد حیات قرار دیا، ان کی طویل فہرست میں حافظ محمد بنیامین طور کا نام نامی بھی شامل ہے۔ حافظ محمد بنیامین ۱۹۳۴ء میں جھوک دادو چک نمبر ۴۲۷ گ ب (تحصیل تاندلیاں والا، ضلع فیصل آباد) میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی وریام خاں اور جد امجد کا داؤد تھا۔ طور برادری سے تعلق رکھتے ہیں جو راجپوتوں کی ایک گوت ہے اور اسی گاؤں کے رہنے والے ہیں، جس میں اس علاقے کے مشہور بزرگ میاں محمد باقر مرحوم فروکش تھے۔ میاں صاحب رشتے میں ان کے چچا تھے۔

پرائمری تک اپنے آبائی مسکن جھوک دادو میں تعلیم حاصل کی، اس کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول تاندلیاں والا میں داخل کرا دیے گئے جو ان کے گاؤں سے دو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد حافظ محمد بنیامین کے دل میں دینی تعلیم کے حصول کا جذبہ ابھرا۔ اس وقت وہ ایک گاؤں کے پرائمری سکول میں بہ طور ٹیچر خدمات انجام دیتے تھے اور سکول ٹیچری سے انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ ۱۹۵۵ء میں دریاے راوی میں سیلاب آیا تھا۔ یہ دریا ان کے گاؤں جھوک دادو سے تقریباً چھ میل کے فاصلے سے گزرتا ہے۔ اس سیلاب میں بہت مالی اور جانی نقصان ہوا تھا۔ سیلاب کی شدت کو دیکھ کر حافظ صاحب کو خیال آیا کہ سیلاب نے ہمارے گاؤں کا رخ کرلیا تو لوگوں کے ساتھ میں بھی مرجاؤں گا اور کوئی نیک عمل میرے پاس نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ دس سال میں نے سرکاری سکول میں گزارے ہیں اور کوئی ایسا کام نہیں کیا جو نجات کا باعث بن سکے۔ بہتر یہ ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دینی تعلیم حاصل کی جائے اور اس کے حصول کے بعد دینی علوم کی تدریس کا سلسلہ جاری کیا جائے۔ یہ خیال آتے ہی پرائمری سکول کی ملازمت چھوڑ دی اور اپنے گاؤں کے مدرسہ خادم القرآن والحدیث میں داخل ہوگئے۔

اس مدرسے میں اس وقت چار استاذ طلبا کو تعلیم دینے پر مامور تھے۔ ایک مولانا عبدالرشید مرحوم، ان سے حافظ محمد بنیامین نے ''عربی کا معلم'' پڑھا (چاروں حصے)

دوسرے حافظ مختار احمد تھے۔ ان سے انھوں نے مختصر المعانی اور الفیہ وغیرہ کتابیں پڑھیں۔

تیسرے استاذ مدرسہ خادم القرآن والحدیث کے مولانا محمد حسین طور تھے۔ ان سے بھی حافظ محمد بنیامین نے استفادہ کیا۔

چوتھے استاد اس وقت مولانا محمد یعقوب گوجروی تھے۔ ان سے صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، کافیہ اور ہدایت النحو وغیرہ کتابیں پڑھیں۔

جامعہ محمدیہ اوکاڑہ میں بھی حافظ صاحب ممدوح کچھ عرصہ پڑھتے رہے۔ وہاں انھوں نے حافظ شفیق الرحمٰن لکھوی سے ابواب الصرف اور نحو میر وغیرہ، صرف ونحو کی بعض کتابیں پڑھیں۔ اس وقت حضرت حافظ عبداللہ بڈھیمالوی بھی جامعہ محمدیہ میں مصروفِ تدریس تھے۔ ان سے حافظ محمد بنیامین نے باقاعدہ طور سے تو کوئی کتاب نہیں پڑھی، البتہ ان سے مستفید ہونے کا موقع ضرور ملا۔

اس کے بعد حافظ محمد بنیامین نے جامعہ سلفیہ میں داخلہ لیا۔ وہاں مولانا شریف اللہ خاں صاحب سے تفسیر بیضاوی، میبذی اور سلم العلوم کا درس لیا۔ مولانا محمد اسحاق چیمہ بھی جامعہ سلفیہ میں پڑھاتے تھے، ان سے شافیہ پڑھا۔ حضرت حافظ محمد گوندلوی سے صحیح بخاری پڑھی۔

حافظ فتح محمد فتحی مرحوم سے قرآنِ مجید کے بارہ پارے یاد کیے۔ باقی اٹھارہ پارے خود ہی اس وقت یاد کیے جب وہ مسلم شریف اور بخاری شریف پڑھتے تھے۔ یعنی علم حدیث کی تحصیل کے ساتھ ساتھ قرآنِ مجید بھی حفظ کرلیا۔

ان کے مندرجہ بالا وہ اساتذہ کرام ہیں جن سے دینیات کی مختلف کتابیں پڑھیں۔ سکول کے زمانے کے اساتذہ ہیں: ماسٹر منظور احمد، ماسٹر خدایار اور ماسٹر عبدالمجید۔ یہ تینوں حضرات وفات پاچکے ہیں۔ دینیات کے اساتذہ کرام بھی (حافظ شفیق الرحمٰن لکھوی کے علاوہ) سفرِ آخرت اختیار کرگئے ہیں۔

حافظ محمد بنیامین کے ہم جماعت حضرات کی فہرست میں مندرجہ ذیل حضرات شامل ہیں۔

علامہ احسان الٰہی ظہیر، مولانا عبدالخالق قدوسی شہید، شیخ الحدیث مولانا مفتی عبید اللہ عفیف (جامعہ اہل حدیث قدس لاہور)، مولانا محمد صدیق لائل پوری، مولانا محمد یوسف انور خطیب جامع مسجد اہل حدیث فیصل آباد۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد حافظ محمد بنیامین نے تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اس وقت جامعہ سلفیہ کے مہتمم مولانا محمد اسحاق چیمہ تھے۔ چیمہ صاحب نے ان کو جامعہ سلفیہ میں مدرس مقرر کردیا۔ یہ ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔ ۱۹۷۰ء تک دس سال انھوں نے جامعہ سلفیہ میں سلسلہ تدریس جاری رکھا۔ وہاں دیگر علوم وفنون کی کتابوں کے علاوہ بلوغ المرام سے لے کر صحیح مسلم تک کتب حدیث پڑھاتے رہے۔ دس سال میں بے شمار طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔

پھر اپنے گاؤں (جھوک دادو چک نمبر ۴۲۷ گ ب) کے مدرسہ خادم القرآن والحدیث میں چلے گئے۔ اس مدرسے میں دو سال خدمت تدریس انجام دی۔ بعد ازاں جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن کے اصحاب انتظام کی دعوت پر وہاں آ گئے۔ ایک سال وہاں قیام رہا۔ وہاں سے دارالحدیث

اوکاڑہ کا عزم کیا۔ دو سال وہاں بسر کیے۔ اس کے بعد جامعہ سلفیہ کے اربابِ اہتمام کی درخواست پر جامعہ سلفیہ میں چلے گئے۔ تقریباً چار سال جامعہ کے طلبا کو مستفید فرماتے رہے۔ وہاں سے پھر جامعہ تعلیم الاسلام (ماموں کانجن) آ گئے۔ ماموں کانجن کچھ عرصہ رہے۔ پھر اپنے گاؤں (جھوک دادو) میں ''سدرۃ الاسلام للبنات'' اور عمر بن خطاب اسلامک سنٹر (تاندلیاں والا) میں بہ حیثیت شیخ الحدیث خدمات انجام دیں۔ یہ سطور ۱۲۔ فروری ۲۰۰۷ء کو لکھی جارہی ہیں۔ ۲۰۰۶ء سے اب تک جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہیں۔ بہت اچھے مدرس ہیں اور نہایت شوق اور محنت سے پڑھاتے ہیں۔ طلبا ان کے اندازِ تدریس سے نہایت متاثر اور خوش ہیں۔

۱۹۶۰ء سے لے کر اب (۲۰۰۷ء) تک یعنی ۴۷ سال سے خدمت تدریس میں مصروف ہیں اور کئی دفعہ صحیح بخاری پڑھا چکے ہیں۔ اس طویل مدت میں بے شمار طلبا نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیے، جن میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

① مولانا عبدالعزیز علوی شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ فیصل آباد، ② مولانا عبدالرحمٰن چیمہ شیخ الحدیث لودھراں، ③ حافظ مسعود عالم استاذ جامعہ سلفیہ فیصل آباد، ④ مولانا عبدالقہار (صاحب زادہ برق توحیدی) ایڈیٹر ماہنامہ ''التوحید'' ٹوبہ ٹیک سنگھ، ⑤ مولانا محمد خالد سیف اسلامی نظریاتی کونسل اسلام آباد، ⑥ مولانا ارشاد الحق اثری ادارہ علوم اثریہ فیصل آباد، ⑦ مولانا عبدالحی انصاری ادارہ علوم اثریہ فیصل آباد، ⑧ مولانا محمد ہود مدرس کلیۃ دار القرآن والحدیث فیصل آباد، ⑨ قاری بشیر احمد عثمانی برطانیہ، ⑩ پروفیسر عنایت اللہ مدنی اسلام آباد، ⑪ حافظ عبداللہ شیخوپوری مرحوم، ⑫ قاری حفیظ الرحمٰن ملتانی مدرس جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن، ⑬ حافظ فتح دین فاضل مدینہ یونیورسٹی مدرس جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن، ⑭ حافظ محمد اسلم شیخ الحدیث جامعہ محمدیہ خان پور، ⑮ پروفیسر عبدالرحمٰن شاہین بہاول نگر، ⑯ حکیم رانا محمد مدثر خاں چک نمبر ۴۸۵ گ ب تحصیل سمندری ضلع فیصل آباد۔

یہ چند حضرات کے نام ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے علما وطلبا نے حافظ محمد بنیامین سے استفادہ کیا۔

تدریس کے ساتھ ساتھ حافظ صاحب نے اور بھی خدمات سرانجام دیں۔ مثلاً تحریک تحفظ ختم نبوت میں حصہ لیا اور ساہی وال جیل میں قید رہے۔ جہاد افغانستان میں بھی باقاعدہ شرکت کی۔ اپنے گاؤں جھوک دادو میں طالبات کی تعلیم کے لیے جامعہ سدرۃ الاسلام للبنات کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا جو بیس سال سے جاری ہے۔ اس میں عام دینی تعلیم کے علاوہ بچیوں کے لیے قرآن کے حفظ وتجوید کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔

حافظ محمد بنیامین قلم وقرطاس سے بھی رابطہ رکھتے ہیں اور خوب صورت اندازِ میں لکھتے ہیں۔ تحریر کی زبان بہت صاف ہے۔ عربی سے اردو ترجمہ کرنا ایک فن ہے۔ حافظ صاحب ممدوح اس فن کی نزاکتوں سے آگاہ ہیں۔ ان کے ترجمہ وتصانیف کا سلسلہ یہ ہے:

① ...... الطّور الناجی شرح سراجی: تدریسی حلقوں میں سراجی کو مشکل کتاب سمجھا جاتا ہے۔ لیکن حافظ محمد بنیامین نے اس کا رواں دواں اردو ترجمہ کیا ہے۔

② ...... نمازِ نبوی ﷺ: اس میں نبی ﷺ کے طریق نماز کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اپنے موضوع کی عمدہ کتاب ہے۔

③ ...... **الطلاق الصواب الذی یوجد فی الحدیث والکتاب**: اس کتاب کا نام عربی قسم کا ہے، لیکن کتاب اردو زبان میں ہے۔ اس میں قرآن وحدیث کے مطابق طلاق کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ہمارے خیال میں بہتر ہوتا کہ اس کا نام ''طلاق کا طریقہ کتاب وسنت کی روشنی میں'' رکھا جاتا۔

④ ...... سینے پر ہاتھ باندھنا: اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنے چاہئیں۔

⑤ ...... امام بخاری اور ان کی **الجامع الصحیح**: یہ حافظ صاحب کا مقالہ ہے جو ''ترجمان الحدیث'' کے تین شماروں (فروری، مارچ، اپریل ۱۹۸۶ء) میں شائع ہوا تھا۔ یہ نامکمل مقالہ ہے، اسے تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ امید ہے حافظ صاحب اس پر غور فرمائیں گے۔

حافظ صاحب کی اولاد تین بیٹیاں ہیں اور ایک بیٹا۔ تینوں شادی شدہ ہیں۔ بیٹا ایم اے پاس ہے اور ایک ہائی سکول میں عربی ٹیچر ہے۔



حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی

میں اپنی کتاب ''برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن'' (کے بہرہ ف، صفحہ ۴۳۹ تا ۴۴۱) میں حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی کے بارے میں وہ ضروری معلومات بیان کر چکا ہوں جو قرآن مجید سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے عہد طفولیت، ان کے حصول علم کا دور، ان کے اساتذۂ کرام، ان کی خطابتی سرگرمیوں کی روداد اور ان کی تدریسی جدوجہد وغیرہ سے متعلق کوائف بھی کسی حد تک اس مضمون میں آگئے ہیں۔ ان سطور میں ان کی دیگر کتابوں کا ذکر کرنا مقصود ہے جو انھوں نے قرآن و حدیث کی روشنی میں تصنیف فرمائیں۔ نیز اس میں ان کے بعض اہم مضامین کی نشان دہی بھی کی جائے گی۔ انھوں نے ابتدائے شعور سے جس ڈھب سے مسلک اہل حدیث کی تبلیغ فرمائی اس کا تذکرہ بھی کیا جائے گا۔

میانہ قد، سرخی مائل گورا رنگ، مناسب ڈیل ڈول، خوش پوش اور خوش کلام، اچھے خطیب، کلمۂ حق کہنے میں جری، مہمان نواز، اساتذہ کے سامنے نہایت مؤدب، بڑوں کے لیے سراپا احترام۔ یہ ہیں حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی۔

حافظ صاحب ممدوح ۱۹۶۹ میں موضع جید چک نمبر ۱۶ رب (تحصیل منڈی ڈھاباں سنگھ، ضلع شیخوپورہ) میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید حفظ کیا، متعدد جلیل القدر اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اور مسلک اہل حدیث کی تبلیغ و اشاعت میں سرگرم ہوگئے۔ اس سلسلے میں نہ کسی مصلحت کا شکار ہوئے اور نہ کبھی کسی قسم کی جھجک محسوس کی۔ اپنے مسلک کے جرأت مند خطیب اور بلند حوصلہ مبلغ کے طور پر متعارف ہوئے۔

اب حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی کی ابتدائی زندگی میں اہل حدیثیت سے دلی محبت اور اپنے گاؤں میں اس مسلک کی ترویج سے متعلق ضروری باتیں سنیے۔!

جب انھوں نے شعور کی آنکھ کھولی تو اپنے گاؤں اور خاندان کے لوگوں کو حنفی دیوبندی مذہب کا پیروکار پایا۔ گھر اور خاندان کا دینی ماحول ہونے کی وجہ سے نماز روزے کی عادت بچپن ہی میں پڑ گئی تھی اور قرآن مجید بھی پڑھ لیا تھا اور پھر یہ شوق یہاں تک بڑھ گیا کہ گاؤں کی مسجد میں انھوں نے اپنے ہم عمر یا اپنے سے چھوٹی عمر کے بچوں کو ناظرہ قرآن مجید پڑھانا شروع کر دیا۔ حالاں کہ اس وقت وہ خود بھی ایک چھوٹے بچے تھے۔ اس وقت ان کے گاؤں میں صرف دو گھر اہل حدیث

کے تھے۔ ایک گھر کا تعلق گوجر برادری سے تھا اور ایک کا راجپوت برادری سے۔!

راجپوت برادری سے جس گھرانے کا تعلق تھا، ان کے سرکردہ شخص کا نام محمد حسین تھا اور وہ اس پورے علاقے میں مولوی محمد حسین موحد کے نام سے معروف تھے۔ مولوی محمد حسین موحد دیوبندیوں کی اقتدا میں نماز نہیں پڑھتے تھے بلکہ قریبی گاؤں کی اہل حدیث مسجد میں نماز اور جمعہ پڑھا کرتے تھے۔ اگر گاؤں میں ہوتے تو اپنے گھر ہی میں نماز ادا کر لیتے۔ بعد ازاں ضلع شیخوپورہ کی تحصیل ننکانہ صاحب کے ایک گاؤں ''منگوتارا'' چلے گئے تھے۔

گوجر برادری سے تعلق رکھنے والے گھرانے کے سربراہ کا نام تھا صوفی رحمت علی۔ انھوں نے اپنے آبائی مسکن جید چک نمبر ۱۶ سے نقل مکانی کر کے گوجراں والا شہر میں رہائش اختیار کر لی تھی۔

۱۹۸۲ء میں گاؤں کے پرائمری سکول سے پرائمری پاس کرنے کے بعد جب مئی کے آخر یا جون کے شروع میں حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی نے دینی مدرسے میں داخلہ لیا تو اس وقت گاؤں میں کوئی اہل حدیث نہیں تھا۔

اس گاؤں میں کمبو برادری کا ایک خاندان تھا جن کے بڑے کسی دور میں اہل حدیث تھے، مگر حالات اور ماحول کی وجہ سے یہ بھی حنفی ہو گئے تھے اور انھوں نے مولانا احمد علی لاہوری کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔

یہ دو بھائی تھے۔ بڑے کا نام چودھری عبدالغفور کمبو تھا۔ انہی کے بیٹے عبدالرشید صاحب، فاروق الرحمٰن کو دینی مدرسے میں داخل کرانے کی غرض سے لے گئے تھے اور دوسرے بھائی تھے چودھری عبدالحمید کمبو۔ ان سے چوں کہ حافظ صاحب کے گھرانے کے خاندانی مراسم تھے اس لیے ان کے بچوں سے تعلق قائم ہونا قدرتی امر تھا اور پھر جیسا کہ پہلے بتایا گیا فاروق الرحمٰن چھوٹی عمر ہی میں بچوں کو ناظرہ قرآن مجید بھی پڑھایا کرتے تھے۔ چودھری عبدالحمید کمبو کے بچے بھی ان سے ناظرہ قرآن پڑھا کرتے تھے۔ خاندانی تعلق کی وجہ سے یہ بچے آپس میں دوست بھی تھے۔ جب حافظ صاحب جمعرات کو اپنے مدرسے سے چھٹی پر گھر جاتے تو یہ بچے بھی مسجد میں آ جاتے اور انھیں دیکھ کر آمین اور رفع یدین کرتے اور رات گئے تک یہ سب بچے مسجد میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے۔

یہ صورت حال دیکھ کر دیوبندیت سے تعلق رکھنے والے لوگ ان پر تنقید اور اعتراض کرتے۔ جیسے جیسے ان پر تنقید زیادہ ہوتی گئی ویسے ویسے یہ بچے مسلک اہل حدیث میں پختہ ہوتے گئے۔

کچھ عرصے کے بعد انھوں نے اپنی ایک تنظیم بنالی، کوئی صدر بن گیا اور کوئی سیکرٹری۔ تنظیم کا نام اہل حدیث یوتھ فورس رکھا اور گاؤں کی مسجد سے پرانی مسواکیں اٹھائیں اور ان سے دیواروں پر اہل حدیث یوتھ فورس کے الفاظ لکھ دیے۔ گاؤں خاصی بڑی آبادی پر مشتمل ہے جس میں بریلوی،

دیو بندی، شیعہ، مرزائی اور عیسائی شامل ہیں۔ لوگوں نے دیواروں پر یہ الفاظ پڑھ کر ایک دوسرے سے پوچھنا شروع کردیا کہ یہ اہل حدیث یوتھ فورس کیا ہے اور اس کا مطلب کیا ہے۔ حافظ صاحب کے ساتھی بچے ان سے پوچھتے اور یہ اپنی دانست کے مطابق انھیں سمجھانے کی کوشش کرتے۔

اس دوران میں فاروق الرحمٰن یزدانی کبھی کبھی اپنے مدرسے کے کسی طالب علم کو بھی چھٹی کے دن اپنے گاؤں لے جاتے اور وہاں ان سے تقریریں کرائی جاتیں۔ حافظ صاحب اپنے گھر سے ان کو کھانے کے علاوہ حسب توفیق کرایہ وغیرہ بھی دیتے۔ ایک دفعہ دو طالب علم ساتھیوں کو اپنے گاؤں لے گئے۔ اس وقت گھر سے انھیں پانچ روپے ایک ہفتے کا خرچہ ملتا تھا۔ والد صاحب سے دس روپے لیے اور پانچ پانچ روپے دونوں ساتھیوں کو دے دیے اور خود بڑی مشکل سے ہفتہ گزارا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو انھوں نے اسی دیو بندیوں کی مسجد میں آٹھ بڑی سالانہ کانفرنسیں منعقد کیں جو کہ ہر سال باقاعدگی سے ہوتی تھیں۔ ان کانفرنسوں میں جماعت اہل حدیث کے نامور مقررین تشریف لے جاتے تھے۔ مثلاً مولانا عبداللہ گورداس پوری، مولانا محمد حسین شیخوپوری، مولانا محمد عبداللہ شیخوپوری، حافظ عبدالعلیم یزدانی جھنگوی، مولانا محمد شفیق خان پسروری، مولانا منظور احمد، قاری عبدالحفیظ فیصل آبادی، قاری محمد حنیف ربانی کاموں کی، حافظ ابتسام الٰہی ظہیر۔ جب جماعت اور مسلک کا کام کچھ بڑھا تو بہت سے لوگ ان کے ہمدرد اور خیر خواہ ہوگئے۔ یہ بچے بھی اب کچھ بڑے ہوگئے تھے۔ ان کے والدین بھی اپنے بچوں کی وجہ سے ان کے ساتھ تعاون کرنے لگے۔ اور اصل بات یہ ہے کہ اس گاؤں میں مسلک اہل حدیث کی بنیاد اور ترویج و اشاعت میں سب سے زیادہ تعاون اور حصہ چودھری عبدالحمید کمبو کا ہے جو جان، مال اور اولاد کے ساتھ ان کے معاون اور عسر ویسر میں ان کے ساتھی رہے۔ ناساعد حالات میں بھی وہ انھیں حوصلہ دیتے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو وہ خود بھی اور ان کے بڑے بھائی چودھری عبدالغفور اور خاندان کے کچھ دوسرے لوگ بھی اہل حدیث ہوگئے۔

اب دیو بندیوں کی طرف سے مخالفت بلکہ دشمنی نقطۂ عروج پر تھی۔ کئی دفعہ جھگڑا بھی ہوا حتی کہ ۱۹۹۴ء میں اہل حدیث حضرات اپنی الگ مسجد بنانے پر مجبور ہوگئے۔ چنانچہ گاؤں کے بالکل وسط (مین بازار) میں دو مکان خرید کر فروری ۱۹۹۴ میں مسجد کی بنیاد رکھی اور نماز جمعہ اور پانچ وقت کی باجماعت نماز کا اہتمام کیا۔

نئی مسجد میں بھی سالانہ کانفرنس باقاعدہ ہوتی تھی جس میں جماعت کے مقررین تشریف لاتے رہے۔ اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک کانفرنس کے موقع پر چار بریلوی افراد اہل حدیث ہوگئے جس کے بعد بریلویوں کی حمایت پر پورا گاؤں شیعہ، بریلوی اور دیو بندی متحد ہوکر اہل حدیث کی شدید

مخالفت کرنے لگے اور مسجد کی تعمیر روکنے کے لیے عدالت سے سٹے آرڈر لے لیا۔

تقریباً تین سال مقدمہ عدالت میں چلا۔ آخر کار فیصلہ اہل حدیث کے حق میں ہوا۔ اب ماشاء اللہ اسی جگہ پر ایک عظیم الشان مسجد بنام جامع مسجد محمدیہ اہل حدیث تعمیر ہو چکی ہے جس میں حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی کے چھوٹے بھائی امامت، خطابت اور تدریس کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ اور ماشاء اللہ گاؤں میں تقریباً ۳۵ گھر اہل حدیث مسلک سے وابستہ ہیں۔ اور اس گاؤں کی جماعت اہل حدیث علاقے میں اپنا ایک مذہبی و سیاسی مقام رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب محسنین اور معاونین کے تعاون کو قبول فرمائے۔ مسجد کو تا قیامت آباد رکھے اور جماعت کو مزید ترقی عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

۲۰۰۲ء کے آغاز سے فاروق الرحمٰن یزدانی جماعت اہل حدیث کے عظیم تدریسی مرکز جامعہ سلفیہ فیصل آباد میں مصروف درس و تدریس ہیں اور یہ وہ ادارہ ہے جس سے اب تک ہزاروں طلبا فارغ التحصیل ہو چکے ہیں جو مختلف مقامات پر اپنے اپنے ذوق اور قابلیت کے مطابق تدریسی، تصنیفی اور خطابتی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

اس کے علاوہ جنوری ۲۰۰۷ء سے وہ جامعہ سلفیہ کے ترجمان ماہنامہ ''ترجمان الحدیث'' کے نائب مدیر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ان کی تحریری کاوشوں سے ہر مہینے قارئین مستفید ہوتے ہیں۔

کافی مدت سے حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی شاہ کوٹ کے قریب موضع میر پور چک نمبر ۸۷ کے منصب خطابت پر فائز ہیں۔ دو مرتبہ میں بھی ان کی دعوت پر اس گاؤں میں جا چکا ہوں۔ ایک مرتبہ وہاں جمعہ پڑھا۔ دوسری دفعہ انھوں نے گوجراں والا سے اپنے اساتذہ مولانا عبدالحمید ہزاروی اور مولانا حافظ عبدالمنان نور پوری کو بھی بلایا تھا اور ان کے علاوہ گوجراں والا سے بعض دیگر اہل علم ان کی دعوت پر تشریف لائے تھے۔ جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) سے مولانا عبدالعزیز علوی، مولانا محمد یونس بٹ اور چودھری محمد یٰسین ظفر کی جامعہ کے بعض حضرات کی رفاقت میں تشریف آوری ہوئی تھی۔

شام کا کھانا سب لوگوں نے حافظ صاحب کے مکان پر کھایا۔ بڑا پر تکلف کھانا تھا۔ نمازِ مغرب کے بعد مولانا عبدالحمید ہزاروی نے منبر پر بیٹھ کر درس قرآن دیا اور اس کے بعد حافظ عبدالمنان نور پوری صاحب نے دعا کرائی۔ اس عمل سے فارغ ہوئے تو گوجراں والا کے حضرات جو اپنی گاڑی پر تشریف لائے تھے گوجراں والا چلے گئے اور فیصل آباد کے دوست اپنی گاڑی سے فیصل آباد روانہ ہو گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ فیصل آباد چلا گیا اور اپنے بھتیجے سلطان ناصر کے پاس محلہ چیباں کی گلی نمبر ۵ میں (جسے ڈاک خانے والی گلی کہا جاتا ہے) رات رہا۔ دوسرے دن دوستوں سے مل کر لاہور آ گیا۔

حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی سعید الفطرت عالم دین ہیں اور اپنے مسلک کے سلسلے میں نہایت

غیور۔ ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔ ان میں بعض نام ممکن ہے قارئین کے نزدیک ''جارحانہ'' نوعیت کے ہوں لیکن حنفی مصنفین کی جن کتابوں کے جواب میں یہ کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں اہل حدیث مسلک پر زبان و اسلوب کے لحاظ سے نہایت سخت حملے کیے گئے ہیں۔ اور میرے نزدیک ان کے مقابلے میں حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی کا انداز تحریر بہت نرم ہے۔ انھوں نے سختی کا جواب سختی سے نہیں دیا، بلکہ نرمی سے دیا ہے۔ اس کا اندازہ دونوں طرف کی کتابیں پڑھ کر کیا جاسکتا ہے۔ اب حافظ یزدانی صاحب کی کتابوں کے نام:

① خرافات حنفیت بجواب مخمصہ اہل حدیث ② احناف کا رسول اللہ ﷺ سے اختلاف ③ جواہر ہدایت ④ احناف کا امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے اختلاف ⑤حنفیت اپنے جال میں ⑥ تلبیسات حنفیت بجواب انکشاف حقیقت۔

حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی نے کتابوں کے علاوہ بے شمار مضامین سپرد قلم کیے جن میں سے چند مضامین کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں۔

①...... چند خوش نصیب لوگ۔

②...... بسنت: تفریح یا گناہوں کی دلدل۔

③...... معیار ہدایت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔

④...... شب برات اور اس کی شرعی حیثیت۔

⑤...... حج کے احکام اور اس کا طریقہ۔

⑥...... فضائل و مسائل عشرۂ ذی الحجہ و قربانی۔

⑦...... فضائل و مسائل رمضان المبارک۔

⑧...... احکام و مسائل عید الفطر۔

⑨...... شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ اور ان کی تعلیمات۔

⑩...... حقیقی کامیابی کیسے ممکن ہے؟

⑪...... عید میلاد النبی ﷺ عقل و نقل کی کسوٹی پر۔

⑫...... روز مرہ کے معاملات میں دائیں جانب کی اہمیت۔

یہ مضامین جن رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ وہ یہ ہیں۔

①...... ماہنامہ ترجمان الحدیث: فیصل آباد

②...... ماہنامہ صدائے ہوش: لاہور

③...... ماہنامہ اشاعۃ السنۃ: فاروق آباد

④...... پندرہ روزہ صحیفہ اہل حدیث: کراچی

⑤...... ہفت روزہ اہل حدیث: لاہور

ترجمان الحدیث (فیصل آباد) کے حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی نائب مدیر ہیں، اس لیے اس رسالے میں ان کے مضامین ہر مہینے بالالتزام چھپتے ہیں۔

یزدانی صاحب ماشاء اللہ بہ یک وقت تین کام کر رہے ہیں۔

☆...... تدریس

☆...... خطابت

☆...... تحریری تگ و دو

اور یہ تینوں نہایت اہم کام ہیں۔

حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی کی ابتدائی زندگی کا تذکرہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ قارئین ذی احترام کو یہ پتا چل سکے کہ بدوِ شعور ہی میں وہ اہل حدیثیت سے بے پناہ محبت اور تعلق رکھتے تھے اور عہد طفولیت ہی میں اس کی نشر و اشاعت کو انھوں نے اپنے لیے فرض قرار دے لیا تھا۔ معلوم نہیں ان کی ابتدائی زندگی کے وہ ساتھی جو اس سلسلے میں ان کے معاون تھے، اب کس حال میں ہیں اور ان میں سے اس فقیر کی تحریر کردہ ان سطور پر کسی کی نظر بھی پڑے گی یا نہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ گوجر اور راجپوت برادری کے وہ حضرات جنھوں نے موضع جید چک نمبر ۱۶ ر ب میں سب سے پہلے مسلک اہل حدیث کو متعارف کرایا، اس دنیاے فانی میں موجود ہیں یا نہیں۔

ہماری دعا ہے کہ ان میں سے اگر کوئی صاحب زندہ ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے اور انھیں اپنے دین کی خدمت کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرے۔ اگر وفات پا گئے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

نیز دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ خادم اہل حدیث فاروق الرحمٰن یزدانی کو صحت و عافیت سے نوازے رکھے اور انھیں اپنے دین کی خدمت کی مزید توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی کو ایک سند حضرت مولانا محمد یوسف زبیدی (میرپور سندھ) سے حاصل ہوئی۔ مولانا ممدوح، حضرت مولانا احمد اللہ دہلوی رحمہ اللہ (متوفی ۱۹۔ مارچ ۱۹۴۳ء) کے شاگرد تھے جنھوں نے حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ سے حصول علم کیا تھا۔ اس طرح یزدانی صاحب صرف دو واسطوں سے حضرت میاں صاحب کے شاگرد ہوئے یعنی اصطلاح میں ان کی سند عالی کہلائی۔ سند ملاحظہ ہو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اجازة الرواية

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سياٰت اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل فلا هادى له واشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريک له واشهد ان محمدا عبده و رسوله اللهم صل على محمد وعلى آل محمد وبارک وسلم.

فيقول العبد المذنب طالب الغفران ابو الطاهر يوسف الزبيدى بان الشيخ الفاضل حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی بن عبداللطیف قد طلب منى الاجازة بان يروى عنى الكتب الستة، والموطا للامام مالکؒ وكتاب الام للشافعیؒ ومسند الامام احمد بن حنبلؒ وصحيح ابن خزيمة وصحيح ابن حبان و سنن البيهقى وسنن الدار قطنى والدارمى بعد ماقرأ على بعضها وسمع منى بعضها واستجاز منى بجميعها فاجزته بان يروى عنى هذه الكتب ويقرئها ويدرسها بعد المطالعة والتحقيق لماراٰه اهلا لها.

وانى حصلت القرأة والسماع والاجازة لهٰذه الكتب عن الشيخ العابد الزاهد العلامة احمد الله الدهلوى وهو عن الشيخ المحدث السيد نذير حسين الدهلوى وهو عن الشيخ الاجل الامام محمد اسحٰق الدهلوى وهو عن سند وقته الشاه عبدالعزيز الدهلوى وهو عن ابيه العلامة الشاه ولى الله المحدث الدهلوى رحمهم الله اجمعين و سنده معروف ومشهور عند اهل العلم بالحديث فاوصيه بتقوى الله والمواظبة على ذكره سبحانه وتعالى وان لايخاف فى الله لومة لائم ويجتنب الفواحش والمنكرات والله ولى التوفيق.

التوقيع الختم

محمد یوسف عفی عنہ



ڈاکٹر حافظ محمد اسحاق زاہد

برصغیر کے اہل حدیث اصحابِ علم کثیر تعداد میں تحریری، خطابتی اور تدریسی صورت میں مختلف ملکوں میں قرآن وحدیث کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کی خدمت کا یہ سلسلہ شرق اوسط کے ملکوں میں بھی جاری ہے اور یورپ کے ملکوں میں بھی۔ ان میں سے بعض خادمین قرآن وحدیث کا تذکرہ میں اپنی کتاب ''قافلہ حدیث'' میں کر چکا ہوں، بعض کا ''برصغیر کے اہل حدیث خدامِ قرآن'' میں کیا جا چکا ہے اور بعض کا زیرِ مطالعہ کتاب ''دبستانِ حدیث'' میں کیا گیا ہے۔ قرآن وحدیث کے ان خوش بخت مبلغین کی جماعت کے ایک لائق احترام رکن حافظ محمد اسحاق زاہد ہیں جو آج کل کویت میں تدریس وخطابت کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ پورا قد، گندمی رنگ، مردانہ وجاہت کا خوب صورت پیکر، خطیبانہ آواز، کتابی چہرہ، خوش لباس، خوش گفتار، خوش اطوار۔ سنت کے مطابق داڑھی، جو پہلے بالکل سیاہ تھی، اب عمر چالیس کو پہنچ گئی ہے تو کچھ سفید بال بھی اپنا جلوہ دکھانے لگے ہیں۔

حافظ محمد اسحاق زاہد ۱۰ مارچ ۱۹۶۸ء کو ضلع ملتان کی تحصیل شجاع آباد کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی مولانا غلام مرتضیٰ اور چچا کا مولانا غلام مصطفیٰ تھا۔ دونوں بھائیوں کا شمار اپنے علاقے کے اربابِ علم میں ہوتا تھا۔

حافظ محمد اسحاق زاہد کو ابتدائی تعلیم کے لیے اپنے گاؤں کی مسجد میں قاری محمد طاہر کی شاگردی میں دیا گیا۔ قاری صاحب سے انھوں نے قرآنِ مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد پرائمری سکول میں پانچویں جماعت میں داخل کرائے گئے۔ حصولِ علم کے شائق اس ذہین بچے نے چھ ماہ میں پرائمری کا امتحان نمایاں پوزیشن میں پاس کیا۔

اس کے بعد والد گرامی اور چچا جان سے صرف ونحو اور فارسی کی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں اور حصولِ علم کی راہ پر قدم زن ہو گئے۔ پھر عمر کے سن وسال میں کچھ اضافہ ہوا تو شجاع آباد کے ایک دینی مدرسے میں داخلہ لیا۔ اس مدرسے کا نام اشرف العلوم تھا۔ اس مدرسے میں ایک سال رہے اور صرف ونحو کی بعض کتابیں وہاں کے اساتذہ سے پڑھیں۔

اب ۱۹۸۲ء آ گیا تھا اور وہ چودہ پندرہ سال کی عمر کو پہنچ گئے تھے۔ انھوں نے لاہور کا عزم کیا اور ماڈل ٹاؤن کے مدرسہ رحمانیہ میں داخلہ لیا جو حافظ عبدالرحمٰن مدنی نے جاری کیا تھا۔ اس مدرسے

میں انھوں نے جم کر تعلیم حاصل کی اور اس کے نصاب کے مطابق اولیٰ ثانوی سے لے کر اولیٰ کا
تک مختلف اساتذہ سے استفادہ کیا۔ ان فاضل اساتذہ میں مولانا عبدالرحمٰن عظیمی، قاری نعیم الحق
مولانا خلیق الرحمٰن لکھوی، مولانا حافظ ثناء اللہ مدنی، مولانا سعید مجتبیٰ سعیدی، حافظ عبدالرشید اظہر
حافظ عبدالرشید خلیق، مولانا محمد رمضان، حافظ عبدالرحمٰن مدنی اور مولانا عبدالحی انصاری شامل تھے۔

اسی دوران ۱۹۸۵ء میں لاہور بورڈ سے میٹرک کا امتحان پرائیویٹ طالب علم کے طور پر اوّل
ڈویژن میں پاس کیا۔

رابعہ ثانوی کے امتحان میں مدرسے میں اوّل درجے پر آئے تو مدرسے کے اصحابِ انتظام نے
ان کے کاغذات مدینہ یونیورسٹی میں بھیجے اور اللہ نے کرم فرمایا کہ وہاں ان کا داخلہ ہوگیا۔ یہ ۱۹۸۶
کی بات ہے۔

۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۰ء تک چار سال وہ مدینہ یونیورسٹی کے کلیۃ الحدیث میں زیرِ تعلیم رہے۔ اس
اثنا میں جن اساتذہ گرامی سے استفادہ کیا، ان میں مندرجہ ذیل حضرات شامل ہیں۔

① ...... شیخ عمر حسن فلاتہ: مدرس مسجد نبوی (ﷺ) ان سے تدریب الراوی جز ثانی پڑھی۔

② ...... ڈاکٹر انیس الرحمٰن: ان کا وطنی تعلق انڈونیشیا سے ہے۔ ان سے تدریب الراوی جز
اوّل پڑھی۔

③ ...... ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی: ان سے نیل الاوطار کا ایک حصہ پڑھا۔

④ ...... ڈاکٹر عبدالصمد بکر: ان کے پاس ''الوضع فی الحدیث'' کا مضمون تھا۔

⑤ ...... قاری محمد ایوب: مسجد نبوی کے سابق امام۔ ان سے تفسیر فتح القدیر کا درس لیا۔

⑥ ...... شیخ عبدالعزیز عبداللطیف: ان سے جرح وتعدیل کے موضوع پر استفادہ کیا۔

ان حضرات کے علاوہ مدینہ یونیورسٹی کے مشہور محدث علامہ شیخ حماد انصاری کے گھر جا کر ان
کے مکتبے میں حصولِ فیض کرتے رہے۔

مدینہ یونیورسٹی سے فراغت کے بعد لاہور آئے اور ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۴ء کے آغاز تک مدرسہ
رحمانیہ میں خدمت تدریس سرانجام دیتے رہے۔

اب ان کا کاروانِ حیات ایک اور موڑ کاٹتا اور ایک نئی منزل میں داخل ہوتا ہے۔ مئی ۱۹۹۴ء کا
واقعہ ہے کہ کویت کی وزارتِ اوقاف نے انھیں کویت کا ویزا بھیجا اور یہ کویت پہنچے۔ وہاں انھیں
تحفیظ القرآن کی ذمہ داری سونپی گئی۔ یہ نہایت بابرکت ذمہ داری تھی۔ اللہ تعالیٰ کے کلام کو حفظ کرانا
اور اس کے الفاظ وحروف کو لوگوں کے سینوں میں محفوظ کرانے کا اہتمام کرنا ایک عظیم کام تھا جو حافظ
محمد اسحاق زاہد کے سپرد کیا گیا۔ چھ سال وہ اس اہم خدمت پر مامور رہے۔ پھر انھیں امامت

میں شائع کرنے کی کوشش فرمائیں۔ مختلف حضرات نے بعض علمی موضوعات پر بہت اچھے مقالے سپرد قلم کیے ہیں، لیکن وہ یونیورسٹیوں میں پڑے ہیں۔ مقالہ نگار کو تو محنت کا فائدہ حاصل ہو گیا اور محکمۂ تعلیم کی طرف سے اس کو مستحق مراعات قرار دے دیا گیا، لیکن لوگوں کو تو اس کا فائدہ اسی صورت میں پہنچ سکتا ہے کہ مقالہ شائع کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

پی ایچ ڈی کے مختلف موضوعات کے بہت مقالے شائع ہوئے ہوں گے۔ لیکن میرے ذہن میں شائع شدہ جو مقالے آ رہے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

① ...... ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا مقالہ، جو مجدد الف ثانی کے نظریۂ توحید کے بارے میں ہے۔

② ...... ڈاکٹر زبید احمد کا انگریزی مقالہ ''دی کنٹری بیوشن آف انڈیا ٹو دی عربک لٹریچر۔'' اس کا اردو ترجمہ ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' کے نام سے شاہد حسین رزاقی نے کیا جو ڈاکٹر شیخ محمد اکرام کے زمانے میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے شائع ہوا۔

③ ...... ایک اور انگریزی مقالہ ڈاکٹر محمد اسحاق کا ہے، جس کا تعلق برصغیر میں حدیث لٹریچر سے ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی شیخ محمد اکرام کے زمانے میں شاہد حسین رزاقی نے کیا اور اسے ادارہ ثقافت اسلامیہ نے شائع کیا۔

④ ...... پشاور یونیورسٹی کی طرف سے قاضی سعد اللہ نے نواب صدیق حسن خاں پر انگریزی میں مقالہ لکھا جو شیخ محمد اشرف تاجر کتب لاہور نے شائع کیا۔

⑤ ...... حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی پر جامعہ اسلامیہ بہاول پور کے شعبہ عربی کی (سابقہ چیئر پرسن) مرحومہ ثریا ڈار کا مقالہ سراج منیر کے زمانے میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے شائع ہوا۔ اس فقیر نے اس کی ادارت کی اور اس پر مقدمہ لکھا۔

⑥ ...... ''اردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ'' ڈاکٹر محمد ایوب قادری کا ایک تحقیقی مقالہ ہے، اس میں شمالی ہند کے ان علمائے کرام کا تذکرہ کیا گیا ہے، جنھوں نے ۱۸۵۷ء تک تحریری صورت میں اردو زبان کی خدمت کی۔ اس مقالے کی ادارت بھی اس فقیر نے کی اور ''حرفے چند'' کے عنوان سے اس پر مقدمہ لکھا۔ یہ مقالہ بھی کتابی صورت میں سراج منیر کے زمانے میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے چھپا۔

⑦ ...... پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی نے مولانا عبدالماجد دریا بادی پر مقالہ تحریر کیا، جس میں ان کی علمی خدمات کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس مقالے کی اشاعت بھی سراج منیر کے عہد ڈائریکٹری میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے ہوئی۔

⑧ ...... پنجاب یونیورسٹی کے اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر محمود الحسن

عارف نے قاضی ثناء اللہ پانی پتی پر نہایت محنت سے تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا۔ اس مقالے کی ادارت بھی میرے سپرد کی گئی۔ یہ مقالہ سہیل عمر کے زمانے میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کی مطبوعات میں شامل ہوا۔

⑨...... ایک مقالہ ''اسباب الخطأ فی التفسیر'' کے عنوان سے مدینہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل فاضل ومحقق ڈاکٹر طاہر محمود نے عربی زبان میں لکھا جو دو جلدوں میں چھپا۔ مقالہ ١١٦٤ صفحات پر مشتمل ہے۔ بہت عمدہ مقالہ ہے۔

⑩...... ایک مقالہ ''نواب سید صدیق حسن خاں'' کے نام سے ہندوستان کی محققہ رضیہ حامد نے لکھا اور شائع ہوا۔

⑪...... ہندوستان ہی کے ڈاکٹر عین الحق قاسمی نے حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری پر مقالہ لکھا جو شائع ہوا۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ پی ایچ ڈی کے مقالے بڑی محنت اور تحقیق سے لکھے جاتے ہیں، لیکن ان کی اشاعت کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی جاتی۔ انھیں شائع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ پڑھے لکھے لوگ ان سے مستفید ہوسکیں۔ حافظ محمد اسحاق زاہد کا یہ مقالہ حدیث کے سلسلے میں بہت اہم موضوع پر مشتمل ہے اور بے حد محنت سے لکھا گیا ہے۔ اردو زبان میں میرے خیال میں یہ پہلی کوشش ہے، اس کی اشاعت کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔

گزشتہ سطور سے پتا چلتا ہے کہ حافظ محمد اسحاق زاہد تدریس وخطابت وغیرہ کے اہم امور میں بہت مصروف رہتے ہیں۔ لیکن ان مصروفیات کے باوجود قلم وقرطاس سے ان کا باقاعدہ رابطہ رہتا ہے۔ پی ایچ ڈی کے تحقیقی علمی مقالے کے علاوہ تصنیف وتالیف میں بھی انھوں نے خدمات سرانجام دیں اور بعض عربی رسالوں کو اردو میں منتقل کیا۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے۔

○...... شیخ وحید عبدالسلام کی کتاب ''الصارم البتار'' کا اردو ترجمہ جادو کا علاج قرآن وحدیث کی روشنی میں۔

○...... شیخ وہف القحطانی کی کتاب ''صلوٰۃ التطوع'' کا اردو ترجمہ ''نماز نفل'' کتاب وسنت کی روشنی میں یہ نہایت عمدہ کتاب ہے۔ صفحات ١٩٠۔

○...... رابعہ الطّویل کی عربی کتاب ''حقیقۃ الشہادتین'' کا اردو ترجمہ۔ حقیقت شہادتین۔ یعنی اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ و اشھد ان محمدا رسول اللّٰہ۔ یہ کتاب ٢٨٤ صفحات پر مشتمل ہے۔

○...... شیخ خالد الحسینان کی ایک پاکٹ بک قسم کی تصنیف ہے۔ ''الف سنۃ فی الیوم واللیلۃ۔'' حافظ محمد اسحاق زاہد نے ''دن اور رات میں ایک ہزار سے زیادہ سنتیں'' کے نام سے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتاب مکتبہ حسین محمد جامع مسجد علی المرتضیٰ نور روڈ، صدیقیہ کالونی، بادامی باغ لاہور سے

مفت حاصل کیجیے۔ صفحات ۱۲۸

○...... اسلام میں خواتین کا مقام اور پردہ: پچاس صفحات کی یہ بہترین کتاب مذکورہ پتے سے مفت حاصل کیجیے اور مصنف اور ناشر کے لیے دعا فرمایے۔

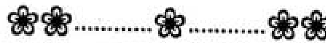
○...... فضائل درود شریف: ۶۴ صفحات کی یہ کتاب اپنے موضوع کی نہایت اہم کتاب ہے۔ شائقین مذکورہ پتے سے مفت حاصل کر سکتے ہیں۔

○...... ارکانِ ایمان: ایک سو بارہ صفحات کی اس کتاب میں چھ ارکانِ ایمان کا بے حد عمدہ انداز میں تعارف کرایا گیا ہے۔ اور وہ ارکان ہیں: ① ایمان باللہ، ② ایمان بالملائکہ، ③ ایمان بالکتب، ④ ایمان بالرسل، ⑤ ایمان بالیوم الآخر اور ⑥ ایمان بالقدر۔

○...... خوش گوار زندگی کے رہنما اصول: ۴۸ صفحات کا یہ خوب صورت رسالہ مندرجہ بالا پتے سے مفت حاصل کیجیے۔

○...... زاد الخطیب (مشتمل بر دو مجلدات) اس میں خطیبوں کے لیے کتاب وسنت کی روشنی میں متعدد خطبات جمع کیے گئے ہیں۔ اپنے موضوع کی نہایت عمدہ کتاب ہے۔ جلد اوّل ۵۵۲ صفحات اور جلد ثانی ۵۱۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ شائع کردہ جمعیت احیاء التراث الاسلامی کویت۔

ڈاکٹر حافظ محمد اسحاق زاہد کو اللہ تعالیٰ خوش رکھے۔ وہ تصنیف وترجمہ، درس وتدریس اور تقریر وخطابت کی صورت میں قرآن وحدیث کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کی علمی سرگرمیوں سے کویت کے لوگ بھی مستفید ہورہے ہیں اور ان کی تصانیف وتراجم سے ہم لوگوں کی بھی دینی تربیت ہورہی ہے۔



مولانا محمود احمد غضنفر

جن حضرات نے کسی نہ کسی انداز میں ہمیشہ خدمت دین کو اپنا شعار بنائے رکھا، ان میں مولانا محمود احمد غضنفر کا اسم گرامی قابل ذکر ہے۔ مولانا ممدوح یکم جنوری ۱۹۴۵ء کو ضلع لدھیانہ (مشرقی پنجاب) کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ مروّجہ تعلیم ۱۹۶۵ میں جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں مکمل کی۔ فاضل عربی اور اردو عالم کے امتحانات پنجاب یونیورسٹی میں دیے اور کامیاب ہوئے۔ وفاق المدارس السّلفیہ کا امتحان بھی پاس کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۰ء تک پانچ سال جامعہ تعلیمات اسلامیہ (فیصل آباد) میں سلسلہ تدریس جاری رہا۔ سعودی عرب کی وزارتِ مذہبی امور میں سولہ سال ملازمت کی۔

مختلف مساجد میں اٹھائیس سال بلا معاوضہ خدمت خطابت سرانجام دیتے رہے۔ ذاتی کوشش سے مندرجہ ذیل تین مسجدیں تعمیر کرائیں۔

① ...... مسجد مزمل اہل حدیث بند روڈ۔ لاہور

② ...... مسجد ریاض الجنۃ اہل حدیث۔ گوشہ احباب۔ لاہور

③ ...... مسجد انوار رحمت۔ اہل حدیث۔ فیصل آباد

صحافت کے سلسلے کی تگ وتاز اور دیگر خدمات ایک نظر میں۔

○ ...... کچھ عرصہ ہفت روزہ ''اہل حدیث'' (لاہور) میں خدمات انجام دیں۔

○ ...... ایک سال ماہنامہ ''البدر الاسلامیہ'' کی ادارت کی۔

○ ...... مجلّہ ''دعوۃ الحق'' کا کویت نمبر شائع کیا جو تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس نمبر میں کویت سے متعلق عربی اور اردو میں مضامین شائع کیے گئے۔

○ ...... مجلّہ ''دعوۃ الحق'' کا نجد وحجاز نمبر جو پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے، اردو اور عربی زبانوں میں معرضِ اشاعت میں آیا۔ اس ضخیم نمبر میں سعودی عرب کے بارے میں بہت سے معلومات افزا مضامین اشاعت پذیر ہوئے۔

''دعوۃ الحق'' کے کویت نمبر اور نجد وحجاز نمبر کو اپنے موضوع کی اہم تاریخی دستاویز سے تعبیر کرنا چاہیے۔

○ ...... ایک سال ہفت روزہ ''تنظیم اہل حدیث'' (لاہور) کے مدیر رہے۔

○ ...... ۱۹۸۷ء یہ فقیر ادارہ ثقافت اسلامیہ میں بہ طور ریسرچ فیلو تصنیفی خدمات سرانجام دیتا تھا۔ اس زمانے میں کچھ عرصہ ہفت روزہ ''اہل حدیث'' کی اداریہ نویسی میرے سپرد رہی۔ مولانا محمود

احمد غضنفر اس اخبار میں میرے ساتھ کام کرتے تھے۔ ان دنوں ہم نے ''اہل حدیث'' کا ضخیم حرمین شریفین نمبر شائع کیا تھا، جس میں اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر متعدد اہل علم کے عربی اور اردو مضامین شائع کیے گئے تھے۔ اس نمبر نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔

○...... ہفت روزہ ''اہل حدیث'' (لاہور) کا شاہ خالد نمبر شائع کیا۔

○...... تقریباً ایک سال ریڈیو پاکستان (لاہور) میں مختلف موضوعات پر مولانا محمود احمد غضنفر کی تقریروں کا سلسلہ جاری رہا۔

○...... کوٹ لکھپت جیل اور کیمپ جیل اچھرہ کے قیدیوں میں انھوں نے کئی مرتبہ قرآنِ مجید کا درس دیا۔

○...... ۱۹۸۲ء میں جامعہ الفیصل الاسلامیہ کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے کا آغاز مسجد مزمل اہل حدیث واقع بند روڈ (لاہور) سے کیا گیا تھا، جس میں سولہ فلپائنی طالب علم تعلیم حاصل کرتے تھے۔ پھر اس ادارے کی مستقل بلڈنگ اعوان ٹاؤن (لاہور) میں بنائی گئی۔ اس میں تقریباً تین سو فلپائنی طالب علم داخل تھے۔ ان کے علاوہ جزائرقمر، انڈونیشیا، ملائشیا، تھائی لینڈ، سری لنکا، افغانستان اور پاکستان کے طلبا حصول تعلیم کرتے رہے۔

مولانا ممدوح نے یہ سب کام مسلک اہل حدیث کی خدمت اور اشاعت کی غرض سے کیے اور جو تعلیمی ادارے جاری کیے، وہ جماعت کی ملکیت تھے۔

محمود احمد غضنفر نے بہت سے غیر ملکی سفر بھی کیے۔ چار مرتبہ برطانیہ، چار مرتبہ کویت اور چار مرتبہ متحدہ عرب امارات گئے۔ بارہ دفعہ سعودی عرب جانے کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔ اس کے علاوہ ہندوستان، فلپائن اور افغانستان کے سفر کیے۔

اب ان کی خدمت حدیث کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

①...... **ضیاء الکلام شرح عمدة الاحکام**: علامہ عبدالغنی مقدسی حنبلی کی تصنیف عمدة الاحکام بہت مشہور کتاب ہے۔ مولانا محمود احمد غضنفر نے ''ضیاء الکلام'' کے نام سے اس کا اردو ترجمہ کیا اور خوب صورت انداز سے اس کی شرح کی۔ مثلاً معنی الحدیث، مفہوم الحدیث، مفردات الحدیث اور احکام الحدیث کے عنوانات سے متعلقہ حدیث کی وضاحت فرمائی۔ یہ کتاب صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ۴۱۰ احادیث پر مشتمل اور بڑے سائز کے ۶۷۰ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے۔ اس کے مقدمے میں مصنفین صحاح کا تعارف کرایا گیا ہے۔

②...... **مصابیح الخیام ترجمہ کتاب الاحکام**: علامہ ابن دقیق العید کی یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ محمود احمد غضنفر نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔

③...... **احادیث قدسیہ:**

④...... **احادیث نبویہ:** ترجمہ اربعین نوویہ۔

⑤...... **احادیث الجہاد:**

⑥...... **ندرۃ الاحادیث:** ترجمہ وتفہیم نخبۃ الاحادیث۔

حدیث کے موضوع کے علاوہ مولانا محمود احمد غضنفر نے صحابہ کرام، صحابیات، تابعین، تابعات کی سوانح حیات پر گیارہ ضخیم کتابیں سپردِ قلم کیں۔ ان میں بعض تالیفات ہیں اور بعض تراجم۔

نساء الانبیاء اور حیات انبیاء علیہم السلام کے موضوع پر ان کی علیحدہ علیحدہ دو کتابیں چھپ چکی ہیں۔

یہ سطور ۱۵۔ جولائی ۲۰۰۵ء کو لکھی جارہی ہیں۔ اس وقت تک مولانا محمود احمد غضنفر ماشاء اللہ ۴۳ کتابیں (بہ صورت تصنیف وترجمہ) مکمل کر چکے ہیں اور چند کتابوں کے علاوہ تمام کتابیں چھپ گئی ہیں۔

اب ان کی زیادہ تر توجہ خدمت قرآن کی طرف ہے۔ یہ خدمت وہ ''ضیاء البیان فی کلام الرحمٰن'' کے نام سے سرانجام دے رہے ہیں۔ ان سطور کی تحریر تک سورہ فاتحہ، سورہ نور، سورہ یٰسٓ، سورہ حجرات اور سورہ مزمل پر کام ہو چکا ہے۔ یہ سورتیں الگ الگ کتابی صورت میں منظر عام پر آرہی ہیں۔

علاوہ ازیں پہلے پارے کی تفسیر مکمل کر لی گئی ہے۔ دوسرے پارے کا بھی کافی حصہ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ پانچ پاروں کی ایک جلد شائع ہوگی جو پہلی جلد ہوگی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس تفسیر کا انداز یہ ہے: القرآن، معانی القرآن، مفردات القرآن، مفہوم القرآن اور فوائد القرآن۔

مولانا محمود احمد غضنفر تقریباً پانچ سال سے بیمار چلے آرہے ہیں، لیکن بیماری کے ایام میں بھی اللہ نے ان کو توفیق مرحمت فرمائی اور انھوں نے ترجمہ وتالیف کے سلسلے کا بہت کام کیا۔ وہ مستقل مزاج، باہمت اور خوش مزاج وخوش طبع اہل علم ہیں۔ میں جب بھی مزاج پرسی کے لیے ان کے پاس گیا، وہ بے حد خندہ پیشانی سے پیش آئے اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ الحمد للہ علی کل حال۔

دوستوں کی خاطر داری، مہمان نوازی، فراخ حوصلگی اور اپنی استطاعت سے بڑھ کر مستحق کی اعانت ان کی زندگی کے ضروری اجزا ہیں۔ طویل مدت سے میرے ان سے گہرے مراسم ہیں، میں نے انھیں ہمیشہ خندہ رو اور مطمئن پایا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے جو انھیں عطا فرمائی گئی ہے۔

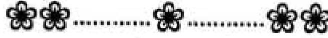
کچھ عرصے سے انھوں نے لاہور کی سکونت ترک کردی ہے اور شیخوپورہ میں اقامت اختیار فرمالی ہے۔ ان کی اولاد پانچ بیٹیاں ہیں اور ایک بیٹا۔ اولاد تعلیم یافتہ ہے۔ بیٹے کا نام حافظ ضیاء

الرحمٰن ہے۔

ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں صحت کاملہ سے نوازے اور وہ تمام عمر قرآن وحدیث کی خدمت کے لیے وقف رہیں، آمین یا رب العالمین۔

مولانا محمود احمد غضنفر کا پتا یہ ہے:

جی ایم ہاؤس۔کاشف پارک۔صدیقی سٹریٹ۔ہاؤسنگ کالونی۔شیخوپورہ



مولانا عبدالرشید اٹاروی

جن حضرات نے دارالعلوم تعلیم الاسلام (اوڈاں والا) میں تعلیم حاصل کی اور پھر اسی دارالعلوم میں تدریسی خدمات سرانجام دینا شروع کیں اور اب تک دے رہے ہیں، ان میں مولانا عبدالرشدی اٹاروی کا اسم گرامی قابل ذکر ہے۔ ان کا تذکرہ دراصل اس کتاب میں آنا چاہیے تھا جو اس فقیر نے حضرت صوفی عبداللہ مرحوم کے حالات میں تحریر کی ہے اور مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور کی طرف سے ٢٠٠٦ء میں شائع ہوئی ہے۔ لیکن مجھے ان کے متعلق کسی صاحب نے مطلع نہیں کیا اور خود میرا دھیان بھی ان کی طرف نہیں گیا۔ اب حکیم رانا محمد مدثر خاں (چک نمبر ٤٨٥ گ ب، ضلع فیصل آباد) نے ان سے متعلق چند باتیں بہ صورت تحریر ارسال کی ہیں تو ان کے شکریے کے ساتھ یہ باتیں اپنے الفاظ میں یہاں لکھ رہا ہوں۔

مولانا عبدالرشید اٹاروی کے والد کا نام قطب الدین، دادا کا عبدالرحمٰن اور پردادا کا فتح دین تھا۔ اس خاندان کا تعلق راجپوت بھٹی برادری سے ہے اور یہ لوگ کسی زمانے میں چک سانده کلاں (تحصیل قصور، ضلع لاہور) میں رہتے تھے۔ انگریزی حکومت نے ضلع لائل پور (حال فیصل آباد) میں چک بندی اور آبادکاری کا سلسلہ شروع کیا تو مولانا عبدالرشید کے پردادا فتح دین اپنے کچھ تعلق داروں کے ساتھ ضلع لائل پور کی تحصیل تاندلیاں والا کے ایک گاؤں چک نمبر ١٧٧ گ ب ماڑی اٹاری میں سکونت پذیر ہوگئے اور اس نواح کی بولی میں ”آبادکار“ کہلائے۔

مولانا عبدالرشید کے نانا کا نام میاں محمد ابراہیم تھا وہ جماعت مجاہدین سے تعلق رکھتے تھے اور اسی وجہ سے صوفی عبداللہ مرحوم کے خاص عقیدت مندوں میں شمار کیے جاتے تھے۔

عبدالرشید ١٩٤٠ء میں بمقام چک نمبر ١٧٧ گ ب ماڑی اٹاری پیدا ہوئے اور آگے چل کر اپنے مولد و مسکن کی وجہ سے ”اٹاروی“ کی نسبت سے شہرت پائی۔ مولانا ممدوح کے ایک بھائی میاں عبدالقیوم ہیں جو محکمہ شماریات میں گریڈ نمبر ١٧ کے افسر ہیں اور فیصل آباد میں مقیم ہیں۔

عبدالرشید کے والد نے ١٩٤٦ء میں یعنی چھوٹی عمر ہی میں اپنے بیٹے کو حصولِ علم کے لیے صوفی عبداللہ مرحوم کے قائم کردہ دارالعلوم میں اوڈاں والا بھیج دیا تھا، دو تین اور بچے بھی ان کے ساتھ تھے۔ لیکن وہاں ان کا جی نہیں لگا، اس لیے واپس گھر چلے گئے تھے۔ بعد ازاں عبدالرشید نے اپنے

گاؤں میں حافظ عبدالرحمٰن مرحوم سے ناظرہ قرآنِ مجید پڑھا اور مولوی شیر محمد مرحوم سے پہلے پارے کا ترجمہ پڑھا اور ابواب الصرف کا بابِ اوّل یاد کرنے لگے۔ پھر جلد ہی انھیں چک نمبر ۴۳۷ گ ب نور پور کے گورنمنٹ پرائمری سکول میں داخل کرادیا گیا۔ ۱۹۵۳ء میں پرائمری پاس کرکے دارالعلوم تعلیم الاسلام (اوڈاں والا) میں داخل ہوئے اور وہاں مولانا محمد اسحاق خائف، مولانا محمد صادق خلیل، مولانا محمد یعقوب ملہوی، مولانا عبدالصمد رؤف اور پیر محمد یعقوب قریشی سے صرف ونحو، عربی ادبیات، بیان ومعانی اور حدیث وتفسیر کی نصابی کتابیں پڑھیں اور ۱۹۶۰ء میں سند فراغ حاصل کی۔

بعد ازاں صوفی عبداللہ مرحوم کے حکم سے جامعہ سلفیہ میں داخلہ لیا اور حضرت حافظ محمد گوندلوی، مولانا شریف اللہ خاں سواتی، مولانا گوہر رحمان ہزاروی اور مولانا محمد اسحاق چیمہ سے استفادہ کیا اور ان اساتذۂ گرامی سے جامعہ سلفیہ کے نصاب کے مطابق انتہائی درسی کتابوں کی تکمیل کی۔ یہ ۱۹۶۱ء کی بات ہے۔

۱۹۶۱ء ہی میں صوفی عبداللہ مرحوم نے ان کو دارالعلوم تعلیم الاسلام میں مدرس مقرر کردیا۔ پھر جب یہ دارالعلوم اوڈاں والا سے ماموں کانجن منتقل ہوگیا تو صوفی صاحب کے حکم سے مولانا عبدالرشید اثاروی ماموں کانجن چلے گئے اور اب تک (جب کہ ۱۷۔ فروری ۲۰۰۷ء کو یہ سطور لکھی جارہی ہیں) ماموں کانجن ہی میں ہیں۔ دیگر درسی کتابوں کے علاوہ ۱۹۸۶ء سے اب تک باقاعدہ طلبا کو صحیح مسلم کا درس دے رہے ہیں۔ درس وتدریس کے علاوہ انھیں کسی سلسلے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ صابر وشاکر عالم دین اور محنتی مدرس ہیں۔ کئی قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہوئے اور بعض پریشانیوں میں گھرے رہے مگر جی نہیں ہارا اور مستقل مزاجی سے سلسلۂ تدریس جاری رکھا۔ ایک بچی سخت بیماری کا شکار رہی، لیکن اللہ نے اس پر بھی ان کو صبر عطا فرمایا۔ خود داری، احساسِ ذمہ داری اور خدمت علم ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

۱۹۵۶ء میں اپنے ماموں محمد یعقوب کی بیٹی سے ان کی شادی ہوئی تھی، اس وقت عمر صرف سولہ برس کی تھی اور دارالعلوم تعلیم الاسلام میں طلب علم میں مصروف تھے۔

اولاد میں سے ایک بیٹا نو دس ماہ کی عمر میں وفات پاگیا اور تین بیٹیاں فوت ہوئیں۔ دو بیٹیاں زندہ ہیں اور شادی شدہ ہیں۔ ایک بیٹی کی شادی ان کے دور طالب علمی کے دوست مولانا عبدالرشید ہزاروی (خطیب جامع مسجد اہل حدیث ساہی وال۔ وشیخ الحدیث دارالحدیث اوکاڑہ) کے فرزند ارجمند مولانا عبدالکبیر سے ہوئی جو ریاض (سعودی عرب) میں اقامت گزیں ہیں اور ماشاء اللہ صاحب اولاد ہیں۔ ان کے بچے تعلیم حاصل کررہے ہیں۔

مولانا عبدالرشید اثاروی کی دوسری بیٹی کی شادی مولانا کے عزیز اور شاگرد مولانا محمد شفیق صاحب سے ہوئی جو فیصل آباد میں مقیم ہیں۔ یہ میاں بیوی بھی ماشاء اللہ بچوں والے ہیں۔

مولانا عبدالرشید اثاروی دو مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ ۶۷ سال کی عمر کو پہنچ گئے ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ صحت وعافیت کے ساتھ اس مردِ باہمت کو عمر دراز عطا فرمائے اور وہ خدمت دین میں مصروف رہیں۔



مولانا عبدالرشید ضیا

مشرقی پنجاب ضلع فیروز پور کی تحصیل مکتسر میں ایک مشہور قصبہ ''کھپیاں والی'' کے نام سے موسوم تھا۔ وہاں ایک نامور عالم دین حضرت مولانا عبداللہ صاحب قیام فرما تھے جو محدث پنجاب حضرت مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی رحمہ اللہ کے شاگردِ گرامی قدر تھے۔ انھوں نے کھپیاں والی میں ایک دار العلوم جاری فرمایا تھا، جس میں علما وطلبا کی کثیر تعداد نے استفادہ کیا۔ حضرت ممدوح اگست ۱۹۴۷ء میں اپنے خاندان سمیت ایک قافلے کے ساتھ پاکستان کی طرف آرہے تھے کہ راستے میں سکھوں نے انھیں شہید کردیا۔ حضرت کے لائق فرزند مولانا حافظ عبدالمنان صاحب ساہی وال تشریف لے آئے تھے، وہ وہیں آخر دم تک تدریس وخطابت کی خدمت سرانجام دیتے رہے۔

مولانا عبدالرشید ضیا کا مسکن یہی موضع کھپیاں والی تھا اور ان کا مکان حضرت مولانا عبداللہ صاحب کے دولت کدہ کے قریب تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ان کے والد چک نمبر ۲۷ گ ب (تحصیل جڑاں والا ضلع فیصل آباد) آگئے تھے، وہیں ۱۹۷۱ء میں مولانا عبدالرشید کی ولادت ہوئی۔ سرکاری سکول میں کچھ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا محمد علی صاحب (چک نمبر ۲۳ گ ب) کی وساطت سے جامعہ تعلیم الاسلام (ماموں کانجن) میں داخل ہوئے اور ۱۹۹۲ء میں اسی جامعہ سے سند فراغت حاصل کی۔ اسی دوران میٹرک، فاضل عربی اور ایف اے کے امتحانات پاس کیے۔ وفاق المدارس السّلفیہ کا امتحان بھی دیا۔

مرکز الدعوۃ السّلفیہ ستیانہ بنگلہ میں مولانا عبداللہ امجد کے دورہ تفسیر میں شرکت کی۔

اساتذہ کی فہرست میں مولانا عبداللہ امجد، مولانا حافظ محمد یاسین، مولانا عبدالرشید اثاروی، قاری حفیظ اللہ سندھو، مولانا رفیع الدین فردوسی اور مولانا محمد علی شامل ہیں۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد جامعہ تعلیم الاسلام (ماموں کانجن) میں سلسلۂ تدریس کا آغاز کیا۔ دوسال وہاں تدریسی خدمت انجام دی۔ اس کے بعد جامعہ اشاعۃ الاسلام (عارف والا) کا عزم کیا۔ وہاں آٹھ سال تدریسی سلسلہ جاری رکھا۔ پھر مرکز الدعوۃ السّلفیہ (ستیانہ بنگلہ) میں آگئے اور یہاں درس وتدریس میں مصروف ہیں۔

اب مولانا عبدالرشید ضیا کی اس خدمت حدیث کی طرف آیئے جو انھوں نے تحریری صورت میں سرانجام دی۔ مختصر الفاظ میں اس کی تفصیل یہ ہے کہ چند سال پیشتر حافظ عبدالستار حماد نے اہل

علم کی ایک کمیٹی مقرر کی تھی، جسے عبدالخالق صاحب کا تعاون حاصل تھا جو امریکہ میں مقیم ہیں۔ مولانا عبدالرشید ضیا کو ابن ابی عاصم کی کتاب السنہ کے متعلق کام کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔ یہ کتاب عقائد کے متعلق ہے اور دو جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ علامہ البانی نے اس پر احادیث کی صحت اور ضعف کے بارے میں کام کیا ہے۔ مولانا عبدالرشید ضیا نے اس کتاب پر درجِ ذیل خدمت سرانجام دی ہے:

① ...... اسناد کو حذف کر کے صرف متن حدیث کا سلیس اردو زبان میں ترجمہ کیا۔

② ...... علامہ البانی کی تحقیق کے مطابق اگر کوئی حدیث صحیح ہے تو بتایا گیا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اگر ضعیف ہے تو اس کے ضعف اور وجہ ضعف کا مختصر الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔

③ ...... فقہ الحدیث کے عنوان کے تحت جا بجا ضمنی عنوانات قائم کر کے اس کی تشریح کی گئی ہے۔

④ ...... جو احادیث بہ ظاہر متعارض ہیں، محدثین کے بیان فرمودہ اصول کی روشنی میں ان کے درمیان تطبیق دی گئی ہے اور وہ راجح موقف اختیار کیا گیا ہے، جس کی اسلاف نے وضاحت فرمائی ہے۔

⑤ ...... ناسخ و منسوخ احادیث کی تعیین کی گئی ہے۔

یہ کتاب ایک ہزار نو احادیث (١٠٠٩) پر مشتمل ہے اور المکتب الاسلامی کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ مولانا ممدوح نے مندرجہ ذیل عربی کتابوں کا اردو ترجمہ کیا۔

① ...... القول الجلی فی التوسل بالنبی والولی۔

② ...... الحجاب غیرۃ عبرہ۔

اب اپنے استاذِ محترم مولانا رفیع الدین فردوسی کی سوانح حیات لکھ رہے ہیں۔

بعض جماعتی رسائل و جرائد میں بھی ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔



پروفیسر محمد اکرم نسیم ججہ

ضلع سیالکوٹ کی تحصیل پسرور میں جاٹوں کی ججہ برادری کے بارہ گاؤں قریب قریب واقع ہیں۔ چند سال پیشتر ان بارہ دیہات میں ایک شخص بھی اہل حدیث نہیں تھا۔ سب لوگ احناف کے بریلوی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ ان بارہ دیہات میں ایک گاؤں کا نام ''موہر یکے ججہ'' ہے۔ پروفیسر محمد اکرم نسیم ججہ اسی گاؤں میں ۲۔ جنوری ۱۹۴۵ء کو پیدا ہوئے۔ اس گاؤں کی مسجد کے امام اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھتے تھے، لیکن اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد محمد اکرم ججہ نے ان سے تفسیر ابن کثیر کے چند پارے پڑھے اور مشکوٰۃ شریف پڑھی تو مسلک اہل حدیث اختیار کرلیا اور اس کی اشاعت کے لیے کمربستہ ہوگئے۔ اس ماحول میں یہ بڑی ہمت کا کام تھا اور توحید وسنت کی دعوت کا جو ردّ عمل اس فضا میں ہوسکتا تھا، ہوا۔ لیکن برادری کے چند نوجوانوں نے ان کی تائید کی اور وہ ان کے ساتھ ہو گئے۔ اب مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پہلا مناظرہ تراویح کے موضوع پر ہوا۔ محمد اکرم ججہ اور ان کے رفقا نے لاہور آ کر مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی کی خدمت میں حاضری دی اور وہ انھیں مناظرے کے لیے اپنے گاؤں موہر یکے ججہ لے گئے۔ حافظ صاحب کے معاون مولانا محمد صدیق (سرگودھا) تھے اور صدر مولانا محمد رفیق پسروری کو بنایا گیا تھا۔ بریلوی حضرات کی طرف سے مولانا مراتب علی شاہ مناظر تھے۔ کھلی فضا میں ہزاروں لوگوں نے مناظرہ سنا جو انتہائی پر امن ماحول میں ہوا۔ موہر یکے ججہ کے قریب ایک گاؤں کا نام خان ججہ ہے۔ وہاں کے رہنے والے ایک صاحب محمد بشیر ججہ ایڈووکیٹ ہیں جن کا تعلق جماعت اسلامی سے تھا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ زیر بحث مسئلہ تراویح کے متعلق مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی نے مضبوط دلائل کی روشنی میں ثابت کردیا ہے کہ تراویح کی نماز بیس رکعت نہیں، آٹھ رکعت ہے۔ اس مناظرہ کے نتیجے میں موہر یکے ججہ کے متعدد افراد نے مسلک اہل حدیث قبول کیا۔ اب اس برادری اور گاؤں کے بہت سے لوگ اس مسلک سے وابستہ ہیں۔

اس کے بعد محمد اکرم نسیم ججہ کے تعلیمی حالات اور ملازمت کے سلسلے کی چند باتیں:

میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ ملیریا ریڈی کیشن کے محکمے میں بہ طور سپروائزر ملازم ہوئے۔ یہ محکمہ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے تحت قائم ہوا تھا، جسے بعد میں محکمہ صحت میں ضم کردیا گیا۔ محمد اکرم ججہ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۶ء تک اس محکمے میں کام کرتے رہے۔ پھر یہ ملازمت چھوڑ دی۔

۱۹۶۸ء میں انھوں نے پرائیویٹ طور سے ایف۔ اے کیا اور ایک پرائیویٹ اسلامیہ ہائی سکول میں ٹیچر مقرر کر لیے گئے۔ پھر ۱۹۸۲ء میں پرائیویٹ امتحان دے کر فرسٹ ڈویژن میں بی اے پاس کیا۔ اس کے بعد ۱۹۸۳ء میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ آئی، ای، آر میں داخلہ لیا اور ۱۹۸۵ء میں ایم اے ایجوکیشن کی ڈگری حاصل کی۔ بعد ازاں پرائیویٹ امتحان دے کر ایم اے اسلامیات کیا اور ۱۹۸۷ء میں بہ طور سبجیکٹ سپیشلسٹ موضع بوسال (ضلع گجرات) میں تقرری ہوئی۔ وہاں سے جلد ہی تبادلہ کرا کے پسرور میں ٹیچر ٹریننگ کالج میں تدریسی فرائض سرانجام دینے لگے۔ پھر چند ماہ بعد اسلامیات کے لیکچرار کی حیثیت سے گورنمنٹ ڈگری کالج پسرور میں پڑھانا شروع کیا۔

۱۹۷۶ء میں جب مولانا کوثر نیازی مرحوم پاکستان کے وزیر مذہبی امور تھے، محمد اکرم ججہ کو سرکاری سکیم کے تحت حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ یہ حج انھوں نے بحری جہاز کے ذریعے کیا تھا۔ ۲۰۰۰ء میں ان کو مسقط میں مقیم پاکستانی دوستوں نے تبلیغ دین کے لیے ویزا بھیج کر اپنے ہاں بلایا تو وہاں سے بذریعہ روڈ حج بیت اللہ کیا۔ ۲۰۰۶ء میں تیسرا حج بائی ایئر کیا۔

اب ان کے سلسلہ تصنیف وتالیف کی طرف آئیے:

کالج کی تدریس کے زمانے ہی میں محمد اکرم ججہ نے اپنے مسلک کی دعوت وتبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، جس سے طلبہ بہت متاثر ہوئے اور بڑی تعداد میں نوجوان کتاب وسنت کے متبع اور داعی ہو گئے۔ تصنیف وتالیف کے کام کا آغاز بھی اسی دور میں کر دیا تھا۔

① ...... پہلی کتاب ''تفہیم توحید'' لکھی، جس میں شرک وبدعات اور غیر اسلامی رسوم ورواج کی کتاب وسنت کی روشنی میں تردید کی گئی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے بہت لوگ راہِ ہدایت پر گامزن ہوئے اور اپنی زندگیوں کو احکامِ دین کے سانچے میں ڈھالا۔

② ...... اس کے بعد ''تفہیم سنت'' کے نام سے کتاب تصنیف کی جو پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں حدیث وسنت کے بارے میں بہت سی اہم چیزیں جمع کر دی گئی ہیں مث حدیث کا مفہوم، حدیث کی حفاظت، حدیث کی جمع وتدوین، فتنۂ انکارِ حدیث کی تاریخ، منکر حدیث کے اعتراضات اور ان کے جوابات، فتنۂ وضع حدیث، علم اسماء الرجال، سنت کا مفہوم اور ا کی تعریف، سنت اور حکمت، وحی جلی یا وحی متلو، بدعت کی حقیقت، بدعت کی قباحتیں، روافض وخوار اور وضع حدیث، سوادِ اعظم، تقلید شخصی وغیرہ کتنے ہی ضروری اور بنیادی مباحث اس کتاب بہترین اسلوب میں آ گئے ہیں۔

③ ...... ایک اور کتاب انھوں نے ''نماز کے تین اہم اختلافی مسائل'' لکھی۔ اس کتاب رفع الیدین، آمین بالجہر اور فاتحہ خلف الامام کے بارے میں دلائل سے ثابت کیا ہے کہ نماز میں

پر عمل کرنا جزوِ نماز ہے۔ فاتحہ خلف الامام کے بغیر نماز نہیں ہوتی، اس کا ہر نماز میں امام کی اقتدا میں پڑھنا ضروری ہے۔ پھر آمین بالجہر اور رفع الیدین نبی ﷺ سے ثابت شدہ عمل ہے۔ جو شخص اسے ترک کرتا ہے، وہ تارکِ سنت ہے۔

④...... پروفیسر محمد اکرم نسیم بجہ کے علاقے میں مرزائی اچھی خاصی تعداد میں آباد ہیں۔ مرزائیوں سے ان کے مناظروں کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور وفات مسیح اور حیاتِ مسیح وغیرہ موضوعات پر بحثیں ہوتی رہتی ہیں۔

انھوں نے مرزائیت سے متعلق لٹریچر کا بہت مطالعہ کیا ہے اور ''حیاتِ مسیح اور حیاتِ مرزا'' کے نام سے کتاب بھی لکھی ہے، جس کے مندرجات سے اس علاقے کے پڑھے لکھے مرزائی بڑے متاثر ہوئے اور مرزائیت سے تائب ہو کر انھوں نے اسلام قبول کیا۔

⑤......مرزا غلام احمد قادیانی کے عقائد کے متعلق مرزائیوں سے ان کا تحریری مناظرہ ہوا تھا جو کتابی صورت میں چھپا۔

⑥......ایک کتاب ''علم غیب اور مختارِ کل'' کے نام سے چھپی۔

ان تصنیفی خدمات کے علاوہ تقریر و خطابت کی صورت میں بھی ان کی تبلیغی کوششیں جاری ہیں۔ ۱۹۸۳ء سے رسول پارک (اچھرہ، لاہور) کی جامع مسجد محمدی اہل حدیث میں خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے ہیں۔ اس کے لیے وہ ہر جمعے کو اپنے گاؤں (موہر یکے بجہ) سے لاہور تشریف لاتے ہیں۔ چھ سات سال سے اپنے ایک مخلص دوست محمد اسلم صاحب کے تعاون سے ایک جامع مسجد میں ہر منگل کو نمازِ مغرب کے بعد نمازِ عشا تک قرآنِ مجید کا درس دیتے ہیں۔ اس درس میں بہت سے لوگ شامل ہوتے اور استفادہ کرتے ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ محمد اکرم نسیم بجہ کو قرآن و سنت کی خدمت کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرے۔

